رجسٹرڈ نمبر ایل: ۷۵۷۹ ٹیلیفون: ۶۹۵۸۰

فنون

جدید غزل نمبر

جلد دوم

۱۳، ۱۴

ادارہ
احمد ندیم قاسمی
حبیب اشعر دہلوی

تزئین: موجد

جلد ۸ جنوری ۱۹۶۹ء شمارہ ۳۵، ۴

سالانہ چندہ: ۱۴ روپے
بشمول غزل نمبر: ۳۰ روپے

غیر ممالک سے: ۲۵ روپے

قیمت فی پرچہ (جدید غزل نمبر جلد اوّل دوم)
۳۰ روپے

مقامِ اشاعت: ۷۴ - انارکلی - لاہور (مغربی پاکستان)

صابنوں میں ایک سے ایک بہتر سلسلہ











ہر مقصد کیلئے
موزوں ترین
صابن

عمدہ۔ بہتر اور بہترین

ہم آپ کی خدمت میں دھونے اور نہانے کے معیاری صابنوں کا سیٹ پیش کرتے ہیں جنہیں حفظانِ صحت کے جدید ترین اصولوں پر تیار کیا جاتا ہے۔

ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ۔ کراچی

ZIL-3991 THAVER

غزلیں :

فراقؔ گورکھپوری



جہانِ غنچۂ دل کا فقط چٹکنا تھا
اسی کی بُوئے پریشاں وجودِ دنیا تھا

یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا
وہ اک نگاہ سہی، کیوں کسی کو دیکھا تھا

ہر اک کے ہاتھ فقط غفلتیں یقیں ہوش نما
کہ اپنے آپ سے بیگانہ وار جینا تھا

یہی ہُوا کہ فریبِ اُمید و یاس مٹے
وہ پا گئے ترے ہاتھوں ہمیں جو پانا تھا

حیات و مرگ کے کچھ راز کھُل گئے ہوں گے
فسانۂ شبِ غم ورنہ دوستو، کیا تھا

کچھ ایسی بات نہ تھی تیرا دُور ہو جانا
یہ اور بات کہ رہ رہ کے درد اُٹھتا تھا

نہ پوچھ سود و زیاں کاروبارِ اُلفت کے
وگرنہ یوں تو نہ پانا تھا کچھ نہ کھونا تھا

تجھے ہم اے دلِ درد آشنا، کہاں ڈھونڈیں
ہم اپنے ہوش میں کب تھے کوئی جب اُٹھتا تھا

کہاں یہ چوک ہُوئی تیرے بیقراروں سے!
زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا

یہ کوئی یاد ہے، یہ بھی ہے کوئی محویت!
ترے خیال میں تجھ کو بھی بھول جانا تھا

کہاں کی چوٹ اُبھر آئی حُسنِ تاباں میں
دمِ نظارہ وہ رخ درد سا چمکتا تھا

نہ پوچھ رمز و کنایاتِ چشمِ ساقی کے
بس ایک حشرِ خموش انجمن میں برپا تھا

چمن چمن تھی، گُلِ داغِ عشق سے ہستی
اسی کی نکہتِ برباد گُل زمانہ تھا

وصال اس سے میں چاہوں، کہاں یہ میرا دل
یہ رو رہا ہوں کہ کیوں اُس کو میں نے دیکھا تھا

ہر ایک سانس ہے تجدید "یادِ ایام"
گزر گیا وہ زمانہ جسے گزرنا تھا

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں، نہ کوئی اُمید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

کسی کے صبر نے بے صبر کر دیا سب کو
فراقؔ نزع میں کروٹ کوئی بدلتا تھا

فراق گورکھپوری



حیات بھی نہ ہو معراجِ آب و رنگ نہیں
مرا وجود بھی میرا وجود ہے کہ نہیں

تو شاد کھو کے اُسے اور اُس کو پا کے غمیں
فراقؔ تیری محبت کا کوئی ٹھیک نہیں

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

ہماری زندگیِ عشق کا وہ پہلا خواب
تمھیں بھی بھول چکا ہے ہمیں بھی یاد نہیں

ہر انقلاب کے بعد آدمی سمجھتا ہے
کہ اس کے بعد نہ پھر لے گی کروٹیں یہ زمیں

بہت نہ بیکسیِ عشق پر کوئی روئے
کہ حسن کا بھی زمانے میں کوئی دوست نہیں

ہر اک ابد کا مسافر ہر ایک خانہ بدوش
سرِ دیارِ محبت کوئی مکاں نہ مکیں

اگر تلاش کریں، کیا نہیں ہے دنیا میں
جز ایک زندگی کی طرح زندگی۔ کہ نہیں

مجھے بھی بے خبری تھی بوقتِ عہدِ وفا
تمھیں بھی ہوش نہ تھا، میں نے سچ کہا کہ نہیں

جو بھولتیں بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں
تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تو نے
یہ اور بات کہ تجھ سے بھی کچھ امیدیں تھیں

خدا کے سامنے میرے قصور وار ہیں جو
اُنھیں سے آنکھیں برابر مری نہیں ہوتیں

یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی نور کا پتلا، نہ کوئی زہرہ جبیں

ہنر تو خیر ہنر، عیب سے بھی جلتے ہیں
فغاں، کہ اہلِ زمانہ ہیں کس قدر کم بیں

تجھے بتائے اگر کوئی آنکھ والا ہو
کہ یہ زمیں بھی چمکتا ستارہ ہے کہ نہیں

تھی شہر شہر زمانے میں جن کی رسوائی
فراقؔ تھے وہی ناموسِ زندگی کے امیں



یہ ڈر رہا ہوں کہ ایسے میں وہ نہ یاد آ جائیں
یہ کالی کالی گھٹائیں یہ اودی اودی ہوائیں
کہاں تک آہ تلاشِ اجل میں جان کھپائیں
فراق آؤ اسی زندگی کو موت بنائیں
یہ کیا کہا، نہ رہے عشق اور ملتے رہیں
اب ایسی باتوں میں کیا ہے کہو تو منہ نہ دکھائیں
ہیں گرچہ اہلِ نظر کو بڑے بڑے دعوے
کہیں وہ جلوہ نما ہو تو دیکھتے رہ جائیں
وصال و ہجر کا ایسوں کے کچھ ٹھکانا ہے
کہ جا کے بھی جو نہ جائیں اور آ کے بھی جو نہ آئیں
یہ تیری انجمنِ ناز بزمِ غیر نہیں
ہمارا کام نہیں کچھ یہاں، تو کیا اٹھ جائیں
زمانہ بدلا ہے ایک آدھ کروٹوں سے کہیں
ابھی عناصرِ عالم کچھ اور پلٹے کھائیں
جہاں ہیں ترکِ تعلق نہیں ہے ترکِ رسوم
وہ سامنے ہیں تو ہم بھی کہاں تک آنکھ چرائیں
ازل سے رونقِ بزمِ جہاں ہیں قلبِ تپاں
یہ انجمن بھی ہوا ہو جو یہ کنول بجھ جائیں
کریں تو کس سے کریں شوقِ نارسا کا گلہ
رکیں تو پاؤں نہ مانیں، چلیں تو منہ کی کھائیں
وہ بے نیاز، یہاں موت و زندگی یکساں
دعا بجا، مگر ایسے میں کس کی خیر منائیں
کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی، تو کیا مر جائیں
نہ ختم ہو جو کبھی، وہ بھی داستاں ہوئی ختم
جھپک رہی ہیں ستاروں کی آنکھیں اب سو جائیں



کچھ ہم بھی تو حسرتیں نکالیں
آؤ تمہیں سینے سے لگا لیں
جس طرح گہن سا لگ کے چھٹ جائے
ہاں پھر یونہی روٹھو، ہم منا لیں
یہ ذلتِ عشق تیرے ہاتھوں!
اے دوست تجھے کہاں چھپا لیں!
اسرارِ جہاں بھی کھل رہیں گے
ان آنکھوں کا پہلے بھید پا لیں
پھر کھا لیں گے فریبِ ہستی
کچھ تیری نظر کے دھوکے کھا لیں
چپ چاپ بدل گئی ہے دنیا
ملتی ہیں کچھ اس کی بھی مثالیں
کچھ دن غمِ ہجر میں بھی کاٹیں
کچھ یوں بھی تو زندگی گنوا لیں
رونے کو تو زندگی پڑی ہے
کچھ تیرے ستم پہ مسکرا لیں
برسوں ترے غم میں رو چکے ہم
اب اور بھی کام دیکھیں بھالیں
غزلیں مری سن کے اہلِ دنیا
اپنی کھوئی حیات پا لیں
ڈگمگ ڈگمگ نظامِ ہستی
ہم خود کو فراق کب سنبھالیں

فراق گورکھپوری



کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

کہوں یہ کیسے، اِدھر دیکھ یا نہ دیکھ اُدھر
کہ درد، درد ہے پھر بھی، نظر نظر پھر بھی

جھپک رہی ہیں زمان و مکاں کی بھی آنکھیں
مگر ہے قافلہ آمادۂ سفر پھر بھی

شبِ فراق سے آگے ہے آج میری نظر
کہ کٹ ہی جائیگی یہ شامِ بے سحر پھر بھی

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن، پلٹنا تھا
وہ کوچہ روکشِ جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی

خراب ہو کے بھی سوچا کئے ترے مہجور
یہی کہ تیری نظر ہے تری نظر پھر بھی

تری نگاہ سے بچنے میں عمر گزری ہے
اتر گیا رگِ جاں میں یہ نشتر پھر بھی

غمِ فراق کے کشتوں کا حشر کیا ہوگا؟
یہ شامِ ہجر تو ہو جائے گی سحر پھر بھی

اگرچہ بیخودیٔ عشق کو زمانہ ہوا
فراقؔ کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی



سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

شکوۂ جور کرے کیا کوئی اس شوخ سے، جو
صاف قائل بھی نہیں، صاف مکرتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے، اے دوست!
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے - ایسا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام
کنجِ زنداں بھی نہیں، وسعتِ صحرا بھی نہیں

آہ یہ مجمعِ احباب، یہ بزمِ خاموش
آج محفل میں فراقِ سخن آرا بھی نہیں



آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا
آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا

لاکھ کر جور و ستم، لاکھ کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

آج پھر عشق دو عالم سے جدا ہوتا ہے
آستینوں میں لیے کون و مکاں ہے کہ جو تھا

عشق افسردہ نہیں آج بھی افسردہ بہت
وہی کم کم اثرِ سوزِ نہاں ہے کہ جو تھا

قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

پھر تری چشمِ سخن سنج نے چھیڑی کوئی بات
وہی جادو ہے، وہی حسنِ بیاں ہے کہ جو تھا

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراقؔ
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا



رکی رکی سی شبِ ہجر ختم پر آئی
وہ پو پھٹی، وہ نئی زندگی نظر آئی

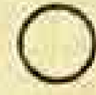
یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی ساتھ
مسافروں سے کہو، اس کی رہگذر آئی

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے شباب کی دوشیزگی نکھر آئی



رات بھی، نیند بھی، کہانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی

دل کو اپنے بھی غم تھے دنیا میں
کچھ بلائیں تھیں آسمانی بھی

منصبِ دل، خوشی لٹانا ہے
غمِ پنہاں کی پاسبانی بھی

لاکھ حسنِ یقین سے بڑھ کر ہے
ان نگاہوں کی بدگمانی بھی

خلق کیا کیا مجھے نہیں کہتی
کچھ سنوں میں ، نزی زبانی بھی

آئے تاریخِ عشق میں سو بار
موت کے دور درمیانی بھی

وضع کرتے کوئی نئی دنیا
کہ یہ دنیا ہوئی پرانی بھی

دل کو آدابِ زندگی بھی نہ آئے
کر گئے لوگ حکمرانی بھی

زندگی عینِ دیدِ یار فراقؔ
زندگی ہجر کی کہانی بھی



آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے
اک شرحِ حیات ہو گئی ہے

مدت سے خبر ملی نہ دل کی
شائد کوئی بات ہو گئی ہے

جس شے پہ نظر پڑی ہے میری
تصویرِ حیات ہو گئی ہے

کیا جانیے، موت پہلے کیا تھی
اب میری حیات ہو گئی ہے

اس دور میں ، زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

مٹنے لگیں زندگی کی قدریں
جب غم سے نجات ہو گئی ہے

اکّا دکّا صدائے زنجیر
زنداں میں رات ہو گئی ہے

ایک ایک صفت فراقؔ اس کی
دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

حفیظ جالندھری



کیسے بند ہُوا مے خانہ - اب معلوم ہُوا
پی نہ سکا کم ظرف زمانہ - اب معلوم ہُوا

اب ہوش آیا - حالِ زمانہ - اب معلوم ہُوا
سب فرزانے ، میں دیوانہ - اب معلوم ہُوا

محفل خوش کیوں تھی ؟ - یہ حقیقت اب معلوم ہوئی
دردبھرا اپنا افسانہ - اب معلوم ہُوا

اللہ اللہ کارگزاری ان فرزانوں کی
یوں تعمیر ہُوا ویرانہ - اب معلوم ہُوا

خالی شیشے طاق پہ دھرتا جاتا ہے ساقی
بھرتا جاتا ہے پیمانہ - اب معلوم ہُوا

خوش تھے - آنکھوں سے کیا رنگیں چشمہ پھوٹا ہے
ٹوٹا ہے دل کا پیمانہ - اب معلوم ہُوا

دل نے آنکھوں تک آنے میں اِتنا وقت لیا
دُور تھا کعبے سے بُت خانہ - اب معلوم ہُوا

سر سہلاتا شہرِ سخن سے باہر نکلا ہُوں
زور پہ ہے مشقِ طفلانہ - اب معلوم ہوا



تُو ہی بھروسا، تُو ہی سہارا — پروردگارا! — پروردگارا!!

منظور، منظور — اے اہلِ دنیا — اللہ میرا — باقی تمہارا

یوں میں نے جیتی الفت کی بازی — اک بار کھیلا، سو بار ہارا

حاضر ہوں میں بھی، حاضر ہے دل بھی — دل بھی تمہارا، میں بھی تمہارا

یہ "ناخدا" ہے، اے اہلِ کشتی — شاید کسی وقت کر دے کنارا

سیراب کر دے دنیا میں ساقی — عقبیٰ کی تلخی مجھکو گوارا

رُخ پہ فلک پر چھائی سفیدی — چمکا ہے شاید میرا ستارا

آنکھوں میں آنسو، لب پر تبسّم — اُن کا تصوّر، اپنا نظارا

جینا پڑے گا اے جانِ شیریں! — کرنی پڑے گی تلخی گوارا

مٹی کے پُتلے! کیا چاہتا ہے — بختِ سکندر یا تختِ دارا

عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی — وہ بھی نہ ہارے، میں بھی نہ ہارا

پھر یہ جہنّم کس کے لیے ہے؟

آمرزگارا! آمرزگارا!!



غم موجود ہے، آنسو بھی ہیں — کھا تو رہا ہوں، پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں — اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

یارو میں نے اپنا سینہ اپنے ہاتھوں چاک کیا ہے
سچ کہتے ہو لیکن دیکھو — اپنے ہاتھوں سی تو رہا ہوں

خونِ جگر آنکھوں سے نہ ٹپکا، منہ سے شعلہ بن کر لپکا!
شعبدہ گر ہوں، مجھ پہ ہنسئے — میں بھی ہنستا ہی تو رہا ہوں

سیم و زر سے برتر و بالا، شاید کوئی شے پا جاؤ
راکھ ذرا میری بھی کرید و — کیمیا گر میں بھی تو رہا ہوں

ہاں مَیں حفیظ ہوں تیرا بندہ - بُت خانے کے اندر اب تک
میری نیت پوچھنا کیا ہے — تیری مشیت ہی تو رہا ہوں



جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں
بہ حالِ گمرہی پایا گیا ہوں
حرم سے دَیر میں لایا گیا ہوں
بلا کافی نہ تھی اِک زندگی کی
دوبارا یاد فرمایا گیا ہوں
برنگِ لالۂ ویرانہ، بے کار
کھلایا اور مرجھایا گیا ہوں
اگرچہ ابرِ گوہر بار ہوں میں
مگر آنکھوں سے برسایا گیا ہوں
سپردِ خاک ہی کرنا ہے مجھ کو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں
فرشتے کو نہ میں شیطان سمجھا
نتیجہ یہ کہ بہکایا گیا ہوں
کوئی صنعت نہیں مجھ میں تو پھر کیوں؟
نمائش گاہ میں لایا گیا ہوں
بقولِ برہمن قہرِ خدا ہوں
بتوں کے حسن پر ڈھایا گیا ہوں
مجھے تو اس خبر نے کھو دیا ہے
سنا ہے میں کہیں پایا گیا ہوں
حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں



ان تلخ آنسوؤں کو نہ یوں مُنہ بنا کے پی
یہ مے ہے خود کشیدہ، اسے مُسکرا کے پی

اُتریں گے کِس کے حلق سے یہ دلخراش گھونٹ
کِس کو پیام دوں کہ مرے ساتھ آ کے پی

مشروبِ جامِ جم نہیں، غم ہے ترا علاج
شیرینیٔ کلام سے شیریں بنا کے پی

واعظ کی اب نہ مان اگر جان ہے عزیز
اس دَور میں یہ چیز بطور اک دوا کے پی

بھر لے پیالہ، خُمکدۂ زیست سے حفیظؔ
خونِ جگر ہے، سامنے چل کر خدا کے پی



ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھُلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے

تم ہی نہ سُن سکے اگر قصۂ غم، سُنے گا کون؟
کِس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سُنا سکے

ہوش میں آ چکے تھے ہم، جوش میں آ چکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اُٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے

شوقِ وصال ہے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کِس کی مجال ہے یہاں، ہم سے نظر ملا سکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر بات پہ کان دھر سکے
سُن کے یقین کر سکے، جا کے انہیں سُنا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمیٔ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست جس کی سمجھ میں آ سکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظؔ درد کے گیت گا سکے

حفیظ جالندھری



ترے دل میں بھی ہیں کدورتیں، ترے لب پہ بھی ہیں شکایتیں
مرے دوستوں کی نوازشیں، مرے دشمنوں کی عنایتیں

یہ ہے طرفہ صورتِ دوستی کہ نگاہ و دل ہمہ برف ہیں
نہ وہ بادہ ہے نہ وہ ظرف ہیں، نہ وہ حرف ہیں نہ حکایتیں

یہی ربط و ضبطِ غم و الم، تری رائے میں کبھی خوب تھے
وہ یہی تو میرے عیوب تھے، جنھیں دی گئی تھیں رعائتیں

ترے آستاں سے کشاں کشاں، لیے جا رہی ہیں کہاں کہاں
مرے ناصحوں کی ہدایتیں، ترے واعظوں کی روایتیں

ترا نام لیتے ہی اے خدا! میں صنم کدے سے نکل چکا!
رہیں کاش تا درِ مصطفےٰ، مری رہنما تری آیتیں



جوانی کے ترانے گا رہا ہوں
دبی چنگاریاں سلگا رہا ہوں

میری بزمِ وفا سے جانے والو
ٹھہر جاؤ کہ میں بھی آ رہا ہوں

بتوں کو قول دیتا ہوں وفا کا
قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں

وفا کا لازمی تھا یہ نتیجہ
سزا اپنے کیے کی پا رہا ہوں

خدا لگتی کہو، بت خانے والو
تمھارے ساتھ میں کیسا رہا ہوں؟

نہ ہے وہ گوشۂ راحت کہ جس میں
ہجومِ رنج لے کر جا رہا ہوں

چراغِ خانۂ درویش ہوں میں
اِدھر جلتا اُدھر بجھتا رہا ہوں

نئے کعبے کی بنیادوں سے پوچھو
پرانے بتکدے کیوں ڈھا رہا ہوں

نہیں کانٹے بھی کیا اُجڑے چمن میں
کوئی روکے مجھے میں جا رہا ہوں

ہوئی جاتی ہے کیوں بے تاب منزل
مسلسل چل رہا ہوں، آ رہا ہوں

حفیظؔ اپنے پرائے بن رہے ہیں
کہ میں دل کو زباں پر لا رہا ہوں

حفیظ جالندھری



اے دوست مٹ گیا ہوں، فنا ہو گیا ہوں میں
اس دردِ دوستی کی دوا ہو گیا ہوں میں

قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہوں میں

ناآشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست
کم بخت جانتے نہیں، کیا ہو گیا ہوں میں

ہنسنے کا اعتبار نہ رونے کا اعتبار
کیا زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

ہمت بلند تھی مگر افتاد دیکھنا!
چپ چاپ آج محوِ دعا ہو گیا ہوں میں

یہ زندگی فریبِ مسلسل نہ ہو کہیں
شاید اسیرِ دامِ بلا ہو گیا ہوں میں

اُٹھا ہوں اک جہانِ خموشی لیے ہوئے
ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا ہو گیا ہوں میں

ہاں کیفِ بیخودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا، خدا ہو گیا ہوں میں



مرے مذاقِ سخن کو سخن کی تاب نہیں
سخن ہے نالۂ دل، نغمۂ رباب نہیں

اگر وہ فتنہ کوئی فتنۂ شباب نہیں
تو حشر میرے لیے وجہِ اضطراب نہیں

نہیں ثواب کی پابند بندگی میری
یہ اک نشہ ہے جو آلودۂ شراب نہیں

مجھے ذلیل نہ کر عذرِ لن ترانی سے
یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے جواب نہیں

جو کامیابِ محبت ہو — سامنے آئے
میں کامیاب نہیں، ہاں میں کامیاب نہیں

قفس میں زمزمہ پیرا ہے رُوحِ آزادی
صدائے مرغِ قفس ہے نفیرِ خواب نہیں

اسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی، میں تو بے حجاب نہیں

سنا ہے میں نے بھی ذکرِ بہشت و حور و طہور
خدا کا شکر ہے نیت مری خراب نہیں

سخنورانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال
تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں، آفتاب نہیں

بیانِ درد کو دل چاہیے جنابِ حفیظ
فقط زبان یہاں، قابلِ خطاب نہیں

فیض احمد فیض



نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

اُدھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا، جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار! ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

فیض احمد فیض



اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے
آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے
ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے
ہے وہی عارضِ لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے
وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے
اک دفعہ بکھری تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم
دل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں ٹھہری ہے
دستِ صیاد بھی عاجز ہے، کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے
آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے
ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

فیض احمد فیض



رہِ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے
شبِ سیہ سے طلب حُسنِ یار کرتے رہے

خیالِ یار، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم اُن سے رشتۂ دل اُستوار کرتے رہے

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم اُن میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سخنِ راز دار کرتے رہے

ضیائے بزمِ جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیثِ شعلہ رُخاں بار بار کرتے رہے

اُنہیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے



گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گذری سو گذری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام فیض، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض احمد فیض



کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی، اب جام میں کم تر جاتی ہے

یوں عرض و طلب سے کب اے دل، پتھر دل پانی ہوتے ہیں
تم لاکھ رضا کی خو ڈالو، کب خوئے ستمگر جاتی ہے

بیدادگروں کی بستی ہے، یاں داد کہاں، خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد، جو در در جاتی ہے

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے، مقتل سے گذر کر جاتی ہے

اب کوچۂ دلبر کا رہرو، رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے



کئی بار اُس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں، جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کجکلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

فیض احمد فیض



بے دم ہوئے بیمار، دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو، شفا کیوں نہیں دیتے

دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صِلا کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کروگے؟
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکتہ ورو، لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو، ساز صدا کیوں نہیں دیتے

بربادیٔ دل جبر نہیں فیضؔ، کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے



دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی، شبِ غم گذار کے

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بے گانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

بُھولے سے مُسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیضؔ
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

فیض احمد فیض



گرمیٔ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو
گُل کھلے جاتے ہیں، وہ سایۂ در تو دیکھو

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہ گزر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے، تمہیں ہو جائے گی اُلفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

وہ جو اب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دلِ پُرخوں کا ہُنر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا اُفق
فیضؔ، تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو



کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں، جاں دے آئیں
دل والو، کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو، ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

حفیظ ہوشیارپوری



بیانِ راحتِ وصل و حدیثِ دردِ جدائی
یہ راہ و رسمِ محبت مجھے پسند نہ آئی

نجانے کونسی منزل میں ہے وہ دور کہ جس میں
نہ کاروبارِ گدائی نہ اہتمامِ خدائی

جو رہبری پہ تھے نازاں نجانے ان کو ہوا کیا
مرا قصور نہ تھا جز قصورِ آبلہ پائی

یہ دل کی خوبیِ قسمت، یہ تیرے غم کا مقدر
زماں زماں بیتابی، جہاں جہاں رسوائی

یہ حسنِ جذبِ محبت، یہ حاصلِ محویت
تمھی کو سامنے پایا، کبھی جو آنکھ اٹھائی

ابھی ہے ان سے تعلق برنگِ ترکِ محبت
کسی نے ذکرِ محبت کیا تو آنکھ بھر آئی

نہ اختیار زباں پر، نہ اعتبار زباں کا
جو دل میں رہ نہیں سکتی، زباں پہ بات وہ آئی

دوگونہ دردِ مسلسل، کشاکشِ بے پایاں
غمِ جہاں سے فراغت نہ تیرے غم سے رہائی

کبھی کبھی غمِ جاناں سے آب و تابِ تغزل
کبھی کبھی غمِ دوراں سے حسنِ نغمہ سرائی

یہ مرے ہم سخنوں پر کھلا نہ راز ابھی تک
کہ نغمہ شیریں تر ہے بقدرِ تلخ نوائی

کسی طرح مرے دل کو حفیظؔ چین نہ آیا
ہلاکِ گرمیٔ محفل، فسردۂ تنہائی

حفیظ ہوشیارپوری



اب کوئی آرزو نہیں، ذوقِ پیام کے سوا
اب کوئی جستجو نہیں، شوقِ سلام کے سوا

کوئی شریکِ غم نہیں، اب تری یاد کے بغیر
کوئی انیسِ دل نہیں اب ترے نام کے سوا

تیری نگاہِ مست سے مجھ پہ یہ راز کھل گیا
اور بھی گردشیں ہیں کچھ، گردشِ جام کے سوا

کاہشِ آرزو سہی حاصلِ زندگی، مگر
حاصلِ آرزو ہے کیا، سوزِ مدام کے سوا

آہ کوئی نہ کر سکا چارۂ تلخیِ فراق
نالۂ صبح کے بغیر، گریۂ شام کے سوا

رنگِ بہار پہ نہ بھول، بوئے چمن سے درگذر
یہ بھی ہیں خوشنما فریب، دانہ و دام کے سوا

مر کے حیاتِ جاوداں عشق کو مل گئی حفیظؔ
جی کے ہوس کو کیا ملا، مرگِ دوام کے سوا

حفیظ ہوشیارپوری



نہ پوچھ، کیوں مری آنکھوں میں آ گئے آنسو
جو تیرے دل میں ہے، اس بات پر نہیں آئے

وفائے عہد ہے یہ، پا شکستگی تو نہیں
ٹھہر گیا کہ مرے ہم سفر نہیں آئے

نہ چھیڑ ان کو خدا کے لیے کہ اہلِ وفا
بھٹک گئے ہیں تو پھر راہ پر نہیں آئے

ابھی ابھی وہ گئے ہیں مگر یہ عالم ہے
بہت دنوں سے وہ جیسے نظر نہیں آئے

کہیں یہ ترکِ محبت کی ابتدا تو نہیں
وہ مجھ کو یاد کبھی اس قدر نہیں آئے

عجیب منزلِ دلکش عدم کی منزل ہے
مسافرانِ عدم لوٹ کر نہیں آئے

حفیظ کب انہیں دیکھا نہیں برنگِ دگر
حفیظ کب وہ برنگِ دگر نہیں آئے



اک عمر سے ہم تم آشنا ہیں
ہم سے مہ و انجم آشنا ہیں

دل ڈوبتا جا رہا ہے پیہم
لب ہیں کہ تبسم آشنا ہیں

اُن منزلوں کا سُراغ گم ہے
جن منزلوں میں گم آشنا ہیں

کچھ چارۂ دردِ آشنائی
کس سوچ میں گم سم آشنا ہیں

اس دور میں تشنہ کام، ساقی
ہم جیسے کئی خُم آشنا ہیں

(غیر مطبوعہ)



قرارِ دل کو نہ آسودگیٔ نظر کے لیے
یہ آزمائشِ قلب و نظر، بشر کے لیے

نہ آسماں پہ نہ مژگاں پہ ہے ستارہ کوئی
شبِ سیاہ میں اندازۂ سحر کے لیے

ہنوز گوش بر آواز ہیں در و دیوار
نجانے کس کی ملاقات کی خبر کے لیے

غمِ فراق بھی ہے اور سکونِ قلب بھی ہے
جدا ہوا ہے کوئی جیسے عمر بھر کے لیے

نہ اب وہ ذوقِ طلب ہے نہ اب وہ عزمِ سفر
رواں ہے قافلہ، تسکینِ راہبر کے لیے

نظر سے حدِ نظر تک تمام تاریکی
یہ اہتمام ہے اک وعدۂ سحر کے لیے

خدا دراز کرے عمرِ اہلِ شوق حفیظؔ
کہ جی رہے ہیں کسی دورِ مختصر کے لیے



منِ و تو کا حجاب اٹھنے نہ دے اے جانِ یکتائی
کہیں ایسا نہ ہو، بن جاؤں خود اپنا تمنائی

وہی میں ہوں، وہی ہے تیرے غم کی کارفرمائی
کبھی تنہائی میں محفل، کبھی محفل میں تنہائی

نشاط انگیز ہے وہ عالمِ جذب و گریز اب تک
تری اچھی بُری ہر بات یوں تو مجھ کو یاد آئی

قصورِ ظرف سمجھوں یا شعورِ لذت اندوزی،
ترے لطف و کرم میں تشنگی ہی تشنگی پائی

نہ چھوڑا دامنِ ہوش و خرد دل نے محبت میں
سزائے دل، حصارِ آگہی کی قیدِ تنہائی

(غیر مطبوعہ)

حفیظ ہوشیارپوری



غمِ آفاق ہے رسوا، غمِ دلبر بن کے
تہمتِ عشق لگی ہم پہ، سخنور بن کے

وہ نہیں، موت سہی، موت نہیں، نیند سہی
کوئی آجائے شبِ غم کا مقدر بن کے

راہبر تم کو بنایا، ہمیں معلوم نہ تھا
راہروِ راہ بھٹک جاتے ہیں، راہبر بن کے

اس زیاں خانے میں اک قطرے پہ کیا کیا گزری
کبھی آنسو، کبھی شبنم، کبھی گوہر بن کے

موت کو نیند کے ماتوں پہ نہ کیوں رشک آئے
جاگتا ہے انہیں ہنگامۂ محشر بن کے

یاد پھر آگئیں بھولی ہوئی باتیں کیا کیا
پھر ملاقات ہوئی عیشِ مکدر بن کے

آہ، یہ عقدۂ غم، بزمِ طرب میں بھی حفیظؔ
بارہا آنکھ چھلک جاتی ہے ساغر بن کے



خوفِ تقلیدِ راہبر ہی رہا
اک قدم اس سے پیشتر ہی رہا

یوں ستارے شریکِ درد رہے
دل کو اندیشۂ سحر ہی رہا

کام آیا نہ خونِ صد منصور
دار کا نخل بے ثمر ہی رہا

دل میں اک شور سا اٹھا تھا کبھی
پھر یہ ہنگامہ عمر بھر ہی رہا

جلوہ در جلوہ حُسن تھا مستور
ماتمِ خفّتِ نظر ہی رہا

آنسوؤں کو ملی نہ راہِ خرام
دامنِ چشم تھا کہ تر ہی رہا

غمِ آفاق کا بیاں تھا حفیظؔ
گرچہ روئے سخن اُدھر ہی رہا

حفیظ ہوشیارپوری



دل کی بستی سُونی سُونی، نگر نگر آباد
اُجڑے گھر آباد ہوں یارب، اُجڑے گھر آباد

منزل پر اک سناٹا ہے، راہِ سفر آباد
راہِ سفر بھی راہبروں سے سرتا سر آباد

آہ یہ انسانوں کی بستی، آہ کہاں انسان
چلتے پھرتے سایوں سے ہیں بام و در آباد

میرے شام و سحر کی رونق زلف و رُخ کے سلسلۂ
سایۂ زلف و جلوۂ رُخ سے شام و سحر آباد

دل تو اُجڑتے بستے ہی ہیں یہ تھا کسے معلوم
ایک نظر ویران کرے گی، ایک نظر آباد

خواب میں ان کو دیکھ رہے تھے، کھُل گئی آنکھ حفیظ
خاک میں موتی رول رہی ہے چشمِ گُہر آباد



گر اس کا سلسلہ بھی عمرِ جاوداں سے ملے
کسی کو خاک سکوں مرگِ ناگہاں سے ملے

کوئی زمیں سے بھی پہنچائے آسماں کو پیام
پیام اہلِ زمیں کو تو آسماں سے ملے

خود اپنی گم شدگی سے جنھیں شکایت ہے
تو ہی بتا، انہیں تیرا نشاں کہاں سے ملے

سراغِ عمرِ گذشتہ ملے کہیں سے حفیظ
سراغِ عمرِ گذشتہ مگر کہاں سے ملے

(غیر مطبوعہ)

آنند نرائن مُلّا



یوں نظر پہ پلکوں کے چھائے ہیں گھنے سائے
جھنڈ میں درختوں کے جیسے دھوپ کھو جائے

روشنی کا لے کر نام لڑ رہے ہیں آپس میں
اِس طرف بھی کچھ سائے، اُس طرف بھی کچھ سائے

دل کی گزری یوں اکثر مصلحت کی دنیا میں
جیسے طائر اپنے پَر تولے اور رہ جائے

آنکھ میں وہی اب بھی آنسوؤں کا موسم ہے
کتنے بھنور سنولائے، کتنے چاند گہنائے

زندگی کے شایاں اب ہو چلا ہے دل شاید
آئے اشک آنکھوں میں اور تم نہ یاد آئے

یوں کسی کی یاد آئی جیسے ایک چنچل نار
گھوم گھوم کر دیکھے دیکھ دیکھ مسکائے

آہ پیریٔ مُلّا! ورنہ کیا یہ ممکن تھا؟
زیست اور نظر پھیرے پاس سے گزر جائے

آنند نرائن مُلّاؔ



جنوں کا دَور ہے کس کس کو جائیں سمجھانے
اِدھر بھی ہوش کے دشمن، اُدھر بھی دیوانے

ہر انقلاب کی سُرخی اُنھیں کے افسانے
حیاتِ دہر کا حاصل ہیں چند دیوانے

کرم کرم ہے تو ہے فیضِ عام اس کا شعار
یہ دشت ہے، وہ گلستاں، سحاب کیا جانے

کسی میں دم نہیں، اہلِ ستم سے کچھ بھی کہے
ستم زدوں کو ہر اک آ رہا ہے سمجھانے

نہ پوچھ دورِ حقیقت کی سختیوں کو نہ پوچھ
ترس گئے لبِ افسانہ گو کو افسانے

فصیلِ باغ سے یہ آندھیاں رُکیں گی کہیں
چمن کی سمت بڑھے آ رہے ہیں ویرانے

گزر گئی جو ستاروں کے دل پہ آخرِ شب
شعاعِ خندہ زنِ آفتاب کیا جانے

الگ الگ سے، اُفق پر ہیں چھوٹے چھوٹے غبار
یہ کارواں کو مرے کیا ہُوا، خدا جانے

یہ جبرِ زیست، محبت پہ کب تلک آخر
کہ دل سلام کریں اور نظر نہ پہچانے

کسے حقیقتِ ہستی کا ترجماں سمجھوں
جہاں میں جتنی زبانیں ہیں اُتنے افسانے

محبت آج بھی ہے حاصلِ حیاتِ بشر
حقیقتِ ابدی انقلاب کیا جانے

اس ارتقائے تمدن کو کیا کہوں مُلّاؔ
ہیں شمعیں شوخ تر، آوارہ تر ہیں پروانے



وہ نبض کی رفتار کہ چھٹتے ہیں پسینے
لگتے نہیں دنیا ترے جینے کے قرینے

نظروں میں ہمیں ہم تھے کسی بزم میں جب تھے
اُٹھ آئے تو بھولے سے بھی پوچھا نہ کسی نے

گرنے لگے کیا شیر کے اب ناخن و دنداں؟
گرگیست بہ ہر خوان دشغالے یہ کمینے

بن جاتے ہیں ــ تقدیر بدلتی ہے جہاں رُخ
چڑھتے ہوئے زینے ہی اُترتے ہوئے زینے

اب بن کے فلک زاد دکھاتے ہیں ہمیں آنکھ
ذرّے وہی کل جن کو اچھالا تھا ہمیں نے

میرے بھی قدم تھے سوئے عشرت کدۂ ہوش
وہ تو کہو آواز دی آشفتہ سری نے

بیکس پہ ستم توڑنے والوں میں نہ ڈھونڈو
جرأت وہ، جو خنجر کفِ سفاک سے چھینے

آنکھوں میں لیے جام، نظر آتے ہیں اکثر
در پردہ خصومت سے سُلگتے ہوئے سینے

ویران سی بستی، نہ وہ میلے نہ چراغاں
اب دیدۂ دل ہیں کہ ہیں یادوں کے دفینے

آغوش میں ساحل کی جو گزری وہ نہ پوچھو
طوفاں کو صدا دینے لگے پھر سے سفینے

مے خانے میں یوں وعظ کناں مُلّا تھا کل رات
شعلہ بہ لبارے دنگارے بہ سفینے



پھر ان گردوں نشینوں کو زمیں کی بات کہنے دے
انھیں پہلے ذرا زیرِ فلک کچھ روز رہنے دے

جہاں کے غل میں دبنے دے نہ آوازِ ضمیر اپنی
جہاں تک ہو سکے کانوں میں یہ آواز رہنے دے

تجھے مردِ یقیں! یہ ساحلِ آسانی مبارک ہو
مجھے شک ہی کی ہمت آزما موجوں میں بہنے دے

قدم رکھ شوق سے تپتی ہوئی راہِ حقیقت پر
مگر اک کہکشاں بھی سامنے نظروں کے رہنے دے

ہوائے تازہ سے زنداں نشیں اتنا ہراساں کیوں
کوئی دیوارِ بوسیدہ اگر ڈھتی ڈھینے دے

محبت مرہمِ دردِ دلِ انساں تو بن جائے
مگر ذہنِ بشر انساں کو جب انساں رہنے دے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا بھلا کیا ہے، بُرا کیا ہے
بدل اے دورِ نو قدریں مگر پہچان رہنے دے

آنند نرائن مُلّا



کرب میں پھر ہے مادرِ عالم
اِک نیا دَور لے رہا ہے جنم

جانے کیوں ہو گئے اُداس سے ہم
ہنس رہے تھے رفیقِ دو، باہم

تم وہی تم ہو اب، نہ ہم ہیں وہ ہم
انقلاباتِ زندگی کی قسم

بڑھ گیا دو دلوں میں شاید ربط
گفتگو ہوتی جاتی ہے کم کم

پھر خداؤں میں اس پہ ان بن ہے
لوٹ لے کون، ورثۂ آدم

دیکھ ذرّوں کے رُخ کی تابانی
بُجھتے تاروں کا کب تلک ماتم

حسن کی رہگزارِ جورؔ میں بھی
ہو ہی جاتے ہیں سانحاتِ کرم

تجھ سے ملنے کی ہے بچھڑ کے بھی آس
اتفاقاتِ زندگی کی قسم



خورشید گہن سے چھوٹ چکا، بدلی سے رہائی باقی ہے
طوفاں سے تو کشتی کھے لائے ساحل پہ لڑائی باقی ہے

پیروں کی کٹی بیڑی جس دم، قیدی سمجھا" آزاد ہوا"
یہ بھول گیا، گردن میں ابھی زنجیرِ طلائی باقی ہے

رہبر دونوں خطروں سے اگر بچ نکلا منزل پائے گا
اب راہ زنی تو ختم ہوئی، ہاں راہ نمائی باقی ہے

با جشنِ طرب قیدی چھٹ کر گلشن کے دوراہے پہ پہنچے
با دیدۂ نم اِس منزل پہ یاروں سے جدائی باقی ہے

اِک جنگ پہ آمادہ دنیا یہ راز نہ کب تک سمجھے گی
طاقت کی دہائی فانی ہے انساں کی اکائی باقی ہے

گردوں کے ستارے بجھنے دو، دنیا سے کہو ماتم نہ کرے
ذرّوں سے شعاعیں پھوٹیں گی، مٹی کی خدائی باقی ہے

اغیار کے قبضے سے چھٹ کر خرمن میں تو اپنی فصل آئی
اس فصل کی ملاؔ اب خالی ہموار بٹائی باقی ہے



ہموار کیا یوں گلشن بھی، ویرانے بنا کر چھوڑ دیئے
کانٹوں پہ تو کچھ بس چل نہ سکا، شاخوں سے شگوفے توڑ دیئے

ہونٹوں پہ رہا پیغامِ سحر، مٹی پہ قدم تاروں پہ نظر
راتوں میں کٹی، راتوں میں مگر خوابوں کے اجالے جوڑ دیئے

تصویرِ حقیقت کھینچ نہ سکی مجھ سے، مانا، پھر بھی میں نے
وہ ٹیڑھے میڑھے خط ہی سہی، خاکے تو بنا کر چھوڑ دیئے

صدیوں قرنوں میں انساں نے جینے کے طریقے کچھ سیکھے
جینے کے طریقے جب آئے، جینے کے ارادے چھوڑ دیئے

آزاد جہاں میں کوئی نہیں، سب قیدی ہیں، بس فرق یہ ہے
کس نے کتنے، اس زنداں کی دیوار میں روزن پھوڑ دیئے

اب آگے تیری قسمت ہے، اے قافلۂ گمراہ بشر!
میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کر چھوڑ دیئے

اس بحث کو چھوڑو خود مُلّاؔ پہنچا کہ نہ پہنچا منزل تک
لیکن اس نے بھاروں کو نئی کچھ راہیں دیں، کچھ موڑ دیئے



وہ چارۂ ستمِ روزگار کر نہ سکے
جو زندگی کو غمِ خوش گوار کر نہ سکے

بس ایک پھیکی ہنسی لب پہ تھی سو دے ڈالی
کچھ اور خدمتِ فصلِ بہار کر نہ سکے

انہیں کے دل کی دبی آگ سے ڈرا، اے محفل!
جو کھل کے بات سرِ رہ گزار کر نہ سکے

بشر ہے بندۂ الفت، غلامِ جبر نہیں
جو اہلِ دل نے کیا، تاجدار کر نہ سکے

وہ اس کے عشق کا منصب نہ پا سکے مُلّاؔ
جو اس کے نام پہ دشمن کو پیار کر نہ سکے



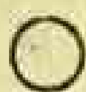
ترکِ ہر رسم کرد، وجہ یہ کافی تو نہ تھی
نگہِ شوق خطا تھی مگر ایسی تو نہ تھی

اُٹھ گئی آپ نظر، آنکھ ملائی تو نہ تھی
بھول کہہ لو اسے، دانستہ گناہی تو نہ تھی

نگہِ لطف بدلنے کا یہ ہنگام نہ تھا
لب پہ آنے کو ہنسی تھی ابھی آئی تو نہ تھی

لطفِ احباب سے کچھ مٹ تو گئی تلخیِ زیست
اس میں ہاں وہ تری آغوش کی نرمی تو نہ تھی

ہاں یہ مُلّا کو ملا، ناز مگر کیا کرتا
منصب و جاہ ترے در کی گدائی تو نہ تھی



دل کی دل کو خبر نہیں ملتی
جب نظر سے نظر نہیں ملتی

سجدۂ اوّلیں کی سرمستی
کبھی بارِ دگر نہیں ملتی

سحر آتی ہے دن کی دھوپ لیے
وہ نسیمِ سحر نہیں ملتی

جتنے لب اتنے اس کے افسانے
خبرِ معتبر نہیں ملتی

نہیں مُلّا پہ اُس فغاں کا اثر
جس میں آہِ بشر نہیں ملتی

سیّد عابد علی عابد



چین پڑتا ہے دل کو آج نہ کل — وہی اُلجھن گھڑی گھڑی پل پل
میرا جینا ہے سیج کانٹوں کی — اُن کے مرنے کا نام تاج محل
کیا سہانی گھٹا ہے ساون کی — سانوری نار، مدھ بھری، چنچل
نہ ہُوا رفع میرے دل کا غبار — کیسے کیسے برس گئے بادل
پیار کی راگنی انوکھی ہے — اس میں لگتی ہیں سب سُریں کومل
بن پیئے انکھڑیاں نشیلی ہیں — نین کالے ہیں تیرے بن کاجل
مجھے دھوکا ہوا کہ جادو ہے — پاؤں بجتے ہیں تیرے بن چھاگل
لاکھ آندھی سی چلے خیاباں میں — مُسکراتے ہیں طاقچوں میں کنول
لاکھ بجلی گرے گلستاں میں — لہلہاتی ہے شاخ میں کونپل
کِھل رہا ہے گلاب ڈالی پر — جل رہی ہے بہار کی مشعل
کوہکن سے مفر نہیں کوئی — بے ستوں ہو کہیں کہ بندھیاچل
ایک دن پتھروں کے بوجھ تلے — خود بخود گر پڑیں گے راج محل

دمِ رخصت وہ چُپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

سید عابد علی عابد



چاند ستاروں سے کیا پوچھوں، کب دن میرے پھرتے ہیں
وہ تو بچارے خود ہیں بھکاری، ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

جن گلیوں میں ہم نے سُکھ کی سیج پہ راتیں کاٹی تھیں
اُن گلیوں میں بیاکل ہو کر سانجھ سویرے پھرتے ہیں

روپ سروپ کی جوت جگانا اس نگری میں جوکھم ہے
چاروں کھونٹ بگولے بن کر گھور اندھیرے پھرتے ہیں

جن کے شیام برن سائے میں میرا من سستایا تھا
اب تک آنکھوں کے آگے وہ بال گھنیرے پھرتے ہیں

کوئی ہمیں بھی یہ سمجھا دو، اُن پر دل کیوں ریجھ گیا
تیکھی چِتون، بانکی چھب والے بہتیرے پھرتے ہیں

اک دن اُس نے نین ملا کے، شرما کے مکھ موڑا تھا
تب سے سُندر سُندر سپنے من کو گھیرے پھرتے ہیں

اس نگری کے باغ اور من کی، یارو! لیلا نیاری ہے
پنچھی اپنے سر پہ اُٹھا کر اپنے بسیرے پھرتے ہیں

لوگ تو دامن سی لیتے ہیں، جیسے ہو جی لیتے ہیں
عابد ہم دیوانے ہیں، جو بال بکھیرے پھرتے ہیں

سید عابد علی عابد



واعظِ شہر خدا ہے، مجھے معلوم نہ تھا
یہی بندے کی خطا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

غمِ دَوراں کا مداوا نہ ہوا پر نہ ہوا
ہاتھ میں کس کے شفا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

نغمہ مَے بھی نہ ہو، بانگِ بربط بھی نہ ہو
یہ بھی جینے کی ادا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

میں سمجھتا تھا جسے ہیکل و محرابِ کنشت
منبرِ نقشِ کفِ پا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

اپنے ہی ساز کی آواز پہ حیراں تھا میں
زخمۂ ساز نیا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

جس کے ایما پہ کیا شیخ نے بندوں کو ہلاک
وہی بندوں کا خدا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

خطبۂ ترغیبِ ہلاکت کا روا ہے لے دوست
شعر کہنے کی سزا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

شبِ ہجراں کی درازی سے پریشاں تھا میں
یہ تری زلفِ رسا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

وہ مجھے مشورۂ ترکِ وفا دیتے تھے
یہ محبت کی ادا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

چہرہ کھولے نظر آتی تھی عروسِ گلنار
منہ پہ شبنم کی ردا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

کفر و ایماں کی حدیں کس نے معین کی تھیں
اس پہ ہنگامہ بپا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

یہی مارِ دو زباں میرا لہو چاٹ گیا
رہنما ایک بلا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

عجب انداز سے تھا کوئی غزل خواں کل رات
عابدِ شعلہ نوا ہے، مجھے معلوم نہ تھا



نغمہ ایسا بھی مرے سینۂ صد چاک میں ہے
خوف سے حشر بپا گنبدِ افلاک میں ہے

اے جنوں، چل خمِ گیسو کی طرف، دل تو ابھی
عالمِ خواب میں آداب کے پیچاک میں ہے

وہ قفس ہو کہ نشیمن ہو، پنہ گاہ نہیں
طائرِ نغمہ گر و برقِ بلا تاک میں ہے

ساقیا! ظرف سے مشروط ہے تیرا مشرب
خون بھی جام میں ہے، زہر بھی تریاک میں ہے

تیرے خوش پوش فقیروں سے وہ ملتے تو سہی
جو یہ کہتے ہیں، وفا پیرہنِ چاک میں ہے

یہ طلسمات ہے ہر چیز گماں ہے لیکن
زرِ خالص کہ یہاں خاک میں تھا خاک میں ہے

کھلتے جاتے ہیں زمینِ چمنستان کے رموز
بُت کدہ ہو کہ حرم ہو، وہ کفِ خاک میں ہے

ہم و مرا بُت بھی یہیں، برقِ تجلی بھی یہیں
کوئی صورت ہو، صنم خانۂ ادراک میں ہے

یہ تصور ہے، ابھی عرش، ابھی فرش پہ تھا
رنگ و نیرنگ اسی توسنِ چالاک میں ہے

موجِ خوں دل سے چلی، تا سرِ مژگاں آئی
رنگِ اغیار کی تقریرِ ہوسناک میں ہے

کیا بنے صورتِ اظہارِ معانی کہ خیال
ابھی الجھا ہوا الفاظ کے پیچاک میں ہے

درِ اخلاص کی دہلیز پہ یوں خم عابدؔ
ایک جینے کا سلیقہ دلِ بے باک میں ہے

عابد علی عابد



دل کا معاملہ نگہِ آشنا کے ساتھ
ایسے ہے جیسے رابطۂ گل صبا کے ساتھ

دیکھو تو پیچ و تاب کی صورت، کہ مل گئی
شامِ فراق بھی تری زلفِ دوتا کے ساتھ

یہ کیا بہار ہے کہ دکھائی گئی مجھے
شعلوں کی آنچ بھی گلِ رنگیں قبا کے ساتھ

یہ کیا طلسم ہے کہ سنایا گیا مجھے
سازِ شکستِ دل، تری آوازِ پا کے ساتھ

اے دوستو، یہی ہے قیامت کہ روزِ حشر
ہم بھی جگائے جائیں گے خلقِ خدا کے ساتھ

گلشن میں آئی پیرہنِ رنگ بن گئی
وہ موجِ خوں کہ چہرہ کشا تھی حنا کے ساتھ

عابد بیانِ جلوۂ ناگاہ کیا کروں
خوبی ادا کے ساتھ ہے، شوخی حیا کے ساتھ



دن ڈھلا، شام ہوئی، پھول کہیں لہرائے
سانپ یادوں کے مہکتے ہوئے ڈسنے آئے

وہ کڑی دھوپ کے دن، وہ تپشِ راہِ وفا
وہ سوادِ شبِ گیسو کے گھنیرے سائے

دولتِ طبعِ سخن گو ہے امانت اس کو
جب تری چشمِ سخن ساز طلب فرمائے

جستجوئے غمِ دوراں کو خبر نکلی تھی
کہ جنوں نے غمِ جاناں کے خزینے پائے

سب مجھے مشورۂ ترکِ وفا دیتے ہیں
ان کا ایماں بھی ہو شامل، تو مزا آ جائے

کیا کہوں دل نے کہاں سینت کے رکھا ہے اُسے
نہ کبھی بھولنے پاؤں، نہ مجھے یاد آئے

میں نے حافظ کی طرح طے یہ کیا ہے عابد
"بعد ازیں مے نہ خورم بے کفِ بزم آرائے"

سید عابد علی عابد



جو بھی منجملۂ آشفتہ سراں ہوتا ہے
زینتِ محفلِ صاحب نظراں ہوتا ہے

یہی دل جس کو شکایت ہے گراں جانی کی
یہی دل کارگہِ شیشہ گراں ہوتا ہے

شاخِ گلزار کے سائے میں کہاں دم لیجے
کہ یہاں خون کا سیلِ گزراں ہوتا ہے

کس کو دکھلائیے اپنوں کی ملامت کا سماں
کہ یہ اسلوبِ حدیثِ دگراں ہوتا ہے

کس کو بتلائیے وہ رابطۂ ناز و نیاز
ان کی محفل میں جو لطفِ بیدہ وراں ہوتا ہے

کبھی کرتی ہے تجلّی نگرانی دل کی
کبھی دل سوئے تجلی نگراں ہوتا ہے

مجھ پہ اترتے ہیں غمِ دل کے صحیفے نازل
جن میں افسانۂ عالی گہراں ہوتا ہے

دل بھی دیتا ہے مجھے مشورۂ ترکِ وفا
کچھ تقاضائے جہانِ گزراں ہوتا ہے

میں تو ہوں شیفتۂ رنگِ غزل عابدؔ
کہ یہی شاہدِ خونیں جگراں ہوتا ہے



ہم بن غمِ یار بھی جیتے ہیں
مرنے کے بڑے جتن کئے ہیں

مخفی تجھ سے بھی ہیں غمِ یار
کچھ وار جو دل نے سہہ لیے ہیں

دل سے بھی چھپا کے ہم نے رکھے
کچھ چاک جو عمر بھر سیے ہیں

کچھ خونِ وفا سے، کچھ جفا سے
کیا رنگ بہار نے لیے ہیں

افسوس ہماری سخت جانی
احباب نے بھی گلے کئے ہیں

گلشن میں عجب ہوا چلی ہے
پھولوں نے ہونٹ سی لیے ہیں

دل باختگی و شعر خوانی
دو کام تو عمر بھر کئے ہیں

کہتے تھے تجھی کو جان اپنی
اور تیرے بغیر بھی جیے ہیں

سید عابد علی عابد



ریت کی طرح کناروں پہ ہیں ڈرنے والے
موج در موج گئے پار اترنے والے

آج کانٹوں سے گریبان چھڑائیں تو سہی
لالہ و گل پہ کبھی پاؤں نہ دھرنے والے

روپ سے، چھب سے، بچپن سے کوئی آگاہ نہیں
نقش کارِ لب و عارض ہیں سنورنے والے

کوئی جینے کا سلیقہ ہو تو میں بھی جانوں
موت آسان ہے مر جاتے ہیں مرنے والے

میرے جینے کا یہ اسلوب پتہ دیتا ہے
کہ ابھی عشق میں کچھ کام ہیں کرنے والے



گلوں کی خوں شدگی کو شگفتگی نہ سمجھ
ہجومِ رنگ سے اندازۂ بہار نہ کر

کچھ احترام بھی کر غم کی وضعداری کا
گراں ہے عرضِ تمنا تو بار بار نہ کر

وہ اور پرسشِ اہلِ وفا؟ فریب نہ کھا
دل اور ترکِ غمِ یار؟ اعتبار نہ کر

خزاں کے سینکڑوں منظر ہیں اے فریبِ خیال
طلوعِ صبحِ بہاراں کا اعتبار نہ کر

احسان دانش



کل رات کچھ عجیب سماں غم کدے میں تھا
میں جس کو ڈھونڈتا تھا، مرے آئینے میں تھا

جس کی نگاہ میں تھیں ستاروں کی منزلیں
وہ میرِ کائنات اسی قافلے میں تھا

رہگیر سُن رہے تھے یہ کس جشنِ نو کا شور
کل رات میرا ذکر یہ کس سلسلے میں تھا

رقصاں تھے رِند، جیسے بھنور میں شفق کے پھول
جو پاؤں پڑ رہا تھا، بڑے قاعدے میں تھا

چھڑکا ہے جسے عدم کے سمندر پہ آپ نے
صحرا تمام خاک کے اس بلبلے میں تھا

منت گزارِ اہلِ ہوس ہو سکا نہ دل
حائل مرا ضمیر مرے راستے میں تھا

ہے فرض اس عطائے جنوں کا بھی شکریہ
لیکن یہ بے شمار کرم کس صلے میں تھا

اب آکے کہہ رہے ہو کہ رسوائی سے ڈرو
یہ بال تو کبھی کا مرے آئینے میں تھا

سنتا ہوں، سرنگوں تھے فرشتے مرے حضور
میں جانے اپنی ذات کے کس مرحلے میں تھا

ہیں ثبت میرے دل پہ زمانے کی ٹھوکریں
میں ایک سنگِ راہ تھا، جس راستے میں تھا

کچھ بھی نہ تھا ازل میں، بجز شعلۂ وجود
ہاں دُور تک عدم کا دھواں حاشیے میں تھا

میں نے جو اپنا نام پکارا تو ہنس پڑا
یہ مجھ سا کون شخص مرے راستے میں تھا

تھی نقطۂ نگاہ تک آزادیٔ عمل
پرکار کی طرح میں رواں دائرے میں تھا

زنجیر کی صدا تھی نہ موجِ شمیمِ زُلف!
یہ کیا طلسم اُن کے مرے فاصلے میں تھا

اب روح اعترافِ بدن سے ہے منحرف
اک یہ بھی سنگِ میل مرے راستے میں تھا

دانش کئی نشیب نظر سے گزر گئے
ہر رند آئینے کی طرح میکدے میں تھا

احسان دانش



نہ سیو ہونٹ، نہ خوابوں میں صدا دو ہم کو
مصلحت کا یہ تقاضا ہے، بھلا دو ہم کو

جرمِ سُقراط سے ہٹ کر نہ سزا دو ہم کو
زہر رکھا ہے تو یہ آبِ بقا دو ہم کو

بستیاں آگ میں بہہ جائیں کہ پتھر برسیں
ہم اگر سوئے ہوئے ہیں تو جگا دو ہم کو

ہم حقیقت ہیں تو تسلیم نہ کرنے کا سبب؟
ہاں اگر حرفِ غلط ہیں تو مٹا دو ہم کو

خضر مشہور ہو، الیاس بنے پھرتے ہو
کب سے ہم گم ہیں، ہمارا تو پتا دو ہم کو

زیست ہے اس سحر و شام سے بیزار و زبوں
لالہ و گل کی طرح رنگِ قبا دو ہم کو

شورشِ عشق میں ہے حسن برابر کا شریک
سوچ کر جرمِ تمنا کی سزا دو ہم کو

جرأتِ لمس بھی امکانِ طلب میں ہے مگر
یہ نہ ہو، اور گنہگار بنا دو ہم کو

کیوں نہ اِس شب سے نئے دَور کا آغاز کریں
بزمِ خوباں سے کوئی نغمہ سرا دو ہم کو

مقصدِ زیست غمِ عشق ہے صحرا ہو کہ شہر
بیٹھ جائیں گے، جہاں چاہو بٹھا دو ہم کو

ہم چٹانیں ہیں، کوئی ریت کے ساحل تو نہیں
شوق سے شہر پناہوں میں لگا دو ہم کو

بھیڑ بازارِ سماعت میں ہے نغموں کی بہت
جس سے تُم سامنے ابھرو، وہ صدا دو ہم کو

کون دیتا ہے محبت کو پرستش کا مقام
تم یہ انصاف سے سوچو تو دُعا دو ہم کو

آج ماحول کو آرائشِ جاں سے ہے گریز
کوئی دانش کی غزل لا کے سُنا دو ہم کو



کبھی کبھی جو وہ غربت کدے میں آئے ہیں
مرے بہے ہوئے آنسو جبیں پہ لائے ہیں

نہ سرگذشتِ سفر پوچھ، مختصر یہ ہے
کہ اپنے نقشِ قدم ہم نے خود مٹائے ہیں

نظر نہ توڑ سکی آنسوؤں کی چلمن کو
وہ روز اگرچہ میرے آئینے میں آئے ہیں

اُس ایک شمع سے اترے ہیں بام و در کے لباس
اُس ایک لَو نے بڑے پھول بن جلائے ہیں

یہ دوپہر، یہ زمیں پر لپا ہوا سورج
کہیں درخت نہ دیوار و در کے سائے ہیں

کلی کلی میں ہے دھرتی کے دودھ کی خوشبو
تمام پھول اسی ایک ماں کے جائے ہیں

نظر خلاؤں پہ اور انتظارِ بے وعدہ
بہ ایں عمل بھی وہ آنکھوں میں جھلملائے ہیں

فسونِ شعر سے ہم اُس مہِ گریزاں کو
خلاؤں سے سرِ کاغذ اتار لائے ہیں

رسالہ ہاتھ سے رکھتے نہ کیوں وہ شرما کر
غزل پڑھی ہے تو ہم سامنے بھی آئے ہیں

چلے ہیں خیر سے ان کو پکارنے دانشؔ
مگر وہ یوں تو نہ آئیں گے اور نہ آئے ہیں



کچھ لوگ جو سوار ہیں کاغذ کی ناؤ پر
تہمت تراشتے ہیں ہوا کے دباؤ پر

موسم ہے سرد مہر، لہو ہے جماؤ پر
چوپال چپ ہے، بھیڑ لگی ہے الاؤ پر

سب چاندنی سے خوش ہیں، کسی کو خبر نہیں
پھیلا ہے ماہتاب کا گردوں کے گھاؤ پر

اب وہ کسی بساط کی فہرست میں نہیں
جن من چلوں نے جان لگا دی تھی داؤ پر

سورج کے سامنے ہیں نئے دن کے مرحلے
اب بات جا چکی ہے گزشتہ پڑاؤ پر

گلدان پر ہے نرم سویرے کی زرد دھوپ
حلقہ بنا ہے کانپتی کرنوں کا گھاؤ پر

یوں خود فریبیوں میں سفر ہو رہا ہے طے
بیٹھے ہیں پُل پہ اور نظر ہے بہاؤ پر

موسم سے ساز غیرتِ گلشن ہے بے نیاز
حیرت ہے مجھ کو اپنے چمن کے سبھاؤ پر

کیا دور ہے کہ مرہمِ زنگار کی جگہ
اب چارہ گر شراب چھڑکتے ہیں گھاؤ پر

تاجر یہاں اگر ہیں، یہی غیرتِ یہود
پانی بکے گا خونِ شہیداں کے بھاؤ پر

پہلے کبھی رواج بنی تھی نہ بے حسی
نادم بگاڑ پر ہیں نہ خوش ہیں بناؤ پر

ہر رنگ سے پیام اترتے ہیں روح میں
پڑتی ہے جب نگاہ دھنک کے جھکاؤ پر

دانشؔ مرے شریکِ سفر ہیں وہ کج مزاج
ساحل نے جن کو پھینک دیا ہے بہاؤ پر

احسان دانش



یوں اس پہ مری عرضِ تمنا کا اثر تھا
جیسے کوئی سُورج کی تپش میں گُلِ تر تھا

اٹھتی تھیں دریچوں پہ ہماری بھی نگاہیں
اپنا بھی کبھی شہرِ نگاراں میں گزر تھا

ہم جس کے تغافل کی شکایت کو گئے تھے
آنکھ اس نے اٹھائی تو جہاں زیر و زبر تھا

شانوں پہ کبھی تھے ترے بھیگے ہوئے رُخسار
آنکھوں پہ کبھی میری، ترا دامن تر تھا

خوشبو سے معطر ہے ابھی تک وہ گزرگاہ
صدیوں سے یہاں جیسے بہاروں کا نگر تھا

ہے ان کے سراپا کی طرح خوش قد و خوش رنگ
وہ سرو کا پودا جو سرِ راہ گزر تھا

قطرے کی ترائی میں تھے طوفاں کے نشیمن
ذرّے کے احاطے میں بگولوں کا بھنور تھا

اس آدمِ خاکی پہ ستاروں کی نظر تھی
اس خاک پہ کچھ جلوۂ یزداں کا اثر تھا

میں رویا تو ہنسنے کی صدا آئی کئی بار
وہ جانِ تمنا پسِ دیوارِ نظر تھا

دانش تھا اکہرا مرا پیراہنِ ہستی
بے پردہ زمانے پہ مرا عیب و ہنر تھا



وفا کا عہد تھا دل کو سنبھالنے کیلئے
وہ ہنس پڑے مجھے مشکل میں ڈالنے کیلئے

بندھا ہوا ہے بہاروں کا اب وہیں تانتا
جہاں رُکا تھا میں کانٹے نکالنے کیلئے

کوئی نسیم کا نغمہ، کوئی شمیم کا راگ
فضا کو امن کے قالب میں ڈھالنے کیلئے

خدا نکردہ، زمیں پاؤں سے اگر کھسکی
بڑھیں گے قد بگولے سنبھالنے کیلئے

اتر پڑے ہیں کدھر سے یہ ادھ کھلے جلوں
سمندروں سے جزیرے نکالنے کیلئے

ترے سلیقۂ ترتیبِ نو کا کیا کہنا
ہمیں تھے قریۂ دل سے نکالنے کیلئے؟

کبھی ہماری ضرورت پڑے گی دُنیا کو
دلوں کی برف کو شعلوں میں ڈھالنے کیلئے

یہ شعبدے ہی سہی کچھ فسوں گروں کو بلاؤ
نئی فضا میں ستارے اچھالنے کیلئے

ہے صرف ہمکو ترے خال و خد کا اندازہ
یہ آئینے تو ہیں حیرت میں ڈالنے کیلئے

نہ جانے کتنی مسافت سے آئیگا سورج
نگارِ شب کا جنازہ نکالنے کیلئے

میں پیشرو ہوں اسی خاک سے اُگیں گے چراغ
نگاہ و دل کے افق کو اجالنے کیلئے

فصیلِ شب سے کوئی ہاتھ بڑھنے والا ہے
فضا کی جیب سے سورج نکالنے کیلئے

کنوئیں میں پھینک کے پچھتا رہا ہوں اے دانش
کمند تھی جو مناروں پہ ڈالنے کیلئے



جبیں کی دھول، جگر کی جلن چھپائے گا
شروعِ عشق ہے، وہ فطرتاً چھپائے گا

دمک رہا ہے جو نس نس کی تشنگی سے بدن
اس آگ کو نہ ترا پیرہن چھپائے گا

ترا علاج شفا گاہِ عصرِ نو میں نہیں
خرد کے گھاؤ تو دیوانہ پن چھپائے گا

حصارِ ضبط ہے ابرِ رواں کی پرچھائیں
ملالِ روح کو کب تک بدن چھپائے گا

نظر کا فردِ عمل سے ہے سلسلہ درکار
یقیں نہ کر، یہ سیاہی کفن چھپائے گا

کسے خبر تھی کہ یہ دورِ خود غرض اک دن
جنوں سے قیمتِ دار و رسن چھپائے گا

ترا غبار زمیں پر اترنے والا ہے
کہاں تک اب یہ بگولہ تھکن چھپائے گا

کھلے گا بادِ نفس سے جو رخ پہ نیل کنول
اسے کہاں ترا اُجلا بدن چھپائے گا

ترے کمال کے دھبے، ترے عروج کے داغ
چھپائے گا تو کوئی اہلِ فن چھپائے گا

جسے ہے فیض مری خانقاہ سے دانشؔ
وہ کس طرح مرا رنگِ سخن چھپائے گا



رنگِ تہذیب و تمدن کے شناسا ہم بھی ہیں — صورتِ آئینہ مرہونِ تماشا ہم بھی ہیں
حال و مستقبل کا کیا ہمکو سبق دیتے ہیں آپ — اس قدر تو واقفِ امروز و فردا ہم بھی ہیں
بادلِ ناخواستہ بنتے ہیں دنیا کے لئے — ورنہ سچ یہ ہے پشیمانِ تمنا ہم بھی ہیں
کچھ سفینے ہیں کہ طوفاں ہے جنکا ساز باز — دیکھنے والوں میں اک حیرانِ دریا ہم بھی ہیں
دیکھنا ہے دیکھ لو اٹھتی ہوئی محفل کا رنگ — صبح کے بجھتے چراغوں کا سنبھالا ہم بھی ہیں
کاغذی ملبوس میں ابھری ہے ہر شکلِ حیات — ریت کی چادر پہ اک نقشِ کفِ پا ہم بھی ہیں
جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں آثارِ قدیم — پی گئیں جنکو گذرگاہیں وہ دریا ہم بھی ہیں
اس حرم کی زیب و زینت کو خدا رکھے مگر — مجرمانِ عہد و پیمانِ کلیسا ہم بھی ہیں
ہم سے گونجا ہے عدم آباد کا دشتِ سکوت — عالمِ ارواح کا پہلا دھماکا ہم بھی ہیں
ہم جب اٹھ جائیں گے یہ عقدہ بھی حل ہو جائیگا — رونقِ محفل چراغوں کے علاوہ ہم بھی ہیں
خاک کیوں ہوتا نہیں جل کر حصارِ آب و گل — یہ اگر سچ ہے ترے جلووں کا پردہ ہم بھی ہیں
ہم پہ جانے کونسا طوفان تھوپا جائے گا — جانے کس تعزیر کی خاطر گوارا ہم بھی ہیں

یہ سرِ فہرست اور احسان دانشؔ، شاد باش
مجرموں میں آپ کے نزدیک گویا ہم بھی ہیں

احسان دانش



جینے کے لئے جو مر رہے ہیں
آغازِ حیات کر رہے ہیں

ہے حسن کا نام مفت بدنام
لوگ اپنی طلب میں مر رہے ہیں

غنچوں کی طرح کھلے تھے کچھ لوگ
کرنوں کی طرح بکھر رہے ہیں

ہے نقشِ قدم پہ نقشِ زنجیر
دیوانے جدھر گزر رہے ہیں

سنتا ہوں کہ آپ کے وفادار
انجامِ وفا سے ڈر رہے ہیں

ساحل کو بھی چھوڑتے نہیں لوگ
کشتی پہ بھی پاؤں دھر رہے ہیں

اب دشت میں نرم رو ہوا ہے
کچھ نقشِ قدم نکھر رہے ہیں

روحوں میں نئی سحر کے باعث
ذہنوں کے نشے اتر رہے ہیں

ہم جیسے تمام نام لیوا
دھبا ترے نام پر رہے ہیں

خوشبو سے لدی بہار میں بھی
ہم درد سے بہرہ ور رہے ہیں

ہر دور کے فن شناس دانش
ناکامِ حصولِ زر رہے ہیں



اپنی رسوائی کا احساس تو اب کچھ بھی نہیں
یہ اجالوں کے جزیرے یہ سرابوں کے دیار
بہہ گئے وقت کے سیلاب میں جیسے جھاگ
ریزہ ریزہ ہے کسی خوابِ افشاں کا طلسم
میرے آنسو نہیں کرتے ہیں اجاگر کچھ اور
ہم پہ تو صبح سے روشن تھی یہ شام کی کیفیت
شہرِ دل شہرِ خموشاں کی طرح ہے گنجان
یہ جہاں عالمِ اسباب ہے، ناداں نہ بنو
رنگ و بو گل سے بکھر جائیں تو رہتا کیا ہے
خول ہی خول ہے نوخیز دبستانِ خیال
گم رہو گم، کہ یہاں جرم ہے اظہارِ کمال
میری تحریر سے یاروں کا بھلا کیا ہوگا !

ہر نفس ہی اُن میں ناخوشی کا سبب کچھ بھی نہیں
سحر و افسوں کے سوا جشنِ طرب کچھ بھی نہیں
اب وہ چشم، نہ رخسار، نہ لب، کچھ بھی نہیں
فصلِ گل، انجم و مہتاب، یہ سب کچھ بھی نہیں
پہلے جو لوگ کبھی کچھ تھے اور اب کچھ بھی نہیں
نکو اس شام سے اندازۂ شب کچھ بھی نہیں
کتنا آباد! مگر شور و شغب کچھ بھی نہیں
کون مانے گا، تباہی کا سبب کچھ بھی نہیں
آگ بجھ جائے تو سورج کا لقب کچھ بھی نہیں
شور ہی شور ہے تخلیقِ ادب کچھ بھی نہیں
چپکے چپکے کہ یہاں نام و نسب کچھ بھی نہیں
میری پونجی تو بجز ذوقِ ادب کچھ بھی نہیں

اُس طرف وا ہے درِ رحمتِ یزداں دانش
اِس طرف وسعتِ دامانِ طلب کچھ بھی نہیں

صوفی تبسم



ہر ایک نقش ترے پاؤں کا نشاں سا ہے
ہر ایک راہگذر تیرا آستاں سا ہے

کہیں سمٹ کے نہ رہ جائے ہمتِ پرواز
کہ شاخ شاخ پہ پنہاں اک آشیاں سا ہے

ابھی گلوں کی نظر سے نظر نہیں ملتی
ابھی فضائے چمن میں دھواں دھواں سا ہے

نہ جانے شوق کی وہ رات کٹ گئی کیسے
ہر ایک لمحہ جہاں عمرِ جاوداں سا ہے

اُجڑ گئی ہے مری کائناتِ دل پھر بھی
مری نگاہ میں آباد اک جہاں سا ہے

زباں پہ نام بھی آتا ہے تیرا رُک رُک کر
ہر ایک تارِ نفس دل کا پاسباں سا ہے

یہ کس نے آج جگائی ہے عہدِ رفتہ کی یاد
یہ کون دل کے قریں آج نوحہ خواں سا ہے

لگے ہیں دل سے اُبھرنے وفا کے افسانے
کہ اپنے حال پہ پھر کوئی مہرباں سا ہے

صوفی تبسّم



سکونِ قلب و شکیبِ نظر کی بات کرو
گزر گئی ہے شبِ غم، سحر کی بات کرو

دلوں کا ذکر ہی کیا ہے، ملیں ملیں نہ ملیں
نظر ملاؤ نظر سے، نظر کی بات کرو

شگفتہ ہو نہ سکے گی فضائے ارض و سما
کسی کی جلوہ گہِ بام و در کی بات کرو

حریمِ ناز کی خلوت میں دسترس ہے کسے
نظارہ ہائے سرِ رہگزر کی بات کرو

بدل نہ جائے کہیں التفاتِ حسن کا رنگ
حلاوتِ نگہِ مختصر کی بات کرو

جہانِ ہوش و خرد کے معاملے ہیں دراز
کسی کے گیسوئے آشفتہ سر کی بات کرو

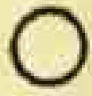
نگاہِ ناز ہے اک کائناتِ راز و نیاز
جدھر کرے وہ اشارہ، اُدھر کی بات کرو

سرورِ زیست ہوا جس کے دَم قدم سے نصیب
اُسی ندیم، اُسی ہمسفر کی بات کرو

وہ جس سے تلخیٔ زہرابِ غم گوارا ہے
اسی تبسمِ شیریں اثر کی بات کرو



کاوشِ بیش و کم کی بات نہ کر
چھوڑ، دام و درم کی بات نہ کر
دیکھ کیا کر رہے ہیں اہلِ زمیں
آسماں کے ستم کی بات نہ کر
اپنی آہ و فغاں کے سوز کو دیکھ
ساز کے زیر و بم کی بات نہ کر
یوں بھی طوفانِ غم ہزاروں ہیں
عشق کی، چشمِ نم کی بات نہ کر
سخت الجھی ہیں زیست کی راہیں
زلف کے پیچ و خم کی بات نہ کر
آج سود و زیاں کا سودا ہے
آج دیر و حرم کی بات نہ کر
دیکھ فرہاد کی تنک نوشی
وسعتِ جامِ جم کی بات نہ کر
ہم نے دیکھا ہے ظرفِ اہلِ کرم
ہم سے اہلِ کرم کی بات نہ کر
شب کی رنگینیوں کا ذکر نہ چھیڑ
حالتِ صبحدم کی بات نہ کر
آج مت چھیڑ غم کے افسانے
آج اے دوست، غم کی بات نہ کر
چھن نہ جائے ترا تبسّمِ لب
میرے درد و الم کی بات نہ کر



ہزار گردشِ شام و سحر سے گزرے ہیں
وہ قافلے جو تری رہگذر سے گزرے ہیں
ابھی ہوس کو میسّر نہیں دلوں کا گداز
ابھی یہ لوگ مقامِ نظر سے گزرے ہیں
ہر ایک نقش پہ تھا تیرے نقشِ پا کا گماں
قدم قدم پہ تری رہگذر سے گزرے ہیں
نہ جانے کونسی منزل پہ جا کے رک جائیں
نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں
رحیلِ شوق سے لرزاں تھا زندگی کا شعور
نہ جانے کس لئے ہم بیخبر سے گزرے ہیں
کچھ اور پھیل گئیں درد کی کٹھن راہیں
غمِ فراق کے مارے جدھر سے گزرے ہیں
جہاں سرور میسّر تھا جام و مے کے بغیر
وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں



تو نے کچھ بھی نہ کہا ہو جیسے
میرے ہی دل کی صدا ہو جیسے

یوں تری یاد سے جی گھبرایا
تُو مجھے بھول گیا ہو جیسے

اس طرح تجھ سے کئے ہیں شکوے
مجھ کو اپنے سے گلا ہو جیسے

یوں ہر اک نقش پہ جھکتی ہے جبیں
تیرا نقش کفِ پا ہو جیسے

تیرے ہونٹوں کی خفی سی لرزش
اک حسیں شعر ہؤا ہو جیسے



کیا ہوا جو ستارے چمکتے نہیں، داغ دل کے فروزاں کرو دوستو
صبحِ عشرت پریشاں ہوئی سو ہوئی، شامِ غم تو نہ ویراں کرو دوستو

ناشناساؤں کی طرفہ غم خواریاں، غم کے ماروں کا سب سے بڑا روگ ہے
دردِ اُلفت کی چارہ گری ہو نہ ہو، پہلے اس دکھ کا درماں کرو دوستو

تملاتی رہیں ہجر کی کلفتیں، جام و مینا کی سرمستیاں کیا ہوئیں
اب یہ مے بھی غموں کا مداوا نہیں، اب کوئی اور ساماں کرو دوستو

میری الفت کی سن سن کے رسوائیاں، لوگ کرتے ہیں آپس میں سرگوشیاں
تم اگر اتفاقاً سنو، چپ رہو، مجھ پہ یہ ایک احساں کرو دوستو



اٹھی ہے جو قدموں سے وہ دامن سے اڑی ہے
کیا کیا نگہِ شوق پہ زنجیر پڑی ہے

وہ یاس کا عالم ہے کہ ہر ایک نظر پر
محسوس یہ ہوتا ہے، جدائی کی گھڑی ہے

یوں دیکھئے تو مرحلۂ شوق ہے یک گام
چلیے تو یہی ایک قدم راہ کڑی ہے

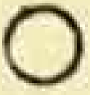
ہر ایک قدم پر ہے کسی یاد کا سایہ
ہر راہ گزر میں کوئی دیوار کھڑی ہے

ہر غنچے کے چہرے سے ابھرتے ہیں ترے نقش
ہر گل میں ترے حسن کی تصویر جڑی ہے

کھیلی تھی کبھی حسن سے تیرے نگہِ شوق
اتنا ہے مجھے یاد، یہی بات بڑی ہے

ناصح! تری باتوں سے کٹی ہجر کی یہ شام
اک اور فسانہ کہ ابھی رات پڑی ہے

کیا جانیے کیا تھا ترا انداز تبسمؔ
ہر دیکھنے والے کی نظر مجھ پہ پڑی ہے



نظر میں ڈھل کے ابھرتے ہیں دل کے افسانے
یہ اور بات ہے، دنیا نظر نہ پہچانے

وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے

یہ کیا بہار کا جوبن، یہ کیا نشاط کا رنگ
فسردہ میکدے والے، اداس میخانے

مرے ندیم! تری چشمِ التفات کی خیر
بگڑ بگڑ کے سنورتے گئے ہیں افسانے

یہ کس کی چشمِ فسوں ساز کا کرشمہ ہے
کہ لوٹ کر بھی سلامت ہیں دل کے تخانے

نگاہِ ناز میں دلسوزیِ نیاز کہاں
یہ آشنائے نظر ہیں دلوں سے بیگانے

ہیں تیرے شہرِ محبت میں ہوں وہ بیگانہ
کہ آشنا بھی جسے دیکھ کر نہ پہچانے

وہ دیکھتے ہیں تبسمؔ مرے لبوں کی ہنسی
جو میرے دل پہ گزرتی ہے، کوئی کیا جانے



یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکیبا نہ کر سکو

ایسا نہ ہو، یہ درد بنے دردِ لا دوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

شاید تمہیں بھی چین نہ آئے مرے بغیر
شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو

کیا جانے، پھر ستم بھی میسر ہو یا نہ ہو
کیا جانے، یہ کرم بھی کرو یا نہ کر سکو

اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو جستجو
میرے سوا کسی کی تمنا نہ کر سکو



نالۂ صبا تنہا، پھول کی ہنسی تنہا
اس چمن کی دنیا میں، ہے کلی کلی تنہا

رات دن کے ہنگامے، اک مہیب تنہائی
صبحِ زیست بھی تنہا، شامِ زیست بھی تنہا

کون کس کا غم کھائے، کون کس کو بہلائے
تیری بے کسی تنہا، میری بے بسی تنہا

دیکھیے تو ہوتے ہیں سارے ہمقدم، رہرو
کاٹیے تو کٹتی ہے راہِ زندگی تنہا

چارہ ساز ہو کر بھی، حسن کے یہ تیور ہیں
درد سے تڑپتا ہے سوزِ عاشقی تنہا

معین احسن جذبی

شریکِ محفلِ دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستمگرو! ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں

رواں دواں یونہی اے ننھی بوندیوں کے ابر
کہ اس دیار میں اُجڑے چمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنوں کے پاؤں
ابھی منازلِ رنج و محن کچھ اور بھی ہیں

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

ابھی تو ہیں دلِ شاعر میں سیکڑوں ناسور
ابھی تو معجزہ ہائے سخن کچھ اور بھی ہیں

دلِ گداز نے آنکھوں کو دے دیے آنسو
یہ جانتے ہوئے، غم کے چلن کچھ اور بھی ہیں

معین احسن جذبی



بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اِک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں
ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں
سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشئ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں
ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بیباکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں
افسردگئ ضبطِ الم آج بھی سہی
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں
ہر فتح کے غرور میں، بے وجہ، بے سبب
احساسِ انفعالِ ہزیمت کہاں سے لائیں
آسودگئ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں
وہ جوشِ اضطراب پہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں، ندامت کہاں سے لائیں
ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
نا آزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں
ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں
سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں



تاریکیوں کا راز نمایاں ہوا تو کیا
ایک اک نفس کی لو سے چراغاں ہوا تو کیا

روشن ہوئے نہ پھر بھی در و بامِ آرزو
ایک ایک اشک مہرِ درخشاں ہوا تو کیا

مہکا نہ کوئی پھول، نہ چٹکی کوئی کلی
دل غمزدہ ہو کے صرفِ گلستاں ہوا تو کیا

چمکیں نہ آندھیاں، نہ بگولے کہیں اٹھے
اپنا جنوں محیطِ بیاباں ہوا تو کیا

کچھ اُڑتیں، دامنِ گل و بلبل کی دھجیاں
اپنا ہی تار تار گریباں ہوا تو کیا

جن کے لئے ہیں بے سر و سامانیاں بھی عیش
ان کی نظر میں بے سر و ساماں ہوا تو کیا

صحنِ چمن میں کون تھا ہم راز و ہم نوا
جذبیؔ ہزار طرح غزل خواں ہوا تو کیا



زندگی ہے تو بہر حال بسر بھی ہو گی
شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہو گی

پرسشِ غم کو وہ آئے تو اک عالم ہو گا
دیدنی کیفیتِ قلب و جگر بھی ہو گی

منزلِ عشق پہ یاد آئینگے کچھ راہ کے غم
مجھ سے لپٹی ہوئی کچھ گردِ سفر بھی ہو گی

ہو گا افسردہ ستاروں میں کوئی نالۂ صبح
غنچہ و گل میں کہیں بادِ سحر بھی ہو گی

دل اگر دل ہے تو جس راہ پہ لے جائیگا
دردمندوں کی وہی راہ گزر بھی ہو گی



کیا جانے ذوق و شوق کے بازار کیا ہوئے
یوسف پکارتا ہے، خریدار کیا ہوئے

گستاخیٔ نگاہِ تمنا کدھر گئی
تعزیرِ درد کے وہ سزاوار کیا ہوئے

صبر آزما وہ شوقِ نظارہ کہاں گیا
آسودگانِ سایۂ دیوار کیا ہوئے

ہر سانس بوئے بادہ، نہ ہر گام لغزشیں
جانے وہ محتسب کے گنہگار کیا ہوئے

دے تو کوئی تبسمِ دوراں کو پھر جواب
وہ میرے درد و غم کے طرفدار کیا ہوئے

تھا جن کے پاس زخم کا مرہم، کہاں گئے
جو دل کو جوڑتے تھے وہ معمار کیا ہوئے

ڈھونڈھو تو کچھ ستارے ابھی ہونگے عرش پر
دیکھو تو وہ حریفِ شبِ تار کیا ہوئے

دھوکا نہ تھا نظر کا تو پھر اے شبِ دراز
وہ ہلکے ہلکے صبح کے آثار کیا ہوئے

جذبیؔ کہاں گئیں وہ تری دل فریبیاں
ڈوبے ہوئے وہ سوز میں اشعار کیا ہوئے



چمن میں تھے جو چمن ہی کی داستان سنتے
کوئی نوا، کوئی نغمہ، کوئی فغاں سنتے

قدم نہ چھوٹتے راہوں کو تا بہ منزلِ شوق
ہماری بات جو یہ اہلِ کارواں سنتے

ترے قلم سے تو گلزارِ بے نوا کا قفس
تری زباں سے بھی کچھ حالِ بے زباں سنتے

ہمارے درد کا طوفاں کہاں کہاں نہ اٹھا
یہ شور آپ جہاں چاہتے، وہاں سنتے

اک عمر اپنی بھی گزری ہے اے چمن والو
گلوں کے کنج میں اندیشۂ خزاں سنتے

کسی کا رنج، کسی کا الم، کسی کا ملال
اب اور کیا تھا جو ہم زیرِ آسماں سنتے

گلوں سے بچ کے چلے، بلبلوں سے کترائے
وہ میرا قصۂ منحوس کہاں کہاں سنتے

کچھ اس میں اپنا بھی سوزِ بیاں تھا اے جذبیؔ
وگرنہ لوگ کب افسانۂ جہاں سنتے



جب کبھی کسی گل پر اک ذرا نکھار آیا
کم نگاہ یہ سمجھے، موسمِ بہار آیا

اس افق کو کیا کہیے، نور بھی دھندلکا بھی
بارہا کرن پھوٹی، بارہا غبار آیا

ہم نے غم کے ماروں کی محفلیں بھی دیکھی ہیں
ایک غمگسار اٹھا، ایک غمگسار آیا

یوں تو سیکڑوں غم تھے پر غمِ جہاں جذبی
بعد ایک مدت کے دل کو سازگار آیا



سروِ سمن بھی، موجِ نسیمِ سحر بھی ہے
اے گل ترے چمن میں کوئی چشمِ تر بھی ہے

سایہ ہے زندگی پہ وہ یاس و امید کا
ہر شب، شبِ دراز بھی ہے، مختصر بھی ہے

کچھ دیر پی لیں کاکل و عارض کی چھاؤں میں
جادوئے شام بھی ہے، فسونِ سحر بھی ہے

دنیا سنے تو قصۂ غم ہے بہت طویل
ہاں تم سنو تو قصۂ غم مختصر بھی ہے

(۷)

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی۔ ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں۔ اب دنیا دنیا کون کرے

○

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں، آہوں میں اشارہ کرتے ہیں

کیا تجھ کو پتہ، کیا تجھ کو خبر، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی! ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موجِ بلا! اِن کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

کیا جانیے کب یہ پاپ کٹے، کیا جانیے وہ دن کب آئے
جس دن کے لئے ہم اے جذبی، کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

مخدوم محی الدین

○

گلوئے یزداں میں نوکِ سناں بھی ٹوٹی ہے
کشاکشِ دلِ پیغمبراں بھی ٹوٹی ہے

سراب ہے کہ حقیقت، نظارہ ہے کہ فریب
یقیں بھی ٹوٹا ہے، طرزِ گماں بھی ٹوٹی ہے

سیاستِ دلِ آئینہ چور چور تو تھی
سیاستِ دلِ آہن گراں بھی ٹوٹی ہے

اندھیری رات کا یہ نیم باز سناٹا
گلوں کی سانس، رگِ گلستاں بھی ٹوٹی ہے

تمہارے جسم کا سورج جہاں جہاں ٹوٹا
وہیں وہیں میری زنجیرِ جاں بھی ٹوٹی ہے

کہاں ہیں عالمِ امکاں، وجود میں آئیں
نظر نظر ہی رہی ہے، جہاں بھی ٹوٹی ہے

شکست و ریخت زمانہ کی خوب ہے مخدوم
خودی تو ٹوٹی تھی خوئے بتاں بھی ٹوٹی ہے

مخدوم محی الدین



سیماب وشی، تشنہ لبی، باخبری ہے
اس دشت میں گر رختِ سفر ہے تو یہی ہے

اک شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی، نسبتِ پیمانہ رہی ہے

بے صحبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی، مے وہی، میخانہ وہی ہے

اس عہد میں بھی دولتِ کونین کے باوصف
ہر گام پہ اُن کی جو کمی تھی، سو کمی ہے

ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر باد تری یاد کے پھولوں میں بسی ہے

ہر شام سجائے ہیں تمنّا کے نشیمن،
ہر صبح مے تلخیِ ایام بھی پی ہے

دھڑکا ہے دلِ زار، ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

وہ عطر تری کاکلِ شب رنگ نے چھڑکا
مہکی ہے خرد، روح کلی بن کے کھلی ہے

مخدوم محی الدین



سازِ آہستہ، ذرا گردشِ جام آہستہ
جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ

چاند اُترا کہ اُتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

کوئے جاناں میں قدم پڑتے ہیں ہلکے ہلکے
آشیانے کی طرف طائرِ بام آہستہ

ان کے پہلو کے مہکتے ہوئے شاداں جھونکے
یوں چلے جیسے شرابی کا خرام آہستہ

اور بھی بیٹھے ہیں اے دل، ذرا آہستہ دھڑک
بزم ہے، پہلو بہ پہلو ہے کلام آہستہ

یہ تمنا ہے کہ اُڑتی ہوئی منزل کا غبار
صبح کے پردے میں یاد آ گئی شام آہستہ



عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے

ہجر میں ملنے شبِ ماہ کے غم آئے ہیں
چارہ سازوں کو بھی بلواؤ کہ کچھ رات کٹے

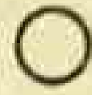
کوئی جلتا ہی نہیں، کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ، پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

چشم و رخسار کے اذکار کو جاری رکھو
پیار کے نغمے کو دہراؤ کہ کچھ رات کٹے

آج ہو جانے دو ہر ایک کو بدمستِ خراب
آج ایک ایک کو پلواؤ کہ کچھ رات کٹے

کوہِ غم اور گراں، اور گراں، اور گراں
غمزدو! تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

مخدوم محی الدین



بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزا آخرِ شب
اور بھی سرخ ہے رخسارِ حیا آخرِ شب

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیرِ درِ مے خانہ
کوئی دیوانہ، کوئی آبلہ پا آخرِ شب

سانس رکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
کوئی لیتا تھا ترا نامِ وفا آخرِ شب

گل ہے قندیلِ حرم، گل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دستِ دعا آخرِ شب

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ، سر بہ گریباں ہے جفا آخرِ شب

اسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے
اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب



سحر سے رات کی سرگوشیاں بہار کی بات
جہاں میں عام ہوئی چشمِ انتظار کی بات

دلوں کی تشنگی جتنی، دلوں کا غم جتنا
اسی قدر ہے زمانے میں حسنِ یار کی بات

جہاں بھی بیٹھے ہیں، جس جا بھی رات مے پی ہے
انہی کی آنکھوں کے قصے انہی کے پیار کی بات

چمن کی آنکھ بھر آئی، کلی کا دل دھڑکا
لبوں پہ آئی ہے جب بھی کسی قرار کی بات

یہ زرد زرد اجالے، یہ رات رات کا درد
یہی تو رہ گئی اب جانِ بے قرار کی بات

تمام عمر چلی ہے، تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یارِ غمگسار کی بات

مخدوم محی الدین



زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی، زندگی رنگِ گل کا بیاں دوستو
گاہ روتی ہوئی، گاہ ہنستی ہوئی، میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

ہے اسی کے جمالِ نظر کا اثر، زندگی زندگی ہے سفر ہے سفر
سایۂ شاخِ گل، شاخِ گل بن گیا، بن گیا ابر، ابرِ رواں دوستو

اک مہکتی بہکتی ہوئی رات ہے، لڑکھڑاتی نگاہوں کی سوغات ہے
پنکھڑی کی زباں، پھول کی داستاں، اس کے ہونٹوں کی پرچھائیاں دوستو

کیسے طے ہوگی یہ منزلِ شامِ غم، کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم
اک ہتھیلی میں دل، اک ہتھیلی میں جاں، اب کہاں کا یہ سود و زیاں دوستو

دوستو ایک دو جام کی بات ہے، دوستو ایک دو گام کی بات ہے
ہاں اسی کے در و بام کی بات ہے، بڑھ نہ جائیں کہیں دوریاں دوستو

سن رہا ہوں حوادث کی آواز کو، پا رہا ہوں زمانے کے ہر راز کو
دوستو اٹھ رہا ہے دلوں سے دھواں، آنکھ لینے لگی ہچکیاں دوستو



دراز ہے شبِ غم، سوز و ساز ساتھ رہے
مسافرو! مئے مینا گداز ساتھ رہے

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
سفر کٹھن ہے، دمِ شعلہ ساز ساتھ رہے

یہ کوہ کیا ہے، یہ دشتِ الم فزا کیا ہے
جو اک تری نگہِ دل نواز ساتھ رہے

کوئی رہے نہ رہے، ایک آہ اک آنسو
بصد خلوص، بصد امتیاز ساتھ رہے

یہ میکدہ ہے، نہیں پیرِ دیر، پیرِ حرم
نظر عفیف، دلِ پاک باز ساتھ رہے

مخدوم محی الدین



یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لیے
جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے

چٹک رہی ہے کسی یاد کی کلی دل میں
نظر میں رقصِ بہاراں کی صبح و شام لیے

ہجومِ بادہ و گُل میں، ہجومِ یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

کسی خیال کی خوشبو، کسی بدن کی مہک
درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

مہک مہک کے جگاتی رہی نسیمِ سحر
لبوں پہ یارِ مسیحا نفس کا نام لیے

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی
اُٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے



اسی چمن میں چلیں، جشنِ یادِ یار کریں
دلوں کو چاک، گریباں کو تار تار کریں

شمیمِ پیرہنِ یار، کیا نثار کریں
تجھی کو دل سے لگا لیں، تجھی کو پیار کریں

سناتی پھرتی ہیں آنکھیں کہانیاں کیا کیا
اب اور کیا کہیں، کس کس کو سوگوار کریں

اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اڑیں، گُل کو ہمکنار کریں

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں، دیدِ یار کریں

سیّد احتشام حسین



رسم ہی شہرِ تمنّا سے وفا کی اُٹھ جائے
اس طرح تو نہ کوئی اہلِ محبّت کو ستائے

وادیِ دل میں کئی راتوں سے سناٹا ہے
کاش بجلی ہی ترے ابرِ ستم سے گر جائے

اپنی ذلّت کی صلیب آپ لیے پھرنا ہے
یہ بڑا بوجھ محبت کے سوا کون اٹھائے

برسرِ جنگ ہیں انوار سے ظلمات کے دیو
چاند راتوں کے اندھیرے میں کہیں ڈوب نہ جائے

یہ سمجھ لو کہ رگِ جاں میں ہے زہرابِ جنوں
جب نگاہِ کرم و لطف سے بھی دل دکھ جائے

دشتِ امّید میں جلتا ہے مرے خوں کا چراغ
راہِ منزل کی کہو، میرے سوا کون دکھائے

بارشِ سنگِ ملامت ہے، خرد کا پتھراؤ
اپنے سر سے ہو جسے پیار، مرے ساتھ نہ آئے

سید احتشام حسین



ڈر ڈر کے جسے میں سن رہا ہوں
کھوئی ہوئی اپنی ہی صدا ہوں
جب آنکھ میں آ گئے ہیں آنسو
خود بزم طرب سے اُٹھ گیا ہوں
چھٹتی نہیں خوئے حق شناسی
سقراط ہوں، زہر پی رہا ہوں
اپنی ہی ہوس تھی سر کشیدہ
دامن سے اُلجھ کے گر پڑا ہوں
عریانیِ فکر کھل نہ جائے
خوابوں کے لباس سی رہا ہوں
ہر منزلِ مرگ آفریں میں
سرگشتۂ زندگی رہا ہوں
دیکھے ہیں بہت سے تیرگی کے
کن روشنیوں میں گھر گیا ہوں

سید احتشام حسین



محفلِ دوست میں گو سینہ فگار آتے ہیں
صورتِ نغمہ، بہ اندازِ بہار آتے ہیں

اس نظر سے کہ ترے ظلم کی تشہیر نہ ہو
بیقراری میں لئے دل کا قرار آئے ہیں

ایک پندارِ خودی، جس کو بچا رکھا تھا
آج ہم وہ بھی تری بزم میں ہار آئے ہیں

ظلمتِ شامِ خزاں یاد کرے گی برسوں
ہم جب آئے ہیں، گلستاں بہ کنار آئے ہیں

اے رفیقانِ رہِ شوق، کہاں ہو، بولو!
ہم تمہیں شہر و بیاباں میں پکار آئے ہیں

ہے پُر آشوب فضا، پھر بھی کسی جانب سے
دل کے ویرانے میں پیغامِ بہار آئے ہیں

غمِ منزل میں بھٹکتے ہی گذر جاتی ہے
چھوڑ کر جب سے تیری راہگذار آئے ہیں

زندگی روز نئی لگتی ہے دل والوں کو
گرچہ ہر روز وہی لیل و نہار آتے ہیں

دیکھنا لُوٹ گئی کون سی بستی یارو!
اُڑ کے دل تک جو کدورت کے غبار آئے ہیں

اپنے انجام سے خوش، اپنی وفا پر نازاں
مسکراتے ہوئے ہم جانبِ دار آئے ہیں



کچھ مرے شوق نے در پردہ کہا ہو جیسے
آج تم اور رہی تصویرِ حیا ہو جیسے

یوں گذرتا ہے تری یاد کی وادی میں خیال
خارزاروں میں کوئی برہنہ پا ہو جیسے

سازِ نفرت کے ترانوں سے بہلتے نہیں کیوں!
یہ بھی کچھ اہلِ محبت کی خطا ہو جیسے

وقت کے شور میں یوں چیخ رہے ہیں لمحے
بہتے پانی میں کوئی ڈوب رہا ہو جیسے

یوں شفق پھولی ہے مشرق کے افق پر اے دوست
دن کا خون، رات کی چوکھٹ پہ بہا ہو جیسے

یا مجھے وہم ہے، سنتا نہیں کوئی میری
یا یہ دنیا ہی کوئی کوہِ ندا ہو جیسے

دل نے چپکے سے کہا، کوششِ ناکام کے بعد
زہر ہی دردِ محبت کی دوا ہو جیسے

دیکھیں بچ جاتی ہے یا ڈوبتی ہے کشتیِ شوق
ساحلِ فکر پہ اک حشر بپا ہو جیسے

سید احتشام حسین



دل تری یاد میں ہر لحظہ تڑپتا بھی نہیں
بند ہو جائے تڑپنا، یہ گوارا بھی نہیں

وہ نہیں پاس تو احساسِ رفاقت ہے سوا
غمِ تنہائی کے زنداں میں، مَیں تنہا بھی نہیں

دشت دیوانوں سے آباد ہوئے جاتے ہیں
اب تو جاگیرِ کسی قیس کی صحرا بھی نہیں

سنگِ دشنام برستے رہے ہر جانب سے
سخت جاں دل ہی کچھ ایسا تھا کہ ٹوٹا بھی نہیں

کر تو لوں ترکِ تمنا کا ارادہ، لیکن
قہر یہ ہے، وہ فسوں گر ستم آرا بھی نہیں

رنگ کیوں اڑ گیا گلشن کے ہواداروں کا
گرم جھونکا کوئی اس راہ سے گزرا بھی نہیں

سردِ ہے مرگِ صفت، مصرِ جنوں کا بازار
خوابِ یوسف بھی نہیں، خوابِ زلیخا بھی نہیں



بدل کے بھیس وہ چہرا کہاں کہاں نہ ملا
تلاش جس کی تھی وہ حُسنِ جاوداں نہ ملا

کھڑا ہوں کب سے سرِ راہگذارِ وقت ندیم!
میں جس کے ساتھ چلوں، ایسا کارواں نہ ملا

خزاں گذر گئی لیکن گلوں کے رنگ ہیں زرد
بہار کو صلۂ خونِ کشتگاں نہ ملا

کہاں سے ذہن میں چھپ چھپ کے وہم آتے ہیں
کبھی یقین کو سراغِ رہِ گماں نہ ملا

میں اہلِ فکر کی بستی بھی روند آیا ہوں
کہیں کوئی غمِ ہستی کا رازداں نہ ملا

کچل کے یاد کی لاشیں، گذر گیا غمِ دہر
میں ڈھونڈتا رہا، زخموں کا بھی نشاں نہ ملا

اتر کے دیکھ چکا رنگ کے جزیروں میں
ترے شباب کا وہ رنگِ ارغواں نہ ملا

آل احمد سرور



لو اندھیروں نے بھی انداز اُجالوں کے لیے
کیسی اُفتاد پڑی دیکھنے والوں کے لیے

تازہ کاری نے وہاں کردیئے عالم ایجاد
ہم ترستے ہی رہے تازہ خیالوں کے لیے

شاہراہوں سے گذرتے ہیں شب و روز ہجوم
نئی راہیں ہیں فقط چند جیالوں کے لیے

کام ماضی کی یہ سادہ نگہی کیا آتی
عصرِ حاضر، ترے پیچیدہ سوالوں کے لیے

کتنی شمعیں بجھیں نادیدہ کرن کی خاطر
کتنے سورج لیے موہوم اُجالوں کے لیے

کتنے سنگین حقائق سے نچوڑا ہے لہو
چند خوابوں کے لیے، چند خیالوں کے لیے

گو نگہ داریِ آدابِ جنوں مشکل ہے
پھر بھی آساں ہے ترے چاہنے والوں کے لیے

آل احمد سرور



یہ دور مجھ سے خرد کا وقار مانگے ہے
دل اب بھی شوق کے لیل و نہار مانگے ہے

جہاں میں کس کو گوارا ہوئی ہے فکر کی دھوپ
ہر اک، کوئی شجر سایہ دار مانگے ہے

زبانِ لالہ و گل میں بسی ہوئی ہے مگر
زمانہ لفظ میں خنجر کی دھار مانگے ہے

اکیلے پن کا یہ احساس، ہم نفس کی تلاش
بڑھی ہوئی جو یہ تلخی ہے، پیار مانگے ہے

یہ آدمی مرے خوابوں کا ساتھ کیا دیتا
حقیقتوں سے جو اکثر فرار مانگے ہے

اب ان میں اپنا لہو ہو کہ کوئی شوخ کرن
ورق جو سادہ ہے، نقش و نگار مانگے ہے

ہُوا کہاں ابھی صدیوں کے جبر سے آزاد
خدائی پر جو بشر اختیار مانگے ہے

بھکاریوں کو یہاں بھیک کون دیتا ہے
ہے سادہ لوح، جو دنیا سے پیار مانگے ہے

وہ دیدہ ور جسے پہچانتی نہیں محفل
تری نظر سے فقط، اعتبار مانگے ہے

آل احمد سرور



زنجیر سے جنوں کی خلش کم نہ ہو سکی
بھڑکی اگر یہ آنچ تو مدھم نہ ہو سکی

بدلے بہارِ لالہ و گل نے ہزار رنگ
لیکن جمالِ دوست کا عالم نہ ہو سکی

کیا کیا غبار اٹھائے نظر کے فساد نے
انسانیت کی لو کبھی مدھم نہ ہو سکی

ہم لاکھ بدمزہ ہوئے جامِ حیات سے
جینے کی پیاس تھی کہ کبھی کم نہ ہو سکی

جو جھک گئی جبیں ترے نقشِ قدم کی سمت
تا زیست پھر وہ اور کہیں خم نہ ہو سکی

مجھ سے نہ پوچھ، اپنی ہی تیغِ ادا سے پوچھ
کیوں تیری چشمِ لطف بھی مرہم نہ ہو سکی

کتنے رموزِ شوق ان آنکھوں میں رہ گئے
جن سے نگاہِ دوست بھی محرم نہ ہو سکی

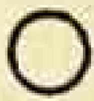
موجِ نسیم اپنی بہاریں لٹا گئی
لیکن خزاں کی مردہ دلی کم نہ ہو سکی

اللہ رے اشتیاق نگاہِ امید کا
کھوئے ہوؤں کی یاد میں پُرنم نہ ہو سکی

گل کاریٔ نظر ہو کہ رنگِ جمالِ دوست
کچھ بات تھی کہ زیست جہنم نہ ہو سکی

ان کی جبیں پہ خیر سے اک رنگ آ گیا
میری وفا اگرچہ مسلّم نہ ہو سکی

اپنے ہی گھر کی خانہ خدائی تمام عمر
ہم سے سرورؔ فکرِ دو عالم نہ ہو سکی



خوابوں سے یوں تو روز بہلتے رہے ہیں ہم
کتنی حقیقتوں کو بدلتے رہے ہیں ہم

اپنے غبار میں بھی ہے وہ ذوقِ سرکشی
پامال ہو کے عرش پہ چلتے رہے ہیں ہم

سو سو طرح سے تجھ کو سنوارا ہے حسنِ دوست
سو سو طرح سے رنگ بدلتے رہے ہیں ہم

ہر دشت و در میں پھول کھلانے کے واسطے
اکثر تو نوکِ خار پہ چلتے رہے ہیں ہم

آئینِ پاس داریٔ صحرا نہ چھٹ سکا
وضعِ جنوں اگرچہ بدلتے رہے ہیں ہم

ساقی نہ ملتفت ہو تو پینا حرام ہے
پیاسے بھی میکدے سے نکلتے رہے ہیں ہم

کوئی خلیل جس کو نہ گلزار کر سکا
تیرے لیے اس آگ پہ چلتے رہے ہیں ہم

کیا جانے کب وہ صبحِ بہاراں ہو جلوہ گر
دورِ خزاں میں جس سے بہلتے رہے ہیں ہم

پرسانِ حال کب ہوئی وہ چشمِ بے نیاز
جب بھی گرے ہیں خود ہی سنبھلتے رہے ہیں ہم

ساحل کی عشرتوں کو خبر بھی نہ ہو سکی
طوفان بن کے لاکھ مچلتے رہے ہیں ہم

تخیلِ لالہ کار یہ کہتی ہے اے سرورؔ
کوئی زمیں ہو، پھولتے پھلتے رہے ہیں ہم

آل احمد سرور

دلدادگانِ لذتِ ایجاد کیا کریں
سیلابِ اشک و آہ پہ بنیاد کیا کریں

کرنا ہے بن کو تازہ نہالوں کی دیکھ بھال
بیتی ہوئی بہار کو وہ یاد کیا کریں

ہاں جان کر امید کی مدھم رکھی ہے لَو
اب اور پاسِ خاطرِ ناشاد کیا کریں

سنگیں حقیقتوں سے کہاں تک ملول ہوں
رعنائیِ خیال کو برباد کیا کریں

دیکھو جسے، لیے ہے وہ زخموں کی کائنات
ہم ایک اپنے زخم پہ فریاد کیا کریں

رندوں کی آرزو کا تلاطم کہاں سے لائیں
آسودگانِ مسندِ ارشاد کیا کریں

کس کو نہیں سکون کی خواہش جہان میں
افتادگانِ رہگذر، یاد کیا کریں

جو ہر نظر میں تازہ کریں میکدے ہزار
ہیچ ہے سرورِ رفتہ کو وہ یاد کیا کریں

شگفتگی دلِ ویراں میں آج آ ہی گئی
گھٹا چمن پہ بہاروں کو لے کے چھا ہی گئی

حیاتِ تازہ کے خطروں سے دل دھڑکتا تھا
ہوا چلی تو کلی پھر بھی مسکرا ہی گئی

نقاب میں بھی وہ جلوے نہ قید ہو پائے
کرن دلوں کے اندھیرے کو جگمگا ہی گئی

تغافل ایک بھرم تھا غرورِ جاناں کا
مری نگاہ، محبت کا راز پا ہی گئی

مطالبے تو بہت سخت تھے زمانے کے
مگر حقوقِ محبت کی یاد آ ہی گئی

مرے جنوں کی خلش سے اب اور کیا ہوتا
سکوتِ اہلِ خرد کو تو آزما ہی گئی

متاعِ قلب و نظر، خاک ہوتے ہوتے بھی
جہانِ حسن کی کچھ آبرو بڑھا ہی گئی

تھپک تھپک کے سلایا جو تم نے ذوقِ سخن
سرور اس کو کسی کی نظر جگا ہی گئی

آل احمد سرور



خیال جن کا ہمیں روز و شب ستاتا ہے
کبھی انہیں بھی ہمارا خیال آتا ہے
تمہارا عشق جسے خاک میں ملاتا ہے
اسی کی خاک سے پھر پھول بھی کھلاتا ہے
ڈھلے گی رات تو پھیلے گا نور بھی اس کا
چراغ اپنا سرِ شام جھلملاتا ہے
نہ طے ہوئی تری شمعِ جمال سے بھی جو راہ
وہیں یہ میرا جنوں راستہ دکھاتا ہے
نہ جانے شوق کو عادت ہے کیوں بھٹکنے کی
ترا حجاب تو بے شک ادب سکھاتا ہے
کہاں بجھائے سے بجھتے ہیں عشق کے شعلے
چراغ یوں تو جو جلتا ہے، بجھ بھی جاتا ہے
یہ بادِ راہ گزر درخورِ چمن نہ سہی
غبار کا بھی ٹھکانا نکل ہی آتا ہے
جنوں کی چال پہ ٹھٹکی نہ وہ نظر تنہا
یہاں زمانہ بھی قدموں میں لوٹ جاتا ہے
ہے تیرے غم کی غمِ روزگار سے سازش
کہاں کہاں دلِ دیوانہ کام آتا ہے
سرورؔ جنسِ وفا بیچتے نہیں پھرتے
جگر کے داغ دکھاتا تو سب کو آتا ہے



سیاہ رات کی سب آزمائشیں منظور
کسی سحر کے اجالے کا آسرا تو ملا
نظر ملا نہ سکے ہم سے وہ تو غم کیا ہے
کہ دل سے دل کے دھڑکنے کا سلسلہ تو ملا
ہے آج اور ہی کچھ زلفِ تابدار میں خم
بھٹکنے والے کو منزل کا راستہ تو ملا
سرشکِ چشم سے موتی بہت لٹائے گئے
تری نگہ کے شہیدوں کو خوں بہا تو ملا
جہاں نگاہ سے انساں بنائے جاتے ہیں
وہ بابِ میکدہ میرے لیے کھلا تو ملا
ستم ظریف محبت کو جرم کہتے ہیں
گناہ گار کو جینے کا آسرا تو ملا
نہ رہنما ہے نہ منزل دیارِ الفت میں
قدم اٹھاتے ہی خضرِ شکستہ پا تو ملا
مرے جنوں نے کھلائے ہیں پھول صحرا میں
مرے جنوں سے بہاروں کو حوصلہ تو ملا
سمجھتے تھے کہ وفا ناشناس ہے دنیا
سرورؔ ہم کو بھی اک درد آشنا تو ملا

آلِ احمد سرور



ہر اک جنت کے رستے، ہو کے دوزخ سے نکلتے ہیں
انہیں کا حق ہے پھولوں پر جو انگاروں پہ چلتے ہیں

حقائق ان سے ٹکرا کر نئے سانچوں میں ڈھلتے ہیں
بڑے ہی سخت جاں ہوتے ہیں جو خوابوں پہ پلتے ہیں

گماں ہوتا ہے جن موجوں پہ اک نقشِ حبابی کا
ابھی سوئی ہوئی موجوں میں کچھ طوفان پلتے ہیں

وہ رات آخر ہوئی تو کیا، یہ دن کب رہنے والا ہے
ستارے ماند ہوتے ہیں اگر، سورج بھی ڈھلتے ہیں

تلوّنِ چشمِ ساقی میں، تغیّر وضعِ رندی میں
ہمارے میکدے میں روز پیمانے بدلتے ہیں

حقائق سرد ہو سکتے ہیں سب محراب و منبر کے
مگر وہ خواب، جو رندوں کے پیمانے میں ڈھلتے ہیں

جنوں نے عالمِ وحشت میں جو راہیں نکالی ہیں
خرد کے کارواں آخر انہی راہوں پہ چلتے ہیں

سرورؔ سادہ گو یوں تو لہو رونا ہی آتا ہے
مگر اس سادگی میں بھی بڑے پہلو نکلتے ہیں



ایک دیوانے کو اتنا ہی شرف کیا کم ہے
زلف و زنجیر سے یک گونہ شغف کیا کم ہے

شوق کے ہاتھ بھلا چاند کو چھو سکتے ہیں
چاندنی دل میں رہے یہ بھی شرف کیا کم ہے

کون اس دور میں کرتا ہے جنوں سے سودا
تیرے دیوانوں کی ٹوٹی ہوئی صف کیا کم ہے

آگ بھڑکی جو ادھر بھی تو بچے گی کیا شے
شعلۂ شوق کی لو ایک طرف کیا کم ہے

ہم نے ہر موج کو موجِ گزراں سمجھا ہے
ورنہ طوفانوں کا رخ میری طرف کیا کم ہے

کالی راتوں میں اجالے سے محبت کی ہے
صبح کی بزم میں اپنا یہ شرف کیا کم ہے

عدم



دروغ کے امتحاں کدے میں سدا یہی کاروبار ہو گا
جو بڑھ کے تائیدِ حق کرے گا، وہی سزاوارِ دار ہو گا

بلا غرض، سادہ سادہ باتوں سے ڈال دیں رسم دوستی کی
جو سلسلہ اس طرح چلے گا، وہ لازماً پائدار ہو گا

چلو محبت کی بیخودی کے حسین خلوت کدے میں بیٹھیں
عجیب مصروفیت رہے گی، نہ غیر ہو گا، نہ یار ہو گا

ترے گلستاں کی آبرو ہے، مہک تری انفرادیت کی
تو کسمپرسی سے بجھ بھی جائے تو غیرتِ نوبہار ہو گا

جہاں نہ تو ہو، نہ کوئی ہمدرد ہو، نہ کوئی شریف دشمن
میں سوچتا ہوں، مجھے وہ ماحول کس طرح سازگار ہو گا

بہشت میں بھی جناب زاہد تمھیں نہ ترجیح مل سکے گی
وہاں بھی خوش ذوق عاصیوں کا تپاک سے انتظار ہو گا

عدم کی شب خیزیوں کے احوال یوں سناتے ہیں اُسکے محرم
کہ سننے والے یہ مان جائیں، کوئی تہجد گزار ہو گا

عدم



منقلب صورتِ حالات بھی ہو جاتی ہے
دن بھلے ہوں تو کرامات بھی ہو جاتی ہے

حُسن کو آتا ہے جب اپنی ضرورت کا خیال
عشق پر لُطف کی برسات بھی ہو جاتی ہے

دیر و کعبہ ہی سے اس کا نہ تعلّق سمجھو
زندگی ہے۔ یہ خرابات بھی ہو جاتی ہے

جبر سے طاعتِ یزداں بھی ہے بارِ خاطر
پیار سے عادتِ خدمات بھی ہو جاتی ہے

داورِ حشر! مجھے اپنا مصاحب نہ سمجھ
بعض اوقات کھری بات بھی ہو جاتی ہے

حشر میں لے کے چلو مُطرب و معشوق و سبُو
غیر کے گھر میں کبھی رات بھی ہو جاتی ہے

بعض اوقات کسی اور کے ملنے سے عدمؔ
اپنی ہستی سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے

عدم



بھولی بسری باتوں سے کیا تشکیلِ روداد کریں
ہم کو تو کچھ یاد نہیں ہے، آپ ہی کچھ ارشاد کریں

پہلے پہل جب آپ کا جوبن اتنا شہر آشوب نہ تھا
اِک مشاق سے، سادہ دل انساں کی پرستش یاد کریں

آپ سے ممکن ہے دلجوئی، یزداں کی یہ ریت نہیں
جس کو سُن کر چُپ رہنا ہے، اُس سے کیا فریاد کریں

عشق نے سونپا ہے کام اپنا، اب تو نبھانا ہی ہوگا
میں بھی کچھ کوشش کرتا ہوں، آپ بھی کچھ امداد کریں

جزوِ طبیعت بن جائیں تو جور کرم ہو جاتے ہیں
لُطف نہ اب رائج فرمائیں، صرف ستم ایجاد کریں



بے سبب کیوں تباہ ہوتا ہے
فکرِ فردا گناہ ہوتا ہے،

تُجھ کو کیا دُوسروں کے عیبوں سے
کیوں عبث رُو سیاہ ہوتا ہے

مُجھ کو تنہا نہ چھوڑ کر جاؤ
یہ خلا بے پناہ ہوتا ہے

زک اُنہی سے بُہت پہنچتی ہے
جو مرا خیر خواہ ہوتا ہے

اُس گھڑی اُس سے مانگ لو سب کچھ
جب عدمؔ بادشاہ ہوتا ہے!

عدم



گناہِ جرأتِ تدبیر کر رہا ہوں میں
یہ کس قماش کی تقصیر کر رہا ہوں میں

میں جانتا ہوں، علامت ہے ضعفِ ہمت کی
جسے نصیب سے تعبیر کر رہا ہوں میں

ابھی تدبّر و تدبیر کا نہیں موقع
ابھی حمایتِ تقدیر کر رہا ہوں میں

ہجومِ حشر میں کھولوں گا عدل کا دفتر
ابھی تو فیصلے تحریر کر رہا ہوں میں

جواب دینے کی عادت نہیں خدا کو اگر
تو کیا پرستشِ تصویر کر رہا ہوں میں

تباہ ہو کے حقائق کے کھردرے پن سے
تصوّرات کی تعمیر کر رہا ہوں میں

خدا کے آگے عدم ذکرِ عظمتِ انساں!
غلط مقام پہ تقریر کر رہا ہوں میں



شب کی بیداریاں نہیں اچھی
اتنی مے خواریاں نہیں اچھی

وہ کہیں کبریا نہ بن جائیں
ناز برداریاں نہیں اچھی

ہڈّیاں گالنے کے گر سیکھو
سہل انگاریاں نہیں اچھی

کچھ رواداریوں کی مشق بھی کر
صرف اداکاریاں نہیں اچھی

ہاتھ سے کھو نہ بیٹھنا اُس کو
اتنی خودداریاں نہیں اچھی!

اے غفور الرحیم، سچ فرما
کیا خطاکاریاں نہیں اچھی

عـــدم

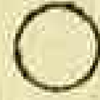


وہ ابرُو یاد آتے ہیں، وہ مژگاں یاد آتے ہیں
نہ پوچھو کیسے کیسے تیر و پیکاں یاد آتے ہیں
وہ جن کے تحت جھک جاتا تھا سر اصنام کے آگے
وہی بھولے ہوئے احکامِ یزداں یاد آتے ہیں
جو اکثر بار ور ہونے سے پہلے ٹوٹ جاتے تھے
وہی خستہ، شکستہ عہد و پیماں یاد آتے ہیں
وہ مرمر کی طرح شفاف اور ہنستے ہوئے اعضا
حیاتِ جاوداں کے ساز و ساماں یاد آتے ہیں
گماں ہوتا ہے وحشی نکہتوں نے بھینچ ڈالا ہے
کچھ اتنے بے محابا سنبلستاں یاد آتے ہیں
وہ گُل اندام جن کا خُلق سرمایہ تھا جینے کا
وہ بن بن کر چراغِ محفلِ جاں یاد آتے ہیں
خیال آتا ہے جب بھی دلبروں کی ہم نشینی کا
تلاطم رنگ کے، خوشبو کے طوفاں یاد آتے ہیں
اُڑی پھرتی تھی بوسوں کی چہک جن کی فضاؤں میں
وہ احساسات میں ڈوبے شبستاں یاد آتے ہیں
فقیہہ و شیخ کے ذہنوں میں بُت ہوں گے خداؤں کے
میں انساں ہوں، مجھے تو صرف انساں یاد آتے ہیں
پیالہ شام کو رکھتا ہوں جب بھی میں عدمؔ آگے
جواں مہ جبینوں کے رُوئے خنداں یاد آتے ہیں



جہاں وہ زلفِ برہم کارگر محسوس ہوتی ہے
وہاں ڈھلتی ہوئی ہر دوپہر محسوس ہوتی ہے
وہی شے مقصدِ قلب و نظر محسوس ہوتی ہے
کمی جس کی برابر عمر بھر محسوس ہوتی ہے
جتن بھی کیا حسیں سوجھا ہے تجھ کو پیار کرنے کا
تری صورت مجھے اپنی نظر محسوس ہوتی ہے
گلی کوچوں میں صحنِ میکدہ کا رنگ ہوتا ہے
مجھے دُنیا ترا کیفِ نظر محسوس ہوتی ہے
ذرا آگے چلو گے تو اضافہ علم میں ہو گا
محبت پہلے پہلے بے خبر محسوس ہوتی ہے
یہ دو پتھر نہ جانے کب سے آپس میں ہیں وابستہ
جبیں اپنی، تمہارا سنگِ در محسوس ہوتی ہے
کبھی سچ تو نہیں اس آنکھ نے بولا، مگر پھر بھی
دکھنے میں نہایت معتبر محسوس ہوتی ہے
عدمؔ اب دوستوں کی بے رُخی کی ہے یہ کیفیت
کھٹکتی تو نہیں اتنی، مگر محسوس ہوتی ہے!

عـــدم



زباں پر آپ کا نام آ رہا تھا
غمِ ہستی کو آرام آ رہا تھا

خدا کا شکر، تیری زلف بکھری
بڑی گرمی کا ہنگام آ رہا تھا

ستارے سو گئے انگڑائی لے کر
کہ افسانے کا انجام آ رہا تھا

تڑپ کر میں نے توبہ توڑ ڈالی
تری رحمت پہ الزام آ رہا تھا

عدمؔ دل کھو کے آسودہ نہیں ہم
بُرا تھا یا بھلا کام آ رہا تھا



تہی سا جام تو تھا، گر کے بہہ گیا ہوگا
مرا نصیب ازل میں ہی رہ گیا ہوگا

ہے اہرمن سے، نہ معلوم کیوں خفا یزداں
غریب کوئی کھری بات کہہ گیا ہوگا

ہم اور لوگ ہیں، ہم سے بہت غرور نہ کر
کلیم تھا جو ترا ناز سہہ گیا ہوگا

قریبِ کعبہ پہنچ کر عدمؔ کو مت ڈھونڈو
وہ حیلہ جُو، کہیں رستے میں رہ گیا ہوگا

رئیس امروہوی

جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں
وہیں سُولی پہ لٹکایا گیا ہوں

سُنا ہر بار میرا کلمۂ صدق
مگر ہر بار جھٹلایا گیا ہوں

عجب اک سِرِّ مبہم ہے مری ذات
نہ سمجھا ہوں نہ سمجھایا گیا ہوں

مرے نقشِ قدم نظروں سے اوجھل
مگر ہر موڑ پر پایا گیا ہوں

پسِ دیوارِ فردوسِ معلّیٰ
ستونِ عرش تھا، ڈھایا گیا ہوں

مگر سنگِ رہِ تقدیر تھا میں
کہ ہر ٹھوکر سے ٹھکرایا گیا ہوں

کبھی ماضی کا جیسے تذکرہ ہو
زباں پر اس طرح لایا گیا ہوں

صلیب و مقتل و زنجیر و زنداں
یہ کن راہوں میں بھٹکایا گیا ہوں

مثالِ وحیِ حق، انسانیت کے
ہر اک وقفے میں دہرایا گیا ہوں

جو موسیٰ تھا تو ٹھکرایا گیا تھا
جو عیسیٰ ہوں تو جھٹلایا گیا ہوں

جہاں ہے رسمِ قتلِ انبیا کی
وہیں مبعوث فرمایا گیا ہوں

بطورِ فدیۂ قرباں گاہ کی سمت
کہاں سے ہانک کر لایا گیا ہوں

ابھی تدفین باقی ہے ابھی تو
لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں

مثالِ سخت جانِ نیم مذبوح
تہِ شمشیر تڑپایا گیا ہوں

دوامی عظمتوں کے مقبرے میں
ہزاروں بار دفنایا گیا ہوں

میں اس حیرت سرائے آب و گل میں
بحکمِ خاص بھجوایا گیا ہوں

کوئی مہمانِ ناخواندہ نہ سمجھے
بصد اصرار بلوایا گیا ہوں

بطورِ ارمغاں لایا گیا تھا
بطورِ ارمغاں لایا گیا ہوں

نہ شبنم ہوں جسے پامال کر دیں
نہ شعلہ ہوں کہ بھڑکایا گیا ہوں

ترس کیسا کہ اس دارالبلا میں
ازل کے دن سے ترسایا گیا ہوں

اساسِ ابتلا محکم ہے مجھ سے
کہ دیواروں میں چُنوایا گیا ہوں

کبھی تو نغمۂ داؤد بن کر
سلیماں کیلئے گایا گیا ہوں

کبھی یعقوب کے نوحے میں ڈھل کر
درِ مجلس پہ دُہرایا گیا ہوں

قمیصِ یوسف و گرگِ برادر
یہ کن فتنوں میں الجھایا گیا ہوں

شگافِ اژدر و سوراخِ افعی
دوبارہ اِن سے ڈسوایا گیا ہوں

سُن اے طعنہ زنِ ابلیس و حوّا!
نہ بہکا ہوں نہ بہکایا گیا ہوں

ظہور و غیب و پیدا و نہاں کیا؟
کہیں کھویا کہیں پایا گیا ہوں

نجانے کون سے سانچے میں ڈھالیں
ابھی تو صرف پگھلایا گیا ہوں

مثالِ اخگرِ مُردہ۔ تہِ خاک
بڑی مشکل سے گرمایا گیا ہوں

بھڑکتا ہوں کہ بھڑکایا ہے مجھ کو
سلگتا ہوں کہ سُلگایا گیا ہوں

خس و خار و خرابِ خشک و خاشاک
یہ کن کھیتوں پہ برسایا گیا ہوں

مثالِ ریزۂ الماس و بلّور
تراشا اور چمکایا گیا ہوں

جہاں تک مہرِ روز افروز پہنچا
وہیں تک صورتِ سایہ گیا ہوں

اذانِ صبح و ذکرِ شام کے ساتھ
ہر اک مسجد میں دہرایا گیا ہوں

کبھی ٹھکرا دیا ہے بُت کدوں نے
کبھی کعبے میں پُجوایا گیا ہوں

کسی محفل میں دل پر جبر کر کے
رئیسؔ آیا تو بے مایا گیا ہوں

رئیس امروہوی



زرد بنی ہے بہار کا منظر
زہر چھڑکا گیا درختوں پر

بُن رہے ہیں عروسِ گل کا کفن
گمّسِ برگ و عنکبوتِ شجر

چیل کوؤں کو تاکتے رہیے
چاند تاروں سے تھک گئی ہے نظر

جو مرا آئینۂ جوانی تھا
اُسی برگد کی جھک گئی ہے کمر

ہاتھ پھیلا کے چیختے ہیں درخت
صرصرِ حادثہ کا رُخ ہے کدھر

سُرخ پھولوں کے لال انگارے
چشمِ زردِ عقاب کے اخگر

وہ جبینِ شفق پہ خطِ شعاع
خون سے کس کے سرخ ہے خنجر

اب کے برسات کچھ تو راس آئی
گھاس اُگنے لگی منڈیروں پر

دھوپ اس صحن میں نہ در آئے
بند کر دو تمام روزنِ در

رقص کرتے ہوئے بگولوں میں
دیو و جنّات و روح کے لشکر

دیکھتا ہوں کہ کیا دکھاتے ہیں؟
اپنے سائے پہ جم گئی ہے نظر

عالمِ بے خودی میں گہرا سانس
سینۂ کائنات میں ہے سفر

آپ اپنے سے کیوں گریزاں ہوں
کسی آسیب کا ہے مجھ پہ اثر؟

کون میرے لیے ہے شب بیدار
کیوں برستے ہیں رات بھر پتھر

میں ہی میں ہوں خلائے تیرہ میں
نہ عطارد نہ مشتری نہ قمر

تہ بہ تہ ظلمتیں ہیں جنبش میں
رینگتے ہیں سیاہ پوش اژدر

جبل الشمس کی بلندی سے
دیکھتا ہوں زمیں کو جھک جھک کر

ایک پُر نور نیلگوں نقطہ
کانپتا ہے خلا میں رہ رہ کر

کہکشاں سے شمال کی جانب
وقت کے بے نشان محور پر

نور کے دائرے ہیں گردش میں
آخر ان قافلوں کا رُخ ہے کدھر

کون آخر جھنجھوڑتا ہے مجھے
عالمِ خواب میں سرِ بستر

کون آخر مجھے جگاتا ہے؟
آخرِ شب میں روز آ آ کر

نہ شہابیہ، نہ کوئی طیارہ
کون اڑ کر گیا اِدھر سے اُدھر



دیارِ شاہدِ بلقیس ادا سے آیا ہوں
میں اک فقیر ہوں، شہرِ سبا سے آیا ہوں

جہانِ نو کی طلب اور اس خبر لیے میں
سوادِ اصطخر و نینوا سے آیا ہوں

شبِ سیاہ خزاں کے سموم و صرصر تک
نگارخانۂ صبح و صبا سے آیا ہوں

ابھی کہاں ہے مجھے نوصر و نوا کا شعور
کہ ایک ناحیۂ بے نوا سے آیا ہوں

مرے رموز کا عرفاں کسے نصیب کریں
سرشتِ روحِ ازل ہوں سما سے آیا ہوں

دمک رہی ہے زمان و مکاں کی پیشانی
ستارۂ اَبدی ہوں خلا سے آیا ہوں

تمہارے غنچہ و گل سے غرض نہیں مجھ کو
ادھر اشارۂ بادِ صبا سے آیا ہوں



میں جو تمہاری طلب میں چلا — ایک سایہ مرے عقب میں چلا
صبح کے قافلوں سے نبھ نہ سکی — میں اکیلا سوادِ شب میں چلا
جب گھنے جنگلوں کی صف آئی — ایک تارا مرے عقب میں چلا
آگئے گر کوئی بگولا سا — عالمِ مستی و طرب میں چلا
میں کبھی حیرتِ طلب میں رُکا — اور کبھی شدتِ غضب میں چلا
نہیں کھلتا کہ کون شخص ہوں میں — اور کس شخص کی طلب میں چلا

ایک انجان ذات کی جانب
الغرض میں بڑے تعب میں چلا

رئیس امروہوی



گرد میں اٹ رہے ہیں احساسات
دھیمے دھیمے برس رہی ہے رات

جل اٹھا اک چراغِ شام تو کیا!
بجھ گئے بے شمار امکانات!

ہائے ماضی کی دل نشیں یادیں
ہائے خونخوار بھیڑیوں کی برات

چیونٹیاں جیسے ذہن پہ رینگیں
اف یہ میرے لطیف احساسات

بھوت بن کر مجھے ڈراتی رہیں!
میری نا آفریدہ تخلیقات!

کون آیا مرے تعاقب میں
مری فکر و خیال کے جنات

دفعتاً کس نے قہقہہ مارا؟
یہ اندھیرے میں کون ہے سرِمات

صرصرِ شب کہاں کہ پتوں میں
کربِ غم سے کراہتی ہے حیات

مجھ سے مجھ کو نہ چھین کر لے جائے
شاہزادیِ کشورِ ظلمات

صبح جاگا تو یاد بھی نہ رہا
رات تھی چاندنی کہ چاندنی رات

تودۂ ریگ و نخلِ خشکِ چنار
چھپ گئی کس کی اوٹ میں برسات

یہ درختِ کہن ۔ لسان الغیب
اور یہ شاخِ خشک برگِ نبات

کیا یہی ہے رئیس امروہی؟
اڑ کے آئے ہیں دور سے ذرات!



خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

صدیوں تک اہتمامِ شبِ ہجر میں رہے
صدیوں سے انتظارِ سحر کر رہے ہیں ہم

ذرّے کے زخمِ دل پہ توجہ کیے بغیر
درمانِ دردِ شمس و قمر کر رہے ہیں ہم

ہر چند نازِ حسن پہ غالب نہ آ سکے
کچھ اور معرکے ہیں جو سر کر رہے ہیں ہم

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے ایک دن
یہ دن تڑپ تڑپ کے بسر کر رہے ہیں ہم

کوئی پکارتا ہے ہر اک حادثے کے ساتھ
تخلیقِ کائناتِ دگر کر رہے ہیں ہم

لکھ لکھ کے اشک و خوں سے حکایاتِ زندگی
آرائشِ کتابِ بشر کر رہے ہیں ہم

اے عرصۂ طلب کے سبک سیر قافلو!
ٹھہرو کہ نظمِ راہ گزر کر رہے ہیں ہم

تخمینۂ حوادثِ طوفاں کے ساتھ ساتھ
بطنِ صدف میں وزنِ گہر کر رہے ہیں ہم

ہم اپنی زندگی تو بسر کر چکے رئیس
یہ کس کی زیست ہے جو بسر کر رہے ہیں ہم

رئیس امروہوی



یہ فقط شورشِ ہوا تو نہیں!
کوئی مجھ کو پکارتا تو نہیں!

بول اے اخترِ غنودۂ صبح
کوئی راتوں کو جاگتا تو نہیں

سن کہ یہ مد و جزرِ ساحلِ بحر
ماجراؤں کا ماجرا تو نہیں

ذہن پر ایک کھردری سی لکیر
کھنکھجورے کا راستا تو نہیں

ریت پر چڑھ رہی ہے ریت کی تہہ
بابل و مصر و نینوا تو نہیں

نوکِ ہر خار و خس ہے خوں آلود
روحِ صحرا برہنہ پا تو نہیں

اے مری جانِ مبتلا کے سکوں
تو کوئی جانِ مبتلا تو نہیں

تیرے جسمِ حسیں میں خوابیدہ
باغِ جنت کا اژدہا تو نہیں



زمیں پر روشنی ہی روشنی ہے
خلا میں اک کرن گم ہو گئی ہے
میں تنہا جا رہا ہوں سوئے منزل
یہ پرچھائیں کہاں سے آ رہی ہے
یہ شام اور روشنی کی یہ قطاریں
اداسی اور گہری ہو گئی ہے
عروجِ ماہ ہے اور مقبروں پر
ابد کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے
ابھار اے موجِ طوفاں خیز مجھ کو
یہ کشتی ریت میں ڈوبی ہوئی ہے
ہوا سے ہے گلِ جنباں سرِ شاخ
یہ کن ہاتھوں میں نیزے کی انی ہے
گرا ہے شاخِ گل سے ایک پتا
کسی نے کیا مجھے آواز دی ہے

منیب احسن دہلوی



اپنے کو تلاش کر رہا ہوں
اپنی ہی طلب سے ڈر رہا ہوں

تم لوگ ہو آندھیوں کی زد میں
میں قحطِ ہوا سے مر رہا ہوں

خود اپنے ہی قلبِ خونچکاں میں
خنجر کی طرح اتر رہا ہوں
اے شہرِ خیال کے مسافر!
کیا میں ترا ہم سفر رہا ہوں

دیوار پہ دائرے ہیں کیسے؟
یہ کون ہے کس سے ڈر رہا ہوں

میں شبنمِ چشمِ ترے اے صبح!
کل رات بھی تر بتر رہا ہوں

اک شخص سے تلخ کام ہو کر!!
ہر شخص کو پیار کر رہا ہوں

اے دجلۂ خوں ذرا ٹھہرنا
اس راہ سے میں گزر رہا ہوں

فریاد کہ زیرِ سایۂ گل!
میں زہرِ خزاں سے مر رہا ہوں



رقصاں ہے منڈیر پر کبوتر
دیوار سی گر رہی ہے دل پر
ٹہنی پہ خموش اِک پرندہ
ماضی کے اُلٹ رہا ہے دفتر
اُڑتے ہیں ہوا کی سمت ذرّے
یادوں کے چلے ہیں لاؤ لشکر
پیڑوں کے گھنے مہیب سائے
یہ کون ہے مجھ پہ حملہ آور
پتّوں میں جھپک رہی ہیں آنکھیں
شاخوں میں چمک رہے ہیں خنجر
یہ کون قریب آ رہا ہے
خود میرے ہی نقشِ پا پہ چل کر
یہ کون سما رہا ہے مجھ میں!
بیٹھا ہوا چپ مری برابر!!
یہ کس کا تنفّسِ پُر اسرار
یہ کس کا تبسّم فسوں گر!!
اک کرب سا روح پہ ہے طاری
اک کیف سا چھا رہا ہے دل پر

اختر انصاری دہلوی



صدا کچھ ایسی مرے گوشِ دل میں آتی ہے　　کوئی بنائے کہن جیسے لڑکھڑاتی ہے
رچا ہوا ہے فضاؤں میں ایک اتھاہ ہراس　　دماغ شل ہے مگر روح سنسناتی ہے
مجھے یقین ہے آندھی کوئی اٹھی ہے کہیں　　کہ لَو چراغِ شبستاں کی تھرتھراتی ہے
اُمید، یاس کے گھرے خموش جنگل میں　　ہوائے شام کی مانند سرسراتی ہے
سوال ہے غمِ ہستی کے بیت جانے کا　　یہ زندگی تو بہر حال بیت جاتی ہے
خیالِ عمرِ گذشتہ، ذرا توقف کر　　زمین قدموں کے نیچے سے نکلی جاتی ہے
میں اپنی آگ میں جل کر کبھی کا خاک ہوا　　یہ زندگی مجھے کیا خاک میں ملاتی ہے
نشانہ بازِ فلک! تیرے ناوکوں کی خیر!　　کہ جن کی زد پہ مرے حوصلوں کی چھاتی ہے
لچک ہی جاتی ہے شاخ اپنے آشیاں کی بھی　　چمن میں گاتی ہوئی جب بہار آتی ہے
فغانِ درد! لبوں پر نہ آ ہنوز نہار　　مری سلیقہ شعاری پہ بات آتی ہے
اِدھر یہ گریۂ ابر اور اُدھر وہ خندۂ برق　　مزاجِ دہر، مرے دوست! طنز باتی ہے
رہینِ رسم و روایت ہو جس کی بُت شکنی　　وہ بُت شکن بھی حقیقت میں سومناتی ہے

بپا ہے شورِ قیامت دماغ میں اختر
زبانِ خامہ مگر زمزمے لُٹاتی ہے

اختر انصاری دہلوی



بہارِ فکر کے جلوے لٹا دیے ہم نے
جنونِ عشق کے دریا بہا لیے ہم نے

فروغِ دانش و برہاں کے شعلے بھڑکا کر
توہمات کے خرمن جلا دیے ہم نے

گرا کے درک و بصیرت کی بجلیاں پیہم
تعصبات کے ٹکڑے اڑا لیے ہم نے

بنا کے فکر و تدبر کو خادمِ انساں
مقدرات کے چھکے چھڑا دیے ہم نے

شعورِ نقد کی صحت پسندیوں کی قسم
عقیدتوں کے پرخچے اڑا دیے ہم نے

مٹا کے تفرقۂ خاص و عام کی لعنت
حقوقِ خاص ٹھکانے لگا دیے ہم نے

نہادگانِ زمیں کا بلند کر کے علم
فلک نشینوں کے پرچم جھکا دیے ہم نے

نئے شعور سے ذہنوں میں بجلیاں بھر دیں
نئی امنگوں سے دل جگمگا دیے ہم نے

گماں حیات پہ ہوتا ہے گیت کی لے کا
کچھ ایسے گیت جہاں کو سنا دیے ہم نے

طلسم توڑ کے جھوٹی حقیقتوں کے تمام
عجائبات کے جادو جگا دیے ہم نے

ورائے چرخ تھے آباد جس قدر فردوس
زمیں کی سطح پہ لا کر بسا دیے ہم نے

بنا کے محنتِ انساں کو ایک قدرِ بلند
زمیں پہ چاند ستارے بچھا دیے ہم نے

جلا کے عظمتِ آدم کی شمعِ دیرینہ
چراغ دیر و حرم کے بجھا دیے ہم نے

جو درک رکھتے ہیں اختر وہ سمجھیں اور بتائیں
یہ کس شراب کے ساغر لنڈھا دیے ہم نے

اختر انصاری دہلوی

○

یہ حسین فطرت کے حسن کا انیلا پن!
زندگی کے عارض پر بہہ کر بہہ پیلا پن!
اُف یہ بیتی راتوں کی یاد کا کٹیلا پن!
آنے والی صبحوں کے دھیان کا رسیلا پن!
کھائے گا شکست اک دن صبر و ضبطِ پیہم سے
درد کا تسلسل اور جبر کا ہٹیلا پن!
زندگی کی موسیقی کس ستم کی شاکی ہے
حزن ہے نواؤں میں، نے میں ہے چٹیلا پن!
احتساب کی مہلک دسترس سے باہر ہے
میری زمزمہ آگیں روح کا سُریلا پن!
رات کی حسین ناگن ڈس رہی ہے عالم کو
چھن رہا ہے تاروں سے موت کا نشیلا پن
کم نہیں ہے خنجر سے، تیز تر ہے نشتر سے
تیرے شعروں میں اختر! ہے جو اِک نکیلا پن

○

چرخ کی سعیِ جفا کوششِ ناکارہ ہے
گردشِ دہر یہاں جنبشِ گہوارہ ہے
چاند تاروں کے تلاطم سے یہ آتا ہے خیال
دلِ وحشی کوئی طوفاں زدہ سیارہ ہے
بہہ گئے دیدۂ نم ناک سے دریا، لیکن
دل وہی ایک دہکتا ہُوا انگارہ ہے
دل ہُوا سوزِ جہنم میں گرفتار، مگر
روح اب بھی کسی فردوس میں آوارہ ہے
کیسی تقدیر کی گردش! غمِ دل کو میں نے
گردشِ گنبدِ افلاک پہ دے مارا ہے
میرے شعروں سے تعرض نہ کرے ناقدِ فن
میری بربادیٔ دل ہی میرا شہ پارہ ہے
ہیبتِ فکر پہ قادر ہوں میں جب تک اختر
مجھے سرمایۂ اندوہ بہت پیارا ہے

اختر انصاری دہلوی



لطف مے لے کے پیے ہیں قدحِ غم کیا کیا
ہم نے فردوس بنائے ہیں جہنم کیا کیا
آنسوؤں کو بھی پیا جرعۂ صہبا کی طرح
ساغر و جام بنے دیدۂ پُرنم کیا کیا!
حلقۂ دامِ وفا، عقدۂ غم، موجِ نشاط
یہ زمانہ بھی دکھاتا ہے پیچ و خم کیا کیا!
لذتِ ہجر کبھی، عشرتِ دیدار کبھی
آرزو نے بھی طبیعت کو دیے دم کیا کیا!
کس کس انداز سے کھٹکے رگِ گل کے نشتر
تپش افروز ہوئے شعلۂ شبنم کیا کیا!
شامِ ویراں کی اداسی، شبِ تیرہ کا سکوت
دلِ محزوں کو ملے ہمدم و محرم کیا کیا!
ہائے وہ عالمِ بے نام کہ جس عالم میں
بیت جاتے ہیں دلِ زار پہ عالم کیا کیا!
عصمت و رفعتِ انجم سے خیال آتا ہے
خاک میں روندی گئی حرمتِ آدم کیا کیا
دب گئے منتِ مزدور سے ایواں کتنے
جھک گئے غیرتِ مفتوح سے پرچم کیا کیا
تھے مسلّح غمِ معشوق سے گو ہم اختر
پھر بھی دکھلائے غمِ دہر نے دم خم کیا کیا!



پُر کیف فضائیں ہوتی ہیں، پُر نور اُجالے ہوتے ہیں
جب خاک بسر دل ہوتا ہے اور عرش پہ نالے ہوتے ہیں
ہنستے ہیں وہاں زخم سے ہم، گاتے ہیں فغاں کے بربط پر
آشفتہ سروں کی دنیا کے سب ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں
کیا قہر برستا ہے دل پر ساون کی شبوں میں کیا کہیے
کچھ درد کی پھواریں ہوتی ہیں، کچھ یاس کے جھالے ہوتے ہیں
ان اجڑے ہوئے ارمانوں کو کس شوق سے دل نے سینچا تھا
برباد مگر ہوتے ہیں وہی جو ناز کے پالے ہوتے ہیں
چاہت کے ستم برداشت کریں، مر مر کے جئیں اور مر نہ سکیں
کیا جانیے کس مٹی کے بنے یہ چاہنے والے ہوتے ہیں
دل تنگ نہ ہو اے رہروِ غم! کانٹوں کیلئے تو کم سے کم
مانندِ نویدِ ابرِ کرم یہ پاؤں کے چھالے ہوتے ہیں
اُف ہائے وہ نزاکت لہجے کی، باتیں جو نکلتی ہیں منہ سے
یا چاندنی کی کرنیں ہوتی ہیں، یا برف کے گالے ہوتے ہیں
یہ دردِ جنوں، یہ سوزِ جگر، ان کیفیتوں کے گرد اختر
تسخیر کے حلقے ہوں کہ نہ ہوں، تقدیس کے ہالے ہوتے ہیں

اختر انصاری دہلوی



شعلے بھڑکاؤ، دیکھتے کیا ہو!
جل اٹھے گھاؤ، دیکھتے کیا ہو!

غرقِ خوناب ہونے والی ہے
درد کی ناؤ، دیکھتے کیا ہو!

دل کسی یاد نے چھُوا ہوگا
آگے بڑھ جاؤ، دیکھتے کیا ہو!

انجمِ چرخ! انسکرِ آدم کا
چل گیا داؤ، دیکھتے کیا ہو!

پیئے بیٹھے ہیں زہرِ دوراں ہم
جام اٹھواؤ، دیکھتے کیا ہو!

حسن سے لو نظر کی بھیک اخترؔ
ہاتھ پھیلاؤ، دیکھتے کیا ہو!



مطربِ دل کی وہ تانیں کیا ہوئیں؟
وہ تخیل کی اڑانیں کیا ہوئیں؟

کیا ہوئے وہ ترچھی نظروں کے خدنگ؟
ابروؤں کی وہ کمانیں کیا ہوئیں؟

وہ ادائیں جن پہ ہوتی تھیں نثار
چاہنے والوں کی جانیں، کیا ہوئیں

کیا ہوئے ٹوٹے دلوں کے زمزمے؟
بے زبانوں کی زبانیں کیا ہوئیں؟

کیا ہوئے اخترؔ امیدوں کے حصار؟
وہ عزائم کی چٹانیں کیا ہوئیں؟

اختر انصاری دہلوی



کسی سے لڑائیں نظر اور جھیلیں محبت کے غم، اتنی فرصت کہاں
اٹھائیں کسی ماہ پیکر حسینہ کے جور و ستم، اتنی فرصت کہاں

زمانے کی بے رحمیوں کے تصدق، دماغِ نشاط و الم ہی نہیں
دل اپنا کرے آرزوئے جفا، یا امیدِ کرم، اتنی فرصت کہاں

ڈبو دیں مئے ناب کی مستیوں میں فلاکت کے نکبت کے احساس کو
بنا لیں کسی عامیانہ سے کوزے ہی کو جامِ جم، اتنی فرصت کہاں

ہوں آزادِ افکار، لیکن تفکر میں ڈوبے ہوئے سے رہیں رات دن
طبیعت کی بے وجہ افسردگی کے مزے لوٹیں ہم، اتنی فرصت کہاں

نہ ماضی ہمارا، نہ مستقبل اپنا، کچھ اس طور سے صرفِ امروز ہیں
غمِ دوش یا فکرِ فردا میں اختر کریں سر کو خم، اتنی فرصت کہاں



یہ صنم روایت و نقل کے ہبل و منات سے کم نہیں!
ترا فکر واعظِ حق نوا! کسی سومنات سے کم نہیں!

کہیں برق چمکے میں جل اٹھوں، کوئی تارا ٹوٹے میں رو پڑوں
یہ دلِ ستم زدہ ہم نشیں! دلِ کائنات سے کم نہیں!

کہیں رنگ و نورِ جمال ہے، کہیں بیم و فکرِ مآل ہے
کہیں شام غیرتِ صبح ہے، کہیں دن بھی رات سے کم نہیں

جسے کہئے رقصِ شرارِ غم، وہ اگر ہو شاملِ غم تو پھر
غمِ دل ہو یا غمِ زندگی، غمِ کائنات سے کم نہیں

یہ سرودِ اخترِ دل زدہ رجزِ بہار و شباب ہے
یہ بلند ہوتی ہوئی فغاں علمِ حیات سے کم نہیں!

روش صدّیقی



ہوسِ خلوتِ خورشید و نشاں اور سہی
دُور ہے صبح تو یہ خوابِ گراں اور سہی

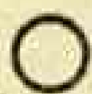
کچھ شکستہ سا ہے رنگینی و نکہت کا طلسم
یہی بیدادِ خزاں ہے تو خزاں اور سہی

مرحلے دانشِ حاضر کے تو سب ختم ہوئے
اک قدم جانبِ اقلیمِ گماں اور سہی

میری پلکیں بھی گراں بار رہی ہیں اے دوست
اب یہ آنسو ترے دامن پہ گراں اور سہی

جلوۂ حُسنِ بتاں سے ہے اگر دل کا زیاں
اے خداوند! مرے دل کا زیاں اور سہی

سینکڑوں رُخ ہیں محبت کی کہانی کے روؔش
ایک انداز حدیثِ دگراں اور سہی



اُس سے بڑھ کر تو کوئی بے سر و ساماں نہ ملا
دل ملا جس کو مگر درد عنبر بیاں نہ ملا

اِک ذرا ذوقِ تجسس میں بڑھایا تھا قدم
نکہتِ گل کو پھر آغوشِ گلستاں نہ ملا

بات اتنی سی ہے، اے واعظِ افلاک نشیں
کیا ملے گا اُسے یزداں، جسے انساں نہ ملا

اُن سے اب تذکرۂ دولتِ کونین ہے کیوں
جن غریبوں کو ترا گوشۂ داماں نہ ملا

خوبئ دولت و دانش پہ نظر ہے سب کی
کوئی اس دور میں دلدادۂ انساں نہ ملا

روشؔ صدیقی



سوالِ عشق پر تا حشر چپ رہنا پڑا مجھ کو
ہر اک الزام کو ہنستے ہوئے سہنا پڑا مجھ کو

کبھی مغرور طوفانوں کو بھی ٹھکرا دیا میں نے
کبھی اک موجِ غم کے ساتھ ہی بہنا پڑا مجھ کو

سکونِ دل بڑی دولت سہی، اے ہم نشیں لیکن
سکوں پا کر بھی اکثر مضطرب رہنا پڑا مجھ کو

زمانہ کس قدر بیگانۂ رسمِ محبت تھا
یہاں تو خود سے بھی ناآشنا رہنا پڑا مجھ کو

روشؔ! اس بزمِ رنگیں میں سکوتِ غم کا افسانہ
کہا جاتا نہ تھا مجھ سے مگر کہنا پڑا مجھ کو



فروغِ گل سے الگ، برقِ آشیاں سے الگ
لگی ہے آگ یہاں سے الگ، وہاں سے الگ

سکوتِ ناز نے اظہار کر دیا جس کا
وہ ایک بات تھی پیرایۂ بیاں سے الگ

سُنیں تو ہم بھی ذرا جبر و اختیار کی بات
کہاں کہاں ہیں یہ شامل، کہاں کہاں سے الگ

ہمارا حال زمانے سے کچھ جُدا تو نہیں
یہ داستاں نہیں دنیا کی داستاں سے الگ

خزاں کا ذکر ہی کیا ہے کہ اے روشؔ، ہم نے
بھری بہار گزاری ہے گلستاں سے الگ

روشؔ صدیقی



ربطِ پنہاں کی صداقت ہے نہ ملنا تیرا
تیرے ملنے ہی کی صورت ہے نہ ملنا تیرا

کیوں مرا شوقِ فراواں ہے بہ ہر لمحہ فزوں
کیا کوئی رازِ مشیت ہے نہ ملنا تیرا

لالہ و گل، مہ و انجم سے گلہ ہے کیا کیا
اور مقصودِ شکایت ہے نہ ملنا تیرا

کسی صورت کسی عنواں سے تلافی نہ ہوئی
کس قدر تلخ حقیقت ہے نہ ملنا تیرا

زندگی نے ترے ملنے کا بہانہ سمجھا
ورنہ دراصل قیامت ہے، نہ ملنا تیرا

پھر بھی تیرے لیے آوارۂ غربت ہے روشؔ
گرچہ شایانِ محبت ہے نہ ملنا تیرا



بُت گر ہے نہ کوئی بُت شکن ہے
سب وہم و گمان، برہمن ہے

یہ کون شریکِ انجمن ہے
آنکھوں کو بھی حسرتِ سخن ہے

آساں تو ہے جوئے شیر لیکن
کچھ اور ہی عزمِ کوہکن ہے

اے آتشِ دل، ادب ہے لازم
مجھ میں بھی وہ بوئے پیرہن ہے

ویران سی ہو چلی ہیں راہیں
رہبر ہے نہ کوئی راہزن ہے

اعجازِ غزل کہ خود روشؔ سے
وہ جانِ کلام ہم سخن ہے

روش صدیقی



عشق دشوار نہیں خوش نظری مشکل ہے
سہل ہے کوہ کنی، شیشہ گری مشکل ہے

اس میں شامل ہے مرا حسنِ طلب بھی اے دوست
ورنہ اس حسن سے بے داد گری مشکل ہے

لگ گئی دامنِ گیسوئے پریشاں کی ہوا
ہوش میں آئے نسیمِ سحری، مشکل ہے

مسندِ لالہ و ریحاں ہو کہ ہو تختۂ دار
ہم نشیں! چارۂ آشفتہ سری مشکل ہے

یہ حقیقت کوئی اربابِ خبر سے پوچھے
کس قدر مرحلۂ بے خبری مشکل ہے

دلِ بیدار کا اب اور ہی عالم ہے روشؔ
لب تک آجائے فغانِ سحری مشکل ہے



پشیماں ہیں ترکِ محبت کے بعد
بڑھیں الجھنیں اور، فرصت کے بعد

ابھی تو قیامت کا ہے آسرا
خدا جانے کیا ہو قیامت کے بعد

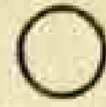
یہ حسنِ خلوصِ شکایت بجا
مگر کیا رہے گا شکایت کے بعد

وہ ہر بار ملتے ہیں اس شان سے
ملے جس طرح کوئی مدت کے بعد

محبت سے پہلے یہ عالم نہ تھا
کہاں آگئے ہم محبت کے بعد

روشؔ یہ خوش آہنگ رنگِ غزل
دل آویز ہے رنگِ حسرتؔ کے بعد

روش صدیقی



کہیں فسانۂ غم ہے، کہیں خوشی کی پکار
سُنے گا آج یہاں کون زندگی کی پکار

خدا شناس ہے زاہد، مگر نہیں معلوم
کہ آدمی کو جگاتی ہے آدمی کی پکار

لباسِ صبح میں ہے کوئی رہبرِ صادق
جگا رہی ہے اندھیرے کو روشنی کی پکار

فغانِ روحِ محبت تھی یا صدائے حبیب
سُنی تو ہے دلِ خاموش نے کسی کی پکار

ترا سکوت نہ رسوا کرے روشؔ تجھ کو
کہ دور دور پہنچتی ہے خامشی کی پکار



چلا ہے لے کے مجھے ذوقِ جستجو میرا
اب انتظار کر، اے جانِ آرزو میرا

میں بن سکا نہ ترا، یہ بجا سہی لیکن
کسی کو کیوں یہ گماں ہو، نہیں ہے تو میرا

ہوائے دشت بہت دور لے گئی اکثر
نہیں اسیرِ چمن ذوقِ رنگ و بو میرا

شکستِ دل کی تلافی، نظر سے کیا ہو گی
ٹپک پڑے نہ تری آنکھ سے لہو میرا

مری غزل کے لیے کون منتظر ہے روشؔ
پہنچ گیا ہے کہاں شوقِ گفتگو میرا

باقی صدیقی



وہ مقامِ دل و جاں کیا ہو گا — تو جہاں آخری پردا ہو گا

منزلیں راستہ بن جاتی ہیں — ڈھونڈنے والوں نے دیکھا ہو گا

سائے میں بیٹھے ہوئے سوچتے ہیں — کون اس دھوپ میں چلتا ہو گا

تیری ہر بات پہ چپ رہتے ہیں — ہم سا پتھر بھی کوئی کیا ہو گا

ابھی دل پر ہیں جہاں کی نظریں — آئنہ اور ابھی دھندلا ہو گا

راز سربستہ ہے محفل تیری — جو سمجھ لے گا وہ تنہا ہو گا

اس طرح قطعِ تعلق نہ کرو — اس طرح اور بھی چرچا ہو گا

بعدِ مدت کے چلے دیوانے — کیا ترے شہر کا نقشہ ہو گا

سب کا منہ تکتے ہیں یوں ہم جیسے — کوئی تو بات سمجھتا ہو گا

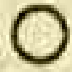
پھول یہ سوچ کے کھل اٹھتے ہیں — کوئی تو دیدۂ بینا ہو گا

خود سے ہم دور نکل آئے ہیں — تیرے ملنے سے بھی اب کیا ہو گا

ہم ترا راستہ تکتے ہوں گے — اور تو سامنے بیٹھا ہو گا

خود کو یاد آنے لگے ہم باقی
پھر کسی بات پہ جھگڑا ہو گا

باقی صدیقی



اُن کا یا اپنا تماشا دیکھو
جو دکھاتا ہے زمانہ دیکھو

وقت کے پاس ہیں کچھ تصویریں
کوئی ڈوبا ہے کہ اُبھرا دیکھو

رنگ ساحل کا نکھر آئے گا
دو گھڑی جانبِ دریا دیکھو

تلملا اُٹھا گھنا سناٹا
پھر کوئی نیند سے چونکا دیکھو

ہمسفر غیر ہُوئے جاتے ہیں
فاصلہ رہ گیا کتنا دیکھو

برف ہو جاتا ہے صدیوں کا لہو
ایک ٹھہرا ہُوا لمحہ دیکھو

رنگ اُڑتے ہیں تبسم کی طرح
آئنہ خانوں کا دعویٰ دیکھو

دل کی بگڑی ہُوئی صورت ہے جہاں
اب کوئی اور خرابہ دیکھو

یا کسی پردے میں گم ہو جاؤ
یا اُٹھا کر کوئی پردا دیکھو

دوستی خونِ جگر چاہتی ہے
کام مشکل ہے تو رستہ دیکھو

سادہ کاغذ کی طرح دل چُپ ہے
حاملِ رنگِ تمنا دیکھو

یہی تسکین کی صورت ہے تو پھر
چار دن غم کو بھی اپنا دیکھو

غمگساروں کا سہارا کب تک
خود پہ بھی کر کے بھروسا دیکھو

اپنی نسبت پہ نہ جاؤ باقیؔ
رُخ زمانے کی ہوا کا دیکھو

باقی صدیقی



صبح کا بھید ملا کیا ہم کو
لگ گیا رات کا دھڑکا ہم کو

شوقِ نظارا کا پردہ اُٹھا
نظر آنے لگی دنیا ہم کو

کشتیاں ٹوٹ گئی ہیں ساری
اب لیے پھرتا ہے دریا ہم کو

بھیڑ میں کھو گئے آخر ہم بھی
نہ مِلا جب کوئی رستہ ہم کو

تلخیٔ غم کا مداوا معلوم
پڑ گیا زہر کا چسکا ہم کو

تیرے غم سے تو سکوں ملتا ہے
اپنے شعلوں نے جلایا ہم کو

گھر کو یوں دیکھ رہے ہیں جیسے
آج ہی گھر نظر آیا ہم کو

ہم کہ شعلہ بھی ہیں اور شبنم بھی
تو نے کس رنگ میں دیکھا ہم کو

جلوۂ لالہ و گل ہے دیوار
کبھی ملتے سرِ صحرا ہم کو

لے اُڑی دل کو نسیمِ سحری
بُوئے گل کر گئی تنہا ہم کو

سیرِ گلشن نے کیا آوارہ
لگ گیا روگ صبا کا ہم کو

یاد آتی ہیں برہنہ شاخیں
تھام لے اے گُلِ تازہ ہم کو

لے گیا ساتھ اُڑا کر باقی
ایک سُوکھا ہُوا پتّہ ہم کو



کہتا ہے ہر مکیں سے مکاں، بولتے رہو
اس چپ میں بھی ہے جی کا زیاں، بولتے رہو

ہر یاد، ہر خیال ہے لفظوں کا سلسلہ
یہ محفلِ نوا ہے، یہاں بولتے رہو

موجِ صدائے دل پہ رواں ہے حصارِ زیست
جس وقت تک ہے منہ میں زباں، بولتے رہو

اپنا لہو ہی رنگ ہے، اپنی تپش ہی بُو
ہو فصلِ گل کہ دورِ خزاں، بولتے رہو

قدموں پہ بار ہوتے ہیں سُنسان راستے
لمبا سفر ہے ہمسفراں! بولتے رہو

ہے زندگی بھی ٹوٹا ہُوا آئنہ تو کیا
تم بھی بطرزِ شیشہ گراں بولتے رہو

باقی جو چُپ رہوگے تو اُٹھیں گی انگلیاں
ہے بولنا بھی رسمِ جہاں، بولتے رہو

باقی صدیقی



داغِ دل ہم کو یاد آنے لگے — لوگ اپنے دِیے جلانے لگے
کچھ نہ پا کر بھی مطمئن ہیں ہم — عشق میں ہاتھ کیا خزانے لگے
یہی رستہ ہے اب یہی منزل — اب یہیں دل کسی بہانے لگے
خود فریبی سی خود فریبی ہے — پاس کے ڈھول بھی سہانے لگے
اب تو ہوتا ہے ہر قدم پہ گماں — ہم یہ کیسا قدم اُٹھانے لگے
اس بدلتے ہوئے زمانے میں — تیرے قصے بھی کچھ پرانے لگے
رُخ بدلنے لگا فسانے کا — لوگ محفل سے اُٹھ کے جانے لگے
ایک پل میں وہاں سے ہم اُٹھے — بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے
اپنی قسمت سے ہے مفر کس کو — تیر پر اُڑ کے بھی نشانے لگے
ہم تک آئے نہ آئے موسمِ گُل — کچھ پرندے تو چہچہانے لگے
شام کا وقت ہو گیا باقیؔ
بستیوں سے شرار آنے لگے



اپنی دھوپ میں بھی کچھ جل
ہر سائے کے ساتھ نہ ڈھل

لفظوں کے پھولوں پہ نہ جا
دیکھ سروں پر چلتے ہل

دنیا برف کا تودہ ہے
جتنا جل سکتا ہے جل

غم کی نہیں آواز کوئی
کاغذ کالے کرتا چل

بن کے لکیریں اُبھرے ہیں
ماتھے پہ راہوں کے بل

میں نے تیرا ساتھ دیا
میرے منہ پہ کالک مل

آس کے پھول کھلے باقیؔ
دل سے گزرا پھر بادل

باقی صدیقی



وقت رستے میں کھڑا ہے کہ نہیں
دل سے اب پوچھ، خدا ہے کہ نہیں

صحبتِ شیشہ گراں سے انکار!
سنگ آئینہ بنا ہے کہ نہیں

ہر کرن وقتِ سحر کہتی ہے
روزنِ دل کوئی وا ہے کہ نہیں

رنگ ہر بات میں بھرنے والو
قصّہ کچھ آگے بڑھا ہے کہ نہیں

زندگی جرم بنی جاتی ہے
جرم کی کوئی سزا ہے کہ نہیں

دوست ہر عیب چھپا لیتے ہیں
کوئی دشمن بھی ترا ہے کہ نہیں

زخمِ دل منزلِ جاں تک آئے
سنگِ رہ ساتھ چلا ہے کہ نہیں

کھو گئے راہ کے سنّاٹے میں
اب کوئی دل کی صدا ہے کہ نہیں

ہم ترسنے لگے بوئے گل کو
کہیں گلشن میں صبا ہے کہ نہیں

حکمِ حاکم ہے کہ خاموش رہو
بولو اب کوئی گلہ ہے کہ نہیں

چپ تو ہو جاتے ہیں لیکن باقیؔ
اس میں بھی اپنا بھلا ہے کہ نہیں



اس کارگہِ رنگ میں ہم تنگ نہیں کیا
جو سر پہ لگا ہے ابھی وہ سنگ نہیں کیا

تصویر کو تصویر دکھائی نہیں جاتی
اِس آئینہ خانے میں نظر دنگ نہیں کیا

ہے حلقۂ جاں اپنی و خاؤں کا تصوّر
اِس داغ سے آگے کوئی فرسنگ نہیں کیا

ہر بات پہ ہم دیتے ہیں غیروں کا حوالہ
اپنا کوئی آہنگ، کوئی رنگ نہیں کیا

بخشے ہوئے اک گھونٹ پہ ہم جھوم رہے ہیں
اب مانگ کے پینا بھی کوئی ننگ نہیں کیا

زخمِ دلِ بیتاب ہے ہاتھوں میں نوالہ
اس بات پہ دنیا سے مری جنگ نہیں کیا

وہ رنگ نہیں شعلۂ احساس میں باقیؔ
ہم سازِ تمنّا سے ہم آہنگ نہیں کیا

باقی صدیقی



تانے درد کے جھونکے بن کر آتے ہیں
ہم بھی نیند کی صورت اُڑتے جاتے ہیں

جب انداز بہاروں کے یاد آتے ہیں
ہم کاغذ پر کیا کیا پھول بناتے ہیں

وقت کا پتھر بھاری ہوتا جاتا ہے
ہم مٹی کی صورت دبتے جاتے ہیں

کیا ذرّوں کا جوش صبا نے چھین لیا
گلشن میں کیوں یاد بگولے آتے ہیں

دنیا نے ہر بات میں کیا کیا رنگ بھرے
ہم سادہ اوراق اُلٹتے جاتے ہیں

دل ناداں ہے شاید راہ پہ آ جائے
تم بھی سمجھاؤ، ہم بھی سمجھاتے ہیں

تم بھی اُلٹی اُلٹی باتیں پوچھتے ہو
ہم بھی کیسی کیسی قسمیں کھاتے ہیں

بیٹھ کے روئیں کس کو فرصت ہے باقیؔ
بھولے بسرے قصے یاد تو آتے ہیں



خبر کچھ ایسی اُڑائی کسی نے گاؤں میں
اُداس پھرتے ہیں ہم بیریوں کی چھاؤں میں

نظر نظر سے نکلتی ہیں درد کی ٹیسیں
قدم قدم پہ وہ کانٹے چبھے ہیں پاؤں میں

ہر ایک سمت سے اُڑ اُڑ کے ریت آتی ہے
ابھی ہے زور وہی دشت کی ہواؤں میں

غموں کی بھیڑ میں اُمید کا وہ عالم ہے
کہ جیسے ایک سخی ہو کئی گداؤں میں

ابھی ہے گوش بر آواز گھر کا سناٹا
ابھی کشش ہے بڑی دور کی صداؤں میں

چلے تو ہیں کسی آہٹ کا آسرا لے کر
بھٹک نہ جائیں کہیں اجنبی فضاؤں میں

دھواں دھواں سی ہے کھیتوں کی چاندنی باقیؔ
کہ آگ شہر کی اب آ گئی ہے گاؤں میں

یوسف ظفر



پانی کو آگ کہہ کے نکھر جانا چاہیئے
پلکوں پہ اشک بن کے ٹھہر جانا چاہیئے

صوت و سخن کے دائرے تحلیل ہو گئے
قوسِ نظر سے دل میں اُتر جانا چاہیئے

احساس کی زباں کو لُغت سے نکال کر
معنی کی سرحدوں سے گزر جانا چاہیئے

دنیا کی وسعتیں ہیں بہ اندازۂ نظر
یہ دیکھنے کا کام ہے، کر جانا چاہیئے

تنہا نظر پہ کیجئے کِس دل سے اعتبار
دل کو بھی تا بہ حدِّ نظر جانا چاہیئے

غم ہائے زندگی سے نہ تھا عمر بھر فراغ
اب کچھ تو زندگی کو سنور جانا چاہیئے

جاؤں کہاں بلکہ خود مری راہیں سفر میں ہیں
راہیں سفر میں ہوں تو کدھر جانا چاہیئے

زنجیریٔ مکاں ہے جہاں حُسنِ لامکاں
اس انجمن میں بارِ دگر جانا چاہیئے

زمزم حریمِ کعبہ میں ہے مامتا کا دل
ہے شرطِ زیست ڈوب کے مر جانا چاہیئے

جاں ہو اگر متاعِ طلب سے عزیز تر
پروانوں کو چراغ سے ڈر جانا چاہیئے

یارو سُنا ہے آپ میں گُم ہو گیا ظفرؔ
اُس خانماں خراب کے گھر جانا چاہیئے

یوسف ظفر



وہ میری جان ہے، دل سے کبھی جُدا نہ ہُوا
کہ اُس کا غم ہی مری زیست کا بہانہ ہُوا

نظر نے جھک کے کہا مجھ سے کیا دمِ رخصت
میں سوچتا ہوں کہ کس دل سے وہ روانہ ہُوا

نمِ صبا، مئے مہتاب، عطرِ زلفِ شمیم
وہ کیا گیا کہ کوئی کارواں روانہ ہُوا

وہ یاد یاد میں جھلکا ہے آئینے کی طرح
اس آئینے میں کبھی اپنا سامنا نہ ہُوا

وہ چند ساعتیں جو اس کے ساتھ گزری ہیں
انہی کا دور رہا، اور جاودانہ ہُوا

میں اس کے ہجر کی تاریکیوں میں ڈوبا تھا
وہ آیا گھر میں مرے اور چراغ خانہ ہُوا

وہ لوٹ آیا ہے یا میری خود فریبی ہے
نگاہ کہتی ہے، دیکھے اُسے زمانہ ہُوا

میں اپنے درد کی نسبت کو دل سمجھتا ہوں
قفس جو ٹوٹ گیا، میرا آشیانہ ہُوا

اُسی کی یاد ہے سرمایۂ حیاتِ ظفر
نہیں تو میرا ہے کیا، میں ہُوا ہُوا، نہ ہُوا

یوسف ظفر



شہر لگتا ہے بیابان مجھے
کہیں ملتا نہیں انسان مجھے

میں ترا نقشِ قدم ہوں اے دوست
اپنے انداز سے پہچان مجھے

میں تجھے جان سمجھ بیٹھا ہوں
اپنے سائے کی طرح جان مجھے

تو کہاں ہے کہ ترے پردے میں
لیے پھرتا ہے ترا دھیان مجھے

تیری خوشبو کو صبا لائی تھی
کر گئی اور پریشان مجھے

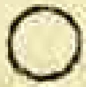
سر و سامانِ دو عالم ہوں میں
کیوں کہو بے سر و سامان مجھے

میری ہستی ترا افسانہ تھی
موت نے دے دیا عنوان مجھے

دل کی دھڑکن پہ گماں ہوتا ہے
ڈھونڈتا ہے کوئی ہر آن مجھے

میں بھی آئینہ ہوں تیرا لیکن
تو نے دیکھا کبھی حیران مجھے

ان کی نسبت کا کرشمہ ہے ظفرؔ
کہتے ہیں یوسفِ کنعان مجھے



ہے گلو گیر بہت رات کی پہنائی بھی
تیرا غم بھی ہے مجھے اور غمِ تنہائی بھی

دشتِ وحشت میں بجز ریگِ رواں کوئی نہیں
آج کل شہر میں ہے لالۂ صحرائی بھی

میں زمانے میں ترا غم ہوں بعنوانِ وفا
زندگی میری سہی ہے تری رسوائی بھی

آج تو نے بھی مرے حال سے منہ پھیر لیا
آج نمناک ہوئی چشمِ تماشائی بھی

اب کھلا ہے کہ ترا حسنِ تغافل تھا کرم
گرچہ کچھ دیر طبیعت مری گھبرائی بھی

جز غمِ دہر مجھے کوئی نہ پہچان سکا
ترے کوچے میں تری یاد مجھے لائی بھی

ان کی محفل میں ظفرؔ لوگ مجھے چاہتے ہیں
وہ جو کل کہتے تھے، دیوانہ بھی سودائی بھی

یوسف ظفر



ہم گرچہ دل و جاں سے بیزار ہوئے ہیں
خوش ہیں کہ ترے غم کے سزاوار ہوئے ہیں

اُٹھے ہیں ترے در سے اگر صورتِ دیوار
رخصت بھی تو جوں سایۂ دیوار ہوئے ہیں

کیا کہئے، نظر آتی ہے کیوں خواب یہ دنیا
کیا جانئے کس خواب سے بیدار ہوئے ہیں

آنکھوں میں ترے جلوے لیے پھرتے ہیں ہم لوگ
ہم لوگ کہ رُسوا سرِ بازار ہوئے ہیں

کچھ دیکھ کے پیتے ہیں لہو اہلِ تمنّا
مےخوار، کسی بات پہ مےخوار ہوئے ہیں

زنجیرِ حوادث کی ہے جھنکار بہر گام
کیا جرم کیا تھا کہ گرفتار ہوئے ہیں

اظہارِ غمِ زیست کریں کیا، کہ ظفر ہم
وہ غم ہیں کہ شرمندۂ اظہار ہوئے ہیں



میں ہوں تیرے لیے بے نام و نشاں آوارہ
زندگی! میرے لیے تو ہے کہاں آوارہ

تجھ سے کٹ کر کوئی دیکھے تو کہاں پہنچا ہوں
جیسے ندی میں کوئی سنگِ رواں آوارہ

تجھ کو دیکھا ہے کہیں، تجھ کو کہاں دیکھا ہے
وہم ہے سرگریباں و گماں آوارہ

دیر و کعبہ کی روایات سے انکار نہیں
اُڑ دو دن، تو پھریں نعرہ زناں آوارہ

تیرے دامن کی طرح دامنِ شب رخشندہ
میرے اشکوں کی طرح کون دمکاں آوارہ

جلتے بجھتے ہیں ہر اک گام پہ تابندہ نجوم
کوئی ہے آج سرِ کاہکشاں آوارہ

بھیگی راتوں میں ظفر پھرتا ہے تنہا تنہا
آہ! وہ سوختہ دل، سوختہ جاں، آوارہ

یوسف ظفر



پکارتا ہوں کہ تم حاصلِ تمنا ہو
اگرچہ میری صدا بھی صدا بصحرا ہو

جہاں تمہارا ہے، ہو گا وہی جو تم چاہو
مجھے بھی چاہیے دو کچھ اگر، تو پھر کیا ہو

جہانِ اہلِ جہاں کو کسی سے کام نہیں
مرے قریب تو آؤ کہ تم بھی تنہا ہو

زمانہ مدفنِ ایام ہے، خموش رہو
نہ جانے کون ہمارے صدا کو سنتا ہو

بھرم کھلا ہے تو ایسے ہر اک کو دیکھتا ہوں
کہ جیسے میں نے کبھی آدمی نہ دیکھا ہو

ترا کرم ہے کہ میں تیرے دم سے جیتا ہوں
مرا نصیب کہ تو میرے دم سے سوا ہو

ترے خیال میں گم ہو کے طے کئے میں نے
وہ مرحلے کہ جہاں موج آبلہ پا ہو

سزائے زیست قیامت سہی، مگر ہم لوگ
وہ زندہ ہیں جنہیں ہر روز، روزِ فردا ہو

دھڑکتے دل کی صدا بھی عجیب شے ہے ظفر
کہ جیسے کوئی مرے ساتھ چلتا ہو



یارو ہر غم، غمِ یاراں ہے، قریب آ جاؤ
پیارو، پھر فصلِ بہاراں ہے، قریب آ جاؤ

دور ہو کر بھی سنیں تم نے حکایاتِ وفا
قرب میں بھی وہی عنواں ہے، قریب آ جاؤ

ہم محبت کے مسافر ہیں، کہیں دیکھ نہ لے
گھات میں گردشِ دوراں ہے، قریب آ جاؤ

جاؤ اب جاؤ کہ وہ عہدِ وفا ختم ہوا
جب بھی دیکھو کہ پھر امکاں ہے، قریب آ جاؤ

آج دنیا کو نہیں اپنے غموں سے فرصت
آج مل بیٹھنا آساں ہے، قریب آ جاؤ

میرے ہی پہلوئے سوزاں میں سکوں ممکن ہے
چار سو گردشِ دوراں ہے، قریب آ جاؤ

میں زمانے کی کڑی دھوپ کا مارا ہوں ظفر
تم جہاں ہو چمنستان ہے، قریب آ جاؤ



کیا ڈھونڈنے آئے ہو نظر میں
دیکھا ہے تمہیں کو عمر بھر میں

معیارِ جمال و رنگ و بو تھے ق
جب تک رہے میری چشمِ تر میں

اب خواب و خیال بن گئے ہو
اب دل میں رہو، رہو نظر میں

وہ رنگ تمہارے کام آیا
اڑتا ہے جو غم کی دوپہر میں

ہائے یہ طویل و سرد راتیں
اور ایک حیاتِ مختصر میں

اب صورتِ حال بن گیا ہوں
ملتا ہوں نگاہِ چارہ گر میں

یا اور ستارے اور شبنم
یا مر رہیں دامنِ سحر میں

یا منزلِ مہر و ماہ بھی ہے
یا راہِ فرار ہے سفر میں

وہ بھی تو ظفر سے خوش نہیں ہیں
رہتے ہیں جو دیدۂ خضر میں



میں لپٹتا رہا ہوں خاروں سے
تم نے پوچھا نہیں بہاروں سے

چاندنی سے، سحاب پاروں سے
جی بہلتا ہے یادگاروں سے

آ مرے چاند! رات سونی ہے
بات بنتی نہیں ستاروں سے

منزلِ زندگی ہے کتنی دور؟
پوچھ لیتا ہوں رہگذاروں سے

بات جب بھی چھڑی محبت کی
خامشی بول اٹھی مزاروں سے

ایک بھی آفتاب بن نہ سکا
لاکھ ٹوٹے ہوئے ستاروں سے

شامِ غم بھی گزر گئی ہے ظفر
کھیلتے کھیلتے غباروں سے

ادا جعفری

جب دِل کی رہگزر پہ ترا نقشِ پا نہ تھا،
جینے کی آرزو تھی مگر حوصلہ نہ تھا

آگے حریمِ غم سے کوئی راستہ نہ تھا
اچھا ہُوا کہ ساتھ کسی کو لیا نہ تھا

دامانِ چاک چاک گلوں کو بہا نہ تھا
ورنہ نگاہ و دل میں کوئی فاصلہ نہ تھا

کچھ لوگ شرمسار، خدا جانے کیوں ہُوئے
ان سے تو روحِ عصر، ہمیں کچھُ گلہ نہ تھا

جلتے رہے خیال، برستی رہی گھٹا
ہاں نازِ آگہی تجھے کیا کچھُ روا نہ تھا

سنسان دوپہر ہے، بڑا جی اداس ہے
کہنے کو ساتھ ساتھ ہمارے زمانہ تھا

ہر آرزو کا نام نہیں آبروئے جاں
ہر تشنہ لب جمالِ رُخِ کربلا نہ تھا

آندھی میں برگِ گل کی زباں سے ادا ہُوا
وہ راز جو کسی سے ابھی تک کہا نہ تھا

ادا جعفری



وہ لمحہ کہ خاموشیٔ شب نغمہ سرا تھی،
کانوں پہ گراں دل کے دھڑکنے کی صدا تھی
جس موڑ پہ چھوڑی ہے سہاروں کی متاع
کہتے ہیں، بڑا قہر وہی لغزشِ پا تھی
کیوں آج دھواں بن کے اُفق تا بہ اُفق ہے
اس سانس میں کلیوں کے چٹکنے کی صدا تھی
ہر لحظۂ بے تاب نے ڈھونڈی ہیں پناہیں؛
گونجی تھی خموشی، تری آواز تو کیا تھی
ہر دن کے صحیفے پہ ترا نام لکھا ہے
ہر شب کی جبیں تیرا نشانِ کفِ پا تھی
کیا کہیے کہ ہونٹوں پہ بس اِک حرفِ وفا تھا
کیا کیجئے ہر سانس جو تعزیرِ وفا تھی
اُٹھتے ہوئے دیکھا ہے دھواں آتشِ گل سے
کیا نکہتِ برباد جلے دل کی دُعا تھی
کیا جانیئے، مرنا بھی روا ہے کہ نہیں ہے
تکوین کے لب پر مرے جینے کی دُعا تھی

ادا جعفری



کیا جانیے کس بات پہ مغرور رہی ہوں
کہنے کو تو جس راہ چلایا ہے چلی ہوں

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

پھولوں کے کٹوروں سے چھلک پڑتی ہے شبنم
ہنسنے کو ترے پیچھے بھی سو بار ہنسی ہوں

تیرے لیے تقدیر مری جنبشِ ابرو
اور میں ترا ایمائے نظر دیکھ رہی ہوں

صدیوں سے مرے پاؤں تلے جنتِ انساں
میں جنتِ انساں کا پتہ پوچھ رہی ہوں

دل کو تو یہ کہتے ہیں کہ بس قطرۂ خوں ہے
کس آس پہ اے سنگِ سرِ راہ چلی ہوں

جس ہاتھ کی تقدیس نے گلشن کو سنوارا
اس ہاتھ کی تقدیر پہ آزردہ رہی ہوں

قسمت کے کھلونے ہیں اُجالا کہ اندھیرا
دل شعلہ طلب تھا سو بہر حال جلی ہوں



شاید ابھی ہے راکھ میں کوئی شرار بھی
کیوں ورنہ انتظار بھی ہے، اضطرار بھی

دھیان آ گیا تھا مرگِ دلِ نامراد کا
ملنے کو مل گیا ہے سکوں بھی قرار بھی

اب ڈھونڈنے چلے ہو مسافر کو دوستو
حدِ نگاہ تک نہ رہا جب غبار بھی

ہر آستاں پہ ناصیہ فرسا ہیں آج وہ
جو کل نہ کر سکے تھے ترا انتظار بھی

اک راہ رُک گئی تو ٹھٹک کیوں گئیں ادا
آباد بستیاں ہیں پہاڑوں کے پار بھی

ادا جعفری



کہتے ہیں کہ اب ہم سے خطاکار بہت ہیں
اِک رسمِ وفا تھی سو وفادار بہت ہیں

لہجے کی کھنک ہو کہ نگاہوں کی صداقت
یوسف کے لیے مصر کے بازار بہت ہیں

کچھ زخم کہ زحمت ہیں گُلِ تر کے قریں تھے
کچھ نقش کہ ہیں نقش بہ دیوار بہت ہیں

راہوں میں کوئی آبلہ پا اب نہیں ملتا
رستے میں مگر قافلہ سالار بہت ہیں

اِک خواب کا احساں بھی اٹھائے نہیں اُٹھتا
کیا کہیے کہ آسودۂ آزار بہت ہیں

کیوں اہلِ وفا! زحمتِ بیداد نگاہی
جینے کے لیے اور بھی آزار بہت ہیں

ہر جذبۂ بے تاب کے احکام ہزاروں
ہر لمحۂ بے خواب کے اصرار بہت ہیں

پلکوں تلک آ پہنچے نہ کرنوں کی تمازت
اب تک تو ادا آئینہ بردار بہت ہیں



بیگانگیِ طرزِ ستم بھی بہانہ ساز
بیچارگیِ کرب و الم بھی بہانہ ساز

کچھ بُت بنا لیے ہیں چٹانیں تراش کر
دل بھی بہانہ ساز ہے غم بھی بہانہ ساز

عذرِ وفا کے ساتھ جلاتے رہے چراغ
کھلتا ہے اب کہ دیدۂ نم بھی بہانہ ساز

پابندیِ رسومِ وفا بھی بہانہ جو
ترکِ وفا و شیوۂ رم بھی بہانہ ساز

ہر لمحۂ حیات کا تنہا رہا وجود
دلداریِ نگاہِ کرم بھی بہانہ ساز

کچھ دور ساتھ ساتھ تھے، اتنا تو یاد ہے
صحرائے غم میں نقشِ قدم بھی بہانہ ساز

سب سے بڑا فریب ہے خود زندگی ادا
اس حیلہ جو کے ساتھ ہیں ہم بھی بہانہ ساز

ادا جعفری



زباں کو حکم، نگاہِ کرم کو پہچانے
نگہ کا جُرم، غبارِ الم کو پہچانے

وہ ایک جام کہاں ہر کسی کی قسمت میں
وہ ایک ظرف کہ اعجازِ سم کو پہچانے

متاعِ درد پرکھنا تو بس کی بات نہیں
جو تجھ کو دیکھ کے آئے وہ ہم کو پہچانے

وہ دل جو خاک ہوئے آج تک دھڑکتے ہیں
رہِ وفا، ترے معجزِ ستم کو پہچانے

سحر سے پہلے یہاں آفتاب اُبھرے ہیں
خلوصِ بندگی چشمِ نم کو پہچانے

یہ خود فریب اُجالے، یہ ہاتھ ہاتھ دیئے
دیئے بجھاؤ کہ انسان غم کو پہچانے

کسی خیال کا سایہ، کسی اُمید کی دھوپ
کوئی تو آئے کہ دل کیف و کم کو پہچانے

ہزار کوس نگاہوں سے دل کی منزل تک
کوئی قریب سے دیکھے تو ہم کو پہچانے

جو ہم سفر بھی رہے ہیں شریکِ منزل بھی
کچھ اجنبی تو نہ تھے پھر بھی کم کو پہچانے

بہت دنوں تو ہواؤں کا ہم نے رُخ دیکھا
بڑے دنوں میں متاعِ قلم کو پہچانے

○

آخری ٹیس آزمانے کو
جی تو چاہا تھا مسکرانے کو

یاد اتنی بھی سخت جاں تو نہیں
اک گھروندا رہا ہے ڈھانے کو

سنگریزوں میں ڈھل گئے آنسو
لوگ ہنستے رہے دکھانے کو

زخمِ نغمہ بھی لَو تو دیتا ہے
اک دیا رہ گیا جلانے کو

جلنے والے تو جل بجھے آخر
کون دیتا خبر زمانے کو

کتنے مجبور ہو گئے ہوں گے
ان کہی بات منہ پہ لانے کو

کھل کے ہنسنا تو سب کو آتا ہے
لوگ ترسے ہیں اک بہانے کو

ریزہ ریزہ بکھر گیا انساں
دل کی ویرانیاں جتانے کو

حسرتوں کی پناہ گاہوں میں
کیا ٹھکانے ہیں سر چھپانے کو

ہاتھ کانٹوں سے کر لیے زخمی
پھول بالوں میں اک سجانے کو

آس کی بات ہو کہ سانس ادا
یہ کھلونے تھے ٹوٹ جانے کو

ادا جعفری



توفیق سے کب کوئی سروکار چلے ہے
دنیا میں فقط طالعِ بیدار چلے ہے

ٹھہروں تو چٹانوں سی کلیجے پہ کھڑی ہے
جاؤں تو مرے ساتھ ہی دیوار چلے ہے

ہر غنچہ بڑے چاؤ سے کھلتا ہے چمن میں
ہر دور کا منصور سرِ دار چلے ہے

رنگوں کی نہ خوشبو کی کمی ہے دل و جاں کو
توشہ جو چلے ساتھ وہ اِک خار چلے ہے

دل کے لیے بس آنکھ کا معیار بہت ہے
جو سکۂ جاں ہے، سرِ بازار چلے ہے

حیرت سے شگوفوں کی جھپکتی نہیں آنکھیں
کِس آن سے کانٹوں کا خریدار چلے ہے

خورشید وہاں ہم نے سلگتے ہوئے دیکھے
کرنوں کا جِس آشوب میں بیوپار چلے ہے

اِک جنبشِ مژگاں کی اجازت بھی نہیں ہے
دل ساتھ چلا ہے کہ ستمگار چلے ہے

تھے خضر بھی لاکھوں یہاں عیسیٰ بھی بہت تھے
آزار جو دل کا ہے سو آزار چلے ہے



چاکِ دل بھی کبھی سِلتے ہونگے
لوگ بچھڑے ہوئے مِلتے ہونگے

روز و شب کے اِنہی ویرانوں میں
خواب کے پھول تو کِھلتے ہونگے

نازپروردہ تبسم سے کہیں،
سلسلے درد کے مِلتے ہونگے

ہم بھی خوشبو ہیں، صبا سے کہیو
ہم نفس روز نہ مِلتے ہونگے

صُبح زنداں میں بھی ہوتی ہوگی
پھول مقتل میں بھی کِھلتے ہونگے

اجنبی شہر کی گلیوں میں ادا
دل کہاں، لوگ ہی مِلتے ہونگے

سراج الدّین ظفر



شوق راتوں کو ہے درپے کہ تپاں ہو جاؤں
رقصِ وحشت میں اُٹھوں اور دھواں ہو جاؤں

ساتھ اگر بادِ سحر دے تو پسِ محملِ یار
اک بھٹکتی ہُوئی آوازِ فغاں ہو جاؤں

اب یہ احساس کا عالم ہے کہ شاید کسی رات
نفسِ سرد سے بھی شعلہ بجاں ہو جاؤں

لا صراحی کہ کروں وہم و گماں غرقِ شراب
اس سے پہلے کہ میں خود وہم و گماں ہو جاؤں

وہ تماشا ہوں، ہزاروں مرے آئینے ہیں
ایک آئینے سے مشکل ہے، عیاں ہو جاؤں

شوق میں ضبط ہے ملحوظ مگر کیا معلوم
کس گھڑی بے خبرِ سود و زیاں ہو جاؤں

ایسا اندازِ غزل ہو کہ زمانے میں ظفر
دورِ آیندہ کی قدروں کا نشاں ہو جاؤں



ہم آہوانِ شب کا بھرم کھولتے رہے
میزانِ دلبری پہ اُنھیں تولتے رہے

عکسِ جمالِ یار بھی کیا تھا کہ دیر تک
آئینے قمریوں کی طرح بولتے رہے

کیا کیا تھا حلِ مسئلۂ زندگی میں لطف
جیسے کسی کا بندِ قبا کھولتے رہے

پوچھو نہ کچھ کہ ہم سے غزالانِ بزمِ شب
کس شہرِ دلبری کی زباں بولتے رہے

کل شب تھا ذکرِ حور بھی ذکرِ بتاں کے ساتھ
زہد و صفا اِدھر سے اُدھر ڈولتے رہے

اپنا بھی وزن کر نہ سکے لوگ، اور ہم
رُوحِ ورائے روح کو بھی تولتے رہے

سرمایۂ ادب تھی ہماری غزل ظفر
اشعارِ نغز تھے کہ گہر رولتے رہے



اے اہلِ نظر سوز ہمیں ساز ہمیں ہیں
عالم میں پسِ پردۂ پرواز ہمیں ہیں

اے جبرِ مشیت، بہ ہمہ بے پرو بالی
اب بھی ہے جنہیں ہمتِ پرواز ہمیں ہیں

خوش ہیں کہ نہیں اس ستم آرا کا ستم عام
نازاں ہیں کہ اس کے ہدفِ ناز ہمیں ہیں

وہ انجمنِ نازِ بتاں ہو کہ سرِ دار
جس سمت سے گزرے ہیں سرافراز ہمیں ہیں

دیکھیں جو کسی اور طرف بھی وہ سرِ بزم
مقصودِ نگاہِ غلط انداز ہمیں ہیں

اے شاہدِ معنیٰ! صفِ شیریں سخناں میں
ہے کوئی اگر شاعرِ طنّاز ہمیں ہیں

اے جانِ ظفرؔ حافظ و سعدی کی فضا میں
اب وارثِ مے خانۂ شیراز ہمیں ہیں



اور کھل جا کہ معارف کی گزرگاہوں میں
پیچ اے زلفِ سیہ فام ابھی باقی ہیں

اک سبو اور کہ لوحِ دلِ مے نوشاں پر
کچھ نقوشِ سحر و شام ابھی باقی ہیں

ٹھہر اے بادِ سحر، اس گلِ نورستہ کے نام
اور بھی شوق کے پیغام ابھی باقی ہیں

اے حریفانِ سبو، گوش بر آواز رہو
دامنِ وحی میں الہام ابھی باقی ہیں

طول کھینچ اے شبِ میخانہ کہ سب کارِ سیا
بہ ہمہ لذتِ اقدام ابھی باقی ہیں

اور ابھی روندا نہیں اے کفِ پائے تحقیق
دل میں سو طرح کے اوہام ابھی باقی ہیں

اے سہی قد، تری نسبت سے سب اونچی قدریں
باوجودِ روشِ عام ابھی باقی ہیں

ہم میں کل کے نہ سہی حافظ و خیام، ظفرؔ
آج کے حافظ و خیام ابھی باقی ہیں

سراج الدین ظفرؔ



یا رب، سرابِ اہلِ ہوس سے نجات دے
مجھ کو شراب دے، اُنہیں آبِ حیات دے

آ ہم بھی رقصِ شوق کریں، رقصِ گُل کے ساتھ
اے گردشِ زماں، میرے ہاتھوں میں ہات دے

اپنا سبو بھی آئینۂ جم سے کم نہیں
رکھّیں جو رُو و بُرو خبرِ شش جہات دے

اے دستِ راز، مرکبِ دوراں ہے سُست رَو
لا میرے ہاتھ میں رسنِ کائنات دے

کچھ تو کھُلے کہ کیا ہے پسِ پردۂ حیات
کوئی بتا تو آئینۂ حسنِ ذات دے

اے دوست، اس زمان و مکاں کے عذاب میں
دشمن ہے جو کسی کو دعائے حیات دے

اُٹھ رہ گُذر سے، لے درِ مے خانہ کے گدا!
مسند پہ بیٹھ، فیصلۂ کائنات دے

اس موجۂ سرور کی ہے آرزو ظفرؔ،
جو طبع کو روانیِ نیل و فرات دے



دن کو جبرِ دہر کا سینہ چیر کر رکھ دیجیے
رات کو پھر پائے گُل رویاں پہ سر رکھ دیجیے

دیکھیے پھر کیا دمکتے ہیں گُل اندامانِ شہر
اِک ذرا ان میں محبت کا شرر رکھ دیجیے

آ ہوانِ شب گریزاں ہوں تو اُن کی راہ میں
دامِ دل رکھ دیجیے، دامِ نظر رکھ دیجیے،

بُت پرستی کیجیے اِس شدّتِ احساس سے
سنگ میں بھی جزوِ احساس و خبر رکھ دیجیے

زُہد اگر جنگ آزما ہو، کھینچیے شمشیرِ شوق
حُسن اگر مدِ مقابل ہو، سپر رکھ دیجیے

راحتِ جانِ ظفرؔ ہیں شاہدانِ بے ہُنر
روندنے کو ان کے قدموں میں ہُنر رکھ دیجیے

سراج الدین ظفر



بغیرِ ساغر و یارِ جواں نہیں گزرے
ہماری عمر کے دِن رائیگاں نہیں گزرے

ہجومِ گُل میں رہے ہم ہزار دست دراز
صبا نفس تھے، کسی پر گراں نہیں گزرے

نمود اُن کی بھی دورِ سبو میں تھی کل رات
ابھی جو دورِ تہِ آسماں نہیں گزرے

نقوشِ پا سے ہمارے اُگے ہیں لالہ و گُل
رہِ بہار سے ہم بے نشاں نہیں گزرے

غلط ہے ہم نفسو، اُن کا زندگی میں شمار
جو دِن بخدمتِ پیرِ مُغاں نہیں گزرے

ظفر کا مشربِ رندی ہے اِک جہاں سے الگ
مری نگاہ سے ایسے جواں نہیں گزرے



شاید رُخِ حیات سے سرکے نقاب اور
بھر دو مرے سبو میں شرابِ گلاب اور

ہوگی مرے سبو سے نمودِ ہزار صبح
اُبھریں گے اس اُفق سے ابھی آفتاب اور

آتی ہے کوئے دار و رسن سے صدا ہنوز
آئے اِدھر جو ہے کوئی خانہ خراب اور

مخمورِ بُوئے زُلف نہ آئیں گے ہوش میں
چھڑکے ابھی نسیمِ بہاراں گلاب اور

اے وارثانِ سطوتِ پرویز، ہوشیار
دامانِ وقت میں ہیں ابھی انقلاب اور

آئی ظفر جو رات زباں پر حدیثِ دوست
ناگاہ بڑھ گئی مرے جوہر کی آب اور

○

ہم دلِ زہرہ وشاں میں خالقِ اندیشہ ہیں
گو خراباتی سہی، جبریل کے ہم پیشہ ہیں

پیروئ واعظانِ شہر میں بزدل ہیں ہم
اور غزالوں کا تعاقب ہو تو شیرِ بیشہ ہیں

جانیے کیا کیا مدارج اور بھی کرنے ہیں طے
ہم ابھی ذہنِ خداوندی میں اک اندیشہ ہیں

خشت و سنگِ ناتراشیدہ سے ابھرا خطِ حسن
میگساروں کی نگاہیں ہیں کہ ضربِ تیشہ ہیں

ہم نہیں ہیں کوہ کن، لیکن ہماری یادگار
وقت کے کوہِ گراں پر کچھ نقوشِ تیشہ ہیں

○

اصلاحِ اہلِ ہوش کا یارا نہیں ہمیں
اس قوم پر خدا نے اُتارا نہیں ہمیں

ڈھونڈیں کہاں سحر کو ہمیں اے غزالِ شب
اب نام بھی تو یاد تمہارا نہیں ہمیں

اب کیا سنور سکیں گے ہم آوارگانِ عشق
صدیوں کے جبر نے تو سنوارا نہیں ہمیں

ہاتھوں میں ہے ہمارے گریبانِ کائنات
لیکن ابھی جنوں کا اشارا نہیں ہمیں

ڈھونڈو کوئی نئی روشِ شاعری ظفر
اسلوب دوسروں کا گوارا نہیں ہمیں

ظہیرؔ کاشمیری



لوحِ مزار دیکھ کے جی دنگ رہ گیا
ہر ایک سَر کے ساتھ فقط سنگ رہ گیا

بدنام ہو کے عشق میں ہم سرخرُو ہوئے
اچھا ہُوا کہ نام گیا، ننگ رہ گیا

ہوتی نہ ہم کو سایۂ دیوار کی تلاش
لیکن محیطِ زیست بہت تنگ رہ گیا

سیرت نہ ہو، تو عارض و رخسار سب غلط
خوشبو اُڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

اپنے گلے میں اپنی ہی بانہوں کو ڈالیے
جینے کا اب تو ایک یہی ڈھنگ رہ گیا

کتنے ہی انقلاب شکن در شکن ملے
آج اپنی شکل دیکھ کے میں دنگ رہ گیا

تخیل کی حدوں کا تعین نہ ہو سکا
لیکن محیطِ زیست بہت تنگ رہ گیا

کُل کائنات فکر سے آزاد ہو گئی
انساں مثالِ دستِ تہِ سنگ رہ گیا

ہم اُن کی بزمِ ناز میں یوں چپ ہوئے ظہیرؔ
جس طرح گھُٹ کے ساز میں آہنگ رہ گیا

ظہیر کاشمیری

 ۱

فرض برسوں کی عبادت کا ادا ہو جیسے
بُت کو یوں پُوج رہے ہیں کہ خدا ہو جیسے

ایک پُر پیچ غزل، ایک حریری نغمہ
ہائے وہ حُسن کہ جنگل کی صدا ہو جیسے

عشق یوں وادیٔ ہجراں میں ہؤا محوِ خرام
خارزاروں میں کوئی آبلہ پا ہو جیسے

عارضوں پر وہ ترے، تابشِ پیمانِ وفا
چاندنی رات کے چہرے پہ حیا ہو جیسے

اس طرح داغ دمکتے ہیں دلِ وحشی پر
قیس کے جسم پہ پھُولوں کی عبا ہو جیسے

کتنا دلکش ہے تیری یاد کا پالا ہوا اشک
سینۂ خاک پہ مہتاب گرا ہو جیسے

رتجگے، وہ بھی نشاطِ غمِ محبوب کے ساتھ
حُسن والوں نے بڑا کام کیا ہو جیسے

ہجر کی رات عجب رنگ ہے پیمانے کا
دستِ میخوار میں بُجھتا سا دیا ہو جیسے

خاکِ دل پر تیرے سیّال تصوّر کا خرام
ریگِ صحرا پہ رواں بادِ صبا ہو جیسے

آج اُس شوخ کی چتون کا یہ عالم ہے ظہیر
حُسن اپنی ہی اداؤں سے خفا ہو جیسے

ظہیر کاشمیری



اب ہے کیا، لاکھ بدل، چشمِ گریزاں کی طرح
میں ہوں زندہ تیرے ٹوٹے ہوئے پیماں کی طرح

کوئی دستک کوئی آہٹ، نہ شناسا آواز
خاک اُڑتی ہے درِ دل پہ بیاباں کی طرح

تو مری ذات، مری روح، مرا حُسنِ کلام
دیکھ اب تو نہ بدل، گردشِ دوراں کی طرح

میں نے جب غور سے دیکھا تو وہ پتھر نکلا
ورنہ وہ حسن نظر آتا تھا انساں کی طرح

اب میں کس ناز پہ کہہ دوں کہ اسے کر لے قبول
دل تو صد چاک ہے مفلس کے گریباں کی طرح

ابھی کچھ کارِ محبت ہے مجھے دنیا میں
زندگی ختم نہ ہو صحبتِ یاراں کی طرح

میں تیری بزم سے نکلا تھا نظر کی صورت
اب نہ یوں دیکھ مجھے دیدۂ حیراں کی طرح

برق بن کر مرے خرمن کو جلانے والے
تو ہی برسا تھا کبھی ابرِ بہاراں کی طرح



اس دورِ عافیت میں یہ کیا ہو گیا ہمیں
پتّہ کھڑکے سے آدمی وحشی ہوا ہمیں

پتھر بنے ہیں عجز بیانوں کے سامنے
تخلیقِ فن کا خوب مِلا ہے صلا ہمیں

ہم کو طلوعِ صبحِ بہاراں کی تھی تلاش
اِس جُرم کی سزا ہے یہ زنجیرِ پا ہمیں

یہ دورِ تیز گام بھی ہے ان سے بے خبر
وہ منزلیں جو دے گئیں اپنا پتہ ہمیں

راہِ طلب سمٹ کے قدم چُومنے لگی
جب بھی کوئی حریفِ سفر مل گیا ہمیں

ظلمت کا دَور کچھ بھی سہی، ستر پوش تھا
کب روشنی نے جیب و گریباں دیا ہمیں؟

پس منظرِ بہار سے ہم بے خبر نہ تھے،
راس آسکی نہ خندۂ گُل کی صدا ہمیں۔

ہم کو تو نذرِ سیل ہوئے عمر ہو گئی
کشتی میں ڈھونڈتا ہے مگر ناخدا ہمیں

ظہیر کاشمیری



ہمراہِ لطف، چشمِ گریزاں بھی آئے گی
وہ آئیں گے تو گردشِ دوراں بھی آئے گی

نکلے گی بوئے زلف، ہماری تلاش میں
صحرا میں اب ہوائے گلستاں بھی آئے گی

وہ جن کو اپنے ترکِ تعلق پہ ناز تھا
آج اُن کو یادِ صحبتِ یاراں بھی آئے گی

ہم خود ہی بے لباس رہے اس خیال سے
وحشت بڑھی تو سوئے گریباں بھی آئے گی

طے ہو چکا ہے سود و زیاں کا معاملہ
زخم آئیں گے تو لذتِ پیکاں بھی آئے گی

ڈھونڈے گی سر برہنہ ہمیں دشتِ ہجر میں
اک دن جنوں میں غیرتِ جاناں بھی آئے گی

اے رہ نوردِ عشق! سنبھل کر قدم بڑھا
اس راستے میں ظلمتِ ہجراں بھی آئے گی

وہ برق جو حدودِ نظر سے پرے رہی
وہ برق اب قریبِ رگِ جاں بھی آئے گی

کٹ جائے گا یہ کربِ شبِ غم بھی لے ظہیر
صبحِ نشاط و فصلِ نگاراں بھی آئے گی



پروانہ جل کے صاحبِ کردار بن گیا
لیکن جمالِ شمع گنہ گار بن گیا

ہم دل زدے جو سیرِ چمن کو نکل پڑے
ہر پھول دستِ شاخ میں تلوار بن گیا

امشب طلوعِ یار کا منظر عجیب تھا
بامِ بلند، مطلعِ انوار بن گیا

اے مہ وشانِ شہر! مری بندگی کرو
میں خود سنور کے عکسِ رُخِ یار بن گیا

وہ دُور تھے، نظر پہ حجابِ غرور تھا
وہ چل دیئے، میں دیدۂ بیدار بن گیا

جب خامشی ہی بزم کا دستور ہو گئی
میں آدمی سے نقش بہ دیوار بن گیا

محسوس کر رہا ہوں کہ تنہا ہوں ان دنوں
ہر شہر گرچہ مصر کا بازار بن گیا

جس ہم نفس کو مجھ سے متاعِ وفا ملی
وہ ہم نفس مرا ہی خریدار بن گیا

ظہیر کاشمیری



طلب آسودگی کی عرصۂ دنیا میں رکھتے ہیں
امیدِ فصلِ گُل ہے اور قدم صحرا میں رکھتے ہیں

ہوئے ہیں اس قدر مانوس ہم ہیجانِ فردا سے
کہ اب دل کا سفینہ ہجر کے دریا میں رکھتے ہیں

بشر کو دیکھئے با ایں ہمہ ساحل پہ مرتا ہے
حباب اپنا اثاثہ سیلِ بے پروا میں رکھتے ہیں

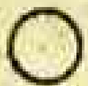
ہمارے پاس کوئی گردشِ دوراں نہیں آتی
ہم اپنی عمرِ فانی ساغر و مینا میں رکھتے ہیں

ہمیں ہر گام پر ملتا رہا ، اعزازِ محرومی
وقار اپنا بہت ہم ، دیدۂ دنیا میں رکھتے ہیں

امیدوں کے کھنڈر ، مایوسیوں کے بم بخود سائے
بڑی ہی رونقیں ہم ، اِس دلِ تنہا میں رکھتے ہیں

ہمارے دور کے انسان خود اپنی ہی ضد نکلے
طلب ماضی کی ہوتی ہے قدم فردا میں رکھتے ہیں

ظہیر ان دل زدوں کی عظمتیں دیکھو یہ دیوانے
چراغِ عشق روشن ، وادی و صحرا میں رکھتے ہیں



مرا ہی بن کے وہ بُت ، مجھ سے آشنا نہ ہوا
وہ بے نیاز تھا اتنا ، تو کیوں خدا نہ ہوا

شکن ہمیشہ جبیں پر رہے تو عادت ہے
مجھے یقیں ہے وہ مجھ سے کبھی خفا نہ ہوا

تمام عمر تری ہمرہی کا شوق رہا ،
مگر یہ رنج کہ میں موجۂ صبا نہ ہوا

حجابِ حُسن سے بڑھتی ہے اور عریانی
یہی سبب ہے ، میں آزردۂ حیا نہ ہوا

نشاطِ ہجر کا خوگر بنا دیا ہوتا ،
جفائے یار سے اتنا بھی حق ادا نہ ہوا

حیاتِ ہجر کا خود میں نے انتخاب کیا
میں قید کب تھا ، جو میں قید سے رہا نہ ہوا

دیارِ درد میں دل نے بہت تلاش کیا
نصیبِ عشق مگر تیرا نقشِ پا نہ ہوا

ظہیر سوزِ دروں بھی عجب کرشمہ ہے
میں دُور رہ کے بھی اس سے کبھی جدا نہ ہوا

ظہیر کاشمیری

○

وہ محفلیں، وہ مصر کے بازار کیا ہوئے
اے شہرِ دل، تیرے در و دیوار کیا ہوئے
ڈسنے لگی ہیں ہم کو زمانے کی رونقیں
ہم جرمِ عاشقی کے سزاوار کیا ہوئے
اتنی گریز پا تو نہ تھی عمرِ دوستی
اے خندہ خلقی، تیرے اقرار کیا ہوئے
پھولوں نے بڑھ کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی
وارفتگی میں مائلِ گلزار کیا ہوئے
جن کا جمال، جنتِ قلب و نظر رہا
وہ ہم نشیں، وہ یارِ طرحدار کیا ہوئے
ہم اس طرح تو یوسفِ بے کارواں نہ تھے
اے دل، تو ہی بتا، تیرے غم خوار کیا ہوئے
امیدِ وصلِ یار میں شب کاٹ دی تو کیا
دن ڈھل گیا تو نیند سے بیدار کیا ہوئے
آنے سے ان کے ڈوبتی نبضیں سنبھل گئیں
آسان مرحلے مرے دشوار کیا ہوئے

○

مرنا عذاب تھا، کبھی جینا عذاب تھا،
میرا ضمیرِ عشق سا خانہ خراب تھا
دل مرمٹا، تلاوتِ رخسارِ یار میں،
مرحوم طفلگی سے ہی اہلِ کتاب تھا
سوچا تو اس حبیب کو پایا قریبِ جاں
دیکھا تو آستیں میں چھپا آفتاب تھا
وہ بارگاہ میری وفا کا جواز تھی
اُس آستاں کی خاک مرا ہی شباب تھا
میری ہر ایک صبح تھی، آغوشِ دلبری
میری ہر ایک شام کا عنوان شراب تھا
دل بھی صنم پرست، نظر بھی صنم پرست
اس عاشقی میں خانہ ہمہ آفتاب تھا
کب اس سیاہ بخت نے چھوڑا کسی کا ساتھ
دشتِ جنوں میں سایہ مرا ہمرکاب تھا
تو کب مآلِ جور و جفا کو سمجھ سکا،
تیرا جمال تیرے لیے بھی حجاب تھا
جس دور کو فقیہہ نے عصیاں سمجھ لیا
اس دور میں تو پی کے بہکنا ثواب تھا
وہ حسن کس قدر ادب آموز تھا ظہیرؔ
قدِ خامۂ رواں تھا، تو چہرہ کتاب تھا

قتیل شفائی



ہر بے زباں کو شعلہ نوا کہہ لیا کرو
یارو، سکوت ہی کو صدا کہہ لیا کرو

خود کو فریب دو کہ نہ ہو تلخ زندگی
ہر سنگدل کو جانِ وفا کہہ لیا کرو

گر چاہتے ہو خوش رہیں کچھ بندگانِ خاص
جتنے صنم ہیں، اُن کو خدا کہہ لیا کرو

یارو یہ دورِ ضعفِ بصارت کا دور ہے
آندھی اُٹھے تو اس کو گھٹا کہہ لیا کرو

انسان کا اگر قد و قامت نہ بڑھ سکے
تم اس کو نقصِ آب و ہوا کہہ لیا کرو

اپنے لیے اب ایک ہی راہِ نجات ہے
ہر ظلم کو رضائے خدا کہہ لیا کرو

دکھلائے جا سکیں جو نہ کانٹے زبان کے
تم داستانِ کرب و بلا کہہ لیا کرو

لے دے کے اب یہی ہے نشانِ ضیا قتیلؔ
جب دل جلے تو اس کو دیا کہہ لیا کرو

قتیل شفائی



رنگ جُدا ، آہنگ جُدا ، مہکار جُدا
پہلے سے اب لگتا ہے گلزار جُدا

نغموں کی تخلیق کا موسم بیت گیا
ٹوٹا ساز تو ہو گیا تار سے تار جُدا

بیزاری سے اپنا اپنا جام لیے
بیٹھا ہے محفل میں ہر مے خوار جُدا

ملا تھا پہلے دروازے سے دروازہ
لیکن اب دیوار سے ہے دیوار جُدا

یارو! میں تو نکلا ہوں جاں بیچنے کو
تم کوئی اب سوچو کاروبار جُدا

سوچتا ہے اک شاعر بھی ، اک تاجر بھی
لیکن سب کی سوچ کا ہے معیار جُدا

کیا لینا اس گرگٹ جیسی دنیا سے
آئے رنگ نظر جس کا ہر بار جُدا

اپنا تو ہے ظاہر و باطن ایک مگر
یاروں کی گفتار جُدا ، کردار جُدا

مل جاتا ہے موقع خونی لہروں کو
ہاتھوں سے جب ہوتے ہیں پتوار جُدا

کس نے دیا ہے ساتھ کسی کا ساتھ قتیل
ہو جاتا ہے سب کو آخر کار جُدا

قتیل شفائی



تہ میں جو رہ گئے، وہ صدف بھی نکالیے
طغیانیوں کا ہاتھ سمندر میں ڈالیے
اپنی حدوں میں رہیے کہ رہ جائے آبرو
اوپر جو دیکھنا ہے تو پگڑی سنبھالیے
خوشبو تو مدتوں کی زمیں دوز ہو چکی
اب صرف تتلیوں کو ہوا میں اچھالیے
صدیوں کا فرق پڑتا ہے لمحوں کے پھیر میں
جو غم ہے آج کا اسے کل پہ نہ ٹالیے
آیا ہی تھا ابھی مرے لب پہ وفا کا نام
کچھ دوستوں نے ہاتھ میں پتھر اٹھا لیے
کہہ دو صلیبِ شب سے کہ اپنی منائے خیر
ہم نے تو پھر چراغ سروں کے جلا لیے
دنیا کی نفرتیں مجھے قلاش کر گئیں
اک پیار کی نظر مرے کاسے میں ڈالیے
رسوائیوں کا آپ کو آیا ہے اب خیال
ہم نے تو اپنے دوست بھی دشمن بنا لیے
ساحل کے انتظار میں چکرا گیا ہوں میں
مجھ کو مری وفا کے بھنور سے نکالیے
محسوس ہو رہا ہے کچھ ایسا مجھے قتیلؔ
نیندوں نے جیسے آج کی شب پر لگا لیے



زیست کی گرمیِ بیدار بھی لایا سورج
کھل گئی آنکھ مری، سر پہ جو آیا سورج
پھر شعاعوں نے مرے جسم پہ دستک دی ہے
پھر جگانے مرے احساس کو آیا سورج
کسی دلہن کے جھمکتے ہوئے جھومر کی طرح
رات نے صبح کے ماتھے پہ سجایا سورج
شام کو روٹھ گیا تھا مجھے تڑپانے کو
صبحدم آپ مجھے ڈھونڈنے آیا سورج
کم نہ تھا اس کا یہ احسان کہ جاتے جاتے
کر گیا اور بھی لمبا مرا سایہ سورج
ڈالتے اس پہ کمندیں، وہ کوئی چاند نہ تھا
سو جتن سب نے کیے، ہاتھ نہ آیا سورج
خوب واقف تھا وہ انساں کے اندھے پن سے
جس نے بھی دن کے اجالے میں جلایا سورج
لوگ کہتے رہے سورج کو دکھائیں گے چراغ
اور ہی رنگ تھا جب سامنے آیا سورج
شب کو بھی روح کے آنگن میں رہی دھوپ قتیلؔ
چاند تاروں نے بھی آ کر نہ بجھایا سورج

قتیل شفائی



منظر سمیٹ لائے ہیں جو تیرے گاؤں کے
نیندیں چرا رہے ہیں وہ جھونکے ہواؤں کے

تیری گلی سے چاند زیادہ حسیں نہیں
کہتے سنے گئے ہیں مسافر خلاؤں کے

پل بھر کو تیری یاد میں دھڑکا تھا دل مرا
اب دور تک بھنور سے پڑے ہیں صداؤں کے

دادِ سفر ملی ہے کسے راہِ شوق میں
ہم نے مٹا دیئے ہیں نشاں اپنے پاؤں کے

جب تک نہ کوئی آس تھی، یہ پیاس بھی نہ تھی
بے چین کر گئے ہیں سائے گھٹاؤں کے

ہم نے لیا ہے جب بھی کسی راہزن کا نام
چہرے اتر اتر گئے کچھ رہنماؤں کے

یوں بھی ہوا کہ جرمِ انا الحق کئے بغیر
لٹکے ہیں سولیوں پہ کئی لال ماؤں کے

اُگلے گا آفتاب کچھ ایسی بلا کی دھوپ
رہ جائیں گے زمین پہ کچھ داغ چھاؤں کے

زندہ تھے جن کی سرد ہواؤں سے ہم قتیل
اب زیرِ آب ہیں وہ جزیرے وفاؤں کے



دور تک چھائے تھے بادل اور کہیں سایا نہ تھا
اس طرح برسات کا موسم کبھی آیا نہ تھا

سرخ آہن پر ٹپکتی بوند ہے اب ہر خوشی
زندگی نے یوں تو پہلے ہم کو ترسایا نہ تھا

کیا ملا آخر تجھے، سایوں کے پیچھے بھاگ کر
اے دلِ ناداں، تجھے کیا ہم نے سمجھایا نہ تھا

اُف یہ سناٹا کہ آہٹ تک نہ ہو جس میں مخل
زندگی میں اس قدر ہم نے سکوں پایا نہ تھا

خوب روئے چھپ کے گھر کی چار دیواری میں ہم
حالِ دل کہنے کے قابل کوئی ہمسایا نہ تھا

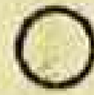
ہو گئے قلاش جب سے آس کی دولت لٹی
پاس اپنے، اور تو کوئی بھی سرمایا نہ تھا

وہ پیمبر ہو کہ عاشق، قتل گاہِ شوق میں
تاج کانٹوں کا کسے دنیا نے پہنایا نہ تھا

اب کھلا، جھونکوں کے پیچھے چل رہی تھیں آندھیاں
اب جو منظر ہے وہ پہلے تو نظر آیا نہ تھا

صرف خوشبو کی کمی تھی غور کے قابل قتیل
ورنہ گلشن میں کوئی بھی پھول مرجھایا نہ تھا

قتیل شفائی



ہر طرف سطوتِ الفت کا رنگ دکھائی دے گی
رنگ برسیں گے، زمیں دھنک دکھائی دے گی

بارشِ خونِ شہیداں سے وہ آئے گی بہار
ساری دھرتی ہمیں گل رنگ دکھائی دے گی

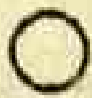
پربتوں سے نکل آئیں گے تھرکتے پیکر
نغمہ زن، خامشیِ سنگ دکھائی دے گی

راز میں رہ نہ سکے گی کوئی اظہار کی لے
اِک نہ اک صورتِ آہنگ دکھائی دے گی

سوچ کو جرأتِ پرواز تو مل لینے دو
یہ زمیں اور ہمیں تنگ دکھائی دے گی

تاج کانٹوں کا سہی ایک نہ ایک دن لیکن
عاشقی زینتِ اورنگ دکھائی دے گی

جب بھی پرکھے گا کوئی پیار کے معیار قتیلؔ
ساری دنیا مرے پاسنگ دکھائی دے گی



رابطہ لاکھ سہی قافلہ سالار کے ساتھ
ہم کو چلنا ہے مگر وقت کی رفتار کے ساتھ

غم لگے رہتے ہیں ہر آن خوشی کے پیچھے
دشمنی دھوپ کی ہے سایۂ دیوار کے ساتھ

کس طرح اپنی محبت کی میں تکمیل کروں
غمِ ہستی بھی تو شامل ہے غمِ یار کے ساتھ

لفظ چنتا ہوں تو مفہوم بدل جاتا ہے
اک نہ اک خوف بھی ہے جرأتِ اظہار کے ساتھ

بخش دے مجھ کو بھی اعزازِ مسیح و منصور
میں نے بھی پیار کیا ہے رسن و دار کے ساتھ

دشمنی مجھ سے کئے جا مگر اپنا بن کر
جان لے لے مری، صیاد! مگر پیار کے ساتھ

دو گھڑی آ کے مل آئیں کسی غالبؔ سے قتیلؔ
حضرتِ ذوقؔ تو وابستہ ہیں دربار کے ساتھ



گاتے ہوئے پیڑوں کی خنک چھاؤں سے آگے نکل آئے
ہم دھوپ میں جلنے کو، ترے گاؤں سے آگے نکل آئے

ایسا بھی تو ممکن ہے، ملے بے طلب اک مژدۂ منزل
ہم اپنی دعاؤں سے، تمناؤں سے آگے نکل آئے

کہتے ہیں کہ ان جسموں کو اک روحِ مقدس کی دعا ہے
وہ جسم کہ جو اپنے تھکے پاؤں سے آگے نکل آئے

تھوڑا سا بھی جن لوگوں کو عرفانِ مذاہب تھا، وہ بچ کر
کعبوں سے، شوالوں سے، کلیساؤں سے آگے نکل آئے

تھے ہم بھی گنہگار، ہر اک زاہدِ مکار کی ضد میں
بازار میں بکتی ہوئی سلماؤں سے آگے نکل آئے

شہروں کے مکینوں سے ملی جب ہمیں وحشت کی ضمانت
ہم سی کے گریبانوں کو، صحراؤں سے آگے نکل آئے

بنتی رہی اک دنیا قتیلؔ اپنی خریدار مگر ہم
یوسف نہ بنے اور زلیخاؤں سے آگے نکل آئے



فسردگی کا مداوا کریں تو کیسے کریں
وہ لوگ جو ترے قربِ جمال سے بھی ڈریں

اک ایسی راہ پہ ڈالا ہے تیرے غم نے کہ ہم
کسی بھی شکل کو دیکھیں تو رک کے آہ بھریں

یہ کیا کہ بے سبب آئے قضا جوانی میں
یہ کیوں نہ ہو کہ تمہاری کسی ادا پہ مریں

شبِ الم کے بھی ہوتے ہیں کچھ نہ کچھ آداب
تڑپنے والے سحر تک تو انتظار کریں

اس ایک بات کے بعد اب ہزار بات کرو
یہ دل کے زخم ہیں یارو، بھریں بھریں نہ بھریں

ثبوتِ عشق کی یہ بھی تو ایک صورت ہے
کہ جس سے پیار کریں اس پہ تہمتیں بھی دھریں

کچھ ایسے دوست بھی میری نگاہ میں ہیں قتیلؔ
کہ مجھ کو بانہ رکھیں جس سے، خود اسی پہ مریں

قیوم نظر



تیری نگہ سے، تجھ کو خبر ہے، کہ کیا ہُوا
دل زندگی سے، بارِ دگر، آشنا ہُوا

اک اک قدم پہ اُس کے، ہُوا سجدہ ریز ہیں
گذرا تھا جس جہاں کو کبھی روندتا ہُوا

دیکھا تجھے تو آرزوؤں کا ہجوم تھا
پایا تجھے تو کچھ نہ تھا باقی رہا ہُوا

دشتِ جنوں میں ریگِ رواں سے خبر ملی
پھرتا رہا ہے تو بھی مجھے ڈھونڈتا ہُوا

احساس تونے زیست کا نقشہ بدل دیا
محرومیوں کا یوں تو چمن ہے کھِلا ہُوا

چمکا ہے بن کے سروِ چراغاں تمام عمر
کیا آنسوؤں کا تار تھا تجھ سے بندھا ہُوا

بکھرے ہیں زندگی کے کچھ اس طرح تار و پود
ہر ذرّہ اپنے آپ میں محشر نما ہُوا

پوچھو تو ایک ایک ہے تنہا سلگ رہا
دیکھو تو شہر شہر ہے میلہ لگا ہُوا

پردہ اُٹھا سکو تو جگر تک گداز ہے
چاہو کہ خود ہو یوں تو ہے پتھر پڑا ہُوا

انسان دوستی کے تقاضوں کا سلسلہ
انسان دشمنی کی حدوں سے مِلا ہُوا

اقدار کے فریب میں اب آچکا نظر
کشتی ڈبو گیا جو خدا، ناخدا ہُوا



جائیں گھڑ دوڑ پر کہ کھیلیں تاش
"میر جی رازِ عشق ہو گا فاش"[1]
پتھروں میں لگا رہے ہیں جونک
چاند میں خونِ گرم کی ہے تلاش
یوں جھگڑتے ہیں جھوٹی قدروں پر
زنِ فاحش پہ جس طرح اوباش
نئے انداز سے حنوط ہوئی
اب نہ بو دے سے کی زندگی کی لاش
اُڑ گیا بھاپ بن کے دل کا لہُو
اب زمیں دُور ہے، قریب آکاش
ہُوئے مفلوج وہ بھی جن کے لیے
ایک عالم تھا بر سرِ پرخاش
لالۂ کوہ کو دماغ نہیں
نشہ لاتی ہے مخلف خشخاش
کیسے بھوکوں مریں گے اتنے لوگ
بے ہُدہ عہدِ نو میں فسکرِ معاش
ہفت اقلیم کے خزانوں پر
ہاتھ ڈالیں گے اَن گنت قلاش
اب نہ آیا حصار سے باہر
نقش میں خود ہی ڈھل گیا نقاش
رشکِ گل ہوں کہ مثلِ نشتر ہوں
یہی ناخن نظرؔ میں زخم تراش

---

[1] میر تقی میر کا مصرع ہے

قیوم نظر



چناریں وادیوں میں مشتعل ہیں
دریغا! سرو ابھی تک پا بہ گل ہیں
اُمڈتے ہیں لالۂ خونیں کفن پھر
یہی شعلے جہانِ مستقل ہیں
اگر دو گام پر منزل ہے، پھر کیوں
چٹانیں زندگی کی منفصل ہیں
گلوں پر بے دلی کا رنگ کیوں ہے
عنادل صحنِ گلشن میں خجل ہیں
رفو ہو جائیں گے چاکِ بہاراں
خزاں کے گھاؤ، دیکھو، مندمل ہیں
کھنکتے ہی رہے شیشے تو کس کام
لبوں تک جام جا پہنچیں تو دل ہیں
گئے منزل بہ منزل دل تنگ ہم
مراحل عشق کے کب جاں گسل ہیں
ملے ہیں بعد مدت کے تو جاناں
بہت اپنے کئے پر منفعل ہیں
ٹھکانا نہ گیا ہے ایسے دوستوں کا
مقابل ہیں نہ میرے متصل ہیں



چمن بندی پہ ہے محشر بپا کیا
کھلے ہیں گل، اُڑی ہے خاک کیا کیا
شہیدانِ وفا بھی جی اُٹھیں گے
کوئی جادو جگا، اب پوچھنا کیا
خرامِ ناز موزوں ہے تجھی کو
اُٹھی اٹکھیلیاں کرتی صبا کیا
فسادِ این و آں ہے کس کے دم سے
کہیں گے اور تجھ سے برملا کیا
قیامت ہے کہ وہ یوں بھی ہیں ناخوش
دعا میں بھی تھا حرفِ مدعا کیا
فریبِ آگہی نے مار ڈالا
خدا کیا، ناخدا کیا، اور کیا کیا
یہی اُڑتا ہوا لمحہ رہے گا
عبث ہے ابتدا کیا، انتہا کیا
غبارِ کہکشاں چھٹ بھی گیا تو
کہیں لے جائے گا یہ راستا کیا
نظر اس کیفیت سے کون نکلے
ہوا وہ آشنا، نا آشنا کیا

قیوم نظر



اُن کی جب نکتہ وری یاد آئی
اپنی ہی بے خبری یاد آئی

یاد آیا بھی تو یوں عہدِ وفا
آہ کی بے اثری یاد آئی

آج کیوں اُن کو بہ آغوشِ رقیب
میری ہی ہم عصری یاد آئی

دل نے پھر وقت سے لڑنا چاہا
پھر وہی دردبھری یاد آئی

اپنا سینہ ہوا روشن تو انہیں
حُسن کی کم نظری یاد آئی

جب بھی دھیان آیا کہیں منزل کا
راہ کی شب بسری یاد آئی

کس کو حاصل ہے دماغِ نالہ
بے سبب بے ہنری یاد آئی

دیکھ کر بے دلیٔ شوق کا رنگ
اپنی آشفتہ سری یاد آئی

اُس پہ کیا گزری جو اس عالم میں
پھول کو جامہ دری یاد آئی

باغ کا حال وہ دیکھا ہے نظر
شاخ تھی جو بھی ہری، یاد آئی



شہر میں رنگ ہے نہ خوشبو ہے
پھر بھی چرچا اسی کا ہر سو ہے

بہہ رہا ہے مہیب سناٹا
یا بہ گِل سبزۂ لبِ جو ہے

گھُپ اندھیرے کا جل رہا ہے چراغ
روشنی کا عجیب جادو ہے

بے دلی ہے نصیبِ دامِ خیال
آرزو اک رمیدہ آہو ہے

سینۂ سنگ پہ ٹھٹھرتا ہوا
شاخِ گل کا گداز پہلو ہے

شدتِ کرب سے نڈھال نہیں
آنکھ میں جم گیا جو آنسو ہے

ایک ذرہ نہیں جو جل جائے
اور سبپ محشرِ تگاپو ہے

درد نے بڑھ کے آشکار کیا
موت پر زندگی کا قابو ہے

مجھ کو دیکھیں نظر جو کہتے ہیں
آدمی، آدمی کا دارو ہے

قیوم نظر



آپ کیوں چھیڑتے ہیں دیپک راگ
شہر میں لگ رہی ہے خود ہی آگ

اُٹھ رہا ہے حریمِ دل سے دھواں
لُٹ رہا ہے سہاگنوں کا سہاگ

شعلہ ساماں ہوئی ہے تاریکی
کیسے جاگے ہیں روشنی کے بھاگ

جانے کس کس ہوس کو دیں گے جنم
بوتلوں کے اُڑا چکے جو کاگ

لاگ میں تھی کبھی لگاؤ کی شان
اب لہو میں لگاؤ کی ہے لاگ

کفِ دریا کا دیکھیے انجام
بے سبب لائیے نہ منہ میں جھاگ

جاتے لمحے دُہائی دیتے ہیں
نئے اطوار کے طریق پہ جاگ

مسکراتا ہے کھیت سرسوں کا
توڑتی ہیں جو گاؤں والیاں ساگ

سرکنڈوں میں ہے کینچلی اٹکی
کہیں لہرا کے چھپ گیا ہے ناگ

چاند پر جو کمند ڈالتے ہیں
مجھ سے کہتے ہیں، زندگی بھی تیاگ



سیر شکمی کا بھوک سے ہے ملاپ
رُوح کی تشنگی سنبھالیے آپ

رقص فرما ہوئی وہ سیم تنی
بے زری کی بہار نے دی تھاپ

شہر والے ہیں کھولتا لاوا
گلی کوچوں سے اُٹھ رہی ہے بھاپ

نامرادی کے بڑھتے سلسلے کو
نئے پیمانۂ ستم سے ناپ

اس کو نمرود کا تقاضا جان
آتشِ حسن کو نہ بیٹھ کے تاپ

خامشی تو علاجِ درد نہیں
بات بنتی نہیں ہے آپ سے آپ

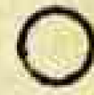
تو بھی کہہ دے جو تیرے جی میں ہے
سُن رہا ہوں میں ہر اناپ شناپ

کوئی آیا نہ گوشۂ دل تک
شاہرہ پر سُنی تھی پاؤں کی چاپ

یوں ہی شاید مزاج بدلے ترا
میرے اشعار اپنے نام سے چھاپ

وقت، موسم، نظرؔ نگاہ میں رکھ
کس نے تجھ سے کہا، یہ راگ الاپ

قیوم نظر



سُورج کی کرن کا شعبدہ ہے
رنگِ رُخِ زرد اُڑ گیا ہے
نقشِ کفِ پا نے گُل کھِلائے
ویراں کہاں اب یہ راستا ہے
جاگ اُٹھی ہیں زندگی کی راہیں
شاید کوئی چاند کہ گیا ہے
شعلوں سے ہوا تھا باغ خالی
پھر سینۂ گُل بھڑک اٹھا ہے
پتے پتے کا رنگ بدلا
بدلی بدلی ہوئی فضا ہے
پہلے تو نہ یوں کبھی ہوا تھا
تو بھی مجھے دیکھ کر ہنسا ہے
بے گانگی نے یہ راز کھولا
تو میرا ازل سے آشنا ہے
شبنم سرِ نوکِ خار یعنی
لب پہ مرے حرفِ مدعا ہے
ہر درد نہیں دوا کا محتاج
یوں بھی تو علاجِ غم ہوا ہے
تیرا ہی رہے گا بول بالا
دل میرا عبث دھڑک رہا ہے



خواہشوں کی موت کا یارو بھلا چاہا کرو
پھیلتی تاریکیوں میں چاند کا چرچا کرو
بے محابا جم ہی جائیں درد کی جب محفلیں
اپنے غم کو شہرِ بختِ نارسا سمجھا کرو
لہلہاتی وادیوں سے خوب تر ہیں ریگ زار
دل کے صحرا میں گلستاں کی فضا پیدا کرو
رنج کی گہرائیوں کی تہ کو پانے کے لئے
دوستوں کی دشمنی کو بھی عطا جانا کرو
عاقبت کی فکر نادانوں کا حصہ ہی سہی
عاقبت کے تذکرے پر برملا رویا کرو
تلخ تر ہو زندگی تو لطف دے شاید سوا
ناشناساؤں کی خاطر آشنا ڈھونڈا کرو
کیا سے کیا شکلیں دکھاتا ہے فریبِ آگہی
دشتِ امکاں سے کوئی ذرہ اٹھا لایا کرو
عظمتِ انساں کے دُکھ میں گھُل رہا ہے عہدِ نو
اس مسیحا کے لئے مل کر دعا مانگا کرو
خروج اُٹھتا ہی نہیں اور رنگ لاتا ہے غضب
بے گنہ کے خون سے بھی قشقہ ذرا کھینچا کرو
خاک اُڑتی ہے کہ روشن حسن کا آنچل ہوا
چہرۂ گیتی بصد بیم و رجا دیکھا کرو

عزیز حامد مدنی



سنبھل نہ پائے تو تقصیرِ واقعی بھی نہیں
ہر اک پہ سہل کچھ آدابِ مے کشی بھی نہیں
اِدھر اُدھر سے حدیثِ غمِ جہاں کہہ کر
تری ہی بات کی اور تیری بات کی بھی نہیں
وفائے وعدہ پہ دل نکتہ چیں ہے، وہ خاموش
حدیثِ مہر و وفا آج گفتنی بھی نہیں
بکھر کے حسنِ جہاں کا نظام کیا ہو گا
یہ برہمی تری زلفوں کی برہمی بھی نہیں
شکستِ ساغر و مینا کو خاک روتا مَیں
گراں ابھی مرے دل کی شکستگی بھی نہیں
ہزار شکر کہ بے خواب ہے سحر کے لیے
وہ چشمِ ناز کہ جو جاگتوں میں تھی بھی نہیں
یہ زندگی ہی تلوّن مزاج ہے اے دوست
تمام ترکِ وفا تیری بے رُخی بھی نہیں
تعلقاتِ زمانہ کی اک کڑی کے سوا
کچھ اور یہ ترا پیمانِ دوستی بھی نہیں
کرم کی وجہ نہ تھی، بے سبب خفا بھی ہے وہ
مزاجِ حسن سے یہ بات دُور تھی بھی نہیں

عزیز حامد مدنی



نہ فاصلے کوئی نکلے، نہ قربتیں نکلیں
وفا کے نام سے کیا کیا سیاستیں نکلیں

کھلی ہے وحشتِ عالم پہ آج کاکلِ یار
کچھ اور، دورِ خرد، تیری نسبتیں نکلیں

ہزار ہاتھوں کے پیمانِ نو کا مرکز ہے
ہوا کے ہاتھ میں نادیدہ طاقتیں نکلیں

سپاہِ عشق جہاں خندقوں میں چلتی تھی
وہ موڑ کاٹ کے آخر محبتیں نکلیں

فضائے تازہ نفس دلبری کی آئی ہے
نئی نئی غمِ دل کی مسافتیں نکلیں

شرارِ مہر و نمِ ابر کے تغیر تک
وصالِ دوست میں کیا کیا نزاکتیں نکلیں

وہی کہ رشکِ رقیباں سے تیرہ تر ہے جو زلف
کل اتفاق سے اس کی حکایتیں نکلیں

وہ حرفِ شک ہے کہ اہلِ یقیں نہیں سمجھے
دماغِ کفر سے کیا کیا حقیقتیں نکلیں

کمندِ سارق و مارِ سیاہ میں آخر
یہ کس کا ہاتھ تھا، یہ کس کی حکمتیں نکلیں

وصال و ہجر سے کیا، عشق سے سنبھل نہ سکیں
تری نگاہ میں ایسی ندامتیں نکلیں

نگار خانے کے نقش و نگار کچھ بھی نہ تھے
جنوں کی آنکھ میں غلطیدہ صورتیں نکلیں

عزیز حامد مدنی



فراق سے بھی گئے ہم وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیشِ ملال سے بھی گئے

جو بت کدے میں تھے، وہ صاحبانِ کشف و کمال
حرم میں آئے تو کشف و کمال سے بھی گئے

اسی نگاہ کی نرمی سے ڈگمگائے قدم
اسی نگاہ کے تیور سنبھال سے بھی گئے

غمِ حیات و غمِ دوست کی کشاکش میں
ہم ایسے لوگ تو رنج و ملال سے بھی گئے

گل و ثمر کا تو رونا الگ رہا لیکن،
یہ غم کہ فرقِ حرام و حلال سے بھی گئے

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

ہم ایسے کون تھے، لیکن قفس کی یہ دنیا
کہ پرشکستوں میں اپنی مثال سے بھی گئے

چراغِ بزم ابھی جانِ انجمن! نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خط و خال سے بھی گئے



جویانِ تازہ کاریٔ گفتار، کچھ کہو
تم بھی ہوئے ہو کاشفِ اسرار کچھ کہو

شیشہ کہیں سے لاؤ شرابِ فرنگ کا
باقی جو تھی حکایتِ دلدار کچھ کہو

جانے بھی دو تغیرِ عالم کی داستاں
کس حال میں ہے نرگسِ بیمار کچھ کہو

بادل اُٹھے ہیں چشمکِ برق و شرار ہے
منہ دیکھتے ہو صورتِ دیوار، کچھ کہو

مطرب کو تازہ بیت سکھاؤ، ہوا ہے نرم
گزرے کسی طرح تو شبِ تار کچھ کہو

ٹھہرا ہوا ہے وادیٔ غم میں رمیدہ وقت
سمجھو بھی کچھ نزاکتِ بسیار، کچھ کہو

زندہ دلانِ شوق نے رکھا بہار نام
اک موجِ خوں گئی سرِ گلزار، کچھ کہو

آغازِ ہر تغیرِ عالم کی حد ہوا
اُس کی گلی کا سایۂ دیوار، کچھ کہو

اُلجھے گا آج جی کہ ہوا پیچ پیچ ہے
بنتا نہیں کوئی رخِ گفتار، کچھ کہو

عزیز حامد مدنی



ختم ہوئی شبِ وفا، خواب کے سلسلے گئے
جس دوِ نیم باز کے پیش تھے مرحلے، گئے

جو رگِ ابر و باد سے تا بہ رگِ جنوں رہیں
عشق کی وہ حکایتیں، حسن کے وہ گلے گئے

شکر و سپاس کا مزہ، دے ہی گیا سکوتِ یار
وصل و فراق سے الگ درد کے حوصلے گئے

اک مرے ہم کنار کی مجھ سے قریب آ کے رات
خیمۂ درد ہو گئی، قرب کے ولولے گئے

دشت میں قحطِ آب سے ہجرتِ طائراں کے بعد
سیرِ پسند و تر نفس ابر کے قافلے گئے

اے بہ فسونِ دلبری تازہ رخ و سیاہ چشم
منزلِ قرب بھی گئی، تجھ سے نہ فاصلے گئے

نیند میں مہوشانِ شہر، بوسۂ عاشقاں کی خیر
شب بہ ہوائے نرم سیر، صبح ہوئی چلے گئے

اے رخِ تازۂ جہاں، رات تو اب بھی ہے گراں
شمعِ ہزار رنگ تک، یوں ترے سلسلے گئے

دامنِ دل کی اوٹ سے ایک شبِ فراق کیا
دورِ تغیرِ جہاں سب ترے قافلے گئے



نرمیِ ہوا کی موجِ طرب خیز ابھی سے ہے
اے ہم صفیر! آتشِ گل تیز ابھی سے ہے

اک تازہ تر سوادِ محبت میں لے چلی
وہ بوئے پیرہن کہ جنوں خیز ابھی سے ہے

اک خوابِ طائرانِ بہاراں ہے اس کی آنکھ
تعبیرِ ابر و باد سے لبریز ابھی سے ہے

شب تاب ابھی سے اس کی قباؤں کے رنگ ہیں
اک داستانِ جبینِ گہر ریز ابھی سے ہے

گزری ہے ایک دو مژۂ خواب ناک کی
دل میں لہو کا رنگ بہت تیز ابھی سے ہے

آئینہ لے کے گھوم گئی عمرِ نو خرام
تازہ رُخی کا موڑ بلا خیز ابھی سے ہے

مبہم سے ایک خواب کی تعبیر کا ہے شوق
نیندوں میں بادلوں کا سفر تیز ابھی سے ہے

اک تازہ مہرِ لب سے جنوں مانگتا ہے نقش
جُنبش لبوں کی سلسلہ آمیز ابھی سے ہے

شاید کہ محرمانہ بھی اُٹھے تری نگاہ
ویسے تری نگاہ دل آویز ابھی سے ہے

عزیز حامد مدنی



یہ فضائے ساز و مطرب، یہ ہجوم تاج داراں
چلو آؤ ہم بھی نکلیں، بہ لباس سوگواراں

یہ فسونِ روئے لیلیٰ، یہ عذابِ جانِ مجنوں
وہی حسن دشت دور ہے، یہ طوافِ جانِ نثاراں

غمِ کارواں کا آخر کوئی رخ نہ اس سے چھوٹا
وہ حدیث کہہ گئی ہے یہ ہوائے رہگذاراں

وہ تعصبِ برہمن جو صنم کو ڈھالتا ہے
رخِ نقش پر بھی آیا، بہ سپاسِ نقش کاراں

یہ خیالِ دوست آخر کوئی خواب ہم کناری
کوئی خوابِ ہم کناری، شبِ خوابِ بے قراراں

سرِ کشتِ غیر کیا کیا، یہ گھٹا برس رہی ہے
کوئی ہم سے آکے پوچھے اثرِ دعائے باراں

وہ شکستِ خوابِ محفل، وہ ہوا کے چار جھونکے
لگی دل پہ تیر بن کر، دمِ صبح یادِ یاراں



دلوں کی عقدہ کشائی کا وقت ہے کہ نہیں
یہ آدمی کی خدائی کا وقت ہے کہ نہیں

کہو ستارہ شناسو، فلک کا حال کہو
رخوں سے پردہ کشائی کا وقت ہے کہ نہیں

ہوا کی نرم روی سے جواں ہوا ہے کوئی
فریبِ تنگ قبائی کا وقت ہے کہ نہیں

خلل پذیر ہوا ربطِ مہر و ماہ میں وقت
بتا، یہ تجھ سے جدائی کا وقت ہے کہ نہیں

الگ سیاستِ درباں سے دل میں ہے اک بات
یہ وقت میری رسائی کا وقت ہے کہ نہیں

دلوں کو مرکزِ اسرار کر گئی جو نگہ
اسی نگہ کی گدائی کا وقت ہے کہ نہیں

تمام منظرِ کون و مکاں ہے بے ترتیب
یہ تیری جلوہ نمائی کا وقت ہے کہ نہیں

عزیز حامد مدنی



صلیب و دار کے قصے رقم ہوتے ہی رہتے ہیں
قلم کی جنبشوں پر سر قلم ہوتے ہی رہتے ہیں

یہ شاخِ گل ہے، آئینِ نمو سے آپ واقف ہے
سمجھتی ہے کہ موسم کے ستم ہوتے ہی رہتے ہیں

کبھی تیری کبھی دستِ جنوں کی بات چلتی ہے
یہ افسانے تو زلفِ خم بہ خم ہوتے ہی رہتے ہیں

توجہ اُن کی اب اے ساکنانِ شہر، تم پر ہے
ہم ایسوں پر بہت اُن کے کرم ہوتے ہی رہتے ہیں

ترے بندِ قبا سے رشتۂ انفاسِ دوراں تک
کچھ عقدے ناخنوں کو بھی بہم ہوتے ہی رہتے ہیں

ہجومِ لالہ و نسریں ہو یا لب ہائے شیریں ہوں
مری موجِ نفس سے تازہ دم ہوتے ہی رہتے ہیں

مرا چاکِ گریباں چاکِ دل سے ملنے والا ہے
مگر یہ حادثے بھی بیش و کم ہوتے ہی رہتے ہیں



سب پیچ و تابِ شوق کے طوفان تھم گئے
وہ زلف کھل گئی تو ہواؤں کے خم گئے

ساری فضا تھی وادیٔ مجنوں کی خواب ناک
جو روشناسِ مرگِ محبت تھے، ہم گئے

اب جن کے غم کا تیرا تبسم ہے پردہ دار
آخر وہ کون تھے کہ بہ مژگانِ نم گئے

اے جادۂ خرامِ مہ و مہر، دیکھنا
تیری طرف بھی آج ہوا کے قدم گئے

وحشت سی ایک لالۂ خونیں کفن سے تھی
اب کے بہار آئی تو سمجھو کہ ہم گئے

میں اور تیرے بندِ قبا کی حدیثِ خاص
نادیدہ خوابِ عشق کئی بے رقم گئے

ایسی کوئی خبر تو نہیں ساکنانِ شہر
دریا محبتوں کے جو بہتے تھے، تھم گئے

مجید امجد



برس گیا بہ خراباتِ آرزو، ترا غم
قدح قدح تری یادیں، سبو سبو ترا غم

ترے خیال کے پہلو سے اٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سُو ترا غم

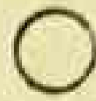
غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈھتی کرن، تری دُھن
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آب جُو، ترا غم

ندی پہ چاند کا پرتَو، ترا نشانِ قدم
خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص، تُو، ترا غم

نخیلِ زیست کی چھاؤں میں نَے بہ لب، تری یاد
فصیلِ دل کے کلس پر ستارہ جُو، ترا غم

طلوعِ مہر، شگفتِ سحر، سیاہیٔ شب
تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم

نگہ اٹھی، تو زمانے کے سامنے ترا روپ
پلک جھکی، تو مرے دل کے روبرُو، ترا غم



میری مانند، خودنگر، تنہا / یہ صراحی میں پھول نرگس کا

اتنی شمعیں تھیں تیری یادوں کی / اپنا سایہ بھی اپنا سایہ نہ تھا

میرے نزدیک تیری دوری تھی / کوئی منزل تھی، کوئی عالم تھا

ہائے وہ زندگی فریب آنکھیں / تو نے کیا سوچا، میں نے کیا سمجھا

صبح کی دھوپ ہے، کہ رستوں پر / منجمد بجلیوں کا اک دریا

گھنگھروؤں کی چھنک منک میں بسی / تیری آہٹ! میں کس خیال میں تھا!

پھر کہیں دل کے برج پر کوئی عکس / فاصلوں کی فصیل سے ابھرا

پھول مرجھا نہ جائیں بجروں میں / مانجھیو، کوئی گیت ساحل کا!

وقت کی سرحدیں سمٹ جاتیں / تیری دوری سے کچھ بعید نہ تھا

عمر ڈھلتی ہے، بخت جلوؤں کے! / زیست مٹتی ہے، بھاگ مٹی کا!

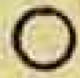
رہیں دردوں کی چوکیاں چوکس / پھول لوہے کی باڑ پر بھی کھلا

جو خود ان کے دلوں میں تھا تہِ سنگ / وہ خزانہ کسی کسی کو ملا

لاکھ قدریں تھیں زندگانی کی / یہ محیط، اک عجیب زاویہ تھا

ہے جو یہ سر پہ گیان کی گٹھڑی / کھول کر بھی اسے کبھی دیکھا؟

روز جھکتا ہے کوئے دل کی طرف
کاخِ صد بام کا کوئی زینا



جب اک چراغِ راہ گزر کی کرن پڑے
ہونٹوں کی لو لطیف حجابوں سے چھن پڑے

یہ کس حسیں دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی
ہر موجۂ خیال پہ صد ہا شکن پڑے

اِک پل بھی کُنجِ دل میں نہ ٹھہرا وُہ رہ نورد
اب جس کے نقشِ پا ہیں چمن در چمن پڑے

اک جست اس طرف بھی، غزالِ زمانہ رقص
رہ تیری دیکھتے ہیں خطا و ختن پڑے

جب انجمن تموّجِ صد گفتگو میں ہو
میری طرف بھی اِک نگہِ کم سخن پڑے

صحرائے زندگی میں جدھر بھی قدم اٹھیں
رستے میں ایک آرزوؤں کا چمن پڑے

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

امجد طریقِ مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اِک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے



جو ہو سکے، تو مرے دل، اب اک وُہ قصّا بھی
ذرا سنا، کہ ہے کچھ ذکر جس میں تیرا بھی

کبھی سفر ہی سفر میں جو عمرِ رفتہ کی سمت
پلٹ کے دیکھا تو اُڑتی تھی گردِ فردا بھی

بڑے سلیقے سے، دنیا نے، میرے دل کو دیے
وہ گھاؤ جن میں تھا سچائیوں کا چرکا بھی

کسی کی روح سے تھا ربط اور اپنے حصے میں تھی
وہ بیکلی، جو ہے موجِ زماں کا حصّا بھی

یہ رسمِ حاصلِ دنیا ہے، اک یہ رسمِ سلوک
ہزار اس میں سہی نفرتوں کا ایما بھی

دلوں کی آنچ سے تھا، برف کی سلوں پہ کبھی
سیاہ سانسوں میں لتھڑا ہوا پسینا بھی

مجھے ڈھکی چھپی، ان بوجھی الجھنوں سے ملا
نپی تُلی ہوئی اِک سانس کا بھروسا بھی

مجید امجد



کبھی تو سوچ! ترے سامنے نہیں گذرے؟
وہ سب سمے، جو ترے دھیان سے نہیں گذرے!

یہ اور بات کہ ہوں ان کے درمیاں میں بھی
یہ واقعے کسی تقریب سے نہیں گذرے

ان آئنوں میں جلے ہیں ہزار عکسِ عدم
دوامِ درد! ترے رت جگے نہیں گذرے

سپردگی میں بھی اک رمزِ خود نگہداری
وہ میرے دل سے مرے واسطے نہیں گذرے

بکھرتی لہروں کے ساتھ ان دنوں کے تنکے بھی تھے
جو دل میں بہتے ہوئے رک گئے، نہیں گذرے

انہیں حقیقتِ دریا کی کیا خبر، امجدؔ
جو اپنی روح کی منجدھار سے نہیں گذرے



دن کٹ رہے ہیں کشمکشِ روزگار میں
دم گھٹ رہا ہے سایۂ ابرِ بہار میں

آتی ہے اپنے جسم کے جلنے کی بُو مجھے
لٹتے ہیں نکہتوں کے سبو جب بہار میں

گذرا ادھر سے جب کوئی جھونکا تو چونک کر
دل نے کہا: یہ آ گئے ہم کس دیار میں

میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں

ہے کنجِ عافیت تجھے پا کر پتہ چلا
کیا ہمہمے تھے گردِ سرِ رہگذار میں



جاوداں قدروں کی شمعیں بجھ گئیں، تو جل اٹھی تقدیرِ دل
آج اس مٹی کے ہر ذی روح ذرّے میں بھی ہے تصویرِ دل

اپنے دل کی راکھ چن کر، کاش ان لمحوں کی بہتی آگ میں
میں بھی اک سیّال شعلے کے ورق پر لکھ سکوں تفسیرِ دل

میں نہ سمجھا، ورنہ ہنگاموں بھری دنیا میں، اک آہٹ کے سنگ
کوئی تو تھا — آج جس کا تہقہہ دل میں ہے دامن گیرِ دل

رت بدلتے ہی، چمن چھوڑ آئے صفیر، اب کے بھی کوسوں دور سے
آ کے جب اس شاخ پر چہکے، مرے دل میں بجی زنجیرِ دل

کیا سفر تھا، بے صدا صدیوں کے پل کھٹکے، اس موڑ تک
پے بہ پے ابھرا، سنہری گرد سے، اک نالۂ دلگیرِ دل

وار دنیا نے کیے مجھ پر تو امجدؔ میں نے اس گھمسان میں
اپنا سینہ چیر کر رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل



گہرے سردوں میں عرضِ نوائے حیات کر
سینے پہ ایک درد کی سِل رکھ کے بات کر

یہ دوریوں کا سیلِ رواں، برگِ نامہ بھیج
یہ فاصلوں کے بندِ گراں، کوئی بات کر

تیرا دیار، رات، مری بانسری کی لے
اس خوابِ دل نشیں کو مری کائنات کر

میرے غموں کو اپنے خیالوں میں بار دے
ان الجھنوں کو سلسلۂ واقعات کر

آ ایک دن، مرے دلِ ویراں میں بیٹھ کر
اس دشت کے سکوتِ سخن جُو سے بات کر

امجدؔ، نشاطِ زیست اسی کشمکش میں ہے
مرنے کا قصد، جینے کا عزم ایک سات کر

مجید امجد



اب یہ مسافت کیسے طے ہو، اے دل تو ہی بتا
کتنی عمر اور گھٹتے فاصلے، پھر بھی وہی صحرا

چیت آیا، چیتاونی بھیجی، اپنا وچن نبھا
بپت بھر آئی، پتر لکھے، آ جیون بیت چلا

خوشبوؤں کا مکھ چوم کے دیکھا، دنیا مان بھری
دکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو روح کرے سجدا

اپنا پیکر، اپنا سایہ، کالے کوس کٹھن
دوری کی جب سنگت ٹوٹی، کوئی قریب نہ تھا

اپنے گرداب اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھلی
کس کے دوست اور کیسے دشمن، سب کو دیکھ لیا

کانچ کی اک دیوار زمانہ، آمنے سامنے ہم
نظروں سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم جدا

راہیں دھڑکیں، شاخیں کڑکیں، اک اک ٹیس اٹھی
کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دکھنا

دکھڑے کہتے لاکھوں مکھڑے، کس کس کی سنئے
بولی تو اک کی دیسی، بانی سب کی جدا



چاندنی میں سایہ ہائے کاخ و کو میں گھومیے
پھر کسی کو چاہنے کی آرزو میں گھومیے

شاید اک بھولی تمنا مٹتے مٹتے جی اٹھے
اور ابھی اس جلوہ زارِ رنگ و بو میں گھومیے

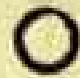
روح کے در بستہ سناٹوں کو لے کر اپنے ساتھ
جھماتی محفلوں کی ہاؤ ہو میں گھومیے

کیا خبر، کس موڑ پر، مہجور یادیں آ ملیں
گھومتی راہوں پہ گردِ آرزو میں گھومیے

زندگی کی راحتیں ملتی نہیں، ملتی نہیں
زندگی کا زہر پی کر جستجو میں گھومیے

کنجِ دوراں کو، نئے اک زاویے سے دیکھیے
جن فضاؤں میں نرالے چاند گھومیں، گھومیے

سیف الدین سیف



آئے تھے ان کے ساتھ نظارے چلے گئے
وہ شب، وہ چاندنی، وہ ستارے چلے گئے

شاید تمھارے ساتھ بھی واپس نہ آسکیں
وہ ولولے جو ساتھ تمھارے چلے گئے

کشتی تڑپ کے حلقۂ طوفاں میں رہ گئی
دیکھو تو کتنی دور کنارے چلے گئے

ہر آستاں اگرچہ ترا آستاں نہ تھا
ہر آستاں پہ تجھ کو پکارے چلے گئے

شامِ وصال، خانۂ غربت سے روٹھ کر
تم کیا گئے، نصیب ہمارے چلے گئے

دیکھا تو پھر وہیں تھے، چلے تھے جہاں سے ہم
کشتی کے ساتھ ساتھ کنارے چلے گئے

محفل میں کس کو تابِ حضورِ جمال تھی
آئے تری نگاہ کے مارے، چلے گئے

جاتے ہجومِ حشر میں ہم عاصیانِ دھر
اے لطفِ یار، تیرے سہارے چلے گئے

دشمن گئے تو کشمکشِ دوستی گئی
دشمن گئے کہ دوست ہمارے چلے گئے

جاتے ہی ان کے سیفؔ شبِ غم نے آلیا
رخصت ہوا وہ چاند، ستارے چلے گئے

سیف الدین سیف



رُخ پہ یوں جھوم کر وہ لٹ جائے
خضر دیکھے تو عمر کٹ جائے

اُس نظارے سے کیا سنبھلے کوئی
جو نگاہوں سے خود لپٹ جائے

یہ بھی اندھیر ہم نے دیکھا ہے
رات اک زلف میں سمٹ جائے

جانے تجھ سے اُدھر بھی کیا کچھ ہے
کاش تو سامنے سے ہٹ جائے

موت نے کھیل ہم کو جانا ہے
کبھی آئے، کبھی پلٹ جائے

ڈوبنے تک ہیں نا اُمید نہیں
کب نجانے ہوا پلٹ جائے

رات گذرے نہ دردِ دل ٹھہرے
کچھ تو بڑھ جائے کچھ تو گھٹ جائے

اُن سے کہہ کر بھی دیکھ لیں غمِ دل
سیفؔ یہ کام بھی نبٹ جائے

سیف الدین سیف



گھر کس کس نے لٹائے ہیں، تمہیں کیا معلوم
آج وہ کیا نظر آئے ہیں، تمہیں کیا معلوم

تم کو بیگانے بھی اپناتے ہیں، میں جانتا ہوں
میرے اپنے بھی پرائے ہیں، تمہیں کیا معلوم

کتنی ویران ہیں، بے نور ہیں آنکھیں میری
یہ دیئے کس نے بجھائے ہیں، تمہیں کیا معلوم

شوق آوارہ کو صحرائے فراموشی میں
راستے ڈھونڈنے آئے ہیں، تمہیں کیا معلوم

اہلِ دل حسرتِ دل لے کے تمہارے در پر
آج کس بھیس میں آئے ہیں، تمہیں کیا معلوم

دیکھ کر حال ہمارا، نہ ہنسو غربت میں
کون ہیں، کس طرح آئے ہیں، تمہیں کیا معلوم

سیفؔ یہ درد سے معمور خرابے دل کے
کتنی مشکل سے بسائے ہیں، تمہیں کیا معلوم



جب وجہِ سکونِ جاں ٹھہر جائے
پھر کیسے دلِ تپاں ٹھہر جائے

منزل کی، مسافرو، نہ پوچھو
مل جائے جسے جہاں ٹھہر جائے

اللہ رے خرامِ ناز ان کا
اک بار تو آسماں ٹھہر جائے

کیا جانیئے قافلہ وفا کا
لٹ جائے کہاں، کہاں ٹھہر جائے

یہ رات، یہ ٹوٹتی امیدیں
اللہ! یہ کارواں ٹھہر جائے

ہے موج میں سیفؔ کشتیِ دل
معلوم نہیں، کہاں ٹھہر جائے

○

در پردہ جفاؤں کو اگر جان گئے ہم
تم یہ نہ سمجھنا کہ بُرا مان گئے ہم

اب اور ہی عالم ہے جہاں کا، دلِ ناداں
اب ہوش میں آئے تو مری جان، گئے ہم

پلکوں پہ لرزتے ہوئے تارے سے یہ آنسو
اے حسنِ پشیماں، ترے قربان گئے ہم

ہم اور ترے حُسنِ تغافل سے بگڑتے
جب تو نے کہا مان گئے، مان گئے ہم

بدلا ہے مگر بھیس غمِ عشق کا تو نے
بس اے غمِ دوراں، تجھے پہچان گئے ہم

ہے سیفؔ بس اتنا ہی تو افسانۂ ہستی
آئے تھے پریشان، پریشان گئے ہم

○

مغرور تھے اپنی ذات پر ہم
رونے لگے بات بات پر ہم

اے دل، تری موت کا بھی غم ہے
خوش بھی ہیں تری نجات پہ ہم

لٹ جائیں گے ضبطِ غم کے ہاتھوں
مر جائیں گے اپنی بات پہ ہم

یہ بھی ترے غم کا آسرا ہے
ہنستے ہیں غمِ حیات پر ہم

کیا ناز تھا سیفؔ حوصلے پر
چپ ہو گئے ایک بات پر ہم

سیف الدین سیف



چھپ چھپ کے اب نہ دیکھ، وفا کے مقام سے
گذرا ہمارا درد، دوا کے مقام سے

لوٹ آئے ہم تو، عرضِ دعا کے مقام سے
ہر شئے تھی پست، ان کی رضا کے مقام سے

اے مطربانِ کنجِ چمن، ہوشیار باش!
صرصر گذر رہی ہے صبا کے مقام سے

اللہ رے خود فریبیٔ اہلِ حرم کہ اب
بندے بھی دیکھتے ہیں خدا کے مقام سے

جب دل نے خیر و شر کی حقیقت کو پا لیا
ہر جرم تھا بلند، سزا کے مقام سے

اے وائے سیفؔ، لذتِ نیرنگیٔ حیات
مر کر اٹھیں گے بیم و رجا کے مقام سے



صبح سے شام کے آثار نظر آنے لگے
پھر سہارے مجھے بے کار نظر آنے لگے

اس مسافر کی نقاہت کا ٹھکانہ کیا ہے
سنگِ منزل جسے دیوار نظر آنے لگے

ان کے جوہر بھی کھلے، اپنی حقیقت بھی کھلی
ہم سے کھنچتے ہی وہ تلوار نظر آنے لگے

مرے ہوتے، دلِ مشتاقِ ستم کے ہوتے
یار منت کشِ اغیار نظر آنے لگے

سیفؔ اتنا بھی نہ کر ضبط کہ پھر ان کے حضور
خامشی، درد کا اظہار نظر آنے لگے



مری داستانِ حسرت وہ سنا سنا کے روئے
مرے آزمانے والے، مجھے آزما کے روئے

کوئی ایسا اہلِ دل ہو کہ فسانۂ محبت
میں اسے سنا کے روؤں، وہ مجھے سنا کے روئے

مری آرزو کی دنیا دلِ ناتواں کی حسرت
جسے کھو کے شادماں تھا، اسے آج پا کے روئے

تری بے وفائیوں پر تری کج ادائیوں پر
کبھی سر جھکا کے روئے، کبھی منہ چھپا کے روئے

جو سنائی انجمن میں شبِ غم کی آپ بیتی
کئی رو کے مسکرائے، کئی مسکرا کے روئے



چین اب مجھ کو تہِ دام تو لینے دیتے
تیرے فتنے کہیں آرام تو لینے دیتے

آپ نے اس کا تڑپنا بھی گوارا نہ کیا
دلِ مضطر سے کوئی کام تو لینے دیتے

موت بھی بس میں نہیں ہے ترے مجبوروں کی
زندگی میں کوئی الزام تو لینے دیتے

پل میں منزل پہ اڑا لائے فنا کے جھونکے
لطف رک رک کے ہر گام تو لینے دیتے

ہاتھ بھی تیری نگاہوں نے اٹھانے نہ دیا
دلِ بے تاب ذرا تھام تو لینے دیتے

سیفؔ ہر بار اشاروں میں کیا اس کو خطاب
لوگ اس بت کا مجھے نام تو لینے دیتے

مختار صدّیقی



دھیان کی موج کو پھر آئینہ سیما کر لیں
کچھ تجلی کی حضوری کا بھی یارا کر لیں

آج کا دن بھی یونہی بیت گیا — شام ہوئی
اور اک رات کا کٹنا بھی گوارا کر لیں

جن خیالوں کے الٹ پھیر میں اُلجھیں سانسیں
اُن میں کچھ اور بھی سانسوں کا اضافہ کر لیں

جن ملالوں سے لہو دِل کا بنا ہے آنسو
ان کے آنکھوں سے برسنے کا نظارا کر لیں

احتیاطوں کی گزرگاہیں ہوتی ہیں سنسان
اب چھپایا ہوا ہر گھاؤ ہویدا کر لیں

ممتاز صدیقی



کی شبِ حشر، مری شامِ جوانی تم نے
چھیڑی کس دَور کی، کس وقت، کہانی تم نے

معنی و لفظ میں جو ربط ہے، میں جان گیا
کھولے اس طرح سے اسرارِ معانی تم نے

میری آنکھوں ہی میں تھے اَن کہے پہلو اُس کے
وہ جو اِک بات سنی، میری زبانی، تم نے

میری تاریخ نے دائم نہیں باقی سمجھا
رکھا ہر دَور میں دائم مجھے فانی تم نے

میں تو ہر دھوپ میں سایوں کا رہا ہوں جویا
مجھ سے لکھوائی سرابوں کی کہانی تم نے

میری ہر بات میں سو عیب تھے، ہر عیب میں شاخ
یہ غنیمت ہے، میری قدر بھی جانی تم نے

مختار صدیقی



بستیاں کیسے نہ ممنون ہوں دیوانوں کی
وسعتیں ان میں وہی لاتے ہیں ویرانوں کی
کل گنے جائیں گے زمرے میں ستم رانوں کے
خیر مانگیں گے اگر آج ستم رانوں کی
خوابِ باطل بھی تو ہوتے ہیں تن آسانوں کے
سعی، مشکور بھی ہوتی ہے گراں جانوں کے
وہ بِنا ساز بھی ہوتے ہیں گلستانوں کے
خاک جو چھانتے پھرتے ہیں بیابانوں کی
ٹکڑے جو گنتے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے
جان بن جاتے ہیں آخر وہی میخانوں کی
تیور آتے ہیں حقیقت میں بھی افسانوں کے
کچھ حقیقت بھی ہوا کرتی ہے افسانوں کی
زخم شاکی ہیں ازل سے نمک افشانوں کے
بات رکھی گئی ہر دور میں پیکانوں کی
ہو بھی جاتے ہیں رفو چاک گریبانوں کے
تنگ بھی ہوتی ہیں پہنائیاں دامانوں کی
ذرے زندانِ ملامت بھی ہیں ویرانوں کے
وہ بنا کرتی ہیں دیواریں ہی زندانوں کی
عبرت آباد بھی دل ہوتے ہیں انسانوں کے
داد ملتی بھی نہیں خون شدہ ارمانوں کے



آخر دل کی پرانی لگن، کر کے ہی رہے گی حقیر ہمیں
ہر رُت آتے جاتے پائے ایک ہی شے کا اسیر ہمیں

دھوم مچاتے بہار کبھی اور پات ہرے کبھی پیلے ہوں
ہر نیرنگیِ قدرت دیکھے، یکساں ہی دلگیر ہمیں

کیا کیا پکاریں سسکتی دیکھیں، لفظوں کے زندانوں میں
چپ ہی کی تلقین کرے ہے غیرت مند ضمیر ہمیں

جن کی ہلکی گہری تلخی خون میں رچ رچ جاتی ہے
جزوِ حیات بنانے پڑے ہیں وہ اشعارِ میرؔ ہمیں

مختار صدیقی



رات کے بعد وہ صبح کہاں ہے دن کے بعد وہ شام کہاں
جو آشفتہ سری ہے مقدر، اس میں قیدِ مقام کہاں

بھیگی رات ہے سونی گھڑیاں، اب وہ جلوۂ عام کہاں
بند حن توڑ کے جاؤں لیکن ہائے دل اے ناکام، کہاں!

اب وہ حسرتِ رسوا بن کر، جزوِ حیات ہے برسوں سے
جس سے وحشت کرتے تھے تم اب وہ خیالِ خام کہاں

زیست کی رہ میں اب ہم بے حس تنہا سر بہ گریباں ہیں
کچھ آلام کا ساتھ ہوا تھا، وہ بھی نافرجام کہاں!

"کرنی کرنے، راہیں تکتے" ہم نے عمر گنوائی ہے
خوبیٔ قسمت ڈھونڈ کے ہاری، ہم ایسے ناکام کہاں!

اپنے حال کو جان کے ہم نے فقر کا دامن تھاما ہے
جن داموں یہ دنیا ملتی، اتنے ہمارے دام کہاں!



تیرے جلوے تیرے حجاب کو میری حیرتوں سے نمو ملی
کہ تھا شب سے دن کبھی تیرہ تر، کبھی شب ہی آئنہ رو ملی

تیری قربتوں سے بھی کیا ہوا، تیری دوریوں کا تو کیا گلہ
وہ مقام میں ہی نہ پا سکا مجھے جس مقام پہ تو ملی!

وہ ہواؤں ہی سے برس پڑے وہ تری نگہ سے چھلک اُٹھے
کوئی بے خودی نہ ہمیں ملی کہ جو بے نیازِ سبو ملی!

وہ ہو فصلِ گل کہ فضائے دل، جو ملا کہیں تو جنوں ملا
مگر اک خرد ہی نہ مل سکی، جو ملی، تو صرفِ رفو ملی!

تمنا صدیقی

○

نورِ سحر کہاں ہے، اگر شامِ غم گئی
کب التفات تھا، کہ جو خوئے ستم گئی

پھیرا بہار کا تو برس دو برس میں ہے
یہ چال ہے خزاں کی جو رُک رُک کے تھم گئی

شاید کوئی اسیر ابھی تک قفس میں ہے
پھر موجِ گل چمن سے جو باچشمِ نم گئی!

قبضے میں جوششِ گل، نہ خزاں دسترس میں ہے
راحت بھی کب ملی ہے اگر وجہِ غم گئی

ہاں طرحِ آشیاں بھی ابھی خار و خس میں ہے
بجلی جہاں پہ خاص برنگِ کرم گئی

ہاں شائبہ گریز کا بھی پیش و پس میں ہے
وہ بے رُخی کہ ناز کا تھی جو بھرم، گئی

اب کائنات اور خداؤں کے بس میں ہے
اب رہبری میں قدرتِ دیر و حرم گئی

جادو غزل کا جذبِ تمنّا کے رس میں ہے
یعنی وہ دل کی بات، دلوں میں جو رم گئی

○

وہی اک پکار، وہی فغاں، میری ہر دیدہ و لب میں ہے
ہے کراہ جو شب و روز کی، جو فضا کے شور و شغب میں ہے

کبھی دن ڈھلے پہ ہو سامنا، کبھی دیدِ آخرِ شب میں ہے
ہے یہی مآلِ طلب مرا، تو مری عبادتِ رب میں ہے

کبھی فاصلوں کی مسافتوں پہ عبور ہو تو یہ کہہ سکوں
میرا جرم حسرتِ قرب ہے تو یہی کمی یہاں سب میں ہے

سحرِ ازل کو جو دی گئی، وہی آج تک ہے مسافری
اسے طے کریں تو پتہ چلے کہاں، کون، کس کی طلب میں ہے

کوئی اور طرزِ حیات بھی مجھے اب رہینِ کرم بتا
کہ ہے بات میری گرفتنی، میری چپ بھی سوئے ادب میں ہے

عارف عبدالمتین



چاند میرے گھر میں اُترا تھا، کہیں ڈوبا نہ تھا
اے مرے سورج، ابھی آنا ترا اچھا نہ تھا

میں نے سُن لی تھی ترے قدموں کی آہٹ دور سے
تو نہ آئے گا کبھی، دل میں مرے دھڑکا نہ تھا

میں نے دیکھا تھا مرا آئینہ اک پیکر کا عکس
ہو بہو ہم شکل تھا میرا مگر مجھ سا نہ تھا

کیوں جھلس ڈالا ہے اس نے میرے خد و خال کو
وقت اِک دریا تھا لیکن آگ کا دریا نہ تھا

بند پانی کے بھنور میں کھو گئی کشتی مری
آنکھ جل تھل تھی مگر آنسو کوئی ٹپکا نہ تھا

میں تہِ داماں چراغِ بے نوا بن کر جلا
تھی طلب جھونکے کی مجھ کو اور تو جھونکا نہ تھا

گھوم کر دیکھا، تو تھا جس راہ پر تنہا رواں
بھیڑ اتنی تھی کہ چلنے کو وہاں رستہ نہ تھا

میں کہ وسعت کی تمنّا میں بگولا بن گیا،
ریت کے ذرّے تھے دامن میں مرے، صحرا نہ تھا

کاہشِ سوز و زیاں نے راکھ کر ڈالا مجھے
میں نے سمجھا تھا کہ یہ شعلہ یہاں جلتا نہ تھا

میرے صحرا کی تپش کو دیکھ کر حیراں نہ ہو
ابر گھِر کر بارہا آیا، مگر برسا نہ تھا

اپنے بچوں کا تبسّم دیکھ کر عارف بتا
گھر کی ویرانی کا تجھ کو شکوہ بیجا نہ تھا

عارف عبدالمتین



زمیں سے تا بہ فلک کوئی فاصلہ بھی نہیں
مگر اُفق کی طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں،

سُنا ہے، سبز ردا اوڑھ لی چمن نے مگر،
ہوا کے زور سے برگِ خزاں گرا بھی نہیں

بہت بسیط ہے دشتِ بقا کی تنہائی
قریب و دُور کوئی آہوئے وفا بھی نہیں

مجھے تو عہد کا آشوب کر گیا پتھر
میں درد مند کہاں، درد آشنا بھی نہیں

کبھی خیال کے رشتوں کو بھی ٹٹول کے دیکھ
میں تجھ سے دُور سہی، تجھ سے کچھ جدا بھی نہیں

قدم قدم پہ شکستوں کا سامنا ہے مگر
یہ دل وہ شیشۂ جاں ہے کہ ٹوٹتا بھی نہیں

مرے وجود میں برپا ہے اِس خیال سے حشر
جو میرے ذہن میں پیدا ابھی ہوا بھی نہیں

میں جس کے سحر سے کوہِ ندا تک آ پہنچا
وہ حرف ابھی مرے لب سے ادا ہوا بھی نہیں

میں ایک گنبدِ بے در میں قید ہوں عارفؔ
مری نوا کا سفر ورنہ بے درا بھی نہیں۔

عارف عبدالمتین



چھپائے دل میں ہم اکثر تری طلب بھی چلے
کبھی کبھی ترے ہمراہ بے سبب بھی چلے،

نمودِ گل کے کرشمے سدا جلو میں رہے
نسیم بن کے چلے ہم چمن میں جب بھی چلے

جلاؤ خونِ شہیداں سے ارتقا کے چراغ
یہ رسم چلتی رہی ہے یہ رسم اب بھی چلے

سنا ہے جادہ نوردانِ صبح کے ہمراہ
بہ فیضِ وقت کئی رہزنانِ شب بھی چلے

ہے شورِ شبنمِ آسودگی کے دوش بدوش
گل آج لے کے کہیں شعلۂ غضب بھی چلے

کسی کا حکمِ زباں بندیِ جنوں بھی چلا
کسی کے قصّے سخن بن کے زیرِ لب بھی چلے

ہمیں نے ساغرِ غم منتخب کیا عارف
وگرنہ بزم میں کچھ ساغرِ طرب بھی چلے



ڈھونڈتا ہوں سرِ صحرائے تمنا خود کو
میں کہ سمجھا تھا کبھی روحِ تماشا خود کو

اپنے بچوں کی طرف غور سے جب بھی دیکھا
کتنے ہی رنگوں میں بکھرا ہوا پایا خود کو

اور کچھ لوگ مرے سائے تلے سستا لیں
گرتی دیوار ہوں، دیتا ہوں سہارا خود کو

نور تجھ سے فروزاں ہوا محفل محفل
غم نہیں، شمع صفت میں نے جلایا خود کو

ریگِ اُمید کے شاداب سرابوں کے طفیل
میں نے دیکھا ہے کبھی صورتِ صحرا خود کو

میری عظمت کا نشاں، میری تباہی کی دلیل
میں نے حالات کے سانچے میں نہ ڈھالا خود کو

میری تخلیق مرے کام نہ آئی عارف
میں بہ اندازِ خدا، پاتا ہوں تنہا خود کو

عارف عبدالمتین



میں ازل کا راہرو، مجھ کو ابد کی جستجو
گردِ رہ میرے جلو میں، ساتھ میرے میں نہ تُو

زرد تھا چہرہ مگر مسرور تھا پہلو میں دل
برگِ گُل جیسے اڑا چھلکے سے میرا رنگ و بُو

مجھ کو اپنے شہر کا ہر ایک ذرہ ہے عزیز
اے ہوا لے جا اُڑا کر خاک میری کُو بہ کُو

وقت کا دریا کہ جس میں میں کنول بن کر کھلا
سوچیے تو بحر ہے اور دیکھیے تو آبجُو

میں مصوّر ہوں مگر تصویر ہے خالق مری
رنگ بھرتی ہے مرے خاکے میں میری آرزُو

ذات کا آئینہ جب دیکھا تو حیرانی ہوئی
میں نہ تھا گویا کوئی مجھ سا تھا میرے رُو برُو

لذتِ خود آگہی کا فیض ہے عارف کہ ہم
پہروں اپنے آپ سے رہتے ہیں محوِ گفتگو



کتنی حسرت سے تری آنکھ کا بادل برسا
یہ الگ بات مرا شعلۂ غم بجھ نہ سکا

تیرا پیکر ہے وہ آئینہ کہ جس کے دم سے
میں نے سو رُوپ میں خود اپنا سراپا دیکھا

ایک لمحے کے لئے چاند کی خواہش کی تھی
عُمر بھر سر پہ مرے قہر کا سُورج چمکا

جب بھی احساسِ اماں باعثِ تسکیں ٹھہرا
اَن گنت خطروں کی آہٹ سے دل اپنا دھڑکا

میں اذیت کی گپھاؤں میں کراہوں کب تک
بے گناہی کی سزا کے لئے میعاد ہے کیا

تیرہ و تار خلاؤں میں بھٹکتا رہا ذہن
رات صحرائے انا سے میں ہراساں گزرا

سحرِ گویائی کے کس دشت کا فیضان ہے یہ
ہر سخن لب سے ترے صورتِ آہو نکلا

میں نے جس شاخ کو پھولوں سے سجایا عارف
میرے سینے میں اسی شاخ کا کانٹا اُترا

عارف عبدالمتین



عارف ازل سے تیرا عمل مومنانہ تھا
ہاں غم یہ تھا کہ فکر کا ڈھب کافرانہ تھا

تو مجھ سے دُور رہ کے بھی میرے قریب تھا
ہر چند تو خدا کی طرح تھا، خدا نہ تھا

تنہائیٔ بسیط کا وہ عہد یاد کر
جب تیرے پاس کوئی بھی تیرے سوا نہ تھا

تھا اعتمادِ حُسن سے تو اِس قدر تہی
آئینہ دیکھنے کا تجھے حوصلہ نہ تھا

مَیں نے کیا ہے تجھ کو ترے رُوبرو مگر
کھنچ جائے گا مجھی سے تو، مجھ کو پتہ نہ تھا

بخشا ہے تُو نے میری وفا کو خود اپنا رنگ
ورنہ مری نگاہ میں کوئی صلہ نہ تھا

عمرِ عزیز راہ نوردی میں کٹ گئی
منزل نے دی خبر کہ مسافر چلا نہ تھا

آئی ہے گلستاں سے مری سمت کس لیے
جب نامہ میرے نام کوئی اے صبا نہ تھا

کنجِ قفس میں سر بہ گریباں پڑا ہوں مَیں
عارف چمن میں کوئی مرا ہم نوا نہ تھا

وہ کاروانِ بہار اں کہ بے درا ہوگا
سکوتِ غنچہ کی منزل پہ رُک گیا ہوگا

بجا کہ دل نہیں زندانِ بے خودی کا اسیر
مگر یہ قیدِ انا سے کہاں رہا ہوگا

شعاعِ مہر کی نظارگی کے شوق میں چاند
فلک کے دیدۂ بے خواب میں ڈھلا ہوگا

کچھ ایسی سہل نہیں فن کی منزلِ تخلیق
خدا بھی میری طرح پہروں سوچتا ہوگا

مَیں تیرے ذہن میں رچ بس گیا ہُوں مثلِ خیال
جدھر بھی جائے گا تو، میرا سامنا ہوگا

بہا کے لے بھی گیا میری ہر متاعِ سکوں
جو اشک ابھی ترے رُخ پہ نہیں بہا ہوگا

یہ آرزو ہے کہ وُہ دِن نہ دیکھنا ہو نصیب
مرے عمل سے مرا فکر جب خفا ہوگا

کھلا رہا ہے جو حرفِ دلنوا کے لالہ و گل
وہ میرا نطق نہیں، موجۂ صبا ہوگا

عارف عبدالمتین



جو اُبھرے وقت کے سانچے میں ڈھل کے
وہ ڈوبے ایک عالم کو بدل کے

غمِ منزل تجھے شاید خبر ہو
یہاں پہنچے ہیں کتنے کوس چل کے

اب اُن کے پاس آنسو ہیں نہ آہیں
جو غم کی آگ سے نکلے ہیں جل کے

زمیں کی ایک ہی جنبش بہت ہے،
زمیں سے آ رلیں گے یہ محل کے

ہمیں نے راستوں کی خاک چھانی
ہمیں آئے ہیں تیرے پاس چل کے

اِن آنکھوں نے یہ اَن ہونی بھی دیکھی
نسیمِ صبح گذری گُل مسل کے

زمانہ کیوں تجھی پر مر رہا ہے
بہانے جب کہ لاکھوں ہیں اَجل کے

تری گفتار پر عالم فدا ہے
تری باتوں میں تیور ہیں غزل کے

سحر ہونے کو ہے عارف خدارا
گھڑی بھر سو رہو پہلو بدل کے



تیرے بازوؤں کا سہارا تو ہے اِن مگر ان میں بھی رچ گئی ہے تھکن
میں صحرا سے بچ کر چمن میں تو آؤں پہ صحرا سے کچھ کم نہیں یہ چمن

مری زیست کی راہ تاریک تھی، چاند بن کر تم آئے تو روشن ہوئی
یہ رہ آج پھر تیرہ و تار ہے، غالباً چاند کو لگ گیا ہے گہن،

ہر اک سمت ناگن کی صورت لپکتی ہوئی تیرگی سے ہراساں نہ ہو
عجب کیا کہ لَو دے اُٹھے میرے لمسِ فروزاں سے تیرا سلگتا بدن

یہ اشکوں سے بھیگی ہوئی مسکراہٹ مروّت کا اعجاز ہے ورنہ ہم
غموں کی ہواؤں میں اُڑتا ہوا دیکھ کر آ رہے ہیں کوئی پیرہن

فراقِ لب و زلف پر منحصر کم ہی باقی ہے اہلِ وفا کی تڑپ
تم آغوش کے تنگ حلقے میں ہو پھر بھی ہر لحظہ افزوں ہے دل کی جلن،

مرے پیار کو اک نئے موڑ پر دیکھ کر یوں مری جاں تعجب نہ کر،
بدلتے رہے ہیں بدلتے رہیں گے زمانے کے ہمراہ دل کے چلن

منظور حسین شورؔ



مآلِ شب، بعنوانِ سحر کہنا ہی پڑتا ہے
کوئی رستہ ہو، اس کی رہگزر کہنا ہی پڑتا ہے

وہ سناٹا، خرد کہتی ہے جس کو گھر کی ویرانی
اُسے بھی رونقِ دیوار و در کہنا ہی پڑتا ہے

سلگ جاتا ہے سینہ جس کی ٹھنڈی سرسراہٹ سے
اُس آتش کو بھی یاں بادِ سحر کہنا ہی پڑتا ہے

شریکِ رہگزر کوئی نہیں ہوتا، مگر پھر بھی
یہاں ہر راہرو کو ہم سفر کہنا ہی پڑتا ہے

مسلّم گلکدوں کی لالہ سامانی، مگر ہمدم!
شرار و برق کو بھی معتبر کہنا ہی پڑتا ہے

بہرصورت گزر جاتی ہے جو دل پر گزرتی ہے
مگر پھر اپنے گھر کو اپنا گھر کہنا ہی پڑتا ہے

کچھ ایسے بھی فسانے محفلوں میں چھیڑے جاتے ہیں
کہ جن کو احتیاطاً مختصر کہنا ہی پڑتا ہے

خموشی ایک مجبوری، تکلم ایک محرومی
کسی سے کہہ نہیں سکتے، مگر کہنا ہی پڑتا ہے

منظور حسین شور



وجہِ تسکینِ جنوں، وصلِ نگاراں بھی نہیں
عشق آساں ہے مگر اس قدر آساں بھی نہیں

ہر تجلّی کے لیے ظرفِ نظر ہے درکار
جلوہ ارزاں ہے مگر اس قدر ارزاں بھی نہیں

جانے کیا سوچ کے ہر راہ میں رک جاتا ہوں
اُس سے ملنے کا کسی موڑ پہ امکاں بھی نہیں

ہر نفس کھینچ رہا ہے کوئی رگ رگ سے لہو
اور نشتر کوئی پیوستِ رگِ جاں بھی نہیں

قافلے ہیں کہ گزرتے ہی چلے جاتے ہیں
منزلیں ہیں کہ کسی سمت نمایاں بھی نہیں

گُل کا کیا ذکر کہ اے دوست، مرے دامن پر
ایک مُدّت سے کسی خار کا احساں بھی نہیں

کون سمجھے گا مرے ظرفِ جنوں کی وسعت
میں پریشاں ہوں، مرا حال پریشاں بھی نہیں

تو یہ الزام مرے ظرفِ جنوں پہ نہ تراش
عشق کافر بھی نہیں، عشق مسلماں بھی نہیں

شورؔ اٹھا دوں میں گل و لالہ کے پردے لیکن
یاں کوئی محرمِ اسرارِ گلستاں بھی نہیں

منظور حسین شور

○

صحبتِ میکشی سرسری رہ گئی
وہ جو مینا بھری تھی، بھری رہ گئی

کیا غضب ہے نشیمن سلگتا رہا
اور شاخِ نشیمن ہری رہ گئی

آخرش کام آ ہی گئی خامشی
لفظ و معنی کی پردہ دری رہ گئی

ہر نظر بن گئی اپنے سینے کا تیر
اک خلش بن کے دیدہ وری رہ گئی

نسلِ آدم سے اتنے اٹھے کردگار
اپنے لب سی کے پیغمبری رہ گئی

آدمی کا خدا بن گیا آدمی
داورِ حشر کی داوری رہ گئی

میرا ہر نقشِ پا بن گیا سنگِ میل
خضر کی زحمتِ رہبری رہ گئی

شورؔ داماںِ غم ہو گیا تار تار
ہر مسرت کی بخیہ گری رہ گئی

○

وہ مرے غم میں بھی خنداں نہیں ہونے پاتا
ہائے وہ کفر جو ایماں نہیں ہونے پاتا

وہ نشیمن کہ جو بربادِ بہاراں ہو جائے
وہ کہیں سوختہ ساماں نہیں ہونے پاتا

ہو اگر ہوش بھی احساسِ بہاراں میں شریک
چاک اپنا بھی گریباں نہیں ہونے پاتا

اتنی آساں بھی غمِ دوست کی تکمیل نہیں
گھر بھی اجڑے تو بیاباں نہیں ہونے پاتا

یوں بھی اک عمر گذر جاتی ہے ملتے ملتے
ایک کو ایک کا عرفاں نہیں ہونے پاتا

شورؔ خاموش نہیں میرے ہی زنداں کے چراغ
شہرِ خوباں بھی چراغاں نہیں ہونے پاتا



خضرِ منزل نہ تھا، ابنِ مریم نہ تھا
غم جہاں تھا، کوئی شاملِ غم نہ تھا

دل کو اپنی تباہی کا کچھ غم نہ تھا
اس کی آنکھوں کا ارشاد مبہم نہ تھا

اس سے پہلے بھی سو بار دھڑکا تھا دل
دل دھڑکنے کا لیکن یہ عالم نہ تھا

کب فلک پر ستارے فروزاں نہ تھے
کب زمیں پر ستارِ دل کا ماتم نہ تھا

جامِ جم میں جو صدیوں سلگتا رہا
اور کیا تھا اگر خونِ آدم نہ تھا

اس نے پوچھا نہ تھا شورؔ جب تک مزاج
آنکھ نم نم نہ تھی درد کم کم نہ تھا



میرے مغنی تجھے کیا ہو گیا
نغمہ بھی اندوہ فزا ہو گیا

تو نے مرے درد کا درماں کیا
اور بھی کچھ درد سوا ہو گیا

نکہتِ گل سے بھی لگی دل پہ چوٹ
غنچہ جہاں چاک قبا ہو گیا

ہائے وہ ماتھا جو ہوا داغدار
حیف وہ سجدہ جو ادا ہو گیا

ایک غزل ہم نے پڑھی تھی کہ شورؔ
حشر سرِ بزم بپا ہو گیا



دمِ برق و باد ہوتا، نفسِ شرار ہوتا
کسی رنگ سے تو جینا مجھے سازگار ہوتا

مجھے اُس کی بے رُخی کا بھی جو اعتبار ہوتا
میں دعا کو ہاتھ اٹھا کر نہ گناہگار ہوتا

نہ بلا سے اشک تھمتے، نہ دُعا قبول ہوتی
میں خلوصِ بندگی سے تو نہ شرمسار ہوتا

وہ نقاب اٹھ بھی جاتا تو نظر کہاں سے لاتے
ترے روبرو بھی تیرا وہی انتظار ہوتا

غمِ دوستاں غنیمت ہے وطن سے دُور ورنہ
مرے دل پہ کیا گزرتی جو مرا دیار ہوتا

مجھے شوق دے رہے ہیں وہ فریبِ تیز گامی
کہ جو دو قدم بھی چلتے تو نہ اعتبار ہوتا



بجھتی ہوئی شمعیں ہوتی ہیں، ڈوبے ہوئے تارے ہوتے ہیں
محفل کے اجڑنے سے پہلے آثار یہ سارے ہوتے ہیں

بربادِ محبت پہ ایسا اک دَور بھی آ ہی جاتا ہے
آغوش میں سورج ہوتا ہے، پلکوں پہ ستارے ہوتے ہیں

یہ ظرف ہے ظرفِ فکر و نظر ہر ڈوبنے والا کیا جانے
بے بحر بھی طوفاں اٹھتے ہیں، بے موج بھی دھارے ہوتے ہیں

نظارہ تو ہے بے پردہ مگر ہر دیکھنے والا کیا دیکھے
جو ظرفِ نظر میں آ نہ سکیں، ایسے بھی نظارے ہوتے ہیں

طغیانِ حوادث کی ہمدم، آتی ہی نوازش کیا کم ہے
کشتی نہ سہی، ساحل نہ سہی، طوفاں تو ہمارے ہوتے ہیں



نالہ بر لب حرم سے نکلنا پڑا
اک دعا مانگ کر ہاتھ ملنا پڑا

رہ گزر میں نہ تھا آشنا کوئی شخص
پھر بھی ہر شخص کے ساتھ چلنا پڑا

کیسی شبنم، کہاں کے نسیم و سحاب
اپنے شعلے میں ہر گل کو جلنا پڑا

عادتاً خضر کے ساتھ دنیا چلی
فطرتاً ہم کو آگے نکلنا پڑا

چلتے چلتے جہاں شورؔ ہم رک گئے
اپنا رُخ حادثوں کو بدلنا پڑا



حدِ نظر تک رات ہی رات
ایسا سفر اور تیرا ساتھ

موج و ہوا کی سمت نہ دیکھ
جلتی رہے گی شمع حیات

ظرفِ کفر و ایماں تنگ
تیز شرابِ احساسات

مجھ کو اک انساں کی تلاش
تو مصروفِ ذات و صفات

میری جبیں پہ بھی ہیں شورؔ
کچھ سجدوں کے الزامات

شریف کنجاہی



فضائے صحنِ گلستاں ہے سوگوار ابھی
خزاں کی قید میں ہے یوسفِ بہار ابھی

ابھی چمن پہ چمن کا گماں نہیں ہوتا
قبائے غنچہ کو ہونا ہے تار تار ابھی

ابھی ہے خندۂ گل بھی اگر تو زیرِ لبی
رُکا رُکا سا ہے کچھ نغمۂ ہزار ابھی

چمن تو خیر چمن ہے۔ نواگروں کو نہیں
خود اپنی شاخِ نشیمن پہ اختیار ابھی

ابھی امید کی سرسوں کہیں نہیں پھولی
بسنت کا ہے زمانے کو انتظار ابھی

تہی سبوئی کسی کی یہ کہہ رہی ہے شریفؔ
نظامِ میکدہ بدلے گا ایک بار ابھی

شریف کنجاہی



تلاش جن کی ہے وہ دن ضرور آئیں گے
یہ اور بات سہی، ہم نہ دیکھ پائیں گے

یقیں تو ہے کہ کھلے گا۔ نہ کھل سکا بھی اگر
درِ بہار پہ دستک دیے ہی جائیں گے

غنودہ راہوں کو تک تک کے سوگوار نہ ہو
ترے قدم ہی مسافر! انھیں جگائیں گے

لبوں کی موت سے بدتر ہے فکر و جذب کی موت
کدھر ہیں وہ جو انہیں موت سے بچائیں گے

طویل رات بھی آخر کو ختم ہوتی ہے
شریف ہم نہ اندھیروں سے مات کھائیں گے

شریف کنجاہی



جو اپنے سر پہ سرِ شاخِ آشیاں گذری
کسی کے سر پہ قفس میں بھی وہ کہاں گذری

اسی کی یاد ہے مہتابِ شام ہائے فراق
وہ ایک شب کہ سرِ کوئے مہ وشاں گذری

جہاں میں شوق کبھی رائگاں نہیں جاتا
میں کیوں کہوں کہ مری عمر رائگاں گذری

جبینِ شوق ہماری، گلی گلی میں جھکی
کہ ہر گلی سے تری خاکِ آستاں گذری



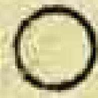
اب کسی شاخ پہ ہلتا نہیں پتہ کوئی
دشت سے، عمر ہوئی، گذرا نہ جھونکا کوئی

لب پہ فریاد، نہ ہے آنکھ میں قطرہ کوئی
وادیٔ شب میں نہیں ہم سفر اپنا کوئی

خندۂ موج مری تشنہ لبی نے جانا
ریت کا تپتا ہوا دیکھ کے ذرہ کوئی

جادۂ شوق پہ کل لوگ تھے آتے جاتے
اب شریف اس پہ مسافر نہیں ملتا کوئی

شریف کنجاہی



تو سمجھتا ہے تو خود تیری نظر گہری نہیں
ورنہ بنیادِ خزاں ناٹے بے خبر! گہری نہیں

وصلِ شیریں ہے نہ جوئے شیر ہے تیرے نصیب
ضرب اے فرہاد! تیشے کی اگر گہری نہیں

یہ بھی ممکن ہے کہ خود تیری نوا ہو نرم خیز
نیند لوگوں کی تو اے مرغِ سحر! گہری نہیں

زندگی کی آج قدریں ہیں فقط گملوں کے پھول
ان میں رعنائی ہے، جڑ ان کی مگر گہری نہیں

ہم نے ان آنکھوں میں اکثر جھانک کر دیکھا شریفؔ
کوئی شے مرموز اتنی، اس قدر گہری نہیں



دھڑکنیں بندِ تکلف سے ذرا آزاد کر
برملا ممکن نہیں، دل میں کسی کو یاد کر

زندگی اک دوڑ ہے تو سانس پھولے گی ضرور
یا بدل مفہوم اس کا، یا نہ پھر فریاد کر

ہر خزاں کی کوکھ سے ہوتی ہے پیدا نوبہار
دامنِ امید میلا اور نہ دل ناشاد کر

بستیاں تو نے خلاؤں میں بسائیں بھی تو کیا
دل کے ویرانوں کو دیکھ، ان کو بھی کچھ آباد کر

شریف کنجاہی



گلزار میں وہ رُت بھی کبھی آ کے رہے گی
جب کوئی کلی جورِ خزاں کے نہ سہے گی

انسان سے نفرت کے شرر بجھ کے رہیں گے
صدیوں کی یہ دیوار کسی دن تو ڈھے گی

جس باپ نے اولاد کی بہبود نہ سوچی
اس باپ کو اولاد، عیاں ہے جو کہے گی

تو جون کی گرمی سے نہ گھبرا کہ جہاں میں
یہ رُت تو ہمیشہ نہ رہی ہے، نہ رہے گی

پختہ ترا ایواں کہ مرا کچا مکاں ہے
سیلاب، شریف، آیا تو ہر چیز بہے گی



کتنے نازک، کتنے خوش گِل پھولوں سے خوش رنگ پیالے
اک بدمست شرابی نے میخانے میں ٹکڑے کر ڈالے

موسمیات کے ماہر ہونے کے تو دعویدار سبھی ہیں
ہم سمجھیں جو حبس گھٹائے، ہم مانیں جو جھکڑ ٹالے

مصنوعی نیلونی پھولوں سے گلدان سجائے جائیں
اور قربینیقوں کا لقمہ بن جائیں خوشبوؤں والے

فرعونوں کے گھر ہی ان کے زہروں کے تریاق پلے ہیں
راتوں کی آغوش ہی پالے اے دل! سرخ سپید اجالے

ہم کو شریف یہ پختہ یقیں ہے آج اگر ہیں کل نہ رہیں گے
راہوں میں کانٹے ہی کانٹے، پاؤں میں چھالے ہی چھالے

شان الحق حقیؔ



نغمہ یوں ساز میں تڑپا مری جاں ہو جیسے
میرا دم ہو مرے سینے کی فغاں ہو جیسے
یک بیک روح میں اٹھا ہے وہ طوفانِ خموش
وادیٔ گل میں نسیم گزراں ہو جیسے
نغمہ و رقص ہوئی جاتی ہے ہر موجِ خیال
چاندنی رات میں دریا کا سماں ہو جیسے
کیا سناتی ہے یہ سازوں کی صدائے دلسوز
کچھ ہمیں درد نصیبوں کا بیاں ہو جیسے
یوں تری چشمِ مدارات پہ دل بھولا ہے
نشۂ مے پہ جوانی کا گماں ہو جیسے
دل ہے یوں بے دلیٔ ہوش کے ہاتھوں لرزاں
کوئی قاتل سے طلب گارِ اماں ہو جیسے
راہ جینے کی کہاں سوختہ جانی کے بغیر
ہر نفس شعلۂ خاطر کا دھواں ہو جیسے
خوب نقشہ ہے مرے فکر کی جولانی کا
کوئی کم بخت اسیری میں جواں ہو جیسے
اُس نے یوں عرضِ محبت پہ سنبھل کر دیکھا
اُس کے دل کو تو خبر ہو نہ گماں ہو جیسے
اک نوا حاصلِ صد عہدِ فغاں ہے حقیؔ
بوئے گل لاکھ بہاروں کا نشاں ہو جیسے

شان الحق حقیؔ



محبت خارِ دامن بن کے رسوا ہو گئی آخر
یہ اقلیمِ عزیزاں بے زلیخا ہو گئی آخر
بساطِ آرزو تصویرِ صحرا ہو گئی آخر
وہ ہنگاموں کی بستی، ہُو کی دنیا ہو گئی آخر
نشانِ صبح یوں گم ہے کہ اب نکلے نہ جب نکلے
اُدھر اندازِ شب ایسا کہ گویا ہو گئی آخر
مری آنکھوں کا بس اک خواب تھی وہ حسرتِ پنہاں
جو خود اُن کی نگاہوں کا تقاضا ہو گئی آخر
قلم کو ہے اُسی صورت کدے کی جستجو یعنی
کہیں پنہاں تھی وہ صورت جو پیدا ہو گئی آخر
فقط ایماں ہی کیا پامال ہیں ایماں شکن لاکھوں
دلوں کی وہ متاعِ کافری کیا ہو گئی آخر
نمودِ صبحِ وعدہ سے تو خیر امید ہی کیا تھی
وہ فرقت کی شبِ ہنگامہ آرا، ہو گئی آخر
کبھی یہ لرزشیں سازآشنا ہوں گی تو دیکھو گے
دلوں کی بے کلی آشوبِ دریا ہو گئی آخر
ہم اپنے چاکِ دامن پر بہت رسوا ہے حقیؔ
نظر آئینِ محفل سے شناسا ہو گئی آخر

شان الحق حقی



اتنا ہی نہیں ہے کہ ترے بن نہ رہا جائے
وہ جان پہ بنی ہے کہ جیے بن نہ رہا جائے

اب دسترسِ شوق ہے بس نام تک اس کے
اکثر جسے سو طرح لکھے بن نہ رہا جائے

غم بردہ سہی، غنچۂ افسردہ سہی دل
تم پیار سے دیکھو تو کھلے بن نہ رہا جائے

ہے دل ہی وہ ناداں کہ ہو تدبیر سے نومید
اور پھر کوئی تدبیر کیے بن نہ رہا جائے

افتاد میں کچھ سعیِ متانت نہیں چلتی
رونے کو جو روکیں تو ہنسے بن نہ رہا جائے

ہم وہ ہیں کہ صد کعبہ و صد دیر کے ہوتے
گوشہ کوئی تعمیر کیے بن نہ رہا جائے

کچھ دیر گذرتی ہے کہ اے بلبلِ ناشاد
صیاد سے نخچیر ہوئے بن نہ رہا جائے

ہر چند کہ فرقت میں تری، زہر ہو جینا
کچھ قہر ہے ایسا کہ جیے بن نہ رہا جائے

ہر چند کہ ساغر کی طرح جوش میں رہیے
ساقی سے ملے آنکھ تو پھر ہوش میں رہیے

کچھ اس کے تصور میں وہ راحت ہے، کہ برسوں
بیٹھے یونہی اس وادیِ گلپوش میں رہیے

اک سادہ تبسم میں وہ جادو ہے کہ پہروں
ڈوبے ہوئے اک نغمۂ خاموش میں رہیے

ہوتی ہے یہاں قدر کسے دیدہ وری کی
آنکھوں کی طرح اپنے ہی آغوش میں رہیے

ٹھہرائی ہے اب حالِ غمِ دل نے یہ صورت
مستی کی طرح دیدۂ مے نوش میں رہیے

ہمت نے چلن اب یہ نکالا ہے کہ چبھ کر
کانٹے کی طرح پائے طلب کوش میں رہیے

آسودہ دلی راس نہیں عرضِ سخن کو
بے شرط کہ دریا کی طرح جوش میں رہیے

یا ربط خدایانِ جفا کیش سے رکھیے
یا حلقۂ یارانِ وفا کوش میں رہیے

حقیؔ وہی اب پھر غمِ ایام کا دکھڑا
یہ محفلِ رنداں ہے، ذرا ہوش میں رہیے



تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

دل کے ماروں کا نہ کر غم کہ یہ اندوہ نصیب
زخم بھی دل میں نہ ہوتا تو کراہے جاتے

ہم نگاہی کی ہمیں خود بھی کہاں تھی توفیق
کم نگاہی کے لیے عذر نہ چاہے جاتے

کاش اے ابرِ بہاری! ترے بہکے سے قدم
میری امید کے صحرا میں بھی گاہے جاتے

ہم بھی کیوں دہر کی رفتار سے ہوتے پامال
ہم بھی ہر لغزشِ مستی کو سراہے جاتے

لذتِ درد سے آسودہ کہاں دل والے
ہیں فقط درد کی حسرت میں کراہے جاتے

ہے ترے فتنۂ رفتار کا شہرہ کیا کیا
گرچہ دیکھا نہ کسی نے سرِ راہے جاتے

دی نہ مہلت ہمیں ہستی نے وفا کی ورنہ
اور کچھ دن غمِ ہستی سے نباہے جاتے



وہ مزا رکھتے ہیں کچھ تازہ فسانے اپنے
بھولتے جاتے ہیں سب درد پرانے اپنے

کرکے اک بار تری چشمِ فسوں گر کے سپرد
پھر نہ پوچھا کبھی بندوں کو خدا نے اپنے

بزمِ یاراں میں وہ اب کیف کہاں ہے باقی
روز جاتے ہیں کہیں جی کو جلانے اپنے

حال میں اپنے کچھ اس طرح مگن ہیں گویا
ہم نے دیکھے ہی نہیں اگلے زمانے اپنے

ہم وہی ہیں کہ جہاں بات کسی نے پوچھی
خوش گماں ہو کے لگے داغ دکھانے اپنے

ہمنشیں، دوست کی صورت تو کہاں ملتی ہے
چین سے وہ ہے جو دشمن کو نہ جانے اپنے

ذکر سے اس کے سنوارا ہے سخن کو حقی
خوش مزا لگتے ہیں کانوں کو ترانے اپنے



دنیا ہی کی راہ پہ آخر رفتہ رفتہ آنا ہوگا
درد بھی دیگا ساتھ کہاں تک، بیدل ہی بن جانا ہوگا

حیرت کیا ہے، ہم سے بڑھ کر کون بھلا بیگانہ ہوگا
خود اپنے کو بھول چکے ہیں، تم نے کیا پہچانا ہوگا

دل کا ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے، اور کہاں اب جانا ہوگا
ہم ہوں گے اور وحشت ہوگی اور یہی ویرانہ ہوگا

بیت گیا جو یاد میں تیری، اک اک لمحے کا ہے دھیان
الفت میں جی ہارنا کیسا، جو کھویا سب پانا ہوگا

اور تو سب کچھ بٹ جاتے ہیں، دل کے درد کو کون بٹائے
دنیا کے غم برحق لیکن اپنا بھی غم کھانا ہوگا

دل میں ہجوم درد ہے لیکن آہ کے بھی اوسان نہیں
اس بدلی کو یونہی آخر من پر سے چھٹ جانا ہوگا

ہم تو فسانہ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ اتار چلے
تم جو کہو گے اپنے دل سے وہ کیسا افسانہ ہوگا

اس بستی کا کون مسیحا، اس بستی کا کون خدا
خود ہی حشر اٹھانے ہوں گے، مرنا اور جی جانا ہوگا



رہی اک فریب حسرت کہ تھا بخشش نگاراں
سو قدم قدم پہ کھایا بہ طریق پختہ کاراں!

وہ چلے خزاں کے ڈیرے کہ ہے آمد بہاراں
شب غم کے رہ نشینو، کہو اب صلاح یاراں

مرے آشیاں کا کیا ہے، میرا آسماں سلامت
ہیں مرے چمن کی رونق یہی برق و باد و باراں

نہ کبھی پسند حکمت، یہ شعار اہل دل ہے
کبھی سر بھی دے دیا ہے بہ صلاح دوست داراں

رہے حسن بن کے آخر جو خیال ادھر سے گزرے
پر کدھر کی چاندنی تھی سر خاک رہ گزاراں

مرے ایک دل کی خاطر یہ کشاکش حوادث
ترے ایک غم کے بدلے یہ ہجوم غمگساراں

مری وحشتوں نے جس کو نہ بنا کے راز رکھا
وہی راز ہے کہ اب تک ہے میان رازداراں

کسی منچلے نے بھیجا ہے مئے سخن سے بھر کر
کہ یہ ساغر دل افزا ہے، یہ نذر دل فگاراں

شان الحق حقی



ایسائے غزل کرتی ہیں موسم کی ادائیں
اک موجِ ترنم کی ہوس میں ہیں فضائیں
نغموں کی زباں ہیں کوئی سمجھے تو بتائیں
کیا چیز ہے یہ طرز، یہ طرحیں، یہ ادائیں
رکے رہ گئے سینۂ تمہارا سے وہ طوفاں
ہیں جن کو کناروں میں لئے تنگ قبائیں
بکنے سے ہوتی ہیں صلاحیں کہ کسی کو
جب خوب مٹانا ہو تو کس طرح مٹائیں
ایسی ہی ترے شہر میں ہوتی ہے مروت
ایسی ہی مرے دیس میں کرتی ہیں وفائیں
دیکھے کوئی افلاک کا یہ جوششِ تباہی
تھکے کو ڈوبنا ہو تو طوفان اٹھائیں
ٹھہرا ہوں اسی بات پہ میں لائقِ تعزیر
جس بات پہ بخشی گئیں اوروں کی خطائیں
دیوانوں کو دنیا سے الجھنے کی کہاں تاب
فرصت ہو تو اک اور ہی دنیا نہ بنائیں
یہ کون سے زنداں کی گرائی گئی دیوار
یہ کونسی تعمیر کی اٹھتی ہیں بنائیں
اے مسکنِ خوبانِ زماں، شہرِ عزیزاں
ہم بھی کبھی بکنے ترے بازار میں آئیں



بکھر جائے گی شام آہستہ بولو
ترخ جائیں گے جام آہستہ بولو
نہ دو داغوں کے بھید آہوں کو روکو
نہ لو نالوں کا نام، آہستہ بولو
نہ لے تنہائی کی راتوں میں اک اک
خموشی انتقام، آہستہ بولو
یہی ہوتے ہیں آدابِ محبت
کہ جب لو اس کا نام، آہستہ بولو
نہ جانے کون بیٹھا ہو کہیں میں
اندھیری ہے یہ شام، آہستہ بولو
فغانِ دل سے کس کا دل پسیجا
یہ ہے سودائے خام، آہستہ بولو
ابھی تو راہ میں دیوار و در ہیں
ابھی دو چار گام، آہستہ بولو
بہت ہے صدمۂ یک آہ اس کو
ہے نازک یہ نظام، آہستہ بولو
ابھی تو بادۂ الفت کا حقی
پیا ہے ایک جام، آہستہ بولو

ضیا جالندھری



منجمد ہونٹوں پہ ہے یخ کی طرح حرفِ جنوں
سرکشی سیل زدہ شاخ کے مانند نگوں

کہاں سرمایۂ الفاظ کہاں سوزِ دروں
لالۂ دشتِ زمستاں ہے، میں جو بات کہوں

میں کہاں پہنچا کہ ہر بُت جسے پوجا اب تک
ہے شکستہ سرِ خاک اور میں شکستہ تر ہوں

رحم کر خوابِ تمنا پہ نگاہِ نگراں
ٹوٹ کر چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں افسوں

خشت کوبی میں گئے فرصتِ خوابِ خوباں
زندہ رہنے کے تقاضوں نے کیا زیست کا خوں

کتنے اقدار کے ایوان زمیں بوس ہوئے
آگہی راکھ کا اک ڈھیر ہوئی جاتی ہے کیوں

کتنے ارمان زمستاں زدہ شاخوں کی طرح
ہاتھ پھیلائے ہوئے تکتے ہیں سوئے گردوں

شب عجب سوختہ ساماں مسافر آئے
جسم آشفتہ بجنوں، چہرے ملول و محزوں

بولے: اے اجنبی اے سادہ تمنا ہمیں دیکھ
ہم بھی رکھتے تھے کبھی آرزوئیں گوناگوں

اور پھر ہم پہ کھلا وقت کی رفتار کا راز
اب کوئی رنگ، کوئی روپ نہیں وجہِ سکوں

بجھ گئیں آرزوئیں شام کے بادل کی طرح
گلشن و شہر ہوئے برف کی تہ میں مدفوں

جا بجا حوصلے تاراج ہوئے، دل ٹوٹے
پے بہ پے ہم نے سہے سرد ہوا کے شبخوں

زندگی محض شکستوں کا اک انبارِ گراں
اب ان آنکھوں میں نہیں کوئی طلسمِ فیکوں

ہم تو اے اجنبی، مہماں ہیں کوئی دم کے
دم بہ دم موجِ فنا کہتی ہے ہیں ہوں میں ہوں

صبحدم سوختہ ساماں مسافر بھی گئے
پھر وہی ہم، وہی تنہائی، وہی حالِ زبوں



اب یہ آنکھیں کسی تسکین سے تابندہ نہیں
میں نے رفتہ سے یہ جانا ہے کہ آئندہ نہیں

تیرے دل میں کوئی غم میرا نمائندہ نہیں
آگہی تیری مژہ پر ابھی رخشندہ نہیں

دلِ ویراں، دمِ بیتے ہوئے وقت کی یاد
کون سا لمحۂ رفتہ ہے کہ پھر زندہ نہیں

تُو بھی چاہے تو نہ آئے گی وہ بیتی ہوئی رات
ہے وہی چاند مگر ویسا درخشندہ نہیں

ابرِ آوارہ سے مجھ کو ہے وفا کی امّید
برقِ بے تاب سے شکوہ ہے کہ پائندہ نہیں

کبھی غنچے کو مہکنے سے کوئی روک سکا
شوق اگر ہے تو پھر اظہار سے شرمندہ نہیں

ضیا جالندھری



اے دل نشیں تلاش تری کو بکو نہ تھی
اپنے سے اک فرار تھا وہ جستجو نہ تھی

اظہار نارسا سہی وہ صورتِ جمال
آئینۂ خیال میں بھی ہو بہو نہ تھی

کیا سحر تھا کہ ہنستے ہوئے جان دے گئے
وہ بھی کہ جن کو تابِ غمِ آرزو نہ تھی

کیا جانے اہلِ بزم نے کیا کیا سمجھ لیا
اخفائے آرزو تھی وہ چپ گفتگو نہ تھی

وہ کون سی سحر تھی کہ روئے نہ پھول پھول
وہ شام کون سی تھی کہ غم سے لہو نہ تھی

ہم تو فریفتہ تھے ضیاؔ دل کی آنچ پر
منظور محض دلکشیِ رنگ و بو نہ تھی



شاداب شاخِ درد کی ہر پور کیوں نہیں
ہر برگ اِک زباں ہے تو پھر شور کیوں نہیں

وارستۂ عذابِ تماشا ہے چشمِ برگ
اے آگہی نگاہ مری کور کیوں نہیں

دستِ سوالِ برگ ہے شبنم سے کیوں تہی
جو بادلوں کو لوٹ لے وہ زور کیوں نہیں

زیست ایک برگِ تشنہ ہے وہ ابر کیا ہوئے
اب ان کی کوئی راہ مری اور کیوں نہیں

یہ شعلہ ایک برگِ خزاں ہے کہ برگِ گل
آنکھوں میں تیری شام ہے کیوں بھور کیوں نہیں

ضیا جالندھری



کتنی دیر اور رہے یہ بزمِ طربناک نہ کہہ
راس آتی ہے کسے گردشِ افلاک نہ کہہ

کیوں ٹھہرتا نہیں گلزار میں کوئی موسم
کیا کشش رکھتی ہے خوشبوئے تہِ خاک نہ کہہ

دیکھ تو رنگ تمناؤں کی بے تابی کے
کل فنا ہے مگر اے صاحبِ ادراک نہ کہہ

درد کی آنچ ابد تک ہے کسی رُوپ میں ہو
آج کے پھول کو آئندہ کے خاشاک نہ کہہ

لفظ کی ضرب تو ہے صاعقہ و سنگ سے سخت
دل بہت نرم ہیں ناگفتہ کو بے باک نہ کہہ

غمگساروں کو بھی ہے اپنے ہی آلام سے کام
دل پہ جو بیتی ہے اے دیدۂ نمناک اسے نہ کہہ

شوق ہی زیست بھی ہے زیست کی آگاہی بھی
اس مسیحا نفس آزاد کو سفاک نہ کہہ

دلِ فرہاد جنوں فہم کو ناداں نہ سمجھ
چشمِ پرویز تنک ہوش کو چالاک نہ کہہ

خود نمائی بھی کہ تھا جس پندار کا خوف
قیس کے جیب و گریباں رہے کیوں چاک نہ کہہ

بجھ نہ جائیں کہیں دل اہلِ تمنا کے ضیاؔ
کیسے شعلوں سے ہے یہ جشنِ طربناک نہ کہہ



چاند ہی نکلا نہ بادل ہی چھما چھم برسا
رات دل پر غمِ دل صورتِ شبنم برسا

جلتی جاتی ہیں جڑیں سُوکھتے جاتے ہیں شجر
ہو جو توفیق تو آنسو ہی کوئی دم برسا

میرے ارمان تھے برسات کے بادل کی طرح
غنچے شاکی ہیں کہ یہ ابر بہت کم برسا

پے بہ پے آئے سبک تاروں کے مانند خیال
میری تنہائی پہ شبِ حسن جھما جھم برسا

کتنے ناپید اُجالوں سے کیا ہے آباد
وہ اندھیرا جو مری آنکھوں پہ پیہم برسا

سرد جھونکوں نے کہی سُوئی رُتوں سے کیا بات
کن تمناؤں کا خوں شاخوں سے تھم تھم برسا

قریہ قریہ بھی ضیا حسرتِ آبادیٔ دل
قریہ قریہ وہی ویرانوں کا عالم برسا

ضیا جالندھری



تمہاری چاہت کی چاندنی سے ہر اک شبِ غم منور گئی ہے
سنہری پوروں سے خواب ریزے سمیٹتی ہر سحر گئی ہے

کھنکتے جھومتے کے حرفِ تسکیں میں جانی پہچانی لرزشیں تھیں
تمہارے سانسوں کی آنچ کتنی قریب آکر گزر گئی ہے

اب اس کا چارہ ہی کیا کہ اپنی طلب ہی لا انتہا تھی ورنہ
وہ آنکھ جب بھی اُٹھی ہے دامانِ درد پھولوں سے بھر گئی ہے

نہ تھا نہ ہوگا کبھی میسر سکون جو تیرے قرب میں ہے
یہ وقت کی جھیل جس میں ہر لہر جیسے تھک کر ٹھہر گئی ہے

یہ برف زارِ خیال جس میں نہ صوتِ گل ہے نہ عکسِ نغمہ
تری توجہ سے آتشِ شوق اسی کو گلزار کر گئی ہے

یہ کون دیوانے ریگِ صحرا کو موجۂ خوں سے سینچتے ہیں
کوئی کہو اس جنوں کی اس نو بہار تک بھی خبر گئی ہے

ضیاؔ دلوں میں غبار کیا کیا تھے روئے جی بھر کے جب ملے وہ
وہ ابر برسا ہے اب کے ساون کہ پتی پتی نکھر گئی ہے



خود کو سمجھا تھا فقط وہم و گماں بھی ہم نے
خود کو پایا ہے دلِ کون و مکاں بھی ہم نے

دیکھ پھولوں سے لدے دھوپ نہائے ہوئے پیڑ
ہنس کے کہتے ہیں گزاری ہے خزاں بھی ہم نے

شفقِ صبح سے تابندہ سمن زار سے پوچھ
رات کاٹی سوئے گردوں نگراں بھی ہم نے

دیکھ کر ابر بھر آئی ہیں خوشی سے آنکھیں
سوکھتے ہونٹوں پہ پھیری ہے زباں بھی ہم نے

جن کے گیتوں میں ہے نکہت کی لپک پھل کا رس
سالہا سال سُنی اُن کی فغاں بھی ہم نے

اب نظر آتے ہیں آسودۂ منزل تو کیا
دیکھی کیا کیا تپشِ ریگِ رواں بھی ہم نے



کچھ اور بلا نشاط کی مے
یہ لذتِ جسم ہے عجب شے

اب بھی وہی گیت ہے، وہی لے
ہم وہ نہیں، انجمن وہی ہے

تخئیل میں ہر طلب ہے تحصیل
جو بات کہیں نہیں، یہاں ہے

کرتے ترا انتظار ابد تک
لیکن ترا اعتبار تا کے

مجھ کو تو نہ راس آئی دوری
تجھ میں بھی وہ بات اب نہیں ہے

دیوانگیاں کبھی مٹی ہیں!
ہر چند رہا زمانہ درپے

سمجھائیں ضیا مگر انہیں کیا
دل ہی سے نہ بات ہو سکی طے



سودِ دل بھی نہیں، سکوں بھی ہے
زندگانی وبال یوں بھی ہے

لالہ گوں ہے ترا خیال مگر
اس میں کچھ حسرتوں کا خوں بھی ہے

تیری خواہش اور اس قدر خواہش
وجہِ ہستی یہی جنوں بھی ہے

اس کی شوخی ہی اک قیامت تھی
اب تو وہ آنکھ آبگوں بھی ہے

زندگی پے بہ پے شکستِ فسوں
زندگی مستقل فسوں بھی ہے

خوش بھی ہے التفاتِ دوست سے دل
غیرتِ عشق سرنگوں بھی ہے

جل کے بجھ بھی گئے ضیا اکثر
آگ سینے میں جوں کی توں بھی ہے

فارغ بخاری



یادوں کا عجیب سلسلہ ہے
سویا ہوا درد جاگ اٹھا ہے

مٹ بھی چکے نقشِ پا، مگر دل
مہکی ہوئی چاپ سُن رہا ہے

جلتی ہوئی منزلوں کا راہی
اب اپنا ہی سایہ ڈھونڈتا ہے

دیواریں تنی ہوئی ہیں لیکن
اندر سے مکان گِر رہا ہے

پوچھے ہے چٹک کے غنچۂ زخم
اے اجنبی تیرا نام کیا ہے

سوچوں کے اتھاہ پانیوں میں
دل برف کا پھول بن گیا ہے

کِس شعلہ بدن کی یاد آئی
دامانِ خیال جل اٹھا ہے

تخلیق میں خود چھپا ہوا ہے
فنکار بھی فطرتاً خدا ہے

مُرجھا کے ہر ایک زرد پتہ
آویزۂ گوش بن گیا ہے

سوچا ہے یہ میں نے پی کے اکثر
نشے میں یہ روشنی سی کیا ہے

شاخوں پہ بہار نہیں سجی ہیں
ہر پھول چمن کا دیوتا ہے

صحرائے وفا میں میرے فن کی
خوشبو کا چراغ جل رہا ہے

پھر پائیں گے خاک سے نمو ہم
فارغ یہ اصولِ ارتقا ہے

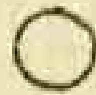
اظہار کا جس کو حوصلہ ہے
وہ اپنی صدی کا دیوتا ہے

منصور سے کم نہیں ہے وہ بھی
جو اپنی زباں سے بولتا ہے

وہ پیڑ ہے زندگی کی عظمت
جو تند ہوا سے لڑ رہا ہے

قاتل کو دعائیں دو کہ فارغ
ہر زخمِ وفا غزل سرا ہے

فارغ بخاری



دو گھڑی بیٹھے تھے زلفِ عنبریں کی چھاؤں میں
چبھ گیا کانٹا دلِ حسرت زدہ کے پاؤں میں

کم نہیں ہیں جبکہ شہروں میں بھی کچھ ویرانیاں
کس توقع پر کوئی جائے گا اب صحراؤں میں

کچی کلیاں، پکی فصلیں سر چھپائیں گی کہاں
آگ شہروں کی لپک کر آ رہی ہے گاؤں میں

زخمِ نظارا ہیں جسموں کی برہنہ ٹہنیاں
ایسے پت جھڑ میں کھلیں گے پھول کیا آشاؤں میں

کیا کہوں طولِ شبِ غم، پل میں صدیاں ڈھل گئیں
وقت یوں گزرا کہ جیسے آبلے ہوں پاؤں میں

حسن کے دیکھے ہیں ہم نے ماہتابی روپ بھی
لیکن ایسی سانولی خوشبو کہاں سلماؤں میں

زندگی میں ایسی کچھ طغیانیاں آتی رہیں
بہہ گئی ہیں عمر بھر کی نیکیاں دریاؤں میں

اے خدائے فصلِ گل، آخر یہ کیا اندھیر ہے
خار گلزاروں میں پھوٹیں، گل کھلیں صحراؤں میں

جلتے موسم میں کوئی فارغ نظر آتا نہیں
ڈوبتا جاتا ہے ہر اک پیڑ اپنی چھاؤں میں

فارغ بخاری



کچھ نہیں گرچہ تری راہگزر سے آگے
دیکھنا کفر نہیں حدِ نظر سے آگے

خود فریبی کے لیے گرمِ سفر ہیں ورنہ
کیا ہے منزل کے سوا گردِ سفر سے آگے

سرِ افلاک بھی تسکینِ نظر ہو نہ سکی
تھے وہی شمس و قمر، شمس و قمر سے آگے

زندگی وقت کی دیواروں میں محبوس رہی
کوئی پردہ نہ اٹھا شام و سحر سے آگے

آج کے دَور کا دعویٰ ہے کہ عنقا کے سوا
کوئی عقدہ نہیں عرفانِ بشر سے آگے

قطرے قطرے کو ترستے ہیں صحرا فارغ
جھوم کر اُٹھے بھی بادل تو وہ برسے آگے



کچھ اب کے بہاروں کا بھی انداز نیا ہے
ہر شاخ پہ غنچے کی جگہ زخم کھلا ہے

دو گھونٹ پلا دے کوئی مے ہو کہ ہلاہل
وہ تشنہ لبی ہے کہ بدن ٹوٹ رہا ہے

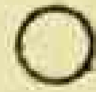
اس رندِ سیہ مست کا ایمان نہ پوچھو
تشنہ ہو تو مخلوق ہے پی لے تو خدا ہے

کس بام سے آتی ہے تری زلف کی خوشبو
دل یادوں کے زینے پہ کھڑا سوچ رہا ہے

کل اس کو تراشو گے تو پوجے گا زمانہ
پتھر کی طرح آج جو راہوں میں پڑا ہے

دیوانوں کو سودائے طلب ہی نہیں ورنہ
ہر سینے کی دھڑکن کسی منزل کی صدا ہے

فارغ بخاری



میں شعلۂ اظہار ہوں کوتاہ ہوں قد تک
وسعت مری دیکھو تو ہے دیوارِ ابد تک

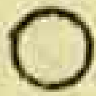
ماحول میں سب گھولتے ہیں اپنی سیاہی
رخ ایک ہی تصویر کے ہیں نیک سے بد تک

کچھ فاصلے ایسے ہیں جو طے ہو نہیں سکتے
جو لوگ کہ بھٹکے ہیں وہ بھٹکیں گے ابد تک

کب تک کوئی کرتا پھرے کرنوں کی گدائی
ظلمت کی کڑی دھوپ تو ڈستی ہے ابد تک

یوں روٹھے مقدر کہ کوئی کام نہ بن پائے
یوں ٹوٹے سہارا، کوئی پہنچے نہ مدد تک

اب بھی ترے نزدیک موحد نہیں فارغ
اقرار کیا ہے ترا، انکار کی حد تک



یاد آئیں گے زمانے کو مثالوں کے لئے
جیسے بوسیدہ کتابیں ہوں حوالوں کے لئے

دیکھ یوں وقت کی دہلیز سے ٹکرا کے نہ گر
راستے بند نہیں سوچنے والوں کے لئے

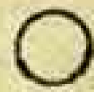
آؤ تعمیر کریں اپنی وفا کا معبد!
ہم نہ مسجد کے لئے ہیں نہ شوالوں کیلئے

سالہا سال عقیدت سے کھلا رہتا ہے
منفرد راہوں کا آغوش، جیالوں کے لئے

رات کا کرب ہے گلبانگِ سحر کا خالق
پیار کا گیت ہے یہ درد، اجالوں کیلئے

شبِ فرقت میں سلگتی ہوئی یادوں کے سوا
اور کیا رکھا ہے ہم چاہنے والوں کے لئے

فارغ بخاری



وہ روشنی ہے کہاں جس کے بعد سایا نہیں
کسی نے آج تلک یہ سراغ پایا نہیں!

کہاں سے لاؤں وہ دل جو ترا بُرا چاہے
عدوئے جاں، ترا دکھ بھی کوئی پرایا نہیں

تری صباحتِ صد رنگ میں بکھر جاؤں
ابھی وہ لمحہ مری زندگی میں آیا نہیں

ترے وجود پہ انگڑائی بن کے ٹوٹا ہے
وہ نغمہ جو کسی مطرب نے گنگنایا نہیں

نئی نویلی زمینوں کی سوندھی خوشبو میں
وہ چاندنی ہے کہ جس میں کوئی نہایا نہیں

ہم ایک فکر کے پیکر ہیں، اک خیال کے پھول
ترا وجود نہیں ہے تو میرا سایا نہیں

وہ باب جس میں توانائیوں کی خوشبو ہے
فسانہ ساز نے فارغ کبھی سنایا نہیں



اس اوج پر نہ اچھالو مجھے، ہوا کر کے
کہ میں جہاں سے ہوں آزا، خدا خدا کر کے

ازل سے، مجھ سے ہے وابستہ خیر و شر کا نظام
نہ دیکھو مجھ کو مری ذات سے جدا کر کے

میں جانتا ہوں، مقفل ہیں سارے دروازے
مجھے یہ ضد ہے کہ گزروں مگر صدا کر کے

میں اپنے دَور کے اس کرب کا ہوں آئینہ
جو پیشرو ہوئے رخصت مجھے عطا کر کے

شکستِ ضبط پہ میں بھی بہت خجل ہوں مگر
کھلا ہے اس کا بھرم میرا سامنا کر کے

یہ فخر کم نہیں، فارغ، ہے دل غریب تو کیا
کہ آبرو تو نہیں کھوئی التجا کر کے



جبیں کا چاند بنوں ، آنکھ کا ستارا بنوں
کسی کا جمالِ شفق تاب کا سہارا بنوں

محبتوں کی شکستوں کا اِک خرابہ ہوں
خدارا مجھ کو گراؤ کہ میں دوبارا بنوں

یہ بھیگی بھیگی ہواؤں میں سرد سرد دھنک
جو دِل کی آگ میں اُترے تو پھر گوارا بنوں

ہر ایک غنچہ دہن کا یہی تقاضا ہے
جمالیات کا میں آخری شمارہ بنوں

زمانہ منظرِ موہوم کا ہے شیدائی
یہ آرزو ہے کوئی دُور کا نظارا بنوں

ہر ایک موج بہا لے گئی جبا نیوں کی دھنک
بنوں تو ایسے سمندر کا میں کنارہ بنوں

مجھے لگن کہ میں آئینے کی مثال رہوں
اسے ہوس کہ روایاتِ سنگِ خارا بنوں

غزل وہ کیوں نہ ہو فارغ در عدن کہ جہاں
ہر ایک شعر کو ضد ہو کہ شاہپارہ بنوں



میں کہ اب تیری ہی دیوار کا اک سایا ہوں
کتنے بے خواب دریچوں سے گزر آیا ہوں

مجھ کو احساس ہے حالات کی مجبوری کا
بے وفا کہہ کے تجھے ، آپ بھی شرمایا ہوں

مجھ کو مت دیکھ ، مرے ذوقِ سماعت کو تو دیکھ
کہ ترے جسم کی ہر تان پہ لہرایا ہوں

اے مورخ ، میری اجڑی ہوئی صورت پہ نہ جا
شہرِ ویراں ہوں مگر وقت کا سرمایہ ہوں

روشنی پھیل گئی ہے مری خوشبو کی طرح
میں بھی جلتے ہوئے صحراؤں کا ہمسایا ہوں

ہمسفر لاکھ مری راہ کا پتھر بھی بنے
پھر بھی ذہنوں کے در و بام پہ لہرایا ہوں

نئی منزل کا جنوں تہمت گمراہی ہے
پاشکستہ بھی تری راہ میں کہلایا ہوں

پھر نمو پائی ہے اِک دردِ خوش آغاز کے ساتھ
دہر میں جرأتِ اظہار کا پیرایہ ہوں

عمر بھر بُت شکنی کرتا رہا ، آج مگر
اپنی ہی ذات کے کہسار سے ٹکرایا ہوں

دہر میں عظمتِ آدم کا نشاں ہوں فارغ
کبھی کہسار ، کبھی دار پہ لہرایا ہوں

شہرت بخاری



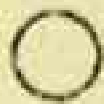
بے نشہ بہک رہا ہوں کب سے — دوزخ ہوں، دہک رہا ہوں کب سے
پتھر ہوئے کان موت کے بھی — سُولی پہ لٹک رہا ہوں کب سے
جھڑتی نہیں گردِ آگہی کی — دامن کو جھٹک رہا ہوں کب سے

ق

لاہور کے کھنڈروں میں یارب — بلبل سا چہک رہا ہوں کب سے
روشن نہ ہوئیں غزل کی شمعیں — شعلہ سا بھڑک رہا ہوں کب سے
تاریک ہیں راستے وفا کے — سورج سا چمک رہا ہوں کب سے
ٹوٹا نہ فسردگی کا جادو — غنچہ سا چٹک رہا ہوں کب سے
جلتا نہیں بیکسی کا خرمن — بجلی سا لپک رہا ہوں کب سے
اس حرص و ہوا کی تیرگی میں — سونا سا دمک رہا ہوں کب سے
سنسان ہے وادیٔ تکلم — بادل سا کڑک رہا ہوں کب سے
بستی کوئی ہو تو مل بھی جائے — صحرا میں بھٹک رہا ہوں کب سے
گلچیں کوئی ہو تو قدر جانے — جنگل میں مہک رہا ہوں کب سے
ہاں اے غمِ عشق! مجھ کو پہچان — دل بن کے دھڑک رہا ہوں کب سے
پیمانۂ عمر کی طرح سے — ہر لحظہ چھلک رہا ہوں کب سے

معلوم یہ اب ہُوا کہ شہرت
دیوانہ ہوں، بک رہا ہوں کب سے

شہرت بخاری



ہم شہر میں اک شمع کی خاطر ہوئے برباد
لوگوں نے کیا چاند کے صحراؤں کو آباد

ہر سمت فلک بوس پہاڑوں کی قطاریں
خسرو ہے، نہ شیریں ہے، نہ تیشہ ہے، نہ فرہاد

برسوں سے یہی خواب ہیں نیندوں کی سجاوٹ
گلشن ہے، مگر گل ہے نہ بلبل ہے، نہ صیاد

ہوں طائرِ بے بام، چراغِ سرِ صحرا
امیدِ کرم ہے نہ مجھے شکوۂ بیداد

جس گھر کو بسایا تھا مری بے خبری نے
آج اس کو تری خودنگری کر گئی برباد

کچھ ایسا دھواں ہے کہ گھٹی جاتی ہیں سانسیں
اس رات کے بعد آؤ گے شاید نہ کبھی یاد

ہر ذرّہ ہے مدفن مری حیرت نگہی کا
یارب، یہ گلی کوچے ہمیشہ رہیں آباد

اک تم ہو کہ پل بھر کو بھلائے نہیں جاتے
اک ہم ہیں کہ خود کو بھی نہیں آئے کبھی یاد

بس اتنا سمجھ لو کہ اجل آبلہ پا تھی
تم سُن نہ سکو گے سفرِ شوق کی روداد

میں نے تجھے سو رنگ سے ڈھالا ہے غزل میں
کیا قہر ہو، تجھ سے بھی اگر پا نہ سکوں داد

کل اپنی بھی تصویر نہ پہچان سکیں گے
اس دور کو بخشے گئے وہ مانی و بہزاد

سنسان ہے زنداں بھی بسانِ دلِ شاعر
نے شورِ سلاسل ہے، نہ ہنگامۂ فریاد

خورشیدِ قیامت اُتر آئے رگِ جاں میں
اے نغمہ گرو! ایسی کوئی طرز ہو ایجاد

شہرت کہ ہے اب وجہِ پریشانیٔ احباب
اُٹھ جائے گا، جس روز تو آئے گا بہت یاد

شہرت بخاری



اُن کو دیکھا تھا کہیں ، یاد نہیں
آسماں تھا کہ زمیں ، یاد نہیں

چاند تاروں کی ٹھنڈی تھیں آنکھیں
تھا کہاں مہرِ مبیں ، یاد نہیں

نغمہ ہی نغمہ تھا یا رنگ ہی رنگ
ہم مکاں تھے کہ مکیں ، یاد نہیں

عہد و پیماں کی جھلکتی شمعیں
کس طرح ڈوب گئیں ، یاد نہیں

اب یہ عالم ہے کہ خود ہم کو بھی
کیوں ہوئے برق نشیں ، یاد نہیں

موت پیاری جو لگا کرتی تھی
اس قدر کیوں ہے غمیں ، یاد نہیں

رس بھری صبحیں ، نشیلی شامیں
کس کے ہمراہ گئیں ، یاد نہیں

راکھ کے ڈھیر ہیں چاروں جانب
بستیاں کیسے لُٹیں ، یاد نہیں

جن کی تعبیر ہیں آنسو شہرتؔ
آج وہ خواب حسیں ، یاد نہیں



بُت بنے راہ تکو گے کب تک
آس کی آنچ سہو گے کب تک

سر اُٹھا کر کبھی دیکھو تو سہی
دل کی دُنیا میں بسو گے کب تک

جس نے اپنی بھی خبر لی نہ کبھی
تم اُسے یاد کرو گے کب تک

ہم سفر ہو تو کوئی اپنا سا
چاند کے ساتھ چلو گے کب تک

کوئی پتّا ہے نہ بُوٹا ہے نہ گُل
دشت کو باغ کہو گے کب تک

ہر طرف آگ برستی ہے یہاں
کس توقع پہ رہو گے کب تک

جھٹپٹا پھیل گیا چہرے پر
صبح کی فکر کرو گے کب تک

ہڈیاں راگ ہوئی جاتی ہیں
میرؔ کے شعر پڑھو گے کب تک

دوست ہنسنے کے لئے ہوتے ہیں
خون کے گھونٹ پیو گے کب تک

دُور اتنا تو نہیں ہے راوی
یعنی بے موت مرو گے کب تک

آندھیاں تیز ہوئی جاتی ہیں
گھر بلاتا ہے ، چلو گے کب تک

کوئی جا کر نہیں آتا شہرتؔ
صورتِ شمع گھلو گے کب تک

شہرت بخاری



سانس کی آس نگہباں ہے، خبردار رہو
دل چراغِ تہِ داماں ہے، خبردار رہو

پھر دو عالم کے اُجڑنے کی گھڑی آپہنچی
آج پھر حُسن پشیماں ہے، خبردار رہو

جادۂ شہرِ تصور کہ رہا رشتۂ جاں
صورتِ گردِ پریشاں ہے، خبردار رہو

پھر کسی دل میں قیامت نے سکوں ڈھونڈ لیا
آج پھر وا درِ زنداں ہے، خبردار رہو

رنگ و خوشبو کے طلسمات میں کھونے والو
پھول میں آگ بھی پنہاں ہے، خبردار رہو

اس قدر محو نہ ہو جاؤ غمِ دُنیا میں
صاف عکسِ غمِ جاناں ہے، خبردار رہو

دل لگاؤ نہ چمن سے، نہ چمن والوں سے
آخرِ کار بیاباں ہے، خبردار رہو

دو گھڑی کے لیے ممکن ہے، کوئی پھول کھلے
حاصلِ دشتِ مغیلاں ہے، خبردار رہو

بوعلی آبلہ پا، سر بگریباں ہے بیاں
موت اس درد کا درماں ہے، خبردار رہو

دل کہ ہے ماتمِ حسرتِ تعمیرِ ازل
خود ہی غارت گرِ ساماں ہے، خبردار رہو

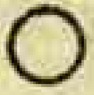
پھر رگ و پے میں اُتر آئیں گے سورج گل کر
آج پھر کوئی غزل خواں ہے، خبردار رہو

ایک اک حرف کہ آئے گا زباں پر لوگو!
گرہِ شعلۂ پیچاں ہے، خبردار رہو

کب تلک سوؤ گے اے کوچۂ جاناں والو!
اثرِ جور نمایاں ہے، خبردار رہو

ذکر میرا بہ بدی بھی نہ زباں پر لاؤ
یہ بھی اک صورتِ درماں ہے، خبردار رہو

طورِ سینا ہو کہ لاہور کی گلیاں شہرت
حسن ہر رنگ گریزاں ہے، خبردار رہو



کوٹھے اُجاڑ، کھڑکیاں چپ، رستے اُداس
جاتے ہی اُن کے، کچھ نہ رہا زندگی کے پاس

دو پل برس کے ابر نے دریا کا رُخ کیا
تپتی زمیں سے پہروں نکلتی رہی بھڑاس

مٹی کی سوندھ جاتے ہوئے ساتھ لے اُڑی
ڈالی کا لوچ، پات کی سبزی، کلی کی باس

اشکوں سے کس کو پیار ہے، آہوں سے کس کو اُنس
لیکن یہ دل کہ جس کو خوشی آسکی نہ راس

ہشیار! اے نویدِ اجل! لُٹ نہ جائیو
پھرتا ہے کوئی آٹھ پہر، دل کے آس پاس

آنسو ہو، مے ہو، زہر ہو، آبِ حیات ہو
جز خونِ آرزو نہ بجھے زندگی کی پیاس

جیسے کبھی تعلقِ خاطر نہیں رہا
یوں روٹھ کر چلی گئی شہرت ہر ایک آس



رسمِ گریہ بھی اٹھا دی ہم نے
آخری شمع بجھا دی ہم نے

ایک موہوم تصور کے لیے
روح کی [illegible] گنوا دی ہم نے

درمیانِ دل و گلزارِ حیات
غم کی دیوار اٹھا دی ہم نے

راکھ بھی پائے نہ کوئی اپنی
اب کے وہ آگ لگا دی ہم نے

سنسناتے رہے تارے پہروں
کیوں تری بات سنا دی ہم نے

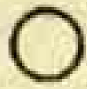
ہر کڑی راہ میں، ہر منزل پر
تیرے ہی غم کو صدا دی ہم نے

اس کے بجھتے ہوئے شعلے کو
تیرے دامن سے ہوا دی ہم نے

جب تجھے بھولنا چاہا دل نے
اک نئے غم کی سزا دی ہم نے

کوئی غنچہ کسی گوشے میں کھلا
باغ میں دھوم مچا دی ہم نے

کیسی آباد تھی دنیا شہرت
کیسی سنسان بنا دی ہم نے



آؤ کہ ابھی چھاؤں ستاروں کی گھنی ہے
پھر شام تلک دشتِ غریب الوطنی ہے

کچھ بھی ہو مگر حسن کی فطرت میں ابھی تک
پابندیٔ رسم و رہِ خاطر شکنی ہے

مت پوچھ کہ کیا رنگ ہے ضبطِ غمِ دل میں
ہر اشک جو پیتا ہوں وہ ہیرے کی کنی ہے

شاعر کے تخیل سے چراغوں کی لووں تک
ہر چیز تری بزم میں تصویر بنی ہے

تم جس کو بہت سمجھے تو اک بوند لہو کی
پوچھو مرے دامن سے، عقیقِ یمنی ہے

معلوم ہوا جب کہ رہا کچھ بھی نہ دل میں
بس ایک نظر قیمتِ دنیائے دنی ہے

خسرو کا تجمل ہے نہ شیریں کا تغافل
فرہاد کی قسمت میں وہی کوہ کنی ہے

ابلیس ہو، سقراط ہو، سرمد ہو کہ منصور
خود آگہی ہر شکل میں گردن زدنی ہے

مقصود نہ بلبل ہے نہ طوطی ہے نہ قمری
مطلب تو چمن والوں کا ناوک فگنی ہے

آسائشِ گیتی ہے سزا بے ہنری کی
آزردگیٔ دل صلۂ خوش سخنی ہے

کن پھول فضاؤں کی توقع میں پڑے ہو
ہشیار! کہ یاں ذوقِ صبا شعلہ زنی ہے

آؤ چلیں اس انجمنِ بوالہوساں سے
آتش نفسی ہے نہ جہاں گل بدنی ہے

شہرت سے کبھی جان طلب کر کے تو دیکھو
ہر چند تہی دست ہے پر دل کا غنی ہے

شہرت بخاری



اک عمر فسانے غمِ جاناں کے گھڑے ہیں
تارے اُفقِ شعر پہ کیا کیا نہ جڑے ہیں

صحرا ہیں ہے جل تھل تو سمندر ہیں بگولے
ہم وضع کے پابند ہیں، چُپ چاپ پڑے ہیں

آئے کوئی جائے، ہمیں کیا کام، کہ ہم لوگ
کھمبے ہیں کہ سڑکوں کے کنارے پہ گڑے ہیں

خود پہ جو پڑی ہے تو دھڑکتا نہیں دل بھی
غیروں کے لئے کعبے میں جا جا کے لڑے ہیں

"مہدی" کوئی آئے گا، بدل دے گا مقدر
کیا جانئے اس آس میں کس دن سے پڑے ہیں

ہم کچھ بھی سہی لیکن ہیں ترے پاؤں کی مٹی
سر چڑھے ترے، تو کچھ بھی نہ ہو، پھر بھی بڑے ہیں

یہ مرتبہ حاصل ہے تری بزم کو جن سے،
وہ لوگ ابھی تک پسِ دیوار پڑے ہیں

انگارے برستے ہیں اگر، کچھ تو ہے، ورنہ
اس مُنہ سے سدا پھول محبت کے جھڑے ہیں

موقوف کرو ہم سخنیِ میرؔ کی شہرتؔ
اربابِ قلم پہ یہ شب و روز کڑے ہیں



بزم سنواروں، غزلیں گاؤں
جینے کے انداز بتاؤں

ہر دم رو رو خون کے آنسو
کیوں آنکھوں کی آب گنواؤں

کب تک دل کے بہکانے پر
تارے گن گن رات بتاؤں

اُن کو میرا دھیان نہیں ہے
میں کیوں اپنی جان گنواؤں

میرا غم کس نے کھایا ہے
میں کیوں دُنیا کا غم کھاؤں

سب سے ترکِ تعلق کر لوں
خود سے رسم و راہ بڑھاؤں

مرنے والوں کو مرنے دوں
جینے والوں کو اپناؤں

ہر میّت کے سرہانے شہرتؔ
نغمے چھیڑوں، جشن مناؤں

جعفر طاہر



پھر وہی قتلِ محبت زدگاں ہے کہ جو تھا
رسن و دار کا عالم میں سماں ہے کہ جو تھا

ان کے ہاتھوں میں وہی تیغِ ستم ہے کہ جو تھی
دہر ماتم کدۂ بے گنہاں ہے کہ جو تھا

چشمِ پُرخونِ وفا لالہ فشاں ہے کہ جو تھی
قسمتِ بوالہوساں، عیشِ جہاں ہے کہ جو تھا

حیرتِ اہلِ نظر، اہلِ ہنر ہے کہ جو تھی
شہرۂ کم نظراں، بے ہنراں ہے کہ جو تھا

رسمِ آرائشِ ایوانِ طرب ہے کہ جو تھی
سرِ فرہاد پہ وہ کوہِ گراں ہے کہ جو تھا

یہ شجر ہیں کہ صلیبیں سی گڑی ہیں ہر سو
منزلِ عشق وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

دفترِ لالہ و گل ہے نہ وہ دیوانِ بہار
زینتِ لوحِ چمن حرفِ خزاں ہے کہ جو تھا

زیرِ ہر شاخ شب و روز قفس ڈھلتے ہیں
عالمِ نوحہ گراں بستہ پراں ہے کہ جو تھا

دولتِ اہلِ طلب، خارِ ستم ہیں کہ جو تھے
چار سُو غلغلۂ گلبدناں ہے کہ جو تھا

سایۂ مرغِ پریدہ ہے کہ یہ ابرِ بہار
گلۂ مرحمتِ آرہ طلباں ہے کہ جو تھا

ہے وہی آج بھی رنگ و روشِ رودِ فرات
ہر نفس ماتمِ تشنہ لباں ہے کہ جو تھا

آج بھی عرضِ وفا ان پہ گراں ہے کہ جو تھی
آج بھی حوصلۂ شرح و بیاں ہے کہ جو تھا

نہ وفاؤں پہ نظر ہے نہ جفاؤں کا ملال
دل میں وہ درد، وہ احساس کہاں ہے کہ جو تھا

صولت و سطوتِ اربابِ ہمم مٹ کے رہی
لٹ کے بھی حسنِ بتاں حسنِ تباں ہے کہ جو تھا

ہے تری یاد نشاطِ شبِ ہجراں کہ جو تھی
ہاں ترا درد قرارِ دل و جاں ہے کہ جو تھا

جلوۂ یار سے محروم ہے غم خانۂ دل
یہ وہی تیرہ و تاریک مکاں ہے کہ جو تھا

وقت کے ساتھ بدلتا نہیں جعفر طاہر
یہ وہی سوختہ دل، سوختہ جاں ہے کہ جو تھا

جعفر طاہر



غمِ دوراں، غمِ جاناں، غمِ جاں ہے کہ نہیں
دلستاں سلسلۂ غم زدگاں ہے کہ نہیں

ہر نفس بزمِ گلستاں میں غزلخواں تھا کبھی
ہر نفس نالہ کشاں، نوحہ کناں ہے کہ نہیں

ہر نظر نغمہ سرا، انجمن آرا تھی کبھی
ہر نظر حیرتیِ رنگِ جہاں ہے کہ نہیں

ہر زباں پر تھا کبھی تذکرۂ دورِ بہار
ہر زباں شکوہ گرِ جورِ خزاں ہے کہ نہیں

مے چکاں، بادہ فشاں تھے لبِ گلرنگ کبھی
لبِ گلرنگ پہ زخموں کا گماں ہے کہ نہیں

سرمۂ چشمِ عنایت کی حکایت چھوڑو
آج ہر آنکھ میں آہوں کا دھواں ہے کہ نہیں

قافلے جانے گھٹاؤں کے کہاں اتریں گے
ہر خمِ زلف بہ حسرت نگراں ہے کہ نہیں

دشتِ وحشت سے نہیں کم یہ جہانِ گل و بو
صورتِ ریگِ رواں، عمرِ رواں ہے کہ نہیں

نغمۂ بارِ بہاری جسے تم کہتے ہو
جرسِ قافلۂ گل کی فغاں ہے کہ نہیں

نہ تو بلبل کی نوا ہے نہ صدائے طاؤس
صحنِ گلزار میں اب امن و اماں ہے کہ نہیں

مجھ سے کیا پوچھتے ہو، کون یہاں تک پہنچا
سرخیِ خارِ بیاباں سے عیاں ہے کہ نہیں

زندگی کچھ بھی سہی، پھر بھی بڑی دولت ہے
موت سی شئے بھی یہاں جنسِ گراں ہے کہ نہیں

صورتِ لطف و کرم یہ ہو تو دل کیوں نہ جلے
آگ پتھر کے بھی سینے میں نہاں ہے کہ نہیں

ظلم چپ چاپ سہے جاؤ گے آخر کب تک
اے اسیرانِ قفس! منہ میں زباں ہے کہ نہیں

یہ ادب گاہِ محبت ہے جو چپ ہوں طاہر
ورنہ یاں کون سا اندازِ بیاں ہے کہ نہیں



یہ اور بات کہ یہ سحر بیش و کم پہ چلا
سیاہ رات کا جادو مگر نہ ہم پہ چلا

ادھر سے پہلے بھی کچھ سرفروش گزرے تھے
رہِ طلب میں نشانِ قدم قدم پہ چلا

یہ طائرانِ چمن کا نصیب کیا کہیے
وہ تیر ان کے لئے وقف ہے جو کم پہ چلا

خدا خدا کے اشارے پہ لوٹ لوٹ گیا
تڑپ تڑپ کے طریقِ صنم صنم پہ چلا

کبھی خدا کی پرستش کبھی ثنائے بتاں
رہِ عرب پہ کبھی جادۂ عجم پہ چلا

اسیرِ دام نہ ہوگا مرا دلِ آزاد
کسی کا حکم کبھی موجِ یم بہ یم پہ چلا

تجھے بھی دیکھ لیا ہم نے اوخدائے اجل
کہ تیرا زور چلا بھی تو اہلِ غم پہ چلا

یہ نقشِ پا ہیں کہ زنجیرِ موجِ خوں، یارو
یہ کون طرفہ جواں جادۂ ستم پہ چلا

لبِ نگاہ پہ مہریں لگی رہیں طاہر
کسی کا زور نہ لیکن مرے قلم پہ چلا



کہنے کو تو کیا کیا نہ دلِ زار میں آئے
ہر بات کہاں قالبِ اظہار میں آئے

نزدیک جو پہنچے تو وہ آہوں کا دھواں تھا
کہنے کو تو ہم سایۂ دیوار میں آئے

ہر موجۂ خوں سر سے گزر جائے تو اچھا
ہر پھول مرے حلقۂ دستار میں آئے

ہم اپنی صلیبوں کی حفاظت میں کھڑے ہیں
اب جو بھی شکن گیسوئے دلدار میں آئے

پاؤں میں اگر طوق و سلاسل ہیں تو کیا غم
اے ہم سفرو، فرق نہ رفتار میں آئے

اک عمر بھٹکتے ہوئے گزری ہے جنگل میں
اب کون فریبِ نگہِ یار میں آئے

اے کاش کبھی اسکا ادھر سے بھی گزر ہو
اک دن تو صبا لوٹ کے گلزار میں آئے

بکتے بھی تو کیا چشمِ خریدار میں طاہر
ہم کون سے یوسف تھے جو بازار میں آئے

جعفر طاہر



تشنہ لبوں کی نذر کو سوغات چاہیئے
تیرے نثار، تھوڑی سی برسات چاہیئے

اتنا بھی میکدے پہ نہ پہرے بٹھائیے
کچھ تو خیالِ اہلِ خرابات چاہیئے

آپس کی گفتگو میں بھی کٹنے لگی زباں
اب دوستوں سے ترکِ ملاقات چاہیئے

مدت سے چشم و دل میں کوئی رابطہ نہیں
کیا اور تجھ کو گردشِ حالات چاہیئے

کس کس خدا کے سامنے سجدہ نہیں کیا
کچھ شرم، کچھ تو آبروئے ذات چاہیئے

ذکرِ پری وشاں کے زمانے گذر گئے
اب تو غزل میں حمد و مناجات چاہیئے

انصاف کی یہ آنکھ، یہ سورج کی روشنی
یارب، یہی ہے دن تو مجھے رات چاہیئے

ہم چاہتے ہیں، دہر میں جینے کا حق ملے
ان کو ثبوتِ فرخیِ ذات چاہیئے

کچھ بھی ہو مصلحت کا تقاضا مگر ندیم
جو دل میں ہو، زباں پہ وہی بات چاہیئے

اے زلفِ ناز، کوئی ہوائے فسوں کا دم
اہلِ نظر کو سیرِ طلسمات چاہیئے

تابِ کمندِ کاکلِ خمدار ہوشیار
کھل کر نہ ہر کسی پہ عنایات چاہیئے

طاہر جزائے ہمتِ عالی ہے زلفِ یار
زلفوں سے کھیلنے کے لئے ہات چاہیئے



یہ تو نہیں کہ ہم پہ ستم ہی کبھی نہ تھے
اتنا ضرور تھا کہ وہ ناگفتنی نہ تھے

اے چشمِ التفات، یہ کیا ہو گیا تجھے
تیری نظر میں ہم تو کبھی اجنبی نہ تھے

پھرتے ہیں آفتاب زدہ کائنات میں
ہم پر کسی کی زلف کے احساں کبھی نہ تھے

پامال کر دیا جو فلک نے تو کیا کہیں
ہم تو کسی کمال کے بھی مدعی نہ تھے

کیا جرم تھا، یہ آج بھی ہم پر نہیں کھلا
یہ علم ہے کہ اہلِ جنوں کشتنی نہ تھے

ہر لمحہ تیرے عشق میں عمرِ ابد بنا
جو دن بھی زندگی کے ملے، عارضی نہ تھے

مرجھا کے بھی گئی نہ مہک جسمِ ناز کی
یہ موتیے کے پھول کوئی کاغذی نہ تھے

یارانِ شہرِ عشق میں بے آبرو ہوئے
ہم پر تو مہرباں وہ کبھی تھے، کبھی نہ تھے

اقلیمِ عاشقی کو دیا دینِ شاعری
ہم صاحبِ کتاب تھے، گرچہ نبی نہ تھے

ہم جن کی نذر کرتے جواہر کلام کے
طاہر ہمارے شہر میں وہ جوہری نہ تھے

جعفر طاہر



نشے میں چشمِ ناز جو ہنستی نظر پڑی
تصویرِ ہوشیاری و مستی نظر پڑی

لہرائی ایک بار وہ زلفِ خرد شکار
کوئی نہ پھر بلندی و پستی نظر پڑی

اٹھی تھی پہلی بار جدھر چشمِ آرزو
وہ لوگ پھر ملے، نہ وہ بستی نظر پڑی

حسنِ بتاں تو آئینۂ حسنِ ذات ہے
زاہد کو اس میں کفر پرستی نظر پڑی

یارب، کبھی تو بوالہوسوں کو بھی دے سزا
مانا، ہماری جان تو سستی نظر پڑی

سوئے چمن گئے تھے بہاراں سمجھ کے ہم
دیکھا تو ایک آگ برستی نظر پڑی

کیسی صبا، کہاں کی نسیمِ چمن، نہ پوچھ
ناگن سی پھول پھول کو ڈستی نظر پڑی

مدت کے بعد اپنی طرف پھر گیا خیال
تم کیا ملے کہ صورتِ ہستی نظر پڑی

شبنم کی بوند بوند نے ہنس ہنس کے جان دی
طاہر کرن کرن بھی ترستی نظر پڑی



عرصۂ ظلمتِ حیات کٹے
ہمنفس مسکرا، کہ رات کٹے

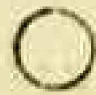
شرِ آرزو کا ذکر نہ چھیڑ
چھونے پائے نہ تجھے کہ بات کٹے

کاش ہر زلف تیغ بن جائے
کاش زنجیرِ حادثات کٹے

اے بقائے دوام کے مالک
کس طرح عمرِ بے ثبات کٹے

آدمی جستجوئے راہ میں ہے
تجھ کو ضد ہے، رہِ نجات کٹے

شبِ خلوت سخن کی داد
اور سرِ بزم بات بات کٹے



دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے بھاری پتھر
مارنے آئے ہیں جگنے کو حواری پتھر

میں نے جو تیرے تصور میں تراشے تھے کبھی
لے گئے وہ بھی مرے گھر سے پجاری پتھر

آدمی آج کہاں جائے، وہ کیونکر جائے
سر پہ صحرا تو زمیں ساری کی ساری پتھر

سب سے پہلے مرے بھائی نے ہی پھینکا مجھ پر
پہلا پتھر ہی مجھے ہو گیا کاری پتھر

رحم اے گردشِ دوراں، یہ تماشا کیا ہے
پھول سے شانوں پہ کرتے ہیں سواری پتھر

جب کوئی غنچہ کھلا، کوئی کلی چٹکی ہے
لے کے پہنچی ہے وہیں بادِ بہاری پتھر

دل ہے اس آہوئے درماندہ و بیکس کی طرح
مارتے ہیں جسے مل مل کے شکاری پتھر

سینۂ سنگ سے دریا نہیں بہتے دیکھے
کون کہتا ہے کہ ہیں درد سے عاری پتھر

نازِ ہر جست کے اٹھا پائے نہ جعفر طاہر
چوم کر چھوڑ دیئے ہم نے یہ بھاری پتھر



چھیڑ کر تذکرۂ دورِ جوانی رویا
رات یاروں کو سنا کر میں کہانی رویا

ذکر تھا کوچہ و بازار کے ہنگاموں کا
جانے کیا سوچ کے وہ یوسفِ ثانی رویا

غیرتِ عشق نے کیا کیا نہ بہائے آنسو
سن کے باتیں تری، غیروں کی زبانی رویا

جب بھی دیکھی ہے کسی چہرے پہ اک تازہ بہار
دیکھ کر میں تری تصویر پرانی، رویا

کس نے دی شوخیِ رفتار کی میری طرح داد
کون یوں دیکھ کے دریا کی روانی رویا

چشمِ اربابِ وفا ہے جو لہو روتی ہے
غیر پھر غیر ہے، رویا بھی تو پانی رویا

تیری بہکی ہوئی سانسوں کی لویں یاد آئیں
آج تو دیکھ کے میں صبح سہانی رویا

اے وطن، جب بھی سرِ دشت کوئی پھول کھلا
دیکھ کر تیرے شہیدوں کی نشانی، رویا

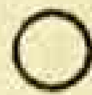
ابنِ انشا



کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا ترا — کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرا ترا
ہم بھی وہیں موجود تھے، ہم سے بھی سب پوچھا کیے — ہم ہنس دیئے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردا ترا
اس شہر میں کس سے ملیں، ہم سے تو چھوٹیں محفلیں — ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانا ترا
کوچے کو تیرے چھوڑ کر، جوگی ہی بن جائیں مگر — جنگل ترے، پربت ترے، بستی تری، صحرا ترا
تو باوفا، تو مہرباں، ہم اور تجھ سے بدگماں؟ — ہم نے تو پوچھا تھا ذرا، یہ وصف کیوں ٹھہرا ترا
بے شک اسی کا دوش ہے، کہتا نہیں خاموش ہے — تو آپ کر ایسی دوا، بیمار ہو اچھا ترا
ہم اور رسمِ بندگی؟ آشفتگی؟ افتادگی؟ — احسان ہے کیا کیا ترا، اے حسنِ بے پروا ترا
دو اشک جانے کس لیے، پلکوں پہ آکر ٹک گئے — الطاف کی بارش تری اکرام کا دریا ترا
اے بے دریغ و بے اماں، ہم نے کبھی کی ہے فغاں؟ — ہم کو تری وحشت سہی، ہم کو سہی سودا ترا
ہم پر یہ سختی کی نظر؟ ہم ہیں فقیرِ رہگذر — رستہ کبھی روکا ترا؟ دامن کبھی تھاما ترا؟
ہاں ہاں تری صورت حسیں، لیکن تو اتنا بھی نہیں — اس شخص کے اشعار سے شہرہ ہوا کیا کیا ترا

بے درد، سننی ہو تو چل، کہتا ہے کیا اچھی غزل
عاشق ترا، رسوا ترا، شاعر ترا، انشا ترا

ابنِ انشا



دیکھ ہمارے ماتھے پر یہ دشتِ طلب کی دھول میاں
ہم سے ہے ترا درد کا ناطہ، دیکھ ہمیں مت بھول میاں

اہلِ وفا سے بات نہ کرنا، ہوگا تیرا اصول میاں
ہم کیوں چھوڑیں ان گلیوں کے پھیروں کا معمول میاں

یونہی تو نہیں دشت میں پہنچے، یونہی تو نہیں جوگ لیا
بستی بستی کانٹے دیکھے، جنگل جنگل پھول میاں

یہ تو کہو کبھی عشق کیا ہے، جگ میں ہوئے ہو رسوا بھی؟
اس کے سوا ہم کچھ بھی نہ پوچھیں، باقی بات فضول میاں

نصب کریں محرابِ تمنّا، دیدہ و دل کو فرش کریں
سنتے ہیں وہ کوئے وفا میں آج کریں گے نزول میاں

سُن تو لیا کسی نار کی خاطر کاٹا کوہ، نکالی نہر
ایک ذرا سے قصے کو اب دیتے کیوں ہو طول میاں

کھیلنے دیں انہیں عشق کی بازی، کھیلیں گے تو سیکھیں گے
قیس کی یا فرہاد کی خاطر کھولیں کیا اسکول میاں

اب تو ہمیں منظور ہے یہ بھی شہر سے نکلیں رسوا ہوں
تجھ کو دیکھا باتیں کرلیں، محنت ہوئی وصول میاں

ہم کو یہ کب تم پہ گماں تھا شاعر بھی ہو انشا جی
اب تک تو جس بھیس میں دیکھا لگتے تھے معقول میاں

ابن انشا



سانحہ ہم پہ یہ پہلا ہے مری جاں کوئی؟
ایسے دامن سے ملاتا ہے گریباں کوئی؟

قیس صاحب کا تو اس غم میں عجب حال ہوا
اپنے رستے میں نہ پڑتا ہو بیاباں کوئی

ہم نے اپنے کو بہت دیر سنبھالا ہوتا
آ ہی نکلے اگر آنسو سرِ مژگاں کوئی!

یارو اس دردِ محبت کی دوا بتلاؤ
ڈھونڈ لیں گے غمِ دوراں کا تو درماں کوئی

یک نظر دیکھنا، رم کرنا، ہوا ہو جانا
اُن سے چھوٹی ہے بھلا خوئے غزالاں کوئی؟

ہم کسی سمت بھی نکلے ہوں، وہیں جا نکلے
ہم سے بھولی ہے رہِ کوچۂ جاناں کوئی

اب تری یاد میں روئیں گے نہ حیراں ہوں گے
اُن سے پیماں ہے کوئی، دل سے ہے پیماں کوئی

سونی راتوں میں سرِ بسترِ خواب راحت
بیٹھا رہتا ہے کسی بات پہ گریاں کوئی

بھیگی شاموں میں، کھلے صحن میں تنہا تنہا
بے قرارانہ ہی دیکھا ہے خراماں کوئی

دوستو، دوستو، اس شخص کو جا کر سمجھاؤ
اپنے انشا کے سنبھلنے کا بھی ساماں کوئی

یہ بھی ہم لوگوں کی وحشت پہ ہنسا کرتا تھا
آ بسا اس خانۂ ویراں میں بھی مہماں کوئی



گوری اب تو آپ سمجھ لے ہم ساجن یا دشمن ہیں
گوری! تو ہے جسم ہمارا، ہم تیرا پیراہن ہیں

نگری نگری گھوم رہے ہیں، سمجھو اچھا موقع ہے
روپ سروپ کی بھکشا دے دو، ہم اک پھیلا دامن ہیں

تیرے چاکر ہو کر پایا درد بہت، رسوائی بہت
تجھ سے تھے جو ٹھگ کے گماشتے آج تجھی کو ارپن[1] ہیں

لوگو، میلے تن من دھن کی ہم کو سخت مناہی ہے
لوگو، ہم اس چھوت سے بھاگیں، ہم تو کھرے برہمن ہیں

پوچھو کھیل بنانے والے، پوچھو کھیلنے والے سے
ہم کیا جانیں کس کی بازی، ہم جو پتے باون ہیں

---

[1] نذر

ابن انشا



اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کر دیں، رستہ روک ستاروں کا

جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا کام ہے ان بنجاروں کا

اپنی زبان سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے، پوچھو حال بچاروں کا

ایک ذرا سی بات تھی جس کا چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا

درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو، دل کا تقاضا وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا، چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا

انشا جی، اب اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی، نام نہ لو اُن پیاروں کا



پیت کرنا تو ہم سے نبھانا سجن، ہم نے پہلے ہی دن تھا کہا نا سجن
تم ہی مجبور ہو ہم ہی مختار ہیں، خیر مانا سجن، یہ بھی مانا سجن

اب جو ہونے کے قصے سبھی ہو چکے، تم ہمیں کھو چکے ہم تمہیں کھو چکے
آگے دل کی نہ باتوں میں آنا سجن، کہ یہ دل ہے سدا کا دوانا سجن

یہ بھی سچ ہے نہ کچھ بات جی کی بنی، سونی راتوں میں دیکھا کیے چاندنی
پر یہ سودا ہے ہم کو پرانا سجن، اور جینے کا اپنے بہانا سجن

شہر کے لوگ اچھے ہیں ہمدرد ہیں، پر ہماری سنو ہم جہاں گرد ہیں
داغِ دل مت کسی کو دکھانا سجن، یہ زمانہ نہیں وہ زمانہ سجن

اس کو مدت ہوئی صبر کرتے ہوئے، آج کوئے وفا سے گزرتے ہوئے
پوچھ کر اس گدا کا ٹھکانا سجن، اپنے انشا کو بھی دیکھ آنا سجن

ابن انشا



جلوہ نمائی، بے پروائی، ہاں یہی ریت جہاں کی ہے
کب کوئی لڑکی من کا دریچہ کھول کے باہر جھانکی ہے

آج مگر اک نار کو دیکھا، جانے یہ نار کہاں کی ہے
مصر کی مورت؟ چین کی گڑیا؟ دیوی ہندوستان کی ہے؟

مکھ پر روپ سے دھوپ کا عالم، بال اندھیری شب کی مثال
آنکھ نشیلی، بات رسیلی، چال بلا کی بانکی ہے

انشا جی اسے روک کے پوچھیں: "تم کو تو مفت ملا ہے حسن
کس لیے پھر بازارِ وفا میں تم نے یہ جنس گراں کی ہے

ایک ذرا سا گوشہ دے دو، اپنے پاس، جہاں سے دور
اس بستی میں ہم لوگوں کو حاجت ایک مکاں کی ہے"

اہلِ خرد تادیب کی خاطر پاتھر لے لے آ پہنچے
جب کبھی ہم نے شہرِ غزل میں دل کی بات بیاں کی ہے

ملکوں ملکوں، شہروں شہروں جوگی بن کر گھوما کون؟
قریہ بہ قریہ، صحرا صحرا خاک یہ کس نے پھانکی ہے؟

ہم سے جس کے طور ہوں بابا، دیکھو گے دو ایک ہی اور
کہنے کو یہ شہرِ کراچی بستی دل زدگاں کی ہے



دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک، ہزار کے بیچ
انشا جی کیا مال لیے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

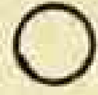
پینا پلانا عین گنہ ہے، جی کا لگانا عینِ ہوس
آپ کی باتیں سب سچی ہیں لیکن بھری بہار کے بیچ

اے سیکھو! اے خوش نظرو! یک گونہ کرم خیرات کرو
نعرہ زناں کچھ لوگ پھریں ہیں صبح سے شہرِ نگار کے بیچ

خار و خس و خاشاک تو جانیں، ایک تجھی کو خبر نہ ملے
اے گلِ خوبی، ہم تو عبث بدنام ہوئے گلزار کے بیچ

منتِ قاصد کون اٹھائے شکوۂ دریاں کون کرے
نامۂ شوق غزل کی صورت چھپنے کو دو اخبار کے بیچ

ابنِ انشا



دیکھ ہماری دید کے کارن، وہ کیا قابلِ دید ہوا
ایک ستارہ بیٹھے بیٹھے تابش میں خورشید ہوا

آج تو جانی، رستہ تکتے شام کا چاند پدید ہوا
تو نے تو انکار کیا تھا، دل کب ناامید ہوا

آن کے اس بیمار کو دیکھے، تجھ کو بھی توفیق ہوئی؟
لب پر اس کے نام تھا تیرا جب بھی درد شدید ہوا

ہاں اس نے جھلکی دکھلائی ایک ہی پل کو دریچے میں
جانو اک بجلی لہرائی، عالم ایک شہید ہوا

تو نے ہم سے کلام بھی چھوڑا عرضِ وفا کے سنتے ہی
پہلے کون قریب تھا ہم سے، اب تو اور بعید ہوا

دنیا کے سب کارج چھوڑے، نام پہ تیرے انشا نے
اور اسے کیا تھوڑے غم تھے، تیرا عشق مزید ہوا



ہمیں تم پہ گمانِ وحشت تھا، ہم لوگوں کو رسوا کیا تم نے
ابھی فصل گلوں کی نہیں گزری، کیوں دامنِ چاک سیا تم نے

اس شہر کے لوگ بڑے ہی سخی، بڑا مان کریں درویشوں کا
پر تم سے تو اتنے برہم ہیں، کیا آن کے مانگ لیا تم نے

کن راہوں سے ہو کر آئی ہو، کس گل کا سندیسہ لائی ہو
ہم باغ میں خوش خوش بیٹھے تھے، کیا کر دیا آ کے صبا تم نے

وہ جو قیس غریب تھے، ان کا جنوں سبھی کہتے ہیں ہم سے پایہ فزوں
ہمیں دیکھ کے ہنس تو دیا تم نے، کبھی دیکھے ہیں اہلِ وفا تم نے

غمِ عشق میں کاری دوا نہ دعا، یہ ہے روگ کٹھن یہ ہے درد بڑا
ہم کرتے جو اپنے سے ہو سکتا، کبھی ہم سے بھی کچھ نہ کہا تم نے

اب رہروِ ماندہ سے کچھ نہ کہو، ہاں شاد رہو آباد رہو
بڑی دیر سے یاد کیا تم نے، بڑی دور سے دی ہے صدا تم نے

اک بات کہیں گے انشا جی، تمہیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم ایک جہان کا علم پڑھے، کوئی میر سا شعر کہا تم نے؟

مظفر علی سیّد



سنیے پیامِ شمس و قمر، رقص کیجیے
اس دائرے میں شام و سحر رقص کیجیے

پاکیزگی فضا کی، ترنم نسیم کا
کیا چاندنی ہے پچھلے پہر رقص کیجیے

تالی بجا رہے ہیں شگوفے نئے نئے
آواز دے رہے ہیں شجر رقص کیجیے

کیا چھُپ چھُپا کے چھت کے تلے ناچ میں مزا
عُریاں نکل کے، در سے باہر رقص کیجیے

جی چاہتا ہے آج فرشتوں سے بھی کہوں
پرواز کیا ہے، کھینچ کے پَر رقص کیجیے

فرصت نہیں فقیہ کو زر کی تلاش سے
مُطلق نہ کیجے خوف و خطر، رقص کیجیے

گر اضطرار قابلِ تعزیر ہے تو ہو
ہے اپنے بس میں خیر نہ شر، رقص کیجیے

دوزخ جلا کے درد کا، اور آگہی کی آگ
دونوں کے درمیان اُتر، رقص کیجیے

تنہائیوں کے گیت نہ سب کو سنائیے
پاؤں مِلا کے، جوڑ کے سر رقص کیجیے

مت پوچھیے کہ پیار کا انجام کیا ہُوا
پیارا چلا گیا ہے کدھر، رقص کیجیے

مانندِ قیس ریت نہ صحرا کی چھانیے
کس کو ملی ہے کس کی خبر، رقص کیجیے

کیجے طوافِ کوچۂ جاناں کو تیز تر
مضمر ہے اس میں سیر و سفر، رقص کیجیے

سیّدؔ قرار کو تو پڑی ہے تمام عمر
اک اور بھی غزل ہے اگر رقص کیجیے



قطرے میں بھی چھپے ہیں بھنور، رقص کیجیے
قیدِ صدف میں، مثلِ گہر رقص کیجیے

کیجے فسردگیِ طبیعت کا کچھ علاج
اس خاکداں میں، مثلِ شرر رقص کیجیے

اک نوجواں نے آج بزرگوں سے کہہ دیا
ہوتی نہیں جو عمر بسر، رقص کیجیے

سوجے ہیں پاؤں، آنکھ سے ہی تال دیجیے
اُلجھا ہُوا ہے تارِ نظر، رقص کیجیے

گردش میں اک ستارۂ بے چارہ ہی نہیں
ہے آسماں بھی زیر و زبر، رقص کیجیے

گزرے جو ماہ و سال تو لے بھی بدل گئی
اب کے برس برنگِ دگر رقص کیجیے

فریاد کیجیے نہ کوئی ظلم ڈھائیے
اِک وہم ہے شکست و ظفر، رقص کیجیے

اس طائفے میں ایک کمی ہے تو آپ کی
اے دشمنانِ علم و ہنر، رقص کیجیے

فیشن ہے آج کل کا مداری کی ڈگڈگی
دل چاہے یا نہ چاہے مگر رقص کیجیے

اپنی تو جھونپڑی میں بھڑکتا نہیں چراغ
جا کر کسی رقیب کے گھر رقص کیجیے

سیّد نہ ریڈیو نہ سینما ہے آپ کا
اپنے ہی گیت گائیے اور رقص کیجیے



دہنِ میہماں میں کانٹے
پہلوئے میزباں میں کانٹے

خون تھوکے گا جو بھی کھائے گا
آپ کے خاصدان میں کانٹے

خوبروؤں کا کیا بھروسا ہے
ان میں پھول، ان میں کانٹے

گلِ رخسار کی حفاظت کو
اس نے لٹکائے کان میں کانٹے

چبھ رہے ہیں مرے خیالوں کو
باغِ جنت نشاں میں کانٹے

مسکراتی خموشیاں اس کی
میرے طرزِ بیاں میں کانٹے

حسن میں اور عجزِ گویائی
دل میں کانٹے، زباں میں کانٹے

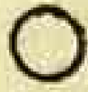
ریت میں رُل کے جل گئے جوہر
جوہری کی دکان میں کانٹے

راکشس بن گئے مہا جوگی
گیان میں اور دھیان میں کانٹے

کبھی ہوتی تھی ایڑیوں میں خلش
اب تو ہیں جسم و جان میں کانٹے

کتنا مشکل ہوا ہے رزقِ حلال
شوربے اور نان میں کانٹے

چننے والا کوئی نہیں سیّد
اور بکھرے ہیں جہاں میں کانٹے



ہر ایک راہ سے آگے ہے خواب کی منزل
ترے حضور سے بڑھ کر، غیاب کی منزل

نہیں ہے آپ ہی مقصود اپنا جوہرِ ذات
کہ آفتاب نہیں آفتاب کی منزل

کچھ ایسا رنج دیا بچپنے کی الفت نے
پھر اس کے بعد نہ آئی شباب کی منزل

مسافروں کو برابر نہیں زمان و مکاں
ہما کا ایک قدم اور حباب کی منزل

محبتوں کے یہ لمحے دریغ کیوں کیجے
بھگت ہی لیں گے جو آئی حساب کی منزل

ملے گی بادہ گساروں کو، شیخ کیا جانے
گنہ کی راہ سے ہو کر ثواب کی منزل

تمام ناز رہے معاملت کے لئے
گزر گئی ہے سوال و جواب کی منزل

ملی جو اس تو سب مرحلے ہوئے آساں
نہیں ہے کوئی بھی منزل سراب کی منزل

مزاجِ درد کو آسودگی سے راس کرو
کہاں ملے گی تمہیں اضطراب کی منزل

رہِ جنوں میں طلب کے سوا نہیں سیّد
اگرچہ طے ہو خدا کی کتاب کی منزل



کیا غم، جو فلک سے کوئی اُترا نہ سرِ خاک
جُز خاک نہیں کوئی یہاں چارہ گرِ خاک

ملتی ہے شرابوں کی جگہ گردِ بیاباں
میخانے کو جاتے ہیں تو کھلتا ہے درِ خاک

صحرا کو گلستان بڑے شوق سے کہہ لو
یعنی شجرِ خاک سے توڑو ثمرِ خاک

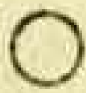
درمانِ محبت ہے نشانِ کفِ پا بھی
آنکھوں سے لگا کر کبھی دیکھو اثرِ خاک

آغوشِ لحد، پہلوئے مادر سے سوا ہے
کس خوف سے لرزاں ہے تو اے بے خبرِ خاک

بے مقصدیِ دہر کا مظہر ہے تساہل
کرنے کو نہ ہو کام تو انسان کرے خاک

لالچ کی نظر، کون کسی شخص کو دیکھے!
آنکھوں کے ورے خاک ہے، آنکھوں کے پرے خاک

ہے کون جو پھولوں کی تمنّا نہیں رکھتا
اک سیّدِ دیوانہ کہ دامن میں بھرے خاک



جوانی، مگر اس قدر مستیاں
شب و روز شام و سحر مستیاں

نہ دل میں ذرا بھی ندامت ہوئی
مچاتے رہے رات بھر مستیاں

ہواؤں میں تو نغمہ لہراتی رہی
اُدھر تھی حیا، اور اِدھر مستیاں

ہوس کاریوں کو مسرت نہ کہہ
محبت میں اتنی نہ کر مستیاں

جوانی گنوانے ہیں جو زہد میں
بڑھاپے میں کرتے ہیں خر مستیاں

کبھی خلوتوں میں تکلف بہم
کبھی ہیں سرِ رہگذر مستیاں

بڑی مشکلوں سے شبِ احتیاط
جو گذری تو پچھلے پہر مستیاں

وہیں دوستی ہے جہاں عشق ہے
جدھر خواریاں ہیں اُدھر مستیاں

اداؤں کو الفت سمجھتا ہے تو
نہیں اس کے سب بے خبر مستیاں

ثوابوں سے اِن کا سہی فاصلہ
گناہوں سے ہیں دور تر مستیاں

یہاں حکمتیں بھی اُترتی رہیں
اچھلتی رہی ہیں اگر مستیاں

پیاپے ترے نام پر گردشیں
دما دم ترے نام پر مستیاں

کوئی کام سیّد نے چھوڑا نہیں،
کمالات، سیر و سفر، مستیاں

مظفر علی سید



بہت خفیف ہے طرزِ فغاں ، بدل ڈالو
نظامِ دہر کو نغمہ گراں ، بدل ڈالو

دل گرفتہ تنوّع ہے زندگی کا اصول
مکاں کا ذکر تو کیا ، لامکاں بدل ڈالو

نہ کوئی چیز دوامی ، نہ کوئی شَے محفوظ
یقین سنبھال کے رکھّو ، گماں بدل ڈالو

بنا بنایا ہے دستورِ عاشقی ہم نے
جو تم بھی قاعدۂ دلبراں بدل ڈالو

اگر یہ تختۂ گل زہر ہے نظر کے لئے
تو پھر ملازمتِ گلستاں بدل ڈالو

جو ایک پل کے لئے خُو بدل نہیں سکتے
یہ کہہ رہے ہیں کہ سارا جہاں بدل ڈالو

تمہارا کیا ہے ، مصیبت ہے لکھنے والوں کی
جو دے چکے ہو وہ سارے بیاں بدل ڈالو

مجھے بتایا ہے سیّد نے نسخۂ آساں
جو تنگ ہو تو زمین آسماں بدل ڈالو



سیّد تمہارے غم کی کسی کو خبر نہیں
ہو بھی خبر کسی کو تو سمجھو ، خبر نہیں

موجود ہو تو کس لئے مفقود ہو گئے ؟
کن جنگلوں میں جا کے بسے ہو ، خبر نہیں

اتنی خبر ہے ، پھول سے خوشبو جدا ہوئی
اسکو کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤ ، خبر نہیں

دل میں ابل رہے ہیں وہ طوفاں کہ اَلاَماں
چہرے پہ وہ سکون ہے ، مانو خبر نہیں

دیکھو تو ہر بغل میں ہے دفتر دبا ہوا
اخبار میں جو چھاپنا چاہو ، خبر نہیں

نوکِ زباں ہیں تم کو شرابوں کے نام سب
لیکن نشے کی ، بادہ پرستو ، خبر نہیں

کاغذ زمینِ شور ، قلم شاخِ بے ثمر
کس آرزو پہ عمر گذارو ، خبر نہیں

سیّد کوئی تو خواب بھی تصنیف کیجیے
ہر بار تم یہی نہ سناؤ : خبر نہیں



(عدناں کے نام جو بیروت میں رہتا ہے)

کون کہتا ہے مصیبت پر کبھی ماتم نہ کر
موت ہے اِک پل کی، ساری زندگی ماتم نہ کر

غم نہ کر اُن کے دریچوں پر چراغاں ہوگیا
چلتی پھرتی ہے سدا سے روشنی، ماتم نہ کر

کربلا سے لے کے ریگستانِ سینائی تلک
مٹ نہیں سکتی ہماری تشنگی، ماتم نہ کر

پھر سے مومن آتشِ نمرود میں ڈالے گئے
ہے یہی سنت خلیل اللہ کی، ماتم نہ کر

کُفر ہے اک ملّتِ واحد، یہ روشن ہو گیا
منقسم ہے رشتۂ ایمان بھی، ماتم نہ کر

کشتِ مُسلم کو ہمیشہ خون سے سینچا گیا
ایک دن ہوگی یہی کھیتی ہری، ماتم نہ کر

یہ بھی کیا کم ہے، بصیرت کی نظر حاصل ہوئی
دوستوں نے کی جو تجھ سے دشمنی، ماتم نہ کر

سیّدی تاریخ میں اک دو برس کچھ بھی نہیں
کشمکش ہے اضطرابِ دائمی، ماتم نہ کر



کام کوئی تو کبھی وقت سے آگے کر جا
اے دلِ زندہ، مرے مرنے سے پہلے مر جا

ساغرِ چشم کو زہراب سے خالی کر دے
اور جو بھرتا ہے تو پیمانۂ ہستی بھر جا

تشنگی کم ہو مگر دور نہ ہونے پائے
اپنے پیاسے کو نہ سیرابِ محبت کر جا

کیسی دھرتی تھی، کبھی کان میں کن من ہوئی
کیسا امبر تھا، کبھی سر پہ نہ بادل گرجا

خاک سے تا بہ فلک، خواب کا پھیلا دامن
کوئی کوشش نہ کہیں، اور تمنا ہر جا

تو مسافر، ترے کس کام کی شہرت سیّد
یہ سخاوت سرِ دہلیزِ رفیقاں دھر جا

ظہور نظر



چھوڑ کر دل میں گئی وحشت ہوا کچھ بھی نہیں
کس قدر گنجان جنگل تھا، رہا کچھ بھی نہیں

خاکِ پائے یار تک گیلی ہوا نے چاٹ لی
عشق کی غرقاب بستی میں بچا کچھ بھی نہیں

حال کے زنداں سے باہر کچھ نہیں جز زردِ برگ
اور اس زنداں میں جز زنجیرِ پا کچھ بھی نہیں

ہجر کے کالے سمندر کا نہیں ساحل کوئی
موجۂ طوفانِ دہشت سے ورا کچھ بھی نہیں

آبنائے درد کے دونوں طرف ہے دشتِ خوف
اب تو چارہ جان دینے کے سوا کچھ بھی نہیں

ہاتھ میرا اے مری پرچھائیں تو ہی تھام لے
ایک مدت سے مجھے تو سوجھتا کچھ بھی نہیں

شہرِ شب میں کونسا گھر تھا، نہ دی جس پر صدا
نیند کے اندھے مسافر کو ملا کچھ بھی نہیں

رات بھر اک چاپ سی پھرتی رہی چاروں طرف
جان لیوا خوف تھا لیکن ہوا کچھ بھی نہیں

کاسۂ جاں ہاتھ میں لے کر گئے تھے ہم جہاں
لائے اُس در سے بجز خونِ صدا کچھ بھی نہیں

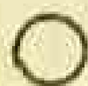
عمر بھر عمرِ گریزاں سے نہ میری بن سکی
جو کرے کرتی رہے، میں پوچھتا کچھ بھی نہیں

وہ بھی شاید رو پڑے ویران کاغذ دیکھ کر
میں نے اُس کو آخری خط میں لکھا کچھ بھی نہیں

دولتِ تنہائی بھی آنے سے تیرے چھن گئی
اب تو میرے پاس اے جانِ وفا کچھ بھی نہیں

دل پہ لاکھوں لفظ کندہ کر گئی اس کی نظر
اور کہنے کو ابھی اُس نے کہا کچھ بھی نہیں

ظہور نظر



دیپک راگ ہے چاہت اپنی، کاہے سنائیں تمہیں
ہم تو سلگتے ہی رہتے ہیں، کیوں سلگائیں تمہیں
ترکِ محبت، ترکِ تمنا کر چکنے کے بعد
ہم پہ یہ مشکل آن پڑی ہے، کیسے بھلائیں تمہیں
دل کے زخم کا رنگ تو شاید آنکھوں میں بھر آئے
روح کے زخموں کی گہرائی کیسے دکھائیں تمہیں
درد ہماری محرومی کا تم تب جانو گے
جب کھانے آئے گی چُپ کی سائیں سائیں تمہیں
سناٹا جب تنہائی کے زہر میں بجھتا ہے
وہ گھڑیاں کیونکر کٹتی ہیں، کیسے بتائیں تمہیں
جن باتوں نے پیار تمہارا، نفرت میں بدلا
ڈر لگتا ہے، وہ باتیں بھی بھول نہ جائیں تمہیں
رنگ برنگے گیت تمہارے ہجر میں ہاتھ آئے
پھر بھی یہ کیسے چاہیں کہ ساری عمر نہ پائیں تمہیں
اڑتے پنچھی، ڈھلتے سائے، جاتے پل اور ہم
بیرن شام کا دامن تھام کے روز بلائیں تمہیں
دُور گگن پر ہنسنے والے نرمل کومل چاند!
بے کل من کہتا ہے "آؤ" ہاتھ لگائیں تمہیں
پاس ہمارے آکر تم بیگانہ سے کیوں ہو؟
چاہو تو ہم پھر کچھ دوری پر چھوڑ آئیں تمہیں!
انہونی کی چنتا، ہونی کا انیائے نظرؔ
دونوں بیری ہیں جیون کے، ہم سمجھائیں تمہیں

ظہور نظر



قحطِ وفائے وعدہ و پیماں ہے ان دنوں
نعروں پہ اعتبارِ دل و جاں ہے ان دنوں

ملعون ہیں جو موسمِ گل کے جنوں میں ہیں
متروک رسمِ چاکِ گریباں ہے ان دنوں

یہ رسمِ رفتگاں تھی، فراموش ہو گئی
اپنے کیے پہ کون پشیماں ہے ان دنوں

آنکھیں ہیں خشک صورتِ صحرائے بے گیاہ
سینہ ہجومِ اشک سے گریاں ہے ان دنوں

یہ کیسا عہد ہے کہ مری چشمِ خواب میں
نقشِ قدم بھی دیدۂ حیراں ہے ان دنوں

ڈرتا ہوں اپنے سانس کی سنتا ہوں جب صدا
دہشت بہت قریبِ رگِ جاں ہے ان دنوں

دیدہ وروں کے گھر پہ مسلط ہے تیرگی
اندھوں کی انجمن میں چراغاں ہے ان دنوں

بدتر ہے جانوروں سے بھی دانشوروں کا حال
جو سوچتا نہیں ہے وہ انساں ہے ان دنوں

ہر بوالہوس دھنی ہے مقدر کا آج کل
ہر بے ضمیر صاحبِ امکاں ہے ان دنوں

تجھ سے گلہ نہیں ہے کہ تو پھر بھی غیر تھا
میرا وجود مجھ سے گریزاں ہے ان دنوں

جی چاہتا ہے روئے زمیں پہ بکھیر دوں
جو درد میری روح میں پنہاں ہے ان دنوں

کیسے چھپاؤں کیسے لکھوں شرحِ دردِ نو؟
ہر ایک لفظ زینتِ زنداں ہے ان دنوں

یادوں کے پھول حدِ نظر تک کھلے ہیں، پھر
وحشت فراقِ رشکِ گلستاں ہے ان دنوں



عشق میں معرکے بلا کے رہے
آخرش ہم شکست کھا کے رہے

یہ الگ بات ہے کہ ہارے ہم
حشر اک بار تو اٹھا کے رہے

سفرِ غم کی بات جب بھی چلی
تذکرے تیرے نقشِ پا کے رہے

جب بھی آئی کوئی خوشی کی گھڑی
دن غموں کے بھی یاد آ کے رہے

حبس میں سارا شہر دفن ہوا
فیصلے سب اٹل ہوا کے رہے

اپنی صورت بگڑ گئی لیکن
ہم انہیں آئینہ دکھا کے رہے

ہونٹ تک سی دیئے تھے پھر بھی ظفر
ظلم کی داستاں سنا کے رہے

ظہور نظر



رکھا نہیں غربت نے کسی اک کا بھرم بھی
میخانہ بھی ویراں ہے، کلیسا بھی، حرم بھی

لوٹا ہے زمانے نے مرا عیش بھی، کم بھی
چھینا تھا تجھے، چھین لیا ہے ترا غم بھی

بے آب ہوا اب تو مرا دیدۂ نم بھی
اے گردشِ آلام! کسی موڑ پہ تھم بھی

سُن اے بُتِ جاں دار! بتِ سیم بدن! سُن!
ٹوٹے نہ گئے ہم سے تو پتھر کے صنم بھی

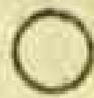
مے وصل کی بھی کر نہ سکی شدّتِ غم کم
آیا نہ کسی کام ترے ہجر کا سم بھی

دیوارِ سکوں بیٹھ گئی شدّتِ نم سے
برسا ہے مرے گھر پہ اگر ابرِ کرم بھی

تنہائی نہ پوچھ اپنی، کہ ساتھ اہلِ جنوں کے
چلتے ہیں فقط چند قدم راہ کے خم بھی

صحرائے غمِ جاں میں بگولوں سے بچا کون
مٹ جائیں گے اے دوست ترے نقشِ قدم بھی

سنتے ہیں چمکتا ہے وہ چاند اب بھی سرِ بام
حسرت ہے کہ بس ایک نظر دیکھ لیں ہم بھی



ہر گھڑی قیامت تھی، یہ نہ پوچھ کب گذری
بس یہی غنیمت ہے، تیرے بعد شب گذری

کنجِ غم میں اِک گل بھی کھل نہیں سکا پورا
اس بلا کی تیزی سے صرصرِ طرب گذری

تیرے غم کی خوشبو سے جسم و جاں مہک اُٹھے
سانس کی ہوا جب بھی چھو کے میرے لب گذری

ایک ساتھ رہ کر بھی دور ہی رہے ہم تم
دھوپ اور چھاؤں کی دوستی عجب گذری

جانے کیا ہوا ہم کو اب کے فصلِ گل میں بھی
برگِ دل نہیں لرزا، تیری یاد جب گذری

بے قرار بے کل ہے جاں، سکوں کے صحرا میں
آج تک نہ دیکھی تھی یہ گھڑی جو اب گذری!

بعدِ ترکِ اُلفت بھی یوں تو ہم جئے، لیکن
وقت بے طرح بیتا، عمر بے سبب گذری

کس طرح تراشو گے، تہمتِ ہوس ہم پر
زندگی ہماری تو ساری بے طلب گذری

ظہور نظر



آرزو کا نشان تک بھی نہیں
دِل میں اب تیرا دھیان تک بھی نہیں

اتنا تنہا بھی کب ہوا تھا دل
درد سا مہرباں تک بھی نہیں

پھر رہا ہوں کھلے سمندر میں
سوجھتا بادبان تک بھی نہیں

لٹ گیا ہے سفر میں، جو کچھ تھا
پاس اپنے تھکان تک بھی نہیں

سر پہ سورج چمک رہا ہے مگر
روشنی کا گمان تک بھی نہیں

والیِ شہر بن کے بیٹھے ہیں
جن کا اپنا مکان تک بھی نہیں

کیا کریں گے وہ لوگ ہنگامہ
جن کے منہ میں زبان تک بھی نہیں

ہجر وہ دشت ہے کہ جس پہ نظر
ابر کیا، آسمان تک بھی نہیں



دِن ایسے یوں تو آئے ہی کب تھے جو راس تھے
لیکن یہ چند روز تو بے حد اداس تھے

اُن کو بھی آج مجھ سے ہیں لاکھوں شکایتیں
کل تک جو اہلِ بزم سراپا سپاس تھے

وہ گل بھی زہرِ خند کی شبنم سے اُٹ گئے
جو شاخسارِ دردِ محبت کی آس تھے

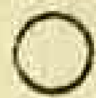
میری برہنگی پہ ہنسے ہیں وہ لوگ بھی
مشہور شہر بھر میں جو ننگِ لباس تھے

اِک لفظ بھی نہ میری صفائی میں کہہ سکے
وہ سارے مہرباں جو مرے آس پاس تھے

تیرا تو صرف نام ہی تھا، تو ہے کیوں ملول
باعث مرے جنوں کا تو میرے حواس تھے

وہ رنگ بھی اڑے جو نظر میں نہ تھے کبھی
وہ خواب بھی لٹے جو قرینِ قیاس تھے

ظہور نظر



ظلم کو یہ ہے کہ شاکی مرے کردار کا ہے
یہ گھنا شہر کہ جنگل در و دیوار کا ہے!
رنگ پھر آج دگر برگِ دلِ زار کا ہے
شائبہ مجھ کو ہوا پہ تیری رفتار کا ہے
اس پہ تہمت نہ دھرے میرے جنوں کی کوئی
مجھ پہ تو سایہ مرے اپنے ہی اسرار کا ہے
صرف یہ کہنا بہت ہے کہ وہ چپ چاپ سا تھا
اس کو اندازہ مرے شیوۂ گفتار کا ہے
کس نے کس حال میں چھوڑا تھا رسا کا دامن
مسئلہ یہ تو مری جاں بڑی تکرار کا ہے
رات بھر نیند نہ آنے کا گلہ کس سے کروں
اس میں بھی ہاتھ مرے طالعِ بیدار کا ہے
وعدہ کی دھوپ پہ پکنے کے تردد میں کھلا
سلسلہ تا بہ افقِ خوف کے اشجار کا ہے
رات دن کھوج میں دریا کی صدا رہتی ہے
آدمی کوئی ترے گاؤں میں اس پار کا ہے
ہر گھڑی محتسبِ شہر ہو موجود جہاں
کام اس بزم میں کیا مجھ سے گنہ گار کا ہے
جھوٹ کا ملبہ پہ اس عہد میں آساں ہے مگر
مرحلہ سخت بہت جراتِ اظہار کا ہے
زندگی ساعتِ موجود کے قدموں میں جھکاؤ
فیصلہ آج بھی وقت کے دربار کا ہے
کس نئے غم سے چراغاں ہے نظر محفلِ جاں
رنگ کچھ اور ہی اب کے ترے اشعار کا ہے



صحرا میں گھٹا کا منتظر ہوں
پھر اس کی وفا کا منتظر ہوں
اک بار نہ جس نے مڑ کے دیکھا
اس جانِ صبا کا منتظر ہوں
بیٹھا ہوں درونِ خانۂ غم
سیلابِ بلا کا منتظر ہوں
جاں آبِ بقا کی کھوج میں ہے
میں موجِ فنا کا منتظر ہوں
کھل جاؤں گا اپنے آپ سے میں
مانوس فضا کا منتظر ہوں
غنچوں کے سلے ہوئے لبوں سے
تحسینِ صبا کا منتظر ہوں
اس دور میں خواہشِ طرب ہے
مدفن میں ہوا کا منتظر ہوں
ماضی کی سزا بھگت رہا ہوں
فردا کی سزا کا منتظر ہوں
شاید کہ وہاں سفر ہو تم سے
تسخیرِ خلا کا منتظر ہوں
ہاتھوں میں ہے میرے دامنِ شب
سورج کی صدا کا منتظر ہوں
برسوں سے کھڑا ہوں ہاتھ اٹھائے
تاثیرِ دعا کا منتظر ہوں
میرا تو خدا کبھی نہیں تھا
میں کس کے خدا کا منتظر ہوں
کہتے ہیں جسے نظر مسافر
اس آبلہ پا کا منتظر ہوں

مجروحؔ سُلطانپوری



جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب مانوں کہ بھر دے ساغرِ ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گُل اور گُل سے گلستاں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اُس کے حضوؔر
لفظ جو منہ سے نہ نکلا، داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

مجروح سلطانپوری



مجھے سہل ہو گئیں منزلیں، وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اُڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آگئی
وہی لب، نہ میں جنھیں چھو سکا، قدحِ شراب میں ڈھل گئے

تجھے چشمِ مست! پتہ بھی ہے کہ شباب گرمیٔ بزم ہے
تجھے چشمِ مست! خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

وہی آستاں ہے وہی جبیں، وہی اشک ہے، وہی آستیں
دلِ زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

مرے کام آگئیں آخرش یہی کاوشیں، یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

مجروح سلطانپوری



ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح

وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہِ یار کی طرح

سیدھی ہے راہِ شوق پہ یوں ہی کہیں کہیں
خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

اب جا کے کچھ کھلا ہنرِ ناخنِ جنوں
زخمِ جگر ہوئے لب و رخسار کی طرح

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح



جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

دیارِ شام نہیں منزلِ سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے

ہوا اسیر کوئی ہمنوا تو دور تلک
بہ پاسِ طرزِ نوا ہم بھی ساتھ ساتھ چلے

ہمارے لب نہ سہی وہ دہانِ زخم سہی
وہیں پہنچتی ہے یارو، کہیں سے بات چلے

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

بچا کے لائے ہم اے یار پھر بھی نقدِ وفا
اگرچہ لٹتے ہوئے رہزنوں کے ہاتھ چلے

پھر آئی فصل کہ مانندِ برگِ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

قطارِ شیشہ ہے یا کاروانِ ہمسفراں
خرامِ جام ہے یا جیسے کائنات چلے

بلا ہی بیٹھے جب اہلِ حرم تو اے مجروح
بغل میں ہم بھی لیے اک صنم کا ہاتھ چلے

مجروح سلطانپوری



ڈرا کے موج و تلاطم سے ہمنشینوں کو!
یہی تو ہیں جو ڈبویا کئے سفینوں کو!

شراب ہو ہی گئی ہے بقدرِ پیمانہ
بہ عزمِ ترک نچوڑا جب آستینوں کو

جمالِ صبح دیا، رُت نے تو بہار دیا
مری نگاہ بھی دیتا خدا حسینوں کو

ہماری راہ میں آئے ہزار میخانے
بھلا سکے نہ مگر ہوش کے قرینوں کو

کبھی نظر بھی اٹھائی نہ سوئے بادۂ ناب
کبھی چڑھا گئے پگھلا کے آب گینوں کو

ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں
چراغِ راہ کئے خونچکاں جبینوں کو

تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا مجروحؔ
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چینوں کو



مسرتوں کو یہ اہلِ ہوس نہ کھو دیتے
جو ہر خوشی میں ترے غم کو بھی سمو دیتے

کہاں وہ شب کہ ترے گیسوؤں کے سائے میں
خیالِ صبح سے ہم آستیں بھگو دیتے

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لیے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

جو دیکھتے مری نظروں پہ بندشوں کے ستم
تو یہ نظارے مری بے بسی پہ رو دیتے

کبھی تو یوں بھی امنڈتے سرشکِ غم مجروحؔ
کہ میرے زخمِ تمنا کے داغ دھو دیتے

مجروح سلطانپوری



ختم شورِ طوفاں تھا دُور تھی سیاہی بھی
دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباہی بھی

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہِ صبح گاہی بھی

بستیِ زمیں سے ہے رفعتِ فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کج کلاہی بھی

شمع بھی اُجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروحؔ
مسجدوں میں کی ہم نے جا کے داد خواہی بھی



ہمیں شعورِ جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے
نگاہ بن کے حسینوں کی انجمن میں رہے

تو اے بہارِ گریزاں کبھی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے

ق

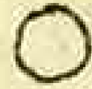
نہ ہم قفس میں رہے مثلِ بوئے گل صیاد
نہ ہم مثالِ صبا حلقۂ رسن میں رہے
کھٹکے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھٹکے
ہوئے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

سرشکِ رنگ نہ بخشے تو کیوں ہو بارِ مژہ
لہو حنا نہیں بنتا تو کیوں بدن میں رہے

ہجومِ دہر میں بدلا نہ ہم سے وضعِ خرام
گری کلاہ تو ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروحؔ
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

مجروح سلطانپوری



وہ جس پہ تمہیں شمعِ سرِ رہ کا گماں ہے
وہ شعلۂ آوارہ ہماری ہی زباں ہے

اب ہاتھ ہمارے ہے عنانِ رخشِ جنوں کی
اب سر پہ ہمارے کلۂ سنگِ بتاں ہے

بس پھیر کے منہ خارِ قدم کھینچ رہے تھے
دیکھا تو نہاں قافلۂ ہمسفراں ہے

چھپتے ہی بنی خار صفت پائے خزاں میں
کیا کیجیے بہت ہم کو غمِ لالہ رخاں ہے

کام آئے بہت لوگ سرِ مقتلِ ظلمات
اے روشنیٔ کوچۂ دلدار کہاں ہے

اے فصلِ جنوں! ہمکو پئے شغلِ گریباں
پیوند ہی کافی ہے اگر جامہ گراں ہے

مجروح کہاں سے گہرِ گندم و جو لائیں
اپنی تو گرہ میں ہی چشمِ نگراں ہے



جلوۂ گل کا سبب دیدۂ تر ہے کہ نہیں
میری آہوں سے بہاراں کی سحر ہے کہ نہیں

راہ گم کردہ ہوں کچھ اس کی خبر ہے کہ نہیں
اس کی پلکوں پہ ستاروں کا گزر ہے کہ نہیں

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آ کر
سوچتا ہوں یہ تری راہگزر ہے کہ نہیں

دیکھیے کلیوں کا چٹکنا سرِ گلشن صیاد
زمزمہ سنج مرا خونِ جگر ہے کہ نہیں

اہلِ تقدیر! یہ ہے معجزۂ دستِ عمل
جو خزف میں نے اٹھایا وہ گہر ہے کہ نہیں

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

ساحر لدھیانوی



ہر قدم مرحلۂ دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا، وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے

جگمگاتے ہیں افق پر تو ستارے لیکن
راستہ منزلِ ہستی کا مہیب آج بھی ہے

سرِ مقتل جنھیں جانا تھا وہ جا بھی پہنچے
سرِ منزل کوئی محتاط خطیب آج بھی ہے

اہلِ دانش نے جسے امرِ مسلّم مانا
اہلِ دل کے لیے وہ بات عجیب آج بھی ہے

یہ تری یاد ہے یا میری اذیّت کوشی
ایک نشتر سا رگِ جاں کے قریب آج بھی ہے

کون جانے یہ ترا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

ساحر لدھیانوی



جب کبھی اُن کی توجہ میں کمی پائی گئی
از سرِ نو داستانِ شوق دھرائی گئی

اے غمِ دُنیا! تجھے کیا علم، تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی

ہم کریں ترکِ وفا، اچھا چلو یونہی سہی
اور اگر ترکِ وفا سے بھی نہ رسوائی گئی!

کیسے کیسے چشم و عارض گردِ غم سے بجھ گئے
کیسے کیسے پیکروں کی شانِ زیبائی گئی

دل کی دھڑکن میں توازن آ چلا ہے، خیر ہو
میری نظریں بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی

ساحرلدھیانوی



عرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری
دلِ زندہ! مرے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری

زمیں نے خون اگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

ہمیں یہ فکر، ان کی انجمن کس حال میں ہوگی
انہیں یہ غم کہ ان سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گزری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری

یہ منظر کون سا منظر ہے، پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو، شبستانوں پہ کیا گزری

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری



نفس کے لوچ میں رم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
حیات ساغرِ سم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے

تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے

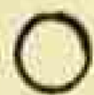
مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بامِ حرم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے

یہ اجتناب ہے عکسِ شعورِ محبوبی
یہ احتیاط، ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ادھر بھی ایک اچٹتی نظر، کہ دنیا میں
فروغِ محفلِ جم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے

نئے جہان بسائے ہیں فکرِ آدم نے
اب اس زمیں پہ ارم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے

ساحر لدھیانوی



ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں، ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت، اے مطرب!
ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے، لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں



ہر چند، مری قوتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبعِ خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت، جادۂ منزل سے گزر جا
ہر چیز سزاوارِ نظارہ نہیں ہوتی

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے، لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

ساحر لدھیانوی



محبت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو، بے کار امید و
بہت دُکھ سہہ لیے میں نے، بہت دن جی لیا میں نے



بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہُوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے، گزرے جدھر سے ہم

احمد راہی



دل کے سنسان جزیروں کی خبر لائے گا
درد پہلو سے جُدا ہو کے کہاں جائے گا

کون ہوتا ہے کسی کا شبِ تنہائی میں
غمِ فرقت ہی غمِ عشق کو بہلائے گا

چاند کے پہلو میں دم سادھ کے روتی ہے کرن
آج تاروں کا فسوں خاک نظر آئے گا

راگ میں آگ دبی ہے غمِ محرومی کی
راکھ ہو کر بھی یہ شعلہ ہمیں سلگائے گا

وقت خاموش ہے رُوٹھے ہُوئے یاروں کی طرح
کون لَو دیتے ہُوئے زخموں کو سہلائے گا

دھوپ کو دیکھ کے اُس جسم کی پڑتی ہے جھمک
چھاؤں دیکھیں گے تو اُس زلف کا دھیان آئے گا

زندگی، چل کہ ذرا موت کے دَم خم دیکھیں
ورنہ یہ جذبہ لحد تک ہمیں لے جائے گا

احمد راہی



گردشِ جام نہیں، گردشِ ایام تو ہے
سعیٔ ناکام سہی، پھر بھی کوئی کام تو ہے

دل کی بے تابی کا آخر کہیں انجام تو ہے
میری قسمت میں نہیں، دہر میں آرام تو ہے

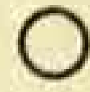
مائلِ لطف و کرم حسنِ دلآرام تو ہے
میری خاطر نہ سہی، کوئی سرِ بام تو ہے

تو نہیں میرا مسیحا، میرا قاتل ہی سہی
مجھ سے وابستہ کسی طور، ترا نام تو ہے

حلقۂ موج میں ایک اور سفینہ آیا
ساحلِ بحر پہ کہرام کا ہنگام تو ہے

تنگ دستو، تہی دامانو، کرو شکرِ خدا
مے گلفام نہیں ہے، شفقِ شام تو ہے

احمد راہی



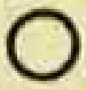
طویل راتوں کی خامشی میں مری فغاں تھک کے سو گئی ہے
تمھاری آنکھوں نے جو کہی تھی، وہ داستاں تھک کے سو گئی ہے

مرے خیالوں میں آج بھی خواب عہدِ رفتہ کے جاگتے ہیں
تمھارے پہلو میں کاہشِ یادِ پاستاں تھک کے سو گئی ہے

گلہ نہیں تجھ سے، زندگی کے وہ نظریے ہی بدل گئے ہیں
مری وفا، وہ ترے تغافل کی نوحہ خواں تھک کے سو گئی ہے

سحر کی اُمّید اب کسے ہے، سحر کی اُمّید ہو بھی کیسے
کہ زیست اُمید و نا اُمیدی کے درمیاں تھک کے سو گئی ہے

نہ جانے میں کس اُدھیڑ بُن میں اُلجھ گیا ہوں کہ مجھ کو راہی
خبر نہیں کچھ، وہ آرزوئے سکوں کہاں تھک کے سو گئی ہے



کوئی حسرت بھی نہیں، کوئی تمنّا بھی نہیں
دل وہ آنسو جو کسی آنکھ سے چھلکا بھی نہیں

روٹھ کر بیٹھ گئی ہمّتِ دشوار پسند
راہ میں اب کوئی جلتا ہُوا صحرا بھی نہیں

آگے کچھ لوگ ہمیں دیکھ کے ہنس دیتے تھے
اب یہ عالم ہے، کوئی دیکھنے والا بھی نہیں

درد، وہ آگ کہ بجھتی نہیں، جلتی بھی نہیں
یاد، وہ زخم کہ بھرتا نہیں، رِستا بھی نہیں

بادباں کھول کے بیٹھے ہیں سفینوں والے
پار اُترنے کے لیے ہلکا سا جھونکا بھی نہیں

احمد راہی



غمِ حیات میں کوئی کمی نہیں آئی
نظر فریب تھی تیری جمال آرائی

وہ داستاں، جو تری دلکشی نے چھیڑی تھی
ہزار بار مری سادگی نے دُہرائی

تری وفا، تری مجبوریاں، بجا، لیکن
یہ سوزشِ غمِ ہجراں، یہ سردِ تنہائی

فسانے عام سہی، میری چشمِ حیراں کے
تماشا بنتے رہے ہیں یہاں تماشائی

کسی کے حسنِ تمنا کا پاس ہے، ورنہ
مجھے خیالِ جہاں ہے نہ خوفِ رسوائی

کہیں یہ یہی محبت کی انتہا تو نہیں
بہت دنوں سے تری یاد بھی نہیں آئی



کبھی حیات کا غم ہے، کبھی ترا غم ہے
ہر ایک رنگ میں ناکامیوں کا ماتم ہے

خیال تھا ترے پہلو میں کچھ سکوں ہوگا
مگر یہاں بھی وہی اضطرابِ پیہم ہے

مرے حبیب، مری مسکراہٹوں پہ نہ جا
خدا گواہ، مجھے آج بھی ترا غم ہے

سحر سے رشتۂ اُمید باندھنے والے
چراغِ زیست کی لو شام ہی سے مدھم ہے

یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی راہی
قدم قدم پہ جہاں بے بسی کا عالم ہے

احمد راہی



عام ہے کوچہ و بازار میں سرکار کی بات
اب سرِ راہ بھی ہوتی ہے سرِ دار کی بات

ہم جو کرتے ہیں کہیں مصر کے بازار کی بات
لوگ پا لیتے ہیں یوسف کے خریدار کی بات

مدتوں لب پہ رہی نرگسِ بیمار کی بات
کیجیے اہلِ چمن، اب خلشِ خار کی بات

غنچۂ دل تنگ، ہوا بند، نشیمن ویراں
باعثِ مرگ ہے میرے لیے غم خوار کی بات

بوئے گل لے کے صبا کنجِ قفس تک پہنچی
لاکھ پردوں میں بھی پھیلی شبِ گلزار کی بات

زندگی درد میں ڈوبی ہوئی لے ہے راہیؔ
ایسے عالم میں کسے یاد رہے پیار کی بات



کوئی بتلائے کہ کیا ہیں یارو
ہم بگولے کہ ہوا ہیں یارو

تنگ ہے وسعتِ صحرائے جنوں
ولولے دل کے سوا ہیں یارو

سرد و بے رنگ ہے ذرہ ذرہ
گرمیِ رنگِ صدا ہیں یارو

شبنمستانِ گلِ نغمہ میں
نکہتِ صبح و فنا ہیں یارو

جلنے والوں کے جگر ہیں، دل ہیں
کھلنے والوں کی ادا ہیں یارو

جن کے قدموں سے ہیں گلزار یہ دشت
ہم وہی آبلہ پا ہیں یارو

احمد راہی



قیامِ دیر و طوافِ حرم نہیں کرتے
زمانہ ساز تو کرتے ہیں، ہم نہیں کرتے

تمہاری زلف کو سلجھائیں گے وہ دیوانے
جو اپنے چاکِ گریباں کا غم نہیں کرتے

اُتر چکا ہے رگ و پے میں زہرِ غم، پھر بھی
بپاسِ عہدِ وفا، چشم نم نہیں کرتے

یہ اپنا دل ہے کہ اس حال میں بھی زندہ ہیں
ستم کچھ اہلِ ستم ہم پہ کم نہیں کرتے

ق

گرفتہ دل ہیں بتانِ حرم کہ اب شاعر
نشاط و عیش کے ساماں بہم نہیں کرتے

سنا رہے ہیں جہاں کو حدیثِ دار و رسن
حکایتِ قد و گیسو رقم نہیں کرتے

وہ آستانِ شہی ہو کہ آستانۂ دوست
یہ اب کہیں سرِ تسلیم خم نہیں کرتے



جس راہ سے بھی گزر گئے ہم
ہر دل کو گداز کر گئے ہم

جلوے تھے کسی کے کارفرما
ہر نقش میں رنگ بھر گئے ہم

کیا جانیے، کیا تھا اُس نظر میں
اُلجھے، تو سنور سنور گئے ہم

ہم بھانپ گئے تھے رنگِ محفل
کہنے کو تو بے خبر گئے ہم

ہر دل تھا اُداسیوں کا معبد
ہر گام ٹھہر ٹھہر گئے ہم

بے مہریٔ دوست، تلخیٔ زیست
کس کس سے نباہ کر گئے ہم

اُمیدِ وفا پہ جینے والو
اُمیدِ وفا میں مر گئے ہم

منظور احمد منظور



مدِ نظر نہیں ہے فقط مہرباں کی خیر
شامل مری دعا میں دلِ دشمناں کی خیر

فرصت ملے تو اپنی زمیں کی خبر بھی لے
اے ربِّ ذوالجلال! ترے آسماں کی خیر

جوشِ جنوں میں پیشِ نظر مصلحت بھی تھی
سجدے کیے ہیں مانگ کے، اُس آستاں کی خیر

ہر انس و جاں نے آنکھ کڑے وقت پھیر لی
ہم تھے کہ مانگتے رہے ہر انس و جاں کی خیر

یخ بار، سرد مہریٔ انساں سے، کائنات
اس ارضِ زمہریر میں قلبِ تپاں کی خیر

انساں کا ہاتھ اُن کی طرف بھی دراز ہے
پاکیزگیٔ حسنِ مہ و کہکشاں کی خیر

ٹوٹا ہے دل، جراحتِ چارہ گراں کا شکر
ٹوٹا ہے جام، نیتِ شیشہ گراں کی خیر

یہ شاخ سر برہنہ، یہ جھکڑ، یہ رقصِ برق
منظورؔ خیر خیر! ترے آشیاں کی خیر

منظور احمد منظور



قمر بھی دور نہ تھا، کہکشاں بلند نہ تھی
ہمیں کو فرش سے دوری مگر پسند نہ تھی

ذرا سی آتشِ غم سے پہنچ کے بجھ جاتی!
مری حیاتِ جنوں، دانہ سپند نہ تھی

لہو زمیں کے شگافوں سے بے سبب پھوٹا
فلک کی آنکھ ابھی مائلِ گزند نہ تھی

یہی کہ پاس تھا تقدیسِ بام کا، ورنہ
طلب کے ہاتھ میں کیا شوق کی کمند نہ تھی

ہمارے حال پہ اہلِ جہاں کے ہونٹوں پر
ہنسی نہ تھی کوئی ایسی، جو زہر خند نہ تھی

شگفتِ گل کی صدا ہو کہ گریۂ شبنم
جہاں میں کون سی آواز تھی جو پند نہ تھی

فریب دے گئی عالم کو خوئے تنہائی
مرے جنوں کی طبیعت تو خود پسند نہ تھی

زباں تھا نازِ متاعِ ہنر پہ اے منظورؔ
یہ چیز چشمِ زمانہ میں ارجمند نہ تھی

منظور احمد منظور



جبیں پہ گردِ کدورت مرا اصول نہیں
جفائے اہلِ زمانہ پہ دل ملول نہیں

مری خودی تو کھٹکتی تھی تیری آنکھوں میں
ترے حضور مرا عجز بھی قبول نہیں

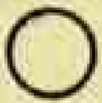
یہ بکھرے تارے، یہ بے نظم پھول شاہد ہیں
نمودِ حسن میں پابندیٔ اصول نہیں

ضرور کچھ تو ہے اپنی حیات کا مقصد
سنا ہے چیز کوئی دہر میں فضول نہیں

مرے وقار پہ، تیرے کرم پہ حرف آتا
مقامِ شکر ہے، میری دعا قبول نہیں

تجھے یہ ناز کہ جنت کی بھیک مانگوں گا
مجھے یہ ضد کہ تقاضا مرا اصول نہیں

مرے غبار سے دامن کشاں ہو کیوں یارو
چمن کی بوئے پریشاں ہوں، بن کی دھول نہیں



زمانہ ہیچ ہے اس کی نگاہ میں اے دوست
جو آ گیا ترے غم کی پناہ میں اے دوست

چھلک رہی ہے جو چشمِ سیاہ میں اے دوست
وہ موجِ نور کہاں مہر و ماہ میں اے دوست

لہو جو سینۂ دہقاں سے بوند بوند گرا
چمک رہا ہے وہی تاجِ شاہ میں اے دوست

صنم کدے میں بھی جس شرک کو اماں نہ ملی
فروغ پر ہے وہی خانقاہ میں اے دوست

سکونِ دل بھی عجب چیز ہے کہ اس کے طفیل
جبیں پہ نور ہے، حالِ تباہ میں اے دوست

نہ مجتہد ہے نہ صوفی مگر ترا منظور
عزیز تر ہے جہاں کی نگاہ میں اے دوست

منظور احمد منظور



ستم یہ ہے کہ اُن کا جورِ پیہم کم نہیں ہوتا
مزاجِ عشق اس پر بھی کبھی برہم نہیں ہوتا

یہ حالت ہے کہ کچھ پا کر خوشی دل کو نہیں ہوتی
اگر کچھ کھو بھی جاتا ہے تو اُس کا غم نہیں ہوتا

کبھی ہنستے ہیں اور آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں
کبھی روتے ہیں اور دامانِ مژگاں نم نہیں ہوتا

خلوص اور آشتی کی راہ میں آنکھیں بچھاتا ہوں
غرورِ جاہ کے آگے مرا سر خم نہیں ہوتا

نشانِ نقشِ پا چھوڑوں گا ہر اک گام پر، مجھ سے
گذشتہ عظمتوں کی خاک پر ماتم نہیں ہوتا



کیفِ ادا بھی ہے نگہِ پُرفتن کے ساتھ
لگتی ہے دل پہ چوٹ مگر بانکپن کے ساتھ

خنکی ہے چاندنی میں، تمازت ہے دھوپ میں
تشبیہہ کس کو دیں ترے نورِ بدن کے ساتھ

سر دے کے سُرخرو تھے کبھی بندگانِ عشق
رسمِ کہن تھی، ختم ہوئی کوہکن کے ساتھ

اک مصلحت کی مُہر ہے لب پر لگی ہوئی
ورنہ ہزار شکوے ہیں اہلِ وطن کے ساتھ

وہ شعرِ نغز کیوں نہ ہو جزوِ رگِ حیات
کچھ فکر کا رچاؤ بھی جس میں ہو فن کے ساتھ

منظور احمد منظور



دل لگی بادِ خزاں کرے گلستانوں کے ساتھ
ہو چلے ہیں، ہم بھی کچھ مانوس، ویرانوں کے ساتھ

حشر سے کچھ کم نہ تھی، گزری جو اے ربِّ جلیل
تیرے انسانوں کے ہاتھوں، تیرے انسانوں کے ساتھ

عقل جب رُک جائے تو لازم ہے تمیزِ جنوں
کوئی دیوانہ بھی ہوتا کاش فرزانوں کے ساتھ

زور پر ہے زہد کے پردے میں جنگِ زرگری
شعبدہ بازی وہی ہے سادہ ایمانوں کے ساتھ

پستیوں کے سائے بڑھ کر چوٹیوں پر چھا گئے
جھونپڑے ٹکرا گئے منظورؔ ایوانوں کے ساتھ



خلوصِ عجز و بندگی رہینِ در نہیں تو کیا
حرم سے بے نیاز ہے اگر مری جبیں تو کیا

یہاں تو بوند بوند کو نظر ترس ترس گئی
ملیں اگر بہشت میں شراب و انگبیں تو کیا

نمودِ زندگی وہی، خروشِ دمدمہ وہی
اُجڑ گئے مکاں تو کیا، بدل گئے مکیں تو کیا

شریکِ بجُوم بھی ردائے گُل بھی خونچکاں
نکھر گیا فلک تو کیا، سنور گئی زمیں تو کیا

سخن تو من کی موج ہے، کہا جو لب پہ آگیا
زمانہ داد دے نہ دے، بشر ہے نکتہ چیں تو کیا

عظیم مرتضیٰ



فغاں سے ترکِ فغاں تک ہزار تشنہ لبی ہے
سکوت بھی تو اک اندازِ مدعا طلبی ہے

بہت دلوں میں ہُوا اہلِ آرزو کو میسّر
وہ قربِ خاص، جہاں تیری یاد بے ادبی ہے

خیالِ ترکِ تعلق، جنونِ قطعِ مراسم
تمام سعیٔ طلب ہے، تمام تشنہ لبی ہے

سکوتِ شعلۂ گُل ہے کہ تیرا پیکرِ رنگیں
وہ آنچ آتی ہے جیسے بدن میں آگ دبی ہے

اسی کے فیض سے آشوبِ آگہی ہے گوارا
نگاہِ ناز ہے یا موجِ بادۂ عنبی ہے

نہ جانے کس طرح طے ہو گا تشنگانِ کرم سے
وہ مرحلہ کہ جہاں عرضِ حال بے ادبی ہے

فضا، نغمۂ گل سے بہت مہک اُٹھی ہے لیکن
تری شگفتہ لبی پھر بھی شگفتہ لبی ہے

عظیم مرتضیٰ



لائی نہ صبا بوئے چمن اب کے برس بھی
کچھ سوچ کے خاموش ہیں یارانِ قفس بھی

دستورِ محبت ہی نہیں جاں سے گزرنا
کر لیتے ہیں یہ کام کبھی اہلِ ہوس بھی

نازک ہیں مراحل سفرِ منزلِ غم کے
اس راہ میں کھو جاتی ہے آوازِ جرس بھی

آزاد بھی ہو جائیں گے آخر ترے قیدی
اک روز بکھر جائے گی زنجیرِ نفس بھی

انگشت نما شیخ و برہمن کے چلن پر
مسجد کے منارے بھی ہیں، مندر کے کلس بھی

دیوانہ ابھی تک ہے اُسی دشمنِ جاں کا
آتا ہے دلِ زار پہ غصہ بھی، ترس بھی

کچھ آپ کا غم، کچھ غمِ جاں، کچھ غمِ دنیا
دامن میں مرے پھول بھی ہیں، خار بھی خس بھی

چُپ رہ کے بھی ممکن نہ رہا درد چھپانا
اک شعلۂ آواز ہے اب موجِ نفس بھی

عظیم مرتضیٰ



یہ اور بات ہے کہ مداوائے غم نہ تھا
لیکن ترا خلوص توقع سے کم نہ تھا

کیا کیا فراغتیں تھیں میسر حیات کو
وہ دن بھی تھے کہ تیرے سوا کوئی غم نہ تھا

کچھ ہم گرفتِ گردشِ دوراں میں آگئے
کچھ دل بھی تیرے عشق میں ثابت قدم نہ تھا

آئے ہیں یاد تجھ سے بچھڑ کر وہ لوگ بھی
جن سے تعلقات بگڑنے کا غم نہ تھا

وہ دورِ عشق، غرض بھی کیا وقت تھا عظیم
جب دل پہ نقشِ مہر و نشانِ ستم نہ تھا

فتنہ ساماں ہی نہیں فتنۂ ساماں نکلے
آپ تو خانہ برانداز دل و جاں نکلے

بیخودی میں جسے ہم سمجھے ہیں تیرا دامن
عین ممکن ہے کہ اپنا ہی گریباں نکلے

دل پہ دھندلے سے نشاں تھے جو غمِ دنیا کے
وہ بھی درپردہ نقوشِ غمِ جاناں نکلے

پھر وہی ہم، وہی بے رونقیٔ دیدہ و دل
حسن کے شعبدے اک خوابِ گریزاں نکلے

دردِ محرومیٔ جاوید بھی اک دولت ہے
اہلِ غم بھی ترے شرمندۂ احساں نکلے

جن سے آرائشِ ایماں کی توقع تھی عظیم
حادثہ ہے کہ وہ غارت گرِ ایماں نکلے

عظیم سوتھٹی



نیم شب، آتشِ فریادِ اسیراں روشن
دھوپ سی پھیل رہی ہے سرِ دیوارِ چمن

یا ترے قرب کی یہ ساعتِ افسردہ ہے
یا کبھی تیرے تصور سے سلگتا تھا بدن

دل جلے رشتے ہیں شاید کہیں پھر آخرِ شب
بھیگا بھیگا ہے نسیمِ سحری کا دامن

آج تک یاد ہے وہ شامِ جدائی کا سماں
تیری آواز کی لرزش، ترے لہجے کی تھکن

دل کے زخموں سے مہک آتی ہے پھولوں کی عظیم
سینۂ چاک ہے یا رخنۂ دیوارِ چمن



جب سے ہے وہ رونقِ محفل آنکھوں میں
جان لبوں پر رہتی ہے، دل آنکھوں میں

سوکھ رہی ہے جوئے گریۂ گردِ نشاں
چبھنے لگی ہے اب خاکِ دل آنکھوں میں

ہجر کی راتیں، عرصۂ بے خوابی کا سفر
کاٹ رہا ہوں منزل منزل، آنکھوں میں

خون کی لہریں موتی پلکوں پر
نکلا دل دریا کا ساحل آنکھوں میں

دیکھ رہا ہوں گزرے وقت کی تصویریں
اُترے ہیں یادوں کے محمل آنکھوں میں

عظیم مرتضیٰ



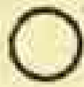
محرومی کے دکھ اور تنہائی کے رنج اُٹھائے
لیکن ہم کو آج بھی جھوٹا پیار نہ کرنا آئے

سیلِ غمِ دنیا نے دل سے کیا کیا نقش مٹائے
ہجر کی راتوں میں اب تیری شکل بھی یاد نہ آئے

تنہائی کا سناٹا اور آتی جاتی راتیں
تیری یاد نہ اور کوئی غم، پھر بھی نیند نہ آئے

تیرے معصومانہ پیار کی دولت پا کر ہم نے
اکثر ناز کیا ہے لیکن کبھی کبھی پچھتائے

پیاسی کلیاں پانی کے قطرے قطرے کو ترسیں
اور کرم کا بادل دریاؤں پہ برسا جائے



افسانۂ حیاتِ پریشاں کے ساتھ ساتھ
دنیا بدل گئی غمِ پنہاں کے ساتھ ساتھ

بے نیابی حیات میں آسودگی بھی تھی
کچھ تیرا غم بھی تھا غمِ دوراں کے ساتھ ساتھ

اب میرے ساتھ اُن کی نظر بھی ہے بیقرار
نشتر تڑپ رہے ہیں رگِ جاں کے ساتھ ساتھ

اب امتیازِ ظاہر و باطن بھی مٹ گیا
دل چاک ہو رہا ہے گریباں کے ساتھ ساتھ

نیرنگیٔ جہانِ طلب دیکھنا عظیم
بڑھتا ہے شوق، تنگیٔ داماں کے ساتھ ساتھ

عظیم مرتضیٰ



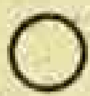
وہی یکسانیتِ شام و سحر ہے کہ جو تھی
زندگی دست بہ دل، خاک بسر ہے کہ جو تھی

دیکھ کر بھی ترے جلوے نہیں دیکھے جاتے
وہی پابندیٔ آدابِ نظر ہے کہ جو تھی

تجھ سے مل کر بھی غمِ ہجر کی تلخی نہ مٹی
ایک حسرت سی بہ اندازِ دگر ہے کہ جو تھی

شعلۂ درد بجھے دیر ہوئی ہے لیکن
وہی تابندگیٔ دیدۂ تر ہے کہ جو تھی

تو مری جان نہیں اب، مگر اے جانِ عظیمؔ
زندگی اب بھی تری دست نگر ہے کہ جو تھی



غم کا یہ سلیقہ بھی، رہ گیا ہے اب ہم تک
زار زار روتے ہیں، آنکھ میں نہیں نم تک

یاد جانے والوں کی، روشنی خیالوں کی
دل کا ساتھ دیتی ہے، ایک منزلِ غم تک

تجھ سے مل کے بھی تیرا انتظار رہتا ہے
صبحِ روئے خنداں سے شامِ زُلف برہم تک

اب نشاں ملے شاید منزلِ تمنا کا
تیرے ہجر کے غم سے آگئے ترے غم تک

ایک دردِ ہستی نے عمر بھر رفاقت کی
ورنہ ساتھ دیتا ہے کون آخری دم تک

رضا ہمدانی



معمورۂ افکار میں اک حشر بپا ہے
ادراک بھی انساں کے لئے طرفہ بلا ہے

ہر نقش اگر تیرا ہی نقشِ کفِ پا ہے
پھر میرے لیے کوئی سزا ہے نہ جزا ہے

ہونٹوں پہ ہنسی، سینوں میں کہرام بپا ہے
دیوانوں نے جینے کا چلن سیکھ لیا ہے

اب دشتِ جنوں بھی جو سمٹ آئے عجب کیا
دیوانہ کوئی لے کے ترا نام چلا ہے

اِک بار جو ٹوٹے تو کبھی جُڑ نہیں سکتا
آئینہ نہیں دل، مگر آئینہ نما ہے

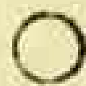
اپنوں سے کبھی موت جُدا کر نہیں سکتی
جو ٹوٹ گیا ہاتھ وہ سینے پہ دھرا ہے

ہم ذوقِ سماعت سے ہیں محروم، وگرنہ
ہر قطرۂ شبنم میں دھڑکنے کی صدا ہے

وہ سامنے آئے ہیں کچھ اس طرفہ ادا سے
آدابِ محبت کے بھی دل بھول گیا ہے

دھڑکا یہ لگا ہے کہ سحر آئے نہ آئے
اس غم سے سرِ شام ہی دل ڈوب رہا ہے

رضا ہمدانی



یہ کس مقام پہ ٹھہرا ہے کاروانِ وفا
نہ روشنی کی کرن ہے کہیں نہ تازہ ہوا

ہوئی ہے جب سے یہاں "نطق و لب کی بخیہ گری"
سوائے حسرتِ اظہار، دل میں کچھ نہ رہا

اس اہتمام سے شبخوں پڑا کہ مدت سے
اجاڑ سی نظر آتی ہے شہرِ دل کی فضا

تمام عمر اسی کی تلاش میں گذری
وہ ایک عکس جو آئینۂ نظر میں نہ تھا

یہ کس نے آج دبے پاؤں دل میں آتے ہی
خیال و فکر کا قفلِ سکوت توڑ دیا

کچھ اس طرح سے تری یاد کی مہک آئی
کہ جیسے دامنِ صحرا میں کوئی پھول کھلا

شکستِ دل پہ رضاؔ ہم بھی ٹوٹ کر روتے
مگر نہ اتنے کہ سو ہی سکے نہ ہمسایا

رضا ہمدانی



حسن پابندِ حنا ہو جیسے
یہ وفاؤں کا صلہ ہو جیسے

یوں وہ کرتے ہیں کنارا مجھ سے
اس میں میرا ہی بھلا ہو جیسے

طعنہ دیتے ہیں مجھے جینے کا
زندگی میری خطا ہو جیسے

اس طرح آنکھ سے ٹپکا ہے لہو
شاخ سے پھول گرا ہو جیسے

سرِ کہسار وہ بادل گرجا!
دل دھڑکنے کی صدا ہو جیسے

حالِ دل پوچھتے ہو یوں مجھ سے
تم مرے دل سے جدا ہو جیسے

یاد یوں آئی تری رُک رُک کر
کوئی زنجیر بپا ہو جیسے

اب جفا کو بھی ترستے ہیں رضاؔ
یہی تاثیرِ دعا ہو جیسے



ہر عکس خود ایک آئینہ ہے
ہر سایہ زباں سے بولتا ہے

احساس کی تلخیوں میں ڈھل کر
دل درد کا چاند بن گیا ہے

سنتا ہو کوئی تو ہر کلی کے
کھلنے میں شکست کی صدا ہے

یوں آتی ہے تیری یاد اب تو
جیسے کوئی دُور کی صدا ہے

گویا تھے تو کوئی بھی نہیں تھا
اب چُپ ہیں تو شہر دیکھتا ہے

عاجز ہے اجل بھی اس کے آگے
جو مثلِ صبا بکھر گیا ہے

تو سلسلۂ سوال بن کر
کیوں ذہنوں کے بن میں گونجتا ہے

قربت تری کس کو راس آئی
آئینے میں عکس کانپتا ہے

جیتے ہیں روایتاً رضاؔ ہم
اس دَور میں زندگی سزا ہے

رضا ہمدانی



اپنے اندیشوں کی بارات دکھاتے کس کو
تم ہی جب بھول گئے، یاد بھی آتے کس کو

اُٹھ گئے خود ہی کہ دیکھا تو فقط غیر تھے ہم
آشنا تھے سبھی، محفل سے اُٹھاتے کس کو

کچھ میسر نہ ہوا، اپنے ہی زخموں کے سوا
مسکراتے ہوئے خوابوں میں سجاتے کس کو

ہم بھٹکتے ہی رہے شہر کے ویرانے میں
اپنی تنہائی کا احساس دلاتے کس کو

سازِ جاں پر بھی پڑا زخمۂ حالات رضا
نارسائی کے بیاباں میں بلاتے کس کو



جنوں کا رازِ محبت کا بھید پا نہ سکی
ہمارا ساتھ یہ دنیا مگر نبھا نہ سکی

بکھر گیا ہوں فضاؤں میں بوئے گل کی طرح
مرے وجود میں وسعت مری سما نہ سکی

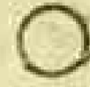
ہر اک قدم پہ صلیبِ آشنا ملے مجھکو
یہ کائنات وفاؤں کا بار اُٹھا نہ سکی

ٹپک کے رہ گئی سر اپنا رہ گذاروں سے
مری صدا دلِ کہسار میں سما نہ سکی

کھلی ہوا کی فصیلوں میں زندگی ہے اسیر
فریبِ رنگ سے ماحول کو بسا نہ سکی

رضا طلوعِ سحر تک ہے زندگی شب کی
یہ بات اہلِ ستم کی سمجھ میں آ نہ سکی

رضا ہمدانی



اشک یوں بہتے ہیں ساون کی جھڑی ہو جیسے
یا کہیں پہلے پہل آنکھ لڑی ہو جیسے

کتنی یادوں نے ستایا ہے تری یاد کے ساتھ
غمِ دوراں غمِ جاناں کی کڑی ہو جیسے

بوئے کاکل کی طرح پھیل گیا شب کا سکوت
تیری آمد بھی قیامت کی گھڑی ہو جیسے

یوں نظر آتے ہیں اخلاص میں ڈوبے ہوئے دوست
دشمنوں پر کوئی افتاد پڑی ہو جیسے

جلوۂ دار اِدھر، جنتِ دیدار اُدھر
زندگی آج دوراہے پہ کھڑی ہو جیسے

یوں خیال آتے ہی ہر سانس میں محسوس ہوا
غمِ محبوب! تری عمر بڑی ہو جیسے!



زخم کچھ ایسے مرے قلب و جگر نے پائے
عمر بھر جو کسی عنوان نہ بھرنے پائے

ہم نے اشکوں کے چراغوں سے سجا لیں پلکیں
کہ ترے درد کی بارات گزرنے پائے

ان سے کیا پوچھتے ہو فلسفۂ موت و حیات
کہ جو زندہ بھی رہے اور نہ مرنے پائے

اس بے کم نظری کا بھی ستم سہنا پڑا
تجھ پہ محفل میں کوئی نام نہ دھرنے پائے

پاسِ آدابِ وفا تھا کہ شکستہ پائی
بے خودی میں بھی نہ ہم حد سے گزرنے پائے

اپنے جذبات کے بپھرے ہوئے طوفاں میں رضاؔ
اس طرح ڈوبے کہ پھر ہم نہ اُبھرنے پائے

رضا ہمدانی



چُپ ہو کیوں اے پیمبرانِ قلم
بات چھیڑو کہ گزرے شامِ الم

چشمِ حیرت سے دیکھتا ہے جہاں
کس مصوّر کے شاہکار ہیں ہم

ہم نکھاریں گے تیرا حسن و جمال
ہم سنواریں گے تیری زلف کے خم

بت شکن مطمئن نہ ہوں کہ ابھی
ناتراشیدہ ہیں ہزاروں صنم

بعد مرنے کے اے رضا شاید
کام آئیں ہمارے نقشِ قدم



ہم سکوں پائیں گے سماؤں میں کیا
خوشبوؤں کا قحط ہے، گاؤں میں کیا؟

کم نہیں گہرے سمندر سے جو دل
وہ بھلا ڈوبے گا دریاؤں میں کیا ؟

ہر طرف روشن ہیں یادوں کے کلس
گھر گئے ہیں ہم کلیساؤں میں کیا؟

جن کی آنکھوں میں ہے نیندوں کا غبار
روشنی پائیں گے صحراؤں میں کیا؟

رات دن قرنوں سے ہوں گرمِ سفر
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں کیا؟

دھوپ تو بدنام ہے یونہی رضا
پھول مرجھاتے نہیں چھاؤں میں کیا؟

تابش دہلوی



ایک جلوہ بصد اندازِ نظر دیکھ لیا
تجھکو ہی دیکھا کئے، تجھکو اگر دیکھ لیا

جیسے سر پھوڑ کے مل جائے گی زنداں سے نجات
کیا جنوں نے کوئی دیوار میں در دیکھ لیا

باز ہے آج تلک دیدۂ حیراں کی طرح
دشتِ وحشت نے کسے خاک بسر دیکھ لیا

جرمِ نظارہ کی پاتا ہے سزا دل اب تک
اہلِ دل دیکھ لیا ، اہلِ نظر دیکھ لیا

صورتِ نقشِ قدم ، دیدۂ مشتاق ہیں ہم
جب بھی وہ آیا سرِ راہگذر ، دیکھ لیا

یہی حسرت ہے کہ وہ ایک نظر دیکھ تو لے
اور اُس نے کبھی اِس سمت اگر دیکھ لیا

کہیں پردہ ہے تجلّی ، کہیں جلوہ ہے حجاب
یہ تماشا بھی ترا ذوقِ نظر دیکھ لیا

روز اک تازہ غمِ دہر ہے نازل تابشؔ
ایک طوفانِ بلا نے مرا گھر دیکھ لیا

تابش دہلوی



تابشؔ ہوسِ لذتِ آزار کہاں تک!
راحت ہے، یہ غم، پھر بھی مرے یار کہاں تک!

ہر روز اک آوازہ انالحق کا لگائیں
دیکھیں تو کہ ہے سلسلۂ دار کہاں تک

ہر راستے سے منزلِ ہستی ہے بہت دُور
جائے گا مرے ساتھ غمِ یار کہاں تک

ہاں طعنۂ اغیار کے نشتر ہی سے کھُل جائے
اک زخم رہے گا لبِ گفتار کہاں تک

ہیں اس کے تعلق سے عزیز اہلِ جہاں بھی
لے جائے گی آخر ہوسِ یار کہاں تک

آئینہ در آئینہ در آئینہ ترا حسن
حیراں ہوں ترے طالبِ دیدار کہاں تک

ہوتی ہی نہیں صبحِ قیامت بھی نمودار
جاگیں گے شبِ ہجر کے بیمار کہاں تک

پھیلی ہوئی ہر سمت کڑی دھوپ ہے تابشؔ
جائے گا کوئی سایۂ دیوار کہاں تک

تابش دہلوی



آغازِ گل ہے، شوق نگہ تیز ابھی سے ہے
مستی ہوائے باغ جنوں خیز ابھی سے ہے

جوشِ طلب ہی موجبِ درماندگی نہ ہو
منزل ہے دور اور قدم تیز ابھی سے ہے

کیا ارتباطِ حسن و محبت کی ہو امید
وہ جانِ شوق ہم سے کم آمیز ابھی سے ہے

ترتیبِ کارواں میں بہت دیر ہے مگر
آوازہ جرس ہے کہ مہمیز ابھی سے ہے

پہلی ہی ضربِ تیشہ سے کوہِ گراں ہے چُور
حسرت مآلِ سطوتِ پرویز ابھی سے ہے

کیا جانے میکشوں کا ہو کیا حشر صبح تک
ساقی کی ہر نگاہ دل آویز ابھی سے ہے

یہ ابتدائے شوق یہ پُر شوق دل مرا!
اک جامِ آتشیں ہے کہ لبریز ابھی سے ہے

تابش بھری بہار میں کوئی بچھڑ گیا
اب کے چمن میں بوئے خزاں تیز ابھی سے ہے



ٹوٹ کر عہدِ تمنا کی طرح
معتبر ہم رہے فردا کی طرح

بے نیازِ سرِ ساحل ہو کر
ہم بہے جاتے ہیں دریا کی طرح

شوقِ منزل تو بہت ہے لیکن
چلتے ہیں نقشِ کفِ پا کی طرح

جا ملیں گے کبھی گلزاروں سے
پھیلتے پھیلتے صحرا کی طرح

دیکھ کر حالِ پریشاں اپنا
ہم بھی ہنس دیتے ہیں دنیا کی طرح

کبھی پایاب کبھی طوفانی
ہم بھی ہیں دشت کے دریا کی طرح

محفلِ ناز میں رہیئے لیکن
دیکھئے چشمِ تماشا کی طرح

مطمئن ایک تجلی سے نہیں
نگہِ جلوہ تقاضا کی طرح

اپنے دشمن سے ہوں واقف تابش
کسی دیرینہ شناسا کی طرح

تابش دہلوی



بہت جبین و رخ و لب، بہت قد و گیسو
طلب ہے شرط، سکوں کے ہزار ہا پہلو

جو بیخودی ہے سلامت تو مل ہی جائے گا
برائے فرصتِ اندیشہ، یار کا زانو!

ہزار وحشتِ بلا حلقۂ اثر میں ہیں
مرا جنوں ہے کہ چشمِ غزال کا جادو

یہ راز کھول دیا تیری کم نگاہی نے
سکوں کی ایک نظر، درد کے بہت پہلو

صبا ہزار کرے بوئے گل کی آمیزش
نہ دب سکے گی ترے جسمِ ناز کی خوشبو

اک اضطرابِ حسیں ہے فشارِ تنگی سے
کنارِ شوق میں تو ہے کہ دام میں آہو

بہت ہے اہلِ بصیرت کو ایک جلوہ بھی
وفورِ تشنہ لبی ہو اگر تو خم ہے سبو

جنوں اور اہلِ جنوں کا وہ قحط ہے تابش
اٹھا نہ دشت سے پھر کوئی نعرۂ "یا ہو"



منزلوں کو نظر میں رکھا ہے
جب قدم رہگذر میں رکھا ہے

اک ہیولا ہے گھر خرابی کا!
ورنہ کیا خاک گھر میں رکھا ہے

ہم نے حسنِ ہزار شیوہ کو
جلوہ جلوہ نظر میں رکھا ہے

چاہیئے صرف ہمتِ پرواز
باغ تو بال و پر میں رکھا ہے

حرم و دیر سے الگ ہم نے
ابھی اک سجدہ سر میں رکھا ہے

میری ہمت نے اپنی منزل کا
فاصلہ رہگذر میں رکھا ہے

رات دن دھوپ چھاؤں کا عالم
کیا تماشا نظر میں رکھا ہے

ایک داغِ فراقِ منزل بھی
ہم نے رختِ سفر میں رکھا ہے

مفت ملتی ہے دشمنی تابش
کیا کرشمہ ہنر میں رکھا ہے

تابش دہلوی



سب غم کہیں جسے کہ تمنا کہیں جسے
وہ اضطرابِ شوق ہے، ہم کیا کہیں جسے

ہے جہدِ منفرد سببِ کاروبارِ دہر
اک اضطرابِ قطرہ ہے، دریا کہیں جسے

تمنا کا اعتبار ہے حسنِ قبول سے
عشرت بھی ایک غم ہے گوارا کہیں جسے

ملتا نہیں ہے اہلِ جنوں کا کوئی سراغ
بس ایک نقشِ پا ہے کہ صحرا کہیں جسے

پہلے حیاتِ شوق تھی اللہ رے انقلاب
اب اعتبارِ غم ہے تمنا کہیں جسے

ہے میری کائناتِ تصور کا اک فریب
وہ جلوۂ خیال کہ دنیا کہیں جسے

کچھ کم نگاہیاں ہیں تجلی کی آڑ سے
ایسی بھی اک نگاہ، تماشا کہیں جسے

تنہائی خیال سے تابش یہ حال ہے
ایسا کوئی نہیں کہ ہم اپنا کہیں جسے



یوں نقابِ رخ مقابل سے اٹھی
چشمِ صد نظارہ مشکل سے اٹھی

بازگشتِ شورِ غرقابی سہی
کوئی تو آواز ساحل سے اٹھی

قافلے ہیں کتنے درماندہ خرام
گرد راہوں سے نہ منزل سے اٹھی

تھام کر دل کیا اٹھے اربابِ درد
اک قیامت تیری محفل سے اٹھی

سر سے بھی گزری ہے طوفاں کی طرح
جب بھی کوئی موجِ خوں دل سے اٹھی

چشمِ نظارہ سے مانندِ حجاب
تہمتِ نظارہ مشکل سے اٹھی

عشق بھی تابش نہیں وجہِ نشاط
اب یہ رسمِ درد بھی دل سے اٹھی

تابش دہلوی



عذاب ٹوٹے دلوں کو ہر اک نفس گذرا
شکستہ پا تھے گراں مژدۂ جرس گذرا

ہجومِ جلوہ و نیرنگیٔ تماشا ہے
تمام موسمِ گل، موسمِ ہوس گذرا

عجب نہیں کہ حیاتِ دوام بھی بخشے
وہ ایک لمحۂ فرقت جو اک برس گذرا

یہ مصلحت کہ کہیں دہر ہے کہیں فردوس
وہی جو عالمِ دل ہم پہ ہم نفس گذرا

غمِ مآل رہا عرضِ شوق سے پہلے
اس ایک بات پہ کیا کیا نہ پیش و پس گذرا

کشاکشِ غمِ آزادی و اسیری میں
ہر آشیاں پہ کوئی عالمِ قفس گذرا

رہِ طلب میں ہیں درماندہ راہبر تابش
یہی ہے حال تو یہ قافلہ بھی بس گذرا



مہر و پروین تہہِ کمند رہے
کن فضاؤں میں ہم بلند رہے
غمِ ہستی سے بے نیاز سہی
اہلِ دل پھر بھی دردمند رہے
چشمِ عقدہ کشا سے بھی نہ کھلے
ہم کچھ اس طرح بند بند رہے
بر سرِ دار ہم سہی لیکن
حرفِ حق کی طرح بلند رہے
حسن کی خود نمائیاں توبہ
مدتوں ہم بھی خود پسند رہے
مے و مستی نہیں ہے اس پہ حرام
میکدے میں جو ہوش مند رہے
ہم پیا رہبر سے دو قدم آگے
حوصلے شوق سے دوچند رہے
دشمنوں کا گلہ نہیں تابش
دوست بھی درپئے گزند رہے

مصطفیٰ زیدی



کیا کیا نظر کو شوقِ ہوس دیکھنے میں تھا
دیکھا تو ہر جمال اسی آئینے میں تھا

قلزم نے بڑھ کے چوم لیے پھول سے قدم
دریائے رنگ و نور ابھی راستے میں تھا

اک موجِ خونِ خلق تھی کس کی جبیں پہ تھی؟
اک طوقِ فردِ جرم تھا، کس کے گلے میں تھا؟

اک رشتۂ وفا تھا سو کس ناشناس سے
اک دردِ حرزِ جاں تھا سو کس کے صلے میں تھا

صہبائے تند و تیز کی حدّت کو کیا خبر
شیشے سے پوچھیے جو مزا ٹوٹنے میں تھا

کیا کیا رہے ہیں حرف و حکایت کے سلسلے
وہ کم سخن نہیں تھا مگر دیکھنے میں تھا

تائب تھے احتساب سے جب سارے بادہ کش
مجھ کو یہ افتخار کہ میں مے کدے میں تھا

مصطفیٰ زیدی



غمِ دوراں نے بھی سیکھے غمِ جاناں کے چلن
وہی سوچی ہوئی چالیں، وہی بے ساختہ پن

وہی اقرار میں انکار کے لاکھوں پہلو
وہی ہونٹوں پہ تبسم، وہی ابرو پہ شکن

کس کو دیکھا ہے کہ پندارِ نظر کے باوصف
ایک لمحے کے لیے رُک گئی دل کی دھڑکن

کون سی فصل میں اس بار ملے ہیں تجھ سے
کہ نہ پروائے گریباں ہے، نہ فکرِ دامن

اب تو چبھتی ہے ہوا برف کے میدانوں کی
اُن دنوں جسم کے احساس سے جلتا تھا بدن

ایسی سُونی تو کبھی شامِ غریباں بھی نہ تھی
دل بجھے جاتے ہیں، اے تیرگیِ صبحِ وطن

مصطفیٰ زیدی



لوگوں کی ملامت بھی ہے، خود دردسری بھی
کس کام کی یہ اپنی وسیع النظری بھی

کیا جانیے کیوں سست تھی کل ذہن کی رفتار
ممکن ہوئی تاروں سے مری ہم سفری بھی

راتوں کو کلی بن کے چٹکتا تھا ترا جسم
دھوکے میں چلی آئی نسیم سحری بھی

خود اپنے شب و روز گزر جائیں گے لیکن
شامل ہے مرے غم میں تری دربدری بھی

فرقت کے شب و روز میں کیا کچھ نہیں ہوتا
قدرت پہ ملامت بھی، دعائے سحری بھی

اک فرد کی الفت تو بڑی کم نظری ہے
ہے کس میں مگر اہلیت کم نظری بھی



کسی اور غم میں اتنی خلش نہاں نہیں ہے
غم دل مرے رفیقو! غم رائیگاں نہیں ہے

کوئی ہم نفس نہیں ہے، کوئی رازداں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک، سو وہ مہرباں نہیں ہے

مری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسم، مرا ترجماں نہیں ہے

کسی آنکھ کو صدا دو، کسی زلف کو پکارو
بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے



کفِ مومن سے، نہ دروازۂ دوراں سے ملا
رشتۂ درد اسی دشمنِ ایماں سے ملا

اس کا رونا ہے کہ پیماں شکنی کے باوصف
وہ ستمگر اسی پیشانیِ خنداں سے ملا

طالبِ دستِ ہوس اور کئی دامن تھے
ہم سے ملتا جو نہ یوسف کے گریباں سے ملا

کوئی باقی نہیں اب ترکِ تعلق کے لئے
وہ بھی جا کر صفِ احبابِ گریزاں سے ملا

کیا کہیں اس کو جو محفل میں شناسا بھی نہ تھا
کبھی خلوت میں در آیا تو دل و جاں سے ملا

میں اسی کوہ صفت خون کی اک بوند ہوں، جو
ریگ زارِ نجف و خاکِ خراساں سے ملا



ہر طرف انبساط ہے اے دل
اور ترے گھر میں رات ہے اے دل

عشق ان ظالموں کی دنیا میں
کتنی مظلوم ذات ہے اے دل

میری حالت کا پوچھنا ہی کیا
سب ترا التفات ہے اے دل

اور بیدار رہ کہ یہ دنیا
شاطروں کی بساط ہے اے دل

صرف اس نے نہیں دیا مجھے سوز
اس میں تیرا بھی ہات ہے اے دل

مندمل ہو نہ جائے زخمِ درُوں
یہ مری کائنات ہے اے دل

حسن کا ایک وار سہہ نہ سکا
ڈوب مرنے کی بات ہے اے دل

مصطفیٰ زیدی



اس قدر اب غمِ دوراں کی فراوانی ہے
تو بھی منجملۂ اسبابِ پریشانی ہے

مجھ کو اس شہر سے کچھ دور ٹھہر جانے دو
میرے ہمراہ مری بے سروسامانی ہے

آنکھ جھک جاتی ہے جب بندِ قبا کھلتے ہیں
تجھ میں اُٹھتے ہوئے خورشید کی عریانی ہے

اک ترا لمحۂ اقرار نہیں مر سکتا
اور ہر لمحہ زمانے کی طرح فانی ہے

کوچۂ وشت سے آگے ہے بہت وشتِ جنوں
عشق والوں نے ابھی خاک کہاں چھانی ہے

اس طرح ہوش گنوانا بھی کوئی بات نہیں
اور یوں ہوش سے ہٹنے میں بھی نادانی ہے



نگر نگر میلے کو گئے، کون سُنے گا تیری پکار
اے دل، اے دیوانے دل! دیواروں سے سر دے مار

روح کے اِس ویرانے میں تیری یاد ہی سب کچھ تھی
آج تو وہ بھی یوں گزری جیسے غریبوں کا تیوہار

پل پل صدیاں بیت گئیں، جانے کس دن بدلے گی
ایک تری آہستہ روی، ایک زمانے کی رفتار

پچھلی فصل میں، جتنے بھی اہلِ جنوں تھے کام آئے
کون سجائے گا تیری مشق کا ساماں اب کی بار؟

صبح کے نکلے دیوانے اب کیا لوٹ کے آئیں گے
ڈوب چلا ہے شہر میں دن، پھیل چلا ہے سایۂ دار



وہ عہد عہد ہی کیا ہے، جسے نبھاؤ بھی
ہمارے وعدۂ الفت کو بھول جاؤ بھی

بھلا، کہاں کے ہم ایسے گمان والے ہیں
ہزار بار ہم آئیں، ہمیں بھلاؤ بھی

بگڑ چلا ہے بہت رسمِ خودکشی کا چلن
ڈرانے والو، کسی روز کر دکھاؤ بھی

نہیں کہ عرضِ تمنا پہ ہاں ہی جاؤ
ہمیں اسی عہدِ تمنا میں آزماؤ بھی

فغاں کہ قصۂ دل سن کے لوگ کہتے ہیں
یہ کون سی نئی افتاد ہے، ہٹاؤ بھی

تمہاری نیند میں ڈوبی ہوئی نظر کی قسم
ہمیں یہ ضد ہے کہ جاگو بھی اور جگاؤ بھی



جس دن سے اپنا طرزِ فقیرانہ چھٹ گیا
شاہی تو مل گئی، دلِ شاہانہ چھٹ گیا

کوئی تو غمگسار تھا، کوئی تو دوست تھا
اب کس کے پاس جائیں کہ ویرانہ چھٹ گیا

دنیا تمام چھٹ گئی پیمانے کے لئے
وہ مے کدے میں آئے تو پیمانہ چھٹ گیا

کیا تیز پا تھے دن کی تمازت کے قافلے
ہاتھوں سے رشتۂ شبِ افسانہ چھٹ گیا

اک دن حساب ہو گا کہ دنیا کے واسطے
کن صاحبوں کا مسلکِ رندانہ چھٹ گیا

افضل پرویز



گرد اُڑے یا کوئی آندھی ہی چلے
یہ اُمس تو کسی عنوان سے ٹلے

انگ پر زخم لیے، خاک ملے
آن بیٹھے ہیں تیرے محل تلے

اپنا گھر شہرِ خموشاں سا ہے
کون آئے گا یہاں شام ڈھلے

دلِ پروانہ پہ کیا گزرے گی
جب تلک دھوپ نہ بجھے، شمع جلے

روپ کی جوت ہے کالا جادو
اک چھلاوہ کہ فرشتوں کو چھلے

دلدلوں میں بھی کنول کھلتے ہیں
نخلِ امید بہر طور پھلے

اپنے ہی رین بسیروں کی طرف
لوٹ آئے ہیں سبھی شام ڈھلے

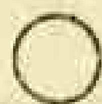
میکدے میں تو نشہ بٹتا ہے
کون یاں جانچے بُرے اور بھلے

روشنی دیکھ کے چندھیا جائیں
جو اندھیروں میں بڑھے اور پلے

خارِ توصیف سہے گا گل کی
یہ بھلے ہی کسی گلچیں کو کھلے

رات باقی ہے ابھی تو پرویز
بادہ سرجوش رہے، دور چلے

افضل پرویز



جو دردِ دل کہو، آہستہ بولو
خوشی سے غم سہو، آہستہ بولو

فغاں کرنا بھی جرمِ عاشقی ہے
بڑے چوکس رہو، آہستہ بولو

تمہاری آہ بھی ہے بارِ خاطر
تکلّم کے شہو! آہستہ بولو

در و دیوار بھی ہوتے ہیں جاسوس
کوئی سنتا نہ ہو، آہستہ بولو

اب آہِ زیرِ لب ہے بزم کی رسم
اسی رو میں بہو، آہستہ بولو

سرہانے دل ہی دل میں بات کرنا
ہمارے دلدہو! آہستہ بولو

صدا سر پھوڑ کر آئے گی واپس
یہی چابک سہو، آہستہ بولو

افضل پرویز



خوش قسمت ہیں وہ جو گاؤں میں لمبی تان کے سوتے ہیں
ہم تو شہر کے شور میں شب بھر اپنی جان کو روتے ہیں

کس کس درد کو اپنائیں اور کس کس زخم کو سہلائیں
دکھتی آنکھوں قدم قدم پہ کئی حوادث ہوتے ہیں

دل کی دِلّی لٹ گئی، اس کے ایوانوں میں غدر مچی
خودداری کے مغل شہزادے شہر میں ٹھلیا ڈھوتے ہیں

خوش لحنوں کے لئے گلشن بھی کُنجِ قفس بن جائے تو
جبر کے گن گاتے ہیں یا نغموں میں درد سموتے ہیں

شام نے دن کا ساتھ چھڑایا، رات نے دشت میں آن لیا
ایسے سفر میں رہ گیروں پہ سانس بھی دوبھر ہوتے ہیں

میں تو اپنی جان پہ کھیل کے پیار کی بازی جیت گیا
قاتل ہار گئے جو اب تک خون کے چھینٹے دھوتے ہیں

دل کے زیاں کا سبب کیا پوچھو ان طوفانوں کو دیکھو
جن کے بھنور ساحل کے سفینوں کو بھی آن ڈبوتے ہیں

پرویز آج نہیں ملتی ہے غم کے بھاؤ تلچھٹ بھی
اس پہ طرّہ یہ ہے کہ ساقی نشترِ طعن چبھوتے ہیں



میں نے دلِ بے تاب پہ جو جبر کیا ہے
خوں ہو کے میری آنکھوں سے اب پھوٹ بہا ہے

جس کو کسی آذر نے ہے پتھر سے تراشا
اب شومیِ تقدیر سے وہ میرا خدا ہے

اس کے ستم و جور کا احساس کسے ہو
اس شوخ کی صورت ہی بڑی ہوشربا ہے

مجھ بیکس و آوارہ کی پھر آ گئی شامت
سنتا ہوں کہ بستی میں کہیں قتل ہوا ہے

تم ان کو سزا کیوں نہیں دیتے کہ جنھوں نے
مجرم کا ضمیر اور سکوں لوٹ لیا ہے

اب دعویٔ انصاف کی اوقات کھلے گی
خود شیخ مرے شہر کا مختار بنا ہے



وقت کے طوفانی ساگر میں کرودھ کپٹ کے ریلے ہیں
لیکن اُس کے مانجھی ہر لحظہ موجوں سے کھیلے ہیں

پگ پگ کانٹے، منزلوں صحرا، کوسوں جنگل بیلے ہیں
سفرِ زیست کٹھن ہے یارو، راہ میں لاکھ جھمیلے ہیں

الکھ جگائے، دھونی رمائے، دھیان لگائے بیٹھے ہیں
پیار ہمارا مسلک ہے، ہم پریم گرو کے چیلے ہیں

راہزنوں سے گھبرا کر سب ساتھی سنگت چھوڑ گئے
اور پُر خوف ڈگر پہ گرمِ سفر، ہم آج اکیلے ہیں

حسن کی دولت اس کی ہے اور وصل کی عشرت بھی اس کی
جس نے پل پل، ہجر میں کاٹا، جور سہے، دُکھ جھیلے ہیں

بازی گاہِ دار و رسن ہیں میکدۂ فکر و فن ہیں
ہم رندوں سے رونق ہے، ہم درویشوں سے میلے ہیں

جیون کی کومل ابلا کا سوئمبر رچنے والا ہے
آو صلائے عام ہے سب کو، جتنے بھی البیلے ہیں



حسن ہیرے کی کنی ہو جیسے
اور مری جاں پہ بنی ہو جیسے

تیری چتون کے عجب تیور ہیں
سر پہ تلوار تنی ہو جیسے

ریزہ ریزہ ہوئے مینا و ایاغ
رند و ساقی میں ٹھنی ہو جیسے

اپنی گلیوں میں ہیں یوں آوارہ
کہ غریب الوطنی ہو جیسے

ہر مسافر تیرے کوچے کو چلا
اس طرف چھاؤں گھنی ہو جیسے

تیری قربت کی خمار آگینی
رت شرابوں میں سنی ہو جیسے

یہ کشاکش کی مئے مرد افگن
تیری پلکوں سے چھنی ہو جیسے



لیلیٰ سر بگریباں ہے، مجنوں سا عاشقِ زار کہاں
ہیرو ہائی دیتی ہے رانجھے سا یارِ غار کہاں

اپنا خونِ جگر پیتے ہیں، تجھ کو دعائیں دیتے ہیں
تیرے میخانے میں ساقی، ہم سا بادہ خوار کہاں

ہجر کا ظلم ہماری قسمت، وصل کی دولت غیر کا مال
زخم کیسے اور مرہم کس کو، درد کہاں ہے، قرار کہاں

پیرِ مغاں کیا کم تھا، محتسبوں کا بھی اب دخل ہوا
مینا پر کیا گزرے گی، سر پھوڑیں گے میخوار کہاں

سنتے ہیں کہ چمن مہکے، بلبل چہکے، بن لہکے ہیں
اپنے نشیمن تک جو نہ پہنچی، ایسی بہار، بہار کہاں

کُنجِ محن ہے، دار و رسن ہے، ظلمت ہے، تنہائی ہے
کون سی جا ہے، ہمسفرو، لے آئی تلاشِ یار کہاں

گل چینوں کو آج چمن بندی کا دعویٰ ہے پر دیز
اب دیکھیں لٹ کر کہتا ہے کلی کلی کا سنگھار کہاں

کارزارِ عشق و سرمستی میں نُصرت یاب ہوں

وہ جنونی، دار تک جانے کو جو بیتاب ہوں

کوہساروں پہ سوا نیزے پہ سورج آگئے تو

چوٹیوں کی برف پگھلے، وادیاں سیراب ہوں

دوسرے ساحل پہ کوئی سوہنی ہو منتظر

ہم مہینوالوں کے آگے بحر بھی پایاب ہوں

عافیت پاتے ہیں خوابوں کے حسیں جزیروں میں لوگ

جب ہر اک موجِ حقائق میں نہاں گرداب ہوں



اک کفن لگتی ہے اس غم کی گھڑی میں چاندنی
سائیں سائیں کر رہی ہے خامشی میں چاندنی

آتشیں چابک لئے پہرے پہ ہیں برقی ستون
کس طرف سے آئے گی میری گلی میں چاندنی

رات بھر میں کاٹ لوں گا درد کا کوہِ گراں
صبح تک تو ساتھ دے گی خامشی میں چاندنی

مجھ سے چھنوائی شبِ ہجراں نے ویرانوں میں خاک
خوار و آوارہ ہے آخر کس خوشی میں چاندنی

پیکرِ سیمیں ترا نظروں سے اوجھل ہو گیا
کس قدر گھل مل گئی ہے چاندنی میں چاندنی

شعر نازل ہو رہے ہیں زینۂ لمعات سے
کیا ہی افسوں پھونکتی ہے خامشی میں چاندنی

صبح کی منزل تلک مشعل لئے ہمرہ رہی
پھر ہوئی تحلیل دن کی روشنی میں چاندنی



دل رقابت کی کشاکش سے چھٹا تیرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ وفا تیرے بعد

روح میں ایسی رچی تیرے بدن کی خوشبو
مدتوں ایک نشہ چھایا رہا تیرے بعد

تجھ سے پہلے بھی مرے دل کا نگر تھا سونا
لیکن اب اور بھی ویران ہوا تیرے بعد

میں کہ شیرانِ نیستاں کو بھی للکارتا ہوں
ایک بچے کی طرح رو ہی دیا تیرے بعد

باغ میں کنجِ ملاقات بنا گوشۂ قبر
بین کرتی ہوئی پھرتی ہے صبا تیرے بعد

تو نے جاتے ہوئے اک بار نہ مڑ کر دیکھا
کیا کروں تیرے تغافل کا گلہ تیرے بعد

جلیل حشمی



گھر سے باہر کبھی نکلا کیجے   حشمی گلیوں میں ٹہلا کیجے

حُسن باتوں میں بھی پیدا کیجے   سامنے آئینہ رکھا کیجے

کیوں کسی اور کو رسوا کیجے   اب کے اپنا ہی تماشا کیجے

پہلے خود آپ کو پرکھا کیجے   اور پھر شکوۂ دُنیا کیجے

کہیں سُولی نہ سمجھ لے کوئی   اپنی بانہوں کو نہ کھولا کیجے

سوچیے پھول کھِلا ہے کیا کیا   صورتِ رنگ نہ دیکھا کیجے

اتنی فرصت بھی کسے ہے لیکن   گاہے گاہے ہمیں پوچھا کیجے

ہر کوئی منہ میں زباں رکھتا ہے   روکتا کون ہے، بولا کیجے

یہ بھی انداز ہے اِک چھُپنے کا   اس قدر پاس نہ آیا کیجے

آنے لگتی ہے شکستوں کی صدا   ایسے خاموش نہ بیٹھا کیجے

ربط بھی رکھتا ہے معنی اپنے   بات بے بات نہ ٹوکا کیجے

حشمی غم نے پھر انگڑائی لی
حشمی پھر غزل، انشا کیجے

جلیل حشمی



جو شکوہ کرتے ہیں حشمؔی سے کم نمائی کا
اُنہیں بھی ڈر ہے زمانے کی کج ادائی کا

پھرے ہیں دُھوپ میں سائے کو ساتھ ساتھ لئے
کہ کھل نہ جائے بھرم اپنی بے نوائی کا

مگر کچھ اور ہے یاری کی بات، شوق سے تم
لگاؤ چہر دل پہ الزام آشنائی کا

عرق عرق تھے ندامت کی آنچ سے خود ہی
گلہ کریں بھی تو کیا تیری بے وفائی کا

کچھ اس ادا سے ستائے گئے ہیں ہم اب کے
ہر ایک سانس میں انداز ہے دہائی کا

چلا تو ہوں ترے ہمراہ، کچھ قدم ہی سہی
جو دے تو کیوں مجھے طعنہ شکستہ پائی کا

جو اپنے در پہ صدا دی تو کیا ملا پیارے
یہی کہ نام ڈبو آئے ہم گدائی کا

نکل پڑے ہو اُسے ڈھونڈنے مگر حشمؔی
یہ راستہ ہے مری جان، نارسائی کا

جلیل حشمی



کہی نہ اُن سے جو ہونٹوں پہ بات آئی بھی
کہ آشنائی بھی تھی، شرمِ آشنائی بھی

کوئی طلب تھی تو دستِ سوال پھیلاتے
مگر ملی تھی کہاں صورتِ گدائی بھی

کہو ہوا سے چلے آج رات تھم تھم کر
کہ آگ ہے مرے دامن میں کچھ پرائی بھی

ترے کرم کے فسانے تو شہر بھر سے کہے
ترے ستم کی کہاں جا کے دیں دہائی بھی

تری صدا پہ گماں دھڑکنوں کا ہوتا تھا
عجب تھا اب کے سکوتِ شبِ جدائی بھی

تمہاری ہم سفری کے بھی تھے بہت احساں
ہوئی ہے وجہِ ندامت شکستہ پائی بھی

نظر بجھی تو ملے روشنی کہاں حشمی
جلا کے شمع، بہت آنکھ سے لگائی بھی



خاک ان گلیوں کی، پلکوں نے بہت چھانی تھی
پھر بھی صورت مری، اس شہر میں انجانی تھی

ہم بھی کچھ اپنی وفاؤں پہ ہوئے تھے نادم
ان کو بھی ترکِ تعلق پہ پشیمانی تھی

خود فریبی تو الگ بات ہے ورنہ ہم نے
اپنی صورت کہاں آئینے میں پہچانی تھی

زندگی سنگ بنی تھی، تجھے رخصت کر کے
دل نہ دھڑکا تھا تو مرنے میں بھی آسانی تھی

حادثہ سخت تھا، جانکاہ تھا، اب کے یارو
ورنہ ہم نے تو کبھی ہار نہیں مانی تھی

رہ گئی راہ میں یوں شرمِ شکستہ پائی
کیا ٹھہرتے کہیں، وہ بے سر و سامانی تھی!

نارسائی کوئی کس آنکھ سے دیکھے اپنی
ہم بھی ٹوٹے ہوئے پر رات بھی طوفانی تھی

گُل ہوئی شمع تو دامن بھڑک اُٹھا حشمی
جب نظر بجھ گئی، ویرانی ہی ویرانی تھی

جلیل حشمی



اتنے تنہا ہیں کہ اب پھرتے ہیں ہم دھوپوں میں
ساتھ سایا ہو تو کچھ بات کریں رستوں میں

اے بہار! اس کو نہ دے سایۂ گُل میں آواز
ہے ہوائے چمنی اُڑتے ہوئے پتّوں میں

تو دکھائی نہیں دیتا تو شکایت کیسی
تیری آواز تو آتی ہے مری سانسوں میں

میرا چہرہ کسی اُجڑے ہوئے گھر کی صورت
اور دُھواں بُجھتے چراغوں کا مری آنکھوں میں

آ دکھاؤں تجھے میں اپنا گلستاں پیارے
کس قدر پھولوں کے چہرے ہیں مرے زخموں میں

کیوں مٹا دی ہے بنا کر مری ہیرے کی لکیر
سنگ ڈھونا ہی جو لکھا تھا مرے ہاتھوں میں

اے "پشاور"! میں مسافر تو نہیں ہوں لیکن
سر جھکائے ہوئے پھرتا ہوں تری گلیوں میں

کب تری آنکھ میں تھی کرب کی یہ لَو حشمی
تھی کہاں چوٹ کی آواز تری باتوں میں



لوگ کیوں ہم سے شکایت کی توقع رکھیں
ہیں خود آزار بھی اتنے کہ ستم گر رُوئیں

اب تو آتی ہیں کچھ اس طرح تمہاری یادیں
دھوپ میں جیسے کسی چہرے سے بادل گزریں

ماتمِ غنچہ میں رُوٹھے ہیں ندامت ہے بہت
شدّتِ غم میں رہا پاسِ تبسّم نہ ہمیں

اب غمِ دل کا سفینہ ہے کہ دریا مانگے
اور یہ رونا ہے کہ آنسو بھی نہیں آنکھوں میں

ہم سے لپٹی ہوئی تلوار ہو جیسے یارو
اک نیا زخم سُلگتا ہے جو کروٹ بدلیں

تجھ کو دیکھا جو نہ ہوتا تو خدا کہہ لیتے
یہ بھی مشکل نظر آتا ہے کہ پیغمبر پُوجیں

وہ کرم ہے ترا سانسوں میں سنائی دینا
یہ ستم ہے کہ تجھے ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں

حشمی جسم نظر آتا ہے سُولی کی طرح
جب مسیحا کے لئے پیار سے بازو کھولیں

جلیل حشمی



شاخچۂ خاکِ گلستاں میں پڑا ہے یارو
اس سے احسانِ بہاراں نہ اُٹھا ہے یارو

تم نے پوچھا ہے، نہ کچھ ہم نے کہا ہے یارو
حادثہ ہم پہ جو گزرا ہے تو کیا ہے یارو

کر گیا خاک ہمیں رخصتِ گل کا منظر
زخمِ نظارہ مگر اب بھی ہرا ہے یارو

مریمِ شام، کھلے بال پھر آتی، دیکھو
پھر مسیحا کوئی سُولی پہ چڑھا ہے یارو

رات اندھیری سہی، مایوس نہیں نور سے ہم
اشک پلکوں پہ ابھی کانپ رہا ہے یارو

اب ہری شب مرے اشکوں سے رہے گی روشن
شام کے وقت دیا میرا بُجھا ہے یارو

سامنے آتے ہو اب اجنبیوں کی صورت
یہ بھی شاید کوئی یاری کی ادا ہے یارو

پاؤں ہیں خاک پہ خورشید پہ سایہ اُس کا
حشمی کھوج میں یہ کس کی چلا ہے یارو



سانس لیجے، تو بکھر جاتے ہیں جیسے غنچے
اب کے آواز میں بجتے ہیں خزاں کے پتے

چڑھتے سورج پہ پڑیں سائے ہم آواروں کے
وہ دیا اب کے ہتھیلی پہ جلا کر چلیے

شام کو گھر سے نکل کر نہ پلٹنے والے!
در و دیوار سے سائے ترے رخصت نہ ہوئے

بے وفا کہہ کے تجھے اپنا بھرم کیوں کھولیں
اے سبک گام! ہمیں رہ گئے تجھ سے پیچھے

وا ہو آغوشِ محبت سے جو تنہائی میں
ایسا لگتا ہے کہ ہم پر کوئی سُولی اُترے

بات کرتے ہیں تو گونج اٹھتی ہے آوازِ شکست
اور قدم رکھیں تو گلیوں کی زمیں بج اُٹھے

صدیوں میں بھی جو گذاریں تو نہ گذرے یارو
ہائے وہ لمحہ کہ جس میں کوئی پیار اُجڑے

حشمی گھر کے ستونوں سے لپٹ کر رونا
بے نوائی کے یہ انداز کہاں تھے پہلے

جلیل حشمی



میں خدا بھی تو نہیں، کیوں مجھے تنہا لکھ دے
اب مرے نام کی سُولی پہ مسیحا لکھ دے

ایسے سنّاٹے سے بہتر ہے شکستوں کی صدا
میری مٹّی میں اک اڑتا ہُوا پتّا لکھ دے

دے وہ عُنواں کہ ضرورت نہ کہانی کی پڑے
باغباں! سینے پہ خاکسترِ غنچہ لکھ دے

رات بھر تیرے اُجالوں کی قسم کھاؤں میں
تُو سرِ شام مری شمع کا بُجھنا لکھ دے

ہو چکے خشک مری آنکھ کے چشمے کب کے
سامنے دشت ہے اک ابر کا ٹکڑا لکھ دے

پھول کا ذکر بھی کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے
پھر نہ تُو میری زباں پر کہیں کانٹا لکھ دے

داغ اس ایک کلی کا نہ مِٹے گا ہرگز
میری جھولی میں اگر باغ بھی سارا لکھ دے

سانس لیتے ہوئے راکھ اُڑتی ہے اب چہرے پر
نہ بُجھا آگ مگر ساتھ ہی چشمہ لکھ دے

بے وفائی کی شکایت اسے کیا لوگوں سے
جس کی راہوں میں تو بچھڑا ہوا پیارا لکھ دے

اب تو اس آس پہ جیتے ہیں کہ شاید حشمی
لکھنے والے نے جو اب تک نہیں لکھا لکھ دے



حشمی تربتِ غنچہ سے پلٹ آئے ہیں
خارِ صحرائی بھی تلووں سے لگا لائے ہیں

دھوپ کے دشت میں پھرتے ہیں مگر گھر کی قسم
اب بھی لپٹے ہوئے سرتا بقدم سائے ہیں

یہ نہ پوچھو کہ بہاروں کا بھرم کھلتا ہے
ہم نے کیا دیکھا ہے گلشن میں جو گھبرائے ہیں

گھر کا بس اتنا تصوّر ہے ترے جانے پر
در سے لپٹے ہیں تو دیوار سے ٹکرائے ہیں

مطمئن ہیں کہ ملا کچھ تو ہمیں گلشن میں
پھول ڈھونڈے ہیں بہت زخم بہت کھائے ہیں

اپنے سائے میں نظر آئی ہے سُولی حشمی
پیار سے ہم نے جو بازو کبھی پھیلائے ہیں

احمد ظفر



پھول کی رنگت میں نے دیکھی، درد کی رنگت دیکھے کون
پیار کا گیت سُنا ہے سب نے، دھن تھی کیسی سوچے کون

دھوپ نے تن من پھونک دیا تو سائے میں آ بیٹھا تھا
شاخ شاخ میں آگ چھپی ہے، پیڑ کے نیچے بیٹھے کون

اپنے درد کو گرد سمجھ کر منزل منزل چھوڑ دیا
آئینے پر دھول جمی ہے، آئینے میں دیکھے کون

انگ انگ سے رنگ رنگ کے پھول برستے دیکھے ہیں
رنگ رنگ سے شعلے برسے، کیسے برسے سوچے کون

فن ترتیب کا زیور لے کر گلشن گلشن ابھرا ہے
بے ترتیبی حُسن ہے جس کا، اس فنکار سے اُلجھے کون

میرے کوٹ کا میلا کالر اور نمایاں ہوتا ہے
بانکی سج دھج رکھنے والے تیرے سامنے بیٹھے کون

کتنی ویراں ویراں آنکھیں آس لگائے بیٹھی ہیں
چشموں سے سیراب ہوئے سب، بند کنوؤں میں جھانکے کون

احمد ظفر



وہ پھول جو مسکرا رہا ہے ۔۔۔ شاید مرا دل جلا رہا ہے
چھپ کر کوئی دیکھتا ہے مجھ کو ۔۔۔ آنکھوں میں مگر سما رہا ہے
میں چاند کے ساتھ چل رہا ہوں ۔۔۔ وہ میری ہنسی اڑا رہا ہے
شاید کسی دَور میں وفا تھی ۔۔۔ یہ دَور تو بے وفا رہا ہے
سو رنگ ہیں زندگی کے لیکن ۔۔۔ انسان فریب کھا رہا ہے
تصویر بنے تو مجھ سے کیسے؟ ۔۔۔ ہر نقش مجھے مٹا رہا ہے
جو لمحہ پیام ہے فنا کا ۔۔۔ چپ چاپ قریب آ رہا ہے
طوفاں نے بھی آنکھ کھول دی ہے ۔۔۔ ساحل بھی نظر بچا رہا ہے
فن کار کہوں اسے تو کیسے ۔۔۔ تخلیق کو جو مٹا رہا ہے
تقدیر مٹا چکی تھی جس کو ۔۔۔ تدبیر کا راز پا رہا ہے
آواز سے آگ لگ رہی ہے ۔۔۔ مطرب ہے کہ گیت گا رہا ہے
احساس شکست و کامرانی ۔۔۔ آئینے کئی دکھا رہا ہے

وہ خاک نشیں ظفرؔ ہے یارو
جو سوئے فلک بھی جا رہا ہے

احمد ظفر



تنہائی نے پر پھیلائے، رات نے اپنی زلفیں
پلکوں پر ہم تارے لیکر چاند کا رستہ دیکھیں

یہ دنیا ہے، اس دنیا کا رنگ بدلتا جائے
اس پربت سے پاؤں پھسلے، جس پربت کو چھو لیں

کیسے پیاس بجھاتے، دریا ریت کا دریا نکلا
لہر لہر میں موج چھپی تھی، جھونکے میں تھیں آنکھیں

جس کو من کا میت بنایا، آخر دشمن ٹھہرا
کس کس کو ہم میت بنائیں، کس کس سے ہم الجھیں

لوہا سونا بن سکتا ہے، پتھر ہیرا موتی
سوچ سمجھ کی بات ہے ساری، کچھ سوچیں، کچھ سمجھیں

اپنا درد بھلا دیں اے دل، اس کے درد کی خاطر
اپنے گھاؤ یاد نہ آئیں، چاند کا گھاؤ دیکھیں



ترس رہا ہوں قرارِ دل و نظر کے لئے
سکوتِ شب میں دعا جس طرح، سحر کیلئے

میں خاکِ راہگزر ہوں کہ مسندِ گل ہوں
اک اضطرابِ مسلسل ہے، عمر بھر کے لئے

شجر کہ جن سے اداسی ٹپکتی رہتی ہے
یہ سنگِ میل ہیں شاید، مری نظر کے لئے

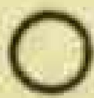
جمالِ دوست کو مشعل بنا لیا میں نے
وفا کہ رخصتِ سفر ہے مرے سفر کے لئے

ترے خیال کا ایواں لہو سے روشن ہے
مری نظر کا اجالا ہے رہگذر کے لئے

شکست، جس سے زمانہ لرزتا رہتا ہے
وہی نوید مسرت بھی ہے ظفر کے لئے



یہ تیرا خیال ہے کہ تو ہے
جو کچھ بھی ہے میری آرزو ہے
دل پہلو میں جل رہا ہے جیسے
یہ کیسی بہارِ رنگ و بو ہے
تقدیر میں شب لکھی گئی تھی
کہنے کو یہ زلف مشکبو ہے
وہ دستِ خزاں سے بچ گیا ہے
جس پھول میں رنگ ہے نہ بو ہے
پتھر کو تراش کر بھی دیکھو
یہ فن بھی خدا کی جستجو ہے
پردیس ہے شہر، شہر میرا
اغیار کی جس میں آبرو ہے
تقدیس کے سر میں خاک دیکھی
تہذیب کے ہاتھ میں سبو ہے
میں جینے سے تنگ آ گیا ہوں
اے موت ثبوت دے کہ تو ہے
دیکھو تو ظفر کہاں ہے یارو
دیوانے کا ذکر کو بہ کو ہے



اک تصور تو ہے، تصویر نہیں
خواب ہے، خواب کی تعبیر نہیں
یہ رہائی کی تمنا کیا ہے
جب مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
صبح میری طرح آباد نہیں
شام میری طرح دلگیر نہیں
کیوں ابھر آیا تری یاد کا چاند
جب اجالا مری تقدیر نہیں
سنگ میں پھول کھلانے والو
فن یہاں باعثِ توقیر نہیں
بات کہنے کا سلیقہ ہے غزل
شاعری حسن ہے، تقریر نہیں
دل اسی آگ میں جلتا ہے ظفر
ہائے جس آگ میں تنویر نہیں



جنگل کا سناٹا، میرا دشمن ہے
پھیلا صحرا دیدہ و دل کا دشمن ہے

جسم کی اوٹ میں گھات لگائے بیٹھا ہے
موسمِ گل بھی ایک انوکھا دشمن ہے

نقشِ وفا میں رنگ وہی ہے دیکھو تو
جس کی دنیا، جو دنیا کا دشمن ہے

ساحلِ مرگ پہ رفتہ رفتہ لے آیا
تنہائی کا روگ بھی اچھا دشمن ہے

چاند میں شاید پیار ملے گا انساں کو
اس بستی کا سایا سایا دشمن ہے

پتھر تو خاموش پڑے ہیں راہوں میں
آئینہ کیوں آئینے کا دشمن ہے

جس کو دشمن سمجھا وہ تو چھوڑ گیا
جس کو اپنا جانا گہرا دشمن ہے



سیاہ رات کی ہر دل کشی کو بھول گئے
دیئے جلا کے ہمیں روشنی کو بھول گئے

کسی کلی کے تبسّم نے بے کلی دی ہے
کلی ہنسی تو ہم اپنی ہنسی کو بھول گئے

جہاں میں اور رہ و رسمِ عاشقی کیا ہے
فریب خوردہ تری بے رخی کو بھول گئے

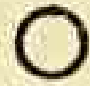
یہی ہے شیوۂ اہلِ وفا زمانے میں
کسی کو دل سے لگایا، کسی کو بھول گئے

ذرا سی بات پہ دامن چھڑا لیا ہم سے
تمام عمر کی وابستگی کو بھول گئے

خدا پرست خدا سے تو لو لگاتے رہے
خدا کی شان، مگر آدمی کو بھول گئے

وہ جس کے غم نے غمِ زندگی دیا ہے ظفرؔ
اسی کے غم میں غمِ زندگی کو بھول گئے

احمد ظفر



آسماں کی آنکھ سورج ، چاند بینائی بھی ہے
روشنی میرے لئے کیوں وجہِ رسوائی بھی ہے

کس کو سینے سے لگاؤں میں، کسے اپنا کہوں
سیلِ رنگ و بو جسے کہتے ہیں، تنہائی بھی ہے

مصلحت اندیشۂ غم کو ذرا کم کر گئی
فلسفہ وہ جھوٹ، شامل جس میں دانائی بھی ہے

زہر آلودہ فضا میں جب کلی سونے لگی
اشکِ شبنم نے کہا، گلشن میں پروائی بھی ہے

فکر جیسے آئینہ در آئینہ روشن چراغ
تیرگی میرے لئے احساسِ رعنائی بھی ہے

منکشف ہوتے گئے ہم صورتِ سنگِ وجود
زندگی حسنِ عدم بھی، کارفرمائی بھی ہے

شعر کہنے کا سلیقہ ہے یہی احمد ظفرؔ
شاعروں نے بات سمجھی بھی ہے، سمجھائی بھی ہے



اس نے توڑا جہاں کوئی پیماں
مرحلے اور ہو گئے آساں

میر ہے کوئی ، کوئی ہے سلطاں
سوچتا ہوں کہاں گیا انساں

آندھیوں میں جلا گئے تھے چراغ
ہائے وہ لوگ بے سروساماں

فلسفی فلسفوں میں ڈوب گئے
آدمی کا لہو رہا ارزاں

ابر بن کر برس ہی جائے گا
کھیت سے جب اٹھا غمِ دہقاں

شعلۂ گل ہے زخمِ دل کی طرح
یہ چمن میں بہار ہے کہ خزاں

سینۂ سنگ میں بھی پھول کھلے
غمِ جاں بھی ہوا غمِ پنہاں

دل کی آزردگی نہ پوچھ ظفرؔ
بات میرے لئے ہے سنگِ گراں

غلام ربّانی تاباں



شوق کا تقاضہ ہے، شرحِ آرزو کیجے
دل سے عہدِ خاموشی، کیسے گفتگو کیجے

دل ہو یا گریباں ہو، روز چاک ہوتے ہیں
کیا جنوں کے موسم میں کوششِ رفو کیجے

عاشقی و خودداری، بندگی و خودبینی
آرزو کی راہوں میں خونِ آرزو کیجے

دادِ سعیِ پیہم کی کچھ تو دیجیے یعنی
تازہ تر شکستوں سے دل کو سرخ رو کیجے

پائے شوق میں کب تک راستوں کی زنجیریں
صورتِ صبا چلیے، سیرِ چار سُو کیجے

ق

ہے خلوص کا مسلک دشمنِ اثر آخر
جو نہ ہو مقدر میں اس کی جستجو کیجے

بزمِ جام و مینا میں دادِ تشنگی دیجے
موسمِ بہاراں میں حسرتِ نمو کیجے

کیا عجب کہ بر آئے، دل کی آرزو تاباںؔ
سیرِ کوئے قاتل کی آپ بھی کبھو کیجے

غلام ربانی تاباں



منزلوں سے بیگانہ آج بھی سفر میرا
رات بے سحر میری، درد بے اثر میرا
گمرہی کا عالم ہے، کس کو ہم سفر کہیے
تھک کے چھوڑ بیٹھی ہے ساتھ رہگزر میرا
وہ فروغِ خلوت بھی، انجمن سراپا بھی
بھر گیا ہے پھولوں سے دامنِ نظر میرا
اب ترے تغافل سے اور کیا طلب کیجیے
شوق نارسا میرا، عشق معتبر میرا
دورِ کم عیاری ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا
کون میرا قاتل ہے، کون چارہ گر میرا
ناگزیر ہستی ہیں فصلِ گل کے ہنگامے
شورشِ نمو تیری، فتنۂ شرر میرا
کچھ بتاؤ تو آخر کیا جواب دوں اُس کو
اک سوال کرتا ہے روز مجھ سے گھر میرا
آسماں کا شکوہ کیا، وقت کی شکایت کیوں
خونِ دل سے نکھرا ہے اور بھی ہُنر میرا
دل کی بے قراری نے ہوش کھو دیئے تاباںؔ
ورنہ آستانوں پر کب جھکا تھا سر میرا



ہر ستم لطف ہے، دل خوگرِ آزار کہاں
سچ کہا تم نے، مجھے غم سے سروکار کہاں

دشت و صحرا کے کچھ آداب ہوا کرتے ہیں
کیوں بھٹکتے ہو، یہاں سایۂ دیوار کہاں

بادۂ شوق سے لبریز ہے ساغر میرا
کیسے افکار، مجھے فرصتِ افکار کہاں

کیوں ترے دور میں محرومِ سزا ہوں کہ مجھے
جرم پہ ناز سہی، جرم سے انکار کہاں

رہروِ شوق ہے بیگانۂ منزل، ورنہ
کوچۂ دار کہاں، کوچۂ دلدار کہاں

سوچتے کیا ہو، جلاتے رہو زخموں کے چراغ
دیکھتے کیا ہو، ابھی صبح کے آثار کہاں

تم کو چاہا تھا مگر تم بھی وفادوست نہیں
دل پہ تکیہ تھا مگر دل بھی وفادار کہاں

یوں تو ہر گام پہ غمخوار ملے ہیں تاباںؔ
جو مرے غم کو سمجھ پائے وہ غمخوار کہاں



مٹے گا درد تو درماں کی آرزو ہو گی
تمام عمر غرض صرف جستجو ہو گی

پھر آج دل سے مخاطب ہے شب کا سناٹا
پھر آج صبح تلک ان کی گفتگو ہو گی

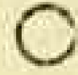
جنوں کا شغل سلامت، رفو کی فکر نہ کر
کسے خبر ہے کہ کب فرصتِ رفو ہو گی

ابھی جلیں گے یہاں اور بے رخی کے چراغ
اس انجمن میں وفا اور رسمِ خرد ہو گی

چلے گی بات جہاں تیری کج ادائی کی
مری وفا بھی تو موضوعِ گفتگو ہو گی

بچیں گے برقِ حوادث سے آشیاں کب تک
کہ تیز تر ابھی تحریکِ رنگ و بو ہو گی

ملیں گے راہ میں ایسے بھی ہمسفر تاباںؔ
قدم قدم جنہیں منزل کی جستجو ہو گی



لطف یہ ہے جسے آشوبِ جہاں کہتا ہوں
اسی ظالم کو فروغِ دل و جاں کہتا ہوں

غیر کا ذکر ہی کیا، مفت میں الزام نہ دو
دل کی ہر بات میں تم سے بھی کہاں کہتا ہوں

کسی مجبور کے ہونٹوں پہ جو آ جاتا ہے
اس تبسم کو میں اعجازِ فغاں کہتا ہوں

نہ میں زندانیٔ صحرا نہ اسیرِ گلشن
کوئی بندش ہو، اسے جی کا زیاں کہتا ہوں

دل شکستہ ہی سہی، مایوس نہیں ہوں اے دوست
میں کہ ہر دور کو دورِ گزراں کہتا ہوں

حسن کا شیوۂ پیماں شکنی اچھا ہے
پھر بھی ہر سانس کو چشمِ نگراں کہتا ہوں

کوئی حد ہے مری آشفتہ سری کی تاباں
ان کی زلفوں کو چراغوں کا دھواں کہتا ہوں



ایک تم ہی نہیں دنیا میں جفاکار بہت
دل سلامت ہے تو دل کے لئے آزار بہت

ہائے کیا چیز ہے محرومیٔ غم کا رشتہ
مل گئے زیست کے ہر موڑ پہ غمخوار بہت

یادِ احباب کی خوشبو سے مہکتی شامیں
کچھ کہو، ہوتی ہیں کمبخت دل آزار بہت

عشق آوارہ کہاں، قیدِ در و بام کہاں
بے نواؤں کے لئے سایۂ دیوار بہت

دل کی رفتار بدل جاتی تھی آواز کے ساتھ
یاد آتا ہے وہ پیرایۂ گفتار بہت

ایک دن وقت بتائے گا جنوں کی عظمت
یوں تو ہم لوگ ہیں رسوا سرِ بازار بہت

وہ کشاکش ہے کہ جینا بھی ہے دوبھر تاباں
عشق معصوم بہت، حسن فسوں کار بہت



دورِ طوفاں میں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
دور ساحل سے کسی موجِ گریزاں کی طرح

دل کی وادی میں ترا درد برستا ہی رہا
ابرِ نیساں کی طرح ، ابرِ بہاراں کی طرح

فاصلے وقت میں تبدیل ہوئے جاتے ہیں
زندگی رقص میں ہے گردشِ دوراں کی طرح

دل کی تسکین کو مانگے کا اجالا کہیئے
رات اک شوخ کی یاد آئی تھی مہماں کی طرح

آرزو اور زمانے کی کشاکش سے گریز
زندگی اور چراغ تہِ داماں کی طرح

گر نہ ہو خاطرِ نازک پہ گراں تو کہہ دوں
بات بھی دل میں اتر جاتی ہے پیکاں کی طرح

ق

ایک تصویر بنی سرحدِ اظہار سے دور
نطق حیراں ہے مرے دیدۂ حیراں کی طرح

چاند نکھرا ہے تری لوحِ جبیں کی صورت
رات بکھری ہے تری زلفِ پریشاں کی طرح

کس نے ہنس ہنس کے پیا زہرِ ملامت پیہم
کون رسوا سرِ بازار ہے تاباںؔ کی طرح



دل وہ کافر کہ صدا عیش کا ساماں مانگے
زخم پا جائے تو کمبخت نمکداں مانگے

لطف آئے جو کوئی سوختہ سامانِ بہار
خالقِ رنگ سے پھر شعلۂ عریاں مانگے

حسرتِ دید سرِ بام تماشہ چاہے
عشقِ بے تاب سرِ طور چراغاں مانگے

رات زلفوں سے کرے شوخ اندھیروں کا سوال
روشنی لوحِ جبیں سے مہِ تاباں مانگے

اک چراغ اور سرِ رہگزرِ باد سہی
چار تنکوں کے لئے کون گلستاں مانگے

کم نگاہی کا تقاضہ ہے کہ پھر جرأتِ شوق
خود تری شوخیِ انداز سے عنواں مانگے

دستِ وحشت کے کوئی حوصلے دیکھے تاباںؔ
جب بھی مانگے تو اسی شوخ کا داماں مانگے



نمو کے فیض سے رنگِ چمن نکھر سا گیا
مگر بہار میں دل شورشوں سے ڈر سا گیا

جفائے دوست بہت سازگار آئی ہے
خراب ہو کہ یہ دل اور کچھ سنور سا گیا

نجانے بادِ صبا کیا پیام لائی تھی
کہ پھول ہنس تو دیا، پھر بھی منہ اتر سا گیا

بہ فیضِ شوق یہ دن دیکھنا نصیب ہُوا
کہ سر سے درد کا طوفاں گزر گزر سا گیا

طلسمِ بزم، فسونِ جمال، سحرِ شباب
نگاہِ شوق کا دامن گلوں سے بھر سا گیا

وہ شام ہو گئی منسوب اُنکی یاد کے نام
چراغ جل سا گیا، داغِ دل ابھر سا گیا

وہ ایک شوخ کا اندازِ گفتگو تاباںؔ
جگر میں طنز کا نشتر اُتر اُتر سا گیا



سوادِ غم میں کہیں گوشۂ اماں نہ مِلا
ہم ایسے کھوئے کہ پھر تیرا آستاں نہ مِلا

غموں کی بزم کہ تنہائیوں کی محفل تھی
ہمیں وہ دشمنِ تمکیں کہاں کہاں نہ مِلا

عجیب دَورِ ستم ہے کہ دل کو مدت سے
نویدِ غم نہ مِلی، مژدۂ زیاں نہ مِلا

کسے ہے یاد کہ سعی و طلب کی راہوں میں
کہاں مِلا ہمیں تیرا نشاں، کہاں نہ مِلا

اِدھر وفا کا گلہ ہے کہ دل لہو نہ ہوا
اُدھر ستم کو شکایت کہ قدرداں نہ مِلا

لبوں کو نطق کا اعجاز تو مِلا تاباںؔ
مگر سکوت کا پیرایۂ بیاں نہ مِلا

منظورؔ عارف



بولتی آنکھیں دیکھیں، جاگتے لب دیکھیں
جو صُورت ہم نے دیکھی ہے، سب دیکھیں

جانے فضا میں کب چلتی ہے موجِ ہوا
بادل ہٹ کر چاند دکھائے کب، دیکھیں

آنکھیں بند کریں تو کیا کیا جلوے ہیں
ہر سُو گھور اندھیرے لپکیں، جب دیکھیں

چندا چمکے، کلیاں چٹکیں، پھُول کھِلیں
جس دن اُس کو دیکھیں، خواب عجب دیکھیں

جسم اک راہگزر ہے، دل مٹی کا دِیا
گُل ہوتا ہے کب یہ چراغِ شب، دیکھیں

شاید نورِ سحر پھیلا ہو اب ہر سُو
عارفؔ! دل پر پتھر رکھ کر اب دیکھیں

منظور عارف



کچھ راز ہیں ایسے جو خبر تک نہیں پہنچے
ایسے بھی ہیں جلوے جو نظر تک نہیں پہنچے

اِک لمحے کو آیا تھا سرِ بزم وہ خوش رُو
جو گھر سے گئے دیکھنے ، گھر تک نہیں پہنچے

چھوٹے تھے جو قامت میں جنہیں جھک کے مِلا تھا
اُن ہاتھوں کے پتھر مرے سر تک نہیں پہنچے

اس گرد سے نِکلو کہ سفر کا کریں آغاز
یارو ! تم ابھی راہگزر تک نہیں پہنچے

ہر چند کہ در چھوڑ کے تیرا ، ہوئے رُسوا
لیکن کبھی ہم غیر کے در تک نہیں پہنچے

کیا جانئے کن لوگوں کی قسمت میں ہوں عارف
وہ پھل جو ابھی شاخِ شجر تک نہیں پہنچے

منظور عارف



غمِ دوراں بھی نہیں ہے، غمِ جاناں بھی نہیں
سخت مشکل میں ہے اب دل کہ غمِ جاں بھی نہیں

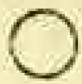
مجھ سے ناراض ہیں سب جانِ جہان و جاناں
میں کہ دل سے بھی جدا شئے ہوں، پریشاں بھی نہیں

دل نے کچھ اور کہا، عقل نے کچھ اور کہی
سُن کے دونوں کی نہ مانی کہ میں ناداں بھی نہیں

حدِ امکانِ تصور میں سہی میرا سراغ
لیکن اے دل! مجھے اب ڈھونڈنا آساں بھی نہیں

ایک وہ دن کہ تری دید پہ قرباں تھی نگاہ
ایک یہ دن کہ ترے وصل کا ارماں بھی نہیں

جانے کس خطۂ افلاک سے اُترا عارفؔ
جو اِک انسان کی صورت بھی ہے، انساں بھی نہیں



منظر جھلکتے چاند کا کتنا حسین تھا
اس کی قبا کی طرح وہ بادل جبین تھا

حیراں ہے مجھ کو دیکھ کے کیوں ٹوٹتا درخت
میں اُگ رہا ہوں اب کہ میں "زیرِ زمین" تھا

اب کھُل گیا ہے مجھ سے تو حد سے گزر گیا
ورنہ وہ دیکھنے میں تو بے حد متین تھا

میں ہوشمند رہ کے بھی نادان ہی رہا
جذبات میں وہ بہہ کے بھی کتنا ذہین تھا

تجھ کو رہا نہ اپنے زرِ غم کا اعتماد
ورنہ یہ دل تو دردِ جہاں کا امین تھا

عارفؔ! زباں اس کی نہ دیتی تھی دل کا ساتھ
انکار کر کے آئے گا، مجھ کو یقین تھا

منظور عارف



میں جن بلندیوں پہ تھا، جن سے گرا بھی تھا
میرا خیال ہے کہ وہاں پر خدا بھی تھا

اُترا زمیں پہ تو نگاہیں چمک اٹھیں
یہ حسن گرچہ خلد سے کم تھا، جُدا بھی تھا

اُس نے زمیں پہ بھی نہ جینے دیا مجھے
یہ شیوۂ سزا کہ خدا کو روا بھی تھا

پیشِ نظر تھا حضرتِ آدم کے، جو شجر
تھی لذتِ ثمر تو خیالِ بقا بھی تھا

شاید کہ سوچتا بھی ہو میرے لیے وہ حُسن
مجھ کو نکال کر جو مجھے دیکھتا بھی تھا

کیوں اُس نے عرش و فرش پہ اپنا لیا مجھے
کیا مجھ سا دو جہاں میں کوئی دوسرا بھی تھا

عارفؔ! وہ کر رہا تھا تبسم بھی زیرِ لب
جب عالمِ عتاب میں مجھ سے خفا بھی تھا



کیسے آ پہنچی ہے گلشن کی ہوا زنداں میں
دل کا جو زخم تھا، اِک پھول بنا زنداں میں

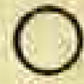
ایسا دلکش تھا کہ تھی موت بھی منظور ہمیں
ہم نے جس جرم کی کاٹی ہے سزا زنداں میں

میں گلستاں میں بھی تنہا تھا مگر دید تو تھی
کیسا بے یار و مددگار ہوا زنداں میں

میں نے تنہائی سے تنگ آ کے اُسے یاد کیا
اب مرے ساتھ ہی رہتا ہے خدا زنداں میں

وہ جو گلشن میں مرے غم کا مداوا نہ ہوا
چاند نکلا تو اُسے یاد کیا زنداں میں

آج جب آنکھ کھلی ہے تو فضا ہے خاموش
صبحدم کون سوئے دار گیا زنداں میں



پایاب موج اُٹھی تو سر سے گزر گئی
اِک سروِ قد جوان کی دستار اُتر گئی

کرنے لگا تھا غرق سمندر جہان کو
طوفاں ہی موجزن تھا جہاں تک نظر گئی

اُس تیرگی میں برق کی شوخی عجیب تھی
آباد وہ ہوا جسے ویران کر گئی

سوئے بدن کے بحر میں جاگی تھی خوں کی لہر
جب چڑھ کے سر تک آئی تو جانے کدھر گئی

صحنِ چمن میں دل کے لہو کی ہر ایک بوُند
پتے کو پھول، شاخ کو تلوار کر گئی

ناصح نے کوئے یار کا رستہ بھلا دیا
اچھا ہوا کہ حسرتِ دیدار مر گئی



ہے آرزو کہ اور تو کیا خود خدا نہ ہو
جب وہ ہو میرے پاس کوئی دوسرا نہ ہو

دیوار سے کہی تھی جو اُس تک پہنچ گئی
اس بات پر ہی مجھ سے کہیں وہ خفا نہ ہو

آہٹ بھی کوئی پا نہ سکے گھر سے یوں نکل
ہر سمت دیکھ بھال، کوئی دیکھتا نہ ہو

سایہ بھی ساتھ دے کے نہ جا کوئے یار میں
ہم زاد بھی سفر میں کہیں رُونما نہ ہو

وہ راہ کر تلاش کہ جو سنگلاخ ہو
ڈھونڈے کوئی تو تیرا کہیں نقشِ پا نہ ہو

ممکن کہاں کہ آخرِ شب در پہ ہو کوئی
دستک سی ہو رہی ہے جو باہر ہوا نہ ہو

منظور عارف



جرسِ دل کی صدا بن کے چلے
تُو اگر راہنما بن کے چلے

موجِ بے مایہ کی رفتار چلوں
تُو اگر آبلہ پا بن کے چلے

آرزو ہے کہ بنوں میں دریا
اور تُو مجھ پہ ہوا بن کے چلے

ایسے گلشن میں گزاروں کوئی شب
تُو جہاں بادِ صبا بن کے چلے

میں رہوں دشت میں جا کر اور تُو
چاندنی شب میں بلا بن کے چلے

عقل و دانش ترے قدموں پہ نثار
تُو اگر ہوش ربا بن کے چلے



اِس بحر میں ڈوب کیوں نہ جاؤں
کیوں موج نہ ایک اور اُٹھاؤں

میں قطرۂ آب سے بنا موج
کیا بحر کے اور کام آؤں

گر کوئی صدف قبول کرے
میں بن کے گہر اسے دکھاؤں

شاید کوئی لہر لینے آئے
ساحل کے قریب گھر بناؤں

تُو اپنے خیال میں مگن ہو
میں دُور سے کوئی گیت گاؤں

اشکوں کی جھڑی لگی ہوئی ہو
بھیگا ہوا تیرے پاس آؤں

اِک عمر کی داستانِ گریہ
دریا کے سوا کسے سناؤں

جمیل ملک



راہِ طلب میں آج یہ کیا معجزہ ہُوا
خوابِ عدم میں جو بھی گیا، جاگتا ہُوا

میداں میں ہار جیت کا یوں فیصلہ ہُوا
دنیا تھی اُن کے ساتھ، ہمارا خدا ہُوا

برسوں کی دوستی کا چلن کیا سے کیا ہُوا
کس منہ سے ہم ملیں گے اگر سامنا ہُوا

صدیوں کا درد، وقت کی آواز بن گیا
پھر سے بپا، وہ معرکۂ کربلا ہُوا

لایا ہے رنگ خونِ شہیداں بفیضِ شوق
نظروں کے سامنے ہے گلستاں کھلا ہُوا

پتھر بنے ہوئے تھے، زباں دے گیا ہمیں
احساس کی رگوں میں لہو بولتا ہُوا

راہیں سمٹ سمٹ کے نگاہوں میں آگئیں
جو بھی قدم اُٹھا، وہی منزل نما ہُوا

آنکھوں میں مشعلیں ہیں فروزاں دوام کی
دل میں ہے تیری یاد کا کانٹا چبھا ہُوا

ق

تو منزلِ حیات سے آگے نکل گیا
میں آ رہا ہوں تیرا پتہ پوچھتا ہُوا

جاں نذر کی تو دونوں جہاں مل گئے ہمیں
طے مرگ و زندگی کا ہر اک مرحلہ ہُوا

یوں دل میں آج نور کی بارش ہوئی جمیلؔ
جیسے کوئی چراغ جلا دے بجھا ہُوا

جمیل ملک



ڈھونڈتے پھرتے ہیں، زخموں کا مداوا نکلے
اس بھرے شہر میں کوئی تو مسیحا نکلے

اف یہ انبوہِ رواں، ہائے مری تنہائی
کہیں رستہ نظر آئے، کوئی تم سا نکلے

چاند سے چہروں پہ پتھرائی ہوئی زرد آنکھیں
کوئی بتلاؤ، یہ کس شہر میں ہم آ نکلے

پسِ دیوار کھڑا ہے کوئی تنہا کب سے
تو نہ نکلے، ترے گھر سے ترا سایا نکلے

جن پہ سو ناز کرے انجمن آرائی بھی
غور سے دیکھا تو وہ لوگ بھی تنہا نکلے

یہ ستاروں کے تڑپتے ہوئے سیمیں پیکر
جانے کب رات ڈھلے، نور کا دریا نکلے

چاند سورج سے بھی تاریکیٔ دوراں نہ گئی
دیکھئے پردۂ تخلیق سے اب کیا نکلے

جمیل ملک



جو خیال آیا ، تمہاری یاد میں ڈھلتا رہا !
دل چراغِ شام بن کر صبح تک جلتا رہا

ہم کہاں رُکتے کہ صدیوں کا سفر درپیش تھا
گھنٹیاں بجتی رہیں اور کارواں چلتا رہا

کتنے لمحوں کے پتنگے آئے ، آ کر جل بجھے
مَیں چراغِ زندگی تھا ، تا ابد جلتا رہا

حسن کی تابانیاں میرا مقدر بن گئیں
چاند میں چمکا ، کبھی خورشید میں ڈھلتا رہا

جانے کیا گزری کہ فرزانے بھی دیوانے ہوئے
میں تو شاعر تھا ، خود اپنی آگ میں جلتا رہا



کس کی محفل سے اُٹھ کے آیا ہُوں
اپنے گھر میں ہوں اور تنہا ہُوں

تو مری زندگی کی شام نہ بن
میں تری صبح کا اجالا ہُوں

چاند میں بستیاں بسا لینا
مجھ کو ڈھونڈھو ، کہ میں بھی دنیا ہُوں

جانِ امروز ، رونقِ فردا
کوئی سمجھے مجھے تو کیا کیا ہُوں

کیسے جھٹلائے گی مجھے دُنیا
مَیں کہ حالات کا تقاضا ہُوں

میری خوشبو سے بس رہے ہیں چمن
مَیں ہر اک شاخِ گل سے پیدا ہُوں

یہ جہاں مزرعِ تمنّا ہے
اور مَیں حاصلِ تمنا ہُوں

جمیل ملک



منہ بند حسرتوں کو سخن آشنا کرو

ترشو سکوتِ ساز، غزل ابتدا کرو

لاؤ کہیں سے سنگِ ملامت ہی کیوں نہ ہو

یارو شکستِ شیشۂ دل کی دعا کرو

معصوم لغزشوں کی بہت داد مل چکی

اب آشنائے غیر کے طعنے سنا کرو

ہارے ہوئے غرور پہ شرمندگی ہے کیوں

کس نے نہیں کہا تھا کہ دل کا کیا کرو

ناداں ہو، جہاں کا چلن دیکھتے نہیں

رسمِ جفا کو عام بنامِ وفا کرو

پھر کوئی جاں نواز، بہانہ تراش لو

پھر کوئی دلفریب انوکھی خطا کرو

مل جائے گا جبیں کو کوئی زخم، کوئی پھول

آؤ نہ تم بھی کوچۂ دل میں صدا کرو



دوستوں کے درمیاں بھی ہم کو تنہا دیکھتے

تم کبھی آتے، سرِ محفل تماشا دیکھتے

آئینہ خانوں میں کیا رکھا ہے حیرت کے سوا

کوچہ و بازار میں خونِ مسیحا دیکھتے

موت کو بھی ہم بنا لیتے متاعِ زندگی

قتل یوں ہوتے کہ سب دانا و بینا دیکھتے

قیس کی مانند کیوں تصویر بن کر رہ گئے!

پردۂ محمل اٹھا کر، دے کے لیلیٰ دیکھتے

میں تمہارے حسن کا بے ساختہ اظہار ہوں

اپنے آئینے میں میرا بھی سراپا دیکھتے

ڈھونڈنے نکلے ہیں تجھ کو ماورائے آب و گل

عمر گزری یم بہ یم، صحرا بہ صحرا دیکھتے

کیا یہ کم ہے، فرش سے تا عرش ہو آئے جمیل

چار دن کی زندگی میں اور کیا کیا دیکھتے

جمیل ملک



خوشبوئے پیرہن سے سلگتے رہے دماغ
آئی شبِ فراق تو گل ہو گئے چراغ

دل کی لگی، بھڑک کے نگاہوں تک آ گئی
پلکوں پہ شامِ وصل جلائے ہیں دل کے داغ

اس چشمِ مے فروش سے ہنگامِ ناؤ نوش
چھوٹا وہ سیلِ نور کہ لو دے اُٹھے ایاغ

وہ گل کھلیں کہ جن کی مہک لازوال ہو
اس ایک دن میں ہم نے سجائے ہیں کتنے باغ

آخر کھلا کہ تو ہے مرے گھر کی روشنی
یوں تو ترے بغیر بھی جلتے رہے چراغ

جب چشم و دل بجھے تو شبستانِ شوق میں
ہم نے ہتھیلیوں پہ جلائے ہیں شب چراغ

جو وادیٔ جمال میں گم ہو گئے جمیلؔ
اپنی طلب کے ساتھ ہی اُن کا بھی کچھ سراغ



لاکھ احساس ترا کشتۂ حالات رہے
ترے ہونٹوں پہ شگفتہ سی کوئی بات رہے

تو نے ہر دور میں الٹی ہے بساطِ عالم
آج یہ آخری بازی بھی ترے ہات رہے

یہ بھی ملنا ہے کہ بس مل کے بچھڑ جاتے ہیں
لطف تو جب ہے کہ اک عمر ملاقات رہے

کائنات ان کے لئے ایک سراب ایک خیال
جو نگہبانِ حرم محوِ غمِ ذات رہے

یوں سرِ بزم کوئی نغمۂ جاوید سنا
کہ ترے بعد بھی محفل میں تری بات رہے

کیا عجب ایک ہی منزل ہو ہماری اے دوست
راہ کٹ جائے گی، دونوں کا اگر ساتھ رہے

اپنا شیوہ کہ جلاتے ہیں اندھیروں میں چراغ
ان کی سازش کہ زمانے میں یونہی رات رہے

جو لگاتے رہے ہر حال پہ جاں کی بازی
کیوں جمیلؔ ان کے مقدر میں فقط مات رہے

لہ ساتھ

جمیل ملک



دل کی دل نے نہ کہی، یوں تو کئی بار ملے
ہم شناسا تھے مگر صورتِ اغیار ملے

اس سے کہنا کہ نہ اب اور وہ اترا کے چلے
دوستو تم کو اگر یارِ طرحدار ملے

بے وفا ہم ہیں تو لے جانِ وفا یونہی سہی
ڈھونڈ لینا جو تمہیں کوئی وفادار ملے

ہم تو دل دے کے بھی دنیا میں اکیلے ہی رہے
جو ہوس کار تھے، سب اُنکے طرفدار ملے

دل کی قیمت تو محبت کے سوا کچھ بھی نہ تھی
جو ملے، صورتِ زیبا کے خریدار ملے

ہم نے کانٹوں کو بھی سینے سے لگا رکھا ہے
خار بھی ہم سے بہ رنگِ گل و گلزار ملے

دوریاں، فاصلے، ہو جاتے ہیں طے آخرکار
سرِ گلزار جو بچھڑے تھے، سرِ دار ملے



تری جستجو میں نکلے، تو عجب سراب دیکھے
کبھی شب کو دن کہا ہے، کبھی دن میں خواب دیکھے

مرے دل میں اس طرح ہے تری آرزو خراماں
کوئی نازنیں ہو جیسے، جو کھلی کتاب دیکھے

جسے میری آرزو ہو، جو خراب کو بکو ہو
مجھے دیکھنے سے پہلے، تجھے بے نقاب دیکھے

جسے کچھ نظر نہ آیا ہو جہانِ رنگ و بو میں
وہ کھلا گلاب دیکھے، وہ ترا شباب دیکھے

دو جہاں کو لا ڈبوئے وہ ذرا سی آبجو میں
تری چشمِ سرمگیں کو جو کوئی پر آب دیکھے

یوں ٹھہر ٹھہر کے گزری شبِ انتظار یارو
کہ سحر کے ہوتے ہوتے کئی ہم نے خواب دیکھے

مجھے دیکھنا ہو جس کو مرے حال پہ نہ جائے
مرا ذوق و شوق دیکھے مرا انتخاب دیکھے

زہرا نگاہ



ترا خیال فروزاں ہے، دیکھیے کیا ہو
خموش گردشِ دوراں ہے، دیکھیے کیا ہو

نجانے کتنے ستارے یہ کہتے ڈوب گئے
سحر کا رنگ پریشاں ہے، دیکھیے کیا ہو

کلی اداس، چمن سوگوار، گل خاموش
یہ انتظارِ بہاراں ہے، دیکھیے کیا ہو

عجیب بات ہے ان تیرگی کی راہوں میں
نفس نفس میں چراغاں ہے، دیکھیے کیا ہو

بھڑک رہا ہے ابھی تک چراغِ آخرِ شب
اسے بھی صبح کا ارماں ہے، دیکھیے کیا ہو



چھلک رہی ہے مے ناب تشنگی کے لیے
سنور رہی ہے تری بزم برہمی کے لیے

نہیں نہیں، ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لیے

جہانِ نو کا تصور، حیاتِ نو کا خیال
بڑے فریب دیے تم نے بندگی کے لیے

مے حیات میں شامل ہے تلخیٔ دوراں
جبھی تو پی کے ترستے ہیں بے خودی کے لیے

کہاں کے عشق و محبت، کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

جو ظلمتوں میں ہویدا ہو قلبِ انساں سے
ضیا نواز وہ شعلہ ہے تیرگی کے لیے



یہ حکم ہے کہ اندھیرے کو روشنی سمجھو
ملے نشیب تو کوہ و دمن کی بات کرو

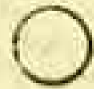
نہیں ہے مے نہ سہی، چشمِ التفات تو ہے
نئی ہے بزم، طریقِ کہن کی بات کرو

فریب خوردۂ منزل ہیں، ہم کو کیا معلوم
بہ طرزِ راہبری راہزن کی بات کرو

خزاں نے آ کے کہا میرے غم سے کیا حاصل
جہاں بہار لٹی اُس چمن کی بات کرو

قدم قدم پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ
انھیں بجھاؤ تو صبحِ وطن کی بات کرو

بہار آئے تو چپ چاپ ہی گزر جائے
نہ رنگ و بو کی، نہ سرو سمن کی بات کرو



خوش جو آئے تھے، پشیمان گئے
اے تغافل، تجھے پہچان گئے

خوب ہے صاحبِ محفل کی ادا
کوئی بولا تو بُرا مان گئے

کوئی دھڑکن ہے، نہ آنسو، نہ خیال
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے

تیری ایک ایک ادا پہچانی
اپنی ایک ایک خطا مان گئے

اس کو سمجھے کہ نہ سمجھے، لیکن
گردشِ دہر، تجھے جان گئے

زہرا نگاہ



جو دل نے کہی، لب پہ کہاں آئی ہے، دیکھو
اب محفلِ یاراں میں بھی تنہائی ہے، دیکھو

پھولوں سے ہوا بھی کبھی گھبرائی ہے، دیکھو
غنچوں سے بھی شبنم کہیں کترائی ہے، دیکھو

اب ذوقِ طلب وجہِ جنوں ٹھیر گیا ہے،
اب عرضِ وفا باعثِ رسوائی ہے، دیکھو

غم اپنے ہی اشکوں کا خریدار ہوا ہے
دل اپنی ہی حالت کا تماشائی ہے، دیکھو



رُک جا ہجومِ گل! کہ ابھی حوصلہ نہیں
دل سے خیالِ تنگیٔ داماں گیا نہیں

صد حیف! اس کے ہاتھ ہے ہر زخم کا رفو
دامن میں جس کے ایک بھی تارِ وفا نہیں

ہر آستاں پہ لکھا ہے اب نامِ شہر یار
وابستگانِ دل کے لیے کوئی جا نہیں

جو کچھ ہیں، سنگ و خشت ہیں یا گردِ رہگذر
تم تک جو آئے ان کا کوئی نقشِ پا نہیں

زهرا نگاه



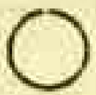
ہر آن ستم ڈھائے ہے، کیا جانیے کیا ہو
دل غم سے بھی گھبرائے ہے، کیا جانیے کیا ہو

کیا غیر کو ڈھونڈیں کہ ترے کوچے میں ہر ایک
اپنا سا نظر آئے ہے، کیا جانیے کیا ہو

آنکھوں کو نہیں راس کسی یاد کا آنسو
تھم تھم کے ڈھلک جائے ہے، کیا جانیے کیا ہو

اس بحر میں ہم جیسوں پہ ہر موجۂ پُرخوں
آ آ کے گذر جائے ہے، کیا جانیے کیا ہو

دنیا سے نرالے ہیں تری بزم کے دستور
جو آئے سو پچھتائے ہے، کیا جانیے کیا ہو

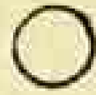


دل بجھنے لگا عارض و رخسار کے ہوتے
تنہا نظر آتے ہیں غمِ یار کے ہوتے

کیوں بدلے ہوئے ہیں نگہِ ناز کے انداز
اپنوں پہ بھی اٹھ جاتی ہے اغیار کے ہوتے

ویراں ہے نظر میری، ترے رخ کے مقابل
آوارہ ہیں غم، کوچۂ دلدار کے ہوتے

جینا ہے تو جی لیں گے بہر طور دوانے
کس بات کا غم ہے رسن و دار کے ہوتے



لب پر خموشیوں کو سجائے، نظر چرائے
جو اہلِ دل ہیں، بیٹھے ہیں چپ چاپ سر جھکائے

کہہ دو کوئی صبا سے، ادھر آج کل نہ آئے
کلیاں کہیں مہک نہ اٹھیں، پھول کھل نہ جائے

اب دوستی وہ فن کہ جو سیکھے وہی نبھائے
اور ہے وفا تماشا، جسے آئے وہ دکھائے

کچھ کہنا جرم ہے تو خطاوار میں بھی ہوں
یہ اور بات، میرا کہا وہ سمجھ نہ پائے



اب تک شریکِ محفلِ اغیار کون ہے
ہم بے وفا ہوئے تو خطاوار کون ہے

یاں سب کو مل گئے ہیں سہارے بقدرِ شوق
تم سوچتے رہے کہ طلبگار کون ہے

نظروں نے کس کی چاک کیے پردہ ہائے رنگ
سنولا دیا ہے جس نے رخِ یار کون ہے

دامن ہزار چاک، گریباں ہزار وا
پھر دیکھنا ہے کتنا گنہ گار کون ہے

پروین فنا سیّد



بظاہر یہ جو بیگانے بہت ہیں
ہمارے جانے پہچانے بہت ہیں
خردمندو، مبارک عزمِ افلاک!
زمیں پر چند دیوانے بہت ہیں
شبستانوں سے تم نکلو تو دیکھو
بھرے شہروں میں ویرانے بہت ہیں
تمھارا میکدہ تم کو مبارک!
ہمیں یادوں کے پیمانے بہت ہیں
گلہ کیا غیر کی بیگانگی کا
کہ جو اپنے ہیں، بیگانے بہت ہیں
نظامِ زیست کا محور، محبت
حقیقت ایک، افسانے بہت ہیں



اہلِ غم! آؤ، ذرا سیرِ گلستاں کر لیں
گر خزاں ہے تو چلو شغلِ بہاراں کر لیں

پھر تو ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا
پو پھٹی ہے تو لٹی بزم چراغاں کر لیں

دل کی ویرانیاں، آنکھوں میں اڑاتی ہیں غبار
مل کے رولیں تو کچھ ان کو بھی فروزاں کر لیں

قہقہوں سے تو گھٹن اور بھی بڑھ جائے گی
آؤ، چپ رہ کے ہی اس درد کا درماں کر لیں

شاید اس طرح بگولوں کا گزر ممکن ہو
اپنے ویرانے کو کچھ اور بھی ویراں کر لیں

ہم جو زندہ ہیں تو سب کہتے ہیں کیوں زندہ ہیں
آؤ مر کر بھی مسیحاؤں کو حیراں کر لیں



سوچتے ہیں تو کر گزرتے ہیں
ہم تو منجدھار میں اُترتے ہیں

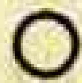
موت سے کھیلتے ہیں ہم لیکن
غیر کی بندگی سے ڈرتے ہیں

جان اپنی تو ہے ہمیں بھی عزیز
پھر بھی شعلوں پہ رقص کرتے ہیں

دل فگاروں سے پوچھ کر دیکھو
کتنی صدیوں میں گھاؤ بھرتے ہیں

جن کو ہے اندمالِ زخم عزیز
آمدِ فصلِ گل سے ڈرتے ہیں

چھپ کے روتے ہیں سب کی نظروں سے
جو گِلہ ہے وہ خود سے کرتے ہیں



درد کی رات نے یہ رنگ بھی دکھلائے ہیں
میری پلکوں پہ ستارے سے اُتر آئے ہیں

دل کے ویرانے میں کس یاد کا جھونکا گزرا
کس نے اس ریت میں یہ پھول سے مہکائے ہیں

ہم نے سوچا، تری آنکھیں تو اُٹھیں لب تو ہلیں
اس لیے ہم تری محفل سے چلے آئے ہیں

جن سے انسان کے زخموں کا مداوا نہ ہُوا
آج وہ چاند ستاروں کی خبر لائے ہیں

چند سکّوں کی طلب حسرتِ بیجا تو نہ تھی
پھر بھی ہم پھیلے ہُوئے ہاتھ سے گھبرائے ہیں

پروین فنا سیّد



دل جلایا تری خوشی کے لیے
یا خود اپنی ہی آگہی کے لیے

ہاتھ پر رکھ کے اپنی روح طپاں
ہم چلے اپنی رہبری کے لیے

نور کی محفلوں میں رہتے ہیں
جو ترستے ہیں روشنی کے لیے

کتنے آلام سہہ گئے ہم لوگ
ایک بے نام سی ہنسی کے لیے

آبِ حیواں بھی گر ملے، تو نہ لیں
اپنے معیارِ تشنگی کے لیے

پھر کوئی قہر، حضرتِ یزداں
کوئی تحریک، بندگی کے لیے



سنوارے آخرت یا زندگی کو
کہاں اتنی بھی مہلت آدمی کو

بجھائی آنسوؤں نے آتشِ غم
مگر بھڑکا دیا ہے بے کلی کو

بھرم کھل جائے گا دانائیوں کا
پکارو تو ذرا دیوانگی کو!

جو سر جھکتا نہیں ہے، دل تو جھک جائے
فقط اتنی طلب ہے بندگی کو

جو دل سے پھوٹ کر آنکھوں میں چمکے
ترستے رہ گئے ہم اس ہنسی کو

پروین فنا سید



کیا غضب تو نے اے بہار کیا
پتی پتی کو بے قرار کیا

اب تو سچ بولنے کی رسم نہیں
کس نے پھر اہتمامِ دار کیا

آتشِ درد میں کمی نہ ہوئی
لاکھ آنکھوں کو اشکبار کیا

روشنی کی تلاش میں ہم نے
بارہا ظلمتوں سے پیار کیا

موج در موج تھے دکھوں کے بھنور
ہم نے تنہا سبھی کو پار کیا

جب بنایا تھا چاند اتنا حسیں
اس کا انجام کیوں غبار کیا



اٹھی تھیں آندھیاں جن کو بجھانے
وہ شمعیں اور بھڑکیں، اس بہانے

نقابیں تجلیوں کی رخ پہ ڈالے
چمن والوں نے لوٹے آشیانے

یہ کیوں وحشت سے لپکا دستِ گلچیں
کلی شاید لگی تھی کچھ بتانے

ابھی موہوم ہے سجدے کا مفہوم
جھکا پھر کس لیے سر، کون جانے

شعورِ زندگی کی ڈھال لے کر
چلے ہم موت سے آنکھیں ملانے

پروین فنا سیّد



جدھر نظریں اُٹھائیں تیرگی ہے
ہماری زندگی کیا زندگی ہے

یہ منزل ہے، تو اے اصحابِ منزل!
یہ میری روح میں کیا تشنگی ہے

یہ غم کی انتہا ہے یا وفا کی
نظر میں پیاس، ہونٹوں پر ہنسی ہے

یہ دل میں درد چمکا یا کوئی یاد!
یہ کیسی آگ کی سی روشنی ہے

خرد کی انتہا مجھ سے نہ پوچھو!
جب اس کی ابتدا دیوانگی ہے

اسے خطرہ ہے صرف اک فصلِ گُل کا
خزاں کو کس قدر آسودگی ہے



دم بخود گلشنوں کی رعنائی
کیسی کھوئی ہُوئی بہار آئی

تم کو سودائے محفل آرائی
اور ہمیں جستجوئے تنہائی

راحتیں تم کو، رنج ہم کو عزیز
اپنی اپنی نظر کی گہرائی

کتنی بیگانگی سے دیکھتے ہو
جب غمِ زندگی کی بات آئی

زخم در زخم ہے حیاتِ فنا
کیسے کر پاؤگے مسیحائی

شیر افضل جعفری



وقت آفاق کے جنگل کا جواں چیتا ہے
میری دنیا کے غزالوں کا لہو پیتا ہے

عشق نے مر کے سوئمبر میں اسے جیتا ہے
دل مری رام ہے، دلبر کی رضا سیتا ہے

اب بھی گمنام ہے اس دشت کا بوٹا بوٹا
برگِ نَے آج بھی انساں کے لیے گیتا ہے

جگمگاتی رہی اشکوں سے شبِ تارِ حیات
دیپ مالا کی طرح دورِ الم بیتا ہے

کوئی لہکا جو سرِ دار تو یزداں نے کہا
ابنِ آدم نے مہ و سال کا رن جیتا ہے

تجھے سجدوں کے عوض مل نہ سکی روحِ بشر
ہم نے سر دے کے خدائی کا بھرم جیتا ہے

شیر افضل جعفری



زندگی رین بسیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ نفس عمر کے پھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

جسے نادان کی بولی میں صدی کہتے ہیں
وہ گھڑی شام سویرے کے سوا کچھ بھی نہیں

دل کبھی شہرِ سدا رنگ ہوا کرتا تھا
اب تو اُجڑے ہوئے ڈیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

ہاتھ میں بین ہے، کانوں کی لووں میں بالے
یہ ریاکار سپیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

سانس کے لہریئے جھونکوں سے پھٹا جاتا ہے
جسم کاغذ کے پھریرے کے سوا کچھ بھی نہیں

آج انسان کا چہرہ تو ہے سورج کی طرح
رُوح میں گھور اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

وقت ہی سے ہے شرفِ دستِ دعا کو حاصل
بندگی سانجھ سویرے کے سوا کچھ بھی نہیں

فقر محذوم ہے، لج پال ہے، لکھ داتا ہے
تاج بے رحم لٹیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

شیر افضل جعفری



آسمانوں سے اتر کر مری دھرتی پہ براج
میں تجھے دوں گا پنپتے ہوئے گیتوں کا خراج

دل کے صحرا پہ برس جیسے بادل کی طرح
خشک ٹیلے کو بھی دے پھولتی سرسوں کا مزاج

نبضِ حالات میں اب رینگ کے چلتا ہے لہو
کاش رکھ لے تو اُترتے ہوئے دریا کی للج

چاند بن کر ذرا انسان کے ماتھے پہ اُبھر
تیرے جلووں کو ترستا ہے یہ تاریک سماج

بجھتے جاتے ہیں ستاروں کے فنا رنگ کنول
آ! سرِ وقت پہ رکھ جھوم کے خورشید کا تاج



جب عرش پہ دم توڑنے لگتی ہیں دعائیں
دیتا ہے رگِ جاں سے مجھے کوئی صدائیں

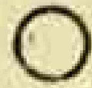
پھر سرمد و منصور کا آتا ہے زمانہ
اب اہلِ چمن گُل کی جگہ دار اُگائیں

اس تشنہ کی برسات میں کیا پیاس بجھے گی
کشمیر کے برفاب جیسے آگ لگائیں

یوں اپنی دُعا سن کے چہک اُٹھے فرشتے
جس طرح سخن فہم کوئی مصرع اٹھائیں

اللہ رے وہ سرشار گنہگار جو اپنی
بے ساختہ لغزش پہ خدا کو بھی رجھائیں

شیر افضل جعفری



اس کو اپنی ذات، خدا کی ذات لگی ہے
میرے دل کو پاگل کی یہ بات لگی ہے

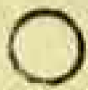
کلجگ ہے اور دُکھڑوں کی برسات لگی ہے
نوح کی کشتی میرے گھر کے سات لگی ہے

میرے پاس تہی دستی ہے، درویشی ہے
یہ دولت کب شہزادوں کے ہات لگی ہے

گوری چٹی دھوپ نہ جوبن پر اِترائے
دن کے پیچھے کالی کالی رات لگی ہے

ایک حسیں فرعون کو بزمِ شعر وسخن میں
میری غزلوں کی پستک "تورات" لگی ہے

میں انسان کو موت کا دُولہا کہہ دیتا ہوں
مجھ کو ماتم کی ٹولی بارات لگی ہے



بجلیاں پی کے جو اڑ جاتے ہیں
وہ قیامت سے بھی لڑ جاتے ہیں

قلبِ انساں کی جواں حدّت سے
آگ پر آبلے پڑ جاتے ہیں

عشق جب وقت کو جھنجھوڑتا ہے
حادثے کانپ کے جھڑ جاتے ہیں

مقتلِ زیست سے محشر کی طرف
رقص کرتے ہوئے دھڑ جاتے ہیں

آہ کی زلزلہ اندازی سے
عرش کے پائے اُکھڑ جاتے ہیں

ہم وہ انساں ہیں جو بندوں کے لیے
کبریا سے بھی بگڑ جاتے ہیں

شیر افضل جعفری



مستی ازل کی شہپرِ جبریل ہو گئی
میری بیاض پر توِ انجیل ہو گئی

دل کا گداز، آہ کی تاثیر دیکھ کر
پتھر کی ذات کانپ کے تحلیل ہو گئی

ہر لفظ کنکری کی طرح غیر پر گرا
اپنی دُعا فلک پہ ابابیل ہو گئی

فرعونِ بے کرم جو ہوا مائلِ ستم
ندی مرے لہو کی وہیں نیل ہو گئی

جانا تھا زود تر مجھے میدانِ حشر میں
یاں شغلِ حادثات میں ہی ڈھیل ہو گئی



ندی کنارے جو نغمہ سرا ملنگ ہوئے
حباب موج میں آ آ کے جلترنگ ہوئے

ارم کے پھول، ازل کا نکھار، طُور کی لو
سخی "چناب" کی وادی میں آ کے "جھنگ" ہوئے

کبھی جو ساز کو چھیڑا بہار مستوں نے
تو گنگ گنگ شجر ہم زبانِ چنگ ہوئے

عطا کیا ترے ماتھے نے جن کو عید کا چاند
نثار اُن پہ ستاروں کے راگ رنگ ہوئے

شبِ حیات میں انساں کے دیوے افضل
اُبھر کے تارے بنے کہکشاں کے سنگ ہوئے

شیر افضل جعفری



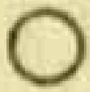
یہ بجھے بجھے ستارے، یہ دھواں دھواں سویرا
کہیں آبرو کو ڈس لے نہ یہ باولا اندھیرا

تری ناگ ناگ زلفیں، کہیں رام ہو نہ جائیں
کہ اُٹھا ہے بِین لے کے زر و مال کا سپیرا

مرے شیشموں کی چھاؤں میں ہیں جو بے ٹھکانے
مری ندیوں کی لہروں میں ہے آگ کا بسیرا

وہیں مَیں نے آرزوؤں کے حسیں دیے جلائے
کہ جہاں شراب پی کر مجھے آندھیوں نے گھیرا

اے نسیم زاد جھونکوں کی حسیں حسیں کلیو!
ذرا جھنگ رنگ ٹیلوں کی طرف بھی ایک پھیرا



ٹہنیاں پھولوں کو ترسیں گی یہاں تیرے بعد
وادیٔ "جھنگ" سے اُٹھے گا دھواں تیرے بعد

لاڈلے شیشموں کی جھاگ بھری شاخوں سے
کونپلیں پھوٹیں گی بن بن کے فغاں تیرے بعد

دھندلی دھندلی نظر آئیں گی سہانی راتیں
ہچکیاں لے گا "ترمّوں" کا سماں تیرے بعد

ناگ بن جائیں گی پانی کی شرابی لہریں
آگ پھیلائے گا سیلابِ "چہناں" تیرے بعد

کون "بیلے" میں دلِ زار کو بہلائے گا
کون دے گا مری آہوں کو اماں تیرے بعد

"ماہیا" گائیں گی گونجیں لبِ دریا لیکن
اُن کے سنگیت میں وہ بات کہاں تیرے بعد

عظیم قریشی



وہ شوخ دل و جاں کی تمنّا تو نہ نکلا
شعلہ تو نہ نکلا، وہ شرارا تو نہ نکلا

محسوس کیا درد کے ہر روپ میں اُس کو
آواز کا افسوں کبھی جھوٹا تو نہ نکلا

محرومیٔ جاوید نے دونوں ہی کو مارا
یہ رازِ محبت کوئی گہرا تو نہ نکلا

یہ دل کا خرابہ ہی تری راہگذر تھی
کعبہ تو نہ نکلا وہ کلیسا تو نہ نکلا

وہ میرے مقدر کی سیاہی تھا سراپا
نورِ شبِ مہتاب سنہرا تو نہ نکلا

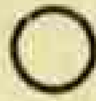
ہم بھی کسی شیریں کے لیے خانہ بدر تھے
فرہاد رہِ عشق میں تنہا تو نہ نکلا

اس میں تری خلوت کا ہر اک رنگ ہے پایا
یہ چاند سرِ چرخ، اکیلا تو نہ نکلا

پہلے سے بڑھی اور غمِ عشق کی تلخی
تو بھی مرے دمساز، مسیحا تو نہ نکلا

اندازِ بیاں تیرا عظیم اور ہی کچھ ہے
دیکھے سبھی فن کار، یہ تجھ سا تو نہ نکلا

عظیم قریشی



بیچ دلوں میں اُترا تو ہے — درد ترا البیلا تو ہے
روپ ترا اے راجکماری — جیسے میری رِجھنا تو ہے
چاند کو تم آواز تو ڈے لو — ایک مسافر تنہا تو ہے
سرجن ہارا! سرجن ہارا!! — تجھ بِن بالک بلکا تو ہے
سِرِّ عالم، کچھ کچھ ہم نے — سوچا تو ہے، جانا تو ہے
کتنی صبحیں برہم ہوں گی — شعلۂ امشب بھڑکا تو ہے
کہنے والے کہتا جا تُو — سننے والا سُنتا تو ہے
مزد کبھی برباد نہ ہو گی — نزد و دُور یہ چرچا تو ہے
مرگ کو یوں بے نام نہ سمجھو — ایک تخیّل اُجلا تو ہے
صبحِ عشق اکیلی کب ہے — شامِ غم کا پہرا تو ہے
گمگھم گمگھم، پنہاں پنہاں — بات کا افسوں گہرا تو ہے
خواب سہی گر نقشِ عالم — انساں آتا جاتا تو ہے
کھوج میں اس کی برسوں پھیر گئے — چاند نگر پہچانا تو ہے
رستے بستے باغ میں یارو — مرگ کا ہر دم کھٹکا تو ہے

تیرا عظیم اے جانِ عالم
میر کی لے میں گاتا تو ہے

عظیم قریشی



یہ پھول جو مٹی کے پیالوں سے اٹا ہے
ماضی کا کوئی خواب ہے، مانوس صدا ہے

سوکھا ہوا پتا ہوں کہ بے ڈال پڑا ہوں
کیا جانیے کس کے لیے یہ جوگ لیا ہے

اے خارِ چمن زار، منجّم تو نہیں تو
فردا کا ہر اک راز ترے لب سے سُنا ہے

پوچھو یہ ستاروں سے کہ توضیح کریں وہ
کیوں لاش پہ یوں چاند کی، ماتم سا بپا ہے

دکھتے ہوئے دل سے کئی شہکار نکالے
اس دور کو ہم نے ہی ضیا پاش کیا ہے

جم بھی وہی، دارا بھی، سکندر بھی وہی ہے
جی کر بھی ترا اور جو مر کر بھی ترا ہے

تو مجھ سے گریزاں ہے تو میں تجھ پہ ہوں قربان
عشوہ ہے جو وہ تیرا، تو یہ میری ادا ہے

فن کار نے سمجھا، نہ مغنّی ہی نے سمجھا
جو سرِّ نہاں ایک قلندر نے کہا ہے

میں پھر بھی عظیمؔ اس کی اداؤں پہ مٹا ہوں
جو مرگ کا عنواں، مری ہستی کی بقا ہے



صحرا کا کوئی پھول معطر تو نہیں تھا
تھا ایک چھلاوا، کوئی منظر تو نہیں تھا

پھر کیوں تری تصویر ڈھلی روح میں میری
افسوس تری آنکھوں کا مصور تو نہیں تھا

بن کر مرا اپنا وہ بنا حسرتِ جاوید
تھا خاک کا پتلا ہی مقدر تو نہیں تھا

میں بھی تری خلوت کا کوئی راز چُراتا
ایسا کوئی قسمت کا سکندر تو نہیں تھا

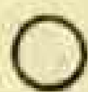
افسانہ تری زلف کا اے جانِ تمنا
میں کیسے سناتا مجھے از بر تو نہیں تھا

تلخابہ دل تھا کہ حوادث کا نشتر تھا
فریاد نہ کرتا، کوئی پتھر تو نہیں تھا!

خود آگ میں اپنی ہی میں جلتا رہا اکثر
برگشتہ میں تجھ سے مرے داور تو نہیں تھا

ہم نے بھی عظیمؔ آج غزل تیری سُنی ہے
اسلوبِ بیاں تیرا مؤثر تو نہیں تھا

عظیم قریشی



رنگ کہاں ہے، سایا سا ہے
نقش کہاں ہے، دھوکا سا ہے

صبح کی رنگت زردی مائل
شام نہیں ہے دھڑکا سا ہے

دل کا خون ہوا ہو شاید
دور پرے جو کہرا سا ہے

سیلِ عشق تھما کب ہوگا
دریا ہے اور چڑھتا سا ہے

لب اس کے جو کھلتے دیکھے
ایک جہاں کچھ ہنستا سا ہے

اصل میں نقشِ کیفِ ہستی
فانی سا ہے، مٹتا سا ہے

حسن اور عشق ہیں دونوں کافر
دونوں میں اک جھگڑا سا ہے

آؤ پیار سے دھولیں اس کو
نقشِ جہاں کچھ میلا سا ہے



عشق اپنا عجب تماشہ ہے
اک جہاں ہے کہ ہم کو تکتا ہے

جیسے بے ماں کے طفل ہو، یہ دل
آج کچھ اس طرح سے سہما ہے

تجھ کو پاکر بھی شاد کب تھا دل
تجھکو کھو کر بھی ہاتھ ملتا ہے

آؤ اس دیس میں چلیں جس جا
عشق تپتا ہے، روپ جلتا ہے

ایک ہی روپ کے ہیولے ہیں
گاہ بیجو ہے گاہ میرا ہے

کتنا نازک ہے آبگینۂ دل
غنچہ چٹکے تو اور دکھتا ہے

بے خطر ہے عظیم ہر غم سے
اس پہ آلِ نبیؐ کا سایا ہے

عظیم قریشی



سرورِ عشق کی مستی کہاں ہے سب کے لیے
وہ مجھ میں جذب ہُوا آ کے ایک شب کے لیے

وہ ایک کربِ حسیں جو مجھے ہُوا ہے عطا
نہ تیرے رحم کے لیے ہے نہ تیرے لب کیلئے

کبھی تو اُلٹے سرِ عام وہ نقاب اپنی
ترس رہے ہیں کبھی بادۂ عنب کیلئے

ترے وصال کی کب آرزو رہی دل کو
کہ ہم نے چاہا تجھے شوقِ بے سبب کیلئے

دلِ حزیں کہ دو عالم نہیں بہا جس کی
لٹا دیا میں نے اسے تیری ایک چھب کیلئے

وہی کرن جو سرِ چرخ رہ گئی تنہا
وہ سوگ بن گئی تاروں کے ہر طرب کے لیے

عظیم عشقِ شہرۂ صحرا بسا دل میں
وہی عجم کے لیے ہے، وہی عرب کیلئے



ایک حسیں ہے "تنہا" دل میں
پھول کھلا ہے گویا دل میں

بجتا ہے اکتارا دل میں
گاتا ہے بنجارا دل میں

دیکھو، پیارے لوگو، دیکھو
کل کا سورج چمکا دل میں

معبد ہے یہ ایک پرانا
مریمؑ اور کلیسا دل میں

خواب بنی یا نقشِ ماضی
تھی جو ایک زلیخا دل میں

عابد، عارف آ کر پڑھ لیں
مکتب میں نے کھولا دل میں

عظیم قریشی



کربِ ہجراں زبس ہے، کیا کیجے
ہم کو تیری ہوس ہے، کیا کیجے

نے دماغِ وصال ہے ہم کو
کچھ انہیں پیش وپس ہے کیا کیجے

ہجر میں اُس نگارِ تاباں کے
لمحہ لمحہ برس ہے، کیا کیجے

نکہتِ گل کے آبگینوں میں
مرگِ شیریں کا رس ہے کیا کیجے

گرچہ درویش ہے عظیم مگر
اس کو تجھ سے بھی مس ہے کیا کیجے



رمِ جاودانہ غزل ہی تو ہے
سرودِ شبانہ غزل ہی تو ہے

نمایاں کیا جس نے اس دور کو
وہ جوہرِ یگانہ غزل ہی تو ہے

نہاں جس میں صدیوں کی تشکیل ہے
وہ زریں ترانہ غزل ہی تو ہے

ادب کا اگر ارتقا ہے تو یہ
عروسِ زمانہ غزل ہی تو ہے

یہ سرِّ حسیں سب کو بتلا عظیم
یمِ بیکرانہ غزل ہی تو ہے

صفدر میر



چاروں اور اب پھول ہی پھول ہیں، کیا گنتے ہو داغوں کو
ہو توفیق تو دل سے لگاؤ ان نورُستہ باغوں کو

جلتے صحرا کی موجوں پر گرتے پڑتے رہرو ہیں
چشمۂ آزادی کے جواب تک، ڈھونڈ رہے ہیں سراغوں کو

بادِ حوادث کے شہپر خود ان کو راہ دکھاتے ہیں
وقت کے دھارے پر چھوڑا ہے ہم نے ایسے چراغوں کو

کنجِ قفس گو کنجِ قفس ہے لیکن اب کے بہاراں میں
ہم نے مہکتا پایا جوشِ تصورِ گل سے دماغوں کو

صبحِ روزِ آدمِ نو ہے، دھوم مچی ہے گھر گھر میں
ساتھیو اٹھو صبوحی سے چھلکائیں بھر کے ایاغوں کو

صفدر میر



بغور دیکھو تو زخموں کا اک چمن سا ہے
سکوتِ تشنہ تمناؤں کا کفن سا ہے

کبھی کِھل اٹھتے ہیں یادوں کے بھی کنول ورنہ
بہار میں بھی یہ دل اک اُداس بن سا ہے

ابھر رہا ہے جو نغمہ بہار کے دل سے
گداز و سوز کچھ اُس میں ترے بدن سا ہے

چمن سے دُور، چمن کے ہر اک خیال سے دُور
کِھلا ہوا مری آنکھوں میں اک چمن سا ہے

نظر نظر میں گھلاوٹ ہے بدگمانی کی
ہجومِ ماہ میں کِھلتا ہوا گہن سا ہے

ہے کعبہ کتنے سمن پوش نازنینوں کا
یہ دل جو کہنے کو یوں چاک پیرہن سا ہے

مرا جنوں ہے ادب آشنا ابھی ورنہ
حرم کے پردے میں بھی ایک برہمن سا ہے

صفدر میر



بہار آئی ہے پھر پیرہن گلابی ہو
وہ چاند آئے سرِ انجمن گلابی ہو

سیاہ رات سی چھائی وہ زلف چہرے پر
جبینِ ناز گلابی، بدن گلابی ہو

کھُلیں جو بندِ قبا، رات جگمگا اُٹھے
مہکتی سیج، شکن در شکن، گلابی ہو

ہوا کی لرزشیں دہکائیں عارض و لب کو
حیا کی موج سے سارا بدن گلابی ہو

وہ ہونٹ چپ ہوں تو آنکھوں میں پھول سے جھلکیں
ہلیں تو ساری فضائے سخن گلابی ہو

گلال اس طرح برسائے کوئی چار طرف
چمن گلابی، ہوا سے چمن گلابی ہو

سیاہی شبِ ہجراں سیاہ تر نہ کرو
جو ہو تو چاند کا میرے، گہن گلابی ہو

وطن سے دُور، بہاروں کو کھوجنے والے!
جوان دلوں میں زمینِ وطن گلابی ہو



درست ہے کہ مرا حال اب زبوں بھی نہیں
مقامِ سجدہ کہ یہ جامِ سرنگوں بھی نہیں

نہیں کہ شورشِ بزمِ طرب فزوں بھی نہیں
دلیلِ شورشِ جاں اِک چراغِ خوں بھی نہیں

حدیثِ شوق ابھی مختصر ہے چُپ رہیے
ابھی بہار کا کیا غم، ابھی جنوں بھی نہیں

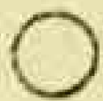
ابھی تو طاقِ حرم میں جلائیے شمعیں
ابھی حریفِ صنم جذبِ اندروں بھی نہیں

ابھی یہ گنبدِ سر پھوڑنے کی کیجیے فکر
کہ سدِّ راہ ابھی چرخِ نیلگوں بھی نہیں

ابھی تو گردِ رہِ آستاں سے ساز کریں
فروغِ دیدہ کوئی پیکرِ فسوں بھی نہیں

ہے اس قدر کہ نگہ بام و دَر پہ پھرتی ہے
مگر دلوں کو جو تڑپائے وہ سکوں بھی نہیں

صمصندر میر



بہت جی ترستا رہا رات بھر
جو ہم سے بھی مل لو ملاقات بھر

بساطِ تمنا اُلٹتے ہو کیوں
کہ بازی یہ کھیلیں گے ہم مات بھر

ہے آنکھوں میں طوفاں بقدرِ جنوں
ہے دل میں تنا خرابات بھر

نہیں مانگتے مستیِ جاوداں
ہمیں چاہیے مے، مدارات بھر

ذرا دیکھ لو میرے دل کی طرف
یہ چھل بل ودیعت نہیں رات بھر

گھر آئی امنڈ کر گھٹا چار اُور
کھلے گی طبیعت نہ برسات بھر



رات کتنی بوجھل ہے، کس قدر اندھیرا ہے
دل گواہی دیتا ہے، پاس ہی سویرا ہے

ایک شہ پہ بچ جائے، شہ پہ شہ چلی آئے
موت کے کھلاڑی کو زندگی نے گھیرا ہے

ناصحوں کا احساں ہے، آپ مجھ کو سمجھاتے
جس گلی میں چھوڑ آئے اس گلی کا پھیرا ہے

کائنات کے دل میں رقصِ صد بہاراں بھی
کائنات کے دل میں یار کا بھی ڈیرا ہے

صفدر میر



اُس کی تمنا میں جیسے باغ جلتا ہے
تو نہ ہو تو سینے کا داغ داغ جلتا ہے

چاند چل دیا چپ چاپ سو گئے ستارے بھی
رات کی سیاہی میں دل کا داغ جلتا ہے

موت اِک کہانی ہے زیست جاودانی ہے
اِک چراغ بجھتا ہے اِک چراغ جلتا ہے

قتل گاہ سے لے کر قاتلوں کے دامن تک
خونِ ناحقِ فرہاد کا سُراغ جلتا ہے

ساتھیوں سے دُوری ہیں اِک جہاں سے دُوری ہے
مے ہے دم نہیں ساقی اور ایاغ جلتا ہے



پھر کوئی آ رہا ہے دِل کے قریب
داغِ تازہ کِھلا ہے دِل کے قریب

پھر کوئی یاد سایہ افگن ہے
دھندلی دھندلی فضا ہے دِل کے قریب

پھر کوئی تازہ واردات ہوئی
جگمگاتا سا لگا ہے دِل کے قریب

آج بھی چین سے نہ سوئیے گا
پھر کہیں رت جگا ہے دِل کے قریب

کل کِھلے تھے یہاں نشاط کے پھول
اب دھواں اُٹھ رہا ہے دِل کے قریب

سیّد ضمیر جعفری



درد میں لذّت بہت، اشکوں میں رعنائی بہت
اے غمِ ہستی، ہمیں دنیا پسند آئی بہت

ہو نہ ہو، دشت و چمن میں اک تعلق ہے ضرور
بادِ صحرائی بھی خوشبوئیں اٹھا لائی بہت

مصلحت کا جبر ایسا تھا کہ چُپ رہنا پڑا
ورنہ اسلوبِ زمانہ پر ہنسی آئی بہت

بے سہاروں کی محبت، بے نواؤں کا خلوص
آہ یہ دولت کہ انسانوں نے ٹھکرائی بہت

بے خیالی میں بھی کتنے فاصلے طے ہو گئے
بے ارادہ بھی یہ دُنیا دُور سے آئی بہت

اپنی فطرت میں بھی روشن ہوں گے لیکن اے ضمیرؔ
میری راتوں سے بھی تاروں نے چمک پائی بہت

سید ضمیر جعفری



ہم اگر دشتِ جنوں میں نہ غزل خواں ہوتے
شہر ہوتے بھی تو آواز کے زنداں ہوتے

زندگی! تیرے تقاضے اگر آساں ہوتے
کتنے آباد جزیرے ہیں کہ ویراں ہوتے

تُو نے دیکھا ہی نہیں پیار سے ذرّوں کی طرف
آنکھ ہوتی تو ستارے بھی نمایاں ہوتے

آرزوؤں سے جو پیمانِ وفا ہم رکھتے
سانحے زخم بھی ہوتے تو گلستاں ہوتے

عشق ہی شعلۂ امکانِ سحر ہے ورنہ
خواب تعبیر سے پہلے ہی پریشاں ہوتے

ماضی و دوش کا ہر داغ ہے فردا کا چراغ
کاش یہ شام و سحر صرفِ دل وجاں ہوتے

ضبط۔ طوفاں کی طبیعت ہی کا اک رُخ ہے ضمیرؔ
موج، آواز بدل لیتی ہے طوفاں ہوتے

سید ضمیر جعفری



اپنی خبر نہیں ہے بجز ایں قدر مجھے
اک شخص تھا کہ مل نہ سکا عمر بھر مجھے

شعلوں کی گفتگو ہیں، صبا کے خرام ہیں
آواز دے رہا ہے کوئی ہمسفر مجھے

شاید انھیں کا عجز مرے کام آ گیا
جن دوستوں نے چھوڑ دیا وقت پر مجھے

شب کو تو ایک قافلۂ گل تھا ساتھ ساتھ
یارب! یہ کس مقام پہ آئی سحر مجھے

ہنستے رہے فلک پہ ستارے زمیں پہ پھول
اچھا ہوا کہ عمر ملی مختصر مجھے

مدت کے بعد اس نے سرِ انجمن ضمیرؔ
دیکھا نگاہِ عام سے اور خاص کر مجھے



ہم زمانے سے فقط حسنِ گماں رکھتے ہیں
ہم زمانے سے توقع ہی کہاں رکھتے ہیں؟

ایک لمحہ بھی مسرت کا بہت ہوتا ہے
لوگ جینے کا سلیقہ ہی کہاں رکھتے ہیں؟

کچھ ہمارے بھی ستارے ترے دامن پہ ہیں
ہم بھی کچھ خوابِ جہانِ گزراں رکھتے ہیں

چند آنسو ہیں کہ ہستی کی چمک ہے جن سے
کچھ حوادث ہیں کہ دنیا کو جواں رکھتے ہیں

جان و دل نذر ہیں لیکن نگہِ لطف کی نذر
مفت بکتے بھی ہیں قیمت بھی گراں رکھتے ہیں

اپنے حصے کی مسرت بھی اذیت ہے ضمیرؔ
ہر نفس پاسِ غمِ ہم نفساں رکھتے ہیں

سید ضمیر جعفری



جنوں بہ جبرِ خرد جب بھی ہوشیار ہوا
نظر کے ساتھ نظارا بھی شرمسار ہوا

غمِ جہاں! بہت اچھا، انھیں بھلا دیں گے
زہے نصیب اگر دل پہ اختیار ہوا

یہ دَور، دَورِ پُر آشوب ہی سہی لیکن
زمانہ پہلے بھی کب، کس کو سازگار ہوا

ملی ہیں نوعِ بشر سے مجھے وہ ایذائیں
کہ جب بھی غور کیا، خود بھی شرمسار ہوا

کسی سے تلخیٔ حالات کا گلہ ہی نہیں
کہ جو ہوا وہ بہ ایمائے چشمِ یار ہوا

یہ زندگی کا اُفق بھی عجب اُفق ہے ضمیرؔ
کہ ہر خیال ستارہ بنا، غبار ہوا!



تجرباتِ تلخ نے ہر چند سمجھایا مجھے
دل مگر دل تھا، اسی محفل میں لے آیا مجھے

حُسن ہر شے پر توجہ کی نظر کا نام ہے
بارہا کانٹوں کی رعنائی نے چونکایا مجھے

دُور تک دامانِ ہستی پر دیے جلتے گئے
دیر تک عمرِ گزشتہ کا خیال آیا مجھے

ہر نظر بس اپنی اپنی روشنی تک جا سکی
ہر کسی نے اپنے اپنے ظرف تک پایا مجھے

ہر رواں لمحہ بڑی تفصیل سے ملتا گیا
ہر گزرتے رنگ نے خود رُک کے ٹھہرایا مجھے

غنچہ و گل، مہر و مہ، ابر و ہوا، رخسار و لب
زندگی نے ہر قدم پر یاد فرمایا مجھے

سید ضمیر جعفری



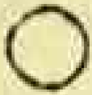
بڑی حیرت سے اربابِ وفا کو دیکھتا ہوں میں
خطا کو دیکھتا ہوں اور سزا کو دیکھتا ہوں میں

ابھی کچھ دیر ہے شاید مرے مایوس ہونے میں
ابھی کچھ دن فریبِ رہنما کو دیکھتا ہوں میں

خدا معلوم دل کو جستجو ہے کن جزیروں کی
نہ جانے کن ستاروں کی ضیا کو دیکھتا ہوں میں

یہ کیا غم ہے مرے اشعار کو نم کر دیا جس نے
یہ دل میں کس سمندر کی گھٹا کو دیکھتا ہوں میں

ضمیر اک قیدِ نامحسوس کو محسوس کرتا ہوں
کسی نادیدنی زنجیرِ پا کو دیکھتا ہوں میں



اپنے ظرف' اپنی طلب' اپنی نظر کی بات ہے
رات ہے لیکن مرے لب پر سحر کی بات ہے

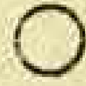
آشیاں کے ساتھ پوری زندگی بدلی گئی
کم نظر سمجھے کہ مشتِ بال و پر کی بات ہے

تا ابد کتنے اندھیرے تھے کہ روشن ہو گئے
شمع کا جلنا بظاہر رات بھر کی بات ہے

زندگی صدیوں کا حاصل' زندگی صدیوں کا روپ
زندگی جو چشمکِ برق و شرر کی بات ہے

منزل اک رہرو کا تھک جانا ہے ورنہ زندگی
اک مسلسل رہگزارِ پیہم سفر کی بات ہے

سید ضمیر جعفری



طوفاں نہیں گزرے کہ بیاباں نہیں گزرے
ہم مرحلۂ زیست سے آساں نہیں گزرے

کچھ ایسے مقامات بھی تھے راہِ وفا میں
محسوس یہ ہوتا تھا کہ انساں نہیں گزرے

عرصہ ہوا وہ زلف پریشاں نہیں دیکھی
مدت ہوئی نظروں سے گلستاں نہیں گزرے

ہر حادثۂ نو سے اُلجھتے گئے ہر گام
ہم رہگزرِ شوق سے گزراں نہیں گزرے

حیران تو گزرے ہیں زمانے کی روش سے
یہ اپنی روش تھی کہ پریشاں نہیں گزرے

کیا ہم کو ستائے گا غمِ گردشِ دوراں
ہم تجھ سے ابھی اے غمِ جاناں نہیں گزرے



حسن کو غایتِ نظر جانا
یہ مگر اُن کو دیکھ کر جانا

کوئی آوازِ دردناک آئی
چلنے والو ذرا ٹھہر جانا

لمحے لمحے کو بیکراں پایا
عمر کو عمرِ مختصر جانا!

راحتوں پر بھی اپنا حق سمجھا
مشکلوں کو بھی ہم سفر جانا

جتنا بڑھتا گیا شعورِ ہنر
خود کو اُتنا ہی بے ہنر جانا

حمایت علی شاعر



اب بتاؤ، جائے گی زندگی کہاں یارو
دُور تک ہے آنکھوں میں دشتِ بے اماں یارو

اب نہ کوئی منزل ہے اور نہ رہگذر کوئی
جانے قافلہ بھٹکے اب کہاں کہاں یارو

پھول ہیں کہ لاشیں ہیں، باغ ہے کہ مقتل ہے
شاخ شاخ ہوتا ہے دار کا گماں یارو

تُربتوں کی شمعیں ہیں اور گہری خاموشی
جا رہے تھے کس جانب آگئے کہاں یارو

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھُل کر
میرِ کارواں یارو، میرِ کارواں یارو

صرف زندہ رہنے کو زندگی نہیں کہتے
کچھ غمِ محبت ہو، کچھ غمِ جہاں یارو

وقت کا تقاضا تو اور بھی ہے کچھ لیکن
کچھ نہیں تو ہو جاؤ میرے ہم زباں یارو

حمایت علی شاعر



نالۂ غم شعلہ اثر چاہیے
چاکِ دل اب تا بہ جگر چاہیے

کتنے مہ و نجم ہوئے نذرِ شب
اے غمِ دل، اب تو سحر چاہیے

منزلیں ہیں زیرِ کفِ پا مگر
ایک ذرا عزمِ سفر چاہیے

آئینہ خانے میں ہے درکار کیا
چاہیے اک سنگ اگر چاہیے

دُور ہے دل منزلِ غم سے ہنوز
اک غلط اندازِ نظر چاہیے

تشنگیٔ لب کا تقاضا ہے اب
بادہ ہو یا زہر مگر چاہیے

حمایت علی شاعر



سائے چمک رہے تھے، ریاست کی بات تھی
آنکھیں کھلیں تو صبح کے پردے میں رات تھی

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مجھ پر ہے مہرباں
دیوار کی یہ چھاؤں تو سورج کے ساتھ تھی

کس درجہ ہولناک ہے یارو شعورِ ذات
کتنی حسین پہلے ہی کائنات تھی!

تیری جفا تو موردِ الزام تھی، نہ ہے!
میری وفا بھی کوششِ تکمیلِ ذات تھی



میرا شعور مجھ کو یہ آزار دے گیا
سورج کی طرح دیدۂ بیدار دے گیا

ہر پھول اک شرر ہے تو ہر شاخ ایک نیش
جنت کا خواب، دوزخِ گلزار دے گیا

لب بستگی میں حسرتِ گفتار جاگ اٹھی
خوفِ سکوت، جرأتِ اظہار دے گیا

جلتا ہوں اپنی آگ میں خورشید کی طرح
کیسی سزا یہ شعلۂ پندار دے گیا

محوِ سخن تھا میں کہ مرا عکس ہنس پڑا!
آئینے سے نکل کے یہ اشعار دے گیا!

حمایت علی شاعر



یم بہ یم پھیلا ہُوا ہے پیاس کا صحرا یہاں
اک سرابِ تشنگی ہے موجۂ صہبا یہاں

روشنی کے زاویوں پر منحصر ہے زندگی
آپ کے بس میں نہیں ہے، آپ کا سایہ یہاں

آتے آتے آنکھ تک دل کا لہو پانی ہُوا
کس قدر ارزاں ہے اپنے خون کا سودا یہاں

تیرے میرے درمیاں حائل رہی دیوارِ حرف
رکھ لیا اک بات نے ہر بات کا پردا یہاں

دیکھئے تو یہ جہاں ہے اک جہانِ آب و گِل
سوچئے تو ذرّے ذرّے میں ہے اِک دُنیا یہاں



پندارِ زہد ہو کہ غرورِ برہمنی
اس دورِ بُت شکن میں ہے ہر بُت شکستنی

صرصر چلے کہ تُند بگولوں کا رقص ہو
موجِ نمو رواں ہے تو ہر گُل شگفتنی

گُل چین و گُل فروش کی خاطر ہے فصلِ گُل
اور قسمتِ جنوں ہے فقط چاک دامنی

دیوار اب کھینچیے کرنوں کی راہ میں
ذرّوں میں قید کیجیے سُورج کی روشنی

موجِ نفس سے لرزے ہے تارِ رگِ حیات
پھیلی ہے شہرِ دل میں وہ پُرہول سنسنی

حمایت علی شاعر



آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن جاگتے رہنا
کوئی نہیں ہے جان کا ضامن جاگتے رہنا

قزاقوں کے دشت میں جب تک قافلہ ٹھہرے
قافلے والو، رات ہو یا دن، جاگتے رہنا

تاریکی میں لپٹی ہوئی پُر ہول خموشی
اس عالم میں کیا نہیں ممکن، جاگتے رہنا

آہٹ آہٹ پر جانے کیوں دل دھڑکے ہے
کوئی نہیں اطراف میں، لیکن جاگتے رہنا

ساتھ ہمارے سب دوست ہیں لیکن اے ہم سفرو
دوست کا کیا ظاہر، کیا باطن، جاگتے رہنا



جب تک زمیں پہ رینگتے سائے رہیں گے ہم
سورج کا بوجھ سر پہ اٹھائے رہیں گے ہم
کھل کر برس ہی جائیں کہ ٹھنڈی ہو دل کی آگ
کب تک خلا میں پاؤں جمائے رہیں گے ہم
جھانکے گا آئینوں سے کوئی اور جب تلک
ہاتھوں میں سنگ ریزے اٹھائے رہیں گے ہم
اک نقش پا کی طرح سہی اس زمین پر
اپنی بھی ایک راہ بنائے رہیں گے ہم
جب تک نہ شاخ شاخ کے سر پر ہو تاجِ گل
کانٹوں کا تاج سر پہ سجائے رہیں گے ہم

حمایت علی شاعر



ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

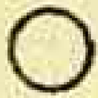
کس لیے کیجے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

کتنے سادہ دل ہیں، اب بھی سن کے آوازِ جرس
پیش و پس سے بے خبر گھر سے نکل جاتے ہیں لوگ

اپنے سائے سائے سر نہوڑائے آہستہ خرام
جانے کس منزل کی جانب آج کل جاتے ہیں لوگ

شمع کے مانند، اہلِ انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ

شاعر ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ



اپنا اندازِ جنوں سب سے جدا رکھتا ہوں میں
چاکِ دل، چاکِ گریباں سے سوا رکھتا ہوں میں
غزنوی ہوں اور گرفتارِ خمِ زلفِ ایاز
بت شکن ہوں اور دل میں بت کدہ رکھتا ہوں میں
ہے خود اپنی آگ سے ہر پیکرِ گل تابناک
بے ہوا کی زد پہ مٹی کا دیا رکھتا ہوں میں
میں کہ اپنی قبر میں بھی زندہ ہوں گھر کی طرح
ہر کفن کو اپنے گرد، احرام سا رکھتا ہوں میں
دشتِ غربت میں ہوں آوارہ مثالِ گردباد
کوئی منزل ہے نہ کوئی نقشِ پا رکھتا ہوں میں
میرا سایہ بھی نہیں میرا، اجالے کے بغیر
اور اجالے کا تصور خواب سا رکھتا ہوں میں

سُرورؔ بارہ بنکوی



یہی نہیں کہ مرا دل ہی میرے بس میں نہ تھا
جو تُو ملا تو میں خود اپنی دسترس میں نہ تھا

بہ نامِ عہدِ رفاقت بھی ہم قدم نہ ہُوا
یہ حوصلہ مرے معصوم ہم نفس میں نہ تھا

عجیب سحر کا عالم تھا اس کی قربت میں
وہ میرے پاس تھا اور میری دسترس میں نہ تھا

نہ جانے قافلۂ اہلِ دل پہ کیا گزری
یہ اضطراب کبھی نالۂ جرس میں نہ تھا

خبر تو ہو گی تجھے، تیرے جاں نثاروں میں
کوئی تو تھا سرِ مقتل جو پیش و پس میں نہ تھا

سرورؔ اپنے چمن کی فضا ہے، کیا کہیئے
سکوُت کا تو وہ عالم ہے جو قفس میں نہ تھا

مسرور بارہ بنکوی



جب تلک روشنیِ فکر و نظر باقی ہے
تیرگی لاکھ ہو، امکانِ سحر باقی ہے

کس کے جلووں کا یہ آنکھوں میں اثر باقی ہے
حُسن باقی ہے نہ اب حسنِ نظر باقی ہے

یہ بھی اک معجزۂ جوششِ جنوں ہے کہ نہیں
پا شکستہ ہوں مگر عزمِ سفر باقی ہے

یہ بھی کیا نظمِ جہاں ہے کہ ازل سے اب تک
بس وہی سلسلۂ شام و سحر باقی ہے

آج یوں آبلہ پایانِ جنوں گزرے ہیں
اک چراغاں سا سرِ راہ گزر باقی ہے

میں خزاں دیدہ و آوارہ سہی، پھر بھی سرورؔ
میرے نغموں میں بہاروں کا اثر باقی ہے



کہے تو کون کہے سرگذشتِ آخرِ شب
جنوں ہے سر بہ گریباں، خرد ہے مہر بہ لب

حدودِ شوق کی منزل سے تا بہ حدِ ادب
ہزار مرحلۂ جاں گداز و صبر طلب

یہ عالمِ قد و گیسو، یہ حسنِ عارض و لب
تمام نکہت و نغمہ، تمام شعر و ادب

بدل سکا نہ زمانہ مزاجِ اہلِ جنوں
وہی دلوں کے تقاضے وہی نظر کی طلب

ہزار حرفِ حکایت وہ ایک نیم نگاہ
ہزار وعدہ و پیماں وہ ایک جنبشِ لب

تھکے تھکے سے ستارے دھواں دھواں سی فضا
بہت قریب ہے، شاید سوادِ منزلِ شب

نہ سرورِ منزلِ جاناں ہے کب سے چشم براہ
بھٹک رہا ہے کہاں کاروانِ شوق و طلب



وہ بے رخی کہ تغافل کی انتہا کہیے
برایں ہمہ اسے کس دل سے بیوفا کہیے

غمِ حیات و غمِ کائنات سے ہٹ کر
کسی کے قامت و گیسو کا ماجرا کہیے

وہ منفعل ہو کہ ہو مشتعل، بلا سے مگر
کبھی تو حالِ دلِ زار برملا کہیے

بتایئے کفِ محبوب دستِ قاتل کو
لہو کے داغ کو گل کاریِ حنا کہیے

ادب کا ہے یہ تقاضہ کہ اس کی محفل میں
سکوتِ ناز کو بھی نغمہ و صدا کہیے

یہی ہے مصلحتِ رسمِ عاشقی کہ اسے
سمجھیے دشمنِ جاں، جانِ مدعا کہیے

ہم اپنے دور میں جس بانکپن سے زندہ ہیں
اسے ہم اہلِ محبت کا حوصلہ کہیے

سرورؔ حضرتِ غالب کے رنگ میں بھی کبھی
حکایتِ کرمِ چشمِ سرمہ سا کہیے

سعد پارہ بنکوی



چمن والوں کو رقصاں وغزل خواں کر کے اٹھی ہے
صبا اک اک سے تا پیرِ بہاراں لے کے اٹھی ہے

رُخِ گلرنگ پر اک شبنمستاں لے کے اٹھی ہے
یہ کیا عالم تری چشمِ پشیماں لے کے اٹھی ہے

یہ کس دامن کی حسرت چشمِ گریاں کر کے اٹھی ہے
کہ دل سے جو بھی موج اٹھی ہے طوفاں کر کے اٹھی ہے

گراں باری سے شانہ خم ہوا جاتا ہے ہستی کا
نہ جانے زندگی کس کس کا احساں لے کے اٹھی ہے

سرورؔ اس بزم کے صدقے جہاں پر دل کی بیتابی
فسردہ ہو کے آئی تھی غزل خواں ہو کے اٹھی ہے



آرزوئے حسن کی بے اُن کی انجمن تک آ گئے
نکہتِ گل کے سہارے ہم چمن تک آ گئے

بے رخی سے آپ جب بیگانہ پن تک آ گئے
آج ہم بھی جرأتِ جرمِ سخن تک آ گئے

میکدہ پھر بھی غنیمت ہے جہاں اس دور میں
ایک ہی مرکز پہ شیخ و برہمن تک آ گئے

جل بجھے اہلِ جنوں لیکن کسی کو کیا خبر
کتنے شعلے خود اُسی گل پیرہن تک آ گئے

معتبر ہو کر رہی دیوانگی اپنی سرورؔ
جتنے اندازِ جنوں تھے بانکپن تک آ گئے

مسعود بارہ بنکوی



مہر و ماہ بھی لرزاں ہیں فضا کی باہوں میں
اہلِ دل خراماں ہیں کیسی شاہراہوں میں

بے کسی برستی ہے زندگی کے چہرے سے
کائنات کی سانسیں ڈھل رہی ہیں آہوں میں

ضبطِ غم کی تاکیدیں تھیں سو خیر تھیں لیکن
کچھ تلافیاں بھی تھیں رات ان نگاہوں میں

ہم تجھے بھلا کر بھی کیا سکون پائیں گے
زندگی تو ہے تیرے درد کی پناہوں میں

دشتِ دل میں اب تیری یاد یوں بھٹکتی ہے
جیسے کوئی دیوانہ شب کو شاہراہوں میں

مدتیں ہوئیں اس نے آنکھ بھر کے دیکھا تھا
پھر رہی ہیں وہ آنکھیں آج تک نگاہوں میں



سوزِ غم بھی نہیں فغاں بھی نہیں
جل بجھی آگ، اب دھواں بھی نہیں

گو بظاہر وہ مہرباں بھی نہیں
منتیں میری رائگاں بھی نہیں

جانے کیوں تم سے کچھ نہیں کہتے
ورنہ ہم اتنے بے زباں بھی نہیں

وہ نگاہیں کہ بے نیاز بھی ہیں
اور ان سے کہیں اماں بھی نہیں

دیدہ و دل ہیں کب سے چشم براہ
کوئی افتادِ ناگہاں بھی نہیں

اے خوشا کاروبارِ شوق سحر در
لفظ کچھ ہو نہ ہو، زباں بھی نہیں

سرور بارہ بنکوی



چمن میں لالہ و گل پر نکھار بھی تو نہیں
خزاں اگر یہ نہیں ہے بہار بھی تو نہیں

تمازتِ غمِ دوراں سے پھنک رہی ہے حیات
کہیں پہ سایۂ گیسوئے یار بھی تو نہیں

خیالِ ترکِ محبت بجا سہی، لیکن
اب اپنے دل پہ ہمیں اختیار بھی تو نہیں

کبھی تو جانِ وفا ہے کبھی ہے دشمنِ جاں
تری نظر کا کوئی اعتبار بھی تو نہیں

بہ ایں تغافلِ پیہم ستم تو یہ ہے سرور
میں اس کی خاطرِ نازک پہ بار بھی تو نہیں



تو عروسِ شامِ خیال بھی، تو جمالِ روئے سحر بھی ہے
یہ ضرور ہے کہ بہ ایں ہمہ، مرا اہتمامِ نظر بھی ہے

یہ مرا نصیب ہے ہمنشیں، سرِ راہ بھی نہ ملے کہیں
وہی میرا جادۂ جستجو، وہی ان کی راہگزر بھی ہے

ہمہ کشمکش مری زندگی، کبھی آ کے دیکھ یہ بے بسی
تری یاد وجہِ سکوں سہی، وہی رازِ دیدۂ تر بھی ہے

ترے قرب نے جو بڑھا دیے، کبھی مٹ سکے نہ وہ فاصلے
وہی پاؤں ہیں وہی آبلے، وہی اپنا ذوقِ سفر بھی ہے

بہ ہزار دانش و آگہی، مری مصلحت ہے ابھی یہی
میں اسیرِ ظلمتِ شب سہی، مری دسترس میں سحر بھی ہے

اختر انصاری اکبر آبادی



یاروں کے اخلاص سے پہلے دل کا مرے، یہ حال نہ تھا
اب وہ چکنا چور پڑا ہے، جس شیشے میں بال نہ تھا

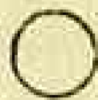
انساں آکر نئی ڈگر پر کھو بیٹھا ہے ہوش و حواس
پہلے بھی مدہوش تھا لیکن ایسا بھی بدحال نہ تھا

گلشن گلشن ویرانی ہے، جنگل جنگل سناٹا
ہائے وہ دن جب ہر منزل میں شورشِ غم کا کال نہ تھا

کیوں رے دوانے! شہر یہی ہے ایک اک پل بھاری ہے جہاں
اپنے ویرانے میں اے دل، جی کا یہ جنجال نہ تھا

ہم جو لُٹے اُس شہر میں جاکر، دکھ لوگوں کو کیوں پہنچا
اپنی نظر تھی، اپنا دل تھا، کوئی پرایا مال نہ تھا

تیری خاک پہ روشن اخترؔ جیسے ستارے تھے
تجھ سا، اے مہران کی وادی! کوئی بلند اقبال نہ تھا



شاعرو! حدِ قدامت سے نکل کر دیکھو
داستانوں کے اب عنوان بدل کر دیکھو

کیوں ہو تقلیدِ کلیم آج بھی، اے دیدہ ورو!
دیدنی ہو کوئی جلوہ تو سنبھل کر دیکھو

شمع و پروانہ کا انداز نیا ہے کہ نہیں
ذکر تھا جس کا، اب اس بزم میں چل کر دیکھو

اور بھی رُخ نظر آئیں گے تجلّی کے ابھی
رُخ نگاہوں کے ذرا اور بدل کر دیکھو

اگلے وقتوں کے فسانے نہ سناؤ یارو!
نئے ماحول کے سانچے میں بھی ڈھل کر دیکھو

کل کے انداز بھی دلکش تھے، یہ تسلیم، مگر
آج بھی شہرِ نگاراں میں نکل کر دیکھو

اپنے احباب کی جانب نہ اٹھاؤ نظریں
دیکھنا ہے اگر اخترؔ تو سنبھل کر دیکھو

اختر انصاری اکبرآبادی



رہبرِ طبل و نشاں، اور ذرا تیز قدم
ہاں مرے عزمِ جواں، اور ذرا تیز قدم

اس اندھیرے سے نہ گھبرا کہ ذرا اور آگے
ہے چراغاں کا سماں، اور ذرا تیز قدم

کہیں مایوس نہ ہونا جو نگاہوں سے ابھی
ان کی محفل ہے نہاں، اور ذرا تیز قدم

یہ یقیں ہے کہ پہنچ جائیں گے ان تک اک دن
چلیے بے وہم و گماں، اور ذرا تیز قدم

بجھ نہ جائیں رہِ ہستی میں تمنا کے چراغ
خواجۂ راہرواں! اور ذرا تیز قدم

کس بلندی پہ رواں تم ہو، زمیں کے ذرو!
ہیں ستارے نگراں، اور ذرا تیز قدم

مل ہی جائے گا کہیں شہرِ نگاراں اختر
اے پرستارِ بتاں، اور ذرا تیز قدم



لٹاؤ جان تو بنتی ہے بات، کس نے کہا
یہ بزمِ عشق میں رازِ حیات کس نے کہا

رہِ طلب میں سناتا کوئی ترانۂ نو
یہاں فسانۂ ذات و صفات کس نے کہا

ابھی ثوابت و سیار میں ہے فصل بہت
سمٹ چکی ہے بہت کائنات، کس نے کہا!

ہر ایک چوٹ پہ کھلتی ہے آنکھ انساں کی
ہیں خضرِ راہِ طلب حادثات، کس نے کہا

ہم آسماں کو زمیں پر اتار لائے مگر
ابھی نہیں ہے شعورِ حیات، کس نے کہا

ہم اپنی دھن میں ہیں مصروف، کس طرف دیکھیں
ہمیں نہیں ہے غمِ التفات، کس نے کہا

ہمیں سکون میسر نہیں مگر اختر
ہمارے دور کو دورِ نجات کس نے کہا

اختر انصاری اکبرآبادی



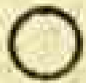
نہیں آسان ترکِ عشق کرنا، دل سے غم جانا
بہت دشوار ہے چڑھتے ہوئے طوفاں کا تھم جانا

خبر کیا تھی ستم کی پردہ داری یوں بھی ہوتی ہے
بہت نادم ہوں جب سے مقصدِ جوشِ کرم جانا

لحاظِ وضعداری میں کبھی ممکن نہ ہو شاید
تمہارا دو قدم آنا، ہمارا دو قدم جانا

ہمیں اندازِ رندانہ کبھی کرنے نہیں دیتے
جو ساغر سامنے آیا، اسی کو جامِ جم جانا

مرا ہر شعر اختر اک پیامِ زندگی نکلا
مجھے دنیا نے آخر مالکِ لوح و قلم جانا



زباں بند رہی، دل کا مدعا نہ کہا
مگر نگاہ نے اُس انجمن میں کیا نہ کہا

محیطِ شوق میں ہم ڈوبتے اُبھرتے رہے
خدا گواہ، کبھی جورِ ناخدا نہ کہا

صنم کدہ ہے کہ اک محفلِ خداوندان
بہت خفا ہُوا وہ بت، جسے خدا نہ کہا

ہزار خضر نما لوگ راستوں میں ملے
ہمارے دل نے کسی کو بھی رہنما نہ کہا

یہ کائنات تو ہے خیر مجھ سے بیگانہ
اگر نگاہ نے تیری بھی، آشنا نہ کہا



یوں بدلتی ہے کہیں برق و شرر کی صورت
قابلِ دید ہوئی ہے گلِ تر کی صورت

زلف کی آڑ میں تھی جانِ نظر کی صورت
رات گذری تو نظر آئی سحر کی صورت

ان کے لب پر ہے تبسم، مری آنکھوں میں سرور
کیا دکھائی ہے دعاؤں نے اثر کی صورت

قافلے والو نئے قافلہ سالار آئے
اب بدل جائے گی اندازِ سفر کی صورت

کیا کرشمہ ہے مرے جذبۂ آزادی کا
تھی جو دیوار کبھی، اب ہے وہ در کی صورت

اب کوئی حوصلہ افزائے ہنر ہے اختر
اب نظر آئے گی اربابِ ہنر کی صورت



ہر لمحہ عطا کرتا ہے پیمانہ سا اک شخص
آنکھوں میں لیے بیٹھا ہے میخانہ سا اک شخص

اور اس کے سوا انجمنِ ناز میں کیا ہے
ہے شمع سا اک شخص تو پروانہ سا اک شخص

خاموش نگاہوں میں قیامت کا اثر تھا
گذرا ہے سناتا ہوا افسانہ سا اک شخص

اک حسنِ مکمل ہے تو اک عشق سراپا
ہشیار سا اک شخص ہے، دیوانہ سا اک شخص

ہم جلوۂ اصنام سے بیزار ہیں لیکن
ملتا ہے وہاں روحِ صنم خانہ سا اک شخص

اختر انصاری اکبرآبادی



نظر سے صفحۂ عالم پہ خونیں داستاں لکھیے
قلم سے کیا حکایاتِ زمین و آسماں لکھیے

مٹا دے جو فضا کی تیرگی، ماحول کی پستی
کوئی ایسا بھی شعر اے شاعرانِ خوش بیاں لکھیے

بپا ہیں ہر جہت میں آتش و آہن کے ہنگامے
کہاں اس دور میں جور و جفائے مہوشاں لکھیے

خطر ہائے رہِ مجنوں کا قصہ کیوں بیاں کیجیے
نظر کو ناقۂ لیلیٰ، خرد کو سارباں لکھیے

یہی ہیں یادگارِ غنچہ و گل اس زمانے میں
انہیں سوکھے ہوئے کانٹوں سے ذکرِ گلستاں لکھیے

بیاں کرنے کو ہے طرزِ تپاکِ دوستاں کافی
اب اس دنیا میں کیا رنگِ غرورِ دشمناں لکھیے

روایاتِ کہن میں دلکشی باقی نہیں اختر
نئے انداز سے تاریخِ شہرِ گلرخاں لکھیے



رہنے دے یہ طنز کے نشتر اہلِ جنوں بیباک نہیں
کون ہے اپنے ہوش میں ظالم، کس کا گریباں چاک نہیں

جب تھا زمانہ دیوانوں کا، اب فرزانے آئے ہیں
جب صحرا میں لالہ و گل تھے، اب گلشن میں خاک نہیں

نقشوں کی ارزانی سے اب ایک اک تار آلودہ ہے
ہم دیکھیں کس کس کے دامن، ایک بھی دامن پاک نہیں

موجِ تلاطم خیز ہیں ہم، ساحل کے قریب آتے ہی نہیں
وقت کی رو میں بہہ جائیں ہم ایسے خس و خاشاک نہیں

درد و کرب سے حشر بپا ہونٹوں پہ تبسم ہے اختر
دل کا عالم کچھ بھی رہے آنکھیں تو مگر نمناک نہیں

بشیر احمد بشیر



گرفتِ زیست میں ہوں، قیدِ بے حصار میں ہوں
عذابِ عرصہ گہہِ جبر و اختیار میں ہوں

خیال ہے تو ابھی ڈھونڈ، پھر ملوں نہ ملوں
ابھی میں تیرے اُڑاتے ہوئے غبار میں ہوں

بھڑک رہا ہے بدن، روح کو خبر بھی نہیں
یہ کیا مقام ہے، یہ کیسے شعلہ زار میں ہوں

میں کون ہوں ترے نزدیک، یہ سوال نہیں
حباب ہوں کہ صدف، بحرِ بے کنار میں ہوں

خود اپنے آپ سے ہر دم ہوں برسرِ پیکار
میں اپنی ذات کے میدانِ کارزار میں ہوں

میں بھید کیا تجھے دوں بیکراں خلاؤں کے
کہ میں ازل سے اسی حلقۂ مدار میں ہوں

تلاش کس کی ہے مجھکو، ابھی یہ کیا سوچوں
بشیرؔ ابھی تو میں اپنے ہی انتظار میں ہوں

بشیر احمد بشیر



اک بے ثبات عکس بنا، بے نشاں گیا
میں گنجِ بے بہا تھا مگر رائگاں گیا

بھٹکا میں اپنی ذات کی وسعت میں سو بہ سو
میں اپنی جستجو میں کراں تا کراں گیا

تحریر اک اور تیر کے تحلیل ہو گئی
اک اور نقشِ لوحِ زمان و مکاں گیا

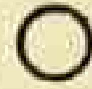
قائم ہوئے دلوں کے اَبد موج رابطے
اِک جنبشِ نظر میں غمِ دو جہاں گیا

کیا کیا چھپے نہ سبز رداؤں میں ریگزار
کیا کیا نہ لطفِ سختیٔ دشتِ تپاں گیا

جادو کا تھا دیار کوئی یا طلسمِ وہم
یہ دمِ زدن میں شہر کا منظر کہاں گیا

در کیا کھلے بشیرؔ خلائے بسیط کے
دل سے ہزار وسوسۂ آسماں گیا

بشیر احمد بشیر



دور تک چاروں طرف میرے سوا کوئی نہ تھا
پھر پلک جھپکی تو کیا دیکھا کہ خود میں بھی نہ تھا

اک تڑپ بجلی کی اور دیوار و در مٹی کے ڈھیر!
اک تڑپ شعلے کی اور دریاؤں میں پانی نہ تھا

دائرے بنتی صدائیں چھو کے جب حدِ اُفق
اپنے مرکز کی طرف لوٹیں تو کچھ باقی نہ تھا

قیدِ زندانِ جسد میں تھا یہ کب کشفِ وجود
اور بھی کچھ تھا میں، صرف اک پیکرِ خاکی نہ تھا

کیا خبر تم نے کہاں کس روپ میں دیکھا مجھے
میں کہیں موتی، کہیں پتھر، کہیں آئینہ تھا

دیں حساب روز و شب کیا، انکو، جنکے واسطے
کوئی ساعت، کوئی لمحہ، کوئی پل خالی نہ تھا

آرزوئے لعل و گوہر کی کس لئے کرتا بشیر
حرف و معنی کا خزینہ کیا اُسے کافی نہ تھا



ایسا تہِ افلاک خرابہ نہیں کوئی
اس دشت سے زندہ کبھی لوٹا نہیں کوئی

ہیبت وہ صداؤں میں کہ لرزے در و دیوار
گذرے وہ شب و روز کہ سویا نہیں کوئی

ویران سی ویران ہوئی دھیان کی بستی
چہرہ کسی چلمن سے جھلکتا نہیں کوئی

سر پھوڑ کے لوٹ آتی ہے جاتی ہے جو آواز
کیا گنبدِ آفاق میں رستہ نہیں کوئی

اک ایسی مسافت ہے کہ ساعت بھی کٹھن ہے
صدیوں کا سفر، اور کہیں سایہ نہیں کوئی

بے اسم نہیں کھلتا درِ گنجِ طلسمات
سطروں میں خزینے ہیں تماشا نہیں کوئی

دیکھی ہے بشیر اہل نظر کی بھی رسائی
باتیں مری سمجھے، مجھے سمجھا نہیں کوئی

بشیر احمد بشیر



یا مہ و سال کی دیوار گرا دی جائے
یا مری خاک خلاؤں میں اڑا دی جائے

کیسے آواز حریمِ رگِ جاں تک پہنچے
اتنی دوری سے تجھے کیسے صدا دی جائے

ہے تو پھر کون ہے اس اوٹ میں، دیکھوں تو سہی
درمیاں سے یہ مری ذات ہٹا دی جائے

تیرے بس میں ہے تو پھر یا مجھے پتھر کر دے
یا مری روح کی یہ پیاس بجھا دی جائے

چکھنے پائے نہ کوئی بوند یہ جلتی مٹی
ابر اٹھے تو ہوا تیز چلا دی جائے

کچھ دنوں بعد اُسے دیکھا تو دیکھا نہ گیا
جیسے اک جلتی ہوئی جوت بجھا دی جائے

یہ لہکتی ہوئی شاخیں، یہ مہکتی بیلیں
یہ ہرا کنج ـــــ یہیں عمر بتا دی جائے

آخر اس جنگ میں کچھ میرا بھی حصہ ہے بشیرؔ
میرے حصے کی مجھے کیوں نہ ردا دی جائے



جُدا بھی ہو کے وہ اک پل کبھی جُدا نہ ہُوا
یہ اور بات کہ دیکھے اسے زمانہ ہُوا

نہ پوچھ میرا پتہ، موجۂ ہوا ہوں میں
بھلا ہوا کا بھی کوئی کبھی ٹھکانہ ہوا!

ہر ایک سمت صحیفے کھلے پڑے تھے یہاں
ترا نصیب کہ تو حرف آشنا نہ ہوا

پناہ ملتی کسے میری کبریائی سے
خدا کا شکر میں بندہ ہوا، خدا نہ ہوا

اس اپنی کھوج میں کیا کیا کھُلے نہ بھید مگر
میں جس میں بھی پا کے نہیں، مجھ پہ آئینہ نہ ہُوا

ندائے غیب تھی، تیری صدا تھی، دھڑکن تھی
مرے شعور سے اتنا بھی فیصلہ نہ ہوا

شجر تو راہ کا سایہ ہیں، ان کو کیا معلوم
کہاں سے آیا مسافر، کدھر روانہ ہوا

فقیر ہو کے لیا تو نے کیا بشیرؔ کہ جب
گلیم پوش بھی تو ہو کے با صفا نہ ہوا

بشیر احمد بشیر



ہر گام پہ آوارگی و دربدری میں
اک دھیان کا سایہ ہے مری ہمسفری میں

تا حدِ نظر پگھلی ہوئی ریت کا دریا
کس سمت نکل آئے ہیں بے خبری میں

کس کی طرب انداز نظر گھول رہی ہے
اندوہ و غم و سوز مزاجِ بشری میں

کیا کوئی کہیں کنجِ خیابانِ سکوں ہے
اے دشتِ غمِ زیست تری بے شجری میں

اے قریۂ دل، دیکھ گزرتی ہے اسی طور
ہر شہر پہ بربادی و زیر و زبری میں

اہلِ طلبِ شوق زمانوں سے پڑے ہیں
عرصہ گہِ خود سوزی و حیراں نظری میں

لہرائے نہ لہرائے وہ اب برقِ خد و خال
اب ہم نہیں خار و خسِ آشفتہ سری میں

اک ہمدمِ دیرینہ کی یادوں کی کسک ہے
خوشبوئے خوش انفاسیٔ بادِ سحری میں

نگراں مری جانب نگہِ خوش ہنراں ہے
کچھ تو ہنر آخر ہے مری بے ہنری میں

اک شیشۂ صد پارہ کی صورت ہیں بشیر اب
حاصل یدِ طولیٰ تھا جنہیں شیشہ گری میں



قریہ قریہ خاک اڑائی، کوچہ گرد فقیر ہوئے
پورب پچھم ڈھونڈا اسکو، آخر گوشہ گیر ہوئے

کون ورق، کیا ربط تھا ان سے، کیا کہیے، کچھ یاد نہیں
چہرے کب دل میں آ ٹھہرے، کس لمحے تصویر ہوئے

سب اپنے ڈھونڈے، پھر بھی آج کے دن تک عاجز ہیں
ہائے وہ بات جو کہہ بھی نہ پائے اور دفترِ تحریر ہوئے

صدا گہری کی کھوج میں ڈوبی صدیاں ہم پر صرف ہوئیں
اک دو برس کی بات نہیں، ہم قرنوں میں تعمیر ہوئے

وہ شب، وہ شبخونِ عدو کا، کس اسلوب بیان کریں
گھائل کیسے پھر بن تڑپے، ہم کس طور اسیر ہوئے

کیا ہیں، کیا تو آج بھی دونوں خاک میں ہیں، کل بھی خاک بشیر
جینا ان کا، مرنا ان کا جو وجہِ خیرِ کثیر ہوئے

بشیر احمد بشیر



اِن چٹخنے پتھروں پر پاؤں دھرنا دھیان سے
ڈھل چکی ہے شام، وادی میں اترنا دھیان سے

جامد و ساکت سبھی، دیوار و در بہرے نہیں
گھر کی تنہائی ہو پھر بھی بات کرنا دھیان سے

کان مت دھرنا کسی آواز پر، کیسی بھی ہو
کوئی روکے بھی تو رستے میں ٹھہرنا دھیان سے

دیکھنا سایہ کہیں کوئی تعاقب میں نہ ہو
شہر کی ویران گلیوں سے گزرنا دھیان سے

راہ میں دیکھو کوئی منظر تو رکھنا ذہن میں
پھر کہیں فرصت ملے تو رنگ بھرنا دھیان سے

کتنے سورج تم سے پہلے اس سفر میں جل بجھے
اس جہانِ تیرہ خاطر پر ابھرنا دھیان سے

وقت کے ساتھ اپنے اندازے غلط نکلے بشیرؔ
کس قدر مشکل ہے پیاروں کا اترنا دھیان سے



کیسی کیسی تھیں اِنہی گلیوں میں زیبا صورتیں
یاد اِک اِک موڑ پہ آتی ہیں کیا کیا صورتیں

نیم شب ہوتے ہیں وا جس دم دریچے یاد کے
کس ادا سے جھانکتی ہیں اب وہ رعنا صورتیں

صورتیں کچھ دیکھ کر ایسا بھی آتا تھا خیال
خاک سے ایسی کہاں ہوتی ہیں پیدا صورتیں

لَوٹ کر پہلے بھی آئے تھے جب اُس شہر سے
اجنبی لگتی نہیں آنکھوں کو شناسا صورتیں

آج تک وہ دل کی دیواروں پہ ہیں کندہ بشیرؔ
پھر نظر آئیں نہیں جو ماہ سیما صورتیں

جعفر شیرازی



بجلی کڑکی، بادل گرجے، میں خاموش رہا
اس کہرام میں بھی اے دُنیا، میں خاموش رہا

صبح کی چاپ نے مجھ کو صدا دی، میں نے بات نہ کی
شام کی چُپ نے مجھ کو پکارا، میں خاموش رہا

کتنے گیت بکھیرتے موسم میرے سامنے آئے
میں تھا جاتی رُت کا سایا، میں خاموش رہا

گزرے میرے پاس سے ہو کر شور بھرے میلے
سیلِ حوادث، تُو نے دیکھا؟ میں خاموش رہا

کتنے پانی سر سے گزرے، میری زباں نہ کھلی
ساحل ساحل، دریا دریا، میں خاموش رہا

جعفر دیکھ کے غم برساتی زندگیوں کے سمے
بیت گئی اس دل پر کیا کیا، میں خاموش رہا

جعفر شیرازی



کہیں فضا میں کوئی ابر تیرنا تو چاہیے
کہاں ہوائیں کھو گئی ہیں، سوچنا تو چاہیے

یہ اور بات باغ باغ کر گئیں طبیعتیں
ذرا قریب سے ہنسی کو دیکھنا تو چاہیے

یہ مصلحت بھی کیا کہ دل کی وسعتیں ہوں منجمد
رگوں میں زندگی کا خون دوڑنا تو چاہیے

میں ان اُداسیوں کو، ان رفاقتوں کو کیا کروں
کرن کو جاگنا، ہوا کو بولنا تو چاہیے

انہیں بھی نوکِ سنگ سے ذرا ہلا کے دیکھ لوں
کہ پانیوں کا یہ سکوت توڑنا تو چاہیے

یہ کیا ہوا، بڑھا گئے سلسلے مجھے بھلا دیا
کہیں ملے تو جعفرؔ اس سے پوچھنا تو چاہیے

جعفر شیرازی



ارض و سما پہ رنگ تھا کیسا اُتر گیا
آندھی چلی تو شام کا چہرہ اُتر گیا

طوفاں کی زد، نہ شورِ تلاطم، مجھے بتاؤ
مَیں موج میں نہیں ہوں کہ دریا اُتر گیا

کیا کیا رہی کنارِ محبت کی دُھن مجھے
جن پانیوں میں اُس نے اُتارا، اُتر گیا

اک کشمکش میں اب ہیں سمندر پڑے ہوئے
صحرا کی تہ میں جیسے کوئی پیاسا اُتر گیا

بکھرا پڑا ہے خاک پہ یوں چاندنی کا جسم
جیسے مری ہی روح میں تیشہ اُتر گیا

جعفرؔ کبھی نہ یہ مرے وہم و گماں میں تھا
میں اور اُس کے دھیان سے ایسا اُتر گیا



سُورج چھپا اک اک گُلِ منظر بکھر گیا
شعلہ سا کوئی دل میں اتر کر بکھر گیا

تھا چاندنی کا جسم کہ شیشے کا تھا بدن
آئی ہوا تو گر کے زمیں پہ بکھر گیا

کل ہنس کے ریگِ دشت سے کہتی تھی زندگی
میں نے چھوا ہی تھا کہ وہ پتھر بکھر گیا

ندی پہ ایک نرم کرن نے رکھا جو پاؤں
چاروں طرف صدا کا سمندر بکھر گیا

جعفرؔ ہمارا دل بھی ہے وہ آئینہ کہ بس
کھائی ذرا نگاہ کی ٹھوکر، بکھر گیا

جعفر شیرازی



جان ایسے خوابوں سے کس طرح چھڑاؤں میں
شہر سو گیا سارا، اب کسے جگاؤں میں

پائمال سبزے پر دیکھ کر گرے پتّے
اب زمین سے خود کو کس طرح اٹھاؤں میں

اِن اکیلی راتوں میں، ان اکیلے رستوں پر
کس کے ساتھ آؤں میں، کس کے ساتھ جاؤں میں

ایک ہی سی تنہائی، ایک ہی سا سنّاٹا
دشت کیا ہے، دل کیا ہے، کیا تجھے بتاؤں میں

دیکھ، کیسے دن آئے، دیکھ، میں نہ کہتا تھا
تو قریب بھی آئے اور تجھے بلاؤں میں

آج سب میں گھل مل جاؤں، مجھ کو کیا خبر کل تک
کس کو یاد آؤں میں، کس کو بھول جاؤں میں

کتنے کام دنیا نے دے دیئے مجھے جعفرؔ
اشکِ غم گراؤں میں، بارِ غم اٹھاؤں میں



عکس جا بجا اپنی ذات کے گراتا ہے
کون آسمانوں سے آئینے گراتا ہے

میں نے روپ سنوارا ہے اس کی روح کا، اور وہ
میرے نقش ہی میرے سامنے گراتا ہے

عمر بھر اٹھائے گا دکھ مرے بکھرنے کا
آنکھ کی بلندی سے کیوں مجھے گراتا ہے

شعلۂ محبت اور آبِ اشک! اے ناداں!
روشنی کو دریا میں کس لیے گراتا ہے

وہ ہوا کا جھونکا بھی میرا سخت دشمن ہے
شاخ سے جو پتّے کو زور سے گراتا ہے

جذب کر نہ لے جعفرؔ سوچ لہر کی تجھ کو
تو کہاں سمندر میں کنکرے گراتا ہے

جعفر شیرازی



راستوں میں ڈھیر ہو کر بھول سے پیکر گرے
برگ کتنے آندھیوں کے پاؤں میں آ کر گرے

اے جنوں کی ساعتو! آمد بہاروں کی ہوئی
دیکھنا وہ شاخچوں سے تتلیوں کے پر گرے

تم نہ سن پائے صدا دل ٹوٹنے کی اور یہاں
شور وہ اٹھا، زمیں پر جس طرح امبر گرے

کون جانے کتنی یادوں سے ہوا دل زخم زخم
چاندنی برسی کہ میری روح پر خنجر گرے

منتظر ہوں غم کے اس طوفانِ ابر و باد میں
کب گھٹا کا شور کم ہو، کب ہوا تھک کر گرے

یوں ہوا ہوں جذب جعفر وقت کے طوفان میں
تہ میں گہرے پانیوں کی جس طرح کنکر گرے



دن ۔ دہکتی دھوپ نے مجھ کو جلایا دیر تک
رات ۔ تنہائی میں کالا ابر برسا دیر تک

تو یہ کہتا ہے کہ تو کل رات میرے ساتھ تھا
میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے تجھ کو ڈھونڈا دیر تک

پاس رکھ کر اُجلے اُجلے دودھ سے یادوں کے جسم
دیر سے بیٹھا ہوں میں بیٹھا رہوں گا دیر تک

پہلے تیری چاہتوں کے غم تھے اب فرقت کے دکھ
مجھ پہ اب طاری رہے گا یہ بھی عرصہ دیر تک

کون ٹھہرے آنے والے موسموں کے سامنے
کون خالی رکھ سکے طاقِ تماشا دیر تک

اب وہ باتیں اب وہ قصے کس طرح جعفر بھلائیں
ایسے صدموں کا اثر دل پر رہے گا دیر تک



دیکھوں تو مرے دل میں اُترتا ہے زیادہ
شعلہ کہ تہِ آب نکھرتا ہے زیادہ

کیا جانیے کیا بات ہے اب دشت کی نسبت
دل خامشیِ شہر سے ڈرتا ہے زیادہ

اندر کا وہی روگ اُسے بھی ہے مجھے بھی
بنتا ہے زیادہ وہ سنورتا ہے زیادہ

جو آنکھ کے جلتے ہوئے صحرا سے پرے ہے
یادل اُسی رستے سے گزرتا ہے زیادہ

رُخ شہر کی جانب ہے ہوا جنگل کی ہوا کا
اور شور مرے دل میں اُبھرتا ہے زیادہ

جعفر یہ لگا زخم محبت بھی عجب ہے
بڑھتا ہے زیادہ جو نہ بھرتا ہے زیادہ



بر سطحِ آب کوئی عکسِ ناتواں نہ پڑا
ہوا گزر بھی گئی اور کہیں نشاں نہ پڑا

بڑے سکون سے دیکھا ہے جلتے لمحوں کو
ہماری آنکھ میں ورنہ دھواں کہاں نہ پڑا

کٹھن بھی ایسا نہ تھا میری تیری صلح کا کام
کوئی بھی شخص مرے تیرے درمیاں نہ پڑا

ہوئے ہیں خاک خموشی کے دشت میں کھو کر
ہمارے کان میں ہی شورِ کارواں نہ پڑا

بلا کی دھوپ ہے جعفر، کسی کو ہوش نہیں
پڑا ہے ابر کا سایا کہاں — کہاں نہ پڑا

نور بجنوری



آس کے رنگیں پتھر کب تک غاروں میں لڑھکاؤ گے
شام ڈھلے ان کہساروں میں اپنا کھوج نہ پاؤ گے

جانے پہچانے سے چہرے اپنی سمت بلائیں گے
قدم قدم پر لیکن اپنے سائے سے ٹکراؤ گے

ہر ٹیلے کی اوٹ سے لاکھوں وحشی آنکھیں چمکیں گی
ماضی کی ہر پگڈنڈی پر نیزوں میں گھر جاؤ گے

پھنکاروں کا زہر تمہارے گیتوں پر جم جائے گا
کب تک اپنے ہونٹ، مری جاں! سانپوں سے ڈسواؤ گے

چیخیں گی بدمست ہوائیں اونچے اونچے پیڑوں میں
روٹھ کے جانے والے پتو! کب تک واپس آؤ گے؟

جادو نگری ہے یہ پیارے آوازوں پر دھیان نہ دو
پیچھے مڑ کر دیکھ لیا تو پتھر کے ہو جاؤ گے

نور بجنوری



عقل نے لاکھ اندھیروں میں چھپایا ہے تجھے
میرا وجدان مگر چوم کے آیا ہے تجھے

وہ طلسمات نظر آئے کہ دیکھے نہ سنے
جب بھی آنکھوں کے چراغوں میں جلایا ہے تجھے

رات بھیگی ہے تو چھیڑا ہے ترے درد کا ساز
چاند نکلا ہے تو پلکوں سے جگایا ہے تجھے

میں تو کیا، وقت بھی اب چھو نہ سکے گا تجھ کو
عشق نے مسندِ یزداں پہ بٹھایا ہے تجھے

وہ ترا حسن! کہ خیرہ تھی زمانے کی نظر
یہ مرا فن! کہ ترا عکس دکھایا ہے تجھے

آج بھی ذہن میں بجلی سی چمک اٹھتی ہے
کون بھولا ہے تجھے! کس نے بھلایا ہے تجھے!

جگمگاتی ہے مری روح، تو میں سوچتا ہوں
میں نے کھویا ہے مری جان کہ پایا ہے تجھے



لالہ و گل میں بکھر جائیں گے ہم
کون کہتا ہے کہ مر جائیں گے ہم

دن اسی فکر میں کاٹا ہم نے
رات آئی تو کدھر جائیں گے ہم

اور ہو جائے اندھیرا گہرا
زندگی، اور نکھر جائیں گے ہم

اور برہم ہو نظامِ ہستی
دل یہ کہتا ہے سنور جائیں گے ہم

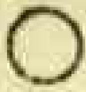
منتظر ہے کوئی کانٹوں سے پرے
پاؤں کٹ جائیں گزر جائیں گے ہم

دیکھ لیں ہم کو زمانے والے
سنگ و آہن میں اتر جائیں گے ہم

جگمگاتے ہوئے ایوانوں سے
آئینے کے گزر جائیں گے ہم

مٹ بھی جائیں گے تو مانندِ غبار
شاہراہوں پہ بکھر جائیں گے ہم

نورؔ جولاں ہے سمندِ وحشت
آج تا حدِّ نظر جائیں گے ہم



شاخ شاخ پہ موسمِ گل نے گجرے سے لٹکائے تھے
میں نے جس دم ہاتھ بڑھایا، سارے پھول پرائے تھے

کتنے درد چمک اٹھتے ہیں فرقت کے سناٹے میں
رات رات بھر جاگ کے ہم نے خود یہ زخم اگائے تھے

تیرے غموں کا ذکر ہی کیا، اب جانے دے یہ بات نہ چھیڑ
ہم دیوانے ملکِ جنوں میں بختِ سکندر لائے تھے

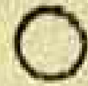
دل کی ویراں بستی مجھ سے اکثر پوچھا کرتی ہے
بستے ہیں کس دیس میں اب وہ لوگ، یہاں جو آئے تھے

پچھلی رات کو تارے اب بھی جھلمل جھلمل کرتے ہیں
کس کو خبر ہے اک شب ہم نے کتنے اشک بہائے تھے

آج جہاں کی تاریکی سے دنیا بچ کر چلتی ہے
ہم نے اس ویران محل میں لاکھوں دیپ جلائے تھے

مجھ کو ان سے پیار نہیں ہے، مجھ کو ان کے نام سے کیا
آنکھیں یوں ہی بھر آئی تھیں، ہونٹ یونہی تھرائے تھے

تنور بجنوری



جگمگ جگمگ اس کی آنکھیں میرا سینہ جلتا تھا
چاند ہمارے آگے آگے مشعل لے کر چلتا تھا

راہگذر تھی ہلکی ہلکی ایک طلسمی خوشبو سے
تیز ہوا میں اس کا آنچل کیا کیا رنگ بدلتا تھا

جھلمل جھلمل کرتے سپنے پہلی پہلی چاہت کے
سینۂ شب پر اس کے قدم تھے یا خورشید نکلتا تھا

پھول سا چہرہ دہکا دہکا زلفوں کی شادابی میں
عالمِ امکاں چپکے چپکے اپنی آنکھیں ملتا تھا!

سرخ لبوں کی پنکھڑیاں جب ہنسنے سے کھل جاتی تھیں
قوسِ قزح کا ریشم ان پر شبنم وار مچلتا تھا

ایک پرندہ چیخ رہا تھا مسجد کے میناروں پر
دور کہیں گنگا کے کنارے اس کا سورج ڈھلتا تھا

شہرِ وفا میں جا نکلے تھے ہم بھی نورؔ سے ملنے کو
وہ دیوانہ اک پرچھائیں سے کے ہمراہ ٹہلتا تھا



اک ترنم سا مرے پاؤں کی زنجیر میں ہے
پھر کوئی فصلِ بہاراں مری تقدیر میں ہے

جھلملاتے ہیں ستارے کہ دیئے جلتے ہیں
کچھ اجالا سا تری زلفِ گرہ گیر میں ہے

کچھ ترا حسن بھی ہے سادہ و معصوم بہت
کچھ مرا پیار بھی شاملِ تری تصویر میں ہے

اور بڑھتی ہے اسی شخص کی چاہت ناصح
یہ کرامات عجب آپکی تقریر میں ہے

اپنی کھوئی ہوئی چھینی ہوئی جنت کا سراغ
حلقۂ دار میں ہے، جنبشِ شمشیر میں ہے

میں جو چاہوں تو پگھل جائیں جدائی کے پہاڑ
یہ بھی تاثیر مرے نالۂ شب گیر میں ہے

ماہ و خورشید زمیں پر نہیں اترے اب تک
میرا ہر خواب ابھی پردۂ تعبیر میں ہے

نور بجنوردی



دل کے صحرا میں کوئی آس کا جگنو بھی نہیں
اتنا رویا ہوں کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں

اتنی بے رحم نہ تھی زیست کی دوپہر کبھی
ان خرابوں میں کہیں سایۂ گیسو بھی نہیں

کاسۂ درد لیے پھرتی ہے گلشن کی ہوا
میرے دامن میں ترے پیار کی خوشبو بھی نہیں

چھن گیا میری نگاہوں سے بھی احساس جمال
تیری تصویر میں پہلا سا وہ جادو بھی نہیں

موج در موج ترے غم کی شفق کھلتی ہے
مجھ کو اس سلسلۂ رنگ پہ قابو بھی نہیں

دل وہ کم بخت کہ دھڑکے ہی چلا جاتا ہے
یہ الگ بات کہ تو زینتِ پہلو بھی نہیں

یہ عجب راہگذر ہے کہ چٹانیں تو بہت
اور سہارے کو تری یاد کے بازو بھی نہیں

حادثہ یہ بھی گذرتا تھا، مری جاں، ہم پر
پیکرِ سنگ ہیں دو، میں بھی نہیں، تو بھی نہیں



زلزلہ آیا وہ دل میں وقت کی رفتار سے
خود بخود تصویر تیری گر پڑی دیوار سے

چپکے چپکے کھینچتا جاتا ہوں کانٹوں کا حصار
یوں کہ اب ڈرنے لگا ہوں پھول کی مہکار سے

ہم بلانوشوں نے زہرِ آگہی بھی پی لیا
چلتے چلتے ہم بھی ٹھوکر کھا گئے کہسار سے

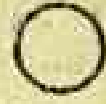
جن کو آنکھوں سے لگایا، جن کو رو رو کر پڑھا
ہائے وہ خط بھی نظر آنے لگے بیکار سے

دیدۂ یعقوب ہر چہرے میں ہے گریہ کناں
ہم بہت اکتا گئے ہیں مصر کے بازار سے

ہم سے شکوہ کر رہا تھا آج دامانِ تہی
توڑ لائے ماہ و انجم سنکر کے گلزار سے

نورؔ صاحب، کھل نہ جائے ترکِ اُلفت کا بھرم
آپ کی خاموشیوں سے، آپ کے اشعار سے

نور بجنوری



کسی کی یاد کے جگنو بھی کھو گئے اب تو
اب ان اجاڑ گھنے جنگلوں سے بھاگ چلو

بلا کا شور ہے لمحات کی روانی میں
کوئی گذرتے ہوئے وقت کو ذرا روکو

وہ آندھیاں ہیں کہ دل کانپ اٹھتا ہے
مرے اداس خیالو، کواڑ مت کھولو

یہی ہے دشتِ وفا کے مسافروں کا چلن
جو چل سکو تو بگولوں کے ساتھ ساتھ چلو

دھواں دھواں رہی برسوں نگاہ و دل کی فضا
بھڑک بھڑک کے بجھا شعلۂ جنوں یارو

تمام رات جو لڑتا رہا گھٹاؤں سے
ادھر وہ آخری تارا بھی چھپ گیا، دیکھو



دل کے داغوں میں ستاروں کی چمک باقی ہے
شبِ فرقت ابھی دو چار پلک باقی ہے

سرخ ہونٹوں کے دیے ذہن میں روشن ہیں ابھی
ابھی افکار میں زلفوں کی مہک باقی ہے

بازوؤں میں ترے پیکر کی لطافت رقصاں
انگلیوں میں، تری باہوں کی لچک باقی ہے

قصرِ پرویز میں گم ہو گئی شیریں کی صدا
دامنِ کوہ میں تیشے کی دھمک باقی ہے

صرصرِ جور نے ہر چند خزاں بکھرائی
پھول میں آگ، شگوفوں میں لہک باقی ہے

گل کھلائے گی ابھی اور نہ جانے کیا کیا
یہ جو پہلو میں مہکتی سی کسک باقی ہے

امین راحت چغتائی



جرسِ مے نے پکارا ہے، اٹھو اور سنو
شیخ آئے ہیں سوئے میکدہ، لو اور سنو

کس طرح اُجڑے سلگتی ہوئی یادوں کے دیئے
ہمدمو، دل کے قریب آؤ، رُکو اور سنو

زخمِ ہستی ہے، کوئی زخمِ محبت تو نہیں
ٹیس اُٹھے بھی تو فریاد نہ ہو اور سنو

خود ہی ہر گھاؤ پہ کہتے ہو، زباں گنگ رہے
خود ہی پھر پُرسشِ احوال کرو اور سنو

داستاں کہتے ہیں جلتے ہوئے پھولوں کے چراغ
ابھی کچھ اور سنو، دیدہ ورو! اور سنو

شہرِ یاروں کے ہیں ہر گام پہ چرچے راحتؔ
یہ وہ بستی ہے کہ بس کچھ نہ کہو اور سنو

امین راحت چغتائی



آج وہ پھول بنا حسنِ دل آرا دیکھا
سچ ہوا پچھلے برس جو بھی کہا تھا، دیکھا

دھیان میں لائے، تصور میں بسایا، دیکھا
اُتنا ہی اجنبی پایا اُسے جتنا دیکھا

کس وسیلے سے بھلا عرضِ تمنا کرتے
ہم نے جس وقت بھی دیکھا اُسے تنہا دیکھا

کب سے احساس پہ اک بوجھ لیے پھرتے ہیں
کاش پوچھو کہ بھری بزم میں کیا کیا دیکھا

شاہراہوں کے گھنے پیڑ کٹے ہیں جب سے
چونک اُٹھتے ہیں جہاں اپنا بھی سایا دیکھا

دفعتاً آ گیا پھر ڈوبتے سورج کا خیال
شام کے وقت جو دریا کا کنارا دیکھا

امین راحت چغتائی



ہو سکے تو دلِ صد چاک دکھایا جائے
اب بھری بزم میں احوال سنایا جائے

ہائے اس جانِ تمنا سے نبھے گی کیسے
ہم سے تو راز نہ اک روز چھپایا جائے

اپنا غم ہو تو اسے کہہ کے سکوں مل جائے
اس کا غم ہو تو کسے جا کے سنایا جائے

رات بھر جن کی ضیا سے رہے روشن کمرے
صبحدم اُن ہی چراغوں کو بجھایا جائے

دھیان میں جس کے کئی جاگتی راتیں گزریں
راحت اِک رات اُسے بھی تو جگایا جائے



مَیں تری دسترس سے بہت دُور تھا
پھر بھی نزدیک آنے پہ مجبور تھا

آج مَیں ہی سزا وارِ جور و ستم
کل تری مانگ کا مَیں ہی سیندھور تھا

کون آتا ہے یوں زیرِ دام ان دنوں
رات تاریک تھی، آشیاں دُور تھا

کچھ خلوصِ دعا پر بھی نادم تھا مَیں
اور کچھ دل کے زخموں سے بھی چُور تھا

آئینہ دیکھ کر یوں ندامت ہوئی
مَیں کہ راحت ہوں اب، پہلے منصور تھا

امین راحت چغتائی



مرے بدن سے کبھی آنچ اس طرح آئے
لپٹ کے مجھ سے مرے ساتھ وہ بھی جل جائے

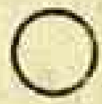
میں آگ ہوں تو مرے پاس کوئی کیوں بیٹھے
میں راکھ ہوں تو کوئی کیوں کریدنے آئے

بھرے دیار میں اب اس کو کس طرح ڈھونڈیں
ہوا چلے تو کہیں بوئے ہم نفس آئے

یہ رات اور روایات کی یہ زنجیریں
گلی کے موڑ سے دو لوٹتے ہوئے سائے

وہی بدن، وہی چہرہ، وہی لباس مگر
کوئی کہاں سے بساون[1] کا موقلم لائے

کوئی تو بات ہوئی ہے عجیب سی راحت
کہ آئینہ بھی نہ وہ چھوڑے اور شرمائے



زندگی ایک سزا ہو جیسے
کسی گنبد کی صدا ہو جیسے

رات کے پچھلے پہر دھیان ترا
کوئی سائے میں کھڑا ہو جیسے

آم کے پیڑ پہ کوئل کی صدا
تیرا اسلوبِ وفا ہو جیسے

یوں بھڑک اٹھے ہیں شعلے دل کے
اپنے دامن کی ہوا ہو جیسے

رہ گئے ہونٹ لرز کر اپنے
تیری ہر بات بجا ہو جیسے

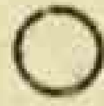
دور تکتا رہا منزل کی طرف
راہرو آبلہ پا ہو جیسے

یوں ملا آج وہ راحت ہم سے
ایک مدت سے خفا ہو جیسے

---

[1] شہنشاہ اکبر کے دربار کا ایک ممتاز مصور

امین راحت چغتائی



ہمیں تھے جانِ بہاراں، ہمیں تھے رنگِ طرب
ہمیں ہیں بزم سے دلگیر میں آج مہر بلب

وہی تجھے بھی نظر آئے بے ادب، جو لوگ
فقیہِ شہر سے اُلجھے تری گلی کے سبب

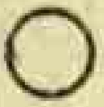
خیال و فکر کے پھر سلسلے سلگ نہ اُٹھیں
کہ چھو رہی ہے دلوں میں ہوائے گیسوئے شب

بس ایک جام نے رندوں کی آبرو رکھ لی
وگرنہ کم نہ تھا واعظ کا شورِ غیظ و غضب

چلو کلی کے تبسم کا راز پوچھ آئیں
گلوں کے قافلے چل دیں چمن سے جانے کب

ابھی سے دھڑکنیں خاموش ہوتی جاتی ہیں
عجیب ہوگا سماں وہ بھی تم نہ آؤ گے جب

ہمیں ہی تابِ سماعت نہ ہو سکی راحت
فسانہ خواں نے تو چھیڑا تھا ذکرِ عہدِ طرب



کیا بتائیں، کہاں کہاں تھے پھول
خاک اڑتی ہے اب، جہاں تھے پھول

بھیگی بھیگی سی دیکھ کر کلیاں
مسکرائے، جہاں جہاں تھے پھول

دل میں گلشن کھلا گئے کیا کیا
یوں تو دو دن کے میہماں تھے پھول

جب خزاں آئی، جاں پہ کھیل گئے
محرمِ عہدِ بیکراں تھے پھول

جس نے توڑا، اُسی کو رنج ہوا
مثلِ پیمانۂ مغاں تھے پھول

دن کی ظلمت نصیب بستی میں
راہگیروں کی کہکشاں تھے پھول

امین راحت چغتائی



جو میکدے سے بھی دامن بچا بچا کے چلے
تری گلی سے جو گزرے تو لڑکھڑا کے چلے

ہمیں بھی قصۂ دار و رسن سے نسبت ہے
فقیہہِ شہر سے کہہ دو، نظر ملا کے چلے

کوئی تو جانے کہ گزری ہے دل پہ کیا جب بھی
خزاں کے باغ میں جھونکے خنک ہوا کے چلے

اب اعترافِ جفا اور کس طرح ہو گا!
کہ تیری بزم میں قصے مری وفا کے چلے

ہزار ہونٹ سِلے ہوں تو کیا، فسانۂ دل
سنانے والے نگاہوں سے بھی سنا کے چلے

کہیں سراغِ چمن مل ہی جائے گا راحتؔ
چلو اُدھر کو جدھر قافلے صبا کے چلے



منزلِ شمس و قمر سے گذرے
جب تری راہگزر سے گذرے

شب کی گاتی ہوئی تنہائی میں
کتنے طوفاں تھے جو سر سے گذرے

وہیں بہت بھیڑ نے پڑاؤ ڈالا
قافلے گل کے جدھر سے گذرے

ہر طرف ثبت ہیں قدموں کے نشاں
کوئی کس راہگزر سے گذرے

کس قدر خود پہ ہمیں پیار آیا
آج جب اپنی نظر سے گذرے

سرخئ گل سے بھی چونکے گل رخ
وُہ زمانے بھی نظر سے گذرے

دشت و صحرا کا بھی دامن سمٹا
تیرے دیوانے جدھر سے گذرے

خود نگر ہو گئے راحتؔ ہم بھی
آج وہ کاش اِدھر سے گذرے

شفقت تنویر مرزا



ہمارے پاس تھا جو کچھ، لُٹا کے بیٹھ رہے
دیارِ دل میں قیامت اُٹھا کے بیٹھ رہے

وہاں جہاں پہ اندھیروں کا کارواں اُترا
کسی امید پہ شمعیں جلا کے بیٹھ رہے

تمہارے ہجر میں جو کچھ گذر گئی، گذری
تمہارے وصل میں ہم گھر جلا کے بیٹھ رہے

کہاں کے دار و رسن اور کیا شہیدِ وفا
یہ کاروبار بھی کل پھر اٹھا کے بیٹھ رہے

خبر نہ تھی کہ زماں آشکار تھے جو کبھی
وہ پردہ دار تو چلمن گرا کے بیٹھ رہے

کڑکتی دھوپ میں دشتِ سفر سے گھبرا کر
فصیلِ شہر کے سائے میں آ کے بیٹھ رہے

زمانہ کچھ تو کہے ان سے جو بجیلۂ دل
کسی کی بزم سے ہم کو اٹھا کے بیٹھ رہے

گری ہے گھر کی کڑی پر کڑی تو گھر والے
غبارِ شرم میں چہرے چھپا کے بیٹھ رہے

وہ طفلِ مکتبِ رسمِ وفا ہمیں تو نہ تھے
جو اپنی یادوں کا میلہ لگا کے بیٹھ رہے

ہے بازگشت ہی شاید مری فغاں کا جواب
"خدا" تو اپنی ہی قبروں پہ جا کے بیٹھ رہے

وہ ناخدا تھے زمانے میں معتبر جو سدا
سمندروں میں سفینے بہا کے بیٹھ رہے

شفقت تنویر مرزا



رنگوں، لفظوں، آوازوں سے سارے رشتے ٹوٹ گئے
سیلِ بلا میں دشتِ خلا کے کتنے کنارے ٹوٹ گئے

گونگے بہرے لوگوں سے اب ساری عمر نباہنا ہے
جینا مرنا ایک برابر، کچے دھاگے ٹوٹ گئے

دل کے گرد حصار کھنچا تو اس کا ملنا محال ہوا
چاروں کھونٹ آوارہ پھرے جب پاؤں بھی اپنے ٹوٹ گئے

کھنڈر کھنڈر سب آوازوں سے گونج پڑیں گے، بولو تو
ایک صدا وہ تھی جس سے محلوں کے کنگرے ٹوٹ گئے

شیشہ و سنگ کے کھیل کے سائے میں رہنے والے لوگو
اک اک کرکے دل میں چبھو لو، جو جو شیشے ٹوٹ گئے

شور شرابا، خون خرابہ، جو بھی ہو کچھ کم بھی نہیں
شہر پناہ کے آہنی بوجھل سب دروازے ٹوٹ گئے

چپ کے بندھن ٹوٹیں گے تو پاؤں میں لوہا بولے گا
پھر دیکھو گے، سانس کے سارے رشتے ناطے ٹوٹ گئے

رونا ہنسنا دونوں ہی بیکار ہیں دنیا والوں کو
یہی ہوا نا، تیرے میرے دونوں کھلونے ٹوٹ گئے

آج کی رات ہماری ہے اور آج کی رات سویرے تک
سب کا ماتم کرنا ہوگا، جو جو تارے ٹوٹ گئے



قربتِ حسن میں بھی درد کے آثار ملے
چارہ گرِ عشق کے مرہم کے طلبگار ملے

دست و پا اپنے تو وابستۂ زنجیر سہی
اک تمنا تھی، کوئی صاحبِ دستار ملے

ہاں جنوں خیزیِ دل رہنِ مسرت نہ ہوئی
خوش ہوئی وحشتِ غم، جب رسن دار ملے

خاک اڑائیں کہ نئے شہر بسائیں یارو
ہم بہر رنگ ہر اک شوق سے بیزار ملے

ہم ہیں اس کارگہِ شیشہ گراں میں حیراں
آئینے تابِ نظارہ کے طلبگار ملے

شوقِ بے منتِ احساں، دگر کیا کہیے
خود سے اس شوق میں ہم برسرِ پیکار ملے

وحشتِ مجنوں تھا کوئی، تیشۂ فرہاد کوئی
عشرتِ مرگ سہی، حیلۂ بے کار ملے

خواہشِ مرگِ درِ یار، تمنا ہی سہی
سرِ گردش پہ ہم کو بھی گراں بار ملے

شب قیامت سی گذر جاتی ہے تنہائی میں
بخت یاور ہے جسے دیدۂ بیدار ملے

اپنے ہمسائے میں وہ ہے جسے دیکھا بھی نہیں
ایسے ہمسائے کہ دیوار سے دیوار ملے



صدیوں تمہاری یاد میں شمعیں جلائیں گے
پل بھر کے بعد پھر بھی تمہیں بھول جائیں گے

تعبیرِ مدعا طلبِ ذوق ہو گئی
بنیادِ درد ہو گی تو دیوار اٹھائیں گے

اب کاہشِ جنوں کا کوئی سلسلہ نہیں
ہاں بے دلی سے دستِ دعا بھی اٹھائیں گے

اے کاروانِ تیز قدم ماندگاں کو دیکھ
آنکھوں میں کیا غبارِ سرِ رہ سجائیں گے

لکھیں گے قہقہوں سے بس اک داستانِ دل
اس پر حدیثِ درد کا عنواں جمائیں گے

یونہی سہی جو گرمیِ بازار ہم سے ہے
ہم بیچ کر ضمیر نظر مسکرائیں گے

یا چاکِ دل کو چاکِ گریباں بنا سکیں
یا دخترانِ مصر سے دامن بچائیں گے

کیا خلشِ عمر حیلۂ مرگ آشنا نہیں
اٹھے گی موجِ ریگِ رواں ڈوب جائیں گے

حرف آشنا نہ ہو گی کوئی موجِ دردِ دل
سینے پہ رکھ کے ہاتھ مگر بیٹھ جائیں گے

شفقت تنویر مرزا



ہم خرابے میں بسر کر گئے خاموشی سے
حلقۂ موج میں گوہر گئے خاموشی سے

ساعتِ وصل، قیامت کی گھڑی ٹھہری تھی
جسم خاموش تھے، دل ڈر گئے خاموشی سے

آزمائش تھی کڑی کوئے وفا میں کہ جہاں
کج کلہ آئے، سبک سر گئے خاموشی سے

ہم ترے ہجر میں آوارہ سخن ہو نکلے
زخم جو تو نے دیئے بھر گئے خاموشی سے

شکوہ سنجِ غمِ منزل تھے فقط ہم ورنہ
کارواں کتنے سفر کر گئے خاموشی سے

کوئے محبوب کی شمعوں کو خبر ہے کہ نہیں
سائے کس سمت برابر گئے خاموشی سے

دکھ کے سناٹے میں یاد آئیں گے تجھ کو ہم سے
جو ترے در پہ صدا کر گئے خاموشی سے

جانے زنداں کے در و بام کا انداز ہے کیا
نعرہ زن آئے جو، اکثر گئے خاموشی سے

کچھ تو تھی لوحِ ازل باعثِ بربادیٔ دل
وارہ احباب بھی کچھ کر گئے خاموشی سے

کوئی منعم نہ ملا دل کا غنی یا قسمت !
در بدر تیرے گداگر خاموشی سے



ریگِ رواں پہ نقشِ کفِ پا نہ دیکھنا
آئینۂ ضمیر میں چہرا نہ دیکھنا

بے صرفہ ہے لہو کی تمازت مجھے لیے
اسرارِ جسم و جاں کو برہنہ نہ دیکھنا

جو آنسوؤں کے لعل و جواہر بکھیر دے
اس ایک موجِ درد کو اٹھتا نہ دیکھنا

راتوں کا چین، دن کا سکوں ہو اگر عزیز
چلتا ہے ساتھ ساتھ جو سایہ نہ دیکھنا

ہے شب کی آستیں میں گناہوں کی روشنی
زخمِ نظر سے صورتِ زیبا نہ دیکھنا

ہم بھی فصیلِ شہر کے سائے میں آ گئے
وا ہو درِ مراد تو صحرا نہ دیکھنا

یہ احتیاطِ وضعِ جنوں ہی نہیں، مگر
راہِ وفا میں اپنے کو بیگانہ دیکھنا

ہر شاخ پر جلے ہوئے لمحوں کی راکھ ہے
فصلِ بہار، زخمِ تمنا نہ دیکھنا



شق عافیت کنار کنارے کو کر گئی
دریا کی موج سر کو پٹک کر گزر گئی

تہمت کا سیل صبح کو اٹھنے لگا کہ شب
دستک تھی ایک در پہ صدا در بدر گئی

غارت گرِ سکوں نفسِ نوائے خوش لب
جنگل کی شام شہر میں آئی تو ڈر گئی

روتا پھرے گا رات کے رستوں پہ ماہتاب
آغوشِ ارضِ خاک تو سورج سے بھر گئی

آرامِ جاں تھا، خوابِ سکوں، آنکھ جب کھلی
سیلِ فنا اتر گیا، مٹی بکھر گئی

ناکردہ کاریوں کی پشیمانیاں نہ پوچھ
عمرِ عزیز ڈھونڈتے پھریئے کدھر گئی

تیرے حضور کون سا نذرانہ تھا قبول
دل سا گہر بھی لے کے مری چشمِ تر گئی

دیوار و در پہ جن کے لہو بولتا رہا
موجِ فنا وہ سارے مکاں ڈھیر کر گئی

خوشبوئے مرگ کا نہ ٹھکانہ ملا کوئی
میں بھی غبارِ راہ رہا، وہ جدھر گئی
اب گوشِ بے صدا ہوئے ہم لوگ تو، تو کیا
آواز دور کی تھی سماعت سفر گئی



ہم نے تو یہی معرکہ مارا ہے سفر میں
منزل کی طرح بیٹھ گئے راہ گذر میں

وہ شمعِ شبِ انجام کی صورت تو نہیں تھا
اک پل میں شبِ نصف اتر آئی ہے گھر میں

اے نالۂ دلدوز تڑپ اٹھی خموشی
ہے مرگِ تماشا کسی آباد نگر میں

ہم خاک کے تودے پہ کھڑے پوچھ رہے ہیں
کیا لطف ملا تم کو سمندر کے سفر میں

ہم سایۂ دیوارِ شکستہ میں پڑے تھے
ڈھونڈو گے تو پاؤ گے ہمیں سایۂ در میں

یہ مرحلۂ قطعِ تعلق تو کٹھن تھا
اک درد کا دریا بھی ہے اب دیدۂ تر میں

اک عمر کے رشتوں کو فنا پل میں ملی ہے
ہم ڈھونڈنے کیا نکلے ہیں صدیوں کے سفر میں

تاریک و خنک خاک کا پیوند ہوئے ہیں
ہم تول کے لائے تھے جنہیں لعل و گہر میں

یوں تیری طرح دور کی منزل کے مسافر
سب کچھ تو نہیں چھوڑ کے جاتے کبھی گھر میں



لوگ ہیں منتظرِ نورِ سحر مدت سے
مَیں بھی بیٹھا ہوں سرِ راہ گزر مدت سے

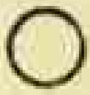
مدتوں دار و رسن زیست کا عنوان رہے
موردِ سنگ ہیں اس شہر میں سر مدت سے

جس کی منزل کا نشاں تک بھی نہیں نظروں میں
کب سے اس راہ میں ہیں محوِ سفر مدت سے

وہ کوئی دشت و بیاباں ہو کہ آبادی ہو
بن چکے ہیں سبھی شعلوں کے نگر مدت سے

ریگزاروں میں ہے لوگوں کو ٹھکانوں کی تلاش
منتظر اپنے مکینوں کے ہیں گھر مدت سے

پا بہ زنجیر ہیں، امکانِ رہائی تو کجا
زنگ آلود ہیں زندانوں کے در مدت سے



برسی ہیں وہ آنکھیں کہ نہ بادل کبھی برسے
اندازۂ غم کیا ہو مگر دیدۂ تر سے

وہ چارہ گری تھی کہ عزیزوں کی دعائیں
لوٹ آئی ہیں ماتم کے لئے بابِ اثر سے

اک جبرِ مسلسل ہے عناصر کی کہانی
مختار کہے جاتے تھے، جب نکلے تھے گھر سے

شاید کوئی منزل نہیں اس راہ میں پڑتی
واپس نہیں آتا کوئی یادوں کے سفر سے

کس عشرتِ رفتہ کی یہ وحشت اثری ہے
دل ڈوب گیا قربِ شبِ وصل کے ڈر سے

حبیب جالبؔ



غالبؔ و یگانہؔ سے لوگ بھی تھے جب تنہا
ہم سے طے نہ ہو گی کیا منزلِ ادب تنہا

فکرِ انجمن کس کو، کیسی انجمن پیارے
اپنا اپنا غم سب کا، سوچیے تو سب تنہا

سن رکھو، زمانے کی کل زباں پہ ہو گی
ہم جو بات کرتے ہیں آج زیرِ لب تنہا

اپنی رہنمائی میں کی ہے زندگی ہم نے
ساتھ کون تھا پہلے، ہو گئے جو اب تنہا

مہر و ماہ کی صورت مسکرا کے گزرے ہیں
خاکدانِ تیرہ سے ہم بھی روز و شب تنہا

کتنے لوگ آ بیٹھے پاس مہرباں ہو کر
ہم نے خود کو پایا ہے تھوڑی دیر جب تنہا

یاد بھی ہے ساتھ اُن کی اور غمِ زمانہ بھی
زندگی میں اے جالبؔ ہم ہوئے ہیں کب تنہا

حبیب جالب



مہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محوِ تماشائے سرِ راہ گزر ہیں

حسرت سی برستی ہے در و بام پہ ہر سُو
روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں

آئے تھے یہاں جن کے تصوّر کے سہارے
وہ چاند، وہ سورج، وہ شب و روز کدھر ہیں

سوئے ہو گھنی زلف کے سائے میں ابھی تک
اے راہرواں! کیا یہی اندازِ سفر ہیں؟

وہ لوگ، قدم جن کے لیے کاہکشاں نے
وہ لوگ بھی اے ہمنفسو! ہم سے بشر ہیں

بک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سرِ بازار
ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گہر ہیں

ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
ہم نزہتِ مہتاب ہیں، ہم نورِ سحر ہیں

حبیب جالب



اب تیری ضرورت بھی بہت کم ہے مری جاں
اب شوق کا کچھ اور ہی عالم ہے مری جاں

اب تذکرۂ خندۂ گل ، بار ہے جی پر
جاں وقفِ غمِ گریۂ شبنم ہے مری جاں

رُخ پر ترے ، بکھری ہوئی یہ زلفِ سیہ تاب
تصویرِ پریشانیٔ عالم ہے مری جاں

یہ کیا کہ تجھے بھی ہے زمانے سے شکایت
یہ کیا کہ تری آنکھ بھی پُرنم ہے مری جاں

ہم سادہ دلوں پر یہ شبِ غم کا تسلّط
مایوس نہ ہو ، اور کوئی دم ہے مری جاں

یہ تیری توجہ کا ہے اعجاز کہ مجھ سے
ہر شخص ترے شہر کا برہم ہے مری جاں

اے نزہتِ مہتاب، ترا غم ہے مری زیست
اے نازشِ خورشید، ترا غم ہے مری جاں



یہ اُجڑے باغ ، ویرانے پُرانے
سناتے ہیں کچھ افسانے پُرانے

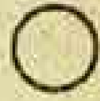
اک آہِ سرد بن کر رہ گئے ہیں
وہ بیتے دن ، وہ یارانے پُرانے

جنوں کا ایک ہی عالم ہو کیونکر
نئی ہے شمع ، پروانے پُرانے

نئی منزل کی دشواری مسلّم
مگر ہم بھی ہیں ، دیوانے پُرانے

ملے گا پیار غیروں ہی میں جالبؔ
کہ اپنے تو ہیں بیگانے پُرانے

حبیب جالب



ہم نے سُنا تھا صحنِ چمن میں کیف کے بادل چھائے ہیں
ہم بھی گئے تھے جی بہلانے، اشک بہا کر آئے ہیں

پھول کھلے تو دل مرجھائے، شمع جلے تو جان جلے
ایک تمہارا غم اپنا کر کتنے غم اپنائے ہیں

ایک سُلگتی یاد، چمکتا درد، فروزاں تنہائی
پوچھ نہ اس کے شہر سے ہم کیا کیا سوغاتیں لائے ہیں

سوئے ہوئے جو درد تھے دل میں، آنسو بن کر بہ نکلے
رات ستاروں کی چھاؤں میں یاد وہ کیا کیا آئے ہیں

آج بھی سورج ڈوب گیا بے نور اُفق کے ساگر میں
آج بھی پھول چمن میں تجھ کو بِن دیکھے مُرجھائے ہیں

ایک قیامت کا سنّاٹا، ایک بلا کی تاریکی
اُن گلیوں سے دور نہ ہنستا چاند نہ روشن سائے ہیں

پیار کی بولی بول نہ جالبؔ اس بستی کے لوگوں سے
ہم نے سُکھ کی کلیاں کھو کر دکھ کے کانٹے پائے ہیں



شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں

پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں، ان مکینوں میں

دیکھ کر دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ
سانپ ہوتے ہیں آستینوں میں

قہر کی آنکھ سے نہ دیکھ اُن کو
دل دھڑکتے ہیں آبگینوں میں

آسمانوں کی خیر ہو یا رب
اک نیا عزم ہے زمینوں میں

وہ محبت نہیں رہی جالبؔ
ہم صفیروں میں، ہم نشینوں میں

حبیب جالب



جب کوئی کلی صحنِ گلستاں میں کھلی ہے
شبنم مری آنکھوں میں وہیں تیر گئی ہے

جس کی سرِ افلاک بڑی دھوم مچی ہے
آشفتہ سری ہے، مری آشفتہ سری ہے

اپنی تو اُجالوں کو ترستی ہیں نگاہیں
سورج کہاں نکلا ہے، کہاں صبح ہوئی ہے

بچھڑی ہوئی راہوں سے جو گزرے ہیں کبھی ہم
ہر گام پہ کھوئی ہوئی اک یاد ملی ہے

اک عمر سنائیں تو حکایت نہ ہو پوری
دو روز میں ہم پر جو یہاں بیت گئی ہے

ہنسنے پہ نہ مجبور کرو، لوگ ہنسیں گے
حالات کی تفسیر تو چہرے پہ لکھی ہے

مل جائیں کہیں وہ بھی تو اُن کو بھی سنائیں
جالبؔ یہ غزل جن کے لیے ہم نے کہی ہے



اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں، یہی بات بڑی بات ہے پیارے

یہ ہنستا ہوا چاند، یہ پُر نور ستارے
تابندہ و پائندہ ہیں ذرّوں کے سہارے

حسرت ہے، کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے، کوئی پھول ہمیں دل سے پکارے

ہر صبح، مری صبح پہ روتی رہی شبنم
ہر رات، مری رات پہ ہنستے رہے تارے

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی اُلجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

حبیب جالب



یہ اور بات تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شہر ترا چھوڑ جائیں ہم

مُدّت ہوئی ہے، کوئے بُتاں کی طرف گئے
آوارگی سے دل کو کہاں تک بچائیں ہم

شاید بقیدِ زیست یہ ساعت نہ آسکے
تم داستانِ شوق سنو اور سنائیں ہم

بے نُور ہو چکی ہے بہت شہر کی فضا
تاریک راستوں میں کہیں کھو نہ جائیں ہم

اس کے بغیر آج بہت جی اُداس ہے
جالبؔ چلو کہیں سے اُسے ڈھونڈ لائیں ہم



گلشن کی فضا دھُواں دھُواں ہے
کہتے ہیں بہار کا سماں ہے

بکھری ہوئی پتیاں ہیں گُل کی
ٹوٹی ہوئی شاخِ آشیاں ہے

جس دل سے اُبھر رہے تھے نغمے
پہلو میں وہ آج نوحہ خواں ہے

ہم ہی نہیں پائمال تنہا
اے دوست! تباہ اک جہاں ہے

جالبؔ وہ کہاں ہے عشق تیرا
پیارے وہ غزل تری کہاں ہے

ظہیر فتحپوری

یہ دھرتی بہت وسیع ہے۔ اس میں بھانت بھانت کی مٹی ہے، طرح طرح کا رنگ روپ ہے۔ میرے ملک اور میری سرزمین کی اپنی مہکار ہے، اپنے رنگ ہیں، اپنے پیکر ہیں۔ میری ان غزلوں میں اپنے دیس کی بوباس ہے۔ ان میں جو آہنگ ہے اس میں میرے ملک کی ندیوں کا لہراؤ ہے۔ یہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے کی شعوری کوشش نہیں بلکہ لاشعور کا فطری بہاؤ ہے۔ اس بہاؤ کی موسیقی میں جو رس ہے وہ دیسی ہے، بِدیسی یا مغربی نہیں۔ تمام دنیا کے انسان یکساں جذبے رکھتے ہیں مگر اظہار کے انداز جدا جدا ہیں۔ اظہار کا فرق ـــ سوچئے تو ـــ مٹی کا فرق ہے۔ میرے وطن پاکستان کی بھی اپنی شوبھا (CHARM) ہے جو اوروں سے مختلف اور منفرد ہے۔ باہر کی ہوائیں یہاں سے بھی گذرتی رہی ہیں۔ یہاں کے پھولوں، پتوں پر ان کے اثرات پڑے ہیں۔ کچھ اثرات جزوِ چمن ہوگئے ہیں۔ ہمارے مزاج کا حصہ بن گئے ہیں۔ وہ اب ہمارے ہیں۔ مگر کچھ ایسے بھی ہیں جن کے پھیر میں پڑ کر ہم اپنے جمالِ فن کے کئی زاویوں سے بے نیاز ہوگئے ہیں۔ اِن غزلوں میں انھی زاویوں کو اُجاگر کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔

ان غزلوں میں سے بعض کے اوزان اور آہنگ شاید ابتدا میں نامانوس لگیں مگر یہ اجنبیت عارضی ہوگی کیونکہ ان کا رشتہ اس سرزمین سے اتنا ہی گہرا ہے جتنا خود ہمارا رشتہ اس مٹی سے ہے۔ یہ ایک تجربہ ہے۔ کہیں کہیں مجھے ناکامی بھی ہوئی ہوگی۔ اُردو غزل کا اپنا مزاج ہے۔ میں نے اس کی نزاکتوں کا لحاظ رکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ خیال اور اظہار کا رچاؤ بڑی جانکاہ منزل ہے مگر اس جانکاہی میں ایک نایاب لذت بھی ہے (ظہیر فتحپوری)



حُسن کہ تھا سیماب صفت، ٹھہرا نہ چمن میں
آن بسا کچھ تیرے تن، کچھ میرے من میں

رُخ پر شوخی جھلکے ہے، شرمیلے پن میں
جیسے سنہری دھوپ کھلی ہو صندل بن میں

تیرے سوا جو تجھ میں ہے، بس ہم جانتے ہیں
حُسن اَن دیکھے رُوپ دکھائے دل درپن میں

جیسے ہیں اک سُر ہوں اور دُنیا بے سُدھ ہے
کیسا یہ سنگیت رچا ہے سُونے پن میں

درشن سے رخصت تک صدیاں بیت گئی تھیں
اب تو جیسے اور جنم پایا جیون میں

غم کی ندی وادی میں اُتر کر کھل کھیلے ہے
درد ہوا ہے اور قیامت دیکھے بن میں

پھر بادل کا بھیس بدل کر ندیاں آئیں
جانے کیا جادُو ہے مٹی کی چتون میں

رات، معطر رات، ذرا دھیرے دھیرے چل
سادہ ورق ہوگا دل، دن کے پھیکے پن میں

آفتِ جاں تھا خود ہی بدن لہراؤ تمھارا
نکلے ہے دھج اور نظر کے پیراہن میں

ان حالوں ڈھارس بھی ظہیر اک برچھی ہوگی
خوش قسمت ہو، شام ہوئی ہے سُونے بن میں

ظہیر فتحپوری



جو بھید بن چھانو گے، جوگیان سُکھ لُو ٹو گے
پہیلیاں بوجھو گے، مگر کہاں بوجھو گے
خیال کی شوبھا، کیا جھلک سکے مایا میں
صبا صبا بھٹکو گے، گھٹا گھٹا روؤ گے
دُکھوں پہ اتراؤ، ہو تو دل کے گُن گاؤ ہو
یہ دل دُہائی دے گا، کبھی جو سُکھ جھیلو گے
نگر سے کیا چاہت کی اُٹھے گی سوندھی خوشبو
یہاں تو دل صحرا ہیں، یہاں کہاں برسو گے
شکستِ دل سے پیدا، غموں کے موہن پیکر
جو ایک بُت توڑو گے، ہزار بُت ڈھالو گے
نہ مانو پر تم جانو، سبھی یہاں سیارے
کل آپ میں آئے تو ہمیں کہاں پاؤ گے

ق

نہ کاش وہ دن آئے مگر وہ دن آئے گا
یہ جن پہ تم بھُولے ہو، انھیں بھُلا بیٹھو گے
یہ دھیان جس میں چھب کی سدا برت بٹتی ہے
وہ عالمِ ہُو ہو گا، خیال کو ترسو گے
فراق چند اڑو با تو ڈھنگ سمے کے ہاتھوں
سبھہ اماوس میں تم ظہیر لُٹ جاؤ گے

ظہیر فتحپوری

غم گہن، من گگن کو ویران کرے ہے
یادِ رُت کا، بہت جی ارمان کرے ہے

شب ترے دھیان کو جب مہمان کرے ہے
دل کی جگمگ جہاں کو سنسان کرے ہے

شعر گوئی کو جی کو ہلکان کرے ہے
پھر جو اُبھرے تو جگ کا کلیان کرے ہے

پیلے پتوں کی اپنائت آس بندھانے
یوں خزاں آئے جیسے احسان کرے ہے

تم تو کھو جاؤ ہو جب سنگار کرو ہو
روپ نٹ کھٹ تمہیں بھی حیران کرے ہے

خواب شب کے بھلائے نسیمِ سحر نے
جب چلے، دل نگر کو میدان کرے ہے

کیا تپش تھی مگر کیا چھتنار ملا ہے
اشک رُت، پریم بَن کو گنجان کرے ہے

گیت اُٹھا لو، مری لے ظہیرؔ مری ہے
وقت کھوٹے کھرے کی پہچان کرے ہے



کھلا جو نین میں کم کم ترے سماؤ کا عالم
بہا غزل میں بھی اے غم! جنوں رچاؤ کا عالم
ہوا کی تال پہ کیلے کی ڈال جھوم رہی ہے
تمام سرو بدن روپ کے بہاؤ کا عالم
سپردگی میں حیا تاب لرزشوں کی جڑت ہے
بلائے جاں ہے لگاوٹ میں رکھ رکھاؤ کا عالم
بھنور بھنور مرے دل کیلئے ہنڈولا ہوا ہے
ترے سبھاؤ، ترے پھول سے سجاؤ کا عالم
نہ چشم کو بھی ملا بول چال کا وہ قرینہ
شگفتِ لب میں رہا ہے جو کسمساؤ کا عالم
یہ گفتگو کی لہریا، یہ رقص و ساز کی سنگت
یہ تھرتھرا اٹھیں، جیسے نرت میں بھاؤ کا عالم
پناہ ڈھونڈھتا دل، حسرتوں کے بھاگتے سائے
تمام عمر رہا ایک چل چلاؤ کا عالم
کرن سفر تھا یہ جیون، نہ آس اوس نما تھی
ہوئی ہے پیاس سوا، ہائے یہ پڑاؤ کا عالم
وہ سائیں سائیں سماں اب بھی ساتھ ساتھ ہوا ہے
گئے تو چھوڑ گئے درد کے جماؤ کا عالم
ملن کی ناؤ بلی بدگمانیوں کے بھنور میں
خوشا ظہیرؔ یہ الجھاؤ میں سجھاؤ کا عالم

ظہیر فتح پوری



جمالِ یار کے تب و تابِ غم یگانہ ہُوا ہے
مرے لیے یہ ترنگِ گُل چراغِ خانہ ہُوا ہے

رمِ خیال حریفِ رمِ زمانہ ہُوا ہے
طلوعِ صبحِ تمنا پیمبرانہ ہوا ہے

نین میں دل کی گلابی کا عکس جھوم رہا ہے
دکھوں کی دھوم ہے، عالم شراب خانہ ہُوا ہے

بس ایک جوت جگی ہے، کہیں کوئی بھی نہیں ہے
مزاجِ وصل بہ رنگِ عارفانہ ہُوا ہے

کچھ اور دھوپ مرے غم، کچھ اور اشک جھما جھم
گھنا ہُوا ہے یہ جنگل تو شامیانہ ہُوا ہے

کرو بناؤ ذرا کم کہ راہِ دید کٹھن ہے
سنگار روپ تمہارا طلسم خانہ ہُوا ہے

مرے نگارِ گریزاں تجھے میں کیسے بھلا دوں
کہ تو پرستشِ اصنام کا بہانہ ہُوا ہے

جگت جگت مرے جی کو جنوں اڑائے پھرے ہے
تری طرح ترا غم آفتِ زمانہ ہُوا ہے

یہ چھاؤں چھاؤں نہ رو، ظہیر دل کو سنبھالو
ڈھلی ہے شام مگر یوں کوئی دِوانہ ہُوا ہے



نظروں کو حسنِ تخلیق ملے، تب روپ نگر جانا
جلوۂ گُل کیا دیکھو گے جب پتھر کو پتھر جانا

کیا کہیے روداد ملن کی، جسم کو جادو گر جانا
ساعت ساعت منزل تو تھی، لمس کو ایک سفر جانا

یاں تو حقیقتیں قحطِ نظر پر نوحہ کناں ہیں، دیوانو!
کیسے تم کو بھایا ہے اک خواب کے پیچھے مر جانا

ساغرِ دل ہے ایسا لبالب، ہاتھ لگانا مشکل ہے
سارا غم جب دل میں اترا، رونا بھی دوبھر جانا

کھِلتی دھوپ میں دُھلے دُھلے سے پتوں کی چھب نیاری ہے
غم کی جوت سے ایسے نکھرے خود کو ہم نے امر جانا

یاں رہ کر بھی اس دُنیا کو ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں
غم کا سر سے گذر جانا ہے، دریا پار اتر جانا

اہلِ خرد سے اہلِ نظر تک سب ہیں ظہیرؔ فقیر حقیر
عزت دار وہ کہلائے ہیں، عیب کو جن نے ہنر جانا

ظہیر فتح پوری



اب در و بے دیار ہے اور جگ ہنسائی ہے
اس عشق نے بھی کیسی جواں موت پائی ہے

بادل ہیں دل کے دل، کوئی روزن کہیں نہیں
اب چھاؤنی غموں نے فلک پہ بھی چھائی ہے

رخصت کے بعد تیرے سراپا سے ماورا
یہ کون سی ادا ہے جو اب یاد آئی ہے

آئی جو سر پہ دھوپ، لگے نغمہ خیال
تم ہو بھی تو وقت کو یوں نیند آئی ہے

چپ ہو گیا ہے دل سے افسانہ نگار بھی
تنہائی اک رہی تھی، سو وہ بھی پرائی ہے

کیا اب کبھی جنوں کا بلاوا نہ آئے گا
صحرا کی خاک اڑ کے خیاباں میں آئی ہے

جو گزرے، غم کو خود میں سموئے رہیں گے ہم
ہم نے ظہیر جینے کی سوگند کھائی ہے



در دان دلوں یوں چہرۂ عالم پہ سجا ہے
ہر شخص نے جیسے مرا غم بانٹ لیا ہے

ہر آن ترے تن میں وہ جادو سا رچا ہے
جو وصل کا لمحہ ہے وہ صحرا کی گھٹا ہے

اک عمر کے بعد آج یکایک جو ملے ہو
وہ سیلِ مسرت ہے کہ دل ڈوب گیا ہے

وہ بات جو سن پاؤ تو بہرو ں نہیں تڑپے
اک لمحے کی تنہائی نے جو مجھ سے کہا ہے

ہو دوست کہ دل کوئی چھپائے نہیں چھپتا
ہر چوٹ کے پہلو میں اک آئینہ لگا ہے

جنگل تھے جنوں خیز، ہوئے شہر بھی ویراں
سناٹے ہیں ہر قریۂ دل جاگ گیا ہے

کیا کس سے گلہ کیجئے ناخود ہم نہیں اپنے
دنیا کا ظہیر ان دنوں کیا حال ہوا ہے

کرار نوری



تری ہی طرح ہمیں یاد آنے والا ہو
ترے سوا بھی کوئی تو ستانے والا ہو

ہر ایک صبح یہی دل میں ہُوک اٹھتی ہے
ہمیں بھی ناز سے کوئی جگانے والا ہو

وہ کس امید پہ گھر میں رہے کہ جس گھر میں
نہ آنے والا ہو کوئی نہ جانے والا ہو

ہر اک سے نظریں ملائی ہیں ان کے کوچے میں
کہ جیسے اب کوئی ہم کو بلانے والا ہو

ہے دوستوں کے لیے آئینہ نظر میری
نظر ملائے جو نظریں ملانے والا ہو

کہ جیسے کوئی بلا مجھ پہ آنے والی ہے
ہر اِک سے کہتا ہے، کوئی بچانے والا ہو

چلوں تو ساتھ چلے اور رکوں تو ساتھ نہ دے
قدم قدم پہ کوئی دل بڑھانے والا ہو

کسی کو شہر میں اب ہم سے لاگ ہے نہ لگاؤ
کوئی تو ہم سے بھی نظریں بچانے والا ہو

ہمارے شہر میں کیا کیا سجے سجائے ہیں گھر
ہمارے گھر کو بھی کوئی سجانے والا ہو



کرب ہے کرب کی آواز برابر ہے یہی
تیری قیمت ہے یہی، تیرا مقدر ہے یہی

جی میں ہے، اب کسی دروازے پہ دستک دے دوں
اور پھر پوچھوں کہ اے شخص، مرا گھر ہے یہی

کون سمجھے گا اگر میں نے کہی بھی روداد
چپ ہی ہو جاؤں، مرے واسطے بہتر ہے یہی

اب تو جو ذرہ بھی دامن سے لپٹ جاتا ہے
میں سمجھتا ہوں مرا مہرِ منور ہے یہی

چاندنی رات میں خود اپنے ہی سائے سے ملوں
میرا مونس ہے یہی اب مرا رہبر ہے یہی

اب تو ہر لحظہ، ہر اک موڑ پہ ہوتا ہے گماں
جس کے بارے میں سنا ہم نے، وہ محشر ہے یہی

شعر کہنے کو تو ہم نے بھی کہے ہیں نوری
یہ جو خاموش سا بیٹھا ہے، سخنور ہے یہی

خاور رضوی



تاریکیوں میں ہم جو گرفتار ہو گئے
شاید سحر سے پہلے ہی بیدار ہو گئے

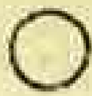
یہ کون سا مقامِ رہ و رسم ہے کہ وہ
اتنے ہوئے قریب کہ بیزار ہو گئے

منزل کی سمت تجھ کو نہ لے جائیں گے کبھی
وہ راستے جو آپ ہی ہموار ہو گئے

ناکامیوں نے اور بھی سرکش بنا دیا
اتنے ہوئے ذلیل کہ خوددار ہو گئے

اب کے تو نوکِ خار بھی گل رنگ ہو چلی
کل دیکھنا کہ دشت بھی گلزار ہو گئے

خاور ہمیں جہاں میں مسرت کی تھی تلاش
آخر ہر ایک شخص کے غمخوار ہو گئے



خود اپنے گھر میں ہیں اس طرح آج آئے ہوئے
کہ جیسے گھر میں کسی کے ہوں ہم بلائے ہوئے

کہ جیسے اب کوئی خورشید آ ہی جائے گا
ہیں اپنے گھر کے اندھیروں سے لو لگائے ہوئے

خدا کرے در و دیوار کان رکھتے ہوں
زمانہ گذرا ہے رودادِ غم سنائے ہوئے

ان آندھیوں میں نہ جانے کدھر سے آ جاؤ
میں جا رہا ہوں ہر اک سُو دیا جلائے ہوئے

گراں گزرتی ہے اب شہر کی ہر اک آواز
سنا رہے ہیں وہ قصے جو ہیں سنائے ہوئے

ہو جیسے جرمِ محبت میں میری ناکامی
ہر اک سے رہتا ہوں خاور نظر بچائے ہوئے

کمار نوری



مانا کہ ہم اس دَور کا حاصل تو نہیں تھے
ناقدریٔ دنیا کے بھی قابل تو نہیں تھے

آتا تو سہی بادِ سحر کا کوئی جھونکا
ہم خاص کسی پھول پہ مائل تو نہیں تھے

ہر شخص نے نقشِ کفِ پا ہم کو بنایا
ہر شخص کی ہم راہ میں حائل تو نہیں تھے

دو گھونٹ ہی پی لیتے اگر کوئی پلاتا
ہم رندِ خوش اوقات تھے، سائل تو نہیں تھے

کیا بات ہے تو آج جو ہے اب لہجے میں نرمی
تم نرمیٔ گفتار کے قائل تو نہیں تھے



رو کے کچھ دیر غبارِ آنکھ کا دھو لیں ہم بھی
اپنے بھی دل کو ذرا آج ٹٹولیں ہم بھی

نام لے کر کبھی ہم کو بھی پکارے کوئی
اپنا دروازہ کسی روز تو کھولیں ہم بھی

لفظ و معنی بھی اُبھرنے لگے سناٹے سے
در و دیوار جو بولے ہیں تو بولیں ہم بھی

جی میں آتا ہے کبھی ان کا تصوّر لے کر
کوئی جاتا ہو کہیں، ساتھ میں ہو لیں ہم بھی

کرار نوری



حالِ دل میں نے جو دنیا کو سنانا چاہا
مجھ کو ہر شخص نے دل اپنا دکھانا چاہا

اپنی تصویر بنانے کے لیے دنیا میں
میں نے ہر رنگ پہ اک رنگ چڑھانا چاہا

خاکِ دل جو ہر آئینہ کے کام آ ہی گئی
لاکھ دنیا نے نگاہوں سے گرانا چاہا

شعلۂ برق سے گلشن کو بچانے کے لیے
میں نے ہر آگ کو سینے میں چھپانا چاہا

اپنے عیبوں کو چھپانے کے لیے دنیا میں
میں نے ہر شخص پہ الزام لگانا چاہا

غیرتِ موج اسے پھینک گئی ساحل پر
ڈوبنے والے نے جب شور مچانا چاہا



اپنی ہستی نظر آئی تھی ابھی
سانس سے شمع بجھائی تھی ابھی

کون ہو سکتا ہے آنے والا
ایک آواز سی آئی تھی ابھی

ایک صورت تھی کہ دل ہی دل میں
ایک صورت سے مل آئی تھی ابھی

ساتھ اپنے وہ خدا تھا کوئی
ساتھ اپنے جو خدائی تھی ابھی

سب کی آنکھوں میں نظر آنے لگی
دل میں صورت جو چھپائی تھی ابھی

بات کہتے ہی ذرا اکھڑ سے گئے
بات مشکل سے بنائی تھی ابھی

پھر وفادار نظر آنے لگا
بے وفا جس سے لڑائی تھی ابھی

کرار نوری



دل ہے چپ، بول رہا ہو جیسے
خود میں غم گھول رہا ہو جیسے

اب وہ یوں دیکھ رہا ہے مجھ کو
ظرف کو تول رہا ہو جیسے

یوں جھجک جاتا ہوں کہہ کے ہر بات
بات میں جھول رہا ہو جیسے

دل کو اب مفت لیے پھرتا ہوں
پہلے انمول رہا ہو جیسے

بات یوں کرنے لگا ہوں لرز سی
آئینہ بول رہا ہو جیسے



شہر میں تنہا تھا لیکن کربِ تنہائی نہ تھا
گھر سے باہر رہ کے میں اتنا تو سودائی نہ تھا

خود بخود ہی دوست بن کر بنتے ہیں دشمن یہ لوگ
ورنہ از خود تو مجھے ذوقِ شناسائی نہ تھا

تیری نظروں نے نہ جانے کتنی عزت بخش دی
مجھ کو پہلے تو کبھی بھی خوفِ رسوائی نہ تھا

اس بھری دنیا میں بس اک میں تماشا بن گیا
اور شاید کوئی بھی تیرا تماشائی نہ تھا

محب عارفی



محرومیوں کا اک سبب جوشِ طلب خود بھی تو ہے
شعلے پہ لپکا اس طرح جیسے کوئی گل ہی تو ہے

کس وہم، کس چکر میں ہو؟ خود بیں بگولو! دم تو لو!
سینے میں دل ہو بھی کہیں، مانا کہ بیتابی تو ہے

سوجھے مگر کیا شمع کو اپنے اُجالے کے سوا
ہر چند ذوقِ دید کا میدان تاریکی تو ہے

جھانکا ہے میں نے ساز میں پردہ ہٹا کر ساز کا
نغمہ نظر آجائے گا، یہ آس بے جا بھی تو ہے

ہر باغ میں اڑتا پھروں، ہر شاخ پر گرتا رہوں
ہر گل سے خوشبو چوس لوں، اب یہ میری ضد ہی تو ہے

ہے ہے وہ شیریں جھلکیاں! اک ٹک مگر سر پھوڑیے
دیوار پھر دیوار ہے، حالانکہ شیشے کی تو ہے

پھر بھی یہ دُھن ہے موج سے دریا کو اپنے ناپ لوں
پیمانہ میرا ہے غلط، مجھ کو خبر اتنی تو ہے

پلتا رہا کیا عمر بھر پی کر تمنا کا لہو
کچھ دن سے میری آستیں کچھ زیرِ لب کہتی تو ہے

ہوتی کہاں تک مسترد بیباکیٔ دستِ صبا
کھُلنے لگا بندِ حیا، آخر شگفتہ ہی تو ہے

تعمیر آخر کر لیا حسرت نے خوابوں کا حرم
شغلِ گنہ کے واسطے یہ آڑ بھی کافی تو ہے

مشقِ خود آشامی کروں، سیراب ہونا سیکھ لوں
لبریز خود ہے تشنگی، ساغر مرا خالی تو ہے

اب صلح کر بھی لیں محبؔ تنہائیوں سے وحشتیں
وہ میرا سایہ ہی سہی، اِک شے نظر آتی تو ہے

محب عارفی



شعلۂ شوق کی آغوش میں کیونکر آؤں   اک تمنا ہوں کہ مٹ جاؤں اگر بر آؤں
ایک دعوت ہوں اگر اُن کے لبوں پر کھیلوں   ایک حسرت ہوں اگر خود کو میسر آؤں
ہر طرف سے مجھے کیا گھور رہی ہیں آنکھیں   خواب ہوں، دیدۂ بیدار میں کیونکر آؤں
ایک عالم ہوں جسے بس کوئی محسوس کرے   کوئی معنی ہوں کہ الفاظ کے اندر آؤں؟
نقش برآب سہی، کچھ بھی سہی، ہوں تو سہی   ریت کی نید میں کیا خود سے بچھڑ کر آؤں
میری پہچان ہو شاید انھیں ذرّوں کی چمک   اپنے گھر میں اسی زینے سے اُتر کر آؤں
میری آیات پہ ایمان نہ لانے والو!   تاب لاؤ گے اگر جلد سے باہر آؤں؟
پھونک ڈالیں مرے شعلے نے فضائیں ساری   اسی دُھن میں کہ تِرے قد اپنے برابر آؤں
لے چکا آبِ بقا تجھ سے اب اے بحرِ عرب   اُڑ کے جاتا ہوں کہ یہ قرض ادا کر آؤں

اپنے دامن میں کہو آگ سنبھالوں کیونکر
ہاتھ اپنے تو محبؔ خیر سے اکثر آؤں

محب عارفی



اندر تو خیالوں کے ہو آتے خیال اپنا
افشائے حقیقت سے ڈرتا ہے سوال اپنا

کاغذ کی صداقت ہوں گو وقفِ کتابت ہوں
صفحوں سے عبارت ہوں کھلنا ہے محال اپنا

آئینہ ہے ذات اپنی معمور ہوں جلووں سے
مستور ہے نظروں سے ہر چند جمال اپنا

خوش ہے کہ جو ٹوٹی ہے آخر کوئی شے ہو گی
خود میں نظر آتا ہے شیشے کو جو بال اپنا

پردے نے کہا مجھ کو، پردے نے سنا مجھ کو
نغمہ ہوں، سمجھتا ہوں اِتنا ہی کمال اپنا

غنچے میں رہا ہوں میں تنکے میں ڈھلا ہوں میں
کرنوں کی دعا ہوں میں شعلہ ہے مآل اپنا

اے ہم نظرو! ٹھہرو، کیا ہو جو برآمد ہو
ہر گوشۂ خلوت سے اک نقشِ خیال اپنا

تہہ سطح تک آپہنچی اک موج نہ ہاتھ آئی
کب تک یہ وہم آخر، اب کھینچ لوں جال اپنا

خوشبو سے محبت کھیلو، کیا عود کو روتے ہو
اس عہد کی نظروں سے مخفی ہے ملال اپنا



جو زخموں سے اپنے بہلتے رہیں گے
وہی پھول ہیں، شہد، اُگلتے رہیں گے
گھٹائیں اٹھیں، سانپ ویرانیوں کے
اِنہی آستینوں میں پلتے رہیں گے
شریعت تاخس و خار ہی کی چلے گی
علم رنگ و بو کے نکلتے رہیں گے
نئی بستیاں روز بستی رہیں گی
جنھیں میرے صحرا نگلتے رہیں گے
مچلتے رہیں روشنی کے پتنگے
دیئے میرے کاجل اُگلتے رہیں گے
رواں ہر طرف ذوقِ پستی رہے گا
بلندی کے چشمے اُبلتے رہیں گے
جسے سانس لینا ہو، خود آڑ کر لے
یہ جھونکے ہوا کے تو چلتے رہیں گے
یہ پتے تو اب پھول کیا ہو سکیں گے
مگر عمر بھر ہاتھ ملتے رہیں گے
محبت راستی ہے عبادت کجی ہے
مرے بل کہاں تک نکلتے رہیں گے

محب عارفی



خردؔ یقیں کے سکوں زار کی تلاش میں ہے
یہ دھوپ سایۂ دیوار کی تلاش میں ہے

خطا چمن کی کہ ہے مبتلائے لالہ و گل
بہار صرفِ خس و خار کی تلاش میں ہے

چھلک رہا ہے قبائے حیا سے اس کا شباب
شرابِ جرأتِ میخوار کی تلاش میں ہے

وہ نقطہ ہوں جو بھرم ہے نقوشِ ہستی کا
زمانہ کیا مرے اسرار کی تلاش میں ہے

وہ اوج ہوں جو خلل ہے نظامِ پستی کا
وہ جرم ہوں جو سرِ دار کی تلاش میں ہے

خس آزما ہے محبؔ شعلہ زارِ باطل سے
نیا خلیل ہے، گلزار کی تلاش میں ہے



اک لہر سی دیکھی گئی، پائے نہ گئے ہم
حالانکہ یہیں تھے کہیں آئے نہ گئے ہم

گرداب میں کیا ہے جسے طوفان مٹائے
ہاں گردشِ دوراں سے مٹائے نہ گئے ہم

پالا تھا اُسے بادِ ے، باراں سے بچا کر
جس آگ سے اے شمع بجھائے نہ گئے ہم

ہیں بند یہ کس آئینہ خانے میں کہ باہر
نایاب نظارے نظر آتے، نہ گئے ہم

محب عارفی



اپنی آگ میں بُھنتی جائے، بُنتی جائے کفن اپنا
گویا اِسی لیے چھوڑا ہے چنگاری نے وطن اپنا

جھونکے کچھ ہیجان ہوا کے، آتے ہیں اپنے آپ چلے
جُھوم اُٹھتے ہیں چمن کے سِنکے، اس کو جان کے فن اپنا

خود رو سبزے چھیڑ رہے ہیں جنگل کے قانون کے راگ
کب تک باغ میں پڑھوائیں گے خطبہ سروِ سمن اپنا

دریا دل ہے ساحل میرا مگر یہاں ہر سیلِ بلا
سائل ہے کہ بڑھا آتا ہے پھیلائے دامن اپنا

مل تو جائے اپنے بھنور کو دریا کے چکر سے نجات
لیکن آہ اگر رہ جاؤں ہو کر میں ہمہ تن اپنا

شمع کی لو کیا شوقِ بقا میں شمع کو چاٹے جاتی ہے
خود کو ترستی رہ جاتی ہے روح مٹا کے بدن اپنا

کوئی محبؔ آزردہ کیوں ہو میری تلخ کلامی سے
اپنی ہی جانب رہتا ہے اکثر، روئے سخن اپنا



کیسے کیسے ملے دن کو ستاتے ہمیں
رات نے بھید سارے بتائے ہمیں

رازِ ہستی تو کیا کُھل سکے گا کبھی
مل گئے تھے مگر کچھ گنائے ہمیں

گرد ہیں کاروانِ گذشتہ کی ہم
کیا اب آنکھوں پہ کوئی بٹھائے ہمیں

ساری دلداریاں دیکھ کر سوتے ہیں
اب نہ زنہار کوئی جگائے ہمیں

ناز جن سے ہمارے نہ اُٹھ پائے تھے
آج لے جا رہے ہیں اُٹھائے ہمیں

دھوپ میں زندگی کی جلے ہیں بہت
لے چلو دوستو سائے سائے ہمیں

اک نوا تھی، فضاؤں میں گم ہو گئی
ہم یہیں ہیں مگر کون پائے ہمیں

چل دیئے تھے محبؔ چھوڑ کر ناؤ تم
ڈوبتے دم بہت یاد آئے ہمیں

اختر ہوشیارپوری



میں نے یوں دیکھا اُسے جیسے کبھی دیکھا نہ تھا
اور جب دیکھا تو آنکھوں پر یقیں آتا نہ تھا
بام و در سے سخت بارش میں بھی اُٹھے گا دھواں
یوں بھی ہوتا ہے محبت میں، کبھی سوچا نہ تھا
آندھیوں کو روزنِ زنداں سے ہم دیکھا کیے
دُور تک پھیلا ہوا صحرا تھا، نقشِ پا نہ تھا
لوگ لائے ہیں کہاں سے شب کو مرمر کے چراغ
ان چٹانوں میں تو دن کو راستہ پیدا نہ تھا
شہر کی ھنگامہ آرائی میں کھو کر رہ گیا
میں کہ اپنے گھر میں بھی مجھ کو سکوں ملتا نہ تھا
برف اپنے آپ گُھل جاتی ہے سورج ہو نہ ہو
شام سے پہلے یہ جانا تھا مگر سمجھا نہ تھا
اُن دنوں بھی شہر میں سیلاب آتے تھے بہت
وادیوں میں جب کہیں بادل ابھی برسا نہ تھا
رات کی تنہائیوں میں جس سے چونک اُٹھے تھے ہم
اپنی ہی آواز تھی، شعلہ کوئی چمکا نہ تھا
وہ بھی سچ کہتے ہیں اختر لوگ بیگانے ہوئے
ہم بھی سچے ہیں کہ دنیا کا چلن ایسا نہ تھا

اختر ہوشیار پوری



اپنے قدموں ہی کی آواز سے چونکا ہوتا
یوں مرے پاس سے ہو کر کوئی گزرا ہوتا
چاندنی سے بھی سُلگ اُٹھتا ہے ویرانۂ جاں
یہ اگر جانتے، سُورج ہی کو چاہا ہوتا
زندگی خوابِ پریشاں ہے، بہار ایک خیال
اُن کو ملنے سے بہت پہلے یہ سوچا ہوتا
دوپہر گذری مگر دھوپ کا عالم ہے وہی
کوئی سایہ کسی دیوار سے اُترا ہوتا
ریت اُڑ اُڑ کے ہواؤں میں چلی آتی ہے
شہرِ ارماں سرِ صحرا نہ بسایا ہوتا
آرزو عمرِ گریزاں تو نہیں، تم تو نہیں
یہ سرکتا ہوا لمحہ کہیں ٹھہرا ہوتا
پیچھے پیچھے کوئی سایہ سا چلا آتا تھا
ہائے وہ کون تھا، مُڑ کر اُسے دیکھا ہوتا
تجھ سے یک گونہ تعلق مجھے اک عمر سے تھا
زندگی! تُو نے ہی بڑھ کر مجھے روکا ہوتا
جانے کیا سوچ کے لوگوں نے بجھائے ہیں چراغ
رات کٹتی تو سحر ہوتی، اُجالا ہوتا
اپنے دامن کو جلا کر میں چراغاں کرتا
اگر اِس راکھ میں اختؔر کوئی شعلہ ہوتا

اختر ہوشیارپوری



بارہا ٹھٹکا ہوں خود بھی، اپنا سایہ دیکھ کر
لوگ بھی کترائے کیا کیا، مجھ کو تنہا دیکھ کر

مجھ کو اس کا غم نہیں، سیلاب میں گھر بہہ گئے
مسکرایا ہوں میں بے موسم کی برکھا دیکھ کر

ریت کی دیوار میں شامل ہے خونِ زیست بھی
اے ہواؤ! سوچ کر، اے موجِ دریا! دیکھ کر

اپنے ہاتھوں اپنی آنکھیں بند کرنی پڑ گئیں
نکہتِ گل کے جلو میں گردِ صحرا دیکھ کر

میرے چہرے پر خراشیں ہیں لکیریں ہاتھ کی
میری قسمت پڑھنے والے! میرا چہرا دیکھ کر



ایک ہم ہی تو نہیں آبلہ پا، آوارہ
نکہتِ گل بھی ہوئی، بادِ صبا! آوارہ

یہ کہیں عمرِ گزشتہ تو نہیں، تم تو نہیں
کوئی پھرتا ہے سرِ شہرِ وفا آوارہ

کون منزل کی خبر دے، کسے منزل کی خبر
راہرو آبلہ پا، راہ نما آوارہ

دل دھڑکتا ہے سرِ شام کہ گزرے گا ابھی
وادیٔ شب سے کوئی نغمہ سرا آوارہ

اب کوئی کس سے کہے کیفیتِ زخمِ بہار
سبزہ بیگانہ ہے، گل چُپ ہیں، صبا آوارہ

اختر ہوشیارپوری



کچھ نقش ہویدا ہیں خیالوں کی ڈگر سے
شاید کبھی گزرا ہوں میں اس راہ گزر سے

گلیاں بھی ہیں سنسان، دریچے بھی ہیں خاموش
قدموں کی یہ آواز در آئی ہے کدھر سے

طاقوں میں چراغوں کا دھواں جم سا گیا ہے
اب ہم بھی نکلتے نہیں اُجڑے ہوئے گھر سے

کیوں کاغذی پھولوں سے سجاتا نہیں گھر کو
اس دور کو شکوہ ہے مرے ذوقِ ہُنر سے

سائے کی طرح کوئی تعاقب میں رواں ہے
اب بچ کے کہاں جائیں گے اک شعبدہ گر سے

اخترؔ یہ گھنے ابر بڑے تنگ نظر ہیں
اُٹھے ہیں جو دریا سے تو دریا پہ ہی برسے



مری نگاہ کا پیغام بے صدا جو ہُوا
وہ میری بات سنے کیوں میں بے نوا جو ہُوا

سوادِ شہر میں ملتے ہیں لوگ سنگ بدست
سوادِ شہر سے صحرا کو راستہ جو ہُوا

ملا نہ تُو، تو غمِ زندگی کے دیوانے
اِدھر ہی لوٹ پڑے ہیں ترا پتہ جو ہُوا

تمام رات میں سُنتا رہا تری آواز
ترا خیال ہی مجھ کو تری صدا جو ہُوا

ہوائے گل بھی پریشاں، قبائے گل بھی چاک
جنوں کا فصلِ بہاراں سے رابطہ جو ہُوا



وہ رنگِ تمنا ہے کہ صد رنگ ہوا ہوں
دیکھو تو نظر ہوں، جو نہ دیکھو تو صدا ہوں

یا اتنا سبک تھا کہ ہوا لے اڑی مجھ کو
یا اتنا گراں ہوں کہ سرِ راہ پڑا ہوں

چہرے پہ اُجالا تھا، گریباں میں سحر تھی
وہ شخص عجب تھا جسے رستے میں ملا ہوں

کب دھوپ چلی، شام ڈھلی، کس کو خبر ہے
اک عمر سے میں اپنے ہی سائے میں کھڑا ہوں

جب آندھیاں آئی ہیں تو میں نکلا نہ گھر سے
پتوں کے تعاقب میں مگر دور پڑا ہوں



دل میں اک جذبۂ بیداد و جفا ہی ہوگا
وہ خداوند بھی ہوگا تو خدا ہی ہوگا

گرد سی اڑتی نظر آتی ہے، آندھی ہوگی
دُور تک نقشِ قدم ہیں، کوئی راہی ہوگا

ہم سے جو پوچھنا ہے پوچھ لو، ورنہ کل تک
کس کو اندازۂ ناکردہ گناہی ہوگا

کہیں گرتی ہوئی دیواریں، کہیں جھکتی چھتیں
آپ کہتے ہیں تو یہ قصرِ وفا ہی ہوگا

پھول سے ترشتے ہوئے لوگ خرابوں میں کہاں
دشتِ وحشت میں کوئی آبلہ پا ہی ہوگا

جاتے جاتے مرے دروازے کے پٹ کھول گئی
یہ بھی اختر کوئی اندازِ صبا ہی ہوگا

اختر ہوشیار پوری



اک نور تھا کہ پچھلے پہر ہم سفر ہُوا
مجھ کو قبا کا چاک ہی چاکِ سحر ہُوا

سیلاب اُمنڈ کے شہر کی گلیوں میں آ گئے
لیکن غریبِ شہر کا دامن نہ تر ہُوا

زندانِ آرزو میں نظر بے بصر رہی
دیوار در ہوئی تو کرن کا گزر ہُوا

وہ آندھیاں چلی ہیں کہ اشجار اُکھڑ گئے
دکانِ شیشہ گر پہ نہ پھر بھی اثر ہُوا

اب کون دیکھتا پھرے کیوں بام و در جلے
جو کچھ ہُوا، فصلِ چمن سے اُدھر ہُوا



آگ چولہے کی بجھی جاتی ہے
چاندنی ہے کہ کھلی جاتی ہے

جس قدر نیچے اُترتا ہوں میں
جھیل بھی گہری ہوئی جاتی ہے

گرد اُٹھی ہے جو مری ٹھوکر سے
ایک دیوار بنی جاتی ہے

پھرے ہونٹوں پہ بھٹلنے والے
بات آنکھوں سے بھی کی جاتی ہے

لوگ ساحل پہ کھڑے دیکھتے ہیں
ناؤ کاغذ کی بہی جاتی ہے

رفیق خاور جسکانی



خلا کی منزلِ پایاب کا پتا بھی ہیں
اور اپنے آپ میں اِک بیکراں خلا بھی ہیں

فضا کے سینے میں بےتاب شورشیں مجھ سے
دلِ وجود کی اک آہِ نارسا بھی ہیں

میں اپنی شاخِ خمیدہ کا برگِ شوریدہ
شجر کا جسم بھی ہیں، جسم سے جُدا بھی ہیں

ترے وجود کے ادراک تک پہنچتی ہوئی
یقیں کی گونج بھی ہیں، وہم کی ہوا بھی ہیں

مجھی سے فکر و نظر کے صنم کدے روشن
اور اپنے آپ کو اب تک نہ پا سکا بھی ہیں

جمالِ صبحِ سکوں، شامِ اضطراب کا رنگ
سکوتِ زرد بھی ہیں، سرخیٔ صدا بھی ہیں

ق
ورائے فہم ہے مرے تضاد کا عالم
کہ نوکِ خار بھی ہیں اور برہنہ پا بھی ہیں

مرے ستم کی خراشیں میرے ہی چہرے پر
اودھ کی شام بھی ہیں اور ہیروشما بھی ہیں

میرے جنوں کے کرشمے میری ربا کے طلسم
کہ ویت نام بھی ہیں اور جنیوا بھی ہیں

بقولِ شاعرِ مشرق، میں اپنا قاتلِ جاں
ہوائے تند بھی ہیں، برگِ بےنوا بھی ہیں

ق
زوالِ آدمِ خاکی کی ابتدا مجھ سے
اور اس کی عظمتِ پیہم کا ارتقا بھی ہیں

مجھی کو چھو نہ سکی ڈارون کی حدِ گماں
اور آج خلوتِ مہتاب تک رسا بھی ہیں

مجھے تو جیسے وہ اَن دیکھا راستا نہ لگا
خلا کے جادۂ مانوس پر چلا بھی ہیں

فنا کی موج مری روح کے مکاں سے خجل
اسیرِ وقت بھی ہیں، وقت سے ورا بھی ہیں

حصارِ جسم کے دیوار و بام میں محبوس
حدودِ کون و مکاں سے گذر گیا بھی ہیں

گدائے نطق بھی میں خالقِ ازل کے حضور
اور اپنے درد کی آواز کا خدا بھی ہیں

مرے شرارۂ فن سے ہے روشنی ہر سُو
اور اپنے شعلۂ احساس میں جلا بھی ہیں

زبانِ حرف کی سحر آفرینیاں مجھ سے
لبِ خیال کی تقریرِ بےصدا بھی ہیں

میں اس کی سوچ کا اک شاہکار بھی خاورؔ
اور اس کے شوق کا دلچسپ حادثا بھی ہیں

رفیق خاور جسکانی



رات بیزار سا گھر سے جو میں تنہا نکلا
چاند بھی جیسے میرے غم کا شناسا نکلا

سر بہ سر ڈوب گیا رات کے سناٹے میں
چاندنی جس کو میں سمجھا تھا وہ دریا نکلا

دُور سے آئی گلی میں کہیں قدموں کی صدا
اپنا گھر چھوڑ کے مجھ سا کوئی تنہا نکلا

سوئی تھی چاندنی پتوں سے ڈھکی سڑکوں پر
ایک جھونکا سرِ شب، خاک اُڑاتا نکلا

سامنے گھر کے ترے کوئی کھڑا تھا جیسے
وہم اپنا تری دیوار کا سایا نکلا

چاندنی راہِ ملاقات میں دیوار بنی
چاند بھی جیسے ترا چاہنے والا نکلا

رات کے موڑ پہ کون آئینہ بردار ملا
جس کو سمجھا تھا تری یاد، زمانہ نکلا

رات بھر موجِ ہوا سے تری خوشبو آئی
چاند تاروں میں ترا نقشِ کفِ پا نکلا

اس بھرے شہر میں ہم چاک گریباں ٹھہرے
جس کو دیکھا وہی سرگرم تماشا نکلا

ہم تو اس دل ہی کو سمجھے تھے بیاباں خاورؔ
چاند بھی دور تک اِک رنگ کا صحرا نکلا

رفیق خاور جسکانی



اجڑ گیا سرِ مژگاں خمارِ خواب کا شہر
بسا ہے جب مرے آنگن میں آفتاب کا شہر
یہ انگ انگ شگوفے ، یہ شاخ شاخ سمن
ترا بدن ہے کہ ہے گل کی آب و تاب کا شہر

ق

غزل ہے سازِ غم و درد کی جمیل آواز
غزل کا مسکنِ جاں ہے دلِ خراب کا شہر
بجا ہے زورِ قلم افتخار جالب کا
مگر غزل کا کھنڈر ہے گلافتاب کا شہر
وہ لفظ و لہجہ کے آسیب ، وہ شکستہ مکاں
"لفظ، لپیٹ، ہوس، بھوت، پیچ و تاب کا شہر"
"الفت" الار، تشفی، بدن ، بروہاں ، ٹمڈھ
کرتروڑ الذت کا " اور "غیاب" کا شہر
یہ حرف و صوت کے ہذیان کی صدا کا سفر
سخن کا شہرِ خرابی ، فنِ خراب کا شہر

تلاشِ آب صدا میں جہاں بھٹکتے پھرے
وہ دشتِ شامِ سفر تھا کہ تھا سراب کا شہر
افق شفق میں ڈھلا ، آفتاب پھٹ کے گرا
ہوائے شام سے جلتا ہے موجِ آب کا شہر
یہی خیال ہمیں رات بھر جگائے گا
ہے اپنا مسکنِ شب ایک مستِ خواب کا شہر
وہ سیلِ اشکِ رواں ہیں بکھر گیا خاور
پلک پلک پہ بسا تھا خیال و خواب کا شہر



پھر تیز ہوا چلتے ہی بے کل ہوئیں شاخیں
کس درد کے احساس سے بوجھل ہوئیں شاخیں
کیا سوچ کے رقصاں ہیں سرِ شام کھلے سر
کس کاہشِ بے نام سے پاگل ہوئیں شاخیں
گرتے ہوئے پتوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں!
صد طنطنۂ زیست کا مقتل ہوئیں شاخیں
ترسی ہوئی باہیں ہیں ہمکتے ہوئے آغوش
دیوانگیِ شوق کا ممثل ہوئیں شاخیں
پھر رات کے اشکوں سے فضا بھیگ چلی ہے
پھر اوس کی برسات سے شتیل ہوئیں شاخیں
جھونکے ہیں کہ شہنائی کے سُر جاگ رہے ہیں
اک نغمہ گرِ ناز کی پائل ہوئیں شاخیں
برگد کا تنا ـــ ایک صدی عمرِ رواں کی
سائے ہیں مہ و سال تو پل پل ہوئیں شاخیں
ہر ڈال پہ اک ٹوٹتی انگڑائی کا عالم
شب بھر جو ہوا تیز رہی شل ہوئیں شاخیں
جاتا ہوا مہتاب جو دم بھر کو رکا ہے
اک مہوشِ طناز کا آنچل ہوئیں شاخیں
جب ڈوب گیا غم کے افق میں دلِ تنہا
مہتاب سے مُدرا آنکھ سے اوجھل ہوئیں شاخیں



رات کے سانس کی مہکار سے سرشار ہوا
جاگتے شہر سلا دیتی ہے، بیدار ہوا

ہو کے سیراب خمِ شب سے سرِ دامنِ گل
صورتِ ابر برس جاتی ہے میخوار ہوا

جانے کس طرح خلاؤں میں دھنک بنتی ہے
چاند کی رنگ بھری جھیل کے اُس پار ہوا

تا لبِ موجِ سحر جاتی ہے لہروں پہ سوار
ساحلِ شب سے اٹھاتی ہے جو پتوار ہوا

کتنی یادیں ہیں کہ جھونکوں کی طرح تیرتی ہیں
چھوڑ آتی ہے سفر میں جنہیں منجدھار ہوا

سر کھلے خاک اڑاتی ہوئی، آنگن آنگن
رات کے درد کا کر جاتی ہے اظہار ہوا

چاند کے رن میں، بجھے لمحوں کی تنہائی میں
زہرِ ہجراں میں ہے ڈوبی ہوئی تلوار ہوا

کتنے لمحے تھے کہ اشکوں کی طرح برسے تھے
رات گزری تھی جو گاتی ہوئی ملہار ہوا

زرد شاخوں کی پتاور میں اٹھاتی ہوئی حشر
کیٹس کی نظم کا جیسے کوئی کردار ہوا

وہ تری جھومتی زلفوں کا گھنا جنگل ہے
بھول جاتی ہے جہاں شوخیِ رفتار ہوا

آسماں پر سفرِ موجِ سحر سے پہلے
روز اٹھا دیتی ہے اک رنگ کی دیوار ہوا



بکھرا کے ہم غبار سا وہم و خیال پر
پتوں کی طرح ڈولتے پھرتے ہیں مال پر

اپنے ہی پاؤں بس میں نہیں اور یار لوگ
تنقید کر رہے ہیں ستاروں کی چال پر

یہ مال، آنچلوں کا سبکسار آبشار
صد موجِ رنگ و نور ہے لمحوں کی فال پر

بہتے ہجوم، شام کے لمحوں کا سیل —— ہم
رقصاں ہیں ذہن، جھومتے قدموں کے تال پر

الجھے ہوئے ہیں بحث میں وارفتگانِ شام
ہے گفتگو "ادب" کے عروج و زوال پر

طے رہ گزارِ پا ہے، نہ موضوعِ گفتگو
وہسکی کے دھندلکے ہیں جواب و سوال پر

غالب کا ذکر تھا، ابھی شیلے پہ آ گئے
پہنچے ملارمے سے جلال و جمال پر

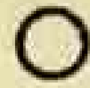
جھونکوں کے ساتھ ساتھ کوئی طائرِ خیال
آ بیٹھتا ہے ذہن کی شاداب ڈال پر

گردِ سفر سے پیار ہے، منزل کا غم نہیں
یوں چل رہے ہیں رہ گزرِ ماہ و سال پر

چھائے ہوئے ہیں سوچ کے سائے کہیں کہیں
چھٹکی ہوئی ہے چاندنی بامِ خیال پر

ہر سایہ اپنی اپنی گپھا میں لڑھک گیا
ہم لوگ گھومتے رہے سنسان مال پر

رفیق خاور جسکانی



خزاں کے زخم ہوا کی مہک سے بھرنے لگے
نگارِ گل کے خد و خال پھر نکھرنے لگے

یہ سوکھے سہمے شجر، دیکھ مارچ آنے پر
ترے بدن کی طرح شاخ شاخ بھرنے لگے

غمِ حیات! پھر آنے لگی صدائے جرس
دیارِ شب سے ترے قافلے گزرنے لگے

اداس رات کے درد آشنے دَاہیں جیسے ابھی
درِ نگاہ سے دل میں کوئی اترنے لگے

سرابِ دشتِ تمنّا سے کون گذرا ہے
کہ چشمۂ غمِ دل بوند بوند جھرنے لگے

یہ جھلملاتے ستارے، یہ زخمِ سینۂ شب
افق کے پہلے اجالے سے جیسے بھرنے لگے

نجومِ شب کی زباں پر ہے گفتۂ اقبال
وہ پھر سے آدمِ خاکی کی بات کرنے لگے

زمیں سے دور بھی اب نقشِ پائے انساں سے
کئی جہان خلا میں نئے ابھرنے لگے

وہ ابرِ راہگذر کی تہوں میں ڈوبا چاند
ہوا چلے تو ابھی تیر کر ابھرنے لگے

ہے اس کے عکس کی تجسیم میرے فن سے ورا
وہ آئنہ کہ صدا کی طرح بکھرنے لگے

وہ ابر ہو کہ دھنک ہو، کوئی تو ہو خاور
فضا کے شانے پہ جو زلف سا سنورنے لگے



مدّت ہوئی خموشیِ اظہارِ حال کو
آب صدا ہی دیجئے دشتِ خیال کو

پھر ایک شاخِ زرد گری، خاک ہو گئی
پھر برگِ نَو ملے شجرِ ماہ و سال کو

جھونکا یہ کس کے لمسِ گریزاں کی طرح تھا
اب حل ہی کرتے رہیئے ہوا کے سوال کو

ہم رنگِ ماہتاب تھا وہ، اس میں کھو گیا
اب کتنی دور پھینکیے نظروں کے جال کو

شب بھر ہوا کے رنگ بدلتے رہے نئے
میں دیکھتا رہا سفرِ بے نشاں کو

جائے گا خونِ شب نہ کسی طور رائیگاں
مُنہ پڑ لے گی صبح، شفق کے گلال کو

جچتے نہیں نگاہ میں خوشیوں کے آفتاب
دل ڈھونڈتا ہے کس غمِ زہرہ جمال کو

انسانیت کے درد کی آواز بن سکے
سوزِ نوا سے سینچئے زخمِ خیال کو

دیجے پھر آبِ دیدۂ تر سے حیاتِ نو
فن و ادب کے سبزۂ نو پائمال کو

سلیمان ادیب



جو تیرے حسن میں نرمی بھی، بانکپن بھی ہے
وہ کیفِ تازہ بھی ہے، نشۂ کہن بھی ہے

مجھے تو چین سے رہنے دے، اے دلِ وحشی!
کہ دشت بھی ہے ترے سامنے، چمن بھی ہے

کہاں کی منزلِ مقصود، راستہ بھی نہیں
سفر میں ساتھ خدا بھی ہے، اہرمن بھی ہے

وہ ایک لمحۂ پرّاں، وہ ایک ساعتِ دید
حنا بدست بھی ہے، لالہ پیرہن بھی ہے

بچشمِ شبنمِ گریاں اگر کوئی دیکھے
ترا لباس ہی، اے گل، ترا کفن بھی ہے

وہ ایک گوشۂ جنت جسے دکن کہیے
نگارِ شاعرِ بدنام کا وطن بھی ہے

سلیمان اریب



ہر بات تری، جانِ جہاں، مان رہا ہوں
اب خاکِ رہِ کاہکشاں چھان رہا ہوں

اصنام سے دیرینہ تعلق کی بدولت
میں کفر کا، ہر دور میں ایمان رہا ہوں

دنیا سے لڑائی تو ازل ہی سے رہی ہے
اب خود سے جھگڑنے کی بھی میں ٹھان رہا ہوں

اب تک تو شب و روز کچھ اس طرح کٹے ہیں
جس جا بھی رہا، اپنا ہی مہمان رہا ہوں

منصب یہ مجھے جبرِ مشیت سے ملا ہے
جلتی ہوئی لاشوں کا نگہبان رہا ہوں

وہ شعر ہوں، جس کو ابھی سوچے گا زمانہ
لکھا نہ گیا جس کو، وہ دیوان رہا ہوں

بے تاج ہوں، بے تخت ہوں، بے ملک و حکومت
ہاں نام کا لیکن میں سلیمان رہا ہوں



بھیس کیا کیا نہ زمانے میں بنائے ہم نے
ایک چہرے پہ کئی چہرے لگائے ہم نے

اس تمنا میں کہ اس راہ سے تو گزرے گا
دیپ، ہر راہ میں، ہر رات جلائے ہم نے

دل سے نکلی نہ تراشِ غمِ ایام کی دھوپ
تیرے ناخن سے کئی چاند بنائے ہم نے

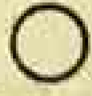
دامنِ یار پہ حق اپنا جتایا نہ کبھی
اشک امڈے بھی تو پلکوں میں چھپائے ہم نے

خود ہوئے غرق، زمانے کو بھی غرقاب کیا
ایک آنسو سے وہ طوفان اٹھائے ہم نے

تیرے پہلو سے بھی پہنچے نہ ترے پہلو تک
فاصلے قرب کے، گو لاکھ گھٹائے ہم نے

چہرے کتنے ہی، کتبوں کی عبارت پہ نہ جا
ابھی لفظوں سے کہاں پردے اٹھائے ہم نے

شعر کہنے سے نہ محبوب، نہ دنیا ہی ملی
عمر بھر شعر کہے، شعر سنائے ہم نے



ترا دل تو نہیں، دل کی لگی ہوں
ترے دامن پہ آنسو کی نمی ہوں

میں اپنے شہر میں تو اجنبی تھا
میں اپنے گھر میں بھی اب اجنبی ہوں

کہاں تک مجھ کو سلجھاتے رہو گے
بہت الجھی ہوئی سی زندگی ہوں

خبر جس کی نہیں باہر کسی کو
میں تہ خانے کی ایسی روشنی ہوں

تھکن سے چُور، تنہا سوچ میں گم
میں پچھلی رات کی وہ چاندنی ہوں

مرا یہ حشر بھی ہونا تھا اک دن
کبھی اک چیخ تھا، اب خامشی ہوں

گزر کر نیک و بد کی ہر گلی سے
سراپا آگہی ہوں، گمرہی ہوں

مرا یہ جرم ہے اس دور میں ہے
سخن تو ہوں مگر ناگفتنی ہوں



آج بھی ہاتھ پہ ہے، تیرے پسینے کی تری
یعنی ہے آج بھی شاخِ شجرِ درد ہری

پاسِ داماں نہ سہی، پاسِ گریباں ہی سہی
تجھ پہ لازم نہیں، اے دستِ جنوں، جامہ دری

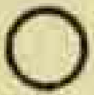
یں کہ دنیائے ہوس میں بھی سرافراز رہا
کام آ ہی گئی آخر مری آشفتہ سری

دل کی بستی سے کبھی یوں نہ گزرتی تھی صبا
اب نہ پیغامبری ہے، نہ کوئی نامہ بری

ہم نے بھی چھوڑ دیا مسلکِ اربابِ وفا
وہ بھی اب بھول گئے شیوۂ بیدادگری

رات کا کرب سمیٹے ہوئے اپنے دل میں
جھلملاتا ہے کہیں دور چراغِ سحری

مَیں نے کس دل سے شبِ غم کی سحر کی بے لاریب
یاد آنے گی زمانے کو مری بے جگری !



پیار کا، درد کا، مذہب نہیں ہوتا کوئی
کعبہ و دیر سے مطلب نہیں ہوتا کوئی

سچ تو یہ ہے کہ میں ہر بزم میں تنہا ہی رہا
یوں مگر پاس مرے، کب نہیں ہوتا کوئی

جان و ایماں سہی، سب کچھ سہی تم سے لیے
ہائے کس منہ سے کہوں، سب نہیں ہوتا کوئی

ایک سایہ تھا جسے میں نے پکڑنا چاہا
وہ جو ہوتا تھا کوئی، اب نہیں ہوتا کوئی

چاندنی، پھول، ہوا، جام، ستارے، خوشبو
زہر کے نام ہیں، جس شب نہیں ہوتا کوئی

مجھ کو خود مجھ سے بھی ملنے نہیں دیتی دنیا
چھپ کے ملتا ہوں کبھی جب نہیں ہوتا کوئی

جس کو مل جائے یہ دولت، ہو مبارک اسکو
شعر سب کے لئے منصب نہیں ہوتا کوئی

سلیمان اریب



کوئی دشمن، کوئی ہمدم بھی نہیں ساتھ اپنے
تو نہیں ہے تو دو عالم بھی نہیں ساتھ اپنے

ساتھ کچھ دُور ترے، ہم بھی گئے تھے، لیکن
اب کہاں جائیں کہ خود ہم بھی نہیں ساتھ اپنے

وہ بھی اک وقت تک، خورشید بکف پھرتے تھے
یہ بھی اک وقت ہے، شبنم بھی نہیں ساتھ اپنے

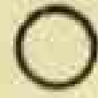
ناخنِ وقت نے کب زخم کو دہکایا ہے
ایسے اک وقت کہ مرہم بھی نہیں ساتھ اپنے

سامنے کتنی صلیبیں ہیں پہ بے گنہی۔!
آج لغزشِ دلِ مریم بھی نہیں ساتھ اپنے

پی کے سوچا کہ خریدیں گے غمِ دنیا بھی
طے ہوئے دام تو درہم بھی نہیں ساتھ اپنے



نازِ پروردۂ جہاں تم ہو
دردِ وغم ہو جہاں جہاں تم ہو
یہ زمیں بھی اگر نہیں میری
ہائے کیوں زیرِ آسماں تم ہو
میں نے کی تھی شکایتِ دوراں
بے سبب مجھ سے بدگماں تم ہو
میں زمانے سے خود سمجھ لیتا
وقت کے میرے درمیاں تم ہو
پھوٹتی ہے وہیں سے درد کی لَے
پردۂ ساز میں جہاں تم ہو
تم کو پا کر بھی سوچتا ہوں یہی
کیا فقط رنجِ رائیگاں تم ہو



میرا سایہ ہے مرے ساتھ، جہاں جاؤں مَیں
بے بسی! تو ہی بتا، خود کو کہاں پاؤں مَیں

بے گھری "مجھ سے پتہ پوچھ رہی ہے میرا
دربدر پوچھتا پھرتا ہوں، کہاں جاؤں مَیں

زخم کی بات بھی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی
دل نہیں پھول کہ ہر شخص کو دکھلاؤں مَیں

زندگی کون سے ناکردہ گنہ کی ہے سزا
خود نہیں جانتا، کیا اوروں کو بتلاؤں مَیں

ایک حمام میں تبدیل ہوئی ہے دنیا
سب ہی ننگے ہیں، کسے دیکھ کے شرماؤں مَیں



نظامِ شمس و قمر کتنے دستِ خاک میں ہیں
زمانے جیسے تری چشمِ خوابناک میں ہیں

شراب و شعر میں عریاں تو ہو گئے لیکن
فضائے ذات کے پردے ہر ایک چاک میں ہیں

شگفتِ لالہ و گل میں بھی سب کہاں نکھرے
نہ جانے کتنے شہیدوں کے خواب خاک میں ہیں

ترا وصال، زمستاں کی رات ہو جیسے
وہ سرد مہری کہ پہلو ترے تپاک میں ہیں

جو سر اٹھا کے چلیں، تم ہی اک نہیں ہو اریبؔ
کچھ ایسے لوگ ابھی تک تو ہند و پاک میں ہیں

مشفق خواجہ



قدم اُٹھے تو عجب دلگداز منظر تھا
میں آپ اپنے لیے راستے کا پتھر تھا

دل ایک اور ہزار آزمائشیں غم کی
دیا جلا تو تھا لیکن ہوا کی زد پر تھا

ہر آئینہ مری آنکھوں سے پوچھ لیتا ہے
وہ عکس کیا ہوئے، آباد جن سے یہ گھر تھا

ہر اک عذاب کو میں سہہ گیا، مگر نہ ملا
وہ ایک غم جو مرے حوصلے سے بڑھ کر تھا

یہ وہم تھا کہ مجھے وہ بھلا چکا ہو گا
مگر ملا تو وہ میری ہی طرح مضطر تھا

ہزار بار خود اپنے مکاں پہ دستک دی
اس احتمال میں جیسے کہ میں ہی اندر تھا

تمام عمر کی تنہائیاں سمیٹی ہیں
یہی مرے در و دیوار کا مقدر تھا

اُداس راتوں میں، پیہم سلگتی صبحوں میں
جو غم گسار تھا کوئی تو دیدۂ تر تھا

مشفق خواجہ



یہ کیا ضرور ہمیں کو وہ آزمائے گا
ہر آنے والا، مقدر بھی ساتھ لائے گا

کسے خبر ہے کہ اس تیرہ خاکداں کیلئے
ہے ایک دل ہی تو روشن، سو ڈوب جائیگا

کھلے دریچوں سے یوں جھانکتی ہے مایوسی
کہ جیسے اب کوئی جھونکا اِدھر نہ آئے گا

اداس رات کی سرگوشیوں کے بعد اگر
سحر جو آئی تو کس کو یقین آئے گا

میں جس کے ماضی کا اک لمحۂ گریزاں ہوں
یہ دیکھنا ہے، وہ کیسے مجھے بھلائے گا

ہزار خواب ہیں ان خود فریب آنکھوں میں
بچھڑ کے بھی وہ یہاں سے کہیں نہ جائے گا

یہ دن بھی آ گئے اب، اپنے دل پہ بیتی ہوئی
میں خود کہوں گا، مجھی کو یقیں نہ آئے گا

مشفق خواجہ



اے مشفقِ من! اس حال میں تم کس طرح بسر فرماؤ گے
انجان بنے چپ بیٹھو گے اور جان کے دھوکے کھاؤ گے

تم اپنے گھر کے اندھیرے میں، کیا دیکھتے ہو دیواروں کو
یہ شمع کی صورت جلنا کیا، آئے گی ہوا، بجھ جاؤ گے

جن جھوٹے سچے خوابوں کی تعبیر غمِ تنہائی ہے
اُن جھوٹے سچے خوابوں سے تم کب تک دل بہلاؤ گے

ان دیدہ و دل کی راہوں پر تم کس کی تلاش میں پھرتے ہو
جو کھونا تھا سو کھو بیٹھے، کیا ڈھونڈو گے کیا پاؤ گے

چھوڑو بھی پرانی باتوں کو، جو دل پہ بیتی، بیت گئی
افسردہ دلی سے تم کب تک ہر محفل کو گرماؤ گے

تم خلوتِ غم سے نکلو تو، اس شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں
اک بار جو اُن کو دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے

کچھ گردِ سفر کے رشتے سے، کچھ نقشِ قدم کے ناتے سے
جس راہ سے گزرو گے یارو، ہم کو بھی وہیں تم پاؤ گے

ممکن ہی نہیں ہے لفظوں میں اُس حسن کی ہو تفسیر کوئی
جب آنکھ کھلے، خاموش رہو، کیا سمجھو گے سمجھاؤ گے

جو پہلے تھے ہم، وہ آج بھی ہیں، پہچان ہماری آساں ہے
تم رُوپ بدل کر لاکھ پھرو، پر کس کس کو جھٹلاؤ گے

غم ہی لے دے کے مری دولتِ بیدار نہیں
یہ خوشی بھی ہے میسّر، کوئی غمخوار نہیں

خود سے بھی توڑ چکا ہوں میں تعلق اپنا
اب مری راہ میں حائل کوئی دیوار نہیں

ایسی سنسان کبھی پہلے نہ تھی ہجر کی رات
دور تک قافلۂ صبح کے آثار نہیں

بات آسان فراوانیٔ غم نے کر دی
اب مجھے شکوۂ ناکامیٔ اظہار نہیں

زندہ رہ لوں کسی صورت تو بڑی بات ہے یہ
ورنہ جاں سے تو گزرنا کوئی دشوار نہیں

دامِ وحشت سے رہائی نہیں ممکن شاید
ہوں اسیر اپنا بھی، صرف اُس کا گرفتار نہیں

قصّۂ غم بھی وہی، میں بھی وہی، دل بھی وہی
پر وہ پہلا سا خلوصِ در و دیوار نہیں

مشفق خواجہ



کیوں خلوتِ غم میں رہتے ہو، کیوں گوشہ نشیں بیکار ہوئے
آخر تمہیں صدمہ کیا پہنچا، کیا سوچ کے خود آزار ہوئے

کیوں صاف کشادہ رستوں پر تم ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہو
کیوں تیرہ و تاریک گلیوں میں تم ان کے خوش رفتار ہوئے

کیوں راستہ چھوڑ کے چلتے ہو، کیوں لوگوں سے کتراتے ہو
کیوں چلتے پھرتے اپنے لئے، تم آپ ہی اک دیوار ہوئے

کب اٹھتے بیٹھتے سوچتے ہو: کیا لکھتے پڑھتے رہتے ہو
اس عمر میں یہ بے کیفی کیوں، کس واسطے نیک اطوار ہوئے

کیوں ایسے سفر پر نکلے ہو، منزل نہیں جس کی کوئی بھی
کیوں راہ پہ ایسی چلتے ہو، سائے بھی جہاں دیوار ہوئے

کیوں ترکِ علائق کو تم نے سمجھا ہے علاجِ غم آخر
دیکھو تو ولی صوفی بھی یہاں کس ٹھاٹ کے دنیا دار ہوئے

مایوسیِ پیہم سے تم نے یارانہ یہ کیسا گانٹھا ہے
اندوہ و الم تھے جتنے بھی، آخر وہ گلے کا ہار ہوئے

اس کلبۂ احزاں سے ہرگز، ابھرے گا نہ سورج کوئی بھی
کب خاک ستارہ بار ہوئی، کب سائے سحر آثار ہوئے

کب صبح کے نالے کام آئے، کیا گریۂ نیم شبی سے ملا
اس قریۂ خواب فروشاں میں تم کس کے لئے بیدار ہوئے

بیکار الجھتے رہتے ہو، کیوں الٹی سیدھی باتوں میں
یہ مرحلے وصل و ہجراں کے اب ایسے بھی کیوں دشوار ہوئے

اس کوچے کی راہ تو سمجھاؤ، جس کوچے میں جانا مشکل ہے
اس شخص کا نام تو بتلاؤ، تم جس کے لئے بیمار ہوئے

مشفق نے یہ باتیں سن کے کہا، باتیں نہ ہوئیں اشعار ہوئے
یہ درد سنانے والے بھی کس شان کے خوش گفتار ہوئے

صد شکر کہ خوش اسلوبی سے تکمیل کو پہنچی رسوائی
عشاقِ زمانہ تھے جو خود ہی، آخر وہ مرے غم خوار ہوئے



یہ کوئی دل تو نہیں ہے کہ ٹھہر جائے گا
وقت اک خوابِ رواں ہے سو گزر جائے گا

ہر گزرتے ہوئے لمحے سے یہی خوف رہا
حسرتوں سے مرے دامن کو یہ بھر جائے گا

دل شفق رنگ تھا ڈوبتے سورج کی طرح
رات آئے گی تو ہر خواب بکھر جائے گا

شدتِ غم سے ملا زیست کو مفہوم نیا
ہم سمجھتے تھے کہ دل جینے سے بھر جائے گا

چند لمحوں کی رفاقت ہی غنیمت ہے کہ پھر
چند لمحوں میں یہ شیرازہ بکھر جائے گا

اپنی یادوں کو سمیٹیں گے بچھڑنے والے
کسے معلوم ہے، پھر کون کدھر جائے گا

یادیں رہ جائیں گی، اور یادیں بھی ایسی، جن کا
زہر آنکھوں سے رگ و پے میں اتر جائے گا

مشفق خواجہ



نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا

کتنے چہروں پہ رہے عکس مری حیرت کے
مہرباں مجھ پہ ہوئے آئینہ پیکر کیا کیا

وقت کٹتا رہا مے خانے کی راتوں کی طرح
ہے گردش میں یہ دن رات کے ساغر کیا کیا

چشمِ خوباں کے اشاروں پہ تھا جینا مرنا
روز بنتے تھے، بگڑتے تھے مقدر کیا کیا

پاؤں اٹھتے تھے، اسی منزلِ وحشت کی طرف
راہ تکتے تھے جہاں راہ کے پتھر کیا کیا

رہگزرِ دل کی نہ پل بھر کو بھی سنسان ہوئی
قافلے غم کے گزرتے رہے اکثر کیا کیا

آذرانہ تھے مری وحشتِ دل کے سب رنگ
شام سے صبح تلک ڈھلتے تھے پیکر کیا کیا

اور اب حال ہے یہ خود سے جو ملتا ہوں کبھی
کھول دیتا ہوں شکایات کے دفتر کیا کیا



ہجومِ ہم نفساں چارۂ الم نہ ہوا
کہ اس طرح غمِ تنہا روی تو کم نہ ہوا

نہ پوچھ دشتِ طلب میں متاعِ دامنِ زیست
یہ تار تار تو ہوتا رہا پہ نم نہ ہوا

لکھی گئی ہیں جنوں کی حکایتیں کیا کیا
مگر وہ قصۂ غم جو کبھی رقم نہ ہوا

ملی نہ آبلہ پایانِ شوق کو منزل
کہ فاصلوں کی طرح حوصلہ بھی کم نہ ہوا

رہِ طلب میں ہے آسودہ حال موجِ نسیم
خدا خدا ہی رہا اور صنم صنم نہ ہوا

وہ کون ہیں کہ ہوس راس آگئی ہے جنہیں
یہاں تو عشق بھی چارہ گرِ الم نہ ہوا

گماں ہوا مجھے احسان ناشناسی کا
جو خود بخود کوئی آمادۂ ستم نہ ہوا

مشفق خواجہ



کچھ اس طرح سے ترا غم دیئے جلاتا تھا
کہ خاکِ دل کا ہر اک ذرّہ جگمگاتا تھا
اسی لئے نہ کیا تلخیٔ جہاں کا گلہ
ترا خیال پسِ پردہ مسکراتا تھا

نہ یاد رکھتا تھا مجھ کو، نہ بھول جاتا تھا
کبھی کبھی وہ مجھے یوں بھی آزماتا تھا
ہر آئینہ تھا سراپا حجاب میرے لئے
میں اپنے آپ کو دیکھوں، نظر وہ آتا تھا
نظر چرا کے وہ گزرا قریب سے لیکن
نظر بچا کے مجھے دیکھتا بھی جاتا تھا
غزل کے لہجے میں ہوتی تھی گفتگو اس سے
وضاحتوں میں بھی ابہام رہ ہی جاتا تھا
وہاں بھی سایۂ دیوار اس کا یاد رہا
خود اپنا سایہ جہاں ساتھ چھوڑ جاتا تھا

اداس کمرہ مہکتا تھا کس کی یادوں سے
وہ کون شخص تھا، کیا تھا، کہاں سے آتا تھا
چمکتے تھے در و دیوار آئینوں کی طرح
ان آئینوں میں کوئی عکس مسکراتا تھا
یہ خواب ہی مری تنہائیوں کا حاصل تھا
یہ خواب ہی مری تنہائیاں بڑھاتا تھا



کبھی پیغامِ سکوں تیری نظر نے نہ دیا
زندگی چھین لی اس طرح کہ مرنے نہ دیا

تھی بہارِ گلِ جلوہ کہ ہوا کا جھونکا
جس نے دامنِ نگہِ شوق کا بھرنے نہ دیا

دی جس احساس نے مرنے کی تمنّا ہم کو
اسی احساس کی رعنائی نے مرنے نہ دیا

جانے کیا قصۂ غم تھا کہ نظر نے تیری
کہنے بھی نہ دیا، یاد بھی کرنے نہ دیا

منزلیں اور بھی تھیں کوئے ملامت کے سوا
مگر آشفتہ مزاجی نے ٹھہرنے نہ دیا

عمر بھر ایک تمنائے سکوں نے ہم کو
دل کی بے تابی کا اندازہ بھی کرنے نہ دیا

محسن بھوپالی



دوستو، بارگہِ قتل سجاتے جاؤ
قرض ہے رشتۂ جاں، قرض چکاتے جاؤ

رہے خاموش تو یہ ہونٹ سُلگ اُٹھیں گے
شعلۂ فکر کو آواز بناتے جاؤ

اپنی تقدیر میں صحرا ہے تو صحرا ہی سہی
آبلہ پاؤ! نئے پھول کھلاتے جاؤ

زندگی سایۂ دیوار نہیں، دار بھی ہے
زیست کو عشق کے آداب سکھاتے جاؤ

بے ضمیری ہے سرافراز کو غم کیسا ہے
اپنی تذلیل کو معیار بناتے جاؤ

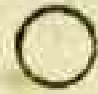
اے مسیحاؤ! اگر چارہ گری ہے دشوار
ہو سکے تم سے، نیا زخم لگاتے جاؤ

کارواں عزم کا رُکے سے کہیں رُکتا ہے
لاکھ تم راہ میں دیوار اٹھاتے جاؤ

ایک مدّت کی رفاقت کا ہو کچھ تو انعام
جاتے جاتے کوئی الزام لگاتے جاؤ

جن کو گہنا دیا افکار کی پرچھائیں نے
محسنؔ ان چہروں کو آئینہ دکھاتے جاؤ!

محسن بھوپالی



یہ طے ہوا ہے کہ قاتل کو بھی دعا دیجے
خود اپنا خون بہا، پھر بھی خوں بہا دیجے

نیاز و ناز بجا ہیں، مگر یہ شرطِ وصال
ہے سنگِ راہِ تعلق، اسے ہٹا دیجے

سنا تھا ہم نے کہ منزل قریب آ پہنچی
کہاں ہیں آپ، اگر ہو سکے، صدا دیجے

سحر قریب سہی پھر بھی کچھ بعید نہیں
چراغ بجھنے لگے ہیں تو لو بڑھا دیجے

مہکتے زخموں کو انعامِ فصلِ گل کہیے
سلگ اُٹھے جو چمن، برق کو دعا دیجے

کچھ اس طرح سے کہ گذرے ہیں جس قیامت سے
سمجھئے خواب اسے، خواب کو بھلا دیجے

بدل گئے ہیں تقاضے سخن شناسی کے
اُدھر عطا ہو، اِدھر داد برملا دیجے

یہ کیا ضرور کہ احساس کو زباں مل جائے
ہے حکمِ نغمہ سرائی تو گنگنا دیجے

محسن بھوپالی



جیتے جیتے، چلتے پھرتے، لاشے جیسے لوگ
وقت سے پہلے مر جاتے ہیں کتنے ایسے لوگ

سر پر چڑھ کر بول رہے ہیں پودے جیسے لوگ
پیڑ بنے خاموش کھڑے ہیں کیسے کیسے لوگ

چڑھتا سورج دیکھ کے خوش ہیں کون انہیں سمجھائے
پیتی دھوپ میں کملائیں گے غنچے جیسے لوگ

شب کے راج دلارو، سوچو اپنا بھی انجام
شب کا کیا ہے کاٹ ہی دیں گے جیسے تیسے لوگ

غم کا درماں سوچنے بیٹھے تھے جو رات گئے
فکرِ فردا لے کر اُٹھے بزم سے لوگ

محسنؔ اور بھی نکھرے گا اِن شعروں کا مفہوم
اپنے آپ کو پہچانیں گے جیسے جیسے لوگ



رات بھر جینے سے کیا، شمعِ شبستاں کی طرح
ایک لمحہ ہے بہت، شعلۂ رقصاں کی طرح

دل کے زخموں پہ بھی پھولوں کا گماں ہوتا ہے
یاد آئی ہے تری، موجِ بہاراں کی طرح

کیوں ہو خاموش، رفیقانِ چمن! کچھ تو کہو،
صبحِ گلشن بھی نہ گذرے شبِ زنداں کی طرح

لذتِ درد کو اربابِ ہوس کیا جانیں
لذتِ درد کہ ارزاں نہیں درماں کی طرح

یورشِ درد نے پندارِ وفا توڑ دیا!
ہم بھی نادم ہیں بہت حسنِ پشیماں کی طرح

یاد رکھے گا سلگتا ہوا ماحول ہمیں
خارزاروں میں رہے ہم، گلِ خنداں کی طرح

طبعِ خوددار پہ اک طرفہ ستم ہے محسنؔ
ان کا اندازِ کرم، غیر کے احساں کی طرح

محسن بھوپالی



ہے وجہِ تماشائے جہاں دل شکنی بھی
منظور ہے اے دوست یہ نیزے کی انی بھی

شاداب درختوں کے بھی سائے ہیں گریزاں
اک جرم ہوئی میری غریب الوطنی بھی

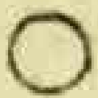
پیتے ہی رہے گردشِ ایام کے ہاتھوں
صہبائے ملامت بھی، غمِ طعنہ زنی بھی

سوچا تھا کہ اس بزم میں خاموش رہیں گے
موضوعِ سخن بن کے رہی کم سخنی بھی

اے سلسلۂ نکہتِ گیسو کے اسیرو!
ہے عشق میں اک مرحلۂ کوہ کنی بھی

ویران جزیروں کی طرح خشک ہیں آنکھیں
بیکار ہے اے درد، تری نالہ زنی بھی

اے نازشِ صد رنگ نہ کر ان سے تغافل
ہے خاک نشینوں سے تری گلبدنی بھی



جامِ تہی قبول نہ تھا غم سمو لیے
پھولوں کے انتظار میں کانٹے چبھو لیے

محرومیٔ دوام بھی کیا لطف دے گئی
یہ سوچ کر ہنسے ہیں کہ اک عمر رو لیے

ہم ہیں وہ سادہ لوح کہ پا کر رضائے دوست
خود اپنے ہاتھ اپنے ہی خوں میں ڈبو لیے

جس سمت سے بھی بانگِ جرس آئی دشت میں
دیوانگانِ شوق اسی سمت ہو لیے

پچھلا پہر ہے شب کا کہ ہے شام کا سماں
وہ کیا بتا سکیں گے جو اک نیند سو لیے

کیا جبر ہے، ثبوتِ وفا پیش کیجیے
اور ان کا نام آئے تو پھر لب نہ کھولیے

محسن زبان دیجیے بزمِ خموش کو
مہمل ہے آج لفظِ سخن کچھ تو بولیے

محسن بھوپالی



تا دیر ہم بدیدۂ تر دیکھتے رہے
یادیں تھیں جس میں دفن، وہ گھر دیکھتے رہے

کیا کیا نہ اعتبار دیا اک سراب نے
ہر چند تشنہ لب تھے مگر دیکھتے رہے

سورج چڑھا تو پھر بھی وہی لوگ زد میں تھے
شب بھر جو انتظارِ سحر دیکھتے رہے

صحنِ چمن کو اپنے لہو سے سنوار کر
دستِ ہوس میں ہم گُلِ تر دیکھتے رہے

یہ دل ہی جانتا ہے کہ کس حوصلے کے ساتھ
نا قدریِ متاعِ ہنر دیکھتے رہے

محسنؔ عروجِ کم نظراں سانحہ نہیں
یہ سانحہ ہے، اہلِ نظر دیکھتے رہے



نگارِ صبحِ درخشاں سے لو لگائے ہوئے
ہیں اپنے دوش پہ اپنی صلیب اٹھائے ہوئے

گزر رہے ہیں دبے پاؤں، وقت کی مانند
فرازِ دار پہ اپنی نظر جمائے ہوئے

صلہ ملے نہ ملے، خونِ دل چھڑکتے چلیں
ہر ایک خار ہے دستِ طلب بڑھائے ہوئے

وہ اب بھی سایۂ ابرِ رواں کو تکتے ہیں
جنھیں زمانہ ہوا اپنا گھر جلائے ہوئے

چھلک سکا نہ کبھی جامِ چشمِ تر محسنؔ
اگرچہ عمر ہوئی ہم کو گنگنائے ہوئے

محسن بھوپالی



جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے
اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے

میخانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

ہے خوئے ایازی ہی سزاوارِ ملامت
محمود کو کیوں طعنۂ اکرام دیا جائے

ضد ہے کہ انہیں مان کے سرخیلِ بہاراں
غنچوں کی طرف سے کوئی پیغام دیا جائے

ہم مصلحتِ وقت کے قائل نہیں یارو
الزام جو دینا ہے، سرِ عام دیا جائے

بہتر ہے کہ اس بزم سے اٹھ آیئے محسن
سرقے کو جہاں رتبۂ الہام دیا جائے



عظمتِ فن کے پرستار ہیں ہم
یہ خطا ہے تو خطاوار ہیں ہم

جہد کی دھوپ ہے ایمان اپنا
منکرِ سایۂ دیوار ہیں ہم

جانتے ہیں ترے غم کی قیمت
مانتے ہیں کہ گنہگار ہیں ہم

اس کو چاہا تھا کبھی، خود کی طرح
آج خود اپنے طلبگار ہیں ہم

اہلِ دنیا سے شکایت نہ رہی
وہ بھی کہتے ہیں، زیاں کار ہیں ہم

کوئی منزل ہے نہ جادہ محسن
صورتِ گردشِ پرکار ہیں ہم

گوہرؔ ہوشیار پوری



شاعری بات نہیں گرمِ سخن ہونے کی
شرط ہی اور ہے شائستۂ فن ہونے کی

ہے کہ ہر دم مجھے بالیدگیٔ روح کی فکر
روح کو فکر ہے وارستۂ تن ہونے کی

رم بہ رم سلسلۂ موجِ غزالانِ خیال
دشتِ غربت کو بشارت ہو وطن ہونے کی

پرتوِ رنگ سے گلگوں ہُوا معمورۂ چشم
دھوم ہے گوشے تماشا کے چمن ہونے کی

حق پرستی کو یہاں کون ہے آمادۂ دار
کس کو توفیق ہے بے گور و کفن ہونے کی

یا پہنچے گا نہ سحر تک کوئی درماندۂ شب
یا سحر ہی نہیں، خاکم بدہن، ہونے کی

درد کی سالگرہ خیر سے گزرے گوہرؔ
آگئی رات وہی چاند گہن ہونے کی

گوہر ہوشیارپوری



مرحلہ طے کوئی بے منّتِ جادہ بھی تو ہو
غم بڑھے بھی تو سہی، درد زیادہ بھی تو ہو

ایسی مشکل تو نہیں دشتِ وفا کی تسخیر
سر میں سودا بھی تو ہو، دل میں ارادہ بھی تو ہو

ذہن کا مشورۂ ترکِ طلب بھی برحق
ذہن کی بات قبولِ دلِ سادہ بھی تو ہو

کہیں بادل، کہیں سورج، کہیں سایہ، کہیں دھوپ
مرے معبود! تیرا کوئی لبادہ بھی تو ہو

پیار میں کم تو نہیں کم نگہی بھی اس کی
ہاں تنگ نظرئ احساس کشادہ بھی تو ہو

عاشقی سرمد و منصور سے کچھ خاص نہیں
مست لیکن کوئی بے زحمتِ بادہ بھی تو ہو

ظرفِ ابذا طلبی غم بھی پرکھ لیں گوہر
اُس سے اِک روز نہ ملنے کا ارادہ بھی تو ہو

گوہر ہوشیارپوری

متاعِ عشق ذرا اور صرفِ ناز تو ہو
تضیعِ عمر کا آخر کوئی جواز تو ہو

بعد گر کوئی شب اس سے لب بہ لب تو چلے
ہوائے شوق کچھ آلودۂ مجاز تو ہو

قدم قدم کوئی سایہ سا متصل تو رہے
سراب کا یہ سرِ سلسلہ دراز تو ہو

وہ کم سخن، نہ کم آمیز، پھر تکلف کیا
کچھ اس سے بات تو ٹھہرے کچھ اس سے ساز تو ہو

وفا سے منزلِ ترکِ وفا تک آ نکلے
کسی بہانے تو پتھر کبھی گداز تو ہو

شفق کنایہ لب — شام استعارہ زلف
کبھی خیال دلیلوں سے بے نیاز تو ہو

حضورِ ناز عبث ہے خیالِ جاں گوہر
نیاز محرمِ غمنازۂ نیاز تو ہو

طبعِ جنوں سرشت ہی کچھ حیلہ جو نہ تھی
توفیقِ ضبط تھی کہ مجالِ رفو نہ تھی

آخر کبھی تو جرعۂ صہبائے لطف بھی
مے سے فقط مرادِ مئے آرزو نہ تھی

اتنا شدید قحطِ مروت کبھی نہ تھا
ناموسِ درد یوں کبھی بے آبرو نہ تھی

وہ وضعِ خامشی کا زباں آشنا نہ تھا
اظہار اپنے نطقِ تمنا کی خو نہ تھی

جذبوں کا خوں الگ تھا، بچھڑنے کا دکھ الگ
شامِ فراق دل کو اذیت دوگونہ تھی

کچھ زخم خوردہ سیلیٔ صرصر سے تھی بہار
کچھ اس زمینِ شور میں تابِ نمو نہ تھی

گوہر غزل لکھی پئے تقریبِ عرضِ غم
اس کم سخن سے اندازِ گفتگو نہ تھی

گوہر ہوشیارپوری

ہاں کاہشِ فضول کا حاصل بھی کچھ نہیں
لیکن حیات بے خلشِ دل بھی کچھ نہیں

اب سوچ لو، قدم ہیں زیاں گاہِ شوق میں
کہنا نہ پھر کہ جذبۂ کامل بھی کچھ نہیں

گہرا سکوت ـــ چاپ کی آوازِ بازگشت
رہ میں بھی کچھ نہ تھا، سرِ منزل بھی کچھ نہیں

جُز حرصِ منفعت تہِ دریا بھی کچھ نہ تھا
جُز وہمِ عافیت لبِ ساحل بھی کچھ نہیں

سب جذبِ آرزو کی تمازت کا کھیل ہے
دل سرد ہو تو گرمیٔ محفل بھی کچھ نہیں

بدلے تو اِک نمونۂ اعراض و احتراز
یوں اس نگہ کی راہ میں حائل بھی کچھ نہیں

گوہرؔ خلا میں گھورتے پھرتے ہو ـــ اب کہو
کیا سچ ہے بھولنا اُسے مشکل بھی کچھ نہیں

میں خود ہی خوگرِ خلش جستجو نہ تھا
دشوار ورنہ مرحلۂ آرزو نہ تھا

ناحق خرابِ منّتِ درماں ہوا نہ درد
ممنونِ زخم ہوں کہ مقامِ رفو نہ تھا

یا آشنائے رمزِ طلب ہی نہ تھی زباں
لب وا ہوئے تو حوصلۂ گفتگو نہ تھا

ناپرسشِ وفا کی یہ نوبت کبھی نہ تھی
دل یوں سلوکِ اہلِ کرم سے لہو نہ تھا

ہاں کب بنامِ عشق، ہوس سرخرو نہ تھی
ہاں کب نیازِ شوق سبک کو بہ کو نہ تھا

خوش فہمیٔ خیال کی اب ضد کا کیا علاج
ورنہ جو شام پاس سے گزرا تھا، تو نہ تھا

گوہرؔ غزل سے دُھل تو گیا کچھ غبارِ غم
ہر چند یہ ہنر سببِ آبرو نہ تھا

گوہر ہوشیارپوری

سمن بروں سے چمن دولتِ نمو مانگے
ہوائے دامنِ گل گیسوؤں کی بو مانگے

طرازِ شوخیٔ پا ہے گیاہِ سبز کی مانگ
خرامِ ناز کا انداز آبِ جو مانگے

بکھرتی زلف سے ٹوٹے غرورِ شب کا طلسم
سحر کا حسن، فسونِ رُخِ نکو مانگے

ورق ورق گلِ تر، موج موج بادِ سحر
بدن کا لمس ترے پیرہن کی بو مانگے

شگافِ کوہ نہ تھا تیشۂ وفا کی طلب
یہ جوئے شیر ابھی اور کچھ لہو مانگے

شکستِ شیشۂ پندار کی صدا بھی سُن
کرم کی بھیک جب اس سنگدل سے تُو مانگے

کہاں وہ شوخ مگر اپنا نطق و لب گوہر
اسی کا ذکر پئے زیبِ گفتگو مانگے

○

دل تمام آئینے، تیرہ کون؟ روشن کون
اب یہ آنکھ ہی جانے، دوستوں میں دشمن کون

یا جگر میں خوں کم تھا، یا ابھی جنوں کم تھا
وحشت کے عوض کرتا ورنہ قصدِ گلشن کون

اِک نشاط آرائی، اِک سکونِ تنہائی
ہجر یا وصال اچھا، حل کرے یہ الجھن کون

سلسلے محبت کے، نام سے نہیں چلتے
اپنی ذات جو تج دے شیخ کیا برہمن کون

اِک نئی لگن بخشے، اِک فقط تھکن بخشے
مردم آزما نکلا، رہنما کہ رہزن، کون

عشق بے خبر گذرے خیر و شر کے عقدوں سے
آرزو کی سیتا کو رام کون؟ راون کون

خامۂ سخنور یا جذبِ اندرون گوہر
فن کے سر پہ رکھتا ہے تاجِ عظمتِ فن کون



یہ صحرائے طلب یا بستۂ آشفتہ حالی ہے
کوئی دریوزہ گر اپنا، کوئی تیرا سوالی ہے

حوادث سے نبرد آرائیوں کا کس کو یارا تھا
جنوں اپنا سلامت جس نے ہر افتاد ٹالی ہے

تیرے اغماض کی خو سیکھ لی اہلِ مروت نے
کہ محفل درد کی اب صاحبِ محفل سے خالی ہے

حضوری ہو کہ مہجوری، محبت کم نہیں اُس سے
تب اپنا بخت عالی تھا اب اپنا ظرف عالی ہے

نمو کا جوش کچھ نظارہ فرما ہو تو ہو — ورنہ
بہار اب کے برس خود پائمالِ خشک سالی ہے

کسی کے لطفِ کم کو دیر لگتی ہے سوا ہوتے
چٹخنے تک، تو ہر گل کی جبلت انفعالی ہے

شرف اتنا کہ غالبؔ کی زمیں میں ہے غزل گوہرؔ
وہ مضموں آفرینی ہے نہ وہ نازک خیالی ہے



دل سلسلۂ شوق کی تشہیر بھی چاہے
زنجیر بھی — آوازۂ زنجیر بھی چاہے

آرام کی صورت نظر آئے تو کچھ انساں
نیرنگِ شب و روز میں تغییر بھی چاہے

سودائے طلب کو نہ توکل کے عوض دے
یہ شرط تو خود خالقِ تقدیر بھی چاہے

لازم ہے محبت ہی محبت کا بدل ہو
تصویر جو دیکھے، اسے تصویر بھی چاہے

اک پل میں بدلتے ہیں خد و خال ہیولے
آنکھ اپنے کسی خواب کی تعبیر بھی چاہے

لہجہ تو بدل چبھتی ہوئی بات سے پہلے
تیر ایسا تو کچھ ہو جسے نخچیر بھی چاہے

تاثیر سے خالی تو سخن ننگ ہے گوہرؔ
شاعر کو عطا ہو سندِ میرؔ بھی چاہے

صادق نسیم



شکستِ آبلۂ دل میں نغمگی ہے بہت
سنے گا کون کہ دنیا بدل گئی ہے بہت

ہر ایک نقش میں ہے ناتمامیوں کی جھلک
ترے جہاں میں کسی چیز کی کمی ہے بہت

گلے لگا کے گل و نسترن کو رُدیا ہوں
کہ مجھ کو نظمِ گلستاں سے آگہی ہے بہت

یہاں کسی کا بھی چہرہ دکھائی دے نہ سکے
حریمِ دل میں تمنّا کی روشنی ہے بہت

میں ایک لمحہ بھی مانندِ شمع جل نہ سکوں
وہ ایک شب کے لیے ہی سہی، جلی ہے بہت

ہے خود فریب بہت میرے عہد کا فنکار
ہنر نہیں بھی تو شورِ ہنروری ہے بہت

لبوں پہ جاں ہو تو احساسِ تلخ و شیریں کیا
کہیں سے زہر ہی لاؤ کہ تشنگی ہے بہت

خرد کو ناز ہے کیوں رسمِ کجکلاہی پر
سرِ جنوں کے لیے مشتِ خاک بھی ہے بہت

گراں ہے جنسِ وفا اور مشتری نایاب
ہزار بار لُٹا ہوں کہ دل غنی ہے بہت

عجب نشاط کے پہلو غمِ حبیب میں ہیں
کہ ڈوبتی نہیں یہ ناؤ، ڈولتی ہے بہت

تمھارا نام کسی اجنبی کے لب پہ تھا
ذراسی بات تھی، دل کو مگر لگی ہے بہت

دمِ وداع میں یوں مسکرا رہا ہوں نسیمؔ
کہ جیسے ان سے جدائی کی بھی خوشی ہے بہت

صادق نسیم



نظر نظر سے وہ کلیاں کھلا کھلا بھی گیا
گُلِ مراد کو قدموں میں روندتا بھی گیا

بلند شاخ کے گُل کی طرح نہ ہاتھ آیا
وہ رفعتوں پہ رہا، اپنی چھب دکھا بھی گیا

مجھے نویدِ جدائی سنانے آیا تھا
جدا ہوا تو مری سمت دیکھتا بھی گیا

وہ زخم زخم پہ مرہم لگانے آیا تھا
ادائے بخیہ گری سے انھیں دُکھا بھی گیا

وہ میرا شعلہ جبیں، موجۂ ہوا کی طرح
دیئے جلا بھی گیا اور دیئے بجھا بھی گیا

وہ کم نگاہ تھا، کم ظرف تو نہ تھا کہ مجھے
پیالہ دے بھی گیا تشنگی بڑھا بھی گیا

سخن کے آئینوں میں دیکھ دیکھ اپنے نقوش
جھجک جھجک بھی گیا اور جھومتا بھی گیا

مری ہی طرح تھا وہ بھی جنوں کی زد میں مگر
مجھے سنبھال کے خود کو سنبھالتا بھی گیا

وہ جس کا دامنِ شفاف اب بھی ہے بے داغ
وفورِ شوق میں مجھ کو گلے لگا بھی گیا

اس اک نظارے میں تھے کتنے دیدنی پہلو
وہ میرے حال پہ رو یا بھی، مسکرا بھی گیا

غمِ وداع میں پنہاں تھا اور بھی اِک غم
کہ دل سے شوقِ ملاقات بارہا بھی گیا

فراقِ یوسفِ گُم گشتہ کم نہ تھا صادقؔ
کہ میرے ہاتھ سے کنعانِ کو لُٹا بھی گیا

صادق نسیم



رشکِ مہتاب جہاں تاب تھا ہر قریۂ جاں
جب بھی دل پر چمک اٹھے ترے قدموں کے نشاں

کون گذرا ہے مہک بن کے دیارِ دل سے
اتنی گلپوش تھیں کب شہرِ طلب کی گلیاں

تیری تصویر کے پرتو نہیں مٹنے پاتے
ایک مدت سے ہے دل کارگہِ شیشہ گراں

آج اس موڑ پہ ہے شہرِ تمنا آباد
ترا دامن نگہِ شوق نے چوما تھا جہاں

میں ترے درد کی کلفت کو کہاں لے آیا
میرے ہمراہ دھڑکتا ہے دلِ کون و مکاں

اتنی مدھم تو نہیں ہے مری فریاد کی لے
ان سلاسل کی صدا گونجے گی زنداں زنداں

وقت آئے گا کہ دہرائیں گے خود اہلِ جفا
میں نے جو گیت سنائے ہیں سرِ نوکِ سناں

موج در موج ابھرتے ہیں تمنا کے سراب
میری تشنہ دہنی میں ہیں سمندر پنہاں

میں وہ اشکوں کا بھکاری ہوں سرِ راہِ وفا
جسکی ٹھوکر میں رہا مرحلۂ سود و زیاں

میں وہ سودائیِ گل ہوں کہ مری آنکھوں نے
سینۂ خار میں دیکھی ہیں مچلتی کلیاں

غم کے لمحوں کا تعین کبھی سوچا تو نسیم
ایک اک پل سے مجھے جھانک رہی تھیں صدیاں



اداس اداس سرِ ساغر و سبو بھی ہیں
ہم نشاط کی اک موجِ تند خو بھی ہیں

مجھی میں گم ہیں کئی تیرگی بکف راتیں
ضیا فروش سرِ طاقِ آرزو بھی ہیں

مجھی سے قائم و دائم ہیں گھر کے سناٹے
تمہاری بزمِ تمنا کی ہاؤ ہو بھی ہیں

مرے ہی زخمِ تمنا ہیں سو طرح کے رنگ
بھری بہار میں محرومِ رنگ و بو بھی ہیں

جو راہ چلتے مری سمت آنکھ بھی نہ اٹھائے
اس کی بزم کا موضوعِ گفتگو بھی ہیں

جسے سنوار کے خود بھی بکھرتا جاتا ہوں
اس ایک گوہرِ صد ضو کی آبرو بھی ہیں

کچھ ایسے طور سے چمکا ہے دل کا داغِ شکست
کہ آج تک نہیں حسرت کشِ رفو بھی ہیں

نظر میں تیرے ہر انداز کو سجائے ہوئے
مثالِ آئینہ بھی ہیں لہو لہو بھی ہیں

میں آج سازِ دلِ بے صدا پہ گاؤں کونسا گیت
تمہارے پاس بھی، دنیا کے روبرو بھی ہیں

تمہاری بزم سے اٹھنے کا بھی خیال مجھے
ذرا سی دیر ٹھہرنے کا حیلہ جو بھی ہیں

خود اپنے آپ سے ایسا بچھڑ گیا ہوں نسیم
کہ اب مقام بھی، منزل بھی، جستجو بھی ہیں

صادق نسیم



جو لب پہ نہ لاؤں وہی شعروں میں کہوں میں
یوں آئینۂ حسرتِ گفتار بنوں میں

آئینۂ آغاز میں دیکھوں رخِ انجام
کلیوں کے چٹکنے کی صدا سے بھی ڈروں میں

میرے لیے خلوت بھی ہے ہنگامے کی صورت
وہ شورِ تمنا ہے کہ کس کس کی سنوں میں

ٹھہرو تو یہ گھر کیا، دل و جاں بھی ہیں تمہارے
جاتے ہو تو کیوں راہ کی دیوار بنوں میں

ہر گام نگاہوں سے لپٹ اٹھتے ہیں شعلے
اور دل کی یہی ضد ہے اسی راہ چلوں میں

ہر ایک نظر آبلہ پا دیکھ رہا ہوں
بستے ہوئے شہروں کو بھی صحرا ہی کہوں میں

کوئی بھی سرِ دار چراغاں نہیں کرتا
اور سب کی تمنا ہے کہ منصور بنوں میں

نقاشیِ تخئیل سے گھبرا سا گیا ہوں
کب تک یونہی خوابوں کے جزیروں میں رہوں میں

جو لے گیا جان و جگر و دل سرِ راہے
وہ گھر میرے آجائے تو کیا نذر کروں میں

مجھ کو ہے جنوں زمزمۂ برگِ خزاں کا
پت جھڑ کے لئے گوش برآواز رہوں میں

صادق مجھے منظور نہیں ان کی نمائش
ہر چند کہ زخموں کا خریدار تو ہوں میں



اپنی آنکھوں سے تو دریا بھی سراب آسا ملے
جو بھی نقدِ جاں لٹانے آئے، ہم سے آ ملے

اب وفا کی راہ پر ہر سمت سناٹا سا ملے
اہلِ دل کے کارواں کن منزلوں سے جا ملے

لب پہ گر نغمہ نہیں، پلکوں پہ ہی تارا ملے
گل نہیں کھلتے تو کوئی زخم ہی کھلتا ملے

رنگ و بو کے پیرہن میں پھول ہیں یا زخم ہیں
اب نہ وہ کلیاں نہ وہ پتے نہ وہ سایا ملے

امتحاں تھا، مصلحت تھی یا مری تقدیر تھی
میں گلستانوں کا طالب تھا، مجھے صحرا ملے

عمر بھر ہر ایک سے میں نے چھپائے دل کے داغ
آج یہ حسرت کہ کوئی دیکھنے والا ملے

میں نے جن آنکھوں میں دیکھے تھے سمندر موجزن
ان میں جو بھی ڈوبنے والا ملے، پیاسا ملے

ناز اس کا پاسباں، انداز اس کا ہم زباں
خلوتوں میں بھی وہ مجھ سے انجمن آرا ملے

آج پھر چھیڑوں گا میں مہتاب کی کرنوں کے تار
کاش امشب تو ملے یا کوئی تجھ جیسا ملے

آنکھ سو رنگوں کی طالب، ہوش سو رنگوں کا زخم
دل کو یہ ضد ہے کہ تیری آرزو تنہا ملے

اجنبی راہیں بھی صادق اجنبی ایسی نہ تھیں
جب کسی کے جانے پہچانے نقوشِ پا ملے

صادق نسیم



بیدلؔ کا تخیل ہوں نہ غالبؔ کی نوا ہوں
اس قافلۂ رفتہ کا نقشِ کفِ پا ہوں

رقصاں ہے چراغانِ تمنا مرے ہر سُو
وہ روشنیاں ہیں کہ میں سائے سے جدا ہوں

جب وحشتِ الم سے کوئی جھونکا کبھی آیا
میں لالۂ خودرو کی طرح اور کھلا ہوں

ظلماتِ اماں بھی ہوں اجالوں کا امیں بھی
میں صبح کے تارے کی طرح ڈوب رہا ہوں

افلاک رسی سے بھی تلافی نہیں ہوتی
کس عزم کی ان دیکھی چٹانوں سے گرا ہوں

ہر عکسِ مقابل سے نمایاں ہے مرا نقش
دنیا میں ہوں یا آئینہ خانے میں کھڑا ہوں

محدود ہے کیوں حدِ طلب تک مری پرواز
میں موجِ صبا ہو کے بھی زنجیر بپا ہوں

ادراک کے شعلوں کا چمن ہے مرا آہنگ
میں برگِ خزاں ہو کے بھی گلزار نما ہوں

احساس کے غنچوں کی چٹک ہے مری آواز
میں سینۂ آفاق میں دھڑکن کی صدا ہوں

ہر چند کہ نس نس میں نہاں برقِ تپاں ہے
کھل کر کبھی برسا ہوں کہ گھنگھور گھٹا ہوں

ایک ایک کرن میں ترے سو رنگ نظر آئے
جب پچھلے پہر چاند کے ہمراہ چلا ہوں

اک نغمۂ رنگیں ہوں لبِ سازِ مژہ پر
صادقؔ جرسِ غنچہ ہوں، تصویرِ صدا ہوں



وہ جس کا رنگ سلونا ہے بادلوں کی طرح
گرا تھا میری نگاہوں پہ بجلیوں کی طرح

وہ روبرو ہو تو شاید نگاہ بھی نہ اٹھے
جو میری آنکھ میں رہتا ہے رتجگوں کی طرح

چراغِ ماہ کے بجھنے پہ یہ ہوا محسوس
بکھر گئی مری شب تیرے گیسوؤں کی طرح

وہ آندھیاں ہیں کہ دل پر تمہاری یادوں کے
نشاں بھی مٹ گئے صحرا کے راستوں کی طرح

مری نگاہ کا انداز اور ہے ورنہ
تمہاری بزم میں ہوں میں بھی دوسروں کی طرح

قریب آئے تو گم کردہ رہ دکھائی دیئے
جو دور سے نظر آتے تھے منزلوں کی طرح

ہر اک نظر کی رسائی نہیں کہ دیکھ سکے
ہجومِ رنگ ہے خاروں میں بھی گلوں کی طرح

نہ جانے کیسے سفر کی ہے آرزو دل میں
میں اپنے گھر میں پڑا ہوں مسافروں کی طرح

میں دشتِ درد ہوں یادوں کی نکہتوں کا امیں
ہوا چلے تو مہکتا ہوں گلشنوں کی طرح

ق

دمک رہا ہے جبینِ دوام پہ فرہاد
شرارِ تیشۂ فروزاں ہے مشعلوں کی طرح

اسی کی دھن میں چٹانوں سے سر کو ٹکرایا
وہ اک خیال کہ نازک تھا آئینوں کی طرح

صادق نسیم



جب بھی تری قربت کے کچھ امکاں نظر آئے
ہم خوش ہوئے اتنے کہ پریشاں نظر آئے

دیکھوں تو ہر اک حسن میں جھلکیں تیرے انداز
سوچوں تو فقط گردشِ دوراں نظر آئے

ٹوٹا جو فسونِ نگہِ شوق تو دیکھا
صحرا تھے جو نقشے ہیں گلستاں نظر آئے

کانٹوں کے دلوں میں بھی وہی زخم تھے لیکن
پھولوں نے سجائے تو نمایاں نظر آئے

اِک اشک بھی نذرِ غمِ جاناں کو نہیں پاس
ہم آج بہت بے سروساماں نظر آئے

جو راہِ تمنا کے ہر اک موڑ پہ چپ تھے
جب دار پہ پہنچے تو غزل خواں نظر آئے

ق

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ نظر کو
جس شہر کو دیکھیں وہی ویراں نظر آئے

کیا روپ نگاہوں میں رچا بیٹھے کہ ان کو
گلشن نظر آئے نہ بیاباں نظر آئے

اک عمر سے اس موڑ پہ بیٹھے ہیں جہاں پر
اِک پل کا گزرنا بھی نہ آساں نظر آئے

صادق کی نگاہوں کو ہی ٹھہراؤ نہ مجرم
آئینے ہر اک دور میں حیراں نظر آئے



کس منہ سے زندگی کو درخشندہ کہہ سکیں
جو مہر و ماہ کو بھی نہ تابندہ کہہ سکیں

وہ دن بھی ہوں، غبار چھٹیں، آندھیاں ہٹیں
اور گل کو رنگ و بو کا نمائندہ کہہ سکیں

تازہ رکھیں سدا خلشِ زخم کو کہ ہم
جو اب نہ کہہ سکے، کبھی آئندہ کہہ سکیں

زنداں میں کوئی روزنِ زنداں تو ہو کہ لوگ
جس حال میں بھی دیکھیں، انہیں زندہ کہہ سکیں

ہر شے بدل رہی ہے عجب عجلتوں میں رنگ
کوئی تو نقش ہو جسے پائندہ کہہ سکیں

دل کے سوا ہے کونسا ایسا چراغِ شام
بے نور ہو کے بھی جسے رخشندہ کہہ سکیں

صدیوں نوا گروں کو میسر نہ آ سکے
وہ گیت جن کو حسرتِ سازندہ کہہ سکیں

اِس دور میں ہر اک کو ہے خود اپنی جستجو
کوئی نہیں جسے ترا جوئندہ کہہ سکیں

ہر سُو اداس چہرے ہیں اِتنے کہ اب نسیم
کس کو دیارِ درد کا باشندہ کہہ سکیں

صہبا اختر



آجا، اندھیری راتیں تنہا بتا چکا ہوں
شمعیں جہاں نہ جلتیں، آنکھیں جلا چکا ہوں

خورشیدِ شامِ رفتہ لوٹے تو اُس سے پوچھوں
میں زندگی کی کتنی صبحیں گنوا چکا ہوں

اُمید و بیمِ شب نے یہ بھی بھلا دیا ہے
کتنے دیئے جلائے، کتنے بجھا چکا ہوں

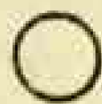
میں بازگشتِ دل ہوں، پیہم شکستِ دل ہوں
وہ آزما رہا ہوں جو آزما چکا ہوں

یہ شب بجھی بجھی ہے، شاید کہ آخری ہے
اے صبحِ درد، تیرے نزدیک آ چکا ہوں

مجھ کو فریب مت دے، اے موسمِ بہاراں
ایسے کئی شگوفے میں بھی کھلا چکا ہوں

سورج طلوع ہوں یا سورج غروب صہبا
شبہائے غم کے پردے خود پر گرا چکا ہوں

صہبا اختر



فردِ عصیاں کو وہ سیاہی دے
جس کی وہ زلف بھی گواہی دے

بے اماں، نیم جاں ہوں، میری جاں
مجھ کو آغوشِ جاں پناہی دے

اپنی زلفوں کے سائے میں مجھ کو
ایک شب کی ستارہ جاہی دے

دل کے اُجڑے نگر کو کر آباد
اس ڈگر کو بھی کوئی راہی دے

میں نے تعمیرِ قصرِ شوق کیا
تو اُسے مژدۂ تباہی دے

بخشنے والے گلرخوں کو جمال
مجھ کو سامانِ خوش نگاہی دے

میں اسیرِ گمانِ ظلمت ہوں
اعتمادِ سحر نگاہی دے

مجھ کو نانِ جویں، بنامِ علیؑ
میرے دشمن کو مرغ و ماہی دے

مجرمِ عشق ہوں، مجھے صہبا
جو سزا دے وہ بے گناہی دے

صہبا اختر



اس بے طلوع شب میں، کیا طالع آزمائی
خورشید لاکھ ابھرے، لیکن سحر نہ آئی

کب تک فریبِ جادہ، کب تک غبارِ منزل
اے دردِ ناتمامی، اے رنجِ نارسائی

ہر گل کا چاک سینہ، گلزار آفرینا
اب کے عجب خزینہ، تیری بہار لائی

ساحل پہ خیمہ کش ہیں، آسودگانِ ساحل
طوفان کر رہے ہیں کشتی کی ناخدائی

ہر آہ کہہ رہی ہے، اک درد کا فسانہ
ہر اشک لکھ رہا ہے اک قصۂ جدائی

صہبا کہاں ہے یارو، کوئی اسے پکارو
ویران ہو رہا ہے، کنجِ غزل سرائی



میں بہاروں کے رُوپ میں گُم تھا
جب تجھے مجھ سے کچھ تبسّم تھا

تھا وہ اپنے ہی خوف کا محکوم
جس کی آواز میں تحکّم تھا

وصل تیرا رہا نہ راز کہ صبح
در و دیوار پر تبسّم تھا

میرے شعروں میں ڈھل سکا نہ کبھی
جو مِری روح میں ترنّم تھا

میں پیمبر نہ تھا مگر مجھ سے
ماہ و خورشید کو تکلّم تھا

سب بہانے تھے کوچہ گردی کے
کون تیری تلاش میں گُم تھا

میرا ساحل نہ بن سکا صہبا
میری فطرت میں جو تلاطم تھا

صہبا اختر



مجھ پہ ایسا کوئی شعر نازل نہ ہو
جس کی حدت مرے خوں میں شامل نہ ہو

فکر ایسے محیطِ سخن کی کرو
جس کی امواج کا کوئی ساحل نہ ہو

آج اک بنتِ مریم ہے آغوش میں
مجھ پہ اے روحِ قدس آج نازل نہ ہو

بے محابا ملے ہجر ہو یا وصال
کوئی دیوار رستے میں حائل نہ ہو

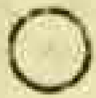
شاخ پر ہے گماں، گل سے اندیشہ ہے
یہ بھی خنجر نہ ہو، یہ بھی قاتل نہ ہو

کاروانِ جنوں دے رہا ہے صدا
جاں، ہو پیاری جسے، ہم میں شامل نہ ہو

کاش وہ وقت بھی آئے دنیا میں، جب
زر پکارے مگر کوئی سائل نہ ہو

میری تنہائی کو میرا مقسوم کر
میری منزل، زمانے کی منزل نہ ہو

حکم دے جانِ صہبا نئی فکر کا
یہ غزل بھی اگر تیرے قابل نہ ہو



اصنام مال و زر کی پرستش سکھا گئی
دنیا مجھے بھی عابدِ دنیا بنا گئی

وہ سنگدل، مزارِ وفا پر بنامِ عشق
آئی تو میرے نام کا پتھر لگا گئی

میرے لیے بزارِ تبسم تھی وہ بہار
جو آنسوؤں کی راہ پہ مجھ کو لگا گئی

گوہر فروش شبنمی پلکوں کی چھاؤں میں
کیا آگ تھی جو روح کے اندر سما گئی

میرے سخن کی داد بھی اس کو ہی دیجیے
وہ جس کی آرزو مجھے شاعر بنا گئی

صہبا وہ روشنی جو بہت مہرباں تھی
کیوں میرے راستے میں اندھیرے بچھا گئی

صہبا اختر



اس طریقے کو عداوت میں روا رکھتا ہوں میں
اپنے دشمن کے لیے حرفِ دعا رکھتا ہوں میں

میں فقیری میں بھی اہلِ زر سے بہتر ہی رہا
کچھ نہیں رکھتا، مگر نامِ خدا رکھتا ہوں میں

میں کبھی تنہا نہیں ہوتا سرِ کنجِ چمن
وہ نہ ہوں تو ہاتھ میں دستِ صبا رکھتا ہوں میں

میں نے کم کھویا، سوا پایا ہے، کارِ عشق میں
دل جہاں تھا، اب وہاں اِک دلربا رکھتا ہوں میں

جانے کب آجائے وہ صہبا مثالِ فصلِ گل
اس لیے ویرانۂ دل کو سجا رکھتا ہوں میں



مجھے ملا وہ بہاروں کی سرخوشی کے ساتھ
گل و سمن سے زیادہ شگفتگی کے ساتھ

وہ رات چشمۂ ظلمات پر گذاری تھی
وہ جب طلوع ہوا مجھ پہ روشنی کے ساتھ

اگر شعور نہ ہو تو بہشت ہے دنیا
بڑے عذاب میں گذری ہے آگہی کے ساتھ

یہ اتفاق ہیں سب راہ کی مسافت کے
چلے کسی کے لیے، جا ملے کسی کے ساتھ

بُرا نہیں ہے مگر حسبِ تشنگی بھی کہاں
سلوکِ شہد لباں، میری تشنگی کے ساتھ

فضا میں رقص ہے صہبا حسیں پرندوں کا
مجھے بھی حسرتِ پرواز ہے کسی کے ساتھ

صہبا اختر



دُہراؤں کیا فسانۂ خواب و خیال کو
گذرے کئی فراق، کسی کے وصال کو

رشتہ بجز گمان نہ تھا، زندگی سے کچھ
میں نے فقط قیاس کیا ماہ و سال کو

شاید وہ سنگدل ہو کبھی مائلِ کرم
صورت نہ دے یقین کی اِس احتمال کو

ترغیب کا ہے وسعتِ امکاں یہ انحصار
رم خوردگی سکھاتا ہے صحرا، غزال کو

صہبا سدا بہار رہے یہ گلستانِ فن
ممکن نہیں زوال، سخن کے کمال کو



یوں بھی ہوا اک عرصے تک اک شعر نہ مجھ سے تمام ہوا
اور کبھی اک رات میں اک دیوان مجھے الہام ہوا

اپنی تنہائی کا شکوہ، مجھ کو گروہِ غیر سے کیوں
یہ تو ہوس کا دَور ہے پیارے، جس کو جس سے کام ہوا

میں اپنے خالق سے خوش ہوں، جہل ملا، اس قسمت پر
دولتِ اہلِ جہل نے پائی، علم مجھے انعام ہوا

کیسی قناعت، کیسی عبادت، حرص و ہوس کے عالم میں
دل جو پہلے گھر تھا خدا کا، اب شہرِ اصنام ہوا

جو پتھر کو موم بنا دے، دل میں اب وہ آنچ کہاں
جس شعلے پر ناز بہت تھا، وہ شعلہ بھی خام ہوا

جن کو ہے اسلام کا دعویٰ، صہبا ان کا حال بھی دیکھ
میں تو خیر بتوں کا ہو کر، محرومِ اسلام ہوا

حزیں لدھیانوی



حزیں تم اپنی کبھی وضع بھی سنوارو گے ؟
قمیص خود ہی گرے گی تو پھر اُتارو گے ؟

خلا نوردو ! بہت ذرّے انتظار میں ہیں
جہاز کونسا پاتال میں اُتارو گے ؟

اُتر کے نیچے کبھی میرے ساتھ بھی تو چلو
بلند کھڑکیوں سے کب تلک پکارو گے

وہ وقت آئے گا، اے میرے اپنے سنگِ زنو
مہکتے پھُولوں کے گجرے بھی مجھ پہ وارو گے

نگل رہی ہے اگر تیرگی — تو کیا تم لوگ
سحر کے وقت چراغوں کی لَو اُبھارو گے ؟

تمھیں قلم کو لہو میں ڈبونا آتا ہے
حزیں ضرور تمھی شعر کو نکھارو گے

حزیں لدھیانوی



مواد کرکے فراہم چمکتی سڑکوں سے
سجا رہا ہوں غزل کو نئے خیالوں سے

چھپی ہے ان میں نہ جانے کہاں کی چیخ پکار
بلند ہوتے ہیں نغمے جو روز محلوں سے

نظر نہ آئی کبھی پھر وہ گاؤں کی گوری
اگرچہ مل گئے دیہات آ کے شہروں سے

گزار دیتے ہیں عمریں وہ گھپ اندھیروں میں
لٹک رہے ہیں جو بجلی کے اونچے کھمبوں سے

سمندر! اب تو انھیں اور بے قرار نہ کر
گزر کے آئی ہیں لہریں ہزار نہروں سے

طلوع ہوگا ابھی کوئی آفتاب ضرور
دھواں اُٹھا ہے سرِ شام پھر چراغوں سے

حزیںؔ یہ شعلۂ تاباں کبھی نہیں بجھتا
میں کیوں حیات کو تشبیہ دوں حبابوں سے

حزیں لدھیانوی



کیا گُل کھلائے، دیکھئے، تپتی ہوئی ہوا
مسموم ہو گئی ہے مہکتی ہوئی ہوا

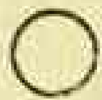
یہ چیتھڑوں میں پھول، یہ سرگرم کار لوگ
یہ دوپہر کی دھوپ، یہ جلتی ہوئی ہوا

زندہ وہی رہے گا جسے ہو شعورِ زیست
کہتی ہے روز رنگ بدلتی ہوئی ہوا

بادل گھرے تو اور بھی شعلہ فشاں ہوئی
پھولوں کی پتیوں کو جُھلستی ہوئی ہوا

طوفانِ گرد و باد سے سنولا نہ جائیں لوگ
پھر رُک گئی ہے شہر میں چلتی ہوئی ہوا

کملا نہ جائے گلشنِ شام و سحر حزیںؔ
مُدّت سے چل رہی ہے سُلگتی ہوئی ہوا



عمر بھر بہتے ہیں غم کے تند رو دھاروں کے ساتھ
جانے کیوں ہوتے ہیں اتنے ظلم فنکاروں کے ساتھ

ابر کی صورت برستے ہیں بلند و پست پر
ہم نہیں آنسو بہاتے، لگ کے دیواروں کے ساتھ

ذہن کے پردے پہ رقصندہ ہیں پیاسی صورتیں
ہم نشے میں کیسے بہہ سکتے ہیں میخواروں کے ساتھ

روز خونِ آرزو ہوتا ہے، پھر بھی پیار ہے،
ہم کو اے ہستی! ترے دلچسپ بازاروں کے ساتھ

ہم سفر ہے خاک و باد و آتش و آب اے حزیںؔ
کاش نبھ جائے ہماری اب انہی چاروں کے ساتھ

حزیں لدھیانوی



پھر فضا دھند لا گئی ، آثار ہیں طوفان کے
کانپتے ہیں پھول کمرے میں مرے گلدان کے

چل رہے ہیں دل میں نخلستان کا ارماں لیے
ہم مسافر زندگی کے تپتے ریگستان کے

سیلِ غم رکھتا ہے یوں میرے ارادوں کو جواں
جس طرح سیلاب میں پلتے ہیں پودے دھان کے

توڑ دے گا اک نہ اک دن یہ طلسم اوہام کا
صاف دیتے ہیں پتہ تیور نئے انسان کے

دوستو! جس دم اُتر جاتا ہے گندم کا خُمار
ذہن کی شاخوں سے اُڑ جاتے ہیں پنچھی دھیان کے



سرتا بہ قدم خون کا جب غازہ لگا ہے
تب زخم کی گہرائی کا اندازہ لگا ہے

یہ رات کا جنگل ، یہ خموشی ، یہ اندھیرا
پتہ بھی جو کھڑکا ہے تو آوازہ لگا ہے

معلوم نہیں میرا کھلا دشت کہاں ہے
صحرا کا خلا بھی مجھے دروازہ لگا ہے

احسان یہ کچھ کم تو نہیں گلبدنوں کا
جو زخم ہے سینے پہ ، گلِ تازہ لگا ہے

یکجا ہوئے یادوں کے اُڑتے ہوئے پیکر
پھر منتشر اپنا مجھے شیرازہ لگا ہے

حزیں لدھیانوی



مرے ریاض کا آخر اثر دکھائی دیا
چھپا تھا دل میں جو نغمہ، مجھے سنائی دیا

جہاں شناس و خود آگاہ کر دیا مجھ کو
مرے شعور نے وہ دردِ آشنائی دیا

جو پالیا تجھے، میں خود کو ڈھونڈنے نکلا
تمہارے قرب نے بھی زخمِ نارسائی دیا

ابھی نہ توڑ تھکے بازوؤں کی پتواریں
وہ دور اُفق پہ کوئی بادباں دکھائی دیا

زمانے بیت گئے دشت دشت پھرنے کے
نئے شعور نے ہم کو سفر خلائی دیا



حیران سارا شہر تھا جس کی اُڑان پر
پنچھی وہ پھڑپھڑا کے گرا سائبان پر

شاید اسی سے ذہن کا جنگل مہک اٹھے
لفظوں کے گل کھلایئے شاخِ زبان پر

کس دل کی راکھ جزوِ رگِ سنگ ہو گئی
سورج مکھی کا پھول کھلا ہے چٹان پر

اک دن اسے زمیں کی کشش کھینچ لائے گی
کب تک رہے گا تیرا خیال آسمان پر

آواز کی مہک نہ کبھی قید ہو سکی
پہرے لگے ہزار گلوں کی زبان پر

حنیف فوق



مری حیات اگر مژدۂ سحر بھی نہیں — ستم یہ ہے کہ ترے غم کی رہگذر بھی نہیں

چمن میں ہوں میں پریشاں، مثلِ موجِ نسیم — چٹک کے غنچے کہیں گے "ہمیں خبر بھی نہیں"

نشاط و کیف کے لمحو، ذرا ٹھہر جاؤ — بہار راہ میں ہے، دور کا سفر بھی نہیں

میں تیری جنبشِ مژگاں سے کانپ جاتا ہوں — اگرچہ دل کو غمِ دو جہاں سے ڈر بھی نہیں

فریبِ وعدہ پہ ہم تا ابد جئیں لیکن — ہزار حیف یہ امکان عمر بھر بھی نہیں

کوئی تو ہمدمِ دیرینہ دے صدا اس دم — وہ اجنبی ہوں کہ مانوس اپنا گھر بھی نہیں

نسیم سر بہ گریباں، صبا ہے سرگرداں — وہ وقت ہے، کوئی خوشبو کا راہبر بھی نہیں

زمیں پہ ہی کہیں نور کا سراغ لگاؤ — ستارے ڈوب گئے، چرخ پر قمر بھی نہیں

کٹی ہے آنکھوں ہی آنکھوں میں شامِ ہجر مگر — شبِ درازِ الم اتنی مختصر بھی نہیں

کسی کی نرم نگاہی کی آنچ ہے ورنہ — یہ دل پذیرِ نوا، جلوۂ ہنر بھی نہیں

ہوائے شام سے کتنے چراغ جل اُٹھے — دیارِ دل میں تمنا کا اک شرر بھی نہیں

نہ جانے کیوں درِ زنداں بھی کانپ اُٹھتا ہے
صدائے فوق اگر ایسی کارگر بھی نہیں

حنیف فوقؔ



آہ و فریاد سے معمور چمن ہے کہ جو تھا
مائلِ جور وہی چرخِ کہن ہے کہ جو تھا

حسن پابندیٔ آدابِ جفا پر مجبور
عشق آوارہ سرِ کوہ و دمن ہے کہ جو تھا

لاکھ بدلا سہی منصور کا آئینِ حیات
آج بھی سلسلۂ دار و رسن ہے کہ جو تھا

ڈر کے چونک اٹھتی ہیں خوابوں سے نویلی کلیاں
خندۂ گل میں وہی سازِ محن ہے کہ جو تھا

شبنم افشانیٔ گلشن ہے دمِ صبح ہنوز
لالہ و گل پہ وہ اشکوں کا کفن ہے کہ جو تھا

دلِ بے تاب پہ ماضی کی نوازش ہے وہی
شبِ مہتاب پہ یادوں کا گہن ہے کہ جو تھا

ہاتھ رکھ دیتا ہے شانے پہ تصور ان کا
غم کی راتوں میں کوئی جلوہ فگن ہے کہ جو تھا

انھیں کیا فکر کہ پوچھیں دلِ بیمار کا حال
بے نیازانہ وہ اندازِ سخن ہے کہ جو تھا

لاکھ بدلا سہی اے فوقؔ زمانہ لیکن
تیرے انداز میں بے ساختہ پن ہے کہ جو تھا

غزل ۔۔۔ ۱۰۱۶

متروکہ

یہ فضائے نیلگوں، یہ بال و پر کافی نہیں
ماہ و انجم تک مرا ذوقِ سفر کافی نہیں

ایک ساعت اک صدی ہے، اک نظر آفاق گیر
اب نظامِ گردشِ شام و سحر کافی نہیں

پھر جنوں کو وسعتِ افلاک ہے کوہِ ندا
اے دلِ دیوانہ، دشتِ پرخطر کافی نہیں

یہ ہوائے نم، یہ سینے میں سلگتی آگ سی
آہ یہ عمرِ رواں کی رہگزر کافی نہیں

پھر مشیت سے الجھتی ہے مری دیوانگی
نالۂ شبگیر، اشکوں کے گہر کافی نہیں

آرزوئے بے کراں ہے اور جسمِ ناتواں
کیا رگِ جاں کے لیے یہ نیشتر کافی نہیں

خنکیٔ شبنم سے غنچہ کو نہیں تسکینِ قلب
زخمِ گل کو اب نسیمِ چارہ گر کافی نہیں

شیشۂ شب میں بھری ہے تو نے جو صہبائے کیف
قطرہ قطرہ بھی پیوں تو رات بھر کافی نہیں

دلِ ناداں پہ شکایت کا گماں کیا ہو گا
چند اشکوں سے جفاؤں کا بیاں کیا ہو گا

شب کے بھٹکے ہوئے راہی کو خبر دے کوئی
صبحِ رنگیں کی بہاروں کا نشاں کیا ہو گا

نالۂ مرغِ گرفتار سے بیزاری کیا
گوشِ صیاد پہ اب یہ بھی گراں کیا ہو گا

سچ کے کہنے سے اگر جی کا زیاں ہوتا ہے
سچ بہر حال ہے سچ، مُہرِ دہاں کیا ہو گا

چپ ہیں ہم تو سرِ دار پکارے گا لہو
چند ہی روز میں آئینِ جہاں کیا ہو گا

ذرہ ذرہ پہ کوئی پھونکے گا افسونِ بہار
مانعِ جوششِ نمو جبرِ خزاں کیا ہو گا

چشمِ نرگس کو ہوس ہے کہ چمن میں دیکھے
آتشِ گل کے بھڑکنے کا سماں کیا ہو گا

اب تو ہم شہرِ نگاراں سے چلے آئے ہیں
باعثِ وحشتِ دل حسنِ بتاں کیا ہو گا

شوق

رات ڈھلتے ہی سفیرانِ قمر آتے ہیں
دل کے آئینے میں سو عکس اُتر آتے ہیں

سیلِ مہتاب سے جب نقش اُبھر آتے ہیں
اوس گرتی ہے تو پیغامِ سحر آتے ہیں

ساعتِ دید کا گلزار ہو یا سایۂ دار
ایسے کتنے ہی مقاماتِ سفر آتے ہیں

جاگتی آنکھوں نے جن لمحوں کو بکھرے دیکھا
وہی لمحے مرے خوابوں میں نکھر آتے ہیں

وقت کی لاش پہ رونے کو جگر ہے کس کا
کس جنازے کو لیے اہلِ نظر آتے ہیں

رات کی بات ہی کیا، رات گئی بات گئی
رات کے خواب کہیں دن کو نظر آتے ہیں

وادیِ غرب سے مبہم ہے اندھیروں کا نزول
مطلعِ شرق سے پیغامِ سحر آتے ہیں

رات کے در پہ یہ دستک، یہ مسلسل دستک
آمدِ صبحِ فروزاں کا پتا دیتی ہے

پھونک ڈالے گی یہ اک روز قبائے صیاد
آتشِ گل کو صبا اور ہوا دیتی ہے

تیرگی زادوں سے کب نور کا سیلاب تھمے
فیصلہ وقت کا، تاریخ سنا دیتی ہے

آنچ آتی ہے ستاروں سے جو کچھ پچھلے پہر
خوابِ شیریں سے نگاروں کو جگا دیتی ہے

کتنی نادیدہ بہاروں کی تمنائے جواں
دامنِ جاں میں مرے، آگ لگا دیتی ہے

سینۂ سنگ میں بیتاب ہے وہ کاوشِ شوق
جو حقیقت کو بھی خوابوں کی ضیا دیتی ہے

شمعِ محراب و دف بن کے حیات، اُس سوا
دلِ فنکار کی کاہری، کچھ تو صلا دیتی ہے

کیا نظر کی ہشیاری، خود اسیرِ مستی ہے
جو نگاہ اٹھتی ہے، محوِ خود پرستی ہے

بادلوں کو تکتا ہوں جانے کتنی مدت سے
ایک بوند پانی کو یہ زباں ترستی ہے

اک جنم کے پیاسے بھی سیر ہوں تو ہم جانیں
یوں تو رحمتِ یزداں چارسُو برستی ہے

رات غم کی آئی ہے، ہوشیار دل والو
دیکھنا ہے یہ ناگن آج کس کو ڈستی ہے

شاید آج آئینہ دل کا ٹوٹ ہی جائے
پھر نظر کی ویرانی، زندگی پہ ہنستی ہے

میں نے اپنی پلکوں پر غم کدے سجائے ہیں
آرزو کے ماتم میں سوگوار بستی ہے

اب بتابشِ اختر تیرگی ہے افزوں تر
روشنی بھی بک جائے، یہ کمال پستی ہے

چشمِ پرنم ابھی مرہونِ اثر ہو نہ سکی
زندگی خاک نشینوں کی بسر ہو نہ سکی

میکدے کی وہی مانوس فضا اور دلِ زار
ایک بھی رات باندازِ دگر ہو نہ سکی

غمِ جاناں غمِ دوراں کی گذرگاہوں سے
گذرے کچھ ایسے کہ خود اپنی خبر ہو نہ سکی

دھندلے دھندلے نظر آتے تو ہیں قدموں کے نشاں
گرچہ پُرنور ابھی راہگذر ہو نہ سکی

زندگی جام بکف آئی بھی محفل میں مگر
شب کے متوالوں کو توفیقِ نظر ہو نہ سکی

کیسے تابندہ ستاروں کا لہو جلتا ہے
شبِ تاریک جو عنوانِ سحر ہو نہ سکی

فضاؤں میں کچھ ایسی کھلبلی تھی
کلیجہ تھام کر وحشت چلی تھی
کبھی اس کی جوانی منچلی تھی
کبھی دنیا بھی سانچے میں ڈھلی تھی
وہی آئینہ در آئینہ الفت
کبھی عکسِ خفی، نقشِ جلی تھی
نہ چھوڑا سرد جھونکوں نے وفا کو
جو شاخِ درد کی تنہا کلی تھی
بگاڑا کس نے ہے طبعِ جہاں کو
کبھی یہ رند مشرب بھی ولی تھی
محیطِ ہنگامۂ آفاق پر ہے
صدائے درد جو دل میں پلی تھی
غنیمت جانیے پھر نیم روشن
چراغِ راہ سے اپنی گلی تھی
برا ہو آگہی کا، زیست ورنہ
گذر جاتی، بری تھی یا بھلی تھی
ہمیں نے ٹوٹ کر چاہا زندگی کو
ہمیں سے کشتِ غم پھولی پھلی تھی

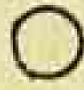
نسیم صبحِ بہار آئے، دلِ حزیں کو قرار آئے
کلی کلی لے کے منہ اندھیرے صباحتِ بوئے یار آئے

اداس راتوں کی تیرگی میں نہ کوئی تارا، نہ کوئی جگنو
کسی کا نقشِ قدم ہی چمکے تو نور کا اعتبار آئے

یہ شعلہ سامانیِ تکلم، یہ آئینہ خانۂ تبسم
جگر سے جیسے دھواں سا اٹھے نظر کو جیسے خمار آئے

اسی کی خاطر خزاں زدہ دل نے جامۂ چاک اپنا بدلا
کہ جشنِ جمہورِ انقلابِ چمن کا آئینہ دار آئے

عرش صدیقی



کیا ساتھ ترا دوں کہ مَیں اک موجِ ہوا ہوں
بس ایک نفس عرضِ تمنا کو رُکا ہوں
رہتا ہوں بگولوں کی طرح رقص میں بے تاب
اے ہم نفسو! میں دلِ صحرا سے اُٹھا ہوں
قطرہ ہوں مَیں دریا میں، مجھے کچھ نہیں معلوم
ہمراہ مرے کون ہے، میں کس سے جدا ہوں
اے محفلِ ہنگامہ و آواز کے شیدا
سُن غور سے مَیں بحرِ خموشی کی صدا ہوں
اک لمحہ ٹھہر، مجھ کو بھی ہمراہ لیے چل
اے لیلیٰ ہستی! ترا نقشِ کفِ پا ہوں
پھیلا نہ مجھے وسعتِ آفاق میں، رُک جا
اے تند ہوا میں غمِ ہستی کی نوا ہوں
ناطاقتیٔ جاں کی شکایت کا نہیں ہوش
میں لمحہ ہوں اور وقت کے دریا میں گرا ہوں
اے ضبطِ نظر! اے مرے ایماں کی گواہی
تُو ہی تو سمجھتا ہے کہ میں کون ہوں، کیا ہوں
چاہے بھی تو وہ مجھ سے جُدا ہو نہیں سکتا
وہ ہے مری زنجیر تو میں اس کی صدا ہوں
بے جاں ہوں پہ گُل ہوں، مجھے خاک پہ مت پھینک
اے بادِ صبا! میں ترے جھونکے کا پلا ہوں
میں عرش نشیں بھی ہوں، ترے گھر کا مکیں بھی
میں نکہتِ ایماں ہوں، میں بوئے وفا ہوں

فنون — ۱۰۲۱

عرش صدیقی



حیراں ہوں کہ یہ کون سا دستورِ وفا ہے
تو شاملِ رگِ جاں ہے تو کیوں مجھ سے جدا ہے

تو اہلِ نظر ہے تو نہیں تجھ کو خبر کیوں
پہلو میں ترے کوئی زمانے سے کھڑا ہے

لکھا ہے مرا نام سمندر پہ ہوا نے
اور دونوں کی فطرت میں سکوں ہے، نہ وفا ہے

میں شہر و بیاباں میں تجھے ڈھونڈ چکا ہوں
بے درد تو کس جلوۂ پنہاں میں چھپا ہے

ہم رکھتے ہیں دعویٰ کہ ہے قابو ہمیں دل پر
تو سامنے آجائے تو یہ بات جدا ہے

میں دوزخِ جاں میں بھی رہا محوِ تگ و تاز
اے خالقِ افلاک! تجھے تو یہ پتا ہے

غم ہے کہ مسلسل اسی شدت سے ہے جاری
یوں کہنے کو اس عمر کا ہر لمحہ نیا ہے

ہر سمت ہوا تیز، فضا تا بہ افق تنگ
دل ذرۂ صحرا ہے، بگولوں میں گھرا ہے

کیوں جاگے ہوئے شہر میں تنہا ہے ہر اک شخص
یہ روشنی کیسی ہے کہ سایہ بھی جدا ہے

اے داورِ محشر تجھے خود تیری قسم ہے
انصاف سے کہہ، دل کبھی تیرا بھی پھٹا ہے

محسوس کیا ہے کبھی تو نے بھی وہ خنجر
غم بن کے جو ہر شخص کے سینے میں گڑا ہے

ٹھہرائے اسے عرش کوئی کیسے جفا کیش
جو مجھ سے الگ رہ کے بھی ہمراہ چلا ہے



بس ایک ہی کیفیتِ دل صبح و مسا ہے
ہر لمحہ مری عمر کا زنجیر بہ پا ہے

میں شہر کو کہتا ہوں بیاباں کہ یہاں بھی
سایہ تری دیوار کا کب سر پہ پڑا ہے

ہے وقت کہ کہتا ہے رکوں گا نہ میں اک پل
تو ہے کہ ابھی بات مری تول رہا ہے

میں بزم سے خاکسترِ دل لے کے چلا ہوں
اور سامنے تنہائی کے صحرا کی ہوا ہے

آواز کا تیشہ ہے نہ خاموش تکلّم
"نالا جو زباں پر تھا وہ اب دل پہ پڑا ہے"

میں ساتھ لیے پھرتا ہوں سامانِ ہلاکت
رگ رگ میں مری زہرِ ریا دوڑ رہا ہے

کیا کیا ہیں تمنائیں ملِ خاک بسر ہیں
یہ قافلہ ویرانے میں کیوں ٹھہرا ہوا ہے

عرش صدیقی

○

بیٹھا ہوں وقفِ ماتمِ ہستی، مٹا ہوا
نہ ہجر دفا ہے گھر کی فضا میں گھُلا ہوا

خود اُس کے پاس جاؤں نہ اسکو بلاؤں پاس
پایا ہے وہ مزاج کہ جینا بلا ہوا

اس پر غلط ہے عشق میں الزامِ دشمنی
قاتل ہے میرے حجلۂ جاں میں چھپا ہوا

ہیں جسم و جاں ہم پہ مگر کس کو ہے خبر
کس کس جگہ سے دامنِ دل ہے سلا ہوا

ہے راہوارِ شوق پہ آسیبِ بے دلی
رکھا ہے کب سے سامنے ساغر بھرا ہوا

حاصل ہے جس کو عرش فضاؤں میں اختیار
وہ دل کے ساتھ کھیل رہا ہے تو کیا ہوا

○

آنکھوں میں کہیں اس کے بھی طوفاں تو نہیں تھا
وہ مجھ سے جدا ہو کے پشیماں تو نہیں تھا

کیوں مجھ سے نہ کی اس نے سرِ بزم کوئی بات
میں سنگِ ملامت سے گریزاں تو نہیں تھا

ہاں حرفِ تسلی کے لیے تھا میں پریشاں
پہلو میں مرے دل تھا، گلستاں تو نہیں تھا

کیوں راستہ دیکھا کیا اس کا میں سرِ شام
بے درد کا مجھ سے کوئی پیماں تو نہیں تھا

جلوہ تھا ترا آگ میں ہر لحظہ ہویدا!
ورنہ مجھے جل مرنے کا ارماں تو نہیں تھا

تھا دل بھی کبھی شہرِ تمنّا سے مماثل
یہ قریہ ہمیشہ سے بیاباں تو نہیں تھا

طوفانِ الم! کیوں مجھے ساحل پہ اتارا
میں شورِ تلاطم سے ہراساں تو نہیں تھا

رکھا تھا چھپا کر جسے الفاظ میں میں نے
پردے میں سخن کے بھی وہ عریاں تو نہیں تھا

کہتے ہیں کہ ہے عرش، نگوں پائے بتاں پہ
ایسا وہ کوئی صاحبِ ایماں تو نہیں تھا

عرش صدیقی

○

غم کی گرمی سے دل پگھلتے رہے
تجربے آنسوؤں میں ڈھلتے رہے

ایک لمحے کو تم ملے تھے مگر!
عمر بھر دل کو ہم مسلتے رہے

صبح کے ڈر سے آنکھ لگ نہ سکی
رات بھر کروٹیں بدلتے رہے

قافلے میں ملے سبھی تنہا
گرچہ سب ساتھ ساتھ چلتے رہے

زندگی سرخوشی، جنون و وفا
موت کے نام کیوں بدلتے رہے

اپنا عزمِ سفر نہ تھا اپنا
حکم ملتا رہا تو چلتے رہے

ہو گئے جن پہ کارواں پامال!
سب انہی راستوں پہ چلتے رہے

○

میں عالمِ امکاں میں جسے ڈھونڈ رہا ہوں
وہ پوچھ رہا ہے کہ کسے ڈھونڈ رہا ہوں

ماضی کے بیاباں میں جو گم ہو گیا مجھ سے
میں حال کے جنگل میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں

گو پیشِ نظر ایک تماشہ ہے ولیکن
اے وجہِ تماشہ، میں تجھے ڈھونڈ رہا ہوں

تو ہاتھ جو آتا نہیں اس کا ہے سبب کیا
شاید میں تجھے تجھ سے پرے ڈھونڈ رہا ہوں

چھینا تھا جسے صبحِ گریزاں کی چمک نے
اس لمحے کو اب شام ڈھلے ڈھونڈ رہا ہوں

ہر اک سے جو کہتا ہوں کہیں عرش کو ڈھونڈو
یوں اپنے بہانے میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں

نظیر صدّیقی



خود فریبی نے بے شک سہارا دیا اور طبیعت بظاہر بہلتی رہی
ایک کانٹا سا دل میں کھٹکتا رہا، ایک حسرت سی دل کو مسلتی رہی

اپنے غم کو ہمیشہ بھلایا کئے، کثرتِ کار میں، سیرِ بازار میں
الغرض کسمپرسی کے عالم میں بھی زندہ رہنے کی صورت نکلتی رہی

عقل کی برتری دل نے مانی تو کیا، اس نے چاہا کبھی عقل کا مشورہ؟
دل کو جس طرح چلنا تھا چلتا رہا، عقل ہر گام پر ہاتھ ملتی رہی

بزمِ ہستی میں آنے کو آئے سبھی، اہلِ دل، اہلِ دیں، شاعر و فلسفی
آدمی کو جو کرنا تھا کرتا رہا اور دنیا بدستور چلتی رہی

اِس کی صورت جو چاہو بدل جائیگی، جیسے سانچے میں ڈھالو گے ڈھل جائیگی
کوئی سانچہ یہاں حرفِ آخر نہیں، زندگی تو ہمیشہ بدلتی رہی

آدمی ساتھ رہنے پہ مجبور ہے، پھر بھی اک دوسرے سے بہت دور ہے
دشمنوں سے تو ہوتی بھلا صلح کیا، جبکہ خود دوستوں سے ٹھنی چلتی رہی

نعیم صدیقی



کس قوتِ بے درد کا اظہار ہے دُنیا — ہر دل کو گلا ہے کہ دل آزار ہے دُنیا

لوگ اِس کو کہا کرتے ہیں اچھا بھی بُرا بھی — کیا خوب کہ دونوں کی سزاوار ہے دُنیا

ملتا ہی نہیں کوئی دلِ زار کا پُرساں — میرے لیے اک محفلِ اغیار ہے دُنیا

ہر سنگ میں دُنیا کو نظر آتا ہے اک بُت — اور ایسے ہر اک بُت کی پرستار ہے دُنیا

یہ حشر، یہ ہنگامہ نہیں آج پہ موقوف — سچ یہ ہے کہ صدیوں ہی سے بیمار ہے دُنیا

نیکی کوئی کرتا ہو تو کروٹ نہیں لیتی — نیت ہو گناہوں کی تو بیدار ہے دُنیا

کس طرح کریں اس کی محبت پہ بھروسا — اے دوست قیامت کی اداکار ہے دُنیا

اس طرح بھی دُنیا کا گلہ کرتے ہیں گویا — معصوم ہے انسان، گنہگار ہے دُنیا

دنیا میں بُرا وقت تو آتا ہے سبھی پر — ق — اب خود ہی بُرے وقت سے دوچار ہے دُنیا

رہ رہ کے برستی ہیں عداوت کی گھٹائیں — لگتا ہے کہ گرتی ہوئی دیوار ہے دُنیا

کیا کہیے اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا — ق — اک وادیٔ پُرخار کہ گلزار ہے دُنیا

جنت بھی اسی میں ہے جہنّم بھی اسی میں — گہوارۂ ہر عشرت و آزار ہے دُنیا

ڈوبے ہوئے تاروں کا یہ ماتم نہیں کرتی
چڑھتے ہوئے سورج کی پرستار ہے دُنیا

نظیر صدیقی



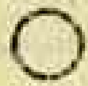
لذتِ خواب لے گئے، حسنِ خیال لے گئے
ایک جھلک میں اتنا کچھ اہلِ جمال لے گئے

آئے تو دل تھا باغ باغ اور گئے تو داغ داغ
کتنی خوشی وہ لائے تھے، کتنا ملال لے گئے

دیدہ وروں کی راہ پر کون ہوا ہے گامزن
وہ مگر اپنی ذات سے ایک مثال لے گئے

اس سے زیادہ راہزن کرتے بھی مجھ پہ کیا ستم
مال و منال لے گئے، فکرِ مآل لے گئے

اہلِ کمال کو نظیرؔ اہلِ جہاں نے کیا دیا
اہلِ جہاں کو کیا نہیں اہلِ کمال دے گئے



آنکھوں میں بے رُخی نہیں، دل میں کشیدگی نہیں
پھر بھی جو دیکھیے تو اب پہلی سی دوستی نہیں

رسمِ وفا کا التزام، عہدِ وفا کا احترام
شیوۂ عاشقی تو ہے، فطرتِ عاشقی نہیں

ہم سے شکایتیں بجا، ہم کو بھی ہے مگر گلہ
پہلے سے ہم اگر نہیں، پہلے سے آپ بھی نہیں

بزمِ طرب میں دوستو! دیکھ رہا ہوں میں یہی
رقص میں آدمی تو ہیں، رقص میں زندگی نہیں

منزل و راہ میں کبھی اتنا تو فاصلہ نہ تھا
راہبرو! خطا معاف، یہ کوئی رہبری نہیں

علم و ہنر کے فیض سے، علم و ہنر کے باوجود
محفلِ زیست میں نظیرؔ رنگ ہے روشنی نہیں

نظیر صدیقی



ہوس کی آگ بجھی، دل کی تشنگی ہے وہی
سکونِ جاں سے تہی میری زندگی ہے وہی

دلِ فسردہ میں احساس ہی نہیں باقی
جہانِ کہنہ میں ورنہ شگفتگی ہے وہی

جمال اور جنوں ہو چکے زمانہ شناس
نیاز و ناز میں کہنے کو سادگی ہے وہی

کوئی قصور تو ثابت نہ ہو سکا لیکن
جو بدگماں تھے انہیں مجھ سے برہمی ہے وہی

وہ ہر قدم کے اثر سے ہے باخبر، پھر بھی
رہِ حیات میں انساں کی کج روی ہے وہی



ہر شخص بن گیا ہے خدا تیرے شہر میں
کس کس کے در پہ مانگیں دعا تیرے شہر میں

مجرم ہیں سارے اہلِ وفا تیرے شہر میں
کیا خوب ہے وفا کا صلہ تیرے شہر میں

اہلِ ہوس کے نام سے ہیں روشناس خلق
ملتی ہے جن کو دادِ وفا تیرے شہر میں

رکھتے ہیں لوگ تہمتیں اپنے نصیب پر
کرتے ہیں یوں بھی تیرا گلہ تیرے شہر میں

اپنوں پہ اعتماد، نہ غیروں پہ اعتماد
یہ کیسی چل پڑی ہے ہوا تیرے شہر میں

ہوتا ہے کس مرض کا مداوا ترے یہاں
ملتی ہے کس مرض کی دوا تیرے شہر میں

رکھتے ہیں ہر جزا کو قیامت پہ منحصر
دیتے ہیں ہر خطا کی سزا تیرے شہر میں

نظیر صدیقی



یہ جو انساں خدا کا ہے شہکار
اس کی قسمت پہ ہے خدا کی مار

مرگِ دشمن کی آرزو ہی سہی
دل سے نکلے کسی طرح تو غبار

نام بدنام ہو چکا حضرت!
کیجیے اب تو جرم کا اقرار

اتفاقی ہے دو دلوں کا ملاپ
کون سنتا ہے ورنہ کس کی پکار

جینا مرنا ہے بن پڑے کی بات
نہ یہ آسان اور نہ وہ دشوار

کس کو پروا کہ اُن پہ کیا گزری
زندگی سے جو ہو گئے بیزار

ملتفت خود نہ ہو اگر کوئی
آہ بے سود اور فغاں بیکار

پُر سکوں نیند چاہتے ہو نظیر
ساتھ لانا تھا قسمتِ بیدار



بدل گئی ہے کچھ ایسی ہوا زمانے کی
کہ عام ہو گئی عادت نظر چرانے کی

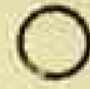
یہ بات کاش سمجھتے کبھی چمن والے
چمن لُٹا تو نہیں خیر آشیانے کی

اُنہیں خبر نہیں وہ خود بھی آزمائے گئے
جنہیں تھی فکر بہت مجھ کو آزمانے کی

کوئی کلی نہ رہی پھر بھی مسکرائے بغیر
سزا اگرچہ مقرر رہی مسکرانے کی

ہُوا یہی کہ وہ تکمیل تک پہنچ نہ سکا
بہت لطیف تھی تمہید جس فسانے کی

اِک آپ ہی پہ نہیں منحصر جنابِ نظیر
بڑے بڑوں کو ہوا لگ گئی زمانے کی



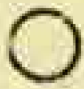
جن کے گناہ میری نظر سے نہاں نہیں
بنتے ہیں مجھ سے دل میں خفا کس قدر وہ لوگ

منزل جنہیں عزیز، نہ رہرو جنہیں عزیز
کہلاتے ہیں ہمارے یہاں راہبر وہ لوگ

انجامِ کارواں تھا اسی بات سے عیاں
منزل تھی جن کی اور بنے ہم سفر وہ لوگ

اپنا سمجھ سکیں نہ جنھیں غیر کہہ سکیں
ملتے ہیں ہر قدم پہ سرِ رہگذر وہ لوگ

تیرا کلام سن کے جو خاموش ہیں نظیرؔ
اُن کا گلہ نہ کر کہ ہیں اہلِ نظر وہ لوگ



حالات اب تو اتنے دشوار ہو گئے ہیں
ہم نیم شب میں اکثر بیدار ہو گئے ہیں

جو لوگ سادہ دل تھے، پُرکار ہو گئے ہیں
اب آدمی کے رشتے دشوار ہو گئے ہیں

یہ زندگی کی نعمت کس کو نہیں ہے پیاری
مت پُوچھ اس سے ہم کیوں بیزار ہو گئے ہیں

عسرت میں جن کا شیوہ کل تک تھا خود فروشی
دولت کے ملتے ہی وہ خوددار ہو گئے ہیں

دشمن کو ہو گیا ہے اندازہ کچھ ہمارا
دشمن سے ہم بھی لیکن ہشیار ہو گئے ہیں

ماتم نہیں مناسب اب جان سے گئے جیالوں کا
دشتِ طلب کے رستے ہموار ہو گئے ہیں

حافظ لدھیانوی



شعلۂ درد بعنوانِ تجلّی ہی سہی
لطفِ دیوانگی و ذوقِ تماشا ہی سہی

دل نہیں لذّتِ دیدار سے سرشار اگر
وحشتِ جاں ہی سہی حسرتِ جلوا ہی سہی

یہ بھی کیا کم ہے کہ امّیدِ کرم میں گزرے
رسم و آئینِ وفا دہر میں عنقا ہی سہی

کچھ تو ہے جس سے ہے قندیلِ غزل تابندہ
فکرِ امروز و پریشانیٔ فردا ہی سہی

ہجر میں کھلتے ہیں اسرارِ محبت کیا کیا
غم میں یہ معجزۂ حسنِ مسیحا ہی سہی

ان کے دامن پہ کوئی داغ نہ آنے پائے
میں ہر اک رنگ، ہر اک حال میں رسوا ہی سہی

پھر بھی ہے وجہِ قرارِ دلِ مضطر حافظ
وہ عدو دین کا، دشمن مری جاں کا ہی سہی

حافظ لدھیانوی



ہے وجہِ سکونِ دلِ آشفتہ نوا بھی
وہ آنکھ کہ ہے فتنۂ صد ہوشربا بھی

ہے کارِ جنوں اہلِ جنوں کے لیے آساں
یہ کام کبھی اہلِ فراست سے ہُوا بھی

تسکینِ دل و جاں ہے اگر وہ رُخِ زیبا
اس قامتِ زیبا میں ہے اک حشر چھپا بھی

جو سامنے آئے تو مری سمت نہ دیکھے
دیتا ہے شبِ ہجر وہی مجھ کو صدا بھی

اترے جو وہ سینے میں تو الہام کی صورت
ٹھہرے تو لرزنے لگے شبنم کی ردا بھی

اُٹھے تو قیامت بھی قدم چوم کے گزرے
القصہ وہ انداز ہے آفت بھی بلا بھی

حافظ مرے سینے میں فروزاں ہے ابھی تک
وہ درد سکھاتا ہے جو جینے کی ادا بھی



ہر شعر غزل کا کہہ رہا ہے
تجھ کو بھی بچھڑ کے دکھ ہوا ہے

ہے شعلۂ جاں میں یاد تیری
کیا آگ میں پھول کھل رہا ہے

خورشیدِ سحر طلوع ہو کر
شبنم کا مزاج پوچھتا ہے

کیا اس کو بتاؤں ہجر کے غم
جس پہ مرا حال آئینہ ہے

میں کس سے کہوں فسانۂ غم
ہر ایک کا دل دکھا ہُوا ہے

کیوں آ گئی درمیان دُنیا
یہ تیرا مرا معاملہ ہے

کیا پاؤ گے بُت سے فیض حافظ
پتھر بھی کہیں خدا بنا ہے

حافظ لدھیانوی



آج یوں درد ترا، دل کے افق پر چمکا
جیسے دریا کے لیے صبح کا اختر چمکا

یوں ضیا بار رہی ہجر کی شب یاد تری
غم کا شعلہ ترے رخسار سے بڑھ کر چمکا

خاکِ گلشن سے نہ کوئی بھی شرارا پھوٹا
فصلِ گُل آئی نہ کوئی بھی گُلِ تر چمکا

اب نہیں اہلِ نظر، اہلِ بصیرت کوئی
لعل سمجھے ہیں اسے، جب کوئی پتھر چمکا

اک کرن چھوڑ گیا دیدہ و دل میں حافظ
وہ حسیں اشک کہ جو نوکِ مژہ پر چمکا



یارائے گفتگو نہیں، آنکھوں میں دم نہیں
یہ خامشی بھی عرضِ تمنا سے کم نہیں

ویران کس قدر ہے گزرگاہِ آرزو
اس رہگزر میں کوئی بھی نقشِ قدم نہیں

قائم رہی جنوں میں بھی اک وضعِ احتیاط
دل خون ہو گیا ہے مگر آنکھ نم نہیں

دل ہے جمالِ یار کی لذت سے فیضیاب
اس آئینے میں کوئی بھی تصویرِ غم نہیں

حافظ اک اضطرابِ مسلسل ہے زندگی
اس منزلِ وفا میں کہیں پیچ و خم نہیں

وارث کرمانی



لاکھ ناداں ہیں مگر اتنی سزا بھی نہ ملے
چارہ سازوں کو مری شامِ بلا بھی نہ ملے

حسرتِ آگہیں تو ہے ناکامیٔ منزل لیکن
لطف تو جب ہے کہ خود اپنا پتا بھی نہ ملے

کچھ نگاہوں سے غمِ دل کی خبر ملتی ہے
ورنہ ہم وہ ہیں کہ باتوں سے ہوا بھی نہ ملے

خواہشِ دادرسی کیا ہو ستمگر سے جہاں
آنکھ میں شائبۂ عذرِ جفا بھی نہ ملے

اس قدر قحطِ بصیرت بھی نہیں اے واعظ!
ہم بتوں کے لیے نکلیں تو خدا بھی نہ ملے

عشق وہ عرصۂ پُرخار ہے ہمدم! کہ جہاں
زندگی راس نہ آئے تو قضا بھی نہ ملے

کیا قیامت ہے طبیعت کی روانی وارثؔ
کوئی ڈھونڈھے تو نشانِ کفِ پا بھی نہ ملے



جمالِ نسترنی، رنگ و بوئے یاسمنی
گلوں نے سیکھ لیا تم سے ذوقِ پیرہنی

زمانہ ساز نہ ہو گر بتوں کی سیم تنی
تو عزم بت شکنی بھی ہے عین برہمنی

سوادِ کوہ و بیاباں میں شامِ بے وطنی
ہمیں بھگا کے کہاں لائے آہوئے ختنی

ہزار رنگ میں پنہاں ہے آرزوئے حیات
دعائے نیم شبی تا جنونِ کوہ کنی

بنامِ دولتِ حسن و جمالِ بے پایاں
سمجھ کے کیجیے اہلِ طلب کی دل شکنی

مجالِ آہ نہ تھی دل کو بزمِ جاناں میں
یہ احتیاط بھی تھی مقتضائے گلبدنی

وہ رنجِ راہِ تمنا میں یادِ یارِ عزیز
وہ دور بجتے ہوئے سے ربابِ انجمنی

وارث کرمانی



قضا جو دے تو الٰہی، ذرا بدل کے مجھے
ملے یہ جام انہی انگلیوں میں ڈھل کے مجھے

میں اپنے دل کے سمندر سے تشنہ کام آیا
پکارتی رہیں موجیں اچھل اچھل کے مجھے

نگاہ جس کے لئے بے قرار رہتی تھی
سزا ملی ہے اُسی روشنی سے جل کے مجھے

میں رہزنوں کو کہیں اور دیکھتا ہی رہا
کسی نے لُوٹ لیا، پاس سے نکل کے مجھے

کہاں نجوم، کہاں راستے کی گردِ حقیر
عجیب وہم ہوا، تیرے ساتھ چل کے مجھے

اب ایک سایۂ بے خانماں بھی ساتھ میں ہے
یہ کیا ملا ہے، ترے شہر سے نکل کے مجھے

وہی حقیقتِ عمرِ دراز بن کے رہے
کسی نے خواب دیئے تھے جو چند پل کے مجھے

کوئی بھی جب ہدفِ خنجرِ ادا نہ ملا
وہ دشتِ غم سے اٹھا لے گئے مچل کے مجھے



بہت دنوں میں ہم ان سے جو ہمکلام ہوئے
دل و نظر ہمہ تن سجدہ و سلام ہوئے

ہنوز جیسے مسیحا کی آمد آمد ہے
اگرچہ عمر ہوئی، زندگی تمام ہوئے

شفق سی خیمۂ جاناں کی سمت باقی ہے
تمام وادی و کہسار غرقِ شام ہوئے

کئی گلے تھے جو شورِ جہاں میں ڈوب گئے
کئی ستم تھے جو احسان بن کے عام ہوئے

کسی طرف جنھیں راہِ گناہ مل نہ سکی
کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں نیکنام ہوئے

افق کے پار کہیں سے لہو اچھلتا ہے
زمیں سے دور بھی کیا کیا نہ قتلِ عام ہوئے

چلے تھے ان سے مصیبت میں ہم گلہ کرنے
کچھ اور موردِ تضحیکِ خاص و عام ہوئے

رہِ طلب میں نئے ریگزار تک پہنچے
وہ تشنہ کام جو صحرا میں تیز گام ہوئے

وارث کرمانی



(بیادِ حافظ شیراز)

اے صبا نکہتِ گیسوئے معنبر لانا
کوئی تحفۂ گل و نسرین سے خوشتر لانا

شبستانِ محبت کی حسیں راہوں سے
تجلیِ شبنم و نورِ مہ و اختر لانا

جاں بلب ہیں ترے مشتاق، سرِ راہِ حیات
دمِ عیسیٰ و مئے لعل و گلِ تر لانا

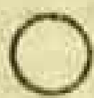
عشق ہو مست و غزلخواں صراحی بردوش
زندگی تازہ و سرشار و معطر لانا

در خورِ محفلِ و شایانِ خراباتِ مغاں
آتشیں مطرب و بیباک نواگر لانا

تجھ کو اندوہِ اسیرانِ قفس کی سوگند
آرزوؤں کے حسیں پھول کھلا کر لانا

کشتگانِ ستمِ دورِ خزاں ہیں ہم لوگ
اپنے ہمراہ بہاروں کا پیمبر لانا

اس نئے دور کے شعروں میں تغزل کم ہے
میری افتادِ طبیعت کا سخنور لانا



آخر وہ اضطراب کے دن بھی گذر گئے
جب دل حریفِ آتشِ قہر و عتاب تھا
جاں دوستوں کی چارہ گری سے لبوں پہ تھی
سر دشمنوں کی سنگ زنی سے عذاب تھا
دامن سگانِ کوئے محبت سے تار تار
چہرہ خراشِ دستِ جنوں سے خراب تھا
واں اعتمادِ مشقِ سیاست کی حد نہ تھی
یاں اعتبارِ نالۂ دل بے حساب تھا
ہر بات صوفیوں کی طرح پیچ و خم لئے
ہر لفظ شاعروں کی طرح انتخاب تھا
ہر جلوہ ایک دفترِ آشوبِ روزگار
ہر غمزہ علمِ فتنہ گری کی کتاب تھا
خوابیدہ ہر نظر میں بنائے فسادِ خلق
پوشیدہ ہر روش میں نیا انقلاب تھا
آج اس غزل میں ہم پہ قیامت گذر گئی
کیا گرمیِ خیال تھی، کیا التہاب تھا

وارث کرمانی



عاشق ہوئے تو عشق میں ہشیار کیوں نہ تھے
ہم ان کے مدح خواں سرِ بازار کیوں نہ تھے

ہاں جب ستم کو عینِ کرم کہہ رہے تھے لوگ
ہم بھی شریکِ گرمیِ گفتار کیوں نہ تھے

جب چل رہا تھا وقت پہ جادو نگاہ کا
اک ہم اسیرِ چشمِ فسوں کار کیوں نہ تھے

اب کیا شہیدِ ناز بنے پھر رہے ہیں لوگ
مرنے کا شوق تھا تو سرِ دار کیوں نہ تھے

وارث یہ شاعری سمِ قاتل سے کم نہیں
آپ اس بلائے جاں سے خبردار کیوں نہ تھے



یہ قدم قدم کشاکش، دلِ بیقرار، کیا ہے
جو یقیں نہ ہو عمل پہ، تو نشاطِ کار کیا ہے

بخدا نسیمِ گلشن، تری وحشتوں کے صدقے
یہ مزاج نامہ بر ہے تو مزاجِ یار کیا ہے

وہ کرم نہ ہو ستم ہو، کوئی بات کم سے کم ہو
یہ ادائے بے نیازی مرے غمگسار کیا ہے

یہ ہم اہلِ غم کی منزل ہے، دبے قدم گذر جا
کہ اجل! یہاں کے فتنوں میں ترا شمار کیا ہے

ابھی آ کے نغمۂ دل کی بہار دیکھ جاؤ
میں نوائے خود شکن ہوں، مرا اعتبار کیا ہے

وارث کرمانی



کھوئے ہوئے صحرا تک، اے بادِ صبا، جانا
وہ خاکِ جنوں، میری آنکھوں سے لگا جانا

اب تک کوئی چنگاری رہ رہ کے چمکتی ہے
اے قافلۂ فردا، یہ راکھ اڑا جانا

آفاق کی سرحد پہ سائے سے گریزاں ہیں
ان سوختہ جانوں کو اس پار نہ تھا جانا

ہم نیند کی چادر میں لپٹے ہوئے چلتے ہیں
اس بھیس میں اب ہم سے ملنا ہو تو آ جانا

یا کھل کے برس جانا ہم پیاس کے ماروں پہ
یا مزرعِ ہستی کو اب آگ لگا جانا

اس سمت سے وارث کا چہرہ تو ذرا دیکھو
اے اہلِ جہاں، تم نے اس شخص کو کیا جانا؟



اجڑ کے گھر سے، سرِ راہ آ کے بیٹھے ہیں
ہم اپنی ضد میں سبھی کچھ گنوا کے بیٹھے ہیں

کہاں تک اپنی ہی پرچھائیوں سے بھاگیں گے
یہ لوگ جو تری محفل میں آ کے بیٹھے ہیں

اب آہ و زاریِ غمخوار کا فریب کھلا
یہ مہرباں بھی وہیں دل لگا کے بیٹھے ہیں

عذابِ حشر کا کیا ذکر ہم سے، اے واعظ
ہم اس بلا کو یہیں آزما کے بیٹھے ہیں

حبیب اشعر دہلوی



موجِ انفاس بھی اک تیغِ رواں ہو جیسے
زندگی کارگہِ شیشہ گراں ہو جیسے

دل پہ یوں عکس فگن ہے کوئی بھولی ہوئی یاد
سرِ کہسار، دھندلکے کا سماں ہو جیسے

حاصلِ عمرِ وفا ہے بس اک احساسِ یقیں
وہ بھی پروردۂ آغوشِ گماں ہو جیسے

مجھ سے وہ آنکھ چراتا ہے تو یوں لگتا ہے
ساری دنیا مری جانب نگراں ہو جیسے

آج اشعرؔ سے سرِ راہ ملاقات ہوئی
کوئی درماندۂ دل، شعلہ بجاں ہو جیسے

حبیب اشعر



یہ کیفِ کیفِ محبت ہے، کوئی کیا جانے
چھلک رہے ہیں نگاہوں میں دل کے پیمانے

کہانیوں ہی پہ بنیاد ہے حقیقت کی
حقیقتوں ہی سے پیدا ہوئے ہیں افسانے

نہ اب وہ آتشِ نمرود ہے، نہ شعلۂ طور
تری نگاہ کو کیا ہوگیا؟ خدا جانے

ہزار تیری محبت نے رہ نمائی کی
گزر سکے نہ مقامِ جنوں سے دیوانے

انہی کو حاصلِ یک شہرِ آرزو کہیے
مری نگاہ میں آباد ہیں جو ویرانے

تجھے خبر بھی ہے؟ اس دورِ خستہ حالی میں
خود اہلِ دل ہیں مذاقِ وفا سے بیگانے

جنوں فریبِ خرد ہے، خرد فریبِ نظر
مجھے کہیں کا نہ رکھا، مری تمنا نے



پہلو میں اک نئی سی خلش پا رہا ہوں میں
اس وقت غالباً انہیں یاد آ رہا ہوں میں

کیا چشمِ التفات کا مطلب سمجھ گیا؟
کیوں ترکِ آرزو کی قسم کھا رہا ہوں میں

کیا کچھ نہ تھی شکایتِ کوتاہیٔ نظر؟
اب وسعتِ نگاہ سے گھبرا رہا ہوں میں

اے دوست! عرضِ غم پہ نہ یوں مسکرا کے دیکھ
اپنی نظر سے آپ گرا جا رہا ہوں میں

تُو یہ سمجھ رہا ہے کہ مجبورِ عشق ہوں
کچھ سوچ کر فریبِ وفا کھا رہا ہوں میں



جو مرے دل میں آہ ہو کے رہی
وہ نظر بے پناہ ہو کے رہی

میں ہوں اور تہمتِ زبونیٔ دل
بے گناہی، گناہ ہو کے رہی

خلشِ دل پہ کچھ بھروسا تھا
وہ بھی تیری نگاہ ہو کے رہی

دل کی عشرت پسندیاں، توبہ!
ہر تمنّا گناہ ہو کے رہی



طور بے طور ہوئے جاتے ہیں
اب وہ کچھ اور ہوئے جاتے ہیں

چھلکی پڑتی ہے نگاہِ ساقی
دَور پر دَور ہوئے جاتے ہیں

تُو نہ گھبرا، کہ ترے دیوانے
خوگرِ جَور ہوئے جاتے ہیں

عشق کے مسئلہ ہائے سادہ
قابلِ غور ہوئے جاتے ہیں

رفعت سلطان



اگر قدم ترے میکش کا لڑکھڑا جائے
تو شمعِ میکدہ کی لَو بھی تھرتھرا جائے

اب اُس مقام پہ لائی ہے زندگی مجھکو
کہ چاہتا ہوں، تجھے بھی بھلا دیا جائے

مجھے بھی یوں تو بڑی آرزو ہے جینے کی
مگر سوال یہ ہے، کس طرح جیا جائے

غمِ حیات سے اتنی بھی ہے کہاں فرصت
کہ تیری یاد میں جی بھر کے رو لیا جائے

اُنہیں بھی بھول چکا ہوں میں، اے غمِ دوراں!
اب اس کے بعد بتا، اور کیا کیا جائے

نہ جانے اب یہ مجھے کیوں خیال آتا ہے
کہ اپنے حال پہ بے ساختہ ہنسا جائے

گریز عشق سے لازم سہی، مگر رفعتؔ
جو دل ہی بات نہ مانے تو کیا کیا جائے

رفعت سلطان



نا آشنائے درد نہیں بے وفا نہیں
اک آشنا، کہ ہائے مرا آشنا نہیں

لاؤں جو دل کی بات زباں پر، تو کس لیے
میں جانتا نہیں ہوں کہ تُو جانتا نہیں؟

جلتا رہا ہوں زیست کے دوزخ میں عمر بھر
یہ اور بات ہے، مری کوئی خطا نہیں

اک ساغرِ حیات کی خاطر، تمام عمر
وہ کون سا ہے زہر جو میں نے پیا نہیں

شاید ورودِ فصلِ بہاراں قریب ہے
اہلِ جنوں نے چاکِ گریباں سیا نہیں

حسنِ غرورِ گل، کہ جمالِ سمن براں
دُنیا میں کچھ بھی ذوقِ نظر کے سوا نہیں

تیرے حریمِ ناز کی اُس کو خبر ہو کیا
جو سرحدِ خیال سے آگے گیا نہیں

رفعت جہاں میں رسمِ وفا ہی نہیں رہی
اُن سے تو کیا، کسی سے بھی مجھ کو گلا نہیں

رفعت سلطان



نادان دل! فریبِ محبت نہ کھا کبھی
دُنیا میں کس نے کی ہے کسی سے وفا کبھی

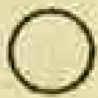
ایسا بھی اتفاق جنوں میں ہُوا کبھی
مَیں ہنستے ہنستے، سوچ کے کچھ، رو پڑا کبھی

بیٹھا ہوں اس امید پہ اک رہگذر پر
لے آئے اس طرف تجھے شاید خدا کبھی

اے دل! یہ میرا حسنِ سماعت نہ ہو کہیں
تو نے بھی کیا سنی ہے وہ آوازِ پا کبھی؟

اس رشکِ گل کے ساتھ گئی تھی خرام کو
پھر لوٹ کر اِدھر نہیں آئی صبا کبھی

رفعت غموں کی تیز ہواؤں کے باوجود
ہم نے چراغ دل کا نہ بجھنے دیا کبھی



اب کہیں سایۂ گیسو بھی نہیں
چین دل کو کسی پہلو بھی نہیں

جانے کیا سوچ کے خوش بیٹھا ہوں
موسمِ گُل بھی نہیں، تو بھی نہیں

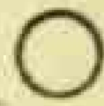
اب تری نذر کروں کیا اے دوست!
اب مری آنکھوں میں آنسو بھی نہیں

کس کو سینے سے لگا کر روئیں
دشت میں اب کوئی آہُو بھی نہیں

مُسکرا اُٹھتی تھی وہ آنکھ کبھی
اور اب جنبشِ ابرو بھی نہیں

دل کو حسرت ہے ترے ملنے کی
اور حالات پہ قابو بھی نہیں

رفعت سلطان



سفرِ زندگی نہیں آساں
ہر طرف راہ میں ہیں سنگِ گراں

دُور ہو جائیں دُکھ زمانے کے
صاحبِ درد ہو اگر انساں

سوچنا پڑ گیا زمانے کو
لُٹ کے بھی ہم نہ جب ہوئے نالاں

تُو اسے طنز کیوں سمجھتا ہے
میں تو حالات کر رہا ہوں بیاں

جی رہا ہوں کچھ اس طرح جیسے
آگ لگ جائے اور نہ ہو دھواں

تُو مری بات کا جواب نہ دے
میں سمجھتا ہوں خامشی کی زباں

نکتہ چینی، حسد، دل آزاری
اور کیا ہے متاعِ بے ہنراں

مجھ کو اس کی تلاش ہے رفعتؔ
جو مرے دل میں ہے کہیں پنہاں



بہاروں کو چمن یاد آ گیا ہے
مجھے وہ گلبدن یاد آ گیا ہے

لچکتی شاخ نے جب سر اٹھایا
کسی کا بانکپن یاد آ گیا ہے

مری خاموشیوں پر ہنسنے والو
مجھے وہ کم سخن یاد آ گیا ہے

تمہیں مل کر تو اے یزداں پرستو!
غرورِ اہرمن یاد آ گیا ہے

تری صورت کو جب دیکھا ہے میں نے
عروجِ فکر و فن یاد آ گیا ہے

کسی کا خوبصورت شعر سن کر
ترا لطفِ سخن یاد آ گیا ہے

ملے وہ اجنبی بن کر تو رفعتؔ
زمانے کا چلن یاد آ گیا ہے

رفعت سلطان



راہ و رسم ان سے غائبانہ سہی
زندہ رہنے کا اک بہانہ سہی

وقت کی مصلحت کے پیشِ نظر
تُو مرا درد آشنا نہ سہی

کسی بُت کو خدا کہوں کیسے
نہیں میرا اگر خدا، نہ سہی

میں چمن چھوڑ کر نہ جاؤں گا
برق کی زد پہ آشیانہ سہی

روشنی چاہیئے بہر صورت
اپنا دل ہی چراغ خانہ سہی

میرے جینے پہ اعتراض نہ کر
یہ زمانہ ترا زمانہ سہی



جب نشاطِ الم نہیں ہوتا
جامِ جم، جامِ جم نہیں ہوتا

جانے کیوں تیری بے رُخی سے بھی
دل کو اب کوئی غم نہیں ہوتا

آ گیا ہوں ترے حضور، مگر
فاصلہ پھر بھی کم نہیں ہوتا

وہ مسرّت تلاش کرتا ہے
جس کو عرفانِ غم نہیں ہوتا

عمر بھر تجھ کو دیکھنے پر بھی
ذوقِ نظارہ کم نہیں ہوتا

کیا کہوں، دل کو کیا ہوا رفعت
دامنِ چشم، نم نہیں ہوتا

رفعت سلطان



جب سے آیا ہوں تیرے گاؤں میں
رنگ ہی رنگ ہیں فضاؤں میں

آکہ دکھ سکھ کی کوئی بات کریں
بیٹھ کر شیشموں کی چھاؤں میں

مَیں بھی کرتا ہوں ضبط کی کوشش
تو بھی تخفیف کر اداؤں میں

وہ ترا دفعتاً بچھڑ جانا
وہ مرا دیکھنا خلاؤں میں

ہو اگر کوئی گوش بر آواز
اک خموشی بھی ہے صداؤں میں

یہی میرے لیے غنیمت ہے
سانس لے لوں کھلی فضاؤں میں



ابتدا ہوں کہ انتہا ہوں میں
عمر بھر سوچتا رہا ہوں میں

لفظ و معنی سے ماورا ہوں میں
ایک خاموش التجا ہوں میں

دل میں کوئی خوشی نہیں، لیکن
عادتاً مسکرا رہا ہوں مَیں

ناتواں ہو کے عدل چاہتا ہوں
واقعی قابلِ سزا ہوں مَیں

دیکھ کر رنگ، بزمِ عالم کا
نقشِ دیوار بن گیا ہوں میں

صبح کے انتظار میں رفعت
رات بھر سوچتا رہا ہوں میں

محمد نبی خاں جمال سویدا



عشق کی جنت، دار کے پیچھے
جیت بھی ہے اس ہار کے پیچھے

پہتر تانے لوگ کھڑے ہیں
زنداں کی دیوار کے پیچھے

دھیمی دھیمی آہیں بھی ہیں
پایل کی جھنکار کے پیچھے

گل چیں باغ کو لوٹ رہا ہے
پھولوں کے اک ہار کے پیچھے

سونی سونی ویراں گلیاں
ہر چلتے بازار کے پیچھے

دل بھی کتنا سودائی ہے
بھاگے ہے افکار کے پیچھے

محمد نبی خاں جمال سویدا



تجھ کو خود اپنے ہی سائے پہ گماں گزرا ہے
تیرا وحشی ترے کوچے سے کہاں گزرا ہے

جھلملانے لگے فانوس تری محفل کے
کوئی پروانہ مگر شعلہ بجاں گزرا ہے

نغمگیِ نالۂ ہجراں میں کہاں سے لاؤں؟
سوزِ دل سازِ بہاراں سے کہاں گزرا ہے؟

پھول گلشن میں جگر چاک نظر آتے ہیں
سرو کے سائے پہ زنداں کا گماں گزرا ہے

غم کی جھنکار میں شامل تھی شکستِ دل بھی
میرے نالوں پہ تغزّل کا گماں گزرا ہے

ٹمٹماتے ہوئے دیکھے ہیں ستاروں کے چراغ
کہکشاں سے ابھی انساں کہاں گزرا ہے ؟



کوئی منزل، نہ کوئی جادہ ہے
اب مسافر کا کیا ارادہ ہے؟

دل یہ کہتا ہے — چاند نکلے گا
تیرگی کل سے کچھ زیادہ ہے

جتنے غم ہوں، مجھے عطا کیجے
دامنِ دل بہت کشادہ ہے

کم سہی التفاتِ دوست، مگر
میری امید سے زیادہ ہے

ہم سویدا سے مل کے آئے ہیں
فکر رنگیں، مزاج سادہ ہے

محمد نبی خاں جمال سویدا



تیرے جلوے سے مرے دل کا فروزاں ہونا
ایک ذرّے کا ہے خورشید بہ داماں ہونا

جب کسی غنچے کا منہ چُومتی ہے موجِ نسیم
یاد آتا ہے ترے لب کا گلستاں ہونا

کس کو فرصت ہے کہ ہر بُت کا جگر چاک کرے
ورنہ مشکل تو نہ تھا کفر کا ایماں ہونا

اب کہاں جاؤں؟ یہ آشوبِ تمنّا لے کر
درد کو آگیا مضرابِ رگِ جاں ہونا

سانس لینے کو مسافر کی طرح ٹھہرے تھے
ہائے! اس سایۂ دیوار کا زنداں ہونا



نگاہِ ناز کا رشتہ جو دل کے گھاؤ سے ہے
یہ آب و رنگِ تمنّا اُسی لگاؤ سے ہے

بقدرِ ظرف پیے اور اپنی راہ لگے
شراب خانے کی رونق ہی چل چلاؤ سے ہے

وفا تو کیا ہے؟ بس اک پاسِ وضع کہہ لیجے
اور اتنی بات بھی میرے ہی رکھ رکھاؤ سے ہے

حکیم اپنے ہی سائے کی ناپ تول میں غرق
فروغِ فکر مگر عقل کے گراؤ سے ہے

خاطر غزنوی



گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہُوا کچھ لوگ پہچانے گئے

گرمیٔ محفل فقط اک نعرۂ مستانہ ہے
اور وہ خوش ہیں کہ اس محفل سے دیوانے گئے

میں اِسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے، اس گلی میں میرے افسانے گئے

یوں تو وہ میری رگِ جاں سے بھی تھے نزدیک تر
آنسوؤں کی دھند میں لیکن نہ پہچانے گئے

وحشتیں کچھ اس طرح اپنا مقدر ہو گئیں
ہم جہاں پہنچے، ہمارے ساتھ ویرانے گئے

اب بھی اُن یادوں کی خوشبو ذہن میں محفوظ ہے
بارہا ہم جن سے گلزاروں کو مہکانے گئے

کیا قیامت ہے کہ خاطرؔ کشتۂ شب بھی تھے ہم
صبح بھی آئی تو مجرم ہم ہی گردانے گئے

خاطر غزنوی



کوئی کلی ہے، نہ غنچہ، نہ گل، برائے صبا
چمن میں کانٹے ہیں، دامن بچا کے آئے صبا

نہ اب طلسمِ بہاراں، نہ اب فسونِ جمال
وہ لمحے خواب ہوئے، خواب بھول جائے صبا

کبھی فضاؤں میں خوشبو اڑائے پھرتی تھی
مگر یہ دن کہ بہاروں میں خاک اُڑائے صبا

کلی ہے مہر بلب، پھول ہے گریباں چاک
اجل کی دھوپ ہے، پھرتی ہے سائے سائے صبا

نہ کچھ نشاں کی صدا ہے، نہ آہٹوں کے نشاں
چمن میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں نقشِ پائے صبا

گھٹن ہے ایسی کہ صرصر کو بھی ترستے ہیں
کسے پکاریں، کہاں جائیں، اے خدائے صبا

حریمِ غنچہ میں خوشبو سمٹ کے بیٹھی ہے
حجاب اُٹھے جو صحنِ چمن میں آئے صبا

خبر نہیں مجھے کس سمت سے کے اڑ جائے
کئی دنوں سے مرے سر میں ہے ہوائے صبا

بھٹکتی پھرتی ہے صحرائے درد میں خاطرؔ
بچھڑ گیا ہو کوئی جیسے آشنائے صبا

خاطر غزنوی



اُلجھے اُلجھے دھاگے سے خیالوں کی طرح
ہو گیا ہوں ان دنوں تیرے سوالوں کی طرح

اپنے دل کی وسعتوں میں ہر طرف بھٹکا پھرا
بے کراں، مبہم سرابوں میں غزالوں کی طرح

یہ مرا احساس ہے یا جبرِ موسم کا اثر
اب کی رُت مہکے نہیں گل پچھلے سالوں کی طرح

عصرِ حاضر کی جبیں پر تلخیاں کندہ ہوئیں
تن گئے حالات اپنے گرد جالوں کی طرح

دشتِ غم میں آندھیوں کے وار سہنے کے لیے
خشک پتّے اُٹھ رہے ہیں آج ڈھالوں کی طرح

ظلمتِ مغرب کو خاطرؔ کوئی یہ پیغام دے
ہم بھی اب اُبھریں گے مشرق سے اجالوں کی طرح



بستیاں ہو گئیں بے نام و نشاں راتوں رات
ایسے طوفان بھی آتے ہیں یہاں راتوں رات

جی میں آتا ہے کہ تعبیر تجھی سے پوچھیں
ہو گیا خواب ترا جسم جواں راتوں رات

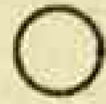
شام ہنگامہ تھا، خوشیاں تھیں، ہمیں چھیڑے تھے
کھو گئی محفلِ احباب کہاں راتوں رات

حسن جلتا رہا شمعوں کی طپاں خلوت میں
ہو گئی مشعلِ مہتاب دھواں راتوں رات

اک جہانگیر خموشی کی رجز خوانی ہے
ہو گیا کیا یہ مرے گھر کا سماں راتوں رات

کون اُن کلیوں کی قسمت پہ نہ روئے خاطرؔ
جن کو کر دیتی ہے تقدیر جواں راتوں رات

خاطر غزنوی



ہے گرم ملکوں کا سورج ترے جلال کی گرد
غرورِ کاہکشاں ہے تیرے جمال کی گرد

محبتوں کے خرابوں میں دھوپ کم نکلی
کبھی جدائی کے کہرے، کبھی ملال کی گرد

کبھی تو گذرے ادھر سے بھی کاروانِ بہار
کبھی تو پہنچے یہاں بھی ترے خیال کی گرد

ہمارے بالوں پہ موسم ہے برف باری کا
ہمارے چہرے پہ اڑتی ہے ماہ و سال کی گرد

تمام عالمِ امکاں ہے اک خیال میں گم
نہ پا سکے گا زمانہ کبھی خیال کی گرد



کیسی چلی ہے اب کے ہوا تیرے شہر میں
بندے بھی ہو گئے ہیں خدا تیرے شہر میں

تُو اور حریمِ ناز میں پابستۂ حنا
ہم پھر رہے ہیں آبلہ پا تیرے شہر میں

کیا جانے کیا ہُوا کہ پریشان ہو گئی
اک لحظہ رک گئی تھی صبا تیرے شہر میں

کچھ دشمنی کا ڈھب ہے نہ اب دوستی کے طور
دونوں کا ایک رنگ ہُوا تیرے شہر میں

شاید انہیں پتہ تھا کہ خاطرؔ ہے اجنبی
لوگوں نے اس کو لوٹ لیا تیرے شہر میں

خاطر غزنوی



تجھ سے مل کر اس قدر اپنوں سے بیگانے ہوئے
اب تو پہچانے نہیں جاتے ہیں پہچانے ہوئے

بت جنہیں ہم نے تراشا اور خدائی سونپ دی
آ گئے ہیں سامنے پتھر وہی تانے ہوئے

خلق کی تہمت سے چھوٹے سنگِ طفلاں سے بچے
خوب تھے وہ لوگ جو خود اپنے دیوانے ہوئے

اس کو کیا کہیئے کہ ہم ہر حال میں جلتے رہے
دوریوں میں چاند تھے قربت میں پروانے ہوئے

اپنی صورت میں بھی خاطر ایک گونہ سحر تھا
آئینہ خانوں میں فرزانے بھی دیوانے ہوئے



رازِ دل جو تری محفل میں بھی افشا نہ ہوا
یا سرِ دار ہوا یا سرِ مے خانہ ہوا

ایک ہم ہیں کہ تصور کی طرح ساتھ رہے
ایک تو ہے کہ جو خلوت میں بھی تنہا نہ ہوا

کیا بھروسہ ہے ترے لطف و کرم کا اے دوست
جس طرح سایۂ دیوار ہوا یا نہ ہوا

شبستاں میں اُتر آئی تھی سورج کی کرن
آئینہ خانہ گل تھا کہ صنم خانہ ہوا

اس قدر رنج سہے دل نے وفا میں خاطر
آج وہ ہم سے جو بچھڑے بھی تو صدمہ نہ ہوا

ہوش ترمذی

تزئینِ بزمِ غم کے لیے کوئی شے تو ہو
روشن چراغِ دل نہ سہی، جامِ مے تو ہو

ہم تو رہینِ رشتۂ بیگانگی رہے
سارے جہاں سے تیری ملاقات ہے تو ہو

غم بھی مجھے قبول ہے لیکن بقدرِ شوق
دل کا نصیب درد سہی، پے بہ پے تو ہو

فریاد ایک شور ہے، آہنگ کے بغیر
نالہ متاعِ درد سہی، کوئی لے تو ہو

یہ کیا کہ اہلِ شوق نہ اپنے نہ آپ کے
یا موت یا حیات، کوئی بات طے تو ہو

ہے دورِ حُسن سلسلۂ زیر و بم کی بات
پہلے گدازِ سینہ سزاوارِ نے تو ہو

ہر چند دو قدم ہی سہی منزلِ مُراد
یہ مختصر سی راہ مگر ہوشؔ طے تو ہو

ہوش ترمذی

وہ تقاضائے جنوں اب کے بہاروں میں نہ تھا
ایک دامن بھی تو الجھا ہوا خاروں میں نہ تھا

اشکِ غم تھم گئے، یاد آتے ہی اُن کی صورت
جب چڑھا چاند تو پھر نور ستاروں میں نہ تھا

مرنے جینے کو نہ سمجھے تو خطا کِس کی ہے
کونسا حکم ہے جو اُن کے اشاروں میں نہ تھا

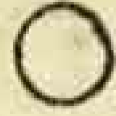
ہر قدم خاک سے دامن کو بچایا تم نے
پھر یہ شکوہ ہے کہ میں راہگذاروں میں نہ تھا

زندگی کے لیے شرمندۂ عیسیٰ ہونا
ایسا اوچھا تو کوئی درد کے ماروں میں نہ تھا

تم سا لاکھوں میں نہ تھا جانِ تمنّا لیکن
ہم سا محرومِ تمنّا بھی ہزاروں میں نہ تھا

ہوشؔ کرتے نہ اگر ضبطِ فغاں کیا کرتے
پُرسشِ غم کا سلیقہ بھی تو یاروں میں نہ تھا

ہوش ترمذی



دل کو غم راس ہے یوں، گُل کو صبا ہو جیسے
اب تو یہ درد کی صورت ہے، دوا ہو جیسے

ہر نفس حلقۂ زنجیر نظر آتا ہے
زندگی جرمِ تمنا کی سزا ہو جیسے

کان بجتے ہیں سکوتِ شبِ تنہائی میں
وہ خموشی ہے کہ اک حشر بپا ہو جیسے

اب تو دیوانوں سے یوں بچ کے گزر جاتی ہے
بوئے گُل بھی ترے دامن کی ہوا ہو جیسے

کہتے کہتے غمِ دل عمر گزاری لیکن
پھر بھی احساس یہ ہے، کچھ نہ کہا ہو جیسے

ہوش بے تابیٔ احساس کا عالم توبہ!
مجھ میں چھپ کر وہ مجھے دیکھ رہا ہو جیسے



گو داغ ہو گئے ہیں وہ چھالے پڑے ہوئے
ہیں اب بھی دل میں تیرے حوالے پڑے ہوئے

دشتِ وفا میں جل کے نہ رہ جائیں اہلِ دل
وہ دھوپ ہے کہ رنگ ہیں کالے پڑے ہوئے

شعلہ کہ رنگ، کیا ہے وہ حسنِ کرشمہ ساز
ہیں کشمکش میں دیکھنے والے پڑے ہوئے

شبنم سزا ہے جرأتِ افشائے راز کی
گویا زبانِ گل میں ہیں چھالے پڑے ہوئے

دیکھو ہمیں کہ منزلِ حشرِ طلب میں ہیں
لیکن لبِ سوال پہ تالے پڑے ہوئے

بے حس گزر نہ یوں چمنِ روزگار سے
کانٹے کہ پھول، کچھ تو اٹھالے پڑے ہوئے

جائیں گے وضعِ نو سے سرِ بزمِ یار ہوش
منہ پر بھبوت، کان میں بالے پڑے ہوئے

ہوش ترمذی



دیکھے ہیں جو غمِ دل سے بھلائے نہیں جاتے
اک عمر ہوئی، یادوں کے ستائے نہیں جاتے

اشکوں سے خبردار کہ آنکھوں سے نہ نکلیں
گر جائیں یہ موتی تو اٹھائے نہیں جاتے

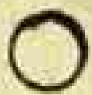
ہر جنبشِ دامانِ جنوں جانِ ادب ہے
اس راہ میں آداب سکھائے نہیں جاتے

ہم بھی شبِ گیسو کے اجالوں میں رہے ہیں
کیا کیجئے، دن پھیر کے لائے نہیں جاتے

شکوہ نہیں، سمجھائے کوئی چارہ گروں کو
کچھ زخم ہیں ایسے کہ دکھائے نہیں جاتے

اے دستِ جفا! سر ہیں یہ اربابِ وفا کے
کٹ جائیں تو کٹ جائیں جھکائے نہیں جاتے

اے ہوشؔ غمِ دل کے چراغوں کی ہے کیا بات
اک بار جلا دو تو بجھائے نہیں جاتے



لائے گا رنگ ضبطِ فغاں دیکھتے رہو
پھوٹے گی ہر کلی میں زباں، دیکھتے رہو

برپا سرِ حیات ہے اک حشرِ دار و گیر
دیتا ہے کون کس کو اماں، دیکھتے رہو

دم بھر کو آستانِ تمنا پہ ہے ہجوم
جائے بچھڑ کے کون کہاں، دیکھتے رہو

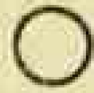
ملنے کو ہے خموشیٔ اہلِ جنوں کی داد
اٹھنے کو ہے زمیں سے دھواں، دیکھتے رہو

محفل میں ان کی شمع جلی ہے کہ جان و دل
کھلتا ہے کب یہ رازِ نہاں، دیکھتے رہو

ہیں برگِ گل کو لرزشِ معترض کے پیام
طرزِ تپاکِ اہلِ جہاں دیکھتے رہو

آئی نگارِ غم کی صدا ہوشؔ، ہم چلے
تم امتیازِ سود و زیاں دیکھتے رہو

ھوش ترمذی



یادیں چلیں، خیال چلا، اشکِ تر چلے
لے کر پیامِ شوق کئی نامہ بر چلے

دل کو سنبھالتے رہے ہر حادثے پہ ہم
اب کیا کریں کہ خود ترے گیسو بکھر چلے

ہر گام پر شکست نے یوں حوصلہ دیا
جس طرح ساتھ ساتھ کوئی ہم سفر چلے

شوقِ طلب نہ ہو کوئی بانگِ جرس تو ہو
آخر کوئی چلے تو کس امید پر چلے

اب کیا کروگے سبزہ و سمن زارِ آرزو
رُت جا چکی، چڑھے ہوئے دریا اتر چلے

راہوں میں ہوشؔ سنگ برستے ہیں ہر طرف
لے کر یہ کاروانِ تمنا کدھر چلے؟



کبھی آہیں، کبھی نالے، کبھی آنسو نکلے
ان سے آغازِ سخن کے کئی پہلو نکلے

یوں بھی وہ بزمِ تصور سے گزر جاتے ہیں
جیسے لَے ساز سے یا پھول سے خوشبو نکلے

ہے اس امید پہ صیقل ہنرِ تیشہ زنی
سینۂ سنگ سے شاید کوئی گل رو نکلے

قصۂ دار و رسن ہی سہی، کچھ بات کرو
کسی عنواں سے تو ذکرِ قدِ گیسو نکلے

غمِ دوراں نے کیا اہلِ تمنا کا وہ حال
دشت سے جیسے ہراساں کوئی آہو نکلے

ہم جنھیں ہوشؔ تجاہل سے خطا سمجھے تھے
ناوکِ ناز وہ سب دل میں ترازو نکلے

ہوش ترمذی

پاسِ ناموسِ تمنا ہر اک آزار میں تھا
نشۂ نکہتِ گُل بھی خلشِ خار میں تھا

کس سے کہیے کہ زمانے کو گراں گذرا ہے
وہ فسانہ کہ مری حسرتِ گفتار میں تھا

دل کہ آتا ہی نہیں ترکِ تمنا کی طرف
کوئی اقرار کا پہلو ترے انکار میں تھا

کچھ تجھے یاد ہے اے چشمِ زلیخا کہ جہاں
ہم سا یوسف بھی کوئی مصر کے بازار میں تھا!

زندگی جا نہ سکی شام و سحر سے آگے
سارا عالم اسی آئینہ تکرار میں تھا

عمر بھر چشمِ تماشا کو رہی جس کی تلاش
ہوشؔ وہ حسنِ گریزاں مرے اشعار میں تھا

ملتا نہیں مزاج، خود اپنی ادا میں ہے
تیری گلی سے آ کے صبا بھی ہوا میں ہے

اے عشق تیری دوسری منزل بھی ہے کہیں
مرنا ہے ابتدا میں تو کیا انتہا میں ہے

لاتی ہے جب صبا تو چمکتے ہیں بام و در
یہ روشنی سی کیا تری بوئے قبا میں ہے

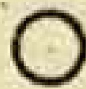
ہر رہ گذر نشاں ہے تری سمت کا مگر
اقرارِ نارسی بھی ہر اک نقشِ پا میں ہے

توصیفِ حُسن اصل میں ہے وصفِ حُسن ساز
بندوں سے جس کو پیار ہے یادِ خدا میں ہے

یہ تشنگی، یہ پاسِ وفا، یہ ہجومِ غم
کیا کاروانِ شوق کسی کربلا میں ہے

سُن لو کہ ہوشؔ نے بھی کیا ترکِ آرزو
کہرام اک بچا ہوا شہرِ وفا میں ہے

کرم حیدری



میں دشتِ زندگی کو چلا تھا نکھار نے
اک قہقہہ لگایا گزرتی بہار نے

گزرا ہوں جب سلگتے ہُوئے نقش چھوڑتا
دیکھا ہے مجھ کو غور سے ہر رہگزار نے

میکش نے جامِ زہر ہی منہ سے لگا لیا
پاگل بنا دیا جو نشے کے اُتار نے

انسان حدِ نور سے آگے نکل گیا
چھوڑا مگر نہ اُس کو لہو کی پکار نے

ان مہ رُخوں کی ہم سے جو یہ بے رُخی رہی
جانا پڑے گا، چاند پہ کچھ دن گزار نے

کرتے ہیں وہ ستارے بھی اب مجھ پہ چشمکیں
چمکا دیا جنھیں مری شب ہائے تار نے

اُن گلکدوں کو بھی کوئی اے کاش دیکھتا
جُھلسا ہے جن کو آتشِ فصلِ بہار نے

لاؤں کہاں سے اُن کے لیے اور غمگسار
جو غم دئیے ہیں مجھ کو مرے غمگسار نے

میری سرشت میں تھی محبت کی پرورش
مجھ کو قلم دیا مرے پروردگار نے

بخشا ہے اپنے حسن کا پرتو مجھے کرمؔ
فطرت کے ہر جمیل و حسیں شاہکار نے

کرم حیدری



دل میں طوفان اُٹھاتے ہوئے جذبات بھی ہیں
ہم ہیں خاموش کہ کچھ اپنی روایات بھی ہیں

محتسب ہی سے نہیں نالہ بلب جام و سبو
سنگ اُٹھائے ہوئے خود اہلِ خرابات بھی ہیں

بستیوں میں کبھی مل جاتے ہیں انساں اب بھی
جیسے صحراؤں میں شاداب مقامات بھی ہیں

دیکھئے مجھ سے وہ کب آ کے گلے ملتا ہے
بٹتے جو میرے وہی اب غیر کے حالات بھی ہیں

اشک ہی اشک نہیں، غور سے دیکھو گے اگر
ان سلگتی ہوئی آنکھوں میں حکایات بھی ہیں

اُن کے دامن پہ لہو! کس کو یقیں آئے گا
جن کے چہروں پہ تقدس کی علامات بھی ہیں

کیا کہیں کون سی راہوں میں ہیں پامالِ کرم
ہم کہ زندہ ہیں مگر کشتۂ حالات بھی ہیں



محرمِ رازِ حرم ہوں، واقفِ بُت خانہ ہوں
میں رہ و رسمِ محبت کا مگر دیوانہ ہوں

میں نہ بے قیمت خزف ہوں اور نہ لعلِ بے بہا
میں تو اربابِ نظر کے ظرف کا پیمانہ ہوں

میری رگ رگ میں ہے موجِ زندگی رقصاں مگر
اک لبِ جاں بخش کو ترسا ہوا پیمانہ ہوں

ہوں بظاہر نقش کچھ بکھرے ہوئے الفاظ کا
تم جو اے جانِ جہاں، سمجھو تو اک افسانہ ہوں

میری پامالی کے چرچے تم بھی سُن لو گے کبھی
اپنے گلشن میں ہوں لیکن سبزۂ بیگانہ ہوں

ڈھونڈنے نکلیں گے مجھ کو ایک دن اہلِ وفا
دفن ہے گنجینۂ دل جس میں وہ ویرانہ ہوں

کرم حیدری



بقدرِ شوق نہیں لطفِ محفل آرائی
شدید تر ہے سرِ بزم اپنی تنہائی

کہاں وہ شعلہ نوائی، کہاں یہ خاموشی
بدل گئے ہیں زمانے کہ تیرے سودائی

مری فغاں کو تو سمجھیں گے لوگ میرا جنوں
ترا سکوت نہ بن جائے وجہِ رسوائی

صدف صدف ہے شکارِ تلاطمِ دریا
کسی گہر میں تو پیدا ہو شانِ یکتائی

نہ فکر و ہوش، نہ قلب و نظر، نہ ظرف و ضمیر
نیا جہاں ہے، نئی خسروی و دارائی

چراغِ راہِ محبت تھی خاکِ اہلِ وفا
قدم قدم پہ کرمؔ روشنی نظر آئی



ہم کس شبِ سیاہ کے دامن میں بس گئے
تیری ضیائے رُخ کو دل و جاں ترس گئے

مرجھا رہی ہیں اپنی اُمنگوں کی کونپلیں
بادل نہ جانے کون سی جانب برس گئے

اُجڑے تھے دل، سو اُجڑے ہوئے ہیں کچھ اور بھی
کیا کیا نہ ورنہ کوچہ و بازار بس گئے

آوارگانِ شوق نے منزل نہ کی قبول
گلشن کا در کھلا تو وہ سوئے قفس گئے

ہے ہجرِ دوستاں بھی کرمؔ دردِ جاں فزا
آنکھوں میں جو بسے تھے وہ اب دل میں بس گئے

مجیب خیرآبادی



یہی نہیں کہ بس عزمِ سفر ہمارے ساتھ ہے
مزاجِ شبنم و دلِ شرر ہمارے ساتھ ہے

انھیں کلاہِ خواجگی پہ ناز ہے؟ ہُوا کرے
یہ انجمن کی انجمن مگر ہمارے ساتھ ہے

شبِ سفر کا غم ہی کیا، شبِ سفر ہے مختصر
ابھی تو ایک دل سا راہبر ہمارے ساتھ ہے

تمھارے دامنوں میں سنگ ہائے نو بہ نو سہی
خیالِ اندمالِ زخمِ سر ہمارے ساتھ ہے

وہ لوگ اور ان کی وہ دکاں تو بڑھ گئی، مگر
ستمگروں کی طبعِ شیشہ گر ہمارے ساتھ ہے

جسے قدم قدم پہ خود ہی حاجتِ دوا نہ ہو
بتاؤ ـــ کوئی ایسا چارہ گر ہمارے ساتھ ہے؟

نہیں اگر تفنگ و تیر و نیشہ و تبر تو کیا
دلِ جواں، جنونِ معتبر ہمارے ساتھ ہے

جوابِ گوشۂ جناں بنائی جائے گی زمیں
فلک شکار عظمتِ بشر ہمارے ساتھ ہے

مجیب خیر آبادی



مثلِ ابرِ کرم ہم جہاں بھی گئے، دشت کے دشت گلزار بنتے گئے
زرد چہرے تھے جھلسے ہوئے دھوپ سے، تازگی پا کے گلنار بنتے گئے

جتنا بہتا گیا زندگی کا لہو، اور ہوتے گئے حوصلے سرخرو
سہل ہوتی گئی منزلِ جستجو، راستے اور ہموار بنتے گئے

کچھ سفر کی تھکن سے بدن چُور تھا، کچھ زمیں سخت تھی آسماں دور تھا
کچھ تری زلف کے سائے بھی تھے گھنے، پھر یہی سائے دیوار بنتے گئے

لاکھ آوارہ و آبلہ پا سہی، منزلیں تو ہیں قدموں سے لپٹی ہوئی
وہ ہمیں ہیں کہ جب دھن سمائی کبھی، برق پا، نور رفتار بنتے گئے

اوّل اوّل تھیں راہیں بڑی پُرخطر، کون تھا جز غمِ دل شریکِ سفر
پھر جو پڑنے لگی منزلوں پر نظر، دوست دشمن سبھی یار بنتے گئے

ہم بھی ٹھہرے مجیبؔ ایک شوریدہ سر، جب نہ پایا کوئی قدردانِ ہنر
آپ اپنے جنوں کے ثناخواں ہوئے، آپ اپنے پرستار بنتے گئے

مجیب خیر آبادی



سورج کی سنہری کرنوں سے تابندہ رخِ عالم نہ سہی
آثارِ سحر تو پیدا ہیں، کم ظلمتِ شامِ غم نہ سہی

آدابِ چمن سے ناواقف زنجیر بپا دیوانوں کو
تعمیرِ چمن کی فکر تو ہے، تخریبِ چمن کا غم نہ سہی

ہاں یاد ہمیں بھی کر لینا آسائشِ منزل سے پہلے
اے قافلے والو غم نہ کرو، اے منزلِ جاناں، ہم نہ سہی

انجامِ سفر کیا ہونا ہے، یہ فیصلہ مستقبل دے گا
میدانوں پہ وحشت آج بھی ہے، راہوں کے وہ پیچ وخم نہ سہی

مایوس مجیبؔ اتنا بھی نہ ہو، لغزش تو گناہِ آدم ہے
منزل کی طلب تو محکم ہے، ادراکِ سفر محکم نہ سہی



کتنے خواب ٹوٹے ہیں، کتنے چاند گہنائے
جو رقیبِ ظلمت ہو، اب وہ آفتاب آئے

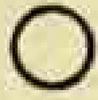
دشمنوں کو اپنایا، دوستوں کے غم کھائے
پھر بھی اجنبی ٹھہرے، پھر بھی غیر کہلائے

ناخدا کی نیت کا کھل گیا بھرم تو کیا
بات جب ہے کشتی بھی ڈوبنے سے بچ جائے

حادثے بھی برسیں گے، زلزلے بھی آئیں گے
یہ سفر قیامت ہے، تم کہاں چلے آئے

پھول پھول برہم ہے، خار خار دشمن ہے
ہم مجیبؔ گلشن سے لو لگا کے پچھتائے

مجیب خیرآبادی



مرے ساقیو، مرے ہمدمو، یہ بجا کہ تیز خرام ہوں
مرے ساتھ ساتھ چلے چلو میں نئی سحر کا پیام ہوں

مرے نقشِ پا نہ مٹے اگر تو چمک اٹھیں گے یہ راستے
مرے قافلے کو خبر کرو، میں حریفِ ظلمتِ شام ہوں

وہی روز و شب، وہی ظلمتیں، وہی مرحلے، وہی گردشیں
جو کبھی تمام نہ ہو سکے، وہ حدیثِ نیم تمام ہوں

کہیں صبح ہے، کہیں شام ہے، مجھے خود بھی اپنا پتہ نہیں
مرا کیا سراغ ملے تمھیں، ابھی بے دیار و قیام ہوں

دلِ دردمند کو آج بھی ہے مجیبؔ حسرتِ رازداں
میں وہ ایک نغمۂ آرزو کہ خود اپنے لب پہ حرام ہوں



اپنوں کا یہ عالم کیا کہئے، ملتے ہیں تو بیگانوں کی طرح
اس دور میں دل بے قیمت ہیں، ٹوٹے ہوئے پیمانوں کی طرح

پروانے تو جل بجھتے ہیں مگر دل ہیں کہ سلگتے رہتے ہیں
آساں تو نہیں جیتے رہنا، ہم ایسے گراں جانوں کی طرح

یا شمع کی لو ہی مدھم ہے، یا سرد ہے دل کی آگ ابھی
سوچا تھا کہ اڑ کر پہنچیں گے اس بزم میں، پروانوں کی طرح

تنکوں کے سفینے لے لے کر کیا کیا نہ مقابل آئی خرد
ہم اہلِ جنوں رقصاں ہی رہے بپھرے ہوئے طوفانوں کی طرح

یا کون و مکاں میں خوار ہوئے، یا کون و مکاں کی خبر نہیں
جینا ہے تو انسانوں کی طرح، مرنا ہے تو انسانوں کی طرح

اقبال عظیم



یہ نگاہِ شرم جھکی جھکی، یہ جبینِ ناز دھواں دھواں
مرے بس کی اب نہیں داستاں، مرا کانپتا ہے رواں رواں

یہ تخیلات کی زندگی، یہ تصورات کی بندگی
فقط اک فریبِ خیال پر مری زندگی ہے رواں دواں

مرے دل پہ نقش ہیں آج تک وہ باحتیاط نوازشیں
وہ غرور و ضبط عیاں عیاں، وہ خلوص و ربط نہاں نہاں

نہ سفر بشرطِ مآل ہے نہ طلب بقیدِ سوال ہے
فقط ایک سیریِ ذوق کو میں بھٹک رہا ہوں کہاں کہاں

ہو طلسمِ عالمِ رنگ و بو کہ حریمِ انجم و کہکشاں
مرا ساتھ دے گی نظر مری، وہ چھپیں گے جا کے جہاں جہاں

مری خلوتوں کی یہ جنتیں کئی بار سج کے اجڑ گئیں
مجھے بار ہا یہ ہوا گماں کہ تم آ رہے ہو کشاں کشاں

اقبال عظیم



ہر چند گام گام حوادث سفر میں ہیں
وہ خوش نصیب ہیں جو تری رہگذر میں ہیں

تاکیدِ ضبط، عہدِ وفا، اذنِ زندگی
کتنے پیام اک نگہِ مختصر میں ہیں

ماضی شریکِ حال ہے کوشش کے باوجود
دھندلے سے کچھ نقوش ابھی تک نظر میں ہیں

للہ اس خلوص سے پرسش نہ کیجئے
طوفاں کئے ہوئے بند مری چشمِ تر میں ہیں

منزل تو خوش نصیبوں میں تقسیم ہو چکی
کچھ خوش خیال لوگ ابھی تک سفر میں ہیں

محفل میں ان کی سمت نگاہیں نہ اُٹھ سکیں
ہم بالخصوص اہلِ نظر کی نظر میں ہیں

یہ کیسے راہرو تھے کہ ہر نقشِ پا کے ساتھ
سجدوں کے کچھ نشان بھی اس رہگذر میں ہیں

اقبال عظیم



خود فریبی کو بسمت ہے، آرزو کہتے ہیں لوگ
شوقِ گمراہی کو ذوقِ جستجو کہتے ہیں لوگ

دیدہ و دانستہ دیتے ہیں نگاہوں کو فریب
پھول کے چاکِ جگر کو رنگ و بو کہتے ہیں لوگ

ایک ہم کیا، آپ کی چشمِ کرم کی داستان
دربدر، قریہ بہ قریہ، کُو بکُو کہتے ہیں لوگ

زخمِ دل پر ڈال دیتے ہیں مقدر کی نقاب
چاکِ پیراہن کو اعجازِ رفو کہتے ہیں لوگ

کوئی چُپ رہ کر بھی کب محفوظ ہے تنقید سے
میری خاموشی کو بھی اب گفتگو کہتے ہیں لوگ

اِس دیارِ اجنبی میں لٹ چکی مدت ہوئی
جس کو خوش فہمی سے اب تک آبرو کہتے ہیں لوگ

اِس بیانِ حال سے اقبالؔ اب حاصل بھی کیا
چارہ سازی کے عوض لاتقنطوا کہتے ہیں لوگ



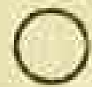
اب اسے کیا کرے کوئی، آنکھوں میں روشنی نہیں
شہر بھی اجنبی نہیں، لوگ بھی اجنبی نہیں

ہم نے یہ سوچ کر کبھی جرأتِ عرض کی نہیں
شکوہ بصد خلوص بھی، شیوۂ دوستی نہیں

یوں تو بڑے خلوص سے لوگ ہوئے ہیں ہم سفر
راہ میں ساتھ چھوڑ دیں، ان سے بعید بھی نہیں

پرسشِ حال کے سوا کوئی کرے بھی کیا مگر
پرسشِ حال، دوستو! طنز ہے دوستی نہیں

بیتے ہوئے خوشی کے دن، بھولی ہوئی کہانیاں
آپکو یاد ہوں تو ہوں، ہم کو تو یاد بھی نہیں



جس انجمن میں دیکھو، بیگانے رہ گئے ہیں
گنتی کے لوگ جانے پہچانے رہ گئے ہیں

کل جن حقیقتوں سے ماحول معتبر تھا
آج ان حقیقتوں کے افسانے رہ گئے ہیں

اب غارتِ چمن میں کیا رہ گیا ہے باقی
کچھ پیرہن دریدہ دیوانے رہ گئے ہیں

تاریخِ عہدِ رفتہ بالاختصار یہ ہے
گلشن جہاں جہاں تھے، ویرانے رہ گئے ہیں

اقبالؔ ڈھونڈتے ہو تم جن کو محفلوں میں
ان کی جگہ اب ان کے افسانے رہ گئے ہیں



اللہ رے یادوں کی یہ انجمن آرائی
بنتے ہوئے غم خانے، بجھتی ہوئی تنہائی

کچھ تلخ حقائق نے معمول بدل ڈالے
اپنوں سے کم آمیزی، غیروں سے شناسائی

یہ کون سا عالم ہے افسردہ مزاجی کا
گلشن میں بھی ویرانی، محفل میں بھی تنہائی

اقبالؔ جدھر دیکھو ظلمات کے پہرے ہیں
آساں طلبی ہم کو کس موڑ پہ لے آئی

اختر لکھنوی



ہشیار کر رہا ہے گجر، جاگتے رہو
اے صاحبانِ فکر و نظر، جاگتے رہو

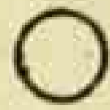
دشتِ شبِ سیاہ میں سنتے ہیں، شب پرست
روکیں گے کاروانِ سحر، جاگتے رہو

ظلمت کہیں نہ کر دے اُجالے کو داغدار
لے کر چراغِ دیدۂ تر، جاگتے رہو

سوئے نہیں کہ ڈوب گئی نبضِ کائنات
بوجھل ہو لاکھ آنکھ، مگر جاگتے رہو

خوابیدہ اپنے چاہنے والوں کو دیکھ کر
ممکن ہے لوٹ جائے سحر، جاگتے رہو

اختر لکھنوی



رونق ہی نہیں، اس کی ہم روحِ رواں بھی ہیں
لیکن ہمیں دنیا کی خاطر پہ گراں بھی ہیں

اک تیرے ہی کوچے پر موقوف نہیں ہے کچھ
ہر گام ہیں تعزیریں، ہم لوگ جہاں بھی ہیں

گلچیں کو نہیں شاید اس راز سے آگاہی
شبنم میں نہائے گل، شعلوں کی زباں بھی ہیں

کھاتے تھے قسم جن کے کردار و عمل کی ہم
شاملِ صفِ اعداء میں وہ ہمنفساں بھی ہیں

سچ کہتے ہو ہم ایسے ذروں کی حقیقت کیا
اب کون کہے تم سے، ہم سنگِ گراں بھی ہیں



اب درد کا سورج کبھی ڈھلتا ہی نہیں ہے
اب دل، کوئی پہلو ہو، سنبھلتا ہی نہیں ہے

بے چین کئے رہتی ہے جس کی طلبِ دید
اب بام پہ وہ چاند نکلتا ہی نہیں ہے

اک عمر سے دنیا کا ہے بس ایک ہی عالم
یہ کیا کہ فلک رنگ بدلتا ہی نہیں ہے

ناکام رہا ان کی نگاہوں کا فسوں بھی
اس وقت تو جادو کوئی چلتا ہی نہیں ہے

جذبے کی کڑی دھوپ ہو تو کیا نہیں ممکن
یہ کس نے کہا، سنگ پگھلتا ہی نہیں ہے

اختر لکھنوی



دیکھو اس نے قدم قدم پر ساتھ دیا بیگانے کا
اختر جس نے عہد کیا تھا تم سے ساتھ نبھانے کا

آج ہمارے قدموں میں ہے کہکشاں، شہرِ مہتاب
کل تک لوگ کہا کرتے تھے خواب اسے دیوانے کا

تیرے لب و رخسار کے قصے، تیرے قد و گیسو کی بات
ساماں ہم بھی رکھتے ہیں تنہائی میں دل بہلانے کا

تم بھی سنتے تو رو دیتے، ہم بھی کہتے تو روتے
جان کے ہم نے چھوڑ دیا ہے اک حصہ افسانے کا

کچھ تو ہے جو اپنایا ہے ہم نے کوئے ملامت کو
ویسے اور طریقہ بھی تھا اختر دل بہلانے کا



سوئے مقتل، کوئی دم، ساتھ چلے
جس کو رکھنا ہو بھرم، ساتھ چلے

اسی حسرت میں کٹی راہِ حیات
کوئی دو چار قدم، ساتھ چلے

خارزاروں میں جہاں کوئی نہ تھا
بن کے ہم دم ترے غم ساتھ چلے

ہم سے رندوں کا ٹھکانا کیا ہے
تم کہاں شیخِ حرم، ساتھ چلے

وادیِ شب کی کٹھن راہوں میں
لوگ کترا گئے، کم ساتھ چلے

بشیر منذر



زخم کھا کے خنداں ہیں پیرہن دریدہ ہم
زندگی کا نوحہ ہم، وقت کا قصیدہ ہم

جانے طبع کے ہاتھوں کون گھاٹ اتریں گے
شہر سے گریزاں ہم، دشت سے رمیدہ ہم

زندگی کی آنکھوں میں رات دن کھٹکتے ہیں
خس جو ہیں تو لاثانی، خار ہیں تو چیدہ ہم

برگ برگ تازہ ہے، زخم زخم رستا ہے
موسمِ بہاراں میں شاخِ نو بریدہ ہم

بزمِ رنگ و نغمہ میں کون ملتفت ہو گا
آہِ ناکشیدہ ہم، حرفِ ناشنیدہ ہم

بشیر منذر



اچھے، کبھی بُرے ہیں حالات آدمی کے
پیچھے لگے ہوئے ہیں دن رات آدمی کے

رخصت ہوئے تو جانا سب کام تھے ادھورے
کیا کیا کریں جہاں میں دو ہات آدمی کے

مٹی سے وہ اٹھا ہے، مٹی میں جا ملے گا
اڑتے پھریں گے اک دن ذرات آدمی کے

اک آگ حسرتوں کی، سوچوں کا اک سمندر
کیا کیا وبال یارب! ہیں ساتھ آدمی کے

اس دورِ ارتقا میں منذرؔ! قدم قدم پر
پامال ہو رہے ہیں جذبات آدمی کے



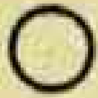
ہم بیابانوں میں گھومے، شہر کی سڑکوں پہ ٹہلے
دل کسی صورت تو سنبھلے، دل کسی صورت تو بہلے

زندگی کے راستے میں دو گھڑی کا ساتھ ہے یہ
اپنے من کی میں بھی کہہ لوں، اپنے من کی تو بھی کہہ لے

گویا زندہ رہنا بھی اک جرم تیرے شہر میں تھا
ہم ہر اک آہٹ پہ لرزے، ہم ہر اک دھڑکن پہ دہلے

اب تو تا حدِ نظر ویرانیاں پھیلی ہوئی ہیں
گھر کا یہ بے در خرابہ کتنا تھا آباد پہلے

وقت ایسا آگیا ہے، خامشی بہتر ہے منذرؔ
بات جو کہتا ہے سُن لے، چوٹ جو لگتی ہے سہہ لے



ہو گیا چاند نگر، سوچتے ہیں
ہم بعنوانِ دگر سوچتے ہیں

اپنا ظاہر میں کوئی جرم نہ تھا
کیوں ہوئے شہر بدر، سوچتے ہیں

شاخ در شاخ ہیں گم صم طائر
سر کو نہوڑائے شجر سوچتے ہیں

کوئی بتلائے، یہ کیا وادی ہے
دم بخود کوہ، حجر سوچتے ہیں

جانے کیوں مجھ سے بچھڑ کر منذرؔ
وہ بھی مانندِ بشر سوچتے ہیں

بشیر منذر



ہر روز ہی دن بھر کے جھمیلوں سے نمٹ کے
رو لیتے ہیں ہم رات کے آنچل سے لپٹ کے

ہم کون ہیں، کیوں بیٹھے ہیں یوں راہگذر پر
پوچھا نہ کسی اک بھی مسافر نے پلٹ کے

کیا کیا تھے مرے دل کے صحیفے میں مضامیں
دیکھے نہ کسی نے مرے اوراق الٹ کے

پھرتے رہے آوارہ خیالات کی صورت
کیا چیز تھی، ہم جس کے لیے دہر میں بھٹکے

شب کروٹیں لیتے تو نہ گذرے کبھی منذر
سو جاؤ میاں، درد کی باہوں میں سمٹ کے



دم بخود ہے چاندنی، چپ چاپ ہیں اشجار بھی
آج کی شب تھم گئی کیوں وقت کی رفتار بھی

زیست کی ناؤ نہ جانے کس کنارے جا لگے
ملگجی سی دھند ہے اِس پار بھی، اُس پار بھی

دل کی باتیں کہنے والے! اور آہستہ ذرا
گوش بر آواز ہے کوئی پسِ دیوار بھی

آنسوؤں کا ابر وہ برسا کہ سب کچھ بہہ گیا
حسرتوں کے شہر بھی، زخموں کے لالہ زار بھی

بشیر منذر



مثلِ نمرود ہر اک شخص خدائی مانگے
دل وہ پاگل ہے کہ خلقت کی بھلائی مانگے

ہم ہیں مجرم تو عدالت میں بلایا ہوتا
بول سکتے ہیں اگر کوئی صفائی مانگے

کتنی سرکش ہے تمنا کہ حضوری چاہے
کتنا بے باک ہے نالہ کہ رسائی مانگے

شوق چاہے کہ ابھی اور بگولے اٹھیں
وسعتِ دشت مری آبلہ پائی مانگے

کوئی تمکیں، کوئی تسکیں، کوئی تحسیں چاہے
ایک منذر ہے کہ آشفتہ نوائی مانگے



حیراں ہے زمانے میں کسے اپنا کہے دل
چہرے تو ہیں گلرنگ مگر کھوٹ بھرے دل

کس سمت لیے جاتا ہے یہ دورِ ترقی
دھاتوں کے ہوئے جسم تو پتھر کے بنے دل

غنچہ ہے تو چٹکے، وہ ستارا ہے تو چمکے
بیتاب ہے سینے میں دھڑکنے کے لیے دل

ویراں کدۂ دہر میں کیا رکھا ہے منذر
کچھ درد کے افسانے تو کچھ ٹوٹے ہوئے دل

عبداللہ جاوید

روح کو قالب کے اندر جاننا مشکل ہوا
لفظ میں احساس کو پہچاننا مشکل ہوا

لے اُڑی پتے ہوا تو شاخِ گُل بے بس ہوئی
پھول پر سائے کی چادر تاننا مشکل ہوا

اپنے خلوت خانۂ دل سے جو نکلے تو ہمیں
سب کے غم میں اپنا غم بھی جاننا مشکل ہوا

وقت نے جب آئینہ ہم کو دکھایا، رو پڑے
اپنی صورت آپ ہی پہچاننا مشکل ہوا

اس مشینی عہد میں کیا ذات، کیا عرفانِ ذات
آدمی کو آدمی گرداننا مشکل ہوا

جستجوئے لعل و گوہر سے بھی باز آئے وہ لوگ
خرمنِ خاشاک جن سے چھاننا مشکل ہوا

دل نہ چھوٹا کیجیے ناقدریٔ احباب پر
عیب جویوں کو ہُنر پہچاننا مشکل ہوا

کیا کریں جاوید اس بہروپیوں کے دَور میں
گل کو گل کانٹے کو کانٹا ماننا مشکل ہوا

عبداللہ جاوید

اِک سیلِ بے پناہ کی صورت رواں ہے وقت
تنکے سمجھ رہے ہیں کہ وہم وگماں ہے وقت

پرکھو تو جیسے تیغ دو دم ہے کھنچی ہوئی
ٹالو تو ایک اڑتا ہوا سا دھواں ہے وقت

جو دل ہدف ہوا ہو وہ شائد بتا سکے
ناوک بھی آپ، آپ ہی چڑھتی کماں ہے وقت

ہم اس کے ساتھ ہیں کہ وہ ہے اپنے ساتھ ساتھ
کس کو خبر کہ ہم ہیں رواں یا رواں ہے وقت

تاریخ کیا ہے، وقت کے قدموں کی گرد ہے
قوموں کے اوج وپست کی اک داستاں ہے وقت

اگلے سخنوروں نے جسے آسماں کہا
سچ پوچھئے تو آج وہی آسماں ہے وقت

ہمدم نہیں، رفیق نہیں، ہم نوا نہیں
لیکن ہمارا سب سے بڑا رازداں ہے وقت

کُل کائنات اپنے جلو میں لئے ہوئے
جاویدؔ ہست و بود کا اک کارواں ہے وقت



چمکا جو چاند رات کا چہرہ نکھر گیا
ماتھے کا نور بھی تو بڑا کام کر گیا

یہ بھی بہت ہے سینکڑوں پودے ہرے ہوئے
کیا غم جو بارشوں میں کوئی پھول مر گیا

ساحل پہ لوگ یونہی کھڑے دیکھتے رہے
دریا میں ہم جو اترے تو دریا اتر گیا۔

سایہ بھی آپ کا ہے فقط روشنی کے ساتھ
ڈھونڈو گے تیرگی میں کہ سایہ کدھر گیا

ہم جس کے انتظار میں جاگے تمام رات
آیا بھی وہ تو خواب کی صورت گزر گیا

ہم نے تو گل کی، چاند کی، تارے کی بات کی
سب اہلِ انجمن کا گماں آپ پہ گیا

گھر ہی نہیں رہا ہے سلامت، تباہ کیا
غالبؔ کے بعد سیلِ بلا کس کے گھر گیا



میں تیری ہی آواز ہوں اور گونج رہا ہوں
اے دوست، مجھے سن کہ میں گنبد کی صدا ہوں

جس راہ سے پہلے کوئی ہو کر نہیں گزرا
اس راہ پہ میں نقشِ قدم چھوڑ رہا ہوں

میں اپنے اصولوں کا گراں بار اٹھائے
ہر وقت ہواؤں کے مخالف ہی چلا ہوں

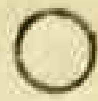
بے مایہ حباب ہوں، مجھے دیکھو کہ عدم سے
میں سوئے ابد سیل کی صورت میں بہا ہوں

ہر عصر کی تخلیق میں کچھ ہاتھ ہے میرا
میں وقت کے زنداں میں بھی آزاد رہا ہوں

صدیوں سے میں اپنے کو بنانے میں ہوں مصروف
بندہ ہوں مگر غور سے دیکھو تو خدا ہوں

حالات کی گردش سے ہراساں نہیں جاویدؔ
میں گردشِ افلاک کی گودی میں پلا ہوں

عبداللہ جاوید



ہر لمحہ مرگ و زیست میں پیکار دیکھنا
کھینچی ہوئی ہے وقت نے تلوار دیکھنا

اس دوپہر کی دھوپ میں سایہ کہاں ملے
دن ڈھل چلے تو پھر کہیں دیوار دیکھنا

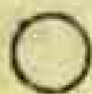
اب تو سفر کے سخت مراحل ہیں اور ہم
جب پاس آئے منزلِ دلدار، دیکھنا

بے تابیاں ہوں لاکھ مگر اس کے روبرو
چھوڑیں نہ ہاتھ دامنِ پندار، دیکھنا

اے مصلحت کی پست زمینوں کے باسیو!
کتنی بلندیاں ہیں سرِ دار، دیکھنا

ذرہ بھی آفتاب سے کم تر نہیں یہاں
یارو مگر بہ دیدۂ بیدار دیکھنا

جاویدؔ ہم ہیں اور ہے احساس کا خلوص
یاروں کے پاس جھوٹ کے طومار دیکھنا



ہم کیا کہیں کہ آبلہ پائی سے کیا ملا
دنیا ملی کسی کو، کسی کو خدا ملا

ہم خود کو دیکھنے کے تو لائق نہ تھے مگر
ہر آئینہ ہماری طرف دیکھتا ملا

ایسا تھا کون روح کے اندر جو دیکھتا
ہر سطح بیں وگرنہ ہمیں جانچتا ملا

انساں اور وقت میں کب دوستی رہی
ہر لمحہ آدمی کا لہو چاٹتا ملا

انساں سمجھ کے ہم نے اسے دل میں رکھ لیا
انساں کے روپ میں مگر اک دیوتا ملا

دلدار بھی ملے ہمیں پر اس کو کیا کریں
کوئی خیال سا تو کوئی خواب سا ملا

عبداللہ جاوید



ننگے پاؤں کی آہٹ تھی یا نرم ہوا کا جھونکا تھا
پچھلے پہر کے سناٹے میں دل دیوانہ چونکا تھا

پانچوں حواس کی بزم سجا کر اسکی یاد میں بیٹھے تھے
ہم سے پوچھو شب جدائی کب کب پتّا کھڑکا تھا

اور بھی تھے اس کی محفل میں باتیں سب سے ہوتی تھیں
سب کی آنکھ بچا کر اس نے ہم کو تنہا دیکھا تھا

دنیا تو دنیا ہی ٹھہری رنگ بدلتی رہتی ہے
دکھ تو یہ ہے دھیان کسی کا گھٹتا بڑھتا سایا تھا

کیسا شکوہ کیسی شکایت، دل میں یہی سوچا جاوید
تم ہی گئے تھے اس کی گلی میں، وہ کب تم تک آیا تھا



چاندنی رات میں ہر درد سنور جاتا ہے
جانے کیا کیا سرِ احساس بکھر جاتا ہے

دیکھتے ہم بھی ہیں کچھ خواب مگر ہائے رے دل
ہر نئے خواب کی تعبیر سے ڈر جاتا ہے

موت کا وقت معین ہے تو پھر بات ہے کیا
کون ہے مجھ میں جو ہر سانس پہ مر جاتا ہے

دل میں گڑ جاتی ہے جب ساعتِ ماضی کی صلیب
وقت رک جاتا ہے انسان گزر جاتا ہے

حفیظ تائب



پتھر میں فن کے پھُول کھلا کر چلا گیا
کیسے امٹ نقوش کوئی چھوڑتا گیا

سمٹا ترا خیال تو گلرنگ اشک تھا
پھیلا تو مثلِ دشتِ وفا پھیلتا گیا

سوچوں کی گونج تھی کہ قیامت کی گونج تھی
تیرا سکوت حشر کے منظر دکھا گیا

یا تیری آرزو مجھے لے آئی اس طرف
یا میرا شوق راہ میں صحرا بچھا گیا

وہ جس کو بھولنے کا تصوّر محال تھا
وہ عہد رفتہ رفتہ مجھے بھُولتا گیا

جب اُس کو پاسِ خاطرِ آزردگاں نہیں
مڑ مڑ کے کیوں وہ دُور تلک دیکھتا گیا

حفیظ تائب



اک درد سا پہلو میں مچلتا ہے سرِ شام
آکاش پہ جب چاند نکلتا ہے سرِ شام

بے نام سی اک آگ دہک اٹھتی ہے دل میں
مہتاب جو ٹھنڈک سی اگلتا ہے سرِ شام

یہ دل ہے مرا یا کسی کٹیا کا دیا ہے
بجھتا ہے دمِ صبح تو جلتا ہے سرِ شام

کچھ دیر شفق پھولتی ہے جیسے افق پر
ایسے ہی مرا حال سنبھلتا ہے سرِ شام

بنتا ہے ترا جسم کبھی گُل، کبھی شعلہ
سانچے میں خیالوں کے جو ڈھلتا ہے سرِ شام

چھٹ جاتی ہے آلامِ زمانہ کی سیاہی
جب دُور تری یاد کا چلتا ہے سرِ شام

میں دُور بہت دُور پہنچ جاتا ہوں تائب
رُخ سوچ کا دھارا جو بدلتا ہے سرِ شام

حفیظ تائب



شرر افشاں وہ شررِ خُو بھی نہیں
کوئی تارا، کوئی جگنو بھی نہیں

جانے طے منزلِ شب ہو کیسے
دُور تک نور کی خوشبو بھی نہیں

ہم سا بے مایہ کوئی کیا ہوگا
اپنی آنکھوں میں تو آنسو بھی نہیں

جس بیاباں میں جنوں لایا ہے
اِس میں تو یاد کے آہو بھی نہیں

جانے اس ضد کا نتیجہ کیا ہو
مانتا دل بھی نہیں، تُو بھی نہیں



وہ جو تیری طلب میں ایذا تھی
میرے ہر درد کا مداوا تھی

مَیں تماشا تھا اِک جہاں کے لیے
اِس پہ بھی حسرتِ تماشا تھی

لاکھ راہیں تھیں وحشتوں کے لیے
کِس لیے بند راہِ صحرا تھی

میری رُسوائی تھی مری توقیر
میری تنہائی تھی مری ساتھی

تج کے دُنیا کو جب چلے تائبؔ
ساتھ اک آرزو کی دُنیا تھی

حفیظ تائب



اِک نیا کرب مرے دل میں جنم لیتا ہے
قافلہ درد کا کچھ دیر جو دم لیتا ہے

رنگ پاتا ہے مرے خونِ جگر سے گلِ شعر
سبزۂ فکر مری آنکھ سے نم لیتا ہے

آبرو حق و صداقت کی بڑھا دیتا ہے
جب بھی سقراط کوئی ساغرِ سم لیتا ہے

رات کے سائے میں شبنم کے گہر ڈھلتے ہیں
رات کی کوکھ سے خورشید جنم لیتا ہے

ذہن بے نام دھندلکوں میں بھٹک جاتا ہے
آج فنکار جو ہاتھوں میں قلم لیتا ہے

جس کو ہو دولتِ احساس میسر تائب
چین وہ کارگہِ زیست میں کم لیتا ہے



لفظ سے جب نہ اُٹھا بارِ خیال
کیسے کیسے کیا اظہارِ خیال

دل میں جب درد کی قندیل جلی
تمتمانے لگے رخسارِ خیال

رُوح کے زخم نہ مُرجھائیں کبھی
تا ابد مہکے چمن زارِ خیال

غم پہ موقوف ہے تاثیرِ بیاں
غم سے ہے رونقِ بازارِ خیال

راکبِ فہم ہے بے بس تائب
اور منہ زور ہے رہوارِ خیال

احمد ندیم قاسمی



احساس میں پھول کھل رہے ہیں
پت جھڑ کے عجیب سلسلے ہیں

کچھ اتنی شدید تیرگی ہے
آنکھوں میں ستارے تیرتے ہیں

دیکھیں، تو ہوا جمی ہوئی ہے
سوچیں، تو درخت جھومتے ہیں

سقراط نے زہر پی لیا تھا
ہم نے جینے کے دکھ سہے ہیں

ہم تجھ سے بگڑ کے جب بھی اُٹھے
پھر تیرے حضور آ گئے ہیں

ہم عکس ہیں ایک دوسرے کا
چہرے یہ نہیں ہیں، آئنے ہیں

لمحوں کا غبار چھا رہا ہے
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

سورج نے گھنے صنوبروں میں
جالے سے شعاعوں کے بُنے ہیں

یکساں ہیں فراق و وصل دونوں
یہ مرحلے، ایک سے کڑے ہیں

پا کر بھی تو نیند اُڑ گئی تھی
کھو کر بھی تو رت جگے ملے ہیں

جو دن تری یاد میں کٹے تھے
ماضی کے کھنڈر بنے کھڑے ہیں

جب، تیرا جمال ڈھونڈتے تھے
اب، تیرا خیال ڈھونڈتے ہیں

ہم دل کے گداز سے ہیں مجبور
جب خوش بھی ہوئے تو رو دئیے ہیں

ہم زندہ ہیں، اے فراق کی رات!
پیاری، ترے بال کیوں کھلے ہیں!

احمد ندیم قاسمی



مروں، تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیمؔ، کاش یہی ایک کام کر جاؤں

یہ دشتِ ترکِ محبت، یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تری یاد سے گزر جاؤں

مرا وجود، مری روح کو پکارتا ہے!
تری طرف بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں

ترے جمال کا پرتو ہے سب حسینوں پر
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈوں، کدھر کدھر جاؤں

میں زندہ تھا کہ ترا انتظار ختم نہ ہو
جو تُو ملا ہے تو اب سوچتا ہوں، مر جاؤں

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے گھر جاؤں

یہ سوچتا ہوں کہ میں بُت پرست کیوں نہ ہُوا
تجھے قریب جو پاؤں تو خود سے ڈر جاؤں

کسی چمن میں بس اس خوف سے گزر نہ ہُوا
کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اُتر جاؤں



عمر بھر اُس نے اسی طرح لبھایا ہے مجھے
وہ جو اس دشت کے اُس پار سے لایا ہے مجھے
کتنے آئینوں میں اک عکس دکھایا ہے مجھے
زندگی نے جو اکیلا کبھی پایا ہے مجھے
تُو مرا کفر بھی ہے، تُو مرا ایمان بھی ہے
تُو نے لوٹا ہے مجھے، تُو نے بسایا ہے مجھے
میں تجھے یاد بھی کرتا ہوں تو جل اٹھتا ہوں
تو نے کس درد کے صحرا میں گنوایا ہے مجھے
تو وہ موتی کہ سمندر میں بھی شعلہ زن تھا
میں وہ آنسو کہ سرِ خاک گرایا ہے مجھے
اتنی خاموش ہے شب، لوگ ڈرے جاتے ہیں
اور میں سوچتا ہوں، کس نے بلایا ہے مجھے
میری پہچان تو مشکل تھی، مگر یاروں نے
زخم اپنے جو کریدے ہیں تو پایا ہے مجھے
واعظِ شہر کے نعروں سے تو کیا کھلتی آنکھ
خود مرے خواب کی ہیبت نے جگایا ہے مجھے
اے خدا، اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے



وہ کوئی اور نہ تھا، چند خشک پتے تھے
شجر سے ٹوٹ کے جو فصلِ گل پہ روئے تھے
ابھی ابھی تمہیں سوچا تو کچھ نہ یاد آیا
ابھی ابھی تو ہم اک دوسرے سے بچھڑے تھے
تمہارے بعد چمن پر جب اک نظر ڈالی
کلی کلی میں خزاں کے چراغ جلتے تھے
تمام عمر وفا کے گناہگار رہے
یہ اور بات کہ ہم آدمی تو اچھے تھے
شبِ خموش کو تنہائی نے زباں دے دی
پہاڑ گونجتے تھے، دشت سنسناتے تھے
وہ ایک بار مرے، جن کو تھا حیات سے پیار
جو زندگی سے گریزاں تھے، روز مرتے تھے
نئے خیال اب آتے ہیں ڈھل کے آہن میں
ہمارے دل میں کبھی کھیت لہلہاتے تھے
یہ ارتقا کا چلن ہے کہ ہر زمانے میں
پرانے لوگ، نئے آدمی سے ڈرتے تھے
ندیم، جو بھی ملاقات تھی، ادھوری تھی
کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے

احمد ندیم قاسمی



میں ہوں یا تو ہے، خود اپنے سے گریزاں جیسے
مرے آگے کوئی سایہ ہے خراماں جیسے

تجھ سے پہلے تو بہاروں کا یہ انداز نہ تھا
پھول یوں کھلتے ہیں، جلتا ہو گلستاں جیسے

یوں تری یاد سے ہوتا ہے اجالا دل میں
چاندنی میں چمک اٹھتا ہے بیاباں جیسے

دل میں روشن ہیں ابھی تک ترے وعدوں کا چراغ
ٹوٹتی رات کے تارے ہوں فروزاں جیسے

تجھے پانے کی تمنا، تجھے کھونے کا یقیں
تیرے گیسو مرے ماحول میں غلطاں جیسے

وقت بدلا پہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا
آندھیوں میں، سرِ کہسار، چراغاں جیسے

اشک آنکھوں میں چمکتے ہیں، تبسم بن کر
آ گیا ہاتھ ترا گوشۂ داماں جیسے

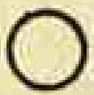
تجھ سے مل کر بھی تمنا ہے کہ تجھ سے ملتا
پیار کے بعد بھی لب رہتے ہیں لرزاں جیسے

بھری دنیا میں نظر آتا ہوں تنہا تنہا
مرغزاروں میں کوئی قریۂ ویراں جیسے

غمِ جاناں، غمِ دوراں کی طرف یوں آیا
جانبِ شہر چلے دخترِ دہقاں جیسے

عصرِ حاضر کو سناتا ہوں اس انداز میں شعر
موسمِ گل ہو مزاروں پہ گل افشاں جیسے

زخم بھرتا ہے زمانہ، مگر اس طرح ندیمؔ
سی رہا ہو کوئی پھولوں کے گریباں جیسے



لبِ خاموش سے افشا ہوگا
راز ہر رنگ میں رسوا ہوگا

دل کے صحرا میں چلی سرد ہوا
ابر گلزار پہ برسا ہوگا

تم نہیں تھے تو سرِ بامِ خیال
یاد کا کوئی ستارہ ہوگا

کس توقع پہ کسی کو دیکھیں
کوئی تم سے بھی حسیں کیا ہوگا

زینتِ حلقۂ آغوش بنو
دور بیٹھو گے تو چرچا ہوگا

ظلمتِ شب میں بھی شرماتے ہو
درد چمکے گا تو پھر کیا ہوگا

جس بھی فنکار کا شاہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہوگا

کس قدر کرب سے چٹکی ہے کلی
شاخ سے گل کوئی ٹوٹا ہوگا

عمر بھر روئے فقط اس دھن میں
رات بھیگی تو اجالا ہوگا

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

احمد ندیم قاسمی



تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں، جہاں تک دیکھوں
حسنِ یزداں سے تجھے حسنِ بتاں تک دیکھوں

تو نے یوں دیکھا ہے، جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا
میں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں

صرف اس شوق سے پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حسن، ترے حسنِ بیاں تک دیکھوں

میرے ویرانۂ جاں میں، تری یادوں کے طفیل
پھول کھلتے نظر آتے ہیں، جہاں تک دیکھوں

وقت نے ذہن میں دھندلا دئے تیرے خد و خال
یوں تو میں ٹوٹتے تاروں کا دھواں تک دیکھوں

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

اک حقیقت سہی، فردوس میں حوروں کا وجود
حسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں



سانس لینا بھی سزا لگتا ہے
اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے

کوہِ غم پر سے جو دیکھوں تو مجھے
دشت، آغوشِ فنا لگتا ہے

سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش
جو گزرتا ہے، خفا لگتا ہے

مسکراتا ہے جو اس عالم میں
بخدا، مجھ کو خدا لگتا ہے

نطق کا ساتھ نہیں دیتا ذہن
شکر کرتا ہوں، گلہ لگتا ہے

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے

اس قدر تند ہے رفتارِ حیات
وقت بھی رشتہ بپا لگتا ہے

احمد ندیم قاسمی



انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

اس حسنِ اتفاق پہ لٹ کر بھی شاد ہوں
تیری رضا جو تھی وہ تقاضا وفا کا تھا

دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی
یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا

اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں
تو سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا

چھپ چھپ کے روؤں اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے دردآشنا کا تھا

اٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر
عادی فنا کا تھا تو پجاری بقا کا تھا

ٹوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زد پڑی
اٹکا ہوا گلے میں جو تنکا صدا کا تھا

حیراں ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیم
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا



پھولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہوا دیکھوں
آنکھوں کو بجھا لوں کہ حقیقت کو بدل دوں

حق بات کہوں گا، مگر اے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو، وہی بات نہ کہہ دوں

یہ سوچ پہ خنجر سا گذر جاتا ہے دل سے
حیراں ہوں کہ سوچوں تو کس انداز میں سوچوں

آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف سے پیکر
جل جاتی ہیں پوریں جو کسی جسم کو چھو لوں

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہوئی لوحیں
بازار میں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں

سناٹے اڑا دیتے ہیں آواز کے پرزے
یاروں کو اگر دشتِ مصیبت میں پکاروں

ملتی نہیں جب موت بھی مانگے سے تو یارب
ہو اذن تو میں اپنی صلیب آپ اٹھا لوں

ناصر کاظمی



گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا، کدھر گیا وہ / عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ

بس ایک موتی سی چھب دکھا کر، بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر / ستارۂ شام بن کے آیا، برنگِ خوابِ سحر گیا وہ

خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم / وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ

نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا، نہ فرصتوں کی اداس برکھا / یونہی ذرا سی کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ

کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی، بدل چلا رنگِ آسماں بھی / جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے، جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں، گئے دنوں کو بلا رہا ہوں / جو قافلہ میرا ہمسفر تھا، مثالِ گردِ سفر گیا وہ

ہوس کی بنیاد پر نہ ٹھہرا، کسی بھی امید کا گھروندا / چلی ذرا سی ہوا مخالف، غبار بن کر بکھر گیا وہ

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی، ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے / یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں، گزر گیا میں، ٹھہر گیا وہ

وہ میکدے کو جگانے والا، وہ رات کی نیند اڑانے والا / یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا / تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ

وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس، ہم سخن ہمارا / سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا، پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

ناصر کاظمی



رہ نوردِ بیابانِ غم! صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم، صبر کر صبر کر

بے نشاں ہے سفر، رات ساری پڑی ہے مگر
آ رہی ہے صدا دم بہ دم، صبر کر صبر کر

تیری فریاد گونجے گی دھرتی سے آکاش تک
کوئی دن اور سہہ لے ستم، صبر کر صبر کر

تیرے قدموں سے جاگیں گے اُجڑے دلوں کے ختن
پا شکستہ غزالِ حرم! صبر کر صبر کر

شہر اُجڑے تو کیا، ہے کشادہ زمینِ خدا
اک نیا گھر بنائیں گے ہم، صبر کر صبر کر

بستیوں میں اندھیرا سہی، غم کا ڈیرا سہی
پھر نئی صبح لے گی جنم، صبر کر صبر کر

یہ محلاتِ شاہی تباہی کے ہیں منتظر
گرنے والے ہیں ان کے علم، صبر کر صبر کر

لہلہائیں گی پھر کھیتیاں، کارواں کارواں
کھل کے برسے گا ابرِ کرم، صبر کر صبر کر

دف بجائیں گے برگ و شجر، صف بہ صف، ہر طرف
خشک مٹی سے پھوٹے گا نم، صبر کر صبر کر

کیوں ٹپکتا ہے سر سنگ سے، جی جلا ڈھنگ سے
دل ہی بن جائے گا خود صنم، صبر کر صبر کر

پہلے کھل جائے دل کا کنول، پھر لکھیں گے غزل
کوئی دم اے صریرِ قلم! صبر کر صبر کر

درد کے تار ملنے تو دے، ہونٹ ہلنے تو دے
ساری باتیں کریں گے رقم، صبر کر صبر کر

دیکھ ناصر زمانے میں کوئی کسی کا نہیں
بھول جا اُس کے قول و قسم، صبر کر صبر کر

ناصر کاظمی



دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا، وہ شکل تو دِکھا گیا

جُدائیوں کے زخم، دردِ زندگی نے بھر دیے
اُسے بھی نیند آ گئی، مجھے بھی صبر آ گیا

وہ دوستی تو خیر اب نصیبِ دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لُطف بھی چلا گیا

پکارتی ہیں فرصتیں، کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمیں نگل گئی اُنہیں کہ آسمان کھا گیا

یہ صُبح کی سفیدیاں، یہ دوپہر کی زردیاں
میں آئینے میں ڈھونڈتا ہوں میں کہاں چلا گیا

یہ کس خوشی کی ریت پر غموں کو نیند آ گئی
وہ لہر کس طرف گئی یہ میں کہاں سما گیا

جو اور کچھ نہیں تو کوئی تازہ درد ہی ملے
میں ایک ہی طرح کی زندگی سے تنگ آ گیا

گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک
الم کشو، اُٹھو کہ آفتاب سر پہ آ گیا



ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سُنو، یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے

یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشئ آواز نما کچھ کہتی ہے

سب اپنے گھروں میں لمبی تان کے سوتے ہیں
اور دُور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے

جب رات کو تارے باری باری جاگتے ہیں
کئی ڈُوبے ہوئے تاروں کی ندا کچھ کہتی ہے

کبھی بھور بھئے، کبھی شام پڑے، کبھی رات گئے
ہر آن بدلتی رُت کی ہوا کچھ کہتی ہے

مہمان ہیں ہم، مہمان سرا ہے یہ نگری!
مہمانوں کو مہمان سرا کچھ کہتی ہے

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو،
اے ہمسفرو! آوازِ درا کچھ کہتی ہے

ناصرؔ آشوبِ زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلقِ خدا کچھ کہتی ہے

ناصر کاظمی



دفعتاً دل میں کسی یاد نے لی انگڑائی
اس خرابے میں یہ دیوار کہاں سے آئی

آج کھلنے ہی کو تھا دردِ محبت کا بھرم
وہ تو کہیے کہ اچانک ہی تری یاد آئی

بس یونہی دل کو توقع سی ہے تجھ سے ورنہ
جانتا ہوں کہ مقدر ہے مرا تنہائی

نشۂ تلخیٔ ایام ، اُترتا ہی نہیں ،
تیری نظروں نے گلابی تو بہت چھلکائی

یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں
پھر بھی ہر دل کے مقدر میں نہیں تنہائی

ڈوبتے چاند پہ روئی ہیں ہزاروں آنکھیں
میں تو رویا بھی نہیں، تم کو ہنسی کیوں آئی

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصر
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی



کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو !
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی،
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق ، تجھے گھر ہی لے چلیں

ناصر کاظمی

○

آرائشِ خیال بھی ہو ، دِل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی اُمید
اس رنجِ بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

یہ کیا کہ ایک طَور سے گزرے تمام عمر!
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ٹُوٹے کبھی تو خوابِ شب و روز کا طِلسم!
اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو

دیوانگیِ شوق کو یہ دُھن ہے ان دنوں!
گھر بھی ہو اور بے در و دیوار سا بھی ہو

جُز دِل کوئی مکان نہیں دہر میں جہاں
رہزن کا خوف بھی نہ رہے ، در کھُلا بھی ہو

ہر ذرّہ ایک محملِ عبرت ہے ، دشت کا
لیکن کسے دِکھاؤں ، کوئی دیکھتا بھی ہو

ہر شَے پُکارتی ہے پسِ پردۂ سکُوت!
لیکن کسے سُناؤں ، کوئی ہمنوا بھی ہو

فرصت میں سُن شگفتگیِ غنچہ کی صدا ،
یہ وُہ سخن نہیں جو کسی نے کہا بھی ہو

بیٹھا ہے ایک شخص مرے پاس دیر سے
کوئی بھلا سا ہو ، تو ہمیں دیکھتا بھی ہو

پھرتے ہیں کیسے کیسے خیالات ذہن میں
لکھوں اگر زبانِ قلم آشنا بھی ہو

بزمِ سخن بھی ہو ، سخنِ گرم کے لیے !
طاؤس بولتا ہو تو جنگل ہرا بھی ہو

○

جُرمِ اُمید کی سزا ہی دے
میرے حق میں بھی کچھ سُنا ہی دے

عشق میں ہم نہیں زیادہ طلب
جو ترا نازِ کم نگاہی دے

تُو نے تاروں سے شب کی مانگ بھری
مُجھ کو اِک اشکِ صبحگاہی دے

تُو نے بنجر زمیں کو پھُول دیے
مُجھ کو اِک زخمِ دلکُشا ہی دے

بستیوں کو دیے ہیں تُو نے چراغ
دشتِ دِل کو بھی کوئی راہی دے

عمُر بھر کی نواگری کا صِلہ
اے خُدا کوئی ہمنوا ہی دے

زرد رُو ہیں ورق خیالوں کے
اے شبِ ہجر ، کچھ سیاہی دے

گر مجالِ سخن نہیں ناصر!
لبِ خاموش سے گواہی دے



سُناتا ہے کوئی بھُولی کہانی
مہکتے میٹھے دریاؤں کا پانی

یہاں جنگل تھے آبادی سے پہلے
سُنا ہے میں نے لوگوں کی زبانی

یہاں اِک شہر تھا، شہرِ نگاراں
نہ چھوڑی وقت نے اُس کی نشانی

میں وہ دِل ہوں دبستانِ اَلَم کا
جسے رَوتی ہے برسوں شادمانی

تحیّر نے اُسے دیکھا ہے اکثر!
خِرد کہتی ہے جس کو لامکانی

خیالوں ہی میں اکثر بیٹھے بیٹھے
بَسا لیتا ہوں اِک دُنیا سُہانی

ہجومِ نشّۂ فکرِ سخن میں
بَدَل جاتے ہیں لفظوں کے معانی

بتا اے ظُلمتِ صحرائے امکاں!
کہاں ہوگا مِرے خوابوں کا ثانی

اندھیری شام کے پردوں میں چھپ کر
کِسے رَوتی ہے چشموں کی رَوانی

کرن پریاں اُترتی ہیں کہاں سے
کہاں جاتے ہیں رستے کہکشانی

پہاڑوں سے چلی پھر کوئی آندھی
اُڑے جاتے ہیں اوراقِ خزانی

نئی دُنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دَبی جاتی ہیں آوازیں پُرانی



دِل میں اِک لہر سی اُٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دِل میں
کوئی دیوار سی گِری ہے ابھی

کُچھ تو نازک مزاج ہیں ہم بھی
اور یہ چوٹ بھی نئی ہے ابھی

جی جلانے دے، ہم نفس، کہ مجھے
فُرصتِ نالۂ شبی ہے ابھی

بھری دُنیا میں جی نہیں لگتا!
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تُو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا!
ہم سُخن تیری خامشی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سوگئے لوگ اُس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھُلی ہے ابھی

تم تو یارو، ابھی سے اُٹھ بیٹھے!
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر، زندگی پڑی ہے ابھی

احمد فراز



منتظر کب سے تحیّر ہے تری تقریر کا
بات کر، تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اُڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

کیسے پایا تھا تجھے، پھر کس طرح کھویا تجھے
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا

جس طرح بادل کا سایہ پیاس بھڑکاتا رہے
میں نے یہ عالم بھی دیکھا ہے تری تصویر کا

جانے کس عالم میں تو بچھڑا کہ ہے تیرے بغیر
آج تک ہر نقش فریادی مری تحریر کا

عشق میں سر پھوڑنا بھی کیا کہ یہ بے مہر لوگ
جوئے خوں کو نام دے دیتے ہیں جوئے شیر کا

جس کو بھی چاہا اسے شدت سے چاہا ہے فراز
سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا

احمد فراز



اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سُوکھے ہوئے پھُول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غمِ دُنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تو خدا ہے، نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ مَیں، نہ وہ تُو ہے، نہ وہ ماضی ہے فرازؔ
جیسے دو شخص تمنّا کے سرابوں میں ملیں

احمد فراز



ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر! تو

بہت اداس ہے اک شخص تیرے جانے سے
جو ہو سکے تو چلا آ اسی کی خاطر تو

مری مثال کہ اک نخلِ خشکِ صحرا ہوں
ترا خیال کہ شاخِ چمن کا طائر تو

میں جانتا ہوں کہ دنیا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بظاہر تو

ہنسی خوشی سے بچھڑ جا اگر بچھڑنا ہے
یہ ہر مقام پہ کیا سوچتا ہے آخر تو

فراز تو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تو



ہر آشنا میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
کہ بے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ

پکارتے ہیں مہ و سال منزلوں کی طرح
لگا ہے توسنِ ہستی کو تازیانہ وہ

ہمیں بھی غم طلبی کا نہیں رہا یارا
ترے بھی رنگ نہیں گردشِ زمانہ! وہ

اب اپنی خواہشیں کیا کیا اسے بلاتی ہیں
یہ بات ہم نے کہی تھی مگر نہ مانا وہ

یہی کہیں گے کہ بس صورت آشنائی تھی
جو عہد ٹوٹ چکا، یاد کیا دلانا وہ

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں
نگار تھا، نظر آیا نگار خانہ وہ

بجھا دیا ہے تجھے بھی فراز دنیا نے
کہاں گیا ترا ہر وقت مسکرانا وہ

احمد فراز



نظر بجھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے
کہ اب تلک نہیں آئے ہیں لوگ جب کے گئے

کرے گا کون تری بے وفائیوں کا گلہ
یہی ہے رسمِ زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

مگر کسی نے ہمیں ہم سفر نہیں جانا
یہ اور بات کہ ہم ساتھ سب کے گئے

اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لیے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے

گرفتہ دل تھے مگر حوصلہ نہ ہارا تھا
گرفتہ دل ہیں مگر حوصلے بھی اب کے گئے

تم اپنی شمعِ تمنا کو رو رہے ہو فراز
ان آندھیوں میں تو پیارے! چراغ سب کے گئے



قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

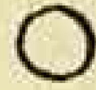
ہیں وہ محروم کہ جیسے کوئی ویرانہ ہو
تو وہ خوش فہم، خرابوں سے خزانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے، لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

زندگی! ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فراز
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

احمد فراز



رنجش ہی سہی، دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ
تُو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی، پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں! مجھ کو رلانے کے لیے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ



چلے تھے یار بڑے زعم میں ہوا کی طرح
پلٹ کے دیکھا تو بیٹھے ہیں نقشِ پا کی طرح

مجھے وفا کی طلب ہے مگر ہر اک سے نہیں
کوئی ملے مگر اس یارِ بے وفا کی طرح

مرے وجود کا صحرا ہے منتظر کب سے
کبھی تو آ جرسِ غنچہ کی صدا کی طرح

وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھیر کر آنکھیں
گزر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح

کشاں کشاں لیے جاتی ہے جانبِ منزل
نفس کی ڈور بھی زنجیرِ بے صدا کی طرح

فراز کس کے ستم کا گلہ کریں کس سے
کہ بے نیاز ہوئی خلق بھی، خدا کی طرح

احمد فراز



کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اُسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اُسے

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اُسے

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
میں کیسے بات کروں اب کہاں سے لاؤں اُسے

مگر وہ زود فراموش زود رنج بھی ہے
کہ روٹھ جائے اگر یاد کچھ دلاؤں اُسے

وہی جو دولتِ دل ہے وہی جو راحتِ جاں
تمہاری بات پہ اے ناصحو! گنواؤں اُسے!

جو ہمسفر سرِ منزل بچھڑ رہا ہے فراز
عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اُسے



خاموش ہو کیوں دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے

وحشت کا سبب روزنِ زنداں تو نہیں ہے
مہر و مہ و انجم کو بجھا کیوں نہیں دیتے

اک یہ بھی تو اندازِ علاجِ غمِ جاں ہے
اے چارہ گرو! درد بڑھا کیوں نہیں دیتے

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

رہزن ہو تو حاضر ہے متاعِ دل و جاں بھی
رہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے

سائے ہیں اگر ہم تو ہو کیوں ہم سے گریزاں
دیوار اگر ہیں تو گرا کیوں نہیں دیتے

کیا بیت گئی اب کے فراز اہلِ چمن پر
یارانِ قفس مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے

منیر نیازی

(۱)

اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

لائی ہے اب اُڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رُت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو

پھرتے ہیں مثلِ موجِ ہوا شہر شہر میں
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

شامِ الم ڈھلی تو چلی درد کی ہوا
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو

آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

منیرؔ نیازی



اُگا سبزہ در و دیوار پر آہستہ آہستہ
ہُوا خالی صداؤں سے نگر آہستہ آہستہ

گِھرا بادل خموشی سے، خزاں آثار باغوں پر
ہلے ٹھنڈی ہواؤں میں شجر آہستہ آہستہ

بہت ہی سست تھا منظر لہو کے رنگ لانے کا
نشاں آخر ہُوا یہ سُرخ تر آہستہ آہستہ

چمک زر کی اُسے آخر مکانِ خاک میں لائی
بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ

مرے باہر فصیلیں تھیں غبارِ خاک و باراں کی
ملی مجھ کو ترے غم کی خبر آہستہ آہستہ

منیرؔ اس مُلک پر آسیب کا سایا ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

منیر نیازی



غم کی بارش نے بھی تیرے نقش کو دھویا نہیں
تُو نے مجھ کو کھو دیا میں نے تجھے کھویا نہیں

نیند کا ہلکا گلابی سا خمار آنکھوں میں تھا
یوں لگا جیسے وہ شب کو دیر تک سویا نہیں

ہر طرف دیوار و در اور اُن میں آنکھوں کے ہجوم
کہہ سکے جو دل کی حالت وہ لبِ گویا نہیں

جرم آدم نے کیا اور نسلِ آدم کو سزا
کاٹتا ہوں زندگی بھر میں نے جو بویا نہیں

جانتا ہوں ایک ایسے شخص کو میں بھی منیر
غم سے پتھر ہو گیا لیکن کبھی رویا نہیں



دل جل رہا تھا غم سے مگر نغمہ گر رہا
جب تک رہا میں، ساتھ مرے یہ ہنر رہا

صبحِ سفر کی رات تھی، تارے تھے اور ہوا
سایا سا ایک، دیر تلک، بام پر رہا

میری صدا ہوا میں بہت دُور تک گئی
پر میں بُلا رہا تھا جسے، بے خبر رہا

گزری ہے کیا مزے سے خیالوں میں زندگی
دُوری کا یہ طلسم بڑا کارگر رہا

خوف آسماں کے ساتھ تھا سر پہ جھکا ہوا
کوئی ہے بھی یا نہیں ہے، یہی دل میں ڈر رہا

اس آخری نظر میں عجب درد تھا منیر
جانے کا اُس کے، رنج مجھے عمر بھر رہا

منیر نیازی



دیتی نہیں اماں جو زمیں، آسماں تو ہے
کہنے کو اپنے دل سے کوئی داستاں تو ہے

یوں تو ہے رنگ زرد مگر ہونٹ لال ہیں
صحرا کی وسعتوں میں کہیں گلستاں تو ہے

اک چیل ایک ممٹی پہ بیٹھی ہے دھوپ میں
گلیاں اُجڑ گئی ہیں مگر پاسباں تو ہے

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائگاں تو ہے

مجھ سے بہت قریب ہے تو، پھر بھی اے منیرؔ
پردہ سا کوئی میرے ترے درمیاں تو ہے



اپنی ہی تیغ ادا سے آپ گھائل ہو گیا
چاند نے پانی میں دیکھا اور پاگل ہو گیا

وہ ہوا تھی، شام ہی سے رستے خالی ہو گئے
وہ گھٹا برسی کہ سارا شہر جل تھل ہو گیا

میں اکیلا اور سفر کی شام رنگوں میں ڈھلی
پھر یہ منظر میری نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا

اب کہاں ہو گا، اگر ہو گا بھی تو ویسا کہاں
سوچ کر یہ بات، جی کچھ اور بوجھل ہو گیا

حُسن کی دہشت عجب تھی وصل کی شب میں منیرؔ
ہاتھ جیسے انتہائے شوق سے شل ہو گیا

منیر نیازی



شہر، پربت، بحر و بر کو چھوڑتا جاتا ہوں میں
اک تماشا ہو رہا ہے، دیکھتا جاتا ہوں میں

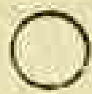
ہوش اڑتا جا رہا ہے گرمیٔ رفتار میں
دیکھتا جاتا ہوں میں اور بھولتا جاتا ہوں میں

ابر ہے افلاک پر اور اک سراسیمہ قمر
ایک دشتِ رائیگاں میں دوڑتا جاتا ہوں میں

ہوں مکاں میں بند جیسے امتحاں میں آدمی
سختیٔ دیوار و در ہے، جھیلتا جاتا ہوں میں

غم ہے میرے شعر سے اُس چشمِ سنگ آلود میں
خواب ہوں، اس چشمِ تر میں پھیلتا جاتا ہوں میں

شوق ہیں کچھ، جن کے پیچھے چل رہا ہوں میں منیرؔ
رنج ہیں کچھ دل میں میرے کھینچتا جاتا ہوں میں



مثالِ سنگ کھڑا ہے اُسی حسیں کی طرح
مکاں کی شکل بھی دیکھو دلِ مکیں کی طرح

ملائمت ہے اندھیرے میں اس کی سانسوں سے
دمک رہی ہیں وہ آنکھیں ہرے نگیں کی طرح

نواحِ قریہ ہے سنسان، شامِ سرما میں
کسی قدیم زمانے کی سرزمیں کی طرح

زمیں دُور سے تارا دکھائی دیتی ہے
رُکا ہے اُس پہ قمر چشمِ سیر بیں کی طرح

فریب دیتی ہے وسعت نظر کی، افقوں پر
ہے کوئی چیز وہاں سحرِ نیلمیں کی طرح

منیرؔ عہد ہے اب آخرِ مسافت کا
کہ چل رہی ہے ہوا، بادِ واپسیں کی طرح

منیر نیازی



چاند نکلا ہے سرِ قریۂ ظلمت، دیکھو
ہو گئی کیسی سیہ خانوں کی رنگت، دیکھو

سامنے جو ہے اُسے آنکھ کا دھوکا سمجھو
ان دیاروں کو سدا خواب کی صورت دیکھو

سیر ہے جیسے کوئی، ایسے جہاں سے گزرو
دُور تک پھیلا ہے اک عرصۂ فرقت، دیکھو

زر کی پرچھائیں جو پڑتی ہے، چمک اٹھتا ہے
آدمِ خاک کی بے ہوشی میں حالت دیکھو

خوف دیتا ہے یہاں ابر میں تنہا ہونا
شہرِ دربند میں دیواروں کی کثرت دیکھو

سایہ ہے ان پہ بہت بھولی ہوئی یادوں کا
شام آئی ہے، پری زادوں میں وحشت دیکھو

داغ ہے اس کے نہ ہونے سے دلوں میں ایک
اڑ گیا مثلِ صبا، گُل کی حقیقت دیکھو

جنگلوں میں کوئی پیچھے سے بلائے تو منیرؔ
مُڑ کے رستے میں کبھی اس کی طرف مت دیکھو



ایک میں اور اتنے لاکھوں سلسلوں کے سامنے
ایک صوتِ گنگ جیسے گنبدوں کے سامنے

مٹتے جاتے نقش، دُودِ دم کی آمد رفت سے
کھلتے جاتے بے صدا لب، آئینوں کے سامنے

ہے ہوائے سیرِ آب اور اجنبی سی سرزمیں
اُڑ رہی ہے خاک، کہنہ ساحلوں کے سامنے

آگ جلتی ہے گھروں میں یا کوئی تصویر ہے
یادگارِ جرمِ آدم، خاکیوں کے سامنے

دشمنی رسمِ جہاں ہے، دوستی حرفِ غلط
آدمی تنہا کھڑا ہے ظالموں کے سامنے

چار چُپ چیزیں ہیں بحر و بر فلک اور کوہسار
دل دہل جاتا ہے ان خالی جگہوں کے سامنے

باطنِ زردار پُراسرار ہے جیسے منیرؔ
کانِ زر کی بند ہیبت، مشعلوں کے سامنے

سلیم احمد



نیا مضموں کتابِ زیست کا ہوں
نہایت غور سے سوچا گیا ہوں
سنیں مجھ کو تو میں دھڑکن ہوں دل کی
نہیں سنتے تو صحرا کی صدا ہوں
مری جانب کوئی آئے تو پوچھوں
نشانِ راہ ہوں، منزل ہوں، کیا ہوں
کسی کو کیا بتاؤں، کون ہوں میں
کہ اپنی داستاں بھولا ہوا ہوں
خود اپنی دید سے اندھی ہیں آنکھیں
خود اپنی گونج سے بہرا ہوا ہوں
مری سیرابیوں میں تشنگی ہے
کہ میں دریا ہوں لیکن ریت کا ہوں
وہ رن مجھ میں پڑا ہے خیر و شر کا
کہ اپنی ذات میں اک کربلا ہوں
میرا سینہ ہے چھلنی نَے کی صورت
انہیں زخموں سے میں نغمہ سرا ہوں
مجھے شبنم کا آئینہ ملا ہے
اُسی میں گل کی صورت دیکھتا ہوں
مری موجودگی سے بندگی ہے
کہ جب سے گم ہوا ہوں میں خدا ہوں

سلیم احمد



عشق میں جس کے یہ احوال بنا رکھا ہے
اب وہی کہتا ہے اس وضع میں کیا رکھا ہے

لے چلے ہو مجھے اس بزم میں یارو لیکن
کچھ مرا حال بھی پہلے سے سنا رکھا ہے

حالِ دل کون سنائے اسے فرصت کس کو
سب کو اس آنکھ نے باتوں میں لگا رکھا ہے

دل بُرا تھا کہ بھلا، کام وفا کے آیا
یار جانے بھی دے اس بحث میں کیا رکھا ہے

اے صبا آ کہ دکھائیں تجھے وہ گل جس نے
باتوں ہی باتوں میں گلزار کھلا رکھا ہے

دیکھ اے دل! نہ کہیں بات یہ اس تک پہنچے
چشمِ نمناک نے طوفان اٹھا رکھا ہے

حسن چاہے جسے ہنس بول کے اپنا کر لے
دل نے اپنوں کو بھی بیگانہ بنا رکھا ہے

دل جو اس بزم میں آتا ہے تو جاتا ہی نہیں
ایک دن دیکھنا، دیوانہ ہوا رکھا ہے

حال مت پوچھ محبت کا، ہوا ہے کچھ اور
لا کے کس نے یہ سرِ راہ دیا رکھا ہے

انتظام ایسا کہ گھٹتی ہی نہیں رونقِ بزم
ہم سے کتنے ہیں کہ وعدے پہ لگا رکھا ہے

ہوش تو پہلے ہی کھو آئے تھے اس محفل میں
اب اگر جائیں تو پھر دل بھی گیا رکھا ہے

تیرے آنے کی خبر پا کے ابھی سے دل نے
شکوہ کو اور کسی دن پہ اٹھا رکھا ہے

بارہا یوں بھی ہوا تیری محبت کی قسم
جان کر ہم نے تجھے خود سے خفا رکھا ہے

دشت و در خیر منائیں کہ ابھی وحشت میں
عشق نے پہلا قدم نامِ خدا رکھا ہے

ہجر میں رنج بھی کرتے ہیں پہ اتنا بھی سلیمؔ
یار تو نے تو عجب حال بنا رکھا ہے

سلیم احمد

○

تری جانب سے دِل میں وسوسے ہیں
یہ کتّے رات بھر بھونکا کیے ہیں !

لباسِ درد بھی ہم نے اتارا !
یہ کپڑے اب پرانے ہو چکے ہیں

اتاریں کینچلی اب تلخ جذبات !
کہ وہ اپنے میں گھٹ کر رہ گئے ہیں

نہ ہو مایوس خشک آنکھوں سے اے دل
کہ صحراؤں میں بھی دریا بہے ہیں

سلیم اچھی غزل ہے تیری، مانا
مگر یہ پھول گھورے پر کِھلے ہیں

○

دِل حسن کو دان دے رہا ہوں
گاہک کو دکان دے رہا ہوں

شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

ہر کہنہ یقیں کو، از سرِ نو
اک تازہ گمان دے رہا ہوں

گونگی ہے ازل سے جو حقیقت
میں اس کو زبان دے رہا ہوں

میں غم کو بسا رہا ہوں دل میں
بے گھر کو مکان دے رہا ہوں

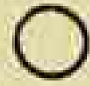
بے جادہ و راہ ہے جو منزل
میں اس کا نشان دے رہا ہوں

جو فصل ابھی کٹی نہیں ہے
میں اس کا لگان دے رہا ہوں

حاصل کا حساب ہو رہے گا
فی الحال تو جان دے رہا ہوں

رکھوں جو لحاظ مصلحت کا
کیا کوئی بیان دے رہا ہوں

سلیم احمد



ترے سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہوں
تجھے بھی کچھ بدلتا جا رہا ہوں

نہ جانے تجھ کو بھولا ہوں کہ خود کو
بہر صورت سنبھلتا جا رہا ہوں

طبیعت ہے ابھی طفلانہ میری
کھلونوں سے بہلتا جا رہا ہوں

حقیقت کو مکمل دیکھنا ہے
نظر کے رُخ بدلتا جا رہا ہوں

چلا ہے مجھ سے آگے میرا سایہ
سو میں بھی ساتھ چلتا جا رہا ہوں

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں
سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں!

بہت نازاں ہوں محرومی پہ اپنی
اسی پر ہاتھ ملتا جا رہا ہوں

کسی کا وعدۂ فردا نہیں میں
تو کیوں فردا پہ ٹلتا جا رہا ہوں



بجا یہ رونقِ محفل مگر کہاں ہیں وہ لوگ
یہاں جو اہلِ محبت کے جانشین ہونگے

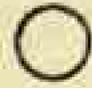
کہاں سے آج میری روح میں چمک اُٹھے
وہ تیرے دکھ جو تجھے یاد بھی نہیں ہونگے

زمانہ گرمِ سفر ہے، کہیں تو پائے گا
وہ دل جو مہر و محبت کی سرزمیں ہونگے

میں کر رہا ہوں تری چشمِ نم سے اندازہ
کہ آنے والے زمانے بہت حسیں ہونگے

سلیم گھر سے نکل کر نہ جاؤ صحرا میں
ہوا کے راگ بہت درد آفریں ہونگے

سلیم احمد



جا کے پھر لوٹ جو آئے وہ زمانہ کیسا
تیری آنکھوں نے یہ چھیڑا ہے فسانہ کیسا

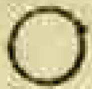
آنکھ سرشارِ تمنا ہے تو وعدہ کر لے
چال کہتی ہے کہ اب لوٹ کے آنا کیسا

مجھ سے کہتا ہے کہ سائے کی طرح ساتھ ہیں ہم
یوں نہ ملنے کا نکالا ہے بہانہ کیسا!

اس کا شکوہ تو نہیں ہے، نہ ملے تم ہم سے
رنج اس کا ہے کہ تم نے ہمیں جانا کیسا!

خود بھی سوچا تھا بہت اس نے بھی پوچھا تھا بہت
حال جب خود ہی نہ سمجھے تو سنانا کیسا

تجھ کو پانے کی ہوس تھی سو کسے تھا معلوم
اپنے ہی آپ کو کھو بیٹھیں گے، پانا کیسا!



مجھ کو دشوار ہوا جس کا نظارا تنہا
کاش مل جائے کہیں مجھ کو دوبارا تنہا

اے شبِ ہجر! مجھے تو نے تو دیکھا ہو گا
میری مانند نہ تھا صبح کا تارا تنہا

تم نہ ٹھہرے تو کہاں موجِ گریزاں رکتی
میری آغوش کی صورت ہے کنارا تنہا

عذر کیا کیا نہ تراشا کئے اربابِ ہوس
جان دینے کا ہوا عشق کو یارا تنہا

یوں بھی محسوس ہوا جیسے کہ میں ہی تو ہوں
ایک لمحے میں جسے میں نے گزارا تنہا

یوں تو دنیا میں بہت ہیں کہ رہے ہیں ناکام
بازیِ عشق کو میں جان کے ہارا تنہا

تو نے اے یارِ عزیزاں یہ عنایت کیوں کی
زندگی یوں بھی نہ تھی مجھ کو گوارا تنہا

سلیم احمد



منزلِ بے جہت کی خیر، سعیِ سفر ہے رائیگاں
اہلِ وفا کے قافلے پھر بھی تو ہیں رواں دواں

زہر ہے میرے جام میں ہونٹوں پہ آ گئی ہے جاں
پھر بھی مجھے حیات پر تیرے کرم کا ہے گماں

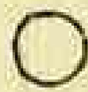
دہر یہ میں کھلا نہیں، مجھ کو خدا ملا نہیں
آپ ہی اپنا راز ہوں، آپ ہی اپنا رازداں

حُسن کو چھو کے دیکھنا آگ تھا موم کے لئے
روح پگھل کے رہ گئی، عقل ہوئی دھواں دھواں

وہ بھی تو ہیں کہ زندگی جن کے لئے ہے انگبیں
ذائقۂ حیات سے اینٹھ گئی مری زباں

گوشِ گلِ بہار میں کس نے کہا ہے حرفِ شوق
کون ہے میرا ترجماں، کس کو ملی مری زباں

روح کی تہ میں ہے ابھی ایک وہ موجِ درد کی
جس کے سرور و کیف سے یاس میں بھی ہوں نغمہ خواں



ایک خوشبو دل و جاں سے آئی
اک مہک زخمِ زباں سے آئی

دشتِ بے آب کی مانند تھا میں
یہ نئی موج کہاں سے آئی

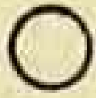
سرد تھی موت کی مانند حیات
آنچ سی شعلۂ جاں سے آئی

اتنی رونق سرِ بازارِ وفا
میرے سودائے زیاں سے آئی

کتنی تاریک تھیں راتیں میری
روشنی کس کے مکاں سے آئی

عشق کی دولتِ بیدار سلیم
حسن پر حسنِ گماں سے آئی

جمیل الدین عالی



یہ جو مری لَے اور لفظوں کے رنگیں تانے بانے ہیں
سننے والو! غور نہ کرنا، سارے راگ پرانے ہیں

سننے والو! غور نہ کرنا، ورنہ کھل ہی جائیں گے
کتنے خالی بھید ہمارے، جو کب سے افسانے ہیں

سننے والو! غور نہ کرنا، ورنہ پتہ چل جائے گا
ہم نے جتنے باغ سجائے، وہ اب تک ویرانے ہیں

سننے والو! غور نہ کرنا، ورنہ صاف سمجھ لو گے
ہم نے جتنے نام لیے تھے، آج بھی سب انجانے ہیں

سننے والو! غور نہ کرنا، ورنہ خفا ہو جاؤ گے
جن کو ہم نے دوست کہا ہے، ہم ان سے بیگانے ہیں

سننے والو! غور نہ کرنا، ورنہ ہمیں ٹھکرا دو گے
ہم اندر سے سخت کمینے، باہر سے دیوانے ہیں

سننے والو! غور نہ کرنا، ہم بے سُر ہو جائیں گے
جب تک تم سر دھنتے رہو گے، سارے گیت سہانے ہیں

سننے والو! غور نہ کرنا، ورنہ ہم خود کہہ دیں گے
ہم اب شعر نہیں کہہ سکتے، یہ سب شعر بہانے ہیں

جمیل الدین عالی



کچھ دن گذرے عالی صاحب عالی جی کہلاتے تھے
محفل محفل، قریے قریے شعر سنانے جاتے تھے
قدرِ سخن ہم کیا جانیں، ہاں رنگِ سخن کچھ ایسا تھا
اچھے اچھے کہنے والے اپنے پاس بٹھاتے تھے
غزلوں میں سو رنگ ملا کر اپنا رنگ ابھارا تھا
استادوں کے سائے میں کچھ اپنی راہ بناتے تھے
گیتوں میں کچھ اور نہ ہو، اک کیفیت سی رہتی تھی
جب بھی مصرعے رقصاں ہوتے، معنی ساز بجاتے تھے
دوہے کہنے اور پڑھنے کا ایسا طرز نکالا تھا
سننے والے سر دھنتے تھے اور پہروں پڑھواتے تھے
سامنے بیٹھی سندر ناریں آپ طلب بن جاتی تھیں
پردوں میں سے فرمائش کے سو سو پرچے آتے تھے
"غزلیں دوہے گیت" کی شہرت ملک سے باہر پھیلی تھی
ہندوستان سے آنے والے تحفوں میں لے جاتے تھے
اہلِ ہنر کی خوشہ چینی ان کو وجہِ سعادت تھی
بے ہنروں میں اپنی انا کا پرچم بھی لہراتے تھے
پھر دیکھا کہ بچہ بچہ ہنستا تھا اور عالی جی
فردیں لکھتے، مسلیں پڑھتے، بیٹھے "گلڈ" چلاتے تھے



میری بے حوصلگی اس سے سوا اور سہی
اور چاہو تو محبت کا صلا اور سہی

یوں بھی کچھ کم تو نہ تھے اتنی بہاروں کے ہجوم
ان میں شامل ترے دامن کی ہوا اور سہی

مجھ کو اصرار کہاں ہے کہ محبت جانوں
آج سے معنیِ انداز و ادا اور سہی

طلبِ درد میں دل حد سے گزرتا کب تھا
تم نے پوچھا تھا کہ اور؟ اس نے کہا اور سہی

اب تو ہر شہر میں اس کے ہی قصیدے پڑھئے
وہ جو پہلے ہی خفا ہے، وہ خفا اور سہی

ہم اسی رحمت و زحمت کے ہیں عادی یارب
جیسی بھی ہے، اسی دنیا کی فضا اور سہی

سبقِ بے گنہی تشنۂ تکمیل بھی تھا
اک نیا فلسفۂ جرم و سزا اور سہی

آج آپ اپنے محاسن کا بیاں کر لیجیے
محفلِ تذکرۂ اہلِ وفا اور سہی

کیا ضروری ہے کہ اندازِ بہاراں رکھئے
اب جو کچھ اور ہے رفتارِ صبا اور سہی

اب بہت شور سہی، کل تو کوئی پرکھے گا
ان صداؤں میں فقیروں کی نوا اور سہی

کیوں نہ عالیؔ سے علائی یہ غزل لکھوائے
"ایک بیدادگرِ رنج فزا اور سہی"



شاید ایک ہی چہرہ سا ہوگا
کوئی ہم سا، کوئی تم سا ہوگا

اسی تاریک زمیں کا منظر
چاند پر چاندنی جیسا ہوگا

سورج آیا ہے مری سمت اگر
دوسری سمت اندھیرا ہوگا

کاش پہلے سے کوئی بتلا دے
کس طرح ذکر ہمارا ہوگا

ایسے بیگانہ نہ سمجھنا لوگو
یہ بھی افسانہ کسی کا ہوگا

وہ نہیں آئے گا اس محفل میں
دور ہی دور سے سنتا ہوگا

آئی بے ساختہ ہر شعر پہ داد
کتنے معنی نہیں سمجھا ہوگا

کون تھا جس نے رکھی تجھ سے امید
ہاں تو وہ شخص مجھی سا ہوگا

کون تھا، ابر جو بن کر برسا
ہاں تو وہ تجھ کو ترستا ہوگا

کون تھا جس سے ہوئی طے منزل
ہاں تو پہلے وہ بھٹکتا ہوگا

کون تھا جس سے یہ شعلے بھڑکے
ہاں تو وہ خوب سلگتا ہوگا

تم رہو چپ کہ غزل خواں عالیؔ
نہ برا ہوگا نہ اچھا ہوگا

جمیل الدین عالی



بھٹکے ہوئے عالی سے پوچھو گھر واپس کب آئے گا
کب یہ در و دیوار سجیں گے، کب یہ چمن لہرائے گا

سو کر چلو غنچے جن سے کیا کیا پھول ابھرنے تھے
اب بھی نہ ان کی پیاس بجھی تو گھر جنگل ہو جائے گا

کم کر نہیں ایسی ہیں جو اب تک راہ اسی کی تکتی ہیں
یہ اندھیارا اور رہا تو پھر نہ اجالا آئے گا

سمجھا ہے اپنے آپ سے چھٹ کر سارا زمانہ دیکھ لیا
دیکھا اپنے آپ میں آکر یہ کیا کیا شرمائے گا

ایسی گیان اور دھیان کی باتیں، ہم جانے پہچانوں سے
تو آخر بھولا ہی کیا تھا، تجھ کو کیا یاد آئے گا

کچھ چھوٹے چھوٹے دکھ اپنے، کچھ دکھ اپنے عزیزوں کے
ان سے ہی جیون بنتا ہے، سو جیون بن جائے گا

چار برس سے بیگانے ہیں سو ہم کیا بیگانے ہیں
روٹھنے والا جیون ساتھی دو دن بیں من جائے گا

اے دل کے طوفانو! اٹھو! اے آنکھو، اب برسو بھی!
تھوڑی دیر میں چاند کا مکھڑا بدلی میں چھپ جائے گا

رات کی کوکھ سے پھوٹا ہے اک سوتا نرم خیالوں کا
دن ہوتے ہوتے یہ کس کس دھارے سے مل جائے گا

کس کس راگ کے کیا کیا سُر ہیں، کس کس سُر کے کیا کیا راگ
سیکھے نہ سیکھے گانے والا بے سیکھے بھی گائے گا



منفعل تھا ترا جلوا کیا کیا
ہم نے سمجھا ترا منشا کیا کیا

ایک تھا لفظ محبت جس سے
مسئلے ہو گئے پیدا کیا کیا

تو ہی خود دیکھ کہ تیرے لیے کام
کر گیا حرفِ تمنا کیا کیا

کون جانے کہ تجھے بن دیکھے
تجھ سے ملتا ہے سہارا کیا کیا

جب نہ دیکھا انہیں، دیکھا ہی نہیں
جب بھی دیکھا انہیں، دیکھا کیا کیا

کس کو سمجھائیں کہ اس محفل میں
کیسے ہوتا ہے تقاضا کیا کیا

کس قدر سخت مقام آئے تھے
ہم نے رکھا ترا پردا کیا کیا

ہم جو دیوانے نہیں ہو جاتے
دیکھتے لوگ تماشا کیا کیا

آج تھا رونقِ محفل عالی
تم نہ ہوتے تو وہ پڑھتا کیا کیا

جمیل الدین عالی



عالی جی! اب آپ چلو تم اپنے بوجھ اٹھائے
ساتھ بھی دے تو آخر پیارے کوئی کہاں تک جائے

جس سورج کی آس لگی ہے شاید وہ بھی آئے
تم یہ کہو خود تم نے اب تک کتنے دیئے جلائے

اپنا کام ہے صرف محبت، باقی اس کا کام
جب چاہے وہ روٹھے ہم سے جب چاہے من جائے

کیا کیا روگ لگے ہیں دل کو کیا کیا ان کے بھید
ہم سب کو سمجھانے والے، کون ہمیں سمجھائے

ایک اسی امید پہ ہیں سب دشمن دوست قبول
کیا جانے اس سادہ روی میں کون کہاں مل جائے

دُنیا والے سب سچے پر جینا ہے اس کو بھی
ایک غریب اکیلا پاپی کس کس سے شرمائے

اتنا بھی مجبور نہ کرنا ورنہ ہم کہہ دیں گے
او عالی پر ہنسنے والے! تو عالی بن جائے



دلِ آشفتہ پہ الزام کئی یاد آئے
جب ترا ذکر چھڑا، نام کئی یاد آئے

تجھ سے چھٹ کر بھی گذرنی تھی سو گذری لیکن
لمحہ لمحہ سحر و شام کئی یاد آئے

ہائے نو عمر امیدوں کا یہ اندازِ بیاں
اپنے مکتوب ترے نام کئی یاد آئے

آج تک مل نہ سکا اپنی تباہی کا سراغ
یوں ترے نام و پیغام کئی یاد آئے

کچھ نہ تھا یاد بجز کارِ محبت، اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

کس قدر سادہ و بے باک ہے عالی کہ ہمیں
اس پہ لگتے تھے جو الزام کئی یاد آئے

جمیل الدین عالی



بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار ہے آجا
اور اب تو خاص وہی موسمِ بہار ہے آجا

کہاں یہ ہوش کہ اسلوبِ تازہ سے تجھے لکھوں
کہ روح تیرے لیے سخت بے قرار ہے آجا

گذر چکی ہیں بہت غم کی شورشیں بھی حدوں سے
مگر ابھی تو ترا سب پہ اختیار ہے آجا

وہ تیری یاد کہ اب تک سکونِ قلبِ تپاں تھی
تری قسم ہے کہ اب وہ بھی ناگوار ہے آجا

غزل کے شکوے، غزل کے معاملات جدا ہیں
مری ہی طرح سے تُو بھی وفا شعار ہے، آجا

بدل رہا ہو زمانہ مگر جہانِ تمنا
ترے لیے تو ابد تک بھی سازگار ہے آجا

ہزار طرح کے افکار دل کو روندرہے ہیں
مقابلے میں ترے رنجِ روزگار ہے آجا



کب تم بھٹکے، کیوں تم بھٹکے، کس کس کو سمجھاؤ گے
اتنی دور تو آ پہنچے ہو اور کہاں تک جاؤ گے

اس چالیس برس میں تم نے کتنے دوست بنائے ہیں
اب جو عمر بچی ہے اس میں کتنے دوست بناؤ گے

بچپن کے سب سنگی ساتھی آخر کیوں تمہیں چھوڑ گئے
کوئی یار نیا پوچھے تو اس کو کیا بتلاؤ گے

جو بھی تم نے شہرت پائی، جو بھی تم بدنام ہوئے
کیا یہی ترکہ، اپنے پیارے بچوں کو دے جاؤ گے

اب اس جوش خود آگاہی میں آگے کی کیا سوچی ہے
شعر کہو گے عشق کرو گے، کیا کیا ڈھونگ رچاؤ گے

عالی کس کو فرصت ہوگی، ایک تمہی کو رونے گی
جیسے سب یاد آجاتے ہیں تم بھی یاد آجاؤ گے

ظفر اقبال



دل کے صفحے پہ خوب چھپایا
اُس حسن کا سانولا سراپا
لائے گی رنگ یہ جُدائی
کھینچے گا طول یہ سیاپا
اندازے سب غلط ہی نکلے
گہرائی کو ڈوب کر ہی ناپا
بٹوے میرے کو لے اُڑا کون
ڈی۔ سی آفس کے لبس سٹاپا
اُلٹا ہی لکھ گیا ہوں، یعنی
آپا دھاپی کو آپی دھاپا
بیوی باہر گئی کمانے
دن بھر وہ گھر میں دھوپ تاپا
ہیں اپنے پاس دو روپے' اور
اس کی قیمت ہے سبز پاپا
آدھا مصرعہ ہوا برامد
سارا ایڈیٹروں نے چھاپا
اتنا چپ رہ کے بھی ظفر نے
بے وقت کا راگ ہی الاپا

ظفر اقبال



کھایا کسی اور ہی نے میوہ
جس پیڑ کی ہم نے کی ہے سیوا
ٹکراؤ لہو کی لہر پر ہو
روٹھے جسموں کا ہو منیوا
زندانیٔ حبسِ آرزو کو
جنگل کی ہوا ہے جان لیوا
دیکھے کوئی تجھ کو بات کرتے
مُندری ترے ہونٹ، لفظ نگیوا
مرگی بھی دُور ہو گی اپنی
جیسے اپنا ہوا منگیوا
انڈے ہوں چاہے سارے گندے
مرغی کب چھوڑتی ہے سیوا
میں تو کافی کھپا چکا سر
اب تم ہی لگاؤ کوئی ٹیوا
سج دھج ہے اور ہی غزل کی
جس روز سے یہ ہوئی ہے بیوہ
اندیشے ظفرؔ ہوں اور اگر، تو
بدلوں باہر سے بھی پرہیوا

چڑ گئی ککڑی، ککڑ — مکڑی تھی یا ککڑ
بھولی تھی صورت سے — اندر سے تھی پکڑ
مطلع سُن کر بولی — بند کرو یہ پھکڑ
پڑ گئی میرے پیچھے — لیے ہاتھ میں لکڑ
تُلتا ہے ہر مصرعہ — لگا ہوا ہے تکڑ
شکّر سے لاہوری — اِسی لیے ہے شکّر
اُڑے دِلوں کے پرزے — رات چلا وہ جھکڑ
آخر پاگل خانے — پہنچا بُوجھ بُجھکڑ

چھوڑو بات ظفر کی
یار رہا ہے یکڑ

دھوپ، عکسِ ہوس تماشا، لُو
بے سفر، بے صدا بدن بالُو
آڑے آئے بڑے میاں ہی ہاں
اس کو لڈو کے ذکر سے کچالُو
وہ تو غرّا کے چل رہی تھی، مگر
سہما سہما تھا شیر کا خالُو
کون لیتا ہے سُکھ کا سانس میاں
کس کی بیوی نہیں ہے جھگڑالُو
ہوئی میعادِ ممبری کی ختم
رہ گئے لال دین سے لالُو
جیسے کُتّے نہیں قبولتے ہیں
شعر ہے وہ سڑا ہُوا آلُو
حرفِ ناگفتہ سے خدا کی پناہ
بچ رہے ہونٹ، جل اُٹھا تالُو
قافیہ تنگ ہوتا جاتا ہے
ایک باقی ہے وہ بھی شفتالُو
لفظ ہُو کے بھگت رہے ہیں ظفر
من تماشا ہے، فکر ہے بھالُو

آگ در دل میں ہو گئی ٹھنڈی
حضرتِ دل دکھا گئے جھنڈی
اب ٹکے سیر ہے پکی ہوئی فصل
تیز ہے جنسِ خام کی منڈی
دو قدم بھی چلا نہیں جاتا
نکلی ہے دل کے پاؤں پر چنڈی
یوں بجی ہے پھٹی پرانی امید
شام کے وقت جس طرح زنڈی
واپس آنے کی راہ کوئی نہیں
جاتی ہے شہر کو یہی ڈنڈی
خلوتِ خاص میں پڑا ہے وہاں
ایک سے ایک بڑھ کے پاکھنڈی
قید ہے ان کبوتروں کے لئے
یہ دھفسی اور پھنسی ہوئی پنڈی
سینگ تو کافی خوبصورت ہیں
دم ذرا شاعری کی ہے لنڈی
لاکھ بچ کر چلو ظفرؔ اس سے
لے مرے گی تمہیں وہ مشٹنڈی

ہے ساری مصیبتوں کا منبع
زخموں پہ تسلیوں کا پھنبا
چپ بیٹھے ہو اور زندہ بھی ہو
یہ بات ہے اور بھی اچنبھا
دوٹ اس کے ہیں نقد نوٹ جس کے
قائم دائم کھڑا ہے کھمب
دی ہیں یہ گاجریں خدا نے
رکھ ہاتھ میں صبح و شام رمبا
اس شام کے سلسلے ہیں بے حد
اس رات کا راستا ہے لمبا
چلتی نہیں اب ہوا ہوس کی
کھلتا نہیں خواہشوں کا چھمبا
چھائی تھی ایسی خشک سالی
چلتا تھا ساری رات بمبا
سو میل ابھی پڑا ہے ملتان
ملتان سے آگے ہے تلمبہ
آیا تری لاش پر، ظفرؔ، وہ
لے، عید کے بعد پھونک تمبا

ظفر اقبال

پڑا ہے وشتِ ابد میں ازل سے ایک اکلا
کوئی سبیل کیا چاہیئے اداس ہے اللہ

ہیں آسماں بھی کئی عرشِ آرزو کے سفر میں
ہوا ہے راہ میں حائل ابھی تو فرشِ معلّیٰ

پگھل پڑا دلِ سنگیں نجانے کس کے بھبکے
ہے اس کی طرز انوکھی نہ اس کا طور ادا

ابھی جو دیکھیں تو حاصلِ وصول کچھ بھی نہیں ہے
وداع و وصل میں بھاری ہے چھیڑ چھاڑ کا پلہ

دکانِ عشوہ فروشاں ہے مہماں کوئی دن کی
کہ کھال اتارتے ہیں اور پھر دکھاتے ہیں کھلّا

نجات بھی نہیں اس پہ نشہ بھی اور کہیں ہے
فلک کی پھوڑ صراحی، زمیں کا پھاڑ مصلّیٰ

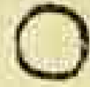
امیدِ فصل ہو بنجر قدیم بیویوں سے کیا
گھروں کو چھوڑیئے اور کھیت میں اگائیے غلہ

جو اجتماعِ حریفاں میں سر پہ چڑھ کے بدلے
کہاں وہ مجمعِ یاراں میں بیٹھتا ہے نچلا

دکھا کے اور ہی کچھ اب کہیں دلائیے نہ کچھ اور
بنا ہے شہر "ظفر" اور ہوشیار رہے دلّا

گم ہیں کسی جستجو میں اب بھی
یہ جلوتِ جسم کے مربّی
امّی تو اسی کی ہے بھلی لوگ
ملنے نہیں دیتے اس کے ابّی
میں ہی بے مرشدا نہیں ہوں
ہے وہ مجھ سے زیادہ گبّی
منّت سے تو وہ بھلے ہی مانے
لے جائیے اس کو بھر کے بگھی
کر استعمال کچھ سیاست
سبجی دکھلا کے مار بھبکی
رشوت سے بنے ہوئے مکاں پہ
لکھوا ہذا من فضلِ ربّی
مندری تو چرا کے لے گئے چور
خالم خالی پڑی ہے ڈبی
اردو کو کیا ہوا تمہاری
ہجیں کو کہہ رہی ہو ہجّی
پہلے ہی "ظفر" ہیں اس طرح کے
کتیا تو نہیں تھی ڈب کھڑبی

ظفر اقبال



سفرِ خواب کا صلہ مانگیں
سوچتے پیڑ، کانپتی ٹانگیں

ابھی دریا تو دور ہیں، صاحب
ذرا یہ دل کی آڑ تو لانگھیں

دور ہوتے ہیں پاس والے سے
جو ذرا دور ہے اسے تانگیں

خود تو ننگے دھڑنگے ہیں ہی اب
راستے کے درخت ہی چھانگیں

کسی لالچ کی لَو ابھارتی ہیں
شاخ کو بانٹتی ہوئی سانگیں

شوق کے جام ہوتے پینے کو
وصل کی دیزلین سے دانگیں

خاد مستی ہوس کی چھائی ہے پھر
بھوک سے مرے رہا ہوں پھر بانگیں

کچھ ترے بھائیوں نے مار رکھا
کچھ پڑیں اپنے گھر سے بھی ڈانگیں

ڈوب جائیں ہمارے رس میں، ظفر
یا رہیں اپنے رنگ میں رانگیں



رہتے ہو متفکر — آخر کیا ہے چکر
دھندا کار میں جھگڑا — ہوئی ہے ایسی ٹکر
کچھ نایاب ہیں پیسے — کچھ مہنگی ہے شکر
اس طوفانِ ہوس میں — کبھی تو ہم کو پکڑ
وہ تو گئی ہے میکے — کیوں بیٹھے ہو دب کر
خالی رکھو دل کی — کوئی نکر نکر
جم گئے سارے جذبے — پڑا ہے ایسا ککر
چھاتی سے بھی لگایا — گئی نہ اس کی اکڑ
بچ نکلی وہ ظفر سے
کیسا ہے یہ نڈر

شاذ تمکنت



وہ نیاز و ناز کے مرحلے نگہ و سخن سے چلے گئے
ترے رنگ و بُو کے وہ قافلے ترے پیرہن سے چلے گئے

کوئی آس ہے نہ ہراس ہے، شبِ ماہ کتنی اُداس ہے
وہ جو رنگ رنگ کے عکس تھے وہ کرن کرن سے چلے گئے

کوئی اُن کی آنکھیں سراہتا، کوئی وحشتوں سے نباہتا
کہ وہ آہوانِ رمیدہ خُو، یہ سُنا، ختن سے چلے گئے

کئی مہر و مہ اُتر آئے تھے، وہ یہیں تھے میرے گھر آئے تھے
وہ گلی گلی سے در آئے تھے، وہ چمن چمن سے چلے گئے

مرے دل کی آب و ہوا لگی کہ وفا بھی اُن کو خطا لگی
وہی سادگی سے جو آئے تھے، وہی بانکپن سے چلے گئے

نہ تو کفر کے نہ خدا کے ہم، نہ دوا کے ہم نہ دُعا کے ہم
کہ بتانِ کعبۂ آرزو دلِ برہمن سے چلے گئے

یہ مرا فریبِ نظر نہیں، مرے ہم قدم تھے یہیں کہیں
مجھے آہٹیں بھی نہ مِل سکیں، وہ بڑے جتن سے چلے گئے

یہ بجا کہ تحفۂ جاں لیے ترے پاس آئے تھے بے سبب
وہ گداگرانِ تہی سبُو، ترے حُسنِ ظن سے چلے گئے

یہی تجھ سے اپنا تھا واسطہ، یہی تھی حیاتِ معاشقہ
تری خلوتوں کے شریک تھے، تری انجمن سے چلے گئے

پسِ عمر بازوئے شوق پر سرِ ناز تھا تو ہوئی خبر
کئی رتجگے ترے گیسوؤں کی شکن شکن سے چلے گئے

وہ بُجھے بُجھے، وہ لُٹے لُٹے، سرِ راہ شاذؔ ملے تو تھے
اُنھیں اب وطن میں نہ ڈھونڈیے کہ وہ اب وطن سے چلے گئے



بنا حسنِ تکلّم حسنِ ظن آہستہ آہستہ
بہرصورت کھُلا اک کم سخن آہستہ آہستہ
مسافر راہ میں ہے شام گہری ہوتی جاتی ہے
سُلگتا ہے تری یادوں کا بن آہستہ آہستہ
دُھواں دل سے اُٹھے چہرے تک آئے نور ہو جائے
بڑی مشکل سے آتا ہے یہ فن آہستہ آہستہ

(ق)

ابھی تو سنگِ طفلاں کا ہدف بننا ہے کوچوں میں
کہ راس آتا ہے یہ دیوانہ پن آہستہ آہستہ
ابھی تو امتحانِ آبلہ پا ہے بیاباں میں
بنیں گے کُنجِ گل دشت و دمن آہستہ آہستہ
ابھی کیوں کر کہوں زیرِ نقابِ سرمگیں کیا ہے
بدلتا ہے زمانے کا چلن آہستہ آہستہ

میں اہلِ انجمن کی خلوتِ دل کا مُغنّی ہوں
مجھے پہچان لے گی انجمن آہستہ آہستہ
دلِ ہر سنگ گویا شمعِ محرابِ تمنّا ہے
اثر کرتی ہے ضربِ کوہکن آہستہ آہستہ
کسی کافر کی شوخی نے کہلوائی غزل مجھ سے
کھُلے گا شاذ اب رنگِ سخن آہستہ آہستہ

شاذ تمکنت



سخن رازِ نشاط و غم کا پردہ ہو ہی جاتا ہے
غزل کہہ لیں تو جی کا بوجھ ہلکا ہو ہی جاتا ہے

وہ عالم جب کسی مایوس کا ہوتا نہیں کوئی
تجھے معلوم بھی ہے تو کسی کا ہو ہی جاتا ہے

کیا ہے میں نے اظہارِ تمنّا جانے کس کس سے
مجھے اکثر تری صورت کا دھوکا ہو ہی جاتا ہے

ہجومِ آرزو ہمراہِ جان و دل سہی لیکن
قریبِ کوئے جاناں کوئی تنہا ہو ہی جاتا ہے

ہمیں تو عمر بھر کا غم کہ ایسا کیوں ہوا ہوگا
ہمیں اب کون سمجھائے کہ ایسا ہو ہی جاتا ہے

کوئی تجھ سا نہیں ہے انجمن در انجمن دیکھا
مگر تنہائیوں میں کوئی تجھ سا ہو ہی جاتا ہے

نہ رو یوں شاذ آنکھیں جو دکھائیں دیکھتے جاؤ
نہ اتنا غم کرو، یہ دل ہے صحرا ہو ہی جاتا ہے



جس طرف جاؤں، اُدھر عالمِ تنہائی ہے
جتنا چاہا تھا تجھے، اُتنی سزا پائی ہے

میں جسے دیکھنا چاہوں وہ نظر نہ آسکے
ہائے ان آنکھوں پہ کیوں تہمتِ بینائی ہے

بارہا سرکشی و کج کلہی سے کے باوصف
تیرے در پہ مجھے دریوزہ گری لائی ہے

صدمۂ ہجر میں تُو بھی ہے برابر کا شریک
یہ الگ بات تجھے تابِ شکیبائی ہے

بھولنے والے تجھے شاید یہ نہ سوچا ہوگا
ایک دو دن نہیں برسوں کی شناسائی ہے

جامِ خوش رنگ تہی ہے مجھے معلوم نہ تھا
اپنی ٹوٹی ہوئی توبہ پہ ہنسی آئی ہے

یہ توجہ بھی تری حسنِ گریزاں کی طرح
یہ تغافل بھی مری حوصلہ افزائی ہے

تیرا لہجہ ہے کہ سناٹے نے آنکھیں کھولیں
تیری آواز کلیدِ درِ تنہائی ہے

شاذ پوچھو کہ یہ آنکھوں کا دھندلکا کب تک
رات آئی نہیں یا نیند نہیں آئی ہے

شاذ تمکنت



دلِ شکستہ ہوئے، ٹوٹا ہوا پیماں بنے
ہم وہی ہیں جو تمہیں دیکھ کے انجاں بنے

چند یادیں مری زنجیرِ شب و روز بنیں
چند لمحے مرے بکھرے ہوئے اوساں بنے

وہ بھی کیا فصل تھی، کیا شعلۂ خرمن تھا بلند
وہ بھی کیا دن تھے کہ دامن سے گریباں بنے

ان کی دوری کا بھی احساں ہے مری سانسوں پہ
مجھ سے اس طرح وہ بچھڑے کہ نگہباں بنے

اب ساحل سے ملامت سی ندامت ہے کہ ہم
ایک کشتی تہِ آب کا ساماں بنے

ہائے کیا اُس نے کیا کیا نہ تمہیں بننا تھا
تم بنے بھی تو مرے درد کی پہچان بنے

گھر سجانا تو کجا شاذؔ لٹا بھی نہ سکوں
ان سے شکوہ ہے کہ وہ کیوں مرے مہماں بنے



نفس نفس ہے ترے غم سے چور چور اب تک
نہ شام ہے نہ سویرا قریب و دور اب تک

سُنی سنائی پہ مت جا، ذرا قریب تو آ
سزا نہ دے کہ محبت سے بے قصور اب تک

مچل رہی ہے کہیں جوئے شیر لے فرہاد!
کلیم! اُٹھ تو سہی جل رہا ہے طور اب تک

مرے خدا! میں کہاں جاؤں کس طرف ڈھونڈوں
مجھے پکار رہا ہے کوئی ضرور اب تک

نہ تو مرا، نہ تری ہم نشینیاں میری
بھرم ہے جس کو سمجھتے ہیں سب غرور اب تک

اِدھر وفورِ محبت، اُدھر مروت تھی
جو کچھ کہا تھا بھلا دے ترے حضور اب تک

چلا گیا ہے مکیں چھوڑ کر مکان اپنا
کوئی نہیں ہے مگر چھن رہا ہے نور اب تک

وہ ایک حادثۂ روح و دل کہ بیت گیا
جسے نہ مان سکا شاذؔ کا شعور اب تک

شاذ تمکنت



کیا کروں رنج گوارا نہ خوشی راس مجھے
جینے دے گی نہ مری شدّتِ احساس مجھے

میں کسی بزم کے قابل نہ رہا تیرے بعد
ہنس پڑا ہوں تو ہوا جرم کا احساس مجھے

ہم نے اک دوسرے کو پرسۂ فرقت نہ دیا
تیری خاطر تھی تجھے اور ترا پاس مجھے

ایک ٹھہرا ہوا دریا ہے مری آنکھوں میں
جانے کس گھاٹ پہ مارے گی تری پیاس مجھے

جیسے پہلوئے طرب میں کوئی نشتر رکھ دے
آج تک یاد ہے تیری نگہِ یاس مجھے

ریزہ ریزہ ہوا جاتا ہے مرا سنگِ وجود
یوں صدا دے نہ پسِ پردۂ انفاس مجھے

شاخ سے برگِ چکیدہ کا تعلق تھا جیسے
کچھ اسی طرح ابھی تک ہے تری آس مجھے

روح کے دشت میں اک ہو کا سماں ہے اے شاذ
دے گیا کون بھرے شہر میں بن باس مجھے



سُن کر بیانِ درد کلیجہ دہل نہ جائے
دنیا سے ڈر رہے تھے کہ دنیا بدل نہ جائے

ہر محفلِ نشاط سے پھرتا ہوں دُور دُور
کیا احتیاط ہے کہ ترا غم بہل نہ جائے

تم آج تک تو ہے مری نظروں میں ہو بہو
دنیا بدل گئی تری صورت بدل نہ جائے

ہیں طاقِ آرزو پہ کھلونے سجے ہوئے
مایوسِ آرزو کی طبیعت مچل نہ جائے

تشنہ لبی کہیں مجھے غرقاب کر نہ دے
تھوڑی سی روشنی کے لیے گھر ہی جل نہ جائے

اک خوف ہے کہ منزلِ نسیاں قریب ہے
تُو وادیِ خیال سے آگے نکل نہ جائے

روؤں کہاں کہ راحتِ خلوت نہیں ہے شاذ
ہنسنے پہ بھی یہ شرط کہ آنسو نکل نہ جائے

شاذ تمکنت



نہ محفل ایسی ہوتی ہے نہ خلوت ایسی ہوتی ہے
مرے مجبور کیا جینے کی صورت ایسی ہوتی ہے

بس اک کیفیتِ خود رنگئ تنہائیاں اپنی
ہمیں ملتی ہے فرصت بھی تو فرصت ایسی ہوتی ہے

یہ دنیا سر بسر رنگینیوں میں ڈوب جاتی ہے
تری قامت کی ہر شے میں شباہت ایسی ہوتی ہے

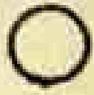
در و دیوار پر بس ایک سناٹے کی رونق ہے
مرے مہماں سے پوچھو گھر کی جنت ایسی ہوتی ہے

کہاں اپنی سیہ کاری، کہاں یہ تیری معصومی
تجھے مڑ دیکھا نہیں جاتا، ندامت ایسی ہوتی ہے

کوئی دیکھے تجھے تو از سرِ نو زندگی مانگے
روایت جھوٹ ہے عاشق کی حسرت ایسی ہوتی ہے

یہ مجبوری، محبت بھیک جیسی بھی گوارا ہے
کبھی دن رات کو تیری ضرورت ایسی ہوتی ہے

بچھڑ کر تجھ سے ملنے کی مسرت بھول جاتا ہوں
کہ مل کر پھر بچھڑنے کی اذیت ایسی ہوتی ہے



چھوڑ دوں شہر ترا، چھوڑ دوں دنیا تیری
مجھ کو معلوم نہ تھا، کیا ہے تمنا تیری

میں اندھیرے میں نہیں ہوں کہ اجالے میں ملا
اب کسے ڈھونڈھتی ہے شمعِ رخِ زیبا تیری

جب کوئی پاسِ مروت سے کرم کرتا ہے
یاد آتی ہے بہت رنجشِ بے جا تیری

پے بہ پے ساتھ چھٹا جاتا ہے اک دنیا کا
دم بہ دم یاد چلی آتی ہے گویا تیری

دامنِ دوست رسالاتِ خدا ساز تو ہے
نارسائی بھی مشیت ہے اے خدایا تیری

منہدم ہو گئی دیوارِ دلِ دیوانہ
میری قسمت میں تھی تصویرِ شکستہ تیری

تار تارِ نفسِ جاں میں ترا نغمہ ہے
پیرہن میں ہے ابھی بوئے شناسا تیری

غزلِ شاذ ہے صدقہ تری رعنائی کا
رنگ ہر شعر میں ہے موجِ سراپا تیری

شہزاد احمد



میں اکیلا ہوں، یہاں میرے سوا کوئی نہیں
چل رہا ہوں اور میرے نقشِ پا کوئی نہیں

ذہن کے تاریک گوشوں سے اٹھی تھی اک صدا
میں نے پوچھا کون ہے؟ اس نے کہا، کوئی نہیں

دیکھ کر ہر ایک شے کا فیصلہ کرتے ہیں لوگ
آنکھ کی پتلی میں کیا ہے، دیکھتا کوئی نہیں

کس کو پہچانوں کہ ہر پہچان مشکل ہو گئی
خود نما سب لوگ ہیں اور رو نما کوئی نہیں

نقشِ حیرت بن گئی دنیا ستاروں کی طرح
سب کی سب آنکھیں کھلی ہیں، جاگتا کوئی نہیں

گھر میں یہ مانوس سی خوشبو کہاں سے آگئی
اس خرابے میں اگر آیا گیا کوئی نہیں

پیکرِ گل آسمانوں کے لیے بے تاب ہے
خاک کہتی ہے کہ مجھ سا دوسرا کوئی نہیں

عمر بھر کی تلخیاں دے کر وہ رخصت ہو گیا
آج کے دن کے سوا روزِ جزا کوئی نہیں

شہزاد احمد



نہ سہی کچھ مگر اتنا تو کیا کرتے تھے
وہ مجھے دیکھ کے پہچان لیا کرتے تھے

آخر کار ہوئے تیری رضا کے پابند
ہم کہ ہر بات پہ اصرار کیا کرتے تھے

خاک ہیں اب تری گلیوں کی وہ عزت والے
جو ترے شہر کا پانی نہ پیا کرتے تھے

اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں
لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے

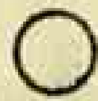
دوستو! اب مجھے گردن زدنی کہتے ہو
تم وہی ہو کہ مرے زخم سیا کرتے تھے

ظلم کرتے ہو مگر اُف نہیں کرنے دیتے
تم سے اچھے کہ تڑپنے تو دیا کرتے تھے

ہم جو دستک کبھی دیتے تھے صبا کی مانند
آپ دروازۂ دل کھول دیا کرتے تھے

اب تو شہزادؔ ستاروں پہ لگی ہیں نظریں
کبھی ہم لوگ بھی مٹی میں جیا کرتے تھے

شہزاد احمد



ڈوب جائیں گے ستارے اور بکھر جائے گی رات
دیکھتی رہ جائیں گی آنکھیں گزر جائے گی رات

رات کا پہلا پہر ہے اہلِ دل خاموش ہیں
صبح تک روتی ہوئی آنکھوں سے بھر جائے گی رات

آرزو کی بے حسی کا گر یہی عالم رہا!
بے طلب آئے گا دن اور بے خبر جائے گی رات

روشنی کیسی اگر عالم اندھیرا ہو گیا!
دل میں بس جائے گی آنکھوں میں اتر جائے گی رات

کوئی آہٹ بھی نہ سن پائے گا خوابیدہ چمن
خشک پتوں سے دبے پاؤں گزر جائے گی رات

دل میں رہ جائیں گے تنہائی کے قدموں کے نشاں
اپنے پیچھے کتنی یادیں چھوڑ کر جائے گی رات

شام ہی سے سو گئے ہیں لوگ آنکھیں موند کر
کس کا دروازہ کھلے گا کس کے گھر جائے گی رات

ہم تمناؤں کے سورج بھی فروزاں کر چکے
اب یہ سیلِ تیرگی لے کر کدھر جائے گی رات

دیر تک شہزاد آنکھوں میں بھرے گی چاندنی
کٹ تو جائے گی مگر کیا کچھ نہ کر جائے گی رات



دیکھنے اس کو کوئی میرے سوا کیوں آئے
میرے ہمراہ یہ نقشِ کفِ پا کیوں آئے

کل تھی یہ فکر، اسے حال سنائیں کیسے
آج یہ سوچتے ہیں، اس کو سنا کیوں آئے

کم نہیں ہے یہ اذیت کہ ابھی زندہ ہوں
اب مرے سر پہ کوئی اور بلا کیوں آئے

میں بلندی پہ اگر جاؤں تو کیسے جاؤں
آسمانوں سے زمینوں پہ خدا کیوں آئے

عدل و انصاف تقاضائے مشیت ہی سہی
زندگی ہی میں مگر روزِ جزا کیوں آئے

دوڑتے خون کی اک لہر بہت کافی ہے
شفقِ شام کو آتی بھی حیا کیوں آئے

قیدیوں کے لیے بہتر ہے کہ گھُٹ کر مر جائیں
روشنی جب نہیں آتی تو ہوا کیوں آئے

لوگ خاموشی کا کرتے ہیں تقاضا یعنی
سانس لینے کی بھی شہزاد صدا کیوں آئے

شہزاد احمد



جوں جوں قدم بڑھائے ہیں جنگل گھنا ہوا
اب سر پہ تیرگی کا ہے پردہ تنا ہوا

پتھر نہ پھینک، دیکھ، ذرا احتیاط کر
ہے سطحِ آب پر کوئی چہرہ بنا ہوا

پھرتا رہا ہوں سایۂ غم کی تلاش میں
مدت کے بعد اپنی طرف جھانکنا ہوا

یادیں تو کیا ہیں، اس میں نہیں خون کی رمق
نکلا ہے میری آنکھ سے پانی چھنا ہوا

پہلے تو تھیں حریفوں سے زور آزمائیاں
اب کے تو اپنے آپ سے ہی سامنا ہوا

گر ہے مسافروں کی یہی پاشکستگی
چلنا بھی آپ اپنے قدم ناپنا ہوا

کاٹی کسی کی بات تو ٹھہرے گناہ گار
رہنا خموش اپنی زباں کاٹنا ہوا!

اپنے نصیب میں نہ ہوئی لذتِ سحر
جب سر پہ دھوپ آئی تو پھر جاگنا ہوا

جب خاک ہی بدن ہے مرا خاکِ زندگی
پھر خاک چاٹنا تو لہو چاٹنا ہوا!!

موجود جو بھی ہے وہ مری دسترس میں ہے
تو کون تھا کہ تجھ سے نہ میں آشنا ہوا

دشتِ طلب میں شبنمِ امید کا خیال
پتھر سے زندگی کی دعا مانگنا ہوا

شہزاد آرزو کے دریچے نہ بند کر!
کیسے نکل سکے گا اگر بھاگنا ہوا



ابر کی اوٹ سے جب چاند ذرا سا نکلا
روشنی دیکھ کے گھر سے کوئی سایا نکلا

کون تھا تو کہ جھلک بھی نہ دکھائی تو نے
اور ہر شخص ترا دیکھنے والا نکلا

گھل گیا موم کی مریم کی طرح آخر کار
سنگدل جس کو سمجھتے تھے ہمیں سا نکلا

دل کی گرمی سے جہانوں کو حرارت نہ ملی
آستینوں سے بہت کم یدِ بیضا نکلا

رات کے زخم شگوفوں کی طرح کھل اٹھے
شکر ہے صبح کا جھونکا نہ ادھر آ نکلا

سطحِ گیتی کا ہر گام بدلتا ہوا رنگ
کبھی دریا کبھی جلتا ہوا صحرا نکلا

چوم لیں دیدۂ حیراں کو کہ آنکھیں پھوڑیں
چاند سمجھے تھے جسے، ابر کا ٹکڑا نکلا

ذرے ذرے سے نکلتی تھیں عجب آوازیں
سب سے لڑنے کے لیے عشق اکیلا نکلا

نشۂ طوفان تھا، اترا بھی تو دریا کی طرح
ٹوٹتا جسم لپکتا ہوا کوندا نکلا!

بجھ گئے چاند ستارے بھی اسی ریلے میں
رات کی کوکھ سے جب صبح کا دھارا نکلا

شبِ امید کے بعد آئی قیامت کی سحر
کہاں ڈوبا تھا میں شہزاد کہاں جا نکلا

شہزاد احمد



اپنی تصویر کو آنکھوں سے لگاتا کیا ہے
اک نظر میری طرف بھی ترا جاتا کیا ہے

میری رسوائی میں وہ بھی ہیں برابر کے شریک
میرے قصے مرے یاروں کو سناتا کیا ہے

پاس رہ کر بھی نہ پہچان سکا تو مجھ کو
دور سے دیکھ کے اب ہاتھ ہلاتا کیا ہے

ذہن کے پردوں پہ منزل کے ہیولے نہ بنا
غور سے دیکھتا جا راہ میں آتا کیا ہے

زخمِ دل جرم نہیں توڑ بھی دے مہرِ سکوت
جو تجھے جانتے ہیں ان سے چھپاتا کیا ہے

عمر بھر اپنے گریباں سے الجھنے والے
تو مجھے میرے ہی سائے سے ڈراتا کیا ہے

مر گئے پیاس کے مارے تو اٹھا ابرِ کرم
بجھ گئی بزم تو اب شمع جلاتا کیا ہے

میں ترا کچھ بھی نہیں ہوں مگر اتنا تو بتا
دیکھ کر مجھ کو ترے ذہن میں آتا کیا ہے

تیرا احساس ذرا سا تری ہستی پایاب
تو سمندر کی طرح شور مچاتا کیا ہے

تجھ میں کس بل ہے تو دنیا کو بہا کر لے جا
چائے کی پیالی میں طوفان اٹھاتا کیا ہے

تیری آواز کا جادو نہ چلے گا ان پر
جاگنے والوں کو شہزاد جگاتا کیا ہے



میں — کہ خوش ہوتا تھا دریا کی روانی دیکھ کر
کانپ اٹھا ہوں گلی کوچوں میں پانی دیکھ کر

ہو کوئی بہروپ اس کا، دل دھڑکتا ہے ضرور
میں اسے پہچان لیتا ہوں نشانی دیکھ کر

ادھ کھلے تنہا دریچوں کا مجھے آیا خیال
نیم وا آنکھوں کی رنگت آسمانی دیکھ کر

ابر کے ٹکڑوں نے دیواریں بنا دیں جا بجا
دھوپ سے جلتی فضا کی بیکرانی دیکھ کر

ایک لمحے میں کٹا ہے مدتوں کا فاصلہ
میں ابھی آیا ہوں تصویریں پرانی دیکھ کر

آنکھ کے بادل سے کہتا ہے کہ دنیا پر برس
دل، لب و رخسار کی شعلہ فشانی دیکھ کر

کس طرف لے جائے گی سوئے ہوئے لوگوں کو رات
ڈر رہا ہوں اس کی آنکھوں میں گرانی دیکھ کر

دن وہیں پر کاٹنا ہم کو قیامت ہو گیا
آن بیٹھے تھے جہاں صبحیں سہانی دیکھ کر

دل میں جو کچھ ہے زباں کا ذائقہ بنتا نہیں
لفظ چہرہ ڈھانپ لیتے ہیں معانی دیکھ کر

دل نہ جانے کونسی گہرائیوں میں کھو گیا
بحر کی موجوں کی تحریروں کو فانی دیکھ کر

دیر سے شہزاد کنجِ عافیت میں تھے اسیر
خوش ہوا ہے دل بلائے ناگہانی دیکھ کر

شہزاد احمد



جو شجر سوکھ گیا ہے وہ ہرا کیسے ہو
میں پیمبر تو نہیں، میرا کہا کیسے ہو

دل کے ہر ذرے پہ ہے نقش محبت اس کی
نور آنکھوں کا ہے آنکھوں سے جدا کیسے ہو

جس کو جانا ہی نہیں، اس کو خدا کیوں مانیں
اور جسے جان چکے ہیں وہ خدا کیسے ہو

عمر ساری تو اندھیرے میں نہیں کٹ سکتی
ہم اگر دل نہ جلائیں تو ضیا کیسے ہو

جس سے دو روز بھی کھل کر نہ ملاقات ہوئی
مدتوں بعد ملے بھی تو گلہ کیسے ہو

دور سے دیکھ کے میں نے اسے پہچان لیا
اس نے اتنا بھی نہیں مجھ سے کہا کیسے ہو

وہ بھی اک دور تھا جب میں نے تجھے چاہا تھا
دل کا دروازہ ہے، ہر وقت کھلا کیسے ہو

جب کوئی دادِ وفا چاہنے والا نہ رہا
کون انصاف کرے حشر بپا کیسے ہو

آئینے میں بھی نظر آتی ہے صورت تیری
کوئی مقصودِ نظر تیرے سوا کیسے ہو

کن نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہوں شہزاد
مجھ کو معلوم نہیں اس کو پتا کیسے ہو



تنہائیوں میں کوئی در آیا تو کیا ہوا
تھا مدتوں سے دل کا دریچہ کھلا ہوا

دیوار کس طرف سے بڑھے کچھ خبر نہیں
ہے بے شمار شہروں میں جنگل گھرا ہوا

چلتی ہے زیرِ دشت بھی پانی کی ایک لہر
آتا ہے شہر میں بھی ہرن ناچتا ہوا

کرتے ہوے سب لیے دریاؤں میں تلاش
پھولوں کی پتیوں میں ہے موتی چھپا ہوا

سرمہ ہماری آنکھ کا مٹی سفر کی ہے
ہے سنگِ میل راہ میں پتھر پڑا ہوا

آگے نکل گئے وہ مجھے دیکھتے ہوئے
جیسے میں آدمی نہ ہوا، نقشِ پا ہوا

بے برگ و بار خود کو سمجھتا رہا تھا میں
جب مل گئے درخت تو کچھ حوصلہ ہوا

حائل ہے زندگی کی وہ دیوار راہ میں
گھبرا کے بیٹھ جائے گا دریا چڑھا ہوا

اے صبح کی کرن مجھے پیاری ہے تو بہت
تجھ سے لپٹ پڑوں گا اگر جاگتا ہوا

ڈرتا ہوں، میرے سر پہ ستارے نہ آ پڑیں
چلتا ہوں آسماں کی طرف دیکھتا ہوا

لغزش ذرا سی اور سزا ساری عمر کی
شہزاد دوستی نہ ہوئی خوں بہا ہوا!

خلیل الرحمٰن اعظمی



بس کہ پابندیٔ آئینِ وفا ہم سے ہوئی
یہ اگر کوئی خطا ہے تو خطا ہم سے ہوئی

زندگی! تیرے لیے سب کو خفا ہم نے کیا
اپنی قسمت ہے کہ اب تُو بھی خفا ہم سے ہوئی

رات بھر چین سے سونے نہیں دیتی ہم کو
اتنی مانوس تری زلفِ رسا ہم سے ہوئی

سر اٹھانے کا بھلا اور کسے یارا تھا
بس ترے شہر میں یہ رسم ادا ہم سے ہوئی

بارہا دستِ ستمگر کو قلم ہم نے کیا
بارہا چاک اندھیرے کی قبا ہم سے ہوئی

ہم نے اُتنے ہی سرِ راہ جلائے ہیں چراغ
جتنی برگشتہ زمانے کی ہوا ہم سے ہوئی

بارِ ہستی تو اٹھا، اٹھ نہ سکا دستِ سوال
مرتے مرتے نہ کبھی کوئی دعا ہم سے ہوئی

کچھ دنوں ساتھ لگی تھی ہمیں تنہا پا کر
کتنی شرمندہ مگر موجِ بلا ہم سے ہوئی

خلیل الرحمٰن اعظمی



نشۂ مے کے سوا کتنے نشے اور بھی ہیں
کچھ بہانے مرے جینے کے لیے اور بھی ہیں

ٹھنڈی ٹھنڈی سہی، مگر غم سے ہے بھرپور ہوا
کئی بادل مری آنکھوں سے پرے اور بھی ہیں

عشق رسوا! ترے ہر داغ فروزاں کی قسم
میرے سینے میں کئی زخم ہرے اور بھی ہیں

زندگی آج تلک جیسے گزاری ہے، نہ پوچھ
زندگی ہے تو ابھی کتنے مزے اور بھی ہیں

ہجر تو ہجر تھا، اب دیکھیے کیا بیتے گی
اُس کی قربت میں کئی درد نئے اور بھی ہیں

رات تو خیر کسی طرح سے کٹ جائے گی
رات کے بعد کئی کوس کڑے اور بھی ہیں

غمِ دوراں! مرے بازوئے شکستہ سے نہ کھیل
مشغلے میری جوانی کے لیے اور بھی ہیں

وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

کوئی تم جیسا تھا، ایسا ہی کوئی چہرا تھا
یاد آتا ہے کہ اک خواب کبھی دیکھا تھا

رات جب دیر تلک چاند نہیں نکلا تھا
میری ہی طرح سے سایہ بھی مرا تنہا تھا

جانے کیا سوچ کے تم نے مرا دل پھیر دیا
میرے پیارے! اسی مٹی میں مرا سونا تھا

وہ بھی کم بخت زمانے کی ہوا لے کے گئی
میری آنکھوں میں نری مے کا جو اک قطرہ تھا

تو نہ جاگا مگر اے دل ترے دروازے پہ
ایسا لگتا ہے، کوئی پچھلے پہر آیا تھا

تیری دیوار کا سایہ نہ خفا ہو مجھ سے
راہ چلتے یونہی کچھ دیر کو آ بیٹھا تھا

اے شبِ غم مجھے خوابوں میں سہی، دکھلا دے
میرا سورج تری وادی میں کہیں ڈوبا تھا

اک مری آنکھ ہی شبنم سے شرابور رہی
صبح تو اور نہ ہر اک پھول کا منہ سوکھا تھا

تم ذرا تھام لو آ کر کبھی پیمانۂ جاں
دیکھو دیکھو مرے ہاتھوں سے ابھی چھوٹا تھا

○

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں

سونا ہوں کریدکر تو دیکھو!
مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں

لے مجھ کو سنبھال گردشِ وقت!
ٹوٹا ہوا تیرا آئینہ ہوں

یوں ربط تو ہے نشاط سے بھی
دراصل میں غم سے آشنا ہوں

صحبت میں گلوں کی، میں بھی رہ کر
کانٹوں کی زباں سمجھ گیا ہوں

دشمن ہو کوئی کہ دوست میرا
ہر ایک کے حق میں، میں دعا ہوں

کیوں آبِ حیات کو میں ترسوں،
میں زہرِ حیات پی چکا ہوں

تقدیرِ جنوں پہ چپ رہا میں
تعبیرِ جنوں پہ رو رہا ہوں

ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں

خلیل الرحمٰن اعظمی



خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں
یوں شہر تا بہ شہر جو بکھرا ہوا ہوں میں

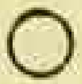
میں ڈھونڈنے چلا ہوں جو خود اپنے آپ کو
تہمت یہ مجھ پہ ہے کہ بہت خود نما ہوں میں

مجھ سے نہ پوچھ نام مرا، روحِ کائنات!
اب اور کچھ نہیں ہوں ترا آئینہ ہوں میں

جب نیند آ گئی ہو صدائے جرس کو بھی
میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں

لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے میں اپنا ہم نوا
خود اپنے ہر خیال سے ٹکرا چکا ہوں میں

اے عمرِ رفتہ! میں تجھے پہچانتا نہیں
اب مجھ کو بھول جا کہ بہت بے وفا ہوں میں



وہ رنگِ رُخ، وہ آتشِ خوں کون لے گیا
اے دل! ترا وہ رقصِ جنوں کون لے گیا

زنجیرِ آنسوؤں کی کہاں ٹوٹ کر گری!
وہ انتہائے غم کا سکوں کون لے گیا

دردِ نہاں کے چھین لیے کس نے آئینے
نوکِ مژہ سے قطرۂ خوں کون لے گیا

جو مجھ سے بولتی تھیں، وہ راتیں کہاں گئیں
جو جاگتا تھا سوزِ دروں، کون لے گیا

کس موڑ پہ بچھڑ گئے خوابوں کے قافلے
وہ منزلِ طرب کا فسوں کون لے گیا

جو شمع آتی رات جلی، کیوں وہ بجھ گئی
جو شوق ہو چلا تھا فزوں، کون لے گیا

خلیل الرحمٰن اعظمی



ہمیں بھی کیوں نہ ہو دعویٰ کہ ہم بھی یکتا ہیں
ہمارے خون کے پیاسے جب اہلِ دنیا ہیں

بس اس خطا پہ کہ پہچانتے ہیں کیوں سب کو
یہ صاحبانِ نظر شہر بھر میں رسوا ہیں

ہم اہلِ دل کا زمانہ ہی ساتھ دے نہ سکا
ہمیں بھی دکھ ہے کہ ہم اس سفر میں تنہا ہیں

ہمیں نہ جانو فقط ڈوبتا ہوا لمحہ
ہمیں یقیں ہے کہ ہم ہی نشانِ فردا ہیں

مٹا سکے گی ہمیں کیا کوئی سیہ بختی
ہم اپنا جسم بھی ہیں، ہم ہی اپنا سایہ ہیں

ہمیں پکار نہ اب اے عروسِ شبنم و گل
ہمیں نہ ڈھونڈھ کہ ہم بے کنار صحرا ہیں

صدائے ساز نہیں ہم نوائے غم ہی سہی
ہمیں سنو کہ ہمیں اعتبارِ نغمہ ہیں



سوتے سوتے چونک پڑے ہم خواب میں ہم نے کیا دیکھا
جو خود ہم کو ڈھونڈھ رہا ہو ایسا اک رستا دیکھا

دور سے اک پرچھائیں دیکھی اپنے سے ملتی جلتی
پاس سے اپنے چہرے میں بھی اور کوئی چہرا دیکھا

سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی
جب مٹی کی کھوج میں نکلے سونا ہی سونا دیکھا

سوکھی دھرتی سن لیتی ہے پانی کی آوازوں کو!
پیاسی آنکھیں بول اٹھتی ہیں ہم نے اک دریا دیکھا

آج ہمیں خود اپنے اشکوں کی قیمت معلوم ہوئی
اپنی چتا میں اپنے آپ کو جب ہم نے جلتا دیکھا

چاندی کے سے جن کے بدن تھے سورج کے سے مکھڑے تھے
کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے ان کا بھی سایہ دیکھا

رات وہی پھر بات ہوئی نا ہم کو نیند نہیں آئی
اپنی روح کے سناٹے سے شور سا اک اٹھتا دیکھا

خلیل الرحمٰن اعظمی



تو بھی اب چھوڑ دے ساتھ اے غمِ دنیا میرا
میری بستی میں نہیں کوئی شناسا میرا

شبِ غم پار لگا دے یہ سفینہ میرا
صبح ہو گی تو اتر جائے گا دریا میرا

مجھ کو معلوم نہیں نام ہے اب کیا میرا
ڈھونڈنے والے مجھے چھوڑ دے پیچھا میرا

میں نے دیکھی نہیں برسوں سے خود اپنی صورت
میرے آئینے سے روٹھا ہے سراپا میرا

تو بھی خوابوں میں ملی میں بھی دھندلکوں میں تجھے
زندگی! دیکھ کبھی غور سے چہرا میرا

گھر سے نکلا ہوں تو اب وہ کہیں جانے دے
روک اے گردشِ ایام نہ رستا میرا

دو قدم دوڑ کے آوازِ جرس بیٹھ گئی
چل پڑا میں تو کہیں پاؤں نہ ٹھہرا میرا

میرے دامن میں رہی خاکِ غریب الوطنی
رہ گیا دیکھ کے منھ دامنِ صحرا میرا



تیری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر! ذرا پکار مجھے

میں اپنے گھر کو بلندی پہ چڑھ کے کیا دیکھوں
عروجِ فن! مری دہلیز پہ اتار مجھے

ابلتے دیکھی ہے سورج سے میں نے تاریکی
نہ راس آئے گی یہ صبحِ زرنگار مجھے

کہے گا دل تو میں پتھر کے پاؤں چوموں گا
زمانہ لاکھ کرے آ کے سنگسار مجھے

وہ فاقہ مست ہوں جس راہ سے گزرتا ہوں
سلام کرتا ہے آشوبِ روزگار مجھے

محبوب خزاں



حسرتِ آب و گِل دوبارہ نہیں
دیکھ، دنیا نہیں — ہمیشہ نہیں

سوچنے کا کوئی نتیجہ نہیں
سایہ ہے، اعتبارِ سایہ نہیں

سادہ کاری کئی پرت، کئی رنگ
سادگی اک ادائے سادہ نہیں

اچھے لگتے ہیں اچھے لوگ سبھے
جو سمجھتے ہیں اُن سے پردہ نہیں

میں نہیں اور کس طرح جاؤں
تو کسی اور کے علاوہ نہیں

تجھ سے بھاگے، سکون سے بھاگے
سرگراں ہیں کہ دل گرفتہ نہیں

رات زنجیر سی قدم بہ قدم
ایک منزل ہے، کوئی جادہ نہیں

حسن تو ہو چلا زمانہ شناس
عشق کا بھی کوئی بھروسہ نہیں

سنتے ہیں اک جزیرہ ہے کہ جہاں
یہ بلائے حواسِ خمسہ نہیں

اے ستارو کسے پکارتے ہو
اس خرابے میں کوئی زندہ نہیں

چاندنی کھیلتی ہے پانی سے
اتنی برسات ہے کہ سبزہ نہیں

کیسے بے درد ہیں کہ جوڑتے ہیں
نرم الفاظ، جن میں رشتہ نہیں

کہیں ایجادِ محض، بے مفہوم
کہیں مفہوم ہے تو لہجہ نہیں

کہیں تصویر، تاک نقشے بغیر
کہیں دیوار ہے، دریچہ نہیں

اُن سے کاغذ میں جان کیسے پڑے
جن کی آنکھوں میں عکسِ تازہ نہیں

دشمنی ہے تو دشمنی ہی سہی
میں نہیں یا دکانِ شیشہ نہیں

خاک سے کس نے اُٹھتے دیکھی ہے
وہ قیامت کہ استعارہ نہیں

کبھی ہر سانس میں زمان و مکاں
کبھی برسوں میں ایک لمحہ نہیں

بیکلی تار کستی جائے خزاں
حسرتِ آب و گِل دوبارہ نہیں

محبوب خزاں



سنبھالنے سے طبیعت کہاں سنبھلتی ہے
وہ بے کسی ہے کہ دنیا رگوں میں چلتی ہے

یہ سرد مہر اُجالا، یہ جیتی جاگتی رات
ترے خیال سے تصویرِ ماہ جلتی ہے

وہ چال ہو کہ بدن ہو، کماں جیسی کشش
قدم سے گھات، ادا سے ادا نکلتی ہے

تمھیں خیال نہیں، کس طرح بتائیں تمھیں
کہ سانس چلتی ہے لیکن اداس چلتی ہے

تمھارے شہر کا انصاف ہے عجب انصاف
اِدھر نگاہ اُدھر زندگی بدلتی ہے

کبھی کہا کہ یہاں جان جلتی ہے اپنی
تو پوچھتے ہیں، بھلا جان کیسے جلتی ہے

بکھر گئے مجھے سانچے میں ڈھالنے والے
یہاں تو ذات بھی سانچے سمیت ڈھلتی ہے

خزاں ہے حاصلِ ہنگامۂ بہار و خزاں
بہار پھولتی ہے، کائنات پھلتی ہے

محبوب خزاں



یہ جو ہم کبھی کبھی سوچتے ہیں رات کو
رات کیا سمجھ سکے ان معاملات کو

حسن اور نجات میں فصلِ مشرقین ہے
کون چاہتا نہیں حسن کو، نجات کو

یہ سکونِ بے جہت، یہ کشش عجیب ہے
تجھ میں بند کر دیا کس نے شش جہات کو

ساحلِ خیال پر کہکشاں کی چھوٹ تھی
ایک موج لے گئی اُن تجلیات کو

آنکھ جب اُٹھے، بھر آئے، شراب کہا نہ جائے
کیسے بھول جائیے بھولنے کی بات کو

دیکھ لے مری نگاہ، تو بھی ہے جہاں بھی ہے
کس نے باخبر کہا دوسرے کی ذات کو

کیا ہوئیں روایتیں، اب ہیں کیوں شکایتیں
عشقِ نامراد سے عمرِ بے ثبات کو

اے بہارِ سرگراں تو خزاں نصیب ہے
اور ہم ترس گئے تیرے التفات کو



دیکھ دریا ہے، کنارے کو سنبھال
یہ محبت، یہ محبت کا زوال

اس زمانے کو ترس جائیں گے ہم
آہ یہ تشنگیِ ہجر و وصال

میٹھی باتوں سے ادا جاگتی ہے
نرم آنکھوں میں سنورتے ہیں خیال

زخم بگڑے تو بدن کاٹ کے پھینک
ورنہ کانٹا بھی محبت سے نکال

آپ کی یاد بھی آجاتی ہے
اتنی محروم نہیں بزمِ خیال

خط جو آیا ہے، انہیں کا ہوگا

ہاں ذرا آج طبیعت تھی بحال

ہائے پھر فصلِ بہار آئی خزاں
کبھی مرنا، کبھی جینا ہے محال

محبوب خزاں



محبت پر نہ بھولو، محبت بے کسی ہے
سکونِ سرو و سنبل، سب اپنی سادگی ہے

کہاں وہ بے خودی تھی کہ خود ہم بے خبر تھے
اب اتنی بے کلی ہے کہ دنیا جانتی ہے

کہو مجھ سے کہ دل میں نہیں کوئی شکایت
طبیعت منچلی ہے، بہانے ڈھونڈتی ہے

نمک سا گفتگو میں، انوکھی مسکراہٹ
بدن پر دھیرے دھیرے قیامت آ رہی ہے

تجھے کیسے دکھاؤں، یہ راتیں یہ اُجالے
جوانی سو گئی ہے، محبت جاگتی ہے

اُسی کا شکوہ ہر دم، اُسی کا ذکر سب سے
اگر یہ دشمنی ہے، تو اچھی دشمنی ہے

تھکن ہے جاں فزا سی، برستی ہے اُداسی
ستارے کہہ رہے ہیں کہ منزل آ گئی ہے

پلٹ کر یوں نہ دیکھو، اُمڈتے بادلوں سے
بہارِ بے خزاں بھی سرکتی چاندنی ہے



کوئی قریب نہ آئے شکستہ پا ہوں میں
کرم تو ہے، مگر انجام دیکھتا ہوں میں

مری نگاہ میں کچھ اور ڈھونڈنے والے
تری نگاہ میں کچھ اور ڈھونڈتا ہوں میں

زمانہ دیر فراموش تو نہیں اتنا
یہ ٹھیک ہے کہ بہت دیر آشنا ہوں میں

غلط نہیں وہ جو شکوے اب آپ کو ہوں گے
بدل گیا ہے زمانہ، بدل گیا ہوں میں

مجھے ستاؤ نہیں، زندگی نگاہ میں ہے
فریب کھاؤ نہیں، تم کو جانتا ہوں میں

مرا غرورِ محبت کہ میں نہیں سمجھا
تری نظر نے کہا تھا کہ دلربا ہوں میں

محبوب خزاں

○

ہم آپ قیامت سے گزر کیوں نہیں جاتے
جینے کی شکایت ہے تو مر کیوں نہیں جاتے

کتراتے ہیں، بل کھاتے ہیں، گھبراتے ہیں، کیوں لوگ
سردی ہے تو پانی میں اتر کیوں نہیں جاتے

آنکھوں میں چمک ہے تو نظر کیوں نہیں آتا
پلکوں پہ گہر ہیں تو بکھر کیوں نہیں جاتے

اخبار میں روزانہ وہی شور ہے، یعنی
اپنے سے یہ حالات سنور کیوں نہیں جاتے

یہ بات ابھی مجھ کو بھی معلوم نہیں ہے
پتھر ادھر آتے ہیں، ادھر کیوں نہیں جاتے

تیری ہی طرح، اب ترے ہجر کے دن بھی
جاتے نظر آتے ہیں، مگر کیوں نہیں جاتے

اب یاد کبھی آتے، تو آئینے سے پوچھو
محبوب خزاں شام کو گھر کیوں نہیں جاتے

○

جنوں سے کھیلتے ہیں، آگہی سے کھیلتے ہیں
یہاں تو اہلِ سخن آدمی سے کھیلتے ہیں

نگارِ میکدہ، سب سے زیادہ قابلِ رحم
وہ تشنہ کام ہیں جو تشنگی سے کھیلتے ہیں

فرازِ عشق نشیبِ جہاں سے پہلے تھا
کسی سے کھیل چکے ہیں، کسی سے کھیلتے ہیں

نہار ہی ہے دھنک زندگی کے سنگم پر
پرانے رنگ نئی روشنی سے کھیلتے ہیں

تمام عمر یہ افسردگانِ محفلِ گل
کلی کو چھیڑتے ہیں، بے کلی سے کھیلتے ہیں

جو کھیل جانتے ہیں، اُن کے اور ہیں انداز
بڑے سکون، بڑی سادگی سے کھیلتے ہیں

خزاں کبھی تو کہو ایک اس طرح کی غزل
کہ جیسے راہ میں بچے خوشی سے کھیلتے ہیں

محبوب خزاں



ہر بات یہاں بات بڑھانے کے لیے ہے
یہ عمر جو دھوکا ہے تو کھانے کے لیے ہے

یہ دامنِ حسرت ہے وہی خوابِ گریزاں
جو اپنے لیے ہے نہ زمانے کے لیے ہے

اُترے ہوئے چہرے میں شکایت ہے کسی کی
رُوٹھی ہوئی رنگت ہے منانے کے لیے ہے

غافل تری آنکھوں کا مقدّر ہے اندھیرا
یہ فرش تو راہوں میں بچھانے کے لیے ہے

گھبرا نہ ستم سے، نہ کرم سے، نہ ادا سے
ہر موڑ یہاں راہ دکھانے کے لیے ہے



دُکھ بہت ہیں زندگی میں کیا کریں گے ہم؟
وُہ جو تیرا فرض تھا ادا کریں گے ہم

دِن کو اتنے کام کس طرح کرے گا، کون؟
رات بھر تو جاگتے رہا کریں گے ہم

آدھی عمر کٹ گئی خیال و خواب میں
شعر سب کہیں گے اور سُنا کریں گے ہم

محسن احسان



صوفیٔ شہر مرے حق میں دعا کیا کرتا
خود تھا محتاجِ عطا، مجھ کو عطا کیا کرتا

اپنی آواز کے سناٹے سے ہول آتا تھا
میں بیابانِ تمنا میں صدا کیا کرتا

سانس لیتے ہوئے سینے میں جلن ہوتی ہے
میں ترے شہر کی شاداب فضا کیا کرتا

محتسب جرم مرا دیکھ کے خاموش رہا
خود خطاکار تھا، احکامِ سزا کیا کرتا

اس فضا میں تو فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
میں یہاں جراتِ پرواز بھلا کیا کرتا

میں لٹا کر بھی متاعِ دل و دیدہ خوش ہوں
مجھ سے رہبر گلۂ مہر و وفا کیا کرتا

رفعتِ دار بھی چھو لی تری خاطر میں نے
منکرِ عہد وفا! اور بتا کیا کرتا

تم نے تو چھین لی مجھ سے مری گویائی بھی
میں تو اِک کاغذِ آتش زدہ تھا، کیا کرتا

اب نہ وہ کشت ہی باقی ہے نہ وہ حاصلِ کشت
اور اس دل کا زیاں سیلِ بلا کیا کرتا

خود فراموشی کے صحراؤں میں گم تھا محسن
کوئی اس بے خبرِ جاں سے گلہ کیا کرتا

محسن احسان



صبا میں تھا، نہ دل آویزیٔ بہار میں تھا
وہ اک اشارہ کہ اُس چشمِ وضعدار میں تھا

گزر کچھ اور بھی آہستہ اے نگارِ وصال
کہ ایک عمر سے میں تیرے انتظار میں تھا

ہوائے دہر کی زد میں بھی آ کے بجھ نہ سکی
بلا کا حوصلہ اک شمعِ رہگذار میں تھا

ہم اپنی دھن میں چلے آئے جانبِ منزل
پلٹ کے دیکھا تو اک کارواں غبار میں تھا

ملا تو پھول کھِل اٹھے تھے شاخِ مژگاں پر
جدا ہوا تو لہو چشمِ اشکبار میں تھا

تجھے پکار کے چُپ ہو گئے ہیں دیوانے
بس اک نعرۂ مستانہ اختیار میں تھا

اب اک کرن بھی نہیں نیم وا دریچے میں
خوشا وہ دن کہ کوئی میرے انتظار میں تھا

ہوائے کم نگہی نے بجھا دیا، ورنہ
میں وہ چراغ کہ روشن حریمِ یار میں تھا

تری نگاہ سے اوجھل سہی مگر محسنؔ
خزاں کا عکس بھی آئینۂ بہار میں تھا

○

میں ایک عمر کے بعد آج خود کو سمجھا ہوں
اگر رکوں تو کنارا، چلوں تو دریا ہوں

جو لب کشا ہوں تو ہنگامۂ بہار ہوں میں
اگر خموش رہوں تو سکوتِ صحرا ہوں

تجھے خبر بھی ہے کچھ، اے مسرتوں کے نقیب
میں کب سے سایۂ دیوارِ غم میں بیٹھا ہوں

جھلس گئی ہے ہوائے دیارِ درد مجھے
بس ایک پل کے لئے شہرِ غم میں ٹھہرا ہوں

مری خودی میں نہاں ہے مرے خدا کا وجود
خدا کو بھول گیا، جب سے خود کو سمجھا ہوں

میں اپنے پاؤں کا کانٹا، میں اپنے غم کا اسیر
مثالِ سنگِ گراں راستے میں بیٹھا ہوں

بلندیوں سے مری سمت دیکھنے والے
مرے قریب تو آ، میں بھی ایک دنیا ہوں

اگر ہے مقتلِ جاناں کا رخ تو اے محسن
ذرا ٹھہر کہ ترے ساتھ میں بھی چلتا ہوں

○

اک تلاطم سا ہے ہر سمت تمناؤں کا
دل پہ ہوتا ہے گماں، شہر ہے دریاؤں کا

تو بھی اک بار مری روح کے آئینے میں
جھانک کر دیکھ، تقدس ہے کلیساؤں کا

ہاں مگر قتل گہِ شوق میں کچھ اور بھی تھے
ہاتھ کیوں مجھ پہ اٹھا میرے مسیحاؤں کا

اب کے گھنگھور گھٹا کھل کے جو برسے بھی تو کیا
دھوپ نے رنگ ہی کجلا دیا صحراؤں کا

اب سرِ دشتِ خود آرائی کھڑا ہوں تنہا
میں کہ دولہا تھا کبھی انجمن آراؤں کا

محسن احسان کی اس سادہ دلی کے صدقے
دھوپ میں ڈھونڈتا پھرتا ہے مزا چھاؤں کا

○

کسی کے سامنے اظہارِ دردِ جاں نہ کروں
اِدھر اُدھر کی کہوں، زخمِ دل عیاں نہ کروں

لگا کے آگ بدن میں، وہ مجھ سے چاہتا ہے
کہ سانس لوں تو فضا کو دھواں دھواں نہ کروں

میں اسکو پڑھتا ہوں انجیلِ آرزو کی طرح
سمجھ میں آئے تو معنی ہر اِک بیاں نہ کروں

غضب ہے مجھ سے توقع زمانہ رکھتا ہے
کہ پاشکستگی میں رنجِ رفتگاں نہ کروں

یہ حکم مجھ کو ملا قصرِ خسروی سے، کہ میں
فغاں سنوں مگر اندازۂ فغاں نہ کروں

مزے سے سوؤں اگر ہاتھ آئے شامِ فراق
میں ایک لمحہ بھی اس شب کا رائیگاں نہ کروں

اٹھا کے سر پہ پھروں بارِ آرزو محسنؔ
کمر کو خم میں کبھی صورتِ کماں نہ کروں

○

موت سے یاری نہ تھی، ہستی سے بیزاری نہ تھی
اس سفر پہ چل دیئے ہم، جس کی تیاری نہ تھی

ہم اسی کی خاک سے اٹھے ہیں کندن بن کے آج
دوستو، جس شہر میں رسمِ وفاداری نہ تھی

ہم نے خونِ آرزو دے کر منقش کر دیا
ورنہ دیوارِ طلب پہ ایسی گلکاری نہ تھی

مر گئے سر پھوڑ کے دیوارِ زنداں سے اسیر
زندگی کنجِ قفس میں موت سے پیاری نہ تھی

اب شکستِ آرزو ہے باعثِ تسکینِ دل
اس سے پہلے تو کبھی یہ کیفیت طاری نہ تھی

جل رہا ہے ہر نفس اب اپنے غم کی آنچ سے
سانس لینے میں کبھی محسنؔ یہ دشواری نہ تھی



مرے وجود کے دوزخ کو سرد کر دے گا
اگر وہ ابرِ کرم ہے تو کھل کے برسے گا

گلہ نہ کر کہ ہے آغازِ شب ابھی پیارے
ڈھلے گی رات تو یہ درد اور چمکے گا

قدح کی خیر مناؤ کہ اب کے بارشِ سنگ
اگر ہوئی تو طربزارِ شب بھی ڈوبے گا

یہ شہرِ کم نظراں ہے، ادھر نہ کر آنکھیں
یہاں اشارۂ مژگاں کوئی نہ سمجھے گا

میں اس بدن میں اتر جاؤں گا نشے کی طرح
وہ ایک بار اگر پھر پلٹ کے دیکھے گا

رواں تو ہوں سوئے افلاکِ آرزو لیکن
یہ زورِ موجِ ہوا بازوؤں کو توڑے گا

اگر ہے شوقِ اسیری تو موند لے آنکھیں
تو عمر بھر در و دیوار بھی نہ دیکھے گا

تلاشِ قافلۂ زندگی ہے اب بے سود
یہ رہگزارِ نفس پر کہیں نہ ٹھہرے گا

نہ آنکھ میں کوئی جنبش، نہ پاؤں پر کوئی گرد
جہاں سے اتنا بھی محتاط کون گزرے گا

رہے گی دل میں نہ جب کوئی بھی خلش محسنؔ
بھلا چکا ہے جسے تو کسے پکارے گا



شاخِ مژگانِ محبت پہ سجا لے مجھ کو
برگِ آوارہ ہوں، صرصر سے بچا لے مجھ کو

رات بھر چاند کی ٹھنڈک میں سلگتا ہے بدن
کوئی تنہائی کے دوزخ سے نکالے مجھ کو

دور رہ کے بھی ہے ہر سانس میں خوشبو تیری
میں مہک جاؤں جو تو پاس بلا لے مجھ کو

میں تری آنکھ سے ڈھلکا ہوا اک آنسو ہوں
تو اگر چاہے، بکھرنے سے بچا لے مجھ کو

شب غنیمت تھی کہ یہ زخمِ نظارہ تو نہ تھا
ڈس گئے صبحِ تمنا کے اجالے مجھ کو

میں منقش ہوں تری روح کی دیواروں پر
تو مٹا سکتا نہیں، بھولنے والے، مجھ کو

صبح سے شام ہوئی، روٹھا ہوا بیٹھا ہوں
کوئی ایسا نہیں، آ کر جو منا لے مجھ کو

تہ بہ تہ موجِ طلب کھینچ رہی ہے محسنؔ
کوئی گردابِ تمنا سے نکالے مجھ کو



سحر سے ایک کرن کی فقط طلب تھی مجھے
تمام رات مگر بیکلی غضب تھی مجھے

کنارِ شام پہ سُرخی شفق کی دوڑ گئی
لہو اگلنے کی یوں آرزو بھی کب تھی مجھے

پتے کی اک نہ کہی صبح کے اجالوں میں
یہ اور بات کہ ازبر حدیثِ شب تھی مجھے

میں تیری روح کی پہنائی میں اتر نہ سکا
کہ تجھ سے صرف تمنائے لب بہ لب تھی مجھے

میں خود ہی بزم بھی اور خود ہی بزم آرا بھی
کہ ناگوار ہر اک محفلِ طرب تھی مجھے

میں اپنے وقت کا سقراط تو نہیں لیکن
جہاں پہ بات چھڑی پھر وہیں پہ شب تھی مجھے

میں اپنی ذات کے اندر کبھی نہ جھانک سکا
یہ اور بات کہ یہ آرزو بھی کب تھی مجھے

فصیلِ شب سے کوئی اب پکارتا ہے تو کیا
ملا نہ ایک بھی اس دن تلاش جب تھی مجھے

شکایتِ شبِ ہجراں کبھی نہ کی محسنؔ
حکایتِ غمِ دل ورنہ یاد سب تھی مجھے



نگارِ فن پہ حریفانِ شعر کی یلغار
نیامِ حرف، کہاں ہے خیال کی تلوار

رہینِ مرگِ تمنا تھی کامرانیٔ وصل
جھلس گیا ہے مجھے قربِ شعلۂ رخسار

ہوا کچھ ایسی چلی دشتِ نامرادی سے
اجڑ کے بس نہ سکے پھر کبھی دلوں کے دیار

کڑکتی دھوپ میں اب اور کس جگہ بیٹھوں
سمٹ کے بن گیا دیوار ـــــ سایۂ دیوار

جلا گئی ہے مری آگ پیرہن میرا
میں کیا گلہ کروں تجھ سے، چراغِ محفلِ یار

ذرا رسائیٔ منزل گہِ مراد تو دیکھ
چلے تھے شہرِ وفا سے، پہنچ گئے سرِ دار

یہ کس نے سروِ گلستاں کا ذکر چھیڑا ہے
بکھر چلا ہے نگاہوں میں پیکرِ قدِ یار

یہ کس جزیرۂ بے رنگ و بو میں بستے ہیں
نہ طائرانِ عجم ہیں، نہ آہوانِ تتار

یہ کون گزرا ہے محسنؔ خرابۂ دل سے
کہ اڑ رہا ہے ہر اک سمت حسرتوں کا غبار

عمیق حنفی



ہے نورِ خدا بھی یہاں، عرفانِ خدا بھی
یہ ذات کہ ہے وادیِ سینا بھی، حرا بھی

اس بن میں کیا کرتی ہے تپ میری انا بھی
اس شہر میں ہے کارگہِ ارض و سما بھی

کرتا ہوں طواف اپنا تو ملتی ہے نئی راہ
قبلہ بھی ہے یہ ذات، مرا قبلہ نما بھی

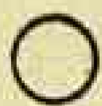
خود آگہی و خود نگہی کا ہے یہ انعام
اور جرمِ شناساییِ عالم کی سزا بھی

ہوتا ہے شب و روز تماشا سرِ احساس
جو دیکھتی رہتی ہے، مری آنکھ! دکھا بھی

کرتی ہے کمر بستہ سفر پر بھی یہی ذات
جب دُور نکل جاتا ہوں، دیتی ہے صدا بھی

ذرّے میں ہے کونین تو کونین میں ذرّہ
کچھ ہے تجھے، آوارۂ افلاک! پتا بھی

عمیق حنفی



عمیقؔ چھیڑ غزل، غم کی انتہا کب ہے
یہ مالوے کی جنوں خیز چودھویں شب ہے

مجھے شکایتِ تلخیٔ زہرِ غم کب ہے
مرے لبوں پہ ابھی کیفِ تشکر لب ہے

لکیر کھنچتی چلی جا رہی ہے تا بہ جگر
فروغِ مے ہے کہ مشقِ جراحتِ شب ہے

یہ محویت ہے؟ کہ رعبِ جمال ہے طاری؟
خلافِ رسمِ جنوں، دل بہت مؤدب ہے

کبھی حرم میں ہے کافر تو دَیر میں مومن
نہ جانے کیا، دلِ دیوانہ! تیرا مذہب ہے

بہت محال تھا، ورنہ، کہ دل فریب میں آئے
کسی کے غم سی غمِ کائنات کی چھب ہے

چمن میں پھول کھلاتی پھرے بہار تو کیا
کسی کے بندِ قبا ٹوٹنے لگیں، تب ہے

عمیق حنفی



اکثر رات گئے تک میں چوکھٹ پر بیٹھا رہتا ہوں
سگرٹ پیتا، چاند کو تکتا، من میں بکتا رہتا ہوں

ریک پہ رکھ کر بھول گیا تھا اس کے چہرے ایسی کتاب
ہاتھ میں جب آجاتی ہے تو پہروں پڑھتا رہتا ہوں

مرمر کا پتھر بن جاتی ہے جب پورے چاند کی رات
اپنی نظروں کی چھینی سے مورتیں گھڑتا رہتا ہوں

آخری شو سے لوٹنے والے بھی غائب ہو جاتے ہیں
میں جانے کن تصویروں میں کب تک کھویا رہتا ہوں



پھول کھلے ہیں۔ لکھا ہوا ہے۔ توڑو مت
اور مچل کر جی کہتا ہے۔ چھوڑو مت

رات متوالی، رات نشیلی، چاند جوان
گھر کا آمد خرچ یہاں تو جوڑو مت

دل کو پتھر کر دینے والی یادو!
اب اپنا سر اس پتھر سے پھوڑو مت

اب نہ عمیق کی آنکھوں سے دل میں جھانکو
اس گہرے ساگر سے ناطہ جوڑو مت

عمیق حنفی



میں بھی کب سے چپ بیٹھا ہوں، وہ بھی کب سے چپ بیٹھی ہے
یہ بے وصال کی رسم انوکھی، یہ ملنے کی ریت نئی ہے

وہ جب مجھ کو دیکھ رہی تھی، میں نے اُس کو دیکھ لیا تھا
بس اتنی سی بات تھی لیکن بڑھتے بڑھتے کتنی بڑھی ہے

بے صوت، بے جسم آوازیں اندر بھیج رہی ہیں ہوائیں
بند ہیں کمرے کے دروازے، لیکن کھڑکی کھلی ہوئی ہے

میرے گھر کی چھت کے اُوپر سورج آیا، چاند بھی اترا
چھت کے نیچے کمروں کی جیسی تھی اوقات، وہی ہے



یوں ہوا ہے چاک ملبوسِ یقیں، سِلتا نہیں
پھینک دینا بھی ہے مشکل، دوسرا ملتا نہیں

خواب جو دیکھے نہ تھے، ان کی سزا تو مل گئی
بارہا دیکھا جنھیں، ان کا صلہ ملتا نہیں

چل رہی ہے سانس کی آندھی، اڑا جاتا ہے دل
اُس کا پتّا ہے ایسا، ڈال سے ہلتا نہیں

میری ہمت دیکھیے، اس دشت میں لیتا ہوں سانس
نقشِ پائے باد بھی جس دشت میں ملتا نہیں

عمیق حنفی



ہم کہ جو بیٹھے ہوئے ہیں اپنے سر پکڑے ہوئے
آپ ہی زنجیر ہیں اور آپ ہی جکڑے ہوئے

شام۔ پیلی راکھ میں خونِ شفق کا انجماد
رات۔ جیسے خواب یخ بستہ ہوں، دن۔ اکڑے ہوئے

رنگ کے پہرے ہیں رخساروں کی آب و تاب پر
اور رنگوں کو ہیں زلفوں کی لٹیں جکڑے ہوئے

دھوپ نے ناخن ڈبوئے ہیں گلوں کے خون میں
زخم خوردہ خوشبوئیں پھرتی ہیں سر پکڑے ہوئے

رات، کالی رات، پیڑوں کو ہلاتی آندھیاں
اور ہم بیٹھے طنابِ خواب ہیں پکڑے ہوئے



کہنے کو شمعِ بزمِ زمان و مکاں ہوں میں
سوچو تو صرف کشتۂ دورِ جہاں ہوں میں

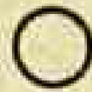
آتا ہوں میں زمانے کی آنکھوں میں رات دن
لیکن خود اپنی آنکھوں سے اب تک نہاں ہوں میں

اک ڈوبتے وجود کی خود ہی پکار ہوں
اور آپ ہی وجود کا اندھا کنواں ہوں میں

سگرٹ، جسے سلگتا ہوا کوئی چھوڑ دے
اس کا دھواں ہوں اور پریشاں دھواں ہوں میں

جاتا نہیں کناروں سے آگے کسی کا دھیان
کب سے پکارتا ہوں۔ یہاں ہوں، یہاں ہوں میں

جاوید شاہیںؔ



دلِ گرفتہ کے سب پیچ و تاب کھول کے دیکھ
ہوا کا زور، محیطِ حباب کھول کے دیکھ

مرے لہو کو نمائشِ گہرِ وفا سے اُٹھا
ہے جمع و خرچ بہت، یہ حساب کھول کے دیکھ

یہ کس طلسم سے ہر شے ہے مثلِ سنگ خموش
اے نقش گر! درِ شہرِ خراب کھول کے دیکھ

کہیں تو دشت میں ٹھہرے گی موجِ آبِ گریز
رواں ہوا ہے تو رازِ سراب کھول کے دیکھ

دھڑکتے دل سے نہ موجوں کی رزم گہ میں اُتر
خطِ سفر کو کفِ دستِ آب کھول کے دیکھ

ہیں کب سے تشنۂ معنی مرے حروفِ بدن
فراغ ہو تو کبھی یہ کتاب کھول کے دیکھ

ذرا سُراغ لگا میرے رنگِ خستہ کا
غزل کی دھوپ میں بندِ نقاب کھول کے دیکھ

گلوں کو کس لیے ڈستی ہیں چاندنی راتیں
کہاں ہے زہر، رگِ ماہتاب کھول کے دیکھ

مزا تو جب ہے کہ گلشن میں جشنِ شعلہ ہو
بھری بہار میں داغِ گلاب کھول کے دیکھ

کنارِ دشتِ بلا کون ہے مکیں شاہیںؔ
خموش، سُونی حویلی کا باب کھول کے دیکھ

جاوید شاہین



خسِ بدن میں برنگِ شرار آئے کوئی
چمک اٹھوں میں، غمِ آب دار آئے کوئی

مری نظر میں پرکھتے ہیں گرم و سردِ جہاں
میں جانچ لوں گا، زرِ کم عیار آئے کوئی

ہے زخم زخم بدن سنگِ حرفِ تلخ سے آج
کہیں سے نرمیِ لب کی پھوار آئے کوئی

میں جل گیا دلِ ویراں کی خشک وادی میں
فرازِ درد سے پھر آبشار آئے کوئی

یہ دشتِ تشنہ لبی چھوڑ کر میں کیوں جاؤں
مرے لیے تو یہیں جوئے بار آئے کوئی

ہے زعمِ شعلہ تو دیکھے ہوائے درد کا زور
چراغ ہے تو سرِ رہگزار آئے کوئی

اک اور بھی ہے جہاں اس جہانِ جبر سے دور
مجال ہے تو وہاں شہریار آئے کوئی

غنیمِ شب کو میں زخموں سے چور کر آیا
سحر کا آخری نیزہ بھی مار آئے کوئی

ٹھہر گئے ہیں کہاں میرے ہمسفر شاہیںؔ
کھڑا ہوں دیر سے جنگل کے پار آئے کوئی

جاوید شاہین



جو برف زار چیر دے، ایسی کرن بھی لا
پتھر دلوں میں آج کوئی کوہکن بھی لا

اِس طرح سرسری مرا بابِ وفا نہ لکھ
وقتِ شمارِ زخم، مرا خستہ تن بھی لا

منصف اگر بنا ہے تو سب کو گواہ رکھ
انصاف ہے تو میرا پھٹا پیرہن بھی لا

جلنے لگے ہیں پیاس سے پھولوں کے خشک ہونٹ
ابرِ بہار کو ذرا سوئے چمن بھی لا

چُپ چاپ خلوتوں میں پگھلنے سے فائدہ
کوئی چراغ ہے تو سرِ انجمن بھی لا

اِتنا وہ شادماں مجھے اچھا نہیں لگا
اُس گل کے دل میں داغ کی تھوڑی جلن بھی لا

زخمِ سفر کے دردِ مسلسل کا سحر توڑ،
نکلا ہوا وطن سے غریب الوطن بھی لا

یہ چشمِ التفات ہی کافی نہیں مجھے
میرے لیے تو زخمِ کام و دہن بھی لا

شاہیں اسے عزیز ہے اپنا لہو تو کیا
نعشِ شہید کے لیے خونیں کفن بھی لا



بگولے بہت ہیں مری گھات میں
گھرا ہوں عجب دشتِ حالات میں

کبھی خوں سے رنگیں بھی ہو چشمِ تر
دھنک بھی نظر آئے برسات میں

کسی درد کی آنچ دے کر پرکھ
چمکتی ہے اِک شے مری ذات میں

لکیروں کا ہر سلسلہ بیکراں
کھُلے پانیوں کا سفر ہات میں

وہی تیری آنکھوں کے حیرت کدے
وہی ہیں جہانِ طلسمات میں

سیہ گھر کی بیمار ضو سے نکل
ذرا گھوم پھر چاندنی رات میں

بچھا ہے کہیں ذہن میں دام سا
پھڑکتا ہے کوئی خیالات میں

بجا نرمیِ لفظ شاہیں مگر
لیے پھر کوئی سنگ بھی ہات میں

جاوید شاہین



یہ برف زار بدن سے نہ جاں سے نکلے گا
لہو ہو سرد تو شعلہ کہاں سے نکلے گا

ہزار گھیرے رہے جبر کا حصارِ سیہ
کہ بابِ راہِ اماں درمیاں سے نکلے گا

جو تلخ حرف پسِ لب ہے، عام بھی ہو گا
چڑھا ہے تیر تو آخر کماں سے نکلے گا

جو پیڑ پھل نہیں دیتے وہ کاٹتے جاؤ
خزاں کا زہر یونہی گلستاں سے نکلے گا

ذرا چلے تو سہی پانیوں پہ تیز ہوا!
کھڑا سفینہ کھلے بادباں سے نکلے گا

کوئی تو کام لو غم سے، رگیں ہی چمکاؤ
جلیں گی شمعیں، اندھیرا مکاں سے نکلے گا

کھلے ہیں راستوں کے بھید تو سمجھ شاہیںؔ
یہ کارواں سفرِ رائیگاں سے نکلے گا



بیگانگی کے بام سے پل بھر اتر کے دیکھ
مَیں کون ہوں، مجھے بھی ذرا آنکھ بھر کے دیکھ

کیوں بدگماں ہے خلقِ خدا تیری ذات سے
لوگوں میں بیٹھ اور ذرا بات کر کے دیکھ

ایسی کِرن، کہ جوڑ سکے رشتۂ بدن
ان ظلمتوں میں فاصلے قلب و نظر کے دیکھ

دشتِ بلا میں کتنے بگولے ہیں گھات میں
مَیں تو گذر چکا، ذرا تو بھی گذر کے دیکھ

اعزازِ خسروی سے نہ میری وفا کو ناپ
فرصت ملے کبھی تو مرے زخم بھر کے دیکھ

کِس زہر کے اثر سے اُلجھتی ہے میری سانس
دم بھر دھواں دھواں سی فضا میں ٹھہر کے دیکھ

شاہیںؔ وہ گاؤں پھر تری قسمت میں ہو نہ ہو
بہتر ہے خواب اجڑے ہوئے بام و در کے دیکھ

جاوید شاہین



یہ جاں گداز سفر دامِ خواب ہو نہ کہیں
رواں ہے جس میں سفینہ، سراب ہو نہ کہیں

یونہی اترتا نہ جا سرد گہرے پانی میں
چمکتا ہے جو بہت سحرِ آب ہو نہ کہیں

کھڑا جو جھانکتا ہے کب سے گرم کمروں میں
گلی میں ٹھٹھرا ہوا ماہتاب ہو نہ کہیں

ہوا یہ کون سی چلتی ہے آر پار مرے
کھلا ہوا کسی خواہش کا باب ہو نہ کہیں

دلوں پہ کیوں نہیں کرتیں اثر تری باتیں
زمیں تو ٹھیک ہے، پانی خراب ہو نہ کہیں

غبار سے بھری بوجھل فضا ہے دل پہ محیط
گرج رہا ہے جو سر میں، سحاب ہو نہ کہیں

سجائے پھرتا ہے وہ جس کو کوٹ پر شاہیں
مرے ہی خوں کا مہکتا گلاب ہو نہ کہیں!



اب یہاں لوگوں کے دُکھ سکھ کا پتا کیا آئے
بند ہوں گھر تو مکینوں کی صدا کیا آئے

ڈوبتے دن کی جلو میں نہ سکوں ہے نہ فراغ
شفقِ شام سے چہروں پہ ضیا کیا آئے

سرد سینوں میں پہنچتے ہی نہیں درد کے بیج
اِن خرابوں پہ برسنے کو گھٹا کیا آئے

دُور ہو کیسے ترے جسم، تری جاں کی گھٹن
تنگ، بے روزن و در گھر میں ہوا کیا آئے

کھو چکے لُطفِ سحر خیزی گراں خواب مکین
صبح دم بند دریچوں میں صبا کیا آئے

خشک پتے ہیں کہ جھڑتے ہی نہیں پیڑوں سے
کیسے تبدیل ہو رُت، رنگ نیا کیا آئے

گرم ہنگامہ کرے کون رگوں میں شاہیں
خشک ندیوں میں کوئی موجِ بلا کیا آئے

جاوید شاہین



اِک عجب وحشت سے دل سینوں میں بے کل ہو گئے
چاند کیا نکلا، خوشی سے لوگ پاگل ہو گئے

دھوپ سے سہمے پرندوں کو اماں ملتی نہیں
سختیِ مہرِ خزاں سے خشک جنگل ہو گئے

راہ میں چھاؤں ذرا سی کر گئی مجھ کو خراب
دو گھڑی رُکنے سے میرے پاؤں بوجھل ہو گئے

اب تو بھرتا ہی نہیں بے آب آئینوں میں رنگ
کون سے منظر مری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے

بے حسی آخر نکل آئی مرے غم کا علاج
برف رکھنے سے مرے گھاؤ سبھی شل ہو گئے

کیا بتاؤں بڑھ گیا دل میں تمناؤں کا حال
اِس زمینِ شور میں سب پیڑ بے پھل ہو گئے

○

ہوئے جمع افکار سر میں بہت
پڑے پیچ عرضِ ہنر میں بہت

گریزاں ہے ہر منظرِ جسم و جاں
کوئی شے ہے اندر سفر میں بہت

ستانے کو باہر بلائیں کئی
ڈرانے کو آسیب گھر میں بہت

کہوں کیا کہ ہے سانس اُلجھی ہوئی
ہوا بند ہے اِس نگر میں بہت

اُمیدِ ثمر رکھ نہ شاخوں سے ابھی
کہ زہرِ خزاں ہے شجر میں بہت

وحید اختر



صحراؤں میں دریا بھی سفر بھول گیا ہے
مٹی نے سمندر کا لہو چوس لیا ہے

دنیا کی ملامت کا بھی اب خوف ہے دل کو
خاشاک نے موجوں کو گرفتار کیا ہے

بچھڑے ہوئے خواب آکے پکڑ لیتے ہیں دامن
ہر موڑ پہ یادوں کا اک انبوہ ملا ہے

گھر سے جو چلے آکے ہوئے شہر میں ہم گم
ہر راستہ پرچھائیوں نے روک لیا ہے

فانوس بجھا لے گئیں طوفانی ہوائیں
کٹ کر بھی مگر شمع کا سر تیرہ رہا ہے

سورج بھی چنگھاڑتا ہے اک اندھے کنویں میں
مدت ہوئی آکاش بھی دھندلایا ہوا ہے

کرنوں سے تراشا ہوا اک نور کا پیکر
شرمایا ہوا خواب کی چوکھٹ پہ کھڑا ہے

پھولوں سے لدی ٹہنیاں پھیلائے ہیں بانہیں
خوشبو کا بدن خاک میں پامال پڑا ہے

دیوار و درِ شہر پہ ہیں خون کے دھبے
رنگوں کا حسیں قافلہ صحرا میں لٹا ہے

ہو جائیں جو اندھے تو سکوں پائیں نظر ور
پرچھائیوں خوابوں کا تعاقب تو سزا ہے

بے فکر کے شعلوں میں جہنم کی عقوبت
دنیا میں بھی جنت ہے اگر سر میں خلا ہے

دو دن سے سوا رحمتِ غم بھی نہیں ملتی
بچھڑے جو کوئی اس کو بھلانا ہی بجا ہے

یاد اپنی بھی آتی ہے تو اس طرح سے مجھکو
اک شخص تھا، برسوں جو مرے ساتھ رہا ہے

وحید اختر



تم گئے، ساتھ اجالوں کا بھی چھوٹا ٹھہرا
روز و شب اپنا مقدر ہی اندھیرا ٹھہرا

یاد کرتے نہیں اتنا تو دلِ خانہ خراب
بھولا بھٹکا کوئی دو روز اگر آ ٹھہرا

کوئی الزام نسیمِ سحری پر نہ گیا
پھول ہنسنے پہ خطاوار اکیلا ٹھہرا

پتیاں رہ گئیں، بُو لے اڑی آوارہ صبا
قافلہ موجِ بہاراں کا بس اتنا ٹھہرا

روز نظروں سے گزرتے ہیں ہزاروں چہرے
سامنے دل کے مگر ایک ہی چہرا ٹھہرا

وقت بھی سعیِ مداوائے الم کر نہ سکا
جب سے تم بچھڑے ہو خود وقت ہے ٹھہرا ٹھہرا

دل ہے وہ موم، ملا ہے جسے شمعوں کا گداز
اب کوئی دیکھے نہ دیکھے، یونہی جلنا ٹھہرا

تم نے جو شمع جلائی تھی، نہ بجھنے پائے
اب تو لے دے کے یہی کام ہمارا ٹھہرا

گنگنا لیں گے غزل آج وحید اختر کی
نام لینا ہی جو در پردہ تمھارا ٹھہرا

ڈاکٹر وحید اختر



ہم جو ٹوٹے تو غمِ دہر کا پیمانہ بنے
خاک میں مل گئے بھی خاکِ رہِ مے خانہ بنے
کون اس بزم میں سمجھے گا غمِ دل کی زبان
بات چھوٹی سی جب افسانہ در افسانہ بنے
سنگ اندازوں سے اونچا ہے بہت اپنا مقام
ورنہ ممکن تھا تماشا نہ سرِ دیوانہ بنے
شہرِ جاناں سے بھی ہم لائے محبت کا خراج
کیا ضروری ہے کہ یاں وضعِ گدایانہ بنے
وحشت آمادۂ رسوائی ہے بے خوفِ جہاں
ضبط کا ہے یہ تقاضا کہ تماشا نہ بنے
زندگی! ہم تیرے اتنے تو خطا وار نہ تھے
کہ جسے اپنا بنائیں، وہی بیگانہ بنے
اک تمنا کوئی ایسا تو بڑا جرم نہ تھی
آنکھ تا مرگ چھلکتا ہوا پیمانہ بنے
کیا رفاقت ہے یہی، اے دلِ آشفتہ مزاج
دیکھ، ہم ایک ترے واسطے کیا کیا نہ بنے
اجنبی لگتے ہیں ہم اپنی نظر کو خود ہی
آپ اپنے سے نہ اتنا کوئی بیگانہ بنے
ہم پہ اک عمر سے طاری ہے خموشی ایسی
ایک نقطے پہ سمٹ جاتے تو افسانہ بنے
اے مرے حوصلۂ غم یہی وقتِ وفا
زہر ہی حاصلِ صد عمرِ تمنا نہ بنے
زندگی کرنے کے انداز تو بھولو نہ وحید
تم نے کیا سیکھا اگر عشق سلیقہ نہ بنے



دیوانوں کو منزل کا پتا یاد نہیں ہے
جب سے ترا نقشِ کفِ پا یاد نہیں ہے
افسردگیِ عشق کے کھلتے نہیں اسباب
کیا بات بھلا بیٹھے ہیں، کیا یاد نہیں ہے
ہم دل زدگاں جیتے ہیں یادوں کے سہارے
ہاں مٹ گئے جس پر وہ ادا یاد نہیں ہے
گھر اپنا تو بھولی ہی تھی آشفتگیِ دل
خود رفتہ کو اب در بھی ترا یاد نہیں ہے
لیتے ہیں ترا نام ہی یوں جاگتے سوتے
جیسے کہ ہمیں اپنا خدا یاد نہیں ہے
یہ ایک ہی احسانِ غمِ دوست ہے کیا کم
بے مہریِ دوراں کی جفا یاد نہیں ہے
بے برسے گزر جاتے ہیں امڈے ہوئے بادل
جیسے انھیں میرا ہی پتا یاد نہیں ہے
پُروائی بھی دیوانہ گر اس رُت میں نہیں ہے
مجھ کو ترے آنچل کی ہوا یاد نہیں ہے
اس بار وحید آپ کی آنکھیں نہیں برسیں
کیا جھومتی زلفوں کی گھٹا یاد نہیں ہے

ڈاکٹر وحید اختر



خوشبو ہے کبھی، گل ہے کبھی، شمع کبھی ہے
وہ آتشِ سیال جو سینے میں بھری ہے

بادہ طلبی شوق کی دریوزہ گری ہے
صد شکر کہ تقدیر ہی یاں تشنہ لبی ہے

غنچوں کے چٹکنے کا سماں دل میں ابھی ہے
ملنے میں جو اٹھ اٹھ کے نظر اُن کی جھکی ہے

اب ضبط سے کہہ دے کہ یہ رخصت کی گھڑی ہے
اے وحشتِ غم، دیر سے کیا سوچ رہی ہے

معصوم ہے یاد اُن کی بھٹک جائے نہ رستہ
خوں گشتہ تمناؤں کی کیوں بھیڑ لگی ہے

یادوں سے کہو سولہ سنگھار آج کر آئیں
آئینہ بکف حسرتِ دیدار کھڑی ہے

ہر رنگ سے ہر رُخ سے جسے دل میں بسایا
وہ شکل بھی اب خوابِ فراموش ہوئی ہے

لب سی لیے اندیشۂ دشنامِ جہاں سے
اب اپنی خموشی ہی اک افسانہ بنی ہے

ٹھہری ہے تو اک چہرے پہ ٹھہری رہی برسوں
بھٹکی ہے تو پھر آنکھ بھٹکتی ہی رہی ہے



ہم نے دیکھا ہے محبت کا سزا ہو جانا
صبحِ دیدار کا بھی شامِ بلا ہو جانا

پہلے اتنا نہ پراگندہ مزاجِ دل تھا
بے سبب ہنسنا تو بے وجہ خفا ہو جانا

جی کے بہلانے کو دنیا میں سہارے ہیں بہت
سازگار آئے تمھیں ہم سے جُدا ہو جانا

ہم ہیں شمعِ سرِ باد اور ہو تم موجِ ہوا
گھر سے پھر نے یادِ خضر کو بھی ذرا ہو جانا

ہم ہیں محروم، رہے دامنِ گل چیں آباد
اپنی تقدیر میں تھا بوئے وفا ہو جانا

کتنی فریادوں کے لب سی کے زباں پائی وحید
کھیل سمجھے نہ کوئی نغمہ سرا ہو جانا

ڈاکٹر وحید اختر



آگ اپنے ہی دامن کی ذرا پہلے بجھا لو
فرصت ہو تو پھر ہم کو بھی جلنے سے بچا لو

اے قسمتِ فردا کے خوش آئند خیالو
راتیں نہ سہی، دن ہی مرے آکے اُجالو

پتھر کے صنم بھی کبھی کچھ بول سکے ہیں
اے بت شکن اذہان کے خاموش سوالو

تم میں تو مرا آہوئے خوش گام نہیں ہے
اے وادیِ تخئیل کے گم گشتہ غزالو

مٹتی ہوئی تصویر میں کیا رنگ بھروگے
مٹنا تھا جنھیں، مٹ گئے، تم خود کو سنبھالو

اک درد کی دولت تمھیں ہم سونپ چلے ہیں
اب اس کو مٹا دو کہ حیات اپنی بنا لو

بادِ سحری پھول کھلا آئی چمن میں
کچھ تم بھی لہو اپنے شہید دل کا اچھالو

ان راہوں میں وہ نقشِ کفِ پا تو نہیں ہے
کیوں پھوٹ کے روتے ہو یہاں پاؤں کے چھالو

چہرے پہ تھکن، بالوں میں گرد، آنکھوں میں سُرخی
لمبا ہے سفر، پاؤں کے کانٹے تو نکالو

پھر ساعتِ دیدار وحیدؔ آئے نہ آئے
تصویر بنا کر اُنھیں آنکھوں میں چھپا لو



گزرا کے گلستاں سے جو سوئے قفس چلے
ایسی کوئی ہوا بھی تو اب کے برس چلے

آدابِ قافلہ بھی ہیں زنجیرِ پائے شوق
یہ کیا سفر، اسیرِ صدائے جرس چلے

مانا ہوائے گل سے تھے بے اختیار ہم
پھر بھی بچا کے راہ کا ہر خار و خس چلے

پامال ہو کے رہ گئے جشنِ بہار میں
یہ فکر تھی، چمن پہ خزاں کا نہ بس چلے

اے چشمۂ حیات، نہ دی تو نے بوند بھی
ہم تشنہ کام ابر کی صورت برس چلے

صبحیں بھی آکے زہر رگِ جاں میں بھر نہ دیں
ہجرانِ یار تیرے اندھیرے تو ڈس چلے

ان کی یہ ضد، وہ دیکھیں گدائے رفو ہمیں
ہم کو یہ فکر، ان کے گریباں پہ بس چلے

تھا پاسِ آبروئے تمنا ہمیں وحیدؔ
چُن کر گلِ مراد سب اہلِ ہوس چلے

ڈاکٹر وحید اختر



عمر کو کرتی ہیں پامال برابر یادیں
مرنے دیتی ہیں نہ جینے یہ ستمگر یادیں

ہیں کبھی خونِ تمنا کی شنا در یادیں
شاخِ دل پر ہیں کبھی برگِ گلِ تر یادیں

ہمتِ کوہ کنی پر بھی کبھی بھاری ہیں
اور تلتی ہیں کبھی نوکِ مژہ پر یادیں

تھک کے دنیا سے اگر کیجیے خوابوں کی تلاش
نیند اڑا دیتی ہیں افسانے سنا کر یادیں

راہ بھولے ہوئے سیاح کو تنہا پا کر
لوٹ لیتی ہیں، مٹا دیتی ہیں چھپ کر یادیں

عہدِ رفتہ کے پر اسرار گھنے جنگل میں
پھونک کر سحر، بنا دیتی ہیں پتھر یادیں

کوئی خود رفتہ و گم گشتہ بھٹکتا ہے جہاں
اجنبی بن کے وہاں ملتی ہیں اکثر یادیں

جب بھی ماضی کے دیاروں سے گزر ہوتا ہے
کاسۂ چشم لیے پھرتی ہیں در در یادیں



رہے وہ ذکر جو لب ہائے آتشیں سے چلے
چلے وہ دور جو رفتارِ ساتگیں سے چلے

ہزاروں سال سفر کر کے پھر وہیں پہنچے
بہت زمانہ ہوا تھا ہمیں زمیں سے چلے

گمان و شک کے دوراہے پہ ہم سے آ کے ملے
وہ قافلے جو کسی منزلِ یقیں سے چلے

زمانہ ایک ہی رستے پہ لا کے چھوڑے گا
رواں ہے ایک ہی دھارا کوئی کہیں سے چلے

ہجومِ سنگِ ملامت رہِ وفا میں ملا
کٹے جو پاؤں، ہم اس راہ میں جبیں سے چلے

خرد بنی رہی زنجیرِ پائے شوق، مگر
جنوں کے جتنے بھی ہیں سلسلے، ہمیں سے چلے

ہمیں شکستِ حریفاں کا بھی ملال رہا
شکستہ دل جو ہم اس بزمِ دل نشیں سے چلے

تمام گمرہیاں دیر اور حرم سے اٹھیں
تمام سلسلۂ کفر اہلِ دیں سے چلے

وحیدؔ سیلِ قیامت نے راہ روکی تھی
جو اشک بن کے ہم اس چشمِ نازنیں سے چلے

عرفانہ عزیز



ہمہ تن جلوہ فشاں، سروِ چراغاں کی طرح
کون آیا دلِ پُرشوق میں، مہماں کی طرح

گونج اُٹھی غم کدۂ روح میں اُس کی آواز
خواب میں بہتے ہوئے چشمۂ عرفاں کی طرح

ذہنِ فنکار میں مانندِ شعورِ نغمہ
صفحۂ دل پہ ہے وہ نظم کے عنواں کی طرح

ضوفشاں میرے صنم خانۂ افکار میں ہے
لبِ معصوم کوئی لعلِ بدخشاں کی طرح

اہرمن بن کے تعاقب میں رہی ظلمتِ شب
چھپ گیا کوئی مری رُوح میں یزداں کی طرح

برہنہ پا و سر اسیمہ تھی تو قیرِ بشر
وہ مرے ساتھ رہا عظمتِ انساں کی طرح

مژہ آلودہ بخوں — چشمِ تمنّا خونبار
سینۂ دہر میں ہوں زخمِ نمایاں کی طرح

اے مرے ہمدمِ دلگیر! دعا دے مجھکو
اس کے قدموں پہ رہوں شاخِ گل افشاں کی طرح

جل اُٹھی شمعِ تمنّا سرِ محرابِ وصال
کون آتا ہے یہ خورشیدِ فروزاں کی طرح



دل پر گہرا نقش ہے ساجن لاکھ تری دانائی کا
سات سمندر بھی تو نہ پائیں راز مری گہرائی کا

چشمۂ خوں میں ڈوب گئی بارات سہانے تاروں کی
بوجھل پلکوں پر گہنا یا چاند مری تنہائی کا

جھوم رہے ہیں کالے بادل درس کی پیاسی آنکھوں میں
کاجل بن کر پھیل گیا ہے داغ مری رسوائی کا

کتنا ہے آنند ترے اس دھیمے دھیمے لہجے میں
تیرے دھیرج سے نکھرا ہے رنگ مری رعنائی کا

میرے دل سے پوچھے کوئی قدر اُبھرتے سُورج کی
میری آنکھ سے دیکھے کوئی روپ مرے سودائی کا

صندل جیسی رنگت پر قربان سُنہری دھوپ کروں
روشن ماتھے پر میں واروں سارا حُسن خدائی کا

میرا بکھرا بکھرا تن من سمٹ گیا کسی چاہت سے
جان گئی ہوں بھید میں تیری باہوں کی گیرائی کا

عرفانہ عزیز



روپ کے پاؤں چومنے والے سُن لے میری بانی
پھول کی ڈالی بہت ہی اونچی، تو ہے بہت پانی

سوندھی سوندھی خوشبو کے بہتے ہیں تخیل جھرنے
کھیتوں پر لہراتا ہے جب میرا آنچل دھانی

تُو میرا آدرش سہانا —— میں سپنوں کی ڈالی
ہریالی دھن تیرا میرا —— دولت آنی جانی

چاند سے ماتھے پر ہیں گہری سوچ کی تین لکیریں
بھول گئی رستہ، ان بھول بھلیوں میں، اک رانی

پھیل گیا ہے قریہ قریہ تیرا رنگ سنہرا
تو ہے میرا رُوپ سویرا، میں ہوں شام سہانی

بیراگی کے روپ میں میرے دَر پر آنیوالے!
تیرے دل کی دھڑکن لگتی ہے جانی پہچانی

کتنی اونچی پریت ہے تیری، جنتا کے رکھوالے
شکتی کا پرچار کرے گی تیری پریم دوانی



سانجھ سویرے پنچھی گائیں لے کر تیرا نام
ڈالی ڈالی پر ہے تیری یادوں کے بسرام

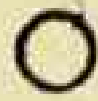
بچھڑا ساتھی ڈھونڈ رہی ہے کونجوں کی اک ڈار
بھیگے بھیگے نین اٹھائے دیکھ رہی ہے شام

میٹھی نیندیں ڈوبے گاؤں، بجھ گئے سارے دیپ
برہا کے ماروں کا سُکھ کے سپنوں سے کیا کام

چھوڑ شکاری اپنی گھاتیں، بدل گیا سنسار
اُڑ جائیں گے اب تو پنچھی لے کر تیرا دام

آنکھوں پر پلکوں کا، ساجن، کب ہوتا ہے بوجھ
دور سے آئے ہو تم، نینن بیچ کرو آرام

عرفانہ عزیز



چراغِ فکر جلایا ہے رات بھر ہم نے
اور اس کے بعد نکھارا رُخِ سحر ہم نے

ہمیں شعور نے دھوکے دیئے ہیں رہ رہ کر
فریب کھائے ہیں دانستہ بیشتر ہم نے !

صلۂ خرد کا زمانے میں جامِ زہر سہی
نکھار دی ہے مگر عظمتِ بشر ہم نے

نظر ہو دولتِ ہر دو جہاں پہ کیا مائل
سمیٹ لی ہے بہت دولتِ نظر ہم نے !

صدائے پا کی سُنی بازگشت ہی ہر گام
تلاش کی ہے جہاں تیری رہ گزر ہم نے !

نگارِ گل نے لیا نام زیرِ لب تیرا
اداس چاند کو دیکھا پسِ شجر ہم نے !



ہر نفس وقفِ آرزو کر کے
کچھ بھی پایا نہ جستجو کر کے !

سو شگوفے کھلا دیئے دل میں
خندۂ گل سے گفتگو کر کے !

مسکراتا ہی کیوں نہ رہنے دو
فائدہ چاکِ دل رفو کر کے !

کتنے نوخیز و نودمیدہ پھول
مر مٹے خواہشِ نمو کر کے !

غیرتِ دل نے آہِ سوزاں کو
رکھ دیا سُرمۂ گلو کر کے !

عرفانہ عزیز



رنگ برنگے پھولوں جیسی میری چنچل آس
میری آس کا روپ منوہر پریتم کو ہے راس

چکے چکے کیا کہتے ہیں تجھ سے دھانی کھیت؟
بول ری نرمل نرمل ندیا کیوں ہے چاند اداس؟

سُر ساگر جیسے گہرے ہیں میرے کوی کے نین
دیکھ سکھی، پنگھٹ پر آیا کون بجھانے پیاس

تُور کے تڑکے، مَیں نے دیکھی پنکھڑیوں پر اوس
تاروں کے موتی چنتی ہے ساری رات کپاس

سانجھ سویرے نینوں میں لہرائے اُسکا روپ
میرے سپنوں کا رکھوالا دور رہے یا پاس



نیل گگن پر سرخ پرندوں کی ڈاروں کے سنگ
بدلی بن کر اُڑتی جائے میری شوخ امنگ

کومل کلیوں جیسا میرا پاک پوتر سریر
پون کے چھونے سے اڑ جاتا ہے چہرے کا رنگ

سپنوں کی ڈالی پہ چمکا ایک سنہرا پات
چڑھتا سورج دیکھ کے جس کا روپ، ہُوا ہے دنگ

جلتے بجھتے پھولوں سے اتری خوشبو کی راکھ
دھو کر آگ جو اوس نے دیکھا انگاروں کا رنگ

طعنے دیکر لوگ لگاتے ہیں کیوں آگ میں آگ
بستی والے کیوں کرتے ہیں بیراگن کو تنگ



مترنم ہے مری روح میں یوں تیری صدا
آبشاروں کی سکوں ریز روانی جیسے

نور و نکہت میں نہایا ہوا وہ تیرا کلام
رودِ کوثر کا چھلکتا ہوا پانی جیسے

میری پلکوں پہ ہیں یوں گوہرِ شبنم غلطاں
میرے ہونٹوں پہ ہو پھولوں کی کہانی جیسے

میرے سانسوں میں مچلتی ہے حنا کی خوشبو
تیری نوخیز محبت کی نشانی جیسے

کتنا خوش رنگ ہے معصوم تبسّم تیرا
مسکراتی ہو بہاروں کی جوانی جیسے

بس گیا میرے تصوّر میں ہیولیٰ تیرا
ذہنِ شاعر میں کوئی یاد سہانی جیسے

دل کے آنگن میں ابھرتا ہے ترا عکسِ جمیل
چاندنی رات میں ہو رات کی رانی جیسے



تلاش کرتی ہے تجھ کو مری نظر ہر سُو
جمالِ رُوح ! مرے دل کی روشنی ہے تُو

یہ کس کی یاد، یہ کس کا خیال آیا ہے
مہک مہک ہے تجلّی، کرن کرن خوشبو

سلگ سلگ کے سرِ شاخ بجھ گئیں کلیاں
مرے بدن میں تھا خوابیدہ جنکا ذوقِ نمو

مری نگاہ میں جلوے یہ کس سحر کے ہیں
کہ داغ داغ نئے آفتاب کا ہے لہو

سجّاد باقر رضوی

○

پوچھو مجھے اے ہم نفساں کون ہوں، کیا ہوں
یارو، میں کوئی حشر کے میداں میں کھڑا ہوں

تم رنگ میں دیکھو تو ہوں مرجھایا ہوا پھول
آواز میں، مَیں ٹوٹتے شیشے کی صدا ہوں

میری بھی حکایت ہے وہی دل زدگی کی
پر درد کے عنوان ہیں، مضمونِ جدا ہوں

کچھ میرے ہی دم سے ہیں بہاروں کے معانی
میں پیرہنِ گل، گل کی طرح چاک قبا ہوں

ہوں بند خیالوں میں کہ جوں پھول میں خوشبو
آزادہ روی میں صفتِ موجِ صبا ہوں

خواہش پہ مجھے ٹوٹ کے گرنا نہیں آتا
پیاسا ہوں مگر ساحلِ دریا پہ کھڑا ہوں

شاید یہی تریاق بنے زہرِ فنا کا
میں تلخیِ ایام کا ست کھینچ رہا ہوں

پھولوں کی رفاقت میں تو پائے ہیں پھپھولے
کانٹوں سے ہے اُمید کہ میں آبلہ پا ہوں

دن روزِ قیامت ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا
تنہا ہوں کہ خود سائے سے بھی اپنے جدا ہوں

رات آئے تو سو جاؤں اندھیروں سے لپٹ کر
میں صبح سے ڈرتا ہوں کہ سورج کا ڈسا ہوں

کترا کے نہ چل، راہ بھٹک جائے گا راہی
میں رہبرِ امید کا نقشِ کفِ پا ہوں

اس دورِ خرافات میں بے قدر ہوں پھر بھی
تو جتنا سمجھتا ہے، میں کچھ اس سے سوا ہوں

ہر رنگ، ہر آہنگ مرے سامنے عاجز
میں کوہِ معانی کی بلندی پہ کھڑا ہوں

نکلیں گی چٹانوں سے مری فکر کی نہریں
میں لفظ کے تیشے سے انہیں کاٹ رہا ہوں

میں کیمیا گر خود کو جلاتا ہی رہوں گا
اور تو یہ سمجھتا ہے کہ جینے سے خفا ہوں

پیدا مرے نغموں سے ہوئیں نور کی لہریں
میں خالقِ تہذیب، اندھیروں کی ضیا ہوں

باقرؔ مجھے کچھ دادِ سخن کی نہیں پروا
میں شہرِ خموشاں میں ہوں اور نغمہ سرا ہوں

سجاد باقر رضوی



میں ہم نفساں جسم ہوں، وہ جاں کی طرح تھا
میں درد ہوں وہ درد کے عنواں کی طرح تھا

جس کے لیے اک عمر کنویں جھانکتے گزری
وہ ماہِ کراچی مہِ کنعاں کی طرح تھا

تو کون تھا کیا تھا کہ برس گزرے، پہ اب بھی
محسوس یہ ہوتا ہے، رگِ جاں کی طرح تھا

جس کے لیے کانٹا سا چبھا کرتا تھا دل میں
پہلو میں وہ آیا تو گلستاں کی طرح تھا

اک عمر اُلجھتا رہا دُنیا کی ہوا سے
کیا میں بھی ترے کاکلِ پیچاں کی طرح تھا

کچھ عمرِ گریزاں سے مرے ہاتھ نہ آیا
ہر لمحہ ترے گوشۂ داماں کی طرح تھا

ڈوبے سے کہاں پیاس بجھی اہلِ طلب کی
ہیں وادیٔ گُل میں بھی بیاباں کی طرح تھا

جینا تو غضب ہے مگر اے عمر، عجب ہے
تجھ کو تو خبر ہے وہ مری جاں کی طرح تھا

اے رات کے اندھیارے میں جاگے ہوئے لمحو
ڈھونڈو اسے، وہ خوابِ پریشاں کی طرح تھا

مٹی کو یہاں پاؤں پکڑنا نہیں آتا
میں شہر میں بھی گرد کے طوفاں کی طرح تھا

جو حرفِ غزل بن کے نمایاں ہوا باقرؔ
کل رمزِ صفتِ معنیٔ پنہاں کی طرح تھا

سجاد باقر رضوی



راہوں کے اونچ نیچ ذرا دیکھ بھال کے
ہاں رہروِ مراد، قدم رکھ سنبھال کے

فتنوں کو دیکھ، اپنے قدم روک، بیٹھ جا
راتیں یہ آفتوں کی ہیں، یہ دن وبال کے

میں سرگراں تھا ہجر کی راتوں کے قرض سے
مایوس ہو کے لوٹ گئے دن وصال کے

کچھ یہ نہ تھا کہ میں نے نہ سمجھی بساطِ دہر
میں خود ہی کھیل ہار گیا دیکھ بھال کے

سامانِ دل کو بے سر و سامانیاں ملیں
کچھ اور بھی جواب تھے میرے سوال کے

لمحوں کی لے پہ گزری ہیں راتیں نشاط کی
کس دھن میں دن کٹیں گے یہ رنج و ملال کے

تخلیق ہے مری تری تخلیق سے الگ
میں بھی بناتا رہتا ہوں پیکر خیال کے

پیاسی زمینِ دل ہے، پڑا قحطِ فصلِ شوق
ہاں اے ہوا، کدھر گئے دن برشگال کے

باقر یہ وانت بیچ زباں بند کیوں ہوئی
قائل تو آپ بھی تھے بہت قیل و قال کے



اس سادہ دل سے کچھ مجھے باقر گلہ نہ تھا
وہ باوفا ہو گیا جو کبھی بے وفا نہ تھا

دل ان سے مل گیا ہے جو ملتے نہیں کبھی
جو مل گئے ہیں، ان سے کبھی دل ملا نہ تھا

باندھا پرِ شکستہ نے رشتہ زمیں کے ساتھ
اڑنے کا شوق بھی مجھے حد سے سوا نہ تھا

منزل وفا کی تھی حدِ کونین سے پرے
کیا دل گرفتگاں کے لیے راستہ نہ تھا

پھرتی تھی لے کے شورشِ دل کو بکو ہمیں
منزل ملی تو شورشِ دل کا پتہ نہ تھا

طوفانِ بحرِ زیست میں خس کی مثال میں
پانی میں بہہ رہا تھا مگر ڈوبتا نہ تھا

ہاں جادۂ حیات میں تیری گلی بھی تھی
ہاں یہ بھی میری سست روی کا بہانہ تھا

دن ایسے پھر گئے کہ مقابل وہ آ گیا
جو میری سمت مڑ کے کبھی دیکھتا نہ تھا

ہاں وہ بھی دن تھے جب غمِ شیریں نجابے نزول
پر کوئی کوہِ تلخیِ غم کاٹتا نہ تھا

اب آہ بھی بھریں تو چٹختا ہے جا بجا
سنگِ گرانِ غم سے جو دل ٹوٹتا نہ تھا

زنجیر کی صدا سے گریباں کے چاک تک
میرے بھی مشغلے تھے، میں بے دست و پا نہ تھا

مرنے مرنے دیا تجھے آشفتگی کا نام
تجھ کو تو کوئی شورشِ غم! پوچھتا نہ تھا

باقر خودی کو چھوڑ چلے کس کے واسطے
تم جس کو پوچھتے تھے وہ کافر خدا نہ تھا

سجاد باقر رضوی



دل خوں ہوا ہے شوخیٔ رنگِ حنا کے ساتھ
ہے معنیٔ بلند بھی طرزِ ادا کے ساتھ

چٹکا جو دل تو مثلِ گلِ تر بکھر گیا
خوشبو صبا کے ساتھ تھی، نغمہ ہوا کے ساتھ

یہ حال ہے چمن میں کہ اب مثلِ برگِ خشک
آوارہ ایک عمر سے ہیں ہم ہوا کے ساتھ

زلفیں اُدھر کھلیں، اِدھر آنسو اُمنڈ پڑے
ہیں سب کے اپنے اپنے روابط گھٹا کے ساتھ

تم رنگ تھے تو خوئے وفا تھی، گلوں میں تھے
خوشبو بنے تو اڑ گئے موجِ صبا کے ساتھ

آہٹ پہ کان، راہ میں آنکھیں بچھی ہوئی
ہم دور تک چلے تری آوازِ پا کے ساتھ

تنگی ہوا تو شورشِ زنداں بھی بڑھ گئی
دل وجد میں ہے نغمۂ زنجیرِ پا کے ساتھ

ہے انتہائے شوق بھی بے راہیوں کا باب
ہم تھوڑی دور چلتے ہیں ہر رہنما کے ساتھ

آخر کو گرد ہو کے رہے مثلِ گرد باد
وہ چار ہاتھ ہم بھی اڑے تھے ہوا کے ساتھ

باقرؔ تمہارا شہر میں ضامن بنے گا کون
کچھ نقد بھی تو چاہیے جنسِ وفا کے ساتھ



وہ گھر کے آیا، گھٹاؤں کی تیرگی کی طرح
برس پڑا مرے آنگن میں، چاندنی کی طرح

وہ جس کے واسطے اک حرفِ مدعا نہ ملا
اتر گیا مرے سینے میں، آگہی کی طرح

نظر بچا کے جسے دیکھتے تھے میرے حریف
سما گیا میری آنکھوں میں، روشنی کی طرح

ہوا پہ جس کے قدم ہیں مثالِ نکہتِ گل
اسیر ہے مرے شعروں میں نغمگی کی طرح

مرا غزال کہ وحشت تھی جس کو سائے سے
لپٹ گیا میرے سینے سے، آدمی کی طرح

مری نگاہ کو تو اپنے آئینے میں بھی دیکھ
جمی ہے تیرے لبوں پہ شگفتگی کی طرح

کہاں کے شعر، کہاں کی غزل، یہ ذہن کی رو
بکھر گئی میرے کاغذ پہ، شاعری کی طرح

زباں کھلی ہے تو دل پھوٹ پڑا ہے صورتِ گل
وگرنہ ہم بھی تھے گم آپ میں، کلی کی طرح

لحد میں ذہن کی مدفون پیکرِ اوہام
مری رگوں میں مچلتے ہیں زندگی کی طرح

یہ دھوپ چھاؤں ہے دنیا کی، خود مرا سایہ
مرے قریب سے گزرا ہے اجنبی کی طرح

غمِ زمانہ سے دل تنگ تھے بہت باقرؔ
سمٹ کے رہ گئے احساسِ بے کسی کی طرح



سجاد باقر رضوی



زہر ان کے ہیں مرے دیکھے ہوئے بھالے ہوئے
یہ تو سب اپنے ہیں زیرِ آستیں پالے ہوئے

ان کے بھی موسم ہیں، ان کے بھی نکل آئیں گے ڈنک
بے ضرر سے اب جو بیٹھے ہیں سپر ڈالے ہوئے

چاک سی کر، جو ہرے موسم میں اٹھلاتے پھرے
خشک سالی میں وہ تیرے چاک سینے والے ہوئے

بڑھ کے جو منظر دکھاتے تھے کبھی سیلاب کا
گھٹ کے وہ دریا، زمیں پر رینگتے نالے ہوئے

کیسے کیسے ناگہانی حادثے لکھے گئے
یاد کے پیلے ورق کس کس طرح کالے ہوئے

کچھ اداسی بن کے پھیلے اس کے رخساروں کے گرد
کچھ سیہ بادل کے ٹکڑے چاند کے ہالے ہوئے

پہلے رو لیتے تھے، اب گلیوں کے پھیروں کا ہے شغل
پہلے جو آنسو تھے اب وہ پاؤں کے چھالے ہوئے

چھلکی ہر موجِ بدن سے حسن کی دریا دلی
بوالہوس کم ظرف دو چلّوں میں متوالے ہوئے

کھل گئے تو بوئے معنی ہر طرف اڑتی پھری
بند ہو کر لفظ باقرؔ نطق پہ تالے ہوئے

کیا بلا لے زندگی قانونِ فطرت سے مجھے
کچھ ملا حق بھی تو باطل کی وساطت سے مجھے
میرے مالک! میں تکبر سے نہیں ہوں سر بلند
سر جھکا آتا، ہوئی نفرت اطاعت سے مجھے
میں وہ عاشق ہوں کہ خود ہی چومتا ہوں اپنے ہاتھ
کب بھلا فرصت ملی اپنی رقابت سے مجھے
میں وہ ٹوٹا آئینہ ہوں، آپ اپنے سامنے
جس میں ہول آتا ہے خود اپنی ہی صورت سے مجھے
میں وہ پتھر ہوں کہ جس میں دودھ کی نہریں بھی ہیں
تیشۂ فرہاد مت سمجھا حقارت سے مجھے
میں وہ عالم ہوں کہ ہر عالم ہے مجھ میں ہمکنار
تو ذرا پہچان خود اپنی شباہت سے مجھے
خار زارِ دشت میں ہوں اور تو سروِ حسین
تو بھلا کیوں ناپتا ہے اپنے قامت سے مجھے
حیف، کس کے آگے لفظوں کے دیئے روشن کیے
کتنی امیدیں ہیں اندھوں کی بصارت سے مجھے
میں کہاں بیٹھوں کہ سائے بھی گریزاں مجھ سے ہیں
اب تو دیواریں بھی تکتی ہیں حقارت سے مجھے
ہیں گریباں چاک تاریکی میں کب تک منہ چھپاؤں
اب تو شرم آنے لگی اپنی ندامت سے مجھے
آتی ہیں وحشت سرائے دل سے آوازیں عجب
دیکھتے ہیں اب تو ویرانے بھی حیرت سے مجھے
اب اگر کچھ بھی نہیں ہوتا تو شورِ حشر ہو
کم نہیں ہے اتنا سناٹا قیامت سے مجھے
کون ناصر میرا باقرؔ کس کو میرا انتظار
گوشۂ گم نامی میں ہوں، کیا کام شہرت سے مجھے

سجاد باقر رضوی



دل کی بساط پہ شاہ پیادے کتنی بار اتارو گے
اس بستی میں سب شاطر ہیں تم ہر بازی ہارو گے

پریم پجاری! مندر مندر دل کی کتھا کیوں گاتے ہو
بت سارے پتھر ہیں پیارے کس سر پھوڑے مارو گے

دل میں کھینچ کے اس کی صورت آج تو خوش خوش آئے ہو
کل سے اس میں رنگ بھرو گے، کل سے نقش ابھارو گے

سارے دن تو اس کی گلی میں آتے جاتے گزری ہے
اب بولو، اب رات ہوئی ہے کیسے رات گزارو گے

پیار کی آنکھیں مند جائیں گی، دل کا دیا بجھ جائیگا
کب تک لہو جلاؤ گے تم، کب تک کاجل پارو گے

پاگل پن ہے گونج کے پیچھے بھاگتے پھرنا چاروں اور
اپنی صدائیں واپس لے لو، یوں کس کس کو پکارو گے

جس کو داتا مان کے تم نے بھیک لگن کی مانگی ہے
اس نے بھی جو سلام کیا تو دامن کہاں پسارو گے

باقر صاحب تنہا کوئی ہو، بڑے گرو کہلاتے ہو
اپنا دکھ سکھ بھول گئے تو کس کا حال سنوارو گے

کلی کلی اشکوں کی لڑیاں، پھول پھول پہ کومل گیت
کس کی سیج سجائی باقر، کس کا روپ نکھارو گے



ہزار شکر، کبھی تیرا آسرا نہ گیا
مگر یہ ہے دلِ آدم کہ وسوسہ نہ گیا

وہ جب کہ زیست بھی اک فن تھی، وہ زمانہ گیا
اب ایک سعی کہ اندازِ شاعرانہ گیا

بہت ہی شور تھا اہلِ جنوں کا پر اب کے
خرد سے آ کے کوئی زور آزمانہ گیا

چلی ہے اب کے برس وہ ہوائے شدتِ برف
دیارِ دل کی طرف کوئی قافلہ نہ گیا

بہت ہی سستی ہے بازارِ جاں میں جنسِ وفا
ارے یہ قحطِ طلب دل کا کارخانہ گیا

میں توڑ توڑ کے خود کو بناتا رہتا ہوں
اب ایک عمر ہوئی، پھر بھی بچپنا نہ گیا

بس ایک گھونٹ محبت کا پی کے پچھتائے
تمام عمر وہ اک تلخ ذائقہ نہ گیا

کبھی بکھر گئے باتوں میں مثلِ نکہتِ گل
کبھی کلی کی طرح منہ سے کچھ کہا نہ گیا

گمان یہ تھا کہ بس دو قدم ہے اس کی گلی
قدم اٹھے تو یہی دو قدم چلا نہ گیا

بس ایک برگِ خزاں دیدہ ہو نہیں کا بوجھ
ہوائے دہر ترے دوش پر اٹھا نہ گیا

برنگِ گل ہے ہمیں بھی مزاج دانِ بہار
بس ایک بار ہنسے، پھر کبھی ہنسا نہ گیا

اب آکے دن کی کہانی لکھیں کوئی باقر
کہ رات ختم ہوئی رات کا فسانہ گیا

توصیف تبسّم



تھا پسِ مژگانِ تر، اک حشر برپا اور بھی
میں اگر یہ جانتا شاید تو روتا اور بھی

پاؤں کی زنجیر، گردابِ بلا ہوتی اگر
ڈوبتے تو سطح پر اک نقش بنتا اور بھی

آندھیوں نے کر دیئے سارے شجر بے برگ و بار
ورنہ جب پتّے کھڑکتے، دل لرزتا اور بھی

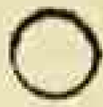
روزنِ در سے ہوا کی سسکیاں سنتے رہو
یہ نہ دیکھو ہے کوئی یاں آبلہ پا اور بھی

ہر طرف آوازکے ٹوٹے ہوئے گرداب ہیں
روشنی کم ہے مگر چلتا ہے دریا اور بھی

صرف تُو ہوتا، تو تیرا وصل کچھ مشکل نہ تھا
کیا کریں تیرے سوا کچھ ہم نے چاہا اور بھی

آرزو شب کی مسافت ہے تو تنہا کاٹئے
دن کے محشر میں تو ہو جائیں گے تنہا اور بھی

توصیف تبسم



میری صورت، سایۂ دیوار و در میں کون ہے
اے جنوں! میرے سوا یہ میرے گھر میں کون ہے

ٹھیک ہے، اے ضبطِ غم! آنسو کوئی ٹپکا نہیں
پر یہ دل سے آنکھ تک ہمسفر میں کون ہے

وہ کوکب کا اپنی منزل پر پہنچ کر سو چکا
چاند کیا جانے کہ راہِ پُر خطر میں کون ہے

میں تو اُس صورت کا دیوانہ ہوں، پر اے زندگی!
صورتِ یک عمر حائل، سنگ و سر میں کون ہے

خاک چھنواتی ہے یہ راتوں کو کس کی جستجو
چاندنی کی طرح پھیلا، دشت و در میں کون ہے

ایک چہرہ مستقل، اشکوں کے آئینے میں ہے
کچھ بتا، اے عمرِ غم! آخر نظر میں کون ہے

پاؤں میں لپٹی ہوئی ہے سب کے زنجیرِ انا
سب مسافر ہیں یہاں، لیکن سفر میں کون ہے

نغمۂ جاں سننے والو! یہ تکلف تا بہ کے
ڈھا کے یہ دیوار بھی دیکھو کہ گھر میں کون ہے

توصیف تبسم



واہمہ ہوگا، یہاں کوئی نہ آیا ہوگا
میرے سایہ ہی مرے جسم سے لپٹا ہوگا

چاند کی طرح لگا ہوں میں لئے خوابِ طلب
اور اک عمر ابھی خاک پہ سونا ہوگا

اشک آئے ہیں تو یہ سیرِ چراغاں بھی سہی
اس سے آگے تو وہی خون کا دریا ہوگا

گر کبھی ٹوٹی بدلتی ہوئی رُت کی زنجیر
ایک اک پھول یہاں خود کو ترستا ہوگا

ہم تو وابستہ رہے تجھ سے کہ ہے خوئے وفا
تو نے کیا سوچ کے اے غم! ہمیں چاہا ہوگا

شوقِ تعمیر بسائے گا خرابے کیا کیا
آدمی ہے تو ہر اک شہر میں صحرا ہوگا

ق

سائے جھکے ہوئے گوشوں میں سمٹ جائیں گے
چاند نکلے گا تو یہ شہر اکیلا ہوگا

یاد آئیں گی بہت نیند سے بوجھل پلکیں
شام کے ساتھ یہ دکھ اور گھنیرا ہوگا

اس کو آنکھوں میں چھپاؤ گے بتاؤ کب تک
کیا کرو گے جو وہی دیکھنے والا ہوگا



اک تیر نہیں کیا تری مژگاں کی صفوں میں
بہہ جائیں لہو بن کے، یہ حسرت ہے دلوں میں

دریا ہو تو موجوں میں کھلے اس کا سراپا
پاگل ہے ہوا، چیختی پھرتی ہے بنوں میں

تیشے کی صدا میری ہی فریاد تھی گویا
میری ہی طرح تھا کوئی پتھر کی سلوں میں

یوں آج پھر اک حسرتِ ناکام پہ روئے
جیسے نہ تھے پہلے کبھی آزردہ دلوں میں

اب صبح سے تا شام ہے صدیوں کی مسافت
ہر لمحۂ بے قید ہے زنجیر دلوں میں

رستوں پہ امڈتا ہوا پھولوں کا سمندر
حیران ہوں کس طرح سمایا ہے گھروں میں

کھینچا تھا جنوں نے جسے دامانِ ہوا پر
دیکھا تو وہی شکل ہے مٹی کی تہوں میں

کیا ٹھہریں قدم دشت نوردانِ وفا کے
کانٹا تو نہیں پاؤں میں، سودا ہے سروں میں

توصیفؔ، وہ یادوں کا دھواں ہے کہ سرِ بزم
چہرے نظر آتے ہیں چراغوں کی لووں میں

توصیف تبسم



کتنے ہی تیر، خمِ دست و کماں میں ہوں گے
جن کے سوفار ابھی سے مری جاں میں ہوں گے

دل ہے اب خانۂ آسیب زدہ کی صورت
زخم، روزن اسی تاریک مکاں میں ہوں گے

ایک ہم ہی نہیں سر میں لئے سودائے وفا
اور بھی کتنے محبت کے گماں میں ہوں گے

صرف تیرے لب و رخ کی نہیں تصویر چمن
میرے بھی غم کے کئی رنگ خزاں میں ہوں گے

ڈگمگاتا ہوا آیا ہے مژہ تک آنسو
راستے کیسے دلِ درد نشاں میں ہوں گے

برمحل ہے ترا اشجار ہوا کا نوحہ
کل کے غنچے بھی اسی دشتِ زیاں میں ہوں گے

ہے خد و خال کا انبار یہاں ہر چہرہ
ہم وہ ہوں گے جو نہ خود اپنے گماں میں ہوں گے



سنو، کوئی توصیف تبسم، اس دکھ سے کیا پاؤ گے
سپنے لکھتے لکھتے آخر، خود سپنا ہو جاؤ گے

جلتی آنکھوں جیسا لاوا پھوٹے، خوشبو گھل کر رنگ بنے
دکھ کے لاکھوں چہرے ہیں، کس کس سے آنکھ ملاؤ گے

ہر کھڑکی میں پھول کھلے ہیں پیلے پیلے چہروں کے
کیسی سرسوں پھولی ہے، کیا ایسے میں گھر جاؤ گے

اتنے رنگوں میں کیوں تم کو ایک رنگ من بھایا ہے
بھید یہ اپنے جی کا کیسے اور دل کو سمجھاؤ گے

اب تو سحر ہونے کو آئی، اب تو گھر کو لوٹ چلو
چاند کے پیچھے پیچھے جتنا بھاگو گے، گہناؤ گے

دل کی بازی ہار کے رو دے ہو تو یہ بھی بس رکھو
اور ابھی تم پیار کرو گے، اور ابھی پچھتاؤ گے



مرتے مرتے روشنی کا خواب تو پورا ہوا
بہہ گیا سارا لہو تن کا، تو دِن آدھا ہوا

راستوں پر پیڑ جب دیکھے تو آنسو آ گئے
ہر شجر سایہ تھا تیری یاد سے ملتا ہوا

صبح سے پہلے بدن کی دھوپ میں نیند آ گئی
اور کتنا جاگتا، میں رات کا جاگا ہوا

شہرِ دل میں اس طرح ہر غم نے پہچانا مجھے
جیسے میرا نام تھا دیوار پہ لکھا ہوا

زیست کے پُرشور ساحل پر گئے لمحوں کی یاد
جس طرح سایہ ہو سطحِ آب پر ٹھیرا ہوا

گم ہوئے وہ آشنا چہروں کے آئینے کہاں
شہر ہے سارے کا سارا دُھند میں لپٹا ہوا

وصل کے بادل ذرا تھم! حسنِ قامت دیکھ لوں
پیاس کا صحرا تو ہے تا چشمِ تر پھیلا ہوا

مجھ کو آشوبِ حکایت جان لینے کی ہوس
اور یہ تیرا بدن اک داستاں کہتا ہوا

غم جو ملتا ہے تو اے توصیفؔ، سینے سے لگاؤ
کس نے لوٹایا ہے یوں مہمان گھر آیا ہوا



بجا کہ درپئے آزار، چشمِ تر ہے بہت
پلٹ کے آؤں گا میں، گرچہ یہ سفر ہے بہت

ٹھہر سکو تو ٹھہر جاؤ میرے پہلو میں
وہ دھوپ ہے کہ یہی سایۂ شجر ہے بہت

دریدہ باہیں خزاں میں پکارتی ہیں، چلو
ہوائے تُند میں ہر شاخ بے سپر ہے بہت

کہوں تو وہ مری رودادِ درد بھی سُنے
کہ جیسے اس کو مرے حال کی خبر ہے بہت

کلی خمار کے عالم میں کسمساتی ہے
کھلی ہے آنکھ مگر نیند کا اثر ہے بہت

مرا قدم ہی نہیں، ہجر میں بگولا صفت
بچھڑ کے مجھ سے ترا غم بھی دربدر ہے بہت

ہیں منتظر کہ یہ دریائے درد کب اترے
ہیں خوش کہ دل کا سفینہ تو موج پہ ہے بہت

نہ خلوتِ غمِ دنیا، نہ بزمِ جاں، توصیفؔ
تمہارے واسطے اک بیکسی کا گھر ہے بہت

توصیف تبسم



کیا بتاؤں کہ ہے کس زلف کا سودا مجھکو
دودِ ہر شمع، گریباں نظر آیا مجھ کو

چاند جو اُبھرا شبِ غم، مرے دل میں ڈوبا
بھیگتی رات نے کچھ اور جلایا مجھ کو

ہائے کیا کیا مجھے بیتاب رکھا ہے اس نے
یاد کرنے پہ بھی جو یاد نہ آیا مجھ کو

اب تو سانسوں کے تموّج سے بھی جی ڈرتا ہے
زندگی! تو نے یہ کس گھاٹ اتارا مجھ کو

تھے مری پشت پہ اقدار کے ڈھلتے سورج
بن گیا راہنما، اپنا ہی سایا مجھ کو

راہ بے سمت ہے، اُفتادہ ہے منزل اپنی
خاکِ صحرا ہوں، اڑاتا ہے بگولا مجھ کو

پہلے دیوار اٹھائی تھی کہ خود کو دیکھوں
اب یہاں کوئی نہیں دیکھنے والا مجھ کو

لے اڑی مجھ کو مرے ذہن کی خوشبو توصیف
تو نے کیا سوچ کے زنجیر کیا تھا مجھ کو



دل تھا پہلو میں، تو کہتے تھے تمنا کیا ہے
اب وہ آنکھوں میں تلاطم ہے کہ دریا کیا ہے

شوق کہتا ہے کہ ہر جسم کو سجدہ کیجے
آنکھ کہتی ہے کہ تو نے ابھی دیکھا کیا ہے

ٹوٹ کر شاخ سے اک برگِ خزاں آمادہ
سوچتا ہے کہ گزرتا ہوا جھونکا کیا ہے

کیا یہ سچ ہے کہ خزاں میں بھی چمن کھلتے ہیں
مرے دامن میں لہو ہے تو مہکتا کب ہے!

دل پہ قابو ہو تو ہم بھی سرِ محفل دیکھیں
وہ خمِ زلف ہے کیا، صورتِ زیبا کیا ہے

ٹھہرو اور ایک نظر وقت کی تحریر پڑھو
ریگِ ساحل پہ رمِ موج نے لکھا کیا ہے

کیا مسافر کو کوئی منزلِ رفتہ یاد آئی
چل کے دیکھیں، یہ اجالا سرِ صحرا کیا ہے

کوئی رہبر ہے، نہ رستہ ہے، نہ منزل، توصیف
ہم کہ گردِ رہِ صرصر ہیں، ہمارا کیا ہے

انور معظم



ہمیں بھولا نہیں افسانہ دل کا
ابھی ہاتھوں میں ہے پیمانہ دل کا

دھواں اٹھتا نظر آتا ہے ہر سو
ابھی آباد ہے ویرانہ دل کا

جہاں بکھری ہے اب خاکسترِ دل
اسی جا تھا کبھی کاشانہ دل کا

ابھی تک یاد ہیں وہ دن کہ جب تھا
ہر اک آوارۂ غم، دیوانہ دل کا

وہ امیدوں کا اک ہلکا تبسم
دھڑک اٹھنا وہ بےتابانہ دل کا

کسی آنسو کی گم ہوتی صدا پر
لرزنا، ڈوبنا، گھبرانا، دل کا

غمِ دوراں، غمِ جاناں، غمِ جاں
ہر اک منزل پہ تھا نذرانہ دل کا

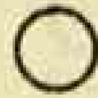
کھلے جاتے تھے گل ہر ہر قدم پر
کہیں بھی قافلہ ٹھہرا نہ دل کا

طلسمِ رنگ و بو تھا ٹوٹنے تک
ٹھکانہ پھر نہ تھا، گل کا نہ دل کا

اِدھر ارماں، اُدھر احساسِ حرماں
چھٹا کس موڑ پر یارانہ دل کا

ہمیں بادہ کشِ دردِ تمنا
ہمیں پر بند ہے میخانہ دل کا

انور معظم



ڈوبتے تاروں سے پوچھو نہ قمر سے پوچھو
قصۂ رخصتِ شب، شمعِ سحر سے پوچھو

کس نے بہلایا خزاں کو، گُلِ تر سے پوچھو
گُل پہ کیا گزری، بہاروں کے جگر سے پوچھو

کون رویا پسِ دیوارِ چمن، آخرِ شب
کیوں صبا لوٹ گئی، راہگذر سے پوچھو

رات بھر دیپ سرِ راہ جلے کس کے لیے
کیوں اندھیرا تھا بھرے گھر میں، قمر سے پوچھو

کس کے دامن سے لگی نکہتِ گُل روتی ہے
کون ہوتا ہے جدا جی کے نگر سے، پوچھو

ایک آواز تو گونجی تھی اُفق تا بہ اُفق
کارواں گُم ہے کہاں، گردِ سفر سے پوچھو

انور معظم



دیدۂ تر نے عجب جلوہ گری دیکھی ہے
غم نے جس شاخ کو پالا وہ ہری دیکھی ہے

ہائے کس بت کی خدائی کا بھرم ٹوٹا ہے
خلق نے آج ان آنکھوں میں تری دیکھی ہے

نہ ملا پر نہ ملا عشق کو اندازِ جنوں
ہم نے مجنوں کی بھی آشفتہ سری دیکھی ہے

آب و گل، غنچہ و گل، دیدہ و دل، شمس و قمر
کن حجابوں میں تری پردہ دری دیکھی ہے

ہاں، کبھی کھل نہ سکا پھول پہ مضمونِ بہار
او صبا! ہم نے تری نامہ بری دیکھی ہے

کون اسیرِ غمِ کوتاہیِ پرواز نہیں
کس نے صیاد کی بے بال و پری دیکھی ہے



آج کچھ یوں شبِ تنہائی کا افسانہ چلے
روشنیِ شمع سے، دل درد سے بیگانہ چلے

شعلہ در شعلہ کسی یاد کے چہرے ابھریں
موج در موج حبابِ رخِ جانانہ چلے

کچھ نہ ہو آنکھ میں، بے درد نگاہوں کے سوا
گفتگو ساقیِ دوراں سے حریفانہ چلے

وقت جب جھومے کہیں، بہکے کہیں، تھم جائے کہیں
کھل اٹھیں نقشِ قدم، یوں کوئی دیوانہ چلے

ٹوٹنے پائے نہ یہ سلسلۂ گردشِ درد
دست در دست چھلکتا ہوا پیمانہ چلے

انور معظم



آؤ دیکھیں اہلِ وفا کی ہوتی ہے توقیر کہاں
کس محفل کا نام ہے مقتل، کھنچتی ہے شمشیر کہاں

چھوٹ نہ پاؤ گے دل والو چاہے نکلے اس زنداں سے
چاہو تو دل ٹوٹ بھی جائیں، ٹوٹے گی زنجیر کہاں

چشمِ سحر میں آس امید کیا، آنسو کی اک بوند نہیں
یوں دامن پھیلائے چلے ہیں راتوں کے رہگیر کہاں

صدیوں کے بیچارے خوابوں سے بوجھل ان آنکھوں کو
ان جانے خوابوں کے شہر میں لے آئی تعبیر کہاں

اک ویرانہ، ایک شجر، کچھ سائے، دو پیاسی آنکھیں
دیکھیں سجے گی دن کے مکان میں رات کی یہ تصویر کہاں

وقت کا دریا لے بھی گیا وہ سب جو دل و جاں تھا عزیز
ڈھونڈ رہے ہو ساحل پر اب آنسو کی تحریر کہاں



یہ قصۂ غمِ دل ہے تو بانکپن سے چلے
کسی نگاہ پہ ٹھہرے، کسی بدن سے چلے

نہ جانے کس کے کرم سے کھلے کلی دل کی
سموم دشت سے اُٹھے، صبا چمن سے چلے

وہ آئے دل میں تو یوں جیسے شام کا تارہ
مثالِ ماہ ستاروں کی انجمن سے چلے

فسانے چاکِ گریباں کے پڑ گئے پھیکے
جنوں کی بات کبھی تیرے پیرہن سے چلے

ہجومِ صبح کی تنہائیوں میں ڈوب گئے
وہ قافلے جو اندھیروں کی انجمن سے چلے

انور معظم



زخمِ نظارہ، خونِ نظر دیکھتے رہو
جو کچھ دکھائے دیدۂ تر، دیکھتے رہو

چشمِ صدف کے درد سے صرفِ نظر کرو
کس طرح ٹوٹتے ہیں گہر، دیکھتے رہو

شاید کسی کا نقشِ کفِ پا چمک اُٹھے
اے رہنماؤ! راہ گزر دیکھتے رہو

گیسوئے شب سنوارنے والو، کبھی کبھی
آئینۂ نگارِ سحر دیکھتے رہو

آنکھوں میں گھُل نہ جائیں کہیں ظلمتوں کے رنگ
جس سمت روشنی ہے اُدھر دیکھتے رہو



جب مری زیست کے عنواں نئے مطلوب ہوئے
میرے اعمال میں ارمان بھی محسوب ہوئے

ان میں سب اپنا پتہ، اپنا نشاں ڈھونڈتے ہیں
جتنے افسانے ترے نام سے منسُوب ہوئے

سب دکھاتے ہیں ترا عکس مری آنکھوں میں
ہم زمانے کو اسی طور سے محبوب ہوئے

جن کو ایمان تھا نظروں کی مسیحائی پر
دل کی بستی سے جو گذرے، بڑے مجذوب ہوئے

قطرے قطرے سے لہو کے، اُسے سرسبز کیا
اور دیوانے اُسی شاخ پہ مصلوب ہوئے

انور معظم



یہ غزل کی انجمن ہے، ذرا اہتمام کر لو
کسی غم کو مے بنا لو، کسی دل کو جام کر لو

کہاں صبحِ غم کا سورج، کہاں شام کا ستارہ
اسی رُخ پہ زلف بکھرے، یہی صبح و شام کر لو

وہ حبیب ہو کہ رہبر، وہ رقیب ہو کہ رہزن
جو دیارِ دل سے گزرے، اُسے ہم کلام کر لو

یہ کہاں کے محتسب ہیں، یہ کہاں کی مصلحت ہے
جو انھیں نہیں میسر، وہی شے حرام کر لو



غمِ حبیب غمِ دو جہاں نہیں ہوتا
اگر خلوصِ وفا بیکراں نہیں ہوتا

دلوں کی آگ بڑھاؤ، کہ لوگ کہتے ہیں
چراغِ حسن سے روشن جہاں نہیں ہوتا

تری نگاہِ کرم ہی کا یہ اثر تو نہیں
جہاں میں ہم پہ کوئی مہرباں نہیں ہوتا

شعورِ منزلِ مقصود بھی ہے شرطِ سفر
ہجومِ رہرواں، کارواں نہیں ہوتا

ادیب سہیل



کی تھی جس کو شکلِ محبوبی عطا
سر اُسی پتھر سے زخمی ہو گیا

ہر گھڑی رہتا تھا آئینہ بدست
خود ستائی کے سوا کرتا بھی کیا

ہو گیا جب اس کو ادراکِ جہاں
توڑ کر آئینہ اس نے رکھ دیا

وہ ہوا ہے پیرہن کا یوں اسیر
کھل کے اب ہنسنا بھی مشکل ہو گیا

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو اس کا وصف
آدمی تخلیق و تکمیلِ خدا

اس کو باہر کی خبر کیا، بیچ میں
کھینچ کر بیٹھا ہوا ہے دائرہ

ہے یہاں ناپید خطِ مُستقیم
زندگی ہے پیچ و خم کا سلسلہ

ادیب سہیل



رُت بدلے تو آپ بدل لے سب بیوہار ہوا
جگ جگ سانگ رچائے، موسم کے انوسار ہوا

پیڑ، گھروندے، لٹھ اور کھمبے ہیں خاشاک سمان
بھیروں ناچ رہی ہے، پہنے ناگ کا ہار ہوا

اِس کی گرہیں کھولے بڑھ کر کوئی دھیان کی لہر
من میں لیے پھرتی ہے، صدیوں کے اسرار ہوا

اِس ویرانے میں بھی کھلتے جگ جگ رم کے پھول
دل سے کبھی ہو کر بھی گزرتی خوش رفتار ہوا

کون بتائے، کب کس کی اس راہ میں شامت آئے
سنتے ہیں اندھے کے ہاتھ کی ہے تلوار ہوا

ہم نے تو اس لمحے میں بھی رت کا سمیٹا درد
روش روش جب رواں دواں تھی صرصر کار ہوا

یوں بھی ہم نے جھیلا ہے موسم کا جبر سہیل
خوشبو کی کبھی لہر بنی، کبھی تیغ کی دھار ہوا

ادیب سہیل



دیارِ جاں پہ مسلط عجب زمانہ رہا
کہ دل میں درد، لبوں پہ رواں ترانہ رہا

کسی پہ برق گری، شاخِ جاں سلگ اُٹھی
کسی پہ سنگ چلے، سر مرا نشانہ رہا

قدم قدم پہ ملی گرچہ صرصرِ خوں ریز
ہجومِ گل اُسی انداز سے روانہ رہا

عدوئے دوست کبھی مجھ کو معتبر نہ ہوا
ازل سے اپنا یہ معیارِ دوستانہ رہا

جو قدرِ فن کا تعین کرو تو دھیان رہے
اسی سبب سے عدو میرا اِک زمانہ رہا

جو بات کہنی ہوئی، ہم نے برملا کہہ دی
سہیل شکوہ کسی سے نہ غائبانہ رہا



جب سے ہے بادِ خزاں صرصرِ غم آوارہ
خشک پتوں کی طرح رہتے ہیں ہم آوارہ

کچھ تو ہے بات کہ ہے موسمِ گل کے باوصف
بوئے گل، بوئے صبا، بوئے صنم آوارہ

کنج در کنج ستم خوردہ غزالوں کو ابھی
تا کجے رکھے گی یہ لذتِ رم آوارہ

جلوۂ سنگِ سرِ رہ میں نہ جانے کتنے
زود نمائی کو ہیں بے تاب صنم آوارہ

ہے غمِ زیست کا، یا سوزِ محبت کا صلہ
عارضِ گل پہ جو ہے گوہرِ نم آوارہ

رنگِ عارض کو تمازت سے بچانے کے لیے
رُخ پہ لہرایا ہوا، ابرِ کرم آوارہ

ادیب سہیل



ایک دیوار سی کہرے کی کھڑی ہے ہر سُو
پر سمیٹے ہوئے بیٹھی ہے چمن میں خوشبو

یہ اندھیرے بھی ہمارے لیے آئینہ ہیں
رُو برو کرتے ہیں کردار کے کتنے پہلو

ان سلگتے ہوئے لمحوں سے یہ ملتا ہے سراغ
دمبدم ٹوٹ رہا ہے شبِ غم کا جادو

دام بر دار کوئی دشتِ وفا سے گذرا
صورتِ خواب ہوا حسنِ خرامِ آہو

پھر ہوا حبس کا احساس، گر اس بار سہیل
پھر مرا دل ہے طلبگارِ ہوائے گیسو

کیا دَور ہے کہ جو بھی سخنور ملا مجھے
گم گشتہ اپنی ذات کے اندر ملا مجھے

کس پیار سے گیا تھا تری آستیں کے پاس
شاخِ حنا کی چاہ میں خنجر ملا مجھے

اس ظلمتِ حیات میں اِک لفظ پیار کا
جب مل گیا تو ماہِ منوّر ملا مجھے

صورت گرانِ عصر کا تھا انتظار کش
تیری رہِ طلب میں جو پتھر ملا مجھے

روزِ ازل سے کارگہِ ہست میں سہیل
دل ہی غمِ حیات کا محور ملا مجھے

ادیب سہیل



دل انہیں روئے جو سیلِ تیرگی میں گم ہوئے
یا اُنہیں جو آپ اپنی روشنی میں جل بجھے

حُسن ہو جاتا ہے جس لمحے ضرورت کا اسیر
ایک ہو جاتے ہیں اس دم خیر و شر کے دائرے

سب ہوا کے رُخ پہ اُڑتے برگ کے ہیں ہم نوا
کون لے اس کی خبر، رہتا ہے جو پتھر تلے

روشنی درکار ہے تو خود ہی روزن وا کرو
منتظر کب تک رہو گے تم ہوائے تیز کے

کوئی تو ہوتا جو خونِ فن کی قیمت جانتا
دوست ناشر سے تو اب تک عذرنامے ہی ملے



پیچ و خم وقت نے سو طرح ابھارے لوگو
کاکلِ زیست مگر ہم نے سنوارے لوگو

اپنے سائے سے تمہیں آپ ہے وحشت زدگی
تم ہو کس مصلحتِ وقت کے مارے لوگو

ہم سفر کس کو کہیں، کس کو سُنائیں غمِ دل
پنبہ در گوش ہوئے سارے تمہارے لوگو

ضربتِ سنگ سے اپنی صدا کے غنچے
گنبدِ جہد میں ہم جب بھی پکارے لوگو

مجھ سے تم دُور بھی رہ کر ہو رگِ جاں سے قریب
مرے نادیدہ رفیقو، مرے پیارے لوگو،

شہاب جعفری



دشتِ غربت ہے تو وہ کیوں ہیں خفا ہم سے بہت
ہم دکھی بیٹھے ہیں، لگ چل نہ صبا ہم سے بہت

کیا ہے دامن میں بجز گردِ مہ وسالِ امید
کیوں الجھتی ہے زمانے کی ہوا ہم سے بہت

اب ہم اظہارِ الم کرنے لگے ہیں سب سے
اب اٹھائی نہیں جاتی ہے جفا ہم سے بہت

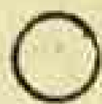
کون موسم ہے کہ پتھر سے لہو رستا ہے
خوں بہا مانگے ہے اب دل کی صدا ہم سے بہت

دادِ شوریدہ سری پائے جو سر سے گذرے
دور بھاگے ہے عبث موجِ بلا ہم سے بہت

کر تو دیں قصۂ دوراں میں ترے غم کا بیاں
پر لہو مانگے ہے یہ فکرِ رسا ہم سے بہت

چڑھتے سورج کے پجاری وہی نکلے جو شہابؔ
کرتے تھے تذکرۂ صدق و صفا ہم سے بہت

شہاب جعفری



یاد اُس کی ہے کچھ ایسی کہ بسرتی بھی نہیں
نیند آتی بھی نہیں، رات گذرتی بھی نہیں

زندگی ہے کہ کسی طرح گذرتی بھی نہیں
آرزو ہے کہ مری موت سے ڈرتی بھی نہیں

بس گذرنے چلے جاتے ہیں مہ و سالِ امید
دو گھڑی گردشِ ایام ٹھہرتی بھی نہیں

دُور ہے منزلِ آفاق، دُکھی بیٹھے ہیں
سخت ہے پاؤں کی زنجیر، اُترتی بھی نہیں

سُن تو سائل نہیں ہم خاک نشینِ گمراہ
اے صبا تُو تو ذرا دیر ٹھہرتی بھی نہیں

شام ہوتی ہے تو اک اجنبی دستک کے سوا
دل سے پہروں کوئی آواز ابھرتی بھی نہیں

زندگی، تُو بھی کوئی موجِ بلا کیوں نہ سہی
ایک ہی بار مرے سر سے گذرتی بھی نہیں

شہاب جعفری



حیات میں بھی اجل کا سماں دکھائی دے
وہی زمین، وہی آسماں دکھائی دے

قدم زمیں سے جدا ہیں، نظر مناظر سے
غریبِ شہر کو شہرِ آسماں دکھائی دے

تمام شہر میں بے چہرگی کا عالم ہے
جسے بھی دیکھئے گرد اور دھواں دکھائی دے

اک ایک شخص ہجومِ رواں میں تنہا ہے
اک ایک شخص ہجومِ رواں دکھائی دے

کبھی سلگتی پلکوں کا گریۂ سحری
لہولہان سا ایک اک مکاں دکھائی دے

بکیں ہوں میں کہ مسافر ہوں دشت ہے کہ دیار
قیام میں بھی سفر کا سماں دکھائی دے

درونِ دل ہو کہ بیرونِ دل سفر اپنا
کہیں لحد، کہیں خالی مکاں دکھائی دے

وہ دھوپ ہے کہ سلگتا ہے سایہ پاؤں تلے
خمیرِ خاک بھی آگ اور دھواں دکھائی دے

ہے جسم شعلہ ہی شعلہ تو جاں ہے پیاس ہی پیاس
اور اپنا سایہ سرابِ تپاں دکھائی دے

میں کس طرف کو بڑھوں، آسماں ہے نہ زمیں
میں جس طرف بھی چلوں، خوفِ جاں دکھائی دے

زمین ہے کہ نہنگ، پاؤں کس جگہ ہیں، ندیم!
مجھے بتا، مجھے سب کچھ دھواں دکھائی دے

سب اپنے درد کے دوزخ میں جل رہے ہیں شہابؔ
مگر زمیں ہمیں جنت نشاں دکھائی دے



اب کہاں سے کر چھپیں عریاں بدن اور تن جلا
دھوپ ایسی ہے کہ سائے سے بھی پیراہن جلا

چھین لو احساس مجھ سے، چھین لو میرا شعور
اس گھٹا میں تن پھنکا، اس روشنی سے من جلا

کس صدا کی ضرب سے ٹوٹا سکوتِ سنگِ دشت
ایک چنگاری اڑی، سارا کا سارا بن جلا

دل جو تھا سینے میں بچ سکتے تھے کب اہلِ خرد
شہر میں اک شور تھا، دامن جلا دامن جلا

دل دکھوں کی خاک پر کی شب نشینی ماہ نے
دن کبھی نکلا تو اک سورج سرِ مدفن جلا

تیرگی کی آندھیاں اٹھتی رہیں ہر نور سے
اک چراغ ایسا ہے سینے میں کہ بے روغن جلا

رفتہ رفتہ ہو گئے دستِ طلب اہلِ جنوں
راستوں پر سب لیے بیٹھے ہیں اک دامن جلا

گھٹ کے رہ سکتی تھی کب تک آتشِ رنگِ بہار
ضربِ موسم بھی کچھ ایسی تھی کہ سب گلشن جلا

شہاب جعفری



اس دھوپ سے کیا گلہ ہے مجھ کو
سائے نے جلا دیا ہے مجھ کو

میں نالہ سکوتِ سنگ کا ہوں
صحرا نے بہت سنا ہے مجھ کو

میں لفظ کی طرح بے زباں تھا
معنی نے ادا کیا ہے مجھ کو

ہر سچ کا نصیب سنگ ساری
اور سچ ہی سے واسطہ ہے مجھ کو

خائف نہیں مرگِ ناگہاں سے
جینے کا وہ حوصلہ ہے مجھ کو

پتھر پہ مری صدا کا سایہ
آئینہ دکھا رہا ہے مجھ کو

آواز دے مجھ کو تیرگی میں
آواز ہی نقشِ پا ہے مجھ کو



یہ محشرِ سوز و ساز کیا ہے
آخر مرا امتیاز کیا ہے

دل محوِ صدائے درد کیوں ہے
یہ عرضِ ہنر گداز کیا ہے

مفہومِ نوائے راز کیا تھا
آوازِ شکستِ ساز کیا ہے

ڈرتا ہوں کہ اپنا غم نہ ہو جائے
اپنے سے یہ احتراز کیا ہے

پا کر بھی تجھے میں سوچتا ہوں
مٹنے کا مرے، جواز کیا ہے

اب تُو جو ملا تو میں نہیں ہوں
مجھ سے ترا امتیاز کیا ہے

کس کس کو بھلا چکا ہوں لے غم
یہ بے دلیِ نیاز کیا ہے

اکثر تو ترا بُرا بھی چاہا!
کیا جانئے خود پہ ناز کیا ہے

شہاب جعفری



شام رکھتی ہے بہت درد سے بیتاب مجھے
لے کے چھپ جا کہیں اے آرزوئے خواب مجھے

اب میں اک موجِ شبِ تار ہوں ساحل ساحل
راہ میں چھوڑ گیا ہے مرا مہتاب مجھے

اب تک اک شمعِ سیہ پوش ہوں صحرا صحرا
تجھ سے چھٹ کر نہ ملی رہگذرِ خواب مجھے

ساحلِ آب و سراب ایک ہے منزل منزل
تشنگی کرتی ہے سیراب نہ غرقاب مجھے

میں بھی صحرا ہوں مجھے سنگ سمجھنے والو!
اپنی آواز سے کرتے چلو سیراب مجھے

میں بھی دریا ہوں، ہر اک سمت رواں ہوں کب سے
میرا ساحل بھی نہیں منزلِ پایاب مجھے

اب مجھے ڈھونڈ نہ آغوشِ گریزاں ہر سو
لے اڑی خاک، بہائے گیا سیلاب مجھے

شام پوچھے تو نہ کہنا کہ میں دنیا میں نہیں
لے کے پھر آئے گا اِس گھر میں مرا خواب مجھے



دل پہ وفا کا بوجھ اٹھاتے رہے ہیں ہم
اپنا ہر امتیاز مٹاتے رہے ہیں ہم

منہ پر جو یہ جلے ہوئے دامن کی راکھ ہے
شعلوں میں زندگی کے، نہاتے رہے ہیں ہم

اتنا نہ کھل سکا کہ ہوا کس طرف کی ہے
سارے جہاں کی خاک اڑاتے رہے ہیں ہم

آنکھوں سے دل تک ایک جہانِ سکوت ہے
سنتے ہیں اس دیار سے جاتے رہے ہیں ہم

تیرا خیال مانعِ عرضِ ہنر ہوا!
کس کس طرح سے جی کو جلاتے رہے ہیں ہم

کس کی صدا سُنی تھی کہ چپ لگ گئی شہاب
ساتوں سروں کا بھید گنواتے رہے ہیں ہم

شہاب جعفری



ہجر و وصالِ یار کا موسم نکل گیا
اے دردِ عشق، جاگ، زمانہ بدل گیا!

کب تک یہ روزِ حشر، سن اے شامِ انتظار
کیا رات اب نہ آئے گی، سورج تو ڈھل گیا

اب کے کہاں سے آئے ہو ساون کے بادلو
دیکھو تو سارا باغ ہی برکھا سے جل گیا

جاؤں کہاں کہ تاب نہیں عرضِ نغمہ کی
پانی میں آگ لگ گئی پتھر پگھل گیا

سانسوں کے رنگ سے جلتی ہے دل کی آگ
بادِ فنا میں بھی مرا شعلہ سنبھل گیا

اس کی حسد لے راگ نکالے شہاب نے
اک شب لگی وہ آگ کہ نادان جل گیا



میں ہی میں بکھرا ہوا ہوں راہ تا منزل تمام
خاکداں تا آسماں چھایا ہوا ہے دل تمام

پی چکی کتنی ہی موجوں کا لہو ساحل کی ریت
لاشیں ہی لاشیں نظر آئیں سرِ ساحل تمام

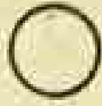
گھر کو دن بھر کی متاعِ رہ نوردی سونپ دی
سعیٔ پیہم کا، غبارِ شہر تھا حاصل تمام

ماہتاب ابھرا ابھی تو جانے کہاں ڈوبا، کہ رات
کر دیا موجوں نے چھلنی سینۂ ساحل تمام

دیکھنا سب نے اٹھا رکھی ہے کاندھوں پر صلیب
بھیس میں مقتول کے روپوش ہیں قاتل تمام

خاک ملے خاک! اب میں نیرا درد ہوں، پیکر نہیں
درد وہ آفت ہے جو دل پہ ہوئی نازل تمام

سلیم شاہد



کھلتی ہے گفتگو سے گرہ پیچ و تاب کی
پر کس سے کھل کے بات کریں اضطراب کی

کافی نہیں ہے چشمِ تماشا کو رنگِ گل
لائیں کہاں سے زخم میں خوشبو گلاب کی

اپنی برہنگی کو بچا تیز دھوپ سے
کرنوں میں بُو ہے جلتے ہوئے آفتاب کی

کچھ میں شجر سے ٹوٹ کے بے خانماں ہوا
ہاں کچھ ہوا نے بھی مری مٹی خراب کی

اک عمر ہو گئی ہے کہ میں جانکنی میں ہوں
ایسی ٹھہر گئی ہے یہ ساعت عذاب کی

احساس تیرگی ہے تو سورج اچھال دے
ورنہ دعا نہ مانگ یہاں انقلاب کی

محکوم بستیوں سے سرکنے لگی ہے دھوپ
وہ عہد ہوں کہ جس نے شفق بے نقاب کی

بجلی چلی گئی تو وہ آنکھوں میں رہ گیا
اب چھو کے پڑھ رہا ہوں عبارت کتاب کی

شاہد کہاں سے ہو کے گزرتی ہے آب جو
رنگت تمام سرخ ہے کیوں سطحِ آب کی

سلیم شاہد



درد کی خوشبو سے سارا گھر معطر ہو گیا
زخم کھا کھا کر بدن پھولوں کا پیکر ہو گیا

مائل پرواز ہر لحظہ ہے مرغ جستجو
میں جو سیڑھی پر چڑھا، وہ اور اوپر ہو گیا

گوہرِ امید لائیں کس اتھاہ میں ڈوب کر
ہم جو غوطہ زن ہوئے، گہرا سمندر ہو گیا

ترچھے سورج کی شعاعیں دے گئیں اک ہم سفر
میرا سایہ ہی مرے قد کے برابر ہو گیا

ہم شفق کو دیکھ کر تاریکیوں میں کھو گئے
آگ چھت پر تھی، دھواں کمرے کے اندر ہو گیا

پیڑ پر بیٹھے پرندوں پر گماں پتوں کا تھا
دم زدن میں آنکھ سے اوجھل وہ منظر ہو گیا

صبح کا آغاز تھا اور چہرے پر تھی گردِ شب
پھول کی صورت شگفتہ میں نہا کر ہو گیا

میں سمجھتا تھا، تعاقب میں فقط ہیں واہمے
لوٹ کر دیکھا مگر جس نے بھی، پتھر ہو گیا

سنگ پانی میں گرا کر دیکھ لو، اُبھرے گی لہر
بات ایسی تھی کہ میں آپے سے باہر ہو گیا

جن درختوں کی گھنی چھاؤں تھی، وہ سب کٹ گئے
یوں لگا شاہد مجھے، جیسے میں بے گھر ہو گیا

سلیم شاہد

اس کو مل کر دیکھ، شاید وہ ترا آئینہ ہو
غائبانہ ہی تری اس کی شناسائی نہ ہو

مجھ پہ ظاہر ہے، ترے جی میں ہیں کیا کیا خواہشیں
بات ایسی کر کہ جس میں تیری رسوائی نہ ہو

احتیاطاً دیکھتا چل اپنے سائے کی طرف
اس طرح شاید تجھے احساسِ تنہائی نہ ہو

آسماں اک دشت کی صورت، ستارے ریت ہیں
تو لبِ دریا سرابوں کا تمنائی نہ ہو

ڈھونڈ اب کچھ بھاگتے لوگوں میں صورت آشنا
ان بگولوں میں گئے لمحوں کی پرچھائی نہ ہو

تھا سفر درپیش صحرا کا، گرہ میں رکھ دیے
اس نے کچھ کانٹے کہ عذرِ آبلہ پائی نہ ہو

کھینچ لے گا ابر سے بارش اگر سبزہ ہوا
تو کسی کی چاہ میں بے کار سودائی نہ ہو

ہم اسے چھو کر یہی سمجھے کہ وہ پتھر نہیں
اس سے بڑھ کر اور کیا کہیے جو بینائی نہ ہو

کھل گئی ہے آنکھ تو چادر ہٹا کر دیکھ لے
تیرے کمرے ہی میں ان خوابوں کی رعنائی نہ ہو

زخم تیرے دل کی زینت ہیں انہیں پردے میں رکھ
کوئی نامحرم ترے گھر کا تماشائی نہ ہو

آج شاہد اس کے دروازے پہ پاؤں رک گئے
ریڈیو بجتا تھا، میں چونکا کہ شہنائی نہ ہو

صبحِ سفر کا راز کسی پر یہاں نہ کھول
طوفاں ہے، پانیوں میں ابھی بادباں نہ کھول

پسماندگاں پہ چھوڑ کہ ڈھونڈیں نقوشِ پا
جو سنگ و خشت ہیں، تہِ آبِ رواں نہ کھول

میں نے سرابِ فہم کے شب راز پا لئے
اب لاکھ مجھ پہ عقدۂ ہفت آسماں نہ کھول

سب کچھ یہاں ہے چشمِ خریدار کی پسند
نذرِ متاعِ درد اگر ہے، دکاں نہ کھول

شاخِ شفق پہ شعلۂ خورشید بجھ تو لے
کچھ دیر تیرگی پہ درِ خاکداں نہ کھول

ہر بزم کیوں نمائشِ زخمِ ہنر بنے
ہر بھید اپنے دوستوں کے درمیاں نہ کھول

شاہد حصارِ جہل پہ تیشے سے وار کر
ان پتھروں کے روبرو اپنی زباں نہ کھول

سلیم شاہد

حرفِ بے مطلب کی میں نے کس قدر تفسیر کی
شکل پہچانی گئی پھر بھی نہ اس تصویر کی

صبح کا دروازہ کھلتے ہی چلو گلشن کی سمت
رنگ اڑ جائے گا پھولوں کا، اگر تاخیر کی

قید میرے جسم کے اندر کوئی وحشی نہ ہو
سانس لیتا ہوں تو آتی ہے صدا زنجیر کی

تیرے چہرے پر جو لکھا تھا، مری آنکھوں میں ہے
حفظ ہے مجھ کو عبارت اب بھی اس تحریر کی

تجھ کو دیکھا بھی نہیں لیکن تیری خواہش بھی ہے
ریت کی دیوار سطحِ آب پر تعمیر کی

گھر کی ویرانی در و دیوار کے اندر رہی
میں نے اپنے درد کو مہلت نہ دی تشہیر کی

میں نے لوحِ عرش پر لکھا ہوا سب پڑھ لیا
لا، مری آنکھوں میں مٹی ڈال دے تقدیر کی

مہر و مہ لگتے ہیں اپنے جسم کے ذرے مجھے
سوچتا ہوں، کونسی منزل ہے یہ تسخیر کی

لٹ چکے وہ ہاتھ شاہد جن سے مانگی تھی دعا
ہاں ابھی تک ہے فضاؤں میں مہک تاثیر کی

کیا میرا اختیار زمان و مکان پر
پہرے بٹھا دیئے ہیں کسی شے نے دھیان پر

تجھ سے بچھڑ کے گھر کی طرف لوٹتے ہوئے
کیوں بستیوں کا وہم ہوا ہر چٹان پر

حسرت رہی کہ صورتِ آبِ رواں چلیں
کب سے مثالِ سنگ پڑے ہیں ڈھلان پر

تھی جن کی دسترس میں ہوا، پا بہ گل ہوئے
اے مشتِ خاک، زعم کہاں کا اڑان پر

ہاں آرزو تو دل میں کبھی سے ہے زخم کی
کیا اپنا اختیار کسی کی کمان پر

ڈھلنے لگی ہے شام مرے خاکداں کی خیر
شعلہ فشاں ہوئی ہے شفق آسمان پر

شاہد تمام عمر پھرا دربدر مگر
دستک نہ دے سکا کبھی اپنے مکان پر

سلیم شاہد

زمیں کو سجدہ کیا خون سے باوضو ہو کر
میں رزم گاہ سے لوٹا ہوں سرخرو ہو کر

جہاں میں پھیل گئی دودِ شعلہ سے ظلمت
فلک پہ بہہ گیا سورج لہو لہو ہو کر

مجھے تھا دامِ اسیری، نشیب دریا کا
اچھل گیا میں کناروں سے تند خو ہو کر

گریز پائی کو ہے گمرہی کا دشتِ بلا
خطِ سفر تو چمکتا ہے آب جو ہو کر

وہ لمس، ذائقہ جس نے مری زباں کو دیا
بکھر نہ جائے کہیں صوتِ گفتگو ہو کر

کیا ہے پرسشِ احوالِ زخم نے رسوا
یہ چاک اور نمایاں ہوا رفو ہو کر

رہی نہ ٹوٹ کے گرنے سے میری یکتائی
میں پاش پاش ہوا خود سے دو بدو ہو کر

زبانِ خلق پہ شاہدؔ میں حرفِ تلخ رہا
اڑی نہ خاک مری گردِ آبرو ہو کر

قائل کروں کس بات سے میں تجھ کو، ستمگر!
ڈھلوان پہ رکتا نہیں پانی ہو کہ پتھر

سورج نکل آیا تو وہ موسم نہ رہے گا
کچھ دیر کا مہماں ہے یہاں صبح کا منظر

باہر جو میں نکلوں تو برہنہ نظر آؤں
بیٹھا ہوں میں گھر میں، در دیوار پہن کر

بیکار گیا گہرے سمندر میں اترنا
لہریں مجھے پھر ڈال گئیں ریت کے اوپر

آ دیکھ کہ ہوں اب بھی میں آغوش کشادہ
آنکھیں ہیں مری اوس میں بھیگا ہوا بستر

کیا مجھ سے مری عمر کا قد ناپ رہے ہو
ہر پل ہے یہاں کتنی ہی صدیوں کے برابر

بادل ہو تو پھر کھل کے برس لو کبھی شاہدؔ
ہے بات اگر دل میں تو کہہ دو اسے منہ پر

سلیم شاہد

خواہش کو اپنے درد کے اندر سمیٹ لے
پرواز بارِ دوش ہے تو پر سمیٹ لے

اپنی طلب کو غیر کی دہلیز پہ نہ ڈال
وہ ہاتھ کھینچ گیا ہے تو چادر سمیٹ لے

سرخی طلوعِ صبح کی، لوحِ افق پہ لکھ
سارے بدن کا خون جبیں پر سمیٹ لے

یکجا نہیں کتابِ ہنر کے ورق ہنوز
ایامِ حرف حرف کا دفتر سمیٹ لے

جو پیڑ ہل چکے ہیں انہیں آندھیوں پہ چھوڑ
شاید ہوا یہ راہ کے پتھر سمیٹ لے

زندہ لہو تو شہر کی گلیوں میں ہے رواں
شاہدؔ رگوں میں کون یہ محشر سمیٹ لے

جرأتِ اظہار کا عقدہ یہاں کیسے کھلے
مصلحت کا بیم دل میں ہے، زباں کیسے کھلے

بے دلی سے ہے رگ و پے میں لہو ٹھہرا ہوا
آنکھ میں پوشیدہ زخموں کا نشاں کیسے کھلے

دامِ ساحل ہے سفینے کی اسیری کا سبب
سر پٹختا ہوں کہ اب یہ بادباں کیسے کھلے

حرفِ مبہم کی طرح اوراقِ روز و شب میں گم
رازِ آخر دشمنوں کے درمیاں کیسے کھلے

ہر گھڑی دستک سی دیتا ہے اندر سے مجھے
سوچتا رہتا ہوں، بابِ جسم و جاں کیسے کھلے

لفظ ہیں شاہدؔ مری تحریر کے افسردہ لب
شعر میں پوشیدہ معنی کا جہاں کیسے کھلے

اقبال ماہر



نظر نظر میں تمنّا، قدم قدم پہ گریز
جہاں جہاں بھی ملے کوہکن، وہیں پرویز

گھٹا گھٹا سا دھند لکا ہے قصر و ایواں میں
نکل چلو جہاں میداں میں روشنی ہے تیز

ترے کرم پہ بھی اندیشہ ہائے دور و دراز
ملے ہیں جام و سبو وہ بھی زہر سے لبریز

نمودِ خارِ مغیلاں ہے باغباں کو پسند
زمینِ لالہ و گل ورنہ ہے بہت زرخیز

سکوں ملا ہے کنیزوں کو خوابِ شیریں کا
جو کوہکن نے سنبھالی ہے دولتِ پرویز

تغیراتِ خیالات — ارتقائے حیات
تصادمِ نظریات — فتنہ ہا چنگیز

گزر رہے ہیں شب و روز اس طرح ماہرؔ
نہ زندگی سے محبت، نہ زندگی سے گریز

اقبال ماھر



اہلِ فن، اہلِ ادب، اہلِ قلم کہتے رہے
بدزباں کو ہم زبانِ دانِ عجم کہتے رہے

جبر و استبداد کو جُود و کرم کہتے رہے
صبر و طاعت کو علاجِ درد و غم کہتے رہے

ہم کو ہر محفل میں تھا آدابِ محفل کا خیال
احتراماً ہر کسی کو محترم کہتے رہے

چشم پوشی سے ریاکاری کو شہ ملتی رہی
عیب پوشی کو شرافت کا بھرم کہتے رہے

آبروئے مذہب و ملت بھی رکھنی تھی ضرور
ننگِ منبر کو بھی ہم شیخِ حرم کہتے رہے

وہ بھی نکلے رہنماؤں کے نقوشِ کجروی
جن کو راہی راستے کے پیچ و خم کہتے رہے

بارہا دیکھا ہے ماہران کو مغموم و ملول
ہم جنھیں پروردۂ ناز و نعم کہتے رہے

اقبال ماھر



حسبِ معمول آئے ہیں شاخوں میں پھول اب کے برس
سایہ افگن ہیں مگر اُن پہ ببول اب کے برس

اس طرح بدلا محبت کا اصول اب کے برس
ہم بھی ہیں مغموم، تم بھی ہو ملول اب کے برس

جھونپڑوں سے کٹ کے چاندی کے بگولے چل دیے
بالا بالا اُڑ گئی سونے کی دھول اب کے برس

اتنے غم، اتنے مسائل، اتنے عنوانِ سخن
ہے جُدا ہر شعر کی شانِ نزول اب کے برس

کٹ گئیں صدیاں اسی موہوم سی امید پر
آسماں سے ہوگا رحمت کا نزول اب کے برس

مٹ گئی تحریرِ قسمت، اُٹھ گئے انجم شناس
عقل خود کرتی ہے تدبیرِ حصول اب کے برس

انقلاب آثار ہے رفتارِ ماہ و سال کی
کچھ تو بدلے گا زمانے کا اصول اب کے برس



زیست تکرارِ نفس ہو جیسے
صرف جینے کی ہوس ہو جیسے

صحنِ گلشن میں بھی جی ڈرتا ہے
سایۂ گل میں قفس ہو جیسے

ترکِ اُلفت کی قسم کھاتے ہیں
دل پہ انسان کا بس ہو جیسے

وہی رفتارِ مہ و سال ہنوز
وقت خاموش جرس ہو جیسے

منتظر یوں بھی رہے ہیں ماہرؔ
ایک پل، لاکھ برس ہو جیسے

اقبال ماھر



اجنبیت کا ہر اک رُخ پہ نشاں ہے یارو
اپنے ہی شہر میں غربت کا سماں ہے یارو

آسمانوں میں لچکتی ہوئی یہ قوسِ قزح
بھیس بدلے ہوئے راون کی کماں ہے یارو

اِک سیاست ہے کہ ہے دیر و حرم کی محبوب
اک محبت ہے کہ رسوائے جہاں ہے یارو

اہلِ دل رہ گئے آثارِ قدیمہ ہو کر
زندگی ایک شکستہ سا مکاں ہے یارو

دل ہی شائستۂ گل گشت نہیں ہے ورنہ
یہ زمیں آج بھی فردوسِ جہاں ہے یارو



شہپارۂ ادب ہو اگر وارداتِ دل
نقش و نگارِ فکر میں ہو جائے منتقل

تھا اعتبارِ ضبط مگر آج ناگہاں
خود وہ تڑپ اُٹھے ہیں کچھ ایسا دکھا ہے دل

لطف و کرم کی اب وہ تمنّا نہیں رہی
کس دور میں ہوئی ہے تری چشم منفعل

تھی آرزو سکوں کی مگر اس قدر نہیں
اس شدّتِ خلوص سے گھبرا گیا ہے دل

کس وقت یاد آئی ہے دورِ نشاط کی
ماحول بھی اُداس، طبیعت بھی مضمحل

مدّت کے بعد آج ملے بھی تو اس طرح
کچھ ہم بھی شرمسار ہیں کچھ وہ بھی ہیں خجل

اقبال ماہر



گل کی خوشبو کی طرح آنکھ کے آنسو کی طرح
دل پریشاں ہے گردِ رمِ آہو کی طرح

جو گل اندام مکینوں کو ترستے ہیں ہنوز
شہر ہیں کتنے کھنڈر ہیں مرے پہلو کی طرح

زلفِ گیتی کو بھی آئینہ و شانہ مل جائے
تم سنور جاؤ جو آرائشِ گیسو کی طرح

رقص کرتا ہے زر و سیم کی جھنکار پہ فن
مرمریں فرش پہ بجتے ہوئے گھنگھرو کی طرح

آج بھی شعبدۂ اہلِ ہوس ہے انصاف
دستِ بقال میں پُرکار ترازو کی طرح

محشرستانِ سکوں ہے مری ہستی ماہر
کسی شہباز کے ٹوٹے ہوئے بازو کی طرح



رات تاریک، راستے خاموش
منزلوں تک ہیں قہقہے خاموش

آرزوؤں کے ڈھے گئے اہرام
حسرتوں کے ہیں مقبرے خاموش

دل کے اُجڑے نگر سے گزرے ہیں
کتنی یادوں کے قافلے خاموش

منتظر تھے جو میری آمد کے
ہیں منڈیروں پہ وہ دیے خاموش

میرے مستقبلِ محبت پر
زندگی کے ہیں تجربے خاموش

ذہنِ آذر ہے خواب گاہِ جمود
فکر و فن کے ہیں بتکدے خاموش

جمیل یوسف



تعلقات کے زخموں کا ہوں ستایا ہوا
جو شام آئی، مرا سایہ بھی پرایا ہوا

مٹے گا ذہن سے کب تیری یاد کا افسوں
ہزار صدیوں سے یہ بوجھ ہے اُٹھایا ہوا

وہ ایک شخص ابھی دل میں چُھپ کے بیٹھا ہے
وہ شخص جو کبھی اپنا، کبھی پرایا ہوا

ہر ایک لمحے کی آہٹ پہ دل لرزتا ہے
زمانے بھر کو ہو جیسے گلے لگایا ہوا

نئی رُتوں کی ہوا نے عجیب سازش کی
کہ موجِ خوں میں ہے ہر برگِ گُل نہایا ہوا

کسی کے سانس کی آواز تک نہیں آتی
سکوتِ مرگ نے پہرہ ہے وہ بٹھایا ہوا

ہر اک نظر میں کوئی اجنبی سی آہٹ ہے
ہر ایک دل میں کوئی خوف ہے سمایا ہوا

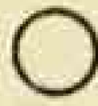
وہ تیرگی ہے کہ آنکھوں میں اک کرن بھی نہیں
وہ خامشی ہے کہ لمحوں نے زہر کھایا ہوا

میں اپنے وقت کے زنداں کا ایک قیدی ہوں
نظر نظر ہے فصیلوں نے سر اٹھایا ہوا

گریزپا ہے وہ عمرِ عزیز کی مانند
ہے ایک عمر سے اپنا جسے بنایا ہوا

نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی ہمراہی
تمہاری زلف کا سایہ تو خیر سایہ ہوا

جمیل یوسف



گو حُسن کی صورت ہیں مری سمت رواں بھی
اِک خواب سی لگتی ہیں مجھے روشنیاں بھی

کچھ اپنی کہو، ڈوبتے تاروں کو نہ دیکھو
شاید نہ ملے پھر یہ نشاطِ گزراں بھی

سوچا تھا کہ لُوٹوں تیری فرقت کے خزینے
دیکھا نہ گیا تیرے بچھڑنے کا سماں بھی

کچھ دل بھی ہے میرا غمِ ایّام سے بوجھل
کچھ شام کی دہلیز سے اُٹھتا ہے دُھواں بھی

کس اجنبی رہرو کے تعاقب میں چلا ہے
پائے گا نہ تو ریت پہ قدموں کے نشاں بھی

کرتا ہوں کبھی چشمِ تخیّل سے نظارہ
ہوتا ہے کبھی تجھ پہ محبت کا گماں بھی

تو حاصلِ منزل بھی، مرا راہنما بھی
تو مجھ سے گریزاں بھی، قریبِ رگِ جاں بھی

جمیل یوسف



دھیان کا راہی رُک رُک کر پیچھے تکتا ہے
بیتے لمحے یاد آتے ہیں، دل روتا ہے

بند دریچے، صف بستہ گم سم دیواریں
شہر کی ویرانی سے مجھ کو خوف آتا ہے

جانے لوگوں کی آوازیں کیا کہتی ہیں
جانے ہر جانب کیوں گہرا سناٹا ہے

کہتے ہیں آ آ کے مجھ کو اونٹوں والے
صحرا میں بجلی چمکی ہے، مینہ برسا ہے

بڑھتے ہی جاتے ہیں دیواروں کے سائے
دھوپ کا سُندر جوبن اب ڈھلتا جاتا ہے

پہروں بیٹھا اُن کی باتوں کو سنتا ہوں
کاغذ کی تصویروں سے جی خوش ہوتا ہے

ہمدم ایسے لوگ کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں
جن کی باتوں سے دل کا غنچہ کھلتا ہے



ہوا چلی تو نشہ چھا گیا فضاؤں میں
خیال ڈوب گیا دُور کی صداؤں میں

نہ ہاتھ آئے مرے، دوڑتے ہوئے لمحے
سفر کٹا ہے مرا، بادلوں کی چھاؤں میں

میں اپنے شہر کے نقش و نگار بھول گیا
کسی نے لوٹ لیا مجھ کو چاٹ گاؤں میں

نہ عشق کی کوئی منزل، نہ حُسن کا کوئی طور
یہ آگ کیسے گرفتار ہو وفاؤں میں

یہ فاصلوں کے سرابوں سے سیر ہو نہ سکے
نہ جانے تشنگی کتنی ہے میرے پاؤں میں

قدم قدم پہ مجھے سجدہ گہ نظر آئے
گھرا ہوا ہوں میں بندوں میں یا خداؤں میں

اسے بھی گاہے بگاہے نگاہ میں رکھنا
جمیل بھی تو ہے تیرے غزل سراؤں میں

جمیل یوسف



ہر سمت رنگ و نور کا دریا دکھائی دے
ہر موجِ رنگ میں ترا چہرہ دکھائی دے

ہر آئنے میں تیرا سراپا دکھائی دے
کوئی تو اس جہان میں اپنا دکھائی دے

ملے کس طرح ہو جادۂ نیرنگِ آرزو
ہر گام تیرا نقشِ کفِ پا دکھائی دے

کرنیں گریز پا ہیں تو خوشبو ہوا نہ جُو
اے کاش کوئی اپنا شناسا دکھائی دے

اِک دامنِ نظر کہ بچانا محال ہے
اِک شعلۂ بدن کہ لپکتا دکھائی دے

دنیائے رنگ و نور بہت بیکراں سہی
پیشِ نظر جو تو ہے تو پھر کیا دکھائی دے



اب تو اپنے جسم کا سایہ بھی بیگانہ ہُوا
میں تری محفل میں آکر اور بھی تنہا ہُوا

وقفِ دردِ جاں ہوا، محوِ غمِ دنیا ہُوا
دل عجب شے ہے کبھی قطرہ، کبھی دریا ہُوا

تیری آہٹ کے تعاقب میں ہوں صدیوں سے رواں
راستوں کے پیچ و خم میں ٹھوکریں کھاتا ہُوا

لذتِ دیدار کی اے ساعتِ رخشاں ٹھہر
پڑھ رہا ہوں میں ترے چہرے پہ کچھ لکھا ہُوا

اب تو تیرے حُسن کی ہر انجمن میں دھوم ہے
جس نے میرا حال دیکھا، تیرا دیوانہ ہُوا

وہ سمے رخصت ہوئے ہمدم، وہ شامیں کھو گئیں
کن خیالوں کے جھمیلوں میں ہے تو اُلجھا ہُوا

جمیل یوسف



بھیڑ ایسی ہے کہ مجھ کو راستہ ملتا نہیں
گُل کوئی کِھلتا نہیں، شُعلہ کوئی اُٹھتا نہیں

اے مرے شوقِ طلب، تیرے جنوں کی خیر ہو
تو نے کیا حدِّ نگہ کا فاصلہ دیکھا نہیں

اے غرورِ حُسن، میں تیرے بدن کا عکس ہوں
محوِ حیرت ہوں کہ تو نے مجھ کو پہچانا نہیں

ایک پل میں یہ رِدائے آب میں چھپ جائیں گی
رنگ کی لہروں کے پیچھے بھاگنا اچھا نہیں

دل جہاں لے جائے، دل کے ساتھ جانا چاہیئے
اس سے بڑھ کر اور کوئی رہنما ہوتا نہیں

جس کے جلووں نے ازل سے مضطرب رکھا مجھے
وہ تو میرے سامنے بھی آج تک آیا نہیں



صدا کا لوچ، سخن کا نکھار لے کے چلے
تری نظر سے فسونِ بہار لے کے چلے

ترے جمال کی صبح جواں تھی آنکھوں میں
جبیں پہ شامِ ستم کا غبار لے کے چلے

رہِ وفا میں متاعِ سفر کی بات نہ پوچھ
بس ایک زندگیٔ مستعار لے کے چلے

نہ یار لُطف پہ مائل، نہ شہر درد شناس
کہاں یہ ہم دلِ امیدوار لے کے چلے

طلب کی راہ میں اک یہ بھی حادثہ گزرا
ہم اپنے ذوقِ نظر کا وقار لے کے چلے

جمیل یوسف



ایک عرصہ بے خودی میں گم ہوا رہتا ہوں میں
بے محابا فاصلوں کو ناپتا رہتا ہوں میں

میرے خدوخال کو پہچاننا آساں نہیں
راستے کی گرد میں اکثر اٹا رہتا ہوں میں

جانتا ہوں، ڈھونڈتا ہوں اِک سرابِ نور کو
پھر بھی اس کی کھوج میں پیہم لگا رہتا ہوں میں

کاروانِ شوق، جس کو زندگی کہتے ہو تم
اس تگ و دو کے جلو میں ہی سدا رہتا ہوں میں

حضرتِ واعظ تجھے میرا پتہ کیونکر ملے
جسم کے کعبے میں، مانندِ خدا رہتا ہوں میں



وقت کی تہہ میں اتر جاؤں گا
میں بھی لمحہ ہوں، گزر جاؤں گا

اب جو نکلا ہوں ترے خواب لئے
تا بہ امکانِ نظر جاؤں گا

تو ہر اک شے میں ملے گا مجھ کو
تجھ کو پاؤں گا، جِدھر جاؤں گا

وہ بھی دن تھے کہ گماں ہوتا تھا
تجھ سے بچھڑوں گا تو مر جاؤں گا

تو مرا ہمدم و ہم راز نہ بن
میں تو نشہ ہوں، اُتر جاؤں گا

افضل منہاس



گر پڑا تو آخری زینے کو چھو کر کس لیے
آ گیا پھر آسمانوں سے زمیں پر کس لیے

آئینہ خانوں میں چھپ کر رہنے والے اور ہیں
تم نے ہاتھوں میں اٹھا رکھے ہیں پتھر کس لیے

میں نے اپنی ہر مسرت دوسروں کو بخش دی
پھر یہ ہنگامہ بپا ہے گھر سے باہر کس لیے

عکس پڑتے ہی، مصوّر کا قلم تھرا گیا
نقش اک آبِ رواں پر ہے اجاگر کس لیے

ایک ہی فنکار کے شہکار ہیں دنیا کے لوگ
کوئی برتر کس لیے ہے، کوئی کمتر کس لیے

خوشبوؤں کو موسموں کا زہر پینا ہے ابھی
اپنی سانسیں کر رہے ہو یوں معطّر کس لیے

اتنی اہمیت کے قابل تو نہ تھا مٹی کا گھر
ایک نقطے میں سمٹ آیا سمندر کس لیے

پوچھتا ہوں سب سے افضلؔ کوئی بتلاتا نہیں
بے بسی کی موت مرتے ہیں سخنور کس لیے

افضل منہاس



میں فقط اس جرم میں دنیا میں رُسوا ہو گیا
میں نے جس چہرے کو دیکھا تیرے جیسا ہو گیا

چاند میں کیسے نظر آئے تری صورت مجھے
آندھیوں سے آسماں کا رنگ مَیلا ہو گیا

ایک میں ہی روشنی کے خواب کو ترسا نہیں
آج تو سورج بھی جب نکلا تو اندھا ہو گیا

یہ بھی شاید زندگی کی اک ادا ہے، دوستو
جس کو ساتھی مل گیا وہ اور تنہا ہو گیا

ایک پتھر زندگی نے تاک کر مارا مجھے
چوٹ وہ کھائی کہ سارا جسم دوہرا ہو گیا

مل گیا مٹی میں جب افضلؔ تو یہ آئی صدا
گر گئی دیوار اور سایا اکیلا ہو گیا

افضل منہاس



گہرا سکوت ذہن کو بے حال کر گیا
سوچوں کے پھول پھول کو پامال کر گیا

سُورج نے اپنی آنچ کو واپس بلا لیا
لیکن مرے لہو کو وہ سیّال کر گیا

کیا فیصلہ دیا ہے عدالت نے، چھوڑیئے
مجرم تو اپنے جرم کا اقبال کر گیا

جو لوگ دُور تھے وہ بہت دُور ہو گئے
یہ تازہ حادثہ بھی گیا سال کر گیا

سہمے ہوئے ہیں چاروں طرف روشنی کے عکس
اک ہاتھ آکے سُرخ کئی گال کر گیا

میں دو قدم چلا تھا کہ ڈھلوان آ گئی
افضلؔ سفر تو میرا بُرا حال کر گیا



چُپ رہے تو شہر کی ہنگامہ آرائی ملی
لب اگر کھولے تو ہم کو قیدِ تنہائی ملی

زندگی کی ظلمتیں اپنے لہو میں رچ گئیں
تب کہیں جا کر ہمیں آنکھوں کی بینائی ملی

موسمِ گل کی نئی تقسیم حیران کر گئی
زخم پھولوں کو ملے، کانٹوں کو رعنائی ملی

سطحِ دریا پر اُبھرنے کی تمنّا ہی نہیں
عرش پر پہنچے ہوئے ہیں، جب سے گہرائی ملی

دوسروں کو سنگدل کہنا بڑا آسان تھا
خود کو جب دیکھا تو اپنی آنکھ پتھرائی ملی

افضل منہاس



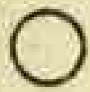
اپنے ماحول سے کچھ یوں بھی تو گھبرائے نہ تھے
سنگ لپٹے ہوئے پھولوں میں نظر آتے نہ تھے

درد، زنجیر کی صورت ہے دلوں میں موجود
اس سے پہلے تو کبھی اس کے یہ پیرائے نہ تھے

چند بکھرے ہوئے ریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سوچتے ہیں کہ چٹانوں سے بھی ٹکرائے نہ تھے

تو نے خود روزِ ازل ہم سے پنا ہیں مانگیں
زندگی ہم تجھے دامن میں چھپا لائے نہ تھے

ہم کہ ہر دور کی تزئین میں رہے ہیں شامل
اب بھی پچھتاتے نہیں، پہلے بھی پچھتائے نہ تھے



ہر چند زندگی کا سفر مشکلوں میں ہے
انساں کا عکس پھر بھی کئی آئینوں میں ہے

تہذیب کو تلاش نہ کر شہر شہر میں
تہذیب کھنڈروں میں ہے کچھ پتھروں میں ہے

تجھ کو سکوں نہیں ہے تو مٹی میں ڈوب جا
آباد اک جہان زمیں کی تہوں میں ہے

کیسا تضاد ہے کہ فضا ہے دھواں دھواں
اور آگ ہے کہ زیرِ زمیں خندقوں میں ہے

انسان بے حسی سے ہے پتھر بنا ہوا
منہ میں زبان بھی ہے، لہو بھی رگوں میں ہے

افضل منہاس



ایک پیکر یوں چمک اٹھا ہے میرے دھیان میں
کوئی جگنو اڑ رہا ہو جس طرح طوفان میں

ہر بگولہ بستیوں کی سمت لہرانے لگا
آشنا چہرے بھی اب آتے نہیں پہچان میں

کیا قیامت ہے کہ کوئی پوچھنے والا نہیں
زندگی تنہا کھڑی ہے حشر کے میدان میں

وقت پڑتے ہی ہوئے روپوش سب حلقہ بگوش
اک یہی خوبی تو ہے اس دور کے انسان میں

آئینے یادوں کے میں نے توڑ ڈالے تھے مگر
چند چہرے پھر ابھر آئے مرے وجدان میں

لوگ میری موت کے خواہاں ہیں افضل کس لیے
چند غزلوں کے سوا کچھ بھی نہیں سامان میں



مجھے بتلائیے اب کون سی جینے کی صورت ہے
زمانہ اس گھنے جنگل میں اک چیتے کی صورت ہے

بکھرتے جسم لے کر تند طوفانوں میں بیٹھے ہیں
کوئی ذرّے کی صورت ہے کوئی ٹیلے کی صورت ہے

چرا لایا تھا آنکھوں میں جو اک تصویر دنیا کی
وہ اب صحرا میں اک سہمے ہوئے بچے کی صورت ہے

مری تحریر کے ہر لفظ میں زندہ ہیں آوازیں
مگر حیران ہوں چہرہ مرا گونگے کی صورت ہے

یہ کیسی آگ ہے افضل کہ جلتے سائے بھی پیڑوں کے
دھوئیں میں کس طرف جائیں عجب رستے کی صورت ہے

فنون، جدید غزل نمبر، ۱۲۳۶

عطاء الرحمٰن جمیل

عطاءالرحمٰن جمیل



آج بھی جس کی خوشبو سے ہے متوالی رات
وہ ترے جلتے پہلو میں تھی جان نکالنے والی رات

صبح سے تنہا تنہا پھرنا پھر آئے گی سوالی رات
اور ترے پاس دھرا ہی کیا ہے لے مری خالی خالی رات

دل پر برف کی سل رکھ دینا ناگن بن کر ڈس لینا
اپنے لیے دونوں ہی برابر، کالی ہو کہ اجالی رات

پیلے پتے سوکھی شاخوں پر بھی تو اکثر چمکا چاند
مجھ سے ملنے کبھی نہ آئی تیری ناز کی پالی رات

دیکھ لیے آنکھوں نے میری تازہ شبنم باسی پھول
گرچہ صبح کو میری خاطر تم نے مجھ سے چھپا لی رات

تم اس کو سورج کہتے ہو تم کیا ہم بھی کہتے ہیں
اپنی تھکی پلکوں پر ہم نے لمحہ بھر جو سنبھالی رات

آنے والی آ نہیں سکتی جانے والی جا بھی چکی
دیکھے تو پھر جانے والی رات تھی آنے والی رات

عطآالرحمٰن جمیل



تری آنکھوں میں اک مبہم فسانہ ڈھونڈھ ہی لے گا
دلِ برباد جینے کا بہانہ ڈھونڈھ ہی لے گا

یہ دنیا ہے یہاں ہر آبگینہ ٹوٹ جاتا ہے
کہیں چھپتے پھرو، آخر زمانہ ڈھونڈھ ہی لے گا

کسی کا نقشِ پا تو مل ہی جائیگا جو آنکھیں ہیں
اگر سر ہے تو کوئی آستانہ ڈھونڈھ ہی لے گا

کہیں تو عمر بھر کی بے قراری لے ہی جائے گی
کوئی دشتِ جنوں تیرا دوانہ ڈھونڈھ ہی لے گا

جمیلؔ اک غم فروشِ وادیٔ غربت سہی لیکن
تمہارے شہر میں کوئی ٹھکانہ ڈھونڈھ ہی لے گا



کہاں گئے شبِ مہتاب کے جمال زدہ
اکیلا شہر میں پھرتا ہوں میں خیال زدہ

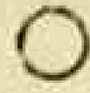
تمہاری بزم سے جب بھی اٹھے تو حال زدہ
کبھی جواب کے مارے، کبھی سوال زدہ

ترے فراق کے مارے نظر تو آتے ہیں
نگارِ شعر! کہاں ہیں ترے وصال زدہ

نہ دیکھو یوں مری جانب اداس آنکھوں سے
کہ مجھ سے پہلے بھی گذرے بہت کمال زدہ

ستارے ڈوب رہے ہیں، جمیلؔ سو جاؤ
یہ کاروبارِ جہاں، کب نہ تھا ملال زدہ

عطاء الرحمٰن جمیل



کچھ خواب کچھ خیال میں مستور ہو گئے
تم کیا قریب نکلے کہ سب دُور ہو گئے

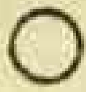
آنکھوں کے در تھے بند تو جینا محال تھا
آنکھیں کھلیں تو اور بھی معذور ہو گئے

ایسے چھپے کہ سرمۂ چشمِ جہاں ہوئے
ایسے کھلے کہ برقِ سرِ طور ہو گئے

جادوگری کے راز سے نا آشنا نہ تھے
ہم تو ترے خیال سے مجبور ہو گئے

مٹی پہ آ گئی تھی ذرا دیر کو بہار
بس لوگ اتنی بات پہ مغرور ہو گئے

پتھر تو پُوجے جاتے ہیں اس راہ میں جمیلؔ
تم تو ذرا سی ٹھیس لگی، چُور ہو گئے



مانا کہ سارے سر افلاک بہت ہیں
ہم کو بھی ہمارے خس و خاشاک بہت ہیں

کھلتے ہیں کدھر گل، دلِ صد چاک بہت ہیں
دامن ہیں کہاں، دیدۂ نمناک بہت ہیں

اتنا نہ ہنسو، صاحبِ ادراک بہت ہیں
آہستہ چلو، لوگ تہہ خاک بہت ہیں

مٹنے کو تو مٹ جاتے ہیں اربابِ محبت
اکسیر ہیں اس راہ میں کم، خاک بہت ہیں

جس رنگ میں چاہا تجھے اس رنگ میں دیکھا
لمحے تری فرقت کے طربناک بہت ہیں

اُن کو بھی جمیلؔ اپنے مقدر سے گلہ ہے
وہ لوگ جو سنتے تھے کہ چالاک بہت ہیں

عطاء الرحمٰن جمیل



آنسو تمہاری آنکھ میں آئے تو اُٹھ گئے
ہم جب کرم کی تاب نہ لائے تو اُٹھ گئے

بیٹھے تھے آکے پاس کہ اپنوں میں تھا شمار
دیکھا کہ ہم ہی نکلے پرائے تو اُٹھ گئے

ہم حرفِ زیرِ لب تھے ہمیں کون روکتا
لفظوں کے تم نے جال بچھائے تو اُٹھ گئے

بیٹھے چھپا چھپا کے جو دامن میں آفتاب
ہم نے بھی کچھ چراغ جلائے تو اُٹھ گئے

کیا تھا ہمارے پاس بجز اک سکوتِ غم
پہرے بہت جو تم نے لگائے تو اُٹھ گئے



شہرتِ فن بہت ہوئی، دادِ کمال دے گئے
شعر تو دوستو مگر صاحبِ حال دے گئے

سوز و گداز جو بھی تھا دل کی لگی کا کھیل تھا
شیشۂ زندگی کو ہم شمعِ خیال دے گئے

پرسشِ غم کے ساتھ تھی شرکتِ غم نگاہ میں
کتنا ملال لے گئے، کتنا ملال دے گئے

صبح چمن چمن نئی، شام کرن کرن نئی
ہم تری کائنات کو تیرا جمال دے گئے

ہم سے جدا ہوئے تو کیا، ہم سے جدا نہ رہ سکے
آئینۂ فراق کو عکسِ وصال دے گئے

اصغر گورکھپوری



اک عرصۂ وصال کی ٹھوکر میں رہا ہوں
میں سنگ سہی، پھر بھی سرِ راہِ وفا ہوں

آپ اپنے ہی ناکردہ گناہوں کی سزا ہوں
آواز ہوں لیکن ترے ہونٹوں سے جُدا ہوں

کیا کم ہے کہ رُسوائے جہاں ہوں تری خاطر
میں داغ ہوں لیکن ترے ماتھے پہ سجا ہُوں

پانی میں نظر آتی ہے اک چاند سی صورت
پیاسا ہوں مگر دیر سے دریا پہ کھڑا ہوں

اک تو ہی نہیں اور بھی خوبانِ جہاں ہیں
تجھ کو نہیں پایا ہے تو اوروں سے مِلا ہُوں

سب دیس مرے دیس ہیں، سب لوگ مرے لوگ
کیا جانیے میں کون سی مٹی کا بنا ہوں

اصغر گورکھپوری



آنکھوں کی ندی سوکھ گئی، پھر بھی ہرا ہے
وہ درد کا پودا جو مرے دل میں اُگا ہے

جاں دے کے بھی چاہوں تو اُسے پا نہ سکوں میں
وہ چاند کا ٹکڑا جو دریچے میں جڑا ہے

سیلاب ہیں چہروں کے تو آواز کے دریا
یہ شہرِ تمنا تو نہیں، دشتِ صدا ہے

اصغرؔ یہ سفر شوق کا، اب کیسے کٹے گا
جو ہم نے تراشا تھا، وہ بُت ٹوٹ گیا ہے



تو ایک نام ہے مگر صدائے خواب کی طرح
میں ایک حرف ہوں مگر نشانِ آب کی طرح

مجھے سمجھ کہ میں ہی اصلِ رازِ کائنات ہوں
دھرا ہوں تیرے سامنے کھلی کتاب کی طرح

میں کوئی گیت ہوں مگر صدا کی بندشوں میں ہوں
مرے لہو میں راگ ہے سمِ عذاب کی طرح

مری پناہ گاہ تھی، انہی خلاؤں میں کہیں
میں سطحِ آب پر رہا حبابِ آب کی طرح

میں اصغرِؔ حزیں کبھی کسی کے دوستوں میں تھا
وہ دن بھی مجھ کو یاد ہیں خیالِ خواب کی طرح

اصغر گورکھپوری



چلتے چلتے رُک جاتا ہے
دیوانہ کچھ سوچ رہا ہے

اس جنگل کا ایک ہی رستہ
جس پر جادو کا پہرا ہے

دُور گھنے پیڑوں کا منظر
مجھ کو آوازیں دیتا ہے

دم لوں یا آگے بڑھ جاؤں
سر پر بادل کا سایا ہے

اس ظالم کی آنکھیں نم ہیں
پتھر سے پانی رستا ہے

بھیگا بھیگا صبح کا آنچل
رات بہت پانی برسا ہے



ہم دشت سے ہر شام یہی سوچ کے گھر آئے
شاید کہ کسی شب ترے آنے کی خبر آئے

معلوم کسے شہرِ طلسمات کا رستہ
کچھ دور مرے ساتھ تو مہتابِ سفر آئے

اُس پھول سے چہرے کی طلب راحتِ جاں ہے
پھینکے کوئی پتھر بھی تو احساں مرے سر آئے

تا پھر نہ مجھے تیرہ نصیبی کا گلہ ہو
یہ صبح کا سورج مری آنکھوں میں اُتر آئے

اب آگے علم اور کوئی ہاتھوں سے لے
ہم شب کے مسافر تھے چلے تا بہ سحر آئے

افسر ماہ پوری



بہار آئے گی گلشن میں تو دار و گیر بھی ہوگی
جہاں اہلِ جنوں ہوں گے، وہاں زنجیر بھی ہوگی

اسی امید پر ہم گام زن ہیں راہِ منزل میں
یہاں ظلمت سہی، آگے کہیں تنویر بھی ہوگی

اگر رہنا ہے گلشن میں تو اپنے آشیانے کی
کبھی تخریب بھی ہوگی، کبھی تعمیر بھی ہوگی

یہی تو سوچ کر ہم اُن کی محفل سے چلے آئے
ہماری خامشی کی کچھ نہ کچھ تفسیر بھی ہوگی

یہ ہم بھی جانتے ہیں، زندگی اک خواب ہے افسرؔ
مگر اس خواب کی آخر کوئی تعبیر بھی ہوگی

افسر ماہ پوری



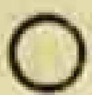
عجیب چیز محبت کی واردات بھی ہے
حدیثِ دل بھی ہے، رودادِ کائنات بھی ہے

عبودیت تو ہمارا ہے شیوۂ فطری
اگر خدائی کریں ہم تو کوئی بات بھی ہے

ادھر بھی اُٹھتی ہے اربابِ انجمن کی نظر
کچھ آپ ہی نہیں محفل میں، میری ذات بھی ہے

مرے وجود سے ناممکنات کا عالم
مرے وجود سے دنیائے ممکنات بھی ہے

یہ ارتقائے بشر کی ہے کون سی منزل
کہ اس کی زد میں خدا بھی ہے کائنات بھی ہے



سرشکِ غم کی روانی تھمی ہے مشکل سے
جو بات کہنی تھی اُن سے، کہی ہے مشکل سے

نہ جانے اہلِ جنوں پر اب اور کیا گزرے
ابھی تو فصلِ بہاراں کٹی ہے مشکل سے

شبِ فراق، نہ پوچھو کہ کس طرح گزری
سحر ہوئی تو ہے، لیکن ہوئی ہے مشکل سے

لگا ہوا ہے یہ دھڑکا کہ بجھ نہ جائے کہیں
ہوا میں شمعِ محبت جلی ہے مشکل سے

کہاں تھی منزلِ مقصود اپنی قسمت میں
کسی کی راہگزر بھی ملی ہے مشکل سے

افسر ماہ پوری



میرے لیے ساحل کا نظارا بھی بہت ہے
گرداب میں تنکے کا سہارا بھی بہت ہے

دمساز ملا کوئی نہ صحرائے جنوں میں
ڈھونڈا بھی بہت ہم نے پکارا بھی بہت ہے

اپنی روشِ لطف پہ کچھ وہ بھی مُصر ہیں
کچھ تلخیٔ غم ہم کو گوارا بھی بہت ہے

انجامِ وفا دیکھ لیں کچھ اور بھی جی کے
سنتے ہیں خیال اُن کو ہمارا بھی بہت ہے

کچھ راس بھی آتی نہیں افسرؔ کو مسرت
کچھ یہ کہ وہ حالات کا مارا بھی بہت ہے



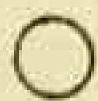
شب کو پازیب کی جھنکار سی آجاتی ہے
بیچ میں پھر کوئی دیوار سی آجاتی ہے

اُن کا اندازِ نظر، دیکھ کے محفل میں کبھی
مجھ میں بھی جرأتِ اظہار سی آجاتی ہے

اس ادا سے کبھی چلتی ہے نسیمِ سحری
خشک پتّوں میں بھی رفتار سی آجاتی ہے

ہم تو اُس وقت سمجھتے ہیں کہ آتی ہے بہار
دشت سے جب کوئی جھنکار سی آجاتی ہے

ناصر زیدی



دیارِ شوق میں کوسوں کہیں ہوا بھی نہیں
اُمس ہے ایسا کہ پتّہ کوئی ہلا بھی نہیں

خفا نہیں ہے مگر اس ادا کو کیا کہیے
پکارتا ہوں تو وہ مُڑ کے دیکھتا بھی نہیں

یہ کس مقام پہ تنہائی سونپتے ہو مجھے
کہ اب تو ترکِ تمنّا کا حوصلہ بھی نہیں

بڑا گِلہ ہے دلِ غم پرست کو تم سے
وہ درد اس کو دیا ہے جو لا دوا بھی نہیں

کہاں تلاش کریں جُز ترے سکونِ نظر
کہ اس جہاں میں کوئی تجھ سا دوسرا بھی نہیں

بسا ہوا ہے مرے دل میں بُوئے گُل کی طرح
وہ دُور دُور ہے مجھ سے مگر جدا بھی نہیں

کِسے سناؤ گے تم مژدۂ سحر ناصر
وہ رت جگے ہوئے اب کوئی جاگتا بھی نہیں

ناصر زیدی



کہہ رہی ہے یہ کیا صبا، کچھ سوچ
اے حسین پیکرِ جفا! کچھ سوچ

چند روزہ بہار پر مت جا
گُل کا انجام کیا ہُوا، کچھ سوچ

یہ حسیں رُت، یہ چاندنی، یہ بہار
ایسے عالم میں تُو نہ جا، کچھ سوچ

کیا ہوئے رہروانِ منزلِ شوق
کیوں ہے سنسان راستا، کچھ سوچ

خار جس سے لپٹ کے روتے تھے
آبلہ پا وہ کون تھا، کچھ سوچ

ہم نہ ہوں گے تو تیری محفل میں
کون ہو گا غزل سرا، کچھ سوچ

بپھری لہروں پہ چھوڑ دی کشتی
کیا کیا تُو نے، ناخدا! کچھ سوچ

رہبری کا بھرم نہ کُھل جائے
پا شکستوں کے رہنما! کچھ سوچ

کس کو چاہے ترے سوا ناصرؔ
کون ہے تجھ سا دوسرا، کچھ سوچ

ناصر زیدی



پھول صحرا میں کھلا دے کوئی
میں اکیلا ہوں صدا دے کوئی

کوئی سناٹا سا سناٹا ہے
کاش! طوفان اٹھا دے کوئی

جس نے چاہا تھا مجھے پہلے پہل
اس ستمگر کا پتہ دے کوئی

جس سے ٹوٹے میرا پندارِ وفا
مجھ کو ایسی بھی سزا دے کوئی

رات سوتی ہے تو میں جاگتا ہوں
اس کو جا کر یہ بتا دے کوئی

جو مرے پاس بھی ہے، دور بھی ہے
کس طرح اس کو بھلا دے کوئی

عشق کے رنگ لیے پھرتا ہوں
اس کی تصویر بنا دے کوئی

دل کے خرمن میں نہاں ہیں شعلے
اپنے دامن کی ہوا دے کوئی

پھول پھر زخم بنے ہیں ناصرؔ!
پھر خزاؤں کو دعا دے کوئی



جانبِ دشت کبھی تم بھی نکل کر دیکھو
دوستو! آبلہ پائی کا عمل کر دیکھو

میری آشفتہ سری پر نہ ہنسو اے لوگو!
عشق کی آگ میں خود بھی ذرا جل کر دیکھو

تم جو چاہو تو مرے دل کو سکوں مل جائے
اپنا اندازِ نظر کچھ تو بدل کر دیکھو

میں تمہیں جینے کے انداز سکھا سکتا ہوں
ایک دو گام میرے ساتھ تو چل کر دیکھو

چاندنی راتوں میں پھرتا ہے کوئی آوارہ
تم کو فرصت جو ملے گھر سے نکل کر دیکھو

فاصلے برسوں کے، پل بھر میں سمٹ آئیں گے
آج کی شب مرے پہلو میں مچل کر دیکھو

اس کا چہرہ ہے کبھی دشت کا سورج ناصرؔ
اس کی جانب کبھی دیکھو تو سنبھل کر دیکھو

ناصر زیدی



روحِ احساس ہے تہی دامن
دل ہے یا حسرتوں کا اک مدفن
پھیلتی جا رہی ہے تاریکی
شام محسوس کر رہی ہے تھکن
ملتفت جب سے ہے نظر ان کی
دل کو درپیش ہے نئی الجھن
میری یادوں سے گل بداماں ہے
ایک زہرہ جمال کا آنگن
آدمیت کہیں نہ ہو رسوا
زندگی کا بدل رہا ہے چلن
ہر ستارہ مرے مقدر کا
ان کے ماتھے کی بن گیا ہے شکن
لٹ چکا ہوں رہِ تمنا میں
آرزو اب تو چھوڑ دے دامن
کس کو اپنا کہیں کہ اے ناصر
ہر حسیں شخص ہے وفا دشمن



رات سنسان ہے گلی خاموش
پھر رہا ہے اک اجنبی خاموش
بات دل کی چھپائی لاکھ ان سے
آنکھ لیکن نہ رہ سکی خاموش
ہجر کی آگ میں جلے چپ چاپ
زندگی یوں گزار دی خاموش
پوجتا ہوں تجھے خیالوں میں
کر رہا ہوں میں بندگی خاموش
شمعِ محفل کچھ اس طرح چپ ہے
جیسے جاڑے کی چاندنی خاموش
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
لب ہلے پر زباں رہی خاموش
کوئی ہنگامہ چاہیے ناصر
کیسے گزرے گی زندگی خاموش



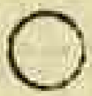
تھوڑا سا مُسکرا کے نگاہیں مِلایئے
مجھ کو مری حیات کا مقصد بتایئے

مجھ سے بھی کچھ حضور! تعلق تھا آپ کا
یُوں بے مروتی سے نہ دامن چھڑایئے

شاید کسی مقام پہ میں کام آ سکوں
مجھ کو بھی ساتھ لیجیے تنہا نہ جایئے

گزرے گا اس طرف سے بھی اک دن ہجومِ گُل
ہر چند آپ راہ میں کانٹے بچھایئے

ناصر اُداسیاں تو رہیں گی یُونہی مُدام
ڈھلنے لگی ہے رات، کوئی گیت گایئے



بھلا کب تک کوئی تنہا رہے گا
کہاں تک یہ نگر سونا رہے گا

شبِ فرقت تو کٹ جائے گی، لیکن
تمہارے جَور کا چرچا رہے گا

ہمیں ترکِ تعلق بھی گوارا
زمانہ کب مگر چپکا رہے گا

جہاں بھی نام آئے گا تمہارا
یقیناً تذکرہ میرا رہے گا

جنونِ عشق کی وارفتگی پر
سبک سر مُدّتوں صحرا رہے گا



مثالِ سادہ ورق تھا، مگر کتاب میں تھا
وہ دن بھی تھے، میں ترے عشق کے نصاب میں تھا

بھلا چکا ہے تو اک بار مجھ سے آ کر سُن
وہی سبق جو کبھی تیرے دل کے باب میں تھا

جو آج مجھ سے بچھڑ کر بڑے سکون میں ہے
کبھی وہ شخص مرے واسطے عذاب میں تھا

اسی نے مجھ کو غمِ سوزِ جاوداں بخشا
وہ ایک چاند کا ٹکڑا سا جو نقاب میں تھا

مرا وجود مجسم خلوص تھا ناصر!
میں پھر بھی بارگہِ حسن کے عتاب میں تھا



تم تو ادروں پہ نہ پتھر پھینکو
آئینہ خانوں میں رہنے والو!

کچھ تو ہو صورتِ تجدیدِ وفا
میں بھی سوچوں ذرا تم بھی سوچو

میں بہرحال تمہارا ہوں، مگر
کاش تم بھی مجھے اپنا سمجھو

نہ سنو ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
دو گھڑی پاس تو آ کر بیٹھو

کھول کر بند دریچہ ناصر
ڈوبتے چاند کا منظر دیکھو

صمد انصاری



اپنی لَو میں کوئی ڈوبا ہی نہیں
چاند احساس کا اُبھرا ہی نہیں

کوئی آہٹ نہ کوئی نقشِ قدم
جیسے دل سے کوئی گزرا ہی نہیں

چُور آئینۂ ایام بھی ہے
میرا ماضی، مرا فردا ہی نہیں

درس میں بھی ہوں زمانے کے لیے
ایک عبرت گہِ دنیا ہی نہیں

کتنی صدیوں پہ رُکے گا جا کر
ایک لمحہ کہ جو بیتا ہی نہیں

کتنا حیراں ہے دہانِ تصویر
عکس آواز کا اترا ہی نہیں

میں بھی تھا شہرِ سخن کا معیار
میرے نقاد نے پرکھا ہی نہیں

یوں چمکتی ہے صمدؔ کاہکشاں
جیسے تارہ کوئی ٹوٹا ہی نہیں

صمد انصاری



دستِ شبنم پہ دمِ شعلہ نوائی نہ رکھو
صبح کی گود میں شب بھر کی کمائی نہ رکھو

میری یادوں کے صنم خانوں سے اُٹھنے دو دھواں
میرے سینے پہ ابھی دستِ حنائی نہ رکھو

جاگ جائے نہ کہیں حسن کا سوتا پندار
دیدۂ شوق میں اندازِ گدائی نہ رکھو

شب کو رہنے دو یوں ہی شام و سحر کا پیوند
ڈر کے ظلمات سے، بنیادِ جدائی نہ رکھو

حسن بھی اپنے تقاضوں سے ہے آخر مجبور
حسن کے دوش پہ الزامِ خدائی نہ رکھو

پھر کسی طور سمیٹو یہ بکھرتے ہوئے رنگ
یوں پریشان، تصوّر کی اکائی نہ رکھو

اپنے وجدان سے بھی کام نکالو کوئی
راہبر ہی کے لیے راہنمائی نہ رکھو

اپنے زخموں کو چھپاؤ کسی عنوان صمدؔ
رہگزاروں میں غمِ آبلہ پائی نہ رکھو

صمد انصاری



چشمِ حیراں کو یوں ہی محوِ نظر چھوڑ گئے
دل میں لہرائے، خیالوں میں شرر چھوڑ گئے

جن کے سائے میں کبھی بیٹھ کے سستایا تھا
وہ گھنے پیڑ مری راہ گزر چھوڑ گئے

منتظر ان کے لئے ہے کس گرداب کی آنکھ
خود سفینوں کو جو ہنگامِ خطر چھوڑ گئے

قافلے نور کے اترے نہ کسی منزل پر
شب کے نم دیدہ کناروں پہ سحر چھوڑ گئے

خیرگی ہے کہ اترتی ہی نہیں آنکھوں سے
کن اندھیروں میں ہمیں شمس و قمر چھوڑ گئے

لے گئے لوگ جبینوں میں عبادت کا غرور
کتنے سجدوں کو مگر خاک بسر چھوڑ گئے

آئے آنکھوں میں نہ دم بھر کو سلگتے آنسو
پردۂ چشم پہ اک نقش مگر چھوڑ گئے

رات کے عکس جو شبنم میں اترنے آئے
کتنے پھولوں میں صمدؔ داغِ جگر چھوڑ گئے



آئینۂ دل داغِ تمنّا کے لئے تھا
سینے کا صدف اِک دُرِ یکتا کے لئے تھا

جو تیرنے والے تھے وہ منجدھار سے گزرے
دریا کا کنارہ کفِ دریا کے لئے تھا

کیوں ہاتھ میں تیرے مجھے پتھر نظر آیا
دیوانہ اگر تھا تو میں دنیا کے لئے تھا

گزرا نہ ترے بعد کوئی کوچۂ دل سے
یہ راستہ اک نقشِ کفِ پا کے لئے تھا

دیوار سے رکتا نہیں دیوار کا سایہ
ضبطِ غمِ ماضی، غمِ فردا کے لئے تھا

کوئی نہیں محفوظ یہاں دستِ ہوس سے
یوسف کا جو دامن تھا، زلیخا کے لئے تھا

بے پردہ چمکتا ہے جو اَب محفلِ شب میں
وہ چاند صمدؔ کل یدِ بیضا کے لئے تھا

صمد انصاری



طلسمِ لفظ و معانی کو تار تار کریں
تصورات کی ندرت کو آشکار کریں

اتار لائیں فلک سے مہ و نجوم تمام
زمیں پہ عظمتِ آدم کو استوار کریں

ہیں سمت سمت عیاں خیر و شر کے ہنگامے
کہ آدمی کو خدائی کا رازدار کریں

ہیں جمع دہر میں فتنے سبھی قیامت کے
اب اور کون سے محشر کا انتظار کریں

گزر کے جائیں گے جس پُل صراط سے اکدن
چلو اسی خطِ قاتل کو رہگذار کریں

اٹھا ہے جس کی لطافت سے بندگی کا خمیر
اسی گناہ کی عصمت پہ جاں نثار کریں

جلائے رکھئے صمد اپنی آرزو کے چراغ
عجب نہیں کہ وہ داغِ جگر شمار کریں



آہٹوں سے دماغ جلتا ہے
آج "سکّہ" ہوا کا چلتا ہے

تھرتھراتی ہے لَو مشیّت کی
ایک محشر فضا میں پلتا ہے

سر اٹھاتے ہیں نقش، پاؤں تلے
سایہ جب آدمی کا ڈھلتا ہے

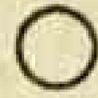
رنگ چھنتا ہے ذہن کا بلور
جسم جب دھوپ سے پگھلتا ہے

اپنے محور پہ شام تک سورج
کتنے ہی زاویے بدلتا ہے

گر کے پتھر سے پاش پاش ہیں
شہر کا شہر ہاتھ ملتا ہے

شعلہ زن ہے غمِ حیات صمد
پرتیوں سے دھواں نکلتا ہے

صمد انصاری



ہم روح کائنات ہیں، نقشِ اساس ہیں
ہم وقت کا خمیر، زمانے کی باس ہیں

تنہا ہیں ہم تمام، نہ قربت نہ فاصلے
ہم آپ کے قریب، نہ ہم اپنے پاس ہیں

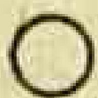
کب سے ٹنگے ہوئے ہیں خلاؤں کے آر پار
کب سے یہ آسماں کے ستارے اداس ہیں

خود ہٹ گئے ہیں دُور وہ پانی کے زور سے
دریا کے وہ کنارے جو دریا شناس ہیں

خودرَو ہیں ہم، ہمیں نہ خزاں سے ڈرائیے
صحرا کے مست پھول ہیں، جنگل کی گھاس ہیں

کتنی بہاریں آ کے چمن سے گذر گئیں
ہم ہیں کہ ایک گل کے لئے محوِ یاس ہیں

جن کے بدن پہ اطلس و کمخواب ہے صمدؔ
سچ پوچھیے تو لوگ وہی بے لباس ہیں



بجھتے سورج کے شرارے نور برسانے لگے
رفتہ رفتہ چاند تاروں میں نظر آنے لگے

کر گیا بیدار پتھر کو فنِ حسنِ تراش
کتنے نادیدہ صنم آنکھوں میں لہرانے لگے

موجِ بوئے گل سے بھڑکی ہیں دبی چنگاریاں
پھر ہوا کے سرد جھونکے جسم جھلسانے لگے

کٹ کے رہ جائے گی آخر قسمتِ غم کی لکیر
تیرے زندانی اگر زنجیر کھڑکانے لگے

سر پہ سورج تھا تو نقشِ پا بھی روشن تھے صمدؔ
دھوپ کے ڈھلتے ہی سائے پاؤں پھیلانے لگے

صمد انصاری



پتھر کی نیند سوتی ہے بستی، جگائیے
آبِ حیات سا کوئی اعجاز لائیے

جل جائیے مقام پہ اپنے بمثالِ شمع
اپنے بدن کی لَو سے نگر کو جلائیے

اک نہر کاٹیے کبھی سینے سے چاند کے
دامانِ شب میں نور کا دھارا بہائیے

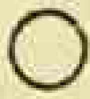
آ تو گئے ہیں آپ خریدار کی طرح
کچھ تن کو خرچ کیجیے، جاں کو بھُنائیے

جن کے دھوئیں سے پھیلتی ہے عافیت کی لَو
ایسے بھی کچھ چراغ سرِ شب جلائیے

آباد کیجیے اسی گھر میں جنوں کو آپ
اس گھر میں کیا نہیں ہے جو صحرا کو جائیے

پھوٹا ہے جس سے رات کے سینے میں ماہتاب
اک بیج ایسا ظلمتِ دل میں اُگائیے

چاہت میں ان کی بیت گئی زندگی صمدؔ
خود کو بھی پیار کیجیے، خود کو بھی چاہیئے



حق نوائی کو زمانے کی زباں کون کرے
ایسی تلخی کو صمدؔ لذتِ جاں کون کرے

اب سرِ دار وفاؤں کے لئے کون آئے
چند خوابوں کے لئے ترکِ جہاں کون کرے

ہم نے مانا کہ بڑی چیز ہے پابندیِ وقت
سجدۂ شوق کو پابندِ اذاں کون کرے

وقت کی چاپ سے گونجی ہے مری تنہائی
وقت کی چاپ کو اب اور گراں کون کرے

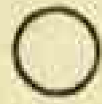
کون اونچی کرے بجھتے ہوئے انفاس کی لَو
اس اندھیرے میں تلاشِ رگِ جاں کون کرے

شعلۂ فکر پہ سورج کا گماں ہوتا ہے
شعلۂ فکر کو محتاجِ بیاں کون کرے

ہم وہ پتھر ہیں کہ صیقل ہوں تو آئینہ بنیں
سنگ پہ مشقِ فنِ شیشہ گراں کون کرے

کون دکھلائے حقیقت کو صمدؔ راہِ مجاز
حاصلِ دیدہ و دل نذرِ بتاں کون کرے

زاھد فارانی



کئی دلوں میں پڑی اس سے شور و شر کی طرح
ترا خیال ہے اڑتی ہوئی خبر کی طرح

نہیں ہے تابِ نظر کم عیار آنکھوں میں
چمک رہا ہے وہ چہرہ دکانِ زر کی طرح

ہٹے گی گردِ مہ و سال کس کے ہاتھوں سے
زمانہ بند پڑا ہے قدیم در کی طرح

خیالِ غیر نکلتا نہیں مرے دل سے
کسی کے گھر میں یہ بیٹھا ہے اپنے گھر کی طرح

ٹھٹھک گیا میں اُسے اپنے سامنے پا کر
مجھے لگا وہ گذرگاہِ پُر خطر کی طرح

سکوں کے ساتھ تھکن بھی ہے اُس کی یادوں میں
گذشتہ عمر ہے بھولے ہوئے سفر کی طرح

پسِ ادائے نظر چھپ گئی ہے تاریکی
وہ بے نقاب ہُوا اوّلیں سحر کی طرح

جو میرے سامنے مدّت کے بعد آیا تھا
گذر گیا ہے اچٹتی ہوئی نظر کی طرح

ڈھلے ہیں ان میں مری زندگی کے شام و سحر
ہیں میرے شعر حکایاتِ مختصر کی طرح

زاھد فنادانی



خشک لمحات کے دریا میں بہا دے مجھ کو
مرگِ احساس کی سُولی پہ چڑھا دے مجھ کو

کون آ کر ترے انصاف کا مصداق بنے
بے گناہی پہ اگر تُو نہ سزا دے مجھ کو

ایک پل میں یہ مرا رنگ اڑا دیتے ہیں
راس آتے نہیں خوش رنگ لبادے مجھ کو

یوں مجھے دیکھ کے چہرہ نہ چھپا ہاتھوں سے
میں ترا جسمِ برہنہ ہوں، قبا دے مجھ کو

نہ ملی کوچہ و بازار میں ڈھونڈے سے کہیں
جو نظر نقش بدیوار بنا دے مجھکو

تو ہیولا جو نہیں ہے تو مرے سامنے آ
گنبدِ درد میں چھپ کر نہ صدا دے مجھ کو

زاہد تارانی



تیرہ و تار زمینوں کے اجالے دریا
ہم نے صحراؤں کے سینے سے نکالے دریا

وادیاں آئیں تو آرام سے سو جاتے ہیں
فاصلوں سے نہ کبھی ہارنے والے دریا

چاہتے تھے کہ پھریں رُو‌ئے زمیں پہ ہر سو
بن گئے راہ میں غاروں کے نوالے دریا

تجھ سے چھٹنے پہ ترے دھیان کی آغوش ملی
کر گیا مجھ کو سمندر کے حوالے دریا

اے زمیں سوکھ رہے ہیں ترے پیاسے جنگل
کیا ہوئے ہیں تری آغوش کے پالے دریا

کس طرح درد کا طوفاں مرے سینے میں تھمے
کس طرح اپنی روانی کو سنبھالے دریا



ستارے چُپ ہیں کہ نغمہ سرا سمندر ہے
شبِ خموش کے دل کی صدا سمندر ہے

سکوتِ لب کو صداؤں کا پیش رو سمجھو
کہ رود بار کے آگے کھلا سمندر ہے

وہ دیکھتا ہے مرے اضطراب کو ہنس کر
میں تیز رو ہوں، وہ ٹھہرا ہُوا سمندر ہے

مہ و نجوم دکھاتے ہیں آئینہ اُس کو
فلک کے سامنے چہرہ نما سمندر ہے

مٹا چلے ہیں مسافت کا نقش اہلِ طلب
ہوا سروں میں ہے اور زیرِ پا سمندر ہے

نظر میں صورتِ ساحل ابھی نہیں آئی
مرے سفر کا ہر اک مرحلہ سمندر ہے

زاہد حنادانی



بساطِ شوق کے منظر بدلتے رہتے ہیں
ہوا کے رنگ برابر بدلتے رہتے ہیں

بتانِ رنگ بھی کچھ کم نہیں ہیولوں سے
قدم قدم پہ یہ پیکر بدلتے رہتے ہیں

چھپائے چھپتی نہیں اُن سے کھنگی دل کی
نئے لباس وہ ہر دم بدلتے رہتے ہیں

رہی نہیں کبھی یک رنگ آسماں کی جبیں
حروفِ لوحِ مقدّر بدلتے رہتے ہیں

قیام کرتا نہیں دل میں چار دن کوئی
مکینِ خانۂ بے در بدلتے رہتے ہیں

بہت نیا تھا جو کل، اب وہی پُرانا ہے
مزارِ دہر کے پتھر بدلتے رہتے ہیں



ہے میرے سر سے کوئی بوجھ اُتارنے والا؟
پکارتا ہے یہ ہر دم پکارنے والا

پھرا ہے یوں وہ رُخِ آئینہ نما مجھ سے
کوئی نہیں مِری صورت سنوارنے والا

بنا ہوں سینۂ دریا کا بوجھ مدّت سے
کوئی رہا ہی نہیں پار اُتارنے والا

بدلتی جاتی ہے حالت زمیں کے چہرے کی
کہ آسماں ہے نیا روپ دھارنے والا

اتر کے کارگہِ فن میں فتح یاب ہوا
بساطِ دھر پہ ہر روز ہارنے والا

میں اپنے عہد کا صنّاعِ شعر ہوں زاہد
مرا قلم ہے نئے نقش اُبھارنے والا

زاہد درّانی



گاڑی کی کھڑکی سے دیکھا شب کو اس کا شہر
چاروں اور تھا کالا جنگل، بیچ میں اجلا شہر

یاد نہ آتا کیوں گاؤں میں ہم کو بھی لاہور
لوگ سمندر پار نہ پائیں اس سے اچھا شہر

سچ ہے ہر اک ملک خدا کا، دیس ہے ہر انسان کا
لیکن اپنا شہر ہے یارو آخر اپنا شہر

خواب میں سن کر جاگ اٹھتا ہوں ان کی چیخ پکار
اف وہ لڑتے مرتے باسی، اف وہ جلتا شہر

پوشیدہ ہیں دل میں اُس کی یادوں کے طوفان
دفن ہیں ایک کھنڈر کی تہہ میں کتنے زندہ شہر

مجھ پہ اک گھنگھور اداسی، تجھ پہ رنگ اور نور
میرا چہرہ بن ہے پیارے، تیرا چہرہ شہر

کل کی بات ہے اور تھکن سے اب تک چُور ہوں میں
اُس لڑکی کا جسم تھا زاہد اونچا نیچا شہر



جہانِ تنگ میں تنہا ہوا میں
بہت اچھا ہوا، رسوا ہوا میں

مری آنکھوں کا پہچانا ہوا تو
نگاہِ دہر کا دیکھا ہوا میں

ابھر آئی ہوا کی موج سر میں
حریفِ موجۂ دریا ہوا میں

جبینِ آب کی تحریر دُنیا
حروفِ سنگ سے لکھا ہوا میں

فنا کے ہاتھ میں میری بقا ہے
خود اپنی خاک سے پیدا ہوا میں

ہوئی وابستہ مجھ سے ترش روئی
کہ نشہ ہوں مگر اُترا ہوا میں

چھپا ہوں آج تک اس کی نظر سے
زمانے بھر پہ آئینہ ہوا میں

زاهد حنادانی



اُسی کی دھن میں کہیں نقش پا گیا ہے مرا
جو آکے خواب میں در کھٹکھٹا گیا ہے مرا

گزر گیا ہے جو پہلو بچا کے مجھ سے تو کیا
نظر جھکا کے وہ گھر دیکھتا گیا ہے مرا

ہوں مضطرب تیری گم گشتہ آرزو کے لیے
دکانِ دل سے دُرِ بے بہا گیا ہے مرا

اسیرِ گنبدِ بے در پڑا ہوں مدت سے
مرے ہی دل پہ وہ پہرہ بٹھا گیا ہے مرا

قدم قدم پہ دیارِ وفا کے رستے ہیں
مری زباں سے فسانہ سنا گیا ہے مرا

محیط ہے مرے دیوار و در پہ تنہائی
نہ جانے کون اسے گھر بتا گیا ہے مرا



وہی لڑکی، وہی لڑکا پُرانا
کہیں ہوتا ہے یہ قصہ پُرانا

اکیلے پن میں اب اک تازگی ہے
ہُوا جاتا ہے ہر رشتہ پُرانا

جہانِ عقل کا انسان، جاہل
نیا جغرافیہ، نقشہ پرانا

جہاں دیکھو، وہی فرسودہ منظر
جدھر نکلو، وہی رستہ پرانا

نیا شاعر بھی الجھا ہے زباں میں
یہ استادوں سے بھی نکلا پرانا

نہ اُکتاؤ جو بے پر کی اُڑائے
کہ زاہد یار ہے اپنا پُرانا

ماجد الباقری



چاند کی کرنوں کی چادر نے سب کے روپ چھپائے ہیں
آنکھوں والے سب ہی جا کر نگری سے لوٹ آئے ہیں

تاریکی کا نام ہو روشن ، آگے پیچھے ایک دیا
روشنیوں کے ویرانے میں آگے پیچھے سائے ہیں

کوئی بولے یوں لگتا ہے جیسے ڈبتے بجتے ہوں
یا باتوں میں درد نہیں ہے یا سب کان پرائے ہیں

پتھر کھا کھا کر دریا کے پیٹ نے سونا اُگلا ہے
غلّہ چھوڑ کے کھیتوں میں لوہے کے پیڑ اُگائے ہیں

گھنٹی کی آوازیں سچ ہیں، چیخ پہ کوئی کان نہ دو
لوہے کے تابوت میں ماجد انسانوں کے سلئے ہیں

ماجد الباقری



آنسوؤں کی ایک چادر تن گئی ہے
دیکھنے میں روشنی ہی روشنی ہے

سوکھے پتے سب اکٹھے ہو گئے ہیں
راستے میں ایک دیوار آگئی ہے

غم کا ریلا ذہن ہی کو لے اُڑا ہے
سوچیے تو آندھیوں کی کیا کمی ہے

چلّو چلّو روشنی کو پی رہا ہوں
موجِ دریا قطرہ قطرہ چاندنی ہے

رات میں دھنکا ہوا سورج پڑا تھا
دن میں ماجد دھوپ کالی ہو گئی ہے



آنکھوں کا قصور کچھ نہیں ہے
جسموں سے غلاف ہٹ گئے ہیں

جو بال کی کھال اُتارتے تھے
صحراؤں میں گھاس کاٹتے ہیں

ہم لوگ تو ہو گئے ہیں پاگل
خوابوں کی کتاب لکھ رہے ہیں

انسان میں کیا بھرا ہوا ہے
ہونٹوں سے دماغ تک سلے ہیں

یہ کیسے زبان سے ادا ہوں
خاکے جو دلوں میں اَن کہے ہیں

ماجد الباقری



مجھی سے پوچھ رہا تھا مرا پتہ کوئی
بتوں کے شہر میں موجود تھا خدا کوئی

خموشیوں کی چٹانوں کو توڑنے کے لیے
کسی کے پاس نہیں تیشۂ صدا کوئی

سمجھ سکا نہ مگر کوئی پتھروں کی زباں
ہر ایک لمحہ لگا بولتا ہوا کوئی

اک آنسوؤں کا سمندر تھا جل پری کا لباس
ملا تو ایسے ملا پیکرِ وفا کوئی

ہر ایک ذہن میں اپنے ہی بند ہے ماجد
خود اپنے خول سے باہر ہے اللہ کوئی



بات کرنا ہے کرو سامنے اتراؤ نہیں
جو نہیں جانتے، اس بات کو سمجھاؤ نہیں

میں وہ سمجھا ہوں، بیاں تم سے جو ہوگا نہ کبھی
بے ضرر ہوں، مرے اس کشف سے گھبراؤ نہیں

اس ترنّم میں تو مفہوم نہیں ہے کوئی
شعر کہتے ہو تو پڑھ ڈالو، مگر گاؤ نہیں

بند آنکھوں میں بکھر جاتے ہیں بجھتے ہوئے رنگ
مجھ سے اندھے کو کوئی آئینہ دکھلاؤ نہیں

میں اکائی کی طرح سب میں سمایا ماجد
بات بڑھ جائے گی، اعداد کو گنواؤ نہیں

احمد معصوم



کہہ ڈالے غزلوں نظموں میں افسانے کیا کیا
دل میں پھر بھی دھڑکتا رہتا ہے جانے کیا کیا

داغ کو چاند، آنسو کو موتی، زخم کو پھول کہیں
ہم کو بھی انداز سکھائے دنیا نے کیا کیا

چاند ایسے چہروں والے ہیں چاند اتنے ہی دور
جن کے سپنے دیکھتے ہیں ہم دیوانے کیا کیا

سوکھے لب، پھیکے رخسار اور الجھے الجھے بال
شہروں میں بھی مل جاتے ہیں ویرانے کیا کیا

احمد معصوم



دلوں پہ زخم لگا کے ہزار گذری بہار
گئی ہے چھوڑ کے اک یادگار، گذری بہار

مرے قریب جو کوئی گُل بدن مہکا
تو آئی یاد کوئی خوشگوار گذری بہار

کسی طرح مجھے پاگل نہ کر سکی، ورنہ
ترے بغیر بھی آئی بہار، گذری بہار

ہر ایک سروِ رواں پر گماں کہ جیسے وہی
ہو میرا ماضی، مری یادگار گذری بہار

مرے نصیب کا نوحہ خزاں۔ یہ عہدِ خزاں
ترے کرم کا فسانہ بہار۔ گذری بہار



ہم سے پہلے تو کہیں پیار نہ تھا شہر بہ شہر
اپنے ہمراہ یہ سیلاب گیا شہر بہ شہر

ایسے بدنام ہوئیں اپنی جھکتی غزلیں
جیسے آوارگیٔ موجِ صبا، شہر بہ شہر

لوگ کیا کیا نہ گئے توڑ کے پیمانِ وفا
دل کی دھڑکن نے مگر ساتھ دیا شہر بہ شہر

ہم کہ معصوم ہیں دیہات کے رہنے والے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں کیا جانیے کیا شہر بہ شہر

مقبول نقش



سچ ہے، ہوگا دنیا میں کوئی ہم سا کم تنہا
ہم نفس نفس تنہا، ہم قدم قدم تنہا

دہر آئینہ خانہ اور اس میں ہم تنہا
دیکھیے تو اک محفل، ویسے ایک دم تنہا

آرزو رفاقت کی آدمی کی فطرت ہے
زندگی نہیں کٹتی، آپ ہوں کہ ہم تنہا

زندگی کی راہوں میں ساتھ چھوڑنے والو
کاش دیکھ لیتے تم چل کے دو قدم تنہا

صرف یہ بتانا ہے، شیوۂ وفا کیا ہے
ورنہ کون سہتا ہے اتنے رنج و غم تنہا



دل کا اک اک داغ شمعِ زیرِ داماں ہو گیا
ہم جہاں پہنچے وہیں جشنِ چراغاں ہو گیا

چاکِ دل کی بات تھی، چاکِ جگر کی بات تھی
مفت میں رسوا مرا چاکِ گریباں ہو گیا

رقص کر یوں، ایک اک بندِ عناصر ٹوٹ جائے
اے جنوں، پابندیوں سے دل پریشاں ہو گیا

کس سے پوچھوں، ارتقار کی کونسی منزل ہے یہ
آدمی خود آدمی کا دشمنِ جاں ہو گیا

چھوڑیے افسانۂ انساں کو، انساں اب کہاں
وہ تو بے چارہ ہلاکِ کفر و ایماں ہو گیا

پھول محرومِ تبسم اور صبا معذورِ رقص
یہ گلستاں کیا ہوا اے نقش زنداں ہو گیا

مقبول نقش



اتفاقاً جو کہیں اب وہ نظر آتے ہیں
کتنی یادوں کے حسیں نقش اُبھر آتے ہیں

کیسے گذری شبِ آشفتہ سراں کس کو خبر
لوگ تو بام پہ ہنگامِ سحر آتے ہیں

سوچ لیں آپ، مرا ساتھ کہاں تک دیں گے
مرحلے سیکڑوں دورانِ سفر آتے ہیں

یوں غلط تو نہیں چہروں کا تاثر بھی مگر
لوگ ویسے بھی نہیں جیسے نظر آتے ہیں

اُن سے جب ترکِ تعلق کا خیال آتا ہے
رابطے کتنے، تصور میں اُبھر آتے ہیں



حدِ پروازِ جمال آپ کی انگڑائی ہے
اس سے آگے مرے احساس کی رعنائی ہے

اب سفر اور بھی دشوار ہُوا، ہمسفرو!
تیرگی راہ کی، ذہنوں میں سمٹ آئی ہے

تھے جو محبوس تو آفاق نگاہی تھی نصیب
ہُوئے آزاد تو ہر چیز علاقائی ہے

ہم کبھی روئے تھے جس بات پہ پہروں اے نقش
آج اس بات پہ رہ رہ کے ہنسی آئی ہے

مقبول نقش



مقامِ امن، قفس کیا کہ آشیاں بھی نہیں
سکوں وہاں بھی نہیں تھا، سکوں یہاں بھی نہیں

مرا کلام پیامِ عمل نہ ہو، لیکن
تمام تر نغمہ و دل کی داستاں بھی نہیں

مری نگاہ میں منزل ہے عام انساں کی
مقامِ دار نہیں، بزمِ مہ رخاں بھی نہیں

یہ بار، شدتِ احساس کا ہے نادانو
گراں ہے زیست مگر اس قدر گراں بھی نہیں

ہے نقشؔ خونِ جگر سے ہر ایک فن کو ثبات
جو یہ نہیں تو کوئی نقشِ جاوداں بھی نہیں



اتنا مجبور آدمی کیوں ہے
اور اگر ہے تو آگہی کیوں ہے

ہر نفس نعرۂ خودی کیوں ہے
اتنا احساسِ کمتری کیوں ہے

تیرگی عجزِ صاحبانِ نظر
روشنی تک ہی روشنی کیوں ہے

آج ہی تو کسی سے بچھڑے ہیں
آج کی رات چاندنی کیوں ہے

لوگ کیا جانے کیا سمجھ بیٹھیں
نقشؔ سے اتنی بے رخی کیوں ہے

عیش برنی



ہر اک شے پر بہارِ زندگی محسوس کرتا ہوں
مگر با ایں ہمہ تیری کمی محسوس کرتا ہوں

بھٹک کر بھی کبھی منزل سے بیگانہ نہیں ہوتا
کسی کی غائبانہ رہبری محسوس کرتا ہوں

میں اپنے دل پہ رکھ لیتا ہوں تہمت بدگمانی کی
اگر تیری طرف سے بے رخی محسوس کرتا ہوں

یہ دُنیا اجنبی پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے لیکن
اب اپنے آپ کو بھی اجنبی محسوس کرتا ہوں

تمھیں اِس بات کا اندازہ شاید ہو نہیں سکتا
کہ تم کو دیکھ کر کتنی خوشی محسوس کرتا ہوں

عیش برنی



میں ہنس رہا تھا، گرچہ مرے دل میں درد تھا
یہ راز کھل گیا تو مرا چہرہ زرد تھا

اچھا ہوا کہ آپ نے دامن جھٹک دیا
میرا وجود آپ کے دامن پہ گرد تھا

خود اپنی ذات کے نہ کسی کام آ سکے
وہ لوگ جن کے دل میں زمانے کا درد تھا

کتنے عروج پر تھی مری شدتِ طلب
تم مل گئے تو شوق کا ہر جذبہ سرد تھا

تنہائیوں میں جس کے بنے راز دار تم
گویا وہ میں نہ تھا، کوئی آوارہ گرد تھا



ظلمتوں میں گو ٹھہرنے کو ٹھہر جاتے ہیں لوگ
اہلِ منزل کی نگاہوں سے اُتر جاتے ہیں لوگ

کل تلک تو حسن کی معصومیت مشکوک تھی
اب خلوصِ عشق پر بھی چوٹ کر جاتے ہیں لوگ

راہ میں اب وہ درِ جاناں ہو یا دیر و حرم
سر اُٹھائے بے نیازانہ گذر جاتے ہیں لوگ

زندگی کی بے ثباتی کا کوئی رونا نہیں
ہائے وہ حالات جب بے موت مر جاتے ہیں لوگ

شیخ صاحب ہم سیہ بختوں کا پیچھا چھوڑیئے
شام ہوتی ہے تو اپنے اپنے گھر جاتے ہیں لوگ

شاہین غازی پوری



یہ بھی شاید ترا اعجازِ نظر ہے اے دوست
شعلۂ درد مجھے اک گلِ تر ہے اے دوست

تیری آواز تو صحرا میں بھٹک جاتی ہے
کس طرف جاؤں میں، تُو جانے کدھر ہے اے دوست

ہائے یہ بے سر و سامانی و بے ترتیبی
زندگی کیا کسی میخوار کا گھر ہے اے دوست

کتنے طوفانوں کو سر کرتی ہے اک شمعِ وفا
اور وہ شمعِ وفا دردِ جگر ہے اے دوست

گر ہو خوابیدہ تو پتھر کے سوا کچھ بھی نہیں
جاگ جائے جو یہی دل تو شرر ہے اے دوست

یوں تو غم، زیست کو بے رنگ بنا دیتا ہے
دل جلوں کا یہی سرمایہ مگر ہے اے دوست

شاہین غازی پوری



میری چاہت پہ نہ الزام لگاؤ لوگو
کچھ سمجھ کر ہی اٹھاتا ہے کوئی بارِ گراں

پہلے ذرّاتِ زمیں بوس کا ہمرازِ تو بن
پھر سمجھنا بہت آساں ہے ستاروں کی زباں

رازدارِ گل و نسریں تو ہزاروں تھے مگر
کوئی سمجھا ہی نہیں برگِ پریشاں کی زباں

پھینکتی ہے ترے شاہیںؔ یہ دنیا پتھر
ناگہاں چور نہ ہو جائے یہ شیشے کا مکاں



دل جہاں بھی ڈوبا ہے، ان کی یاد آئی ہے
ہائے کیا سکوں پرور دردِ آشنائی ہے

تم سراب بن بن کر اپنی چھب دکھاتے ہو
تشنہ لب مسافر کی جان پر بن آئی ہے

یہ کشاکشِ ہستی کتنی دور لے آئی
دن کہاں گزارا ہے، شب کہاں گنوائی ہے

زندگی! تری خاطر تیرے دردمندوں نے
اک جہان کی تہمت اپنے سر اٹھائی ہے

روز و شب مری خاطر جس کا دل دھڑکتا تھا
اب یہ حال ہے، اس کی یاد بھی پرائی ہے

میں صدائے گم گشتہ، میں ادائے نازیبا
میرا نام کتنوں کو وجہِ خود نمائی ہے

خواب ہو چکے شاہیںؔ سارے واقعے پھر بھی
شہر شہر میں اب تک داستاں سرائی ہے

شاہین غازی پوری



خود اپنے زہر کو پینا بڑا کرشمہ ہے
جو ہو خلوص تو جینا بڑا کرشمہ ہے

یہاں تو آپ دھراب ایک سے جدھر جائیں
تمہارے ہاتھ سے پینا بڑا کرشمہ ہے

تمہارا دَور کرشموں کا دَور ہے، سچ ہے
تمہارے دَور میں جینا بڑا کرشمہ ہے

جہاں نصیب ہو عیشِ دوام بے تگ و دو
جبیں پہ گرم پسینا بڑا کرشمہ ہے

غمِ معاش کی گردش، خود آگہی کا بھرم
اس اختلاف میں جینا بڑا کرشمہ ہے

شماریات بھی شاہیںؔ، شعر گوئی بھی
یہ حرف حرف نگینا بڑا کرشمہ ہے



شہرِ خوباں سے جو ہم اب بھی گزر آتے ہیں
کتنے دھندلائے ہوئے نقش اُبھر آتے ہیں

رات جا چھپتی ہے سنسان جزیروں میں کہیں
رات کے خواب مری روح میں در آتے ہیں

سحر انداز ہے کیا نیم نگاہی تیری
ایک سے کافر و دیں دار نظر آتے ہیں

کس کو سچ کہیئے گا، کس روپ کو جھٹلائیے گا
آئینے میں تو کئی عکس اُتر آتے ہیں

ایک مدّت سے ہیں اس شہر میں ہم آوارہ
بام و در آج بھی انجان نظر آتے ہیں

وہ بلاتے تو ہیں شاہیںؔ سرِ بام مگر
ہم ہی کچھ سوچ کے زینوں سے اتر آتے ہیں

شاہین غازی پوری



تھی کچھ نہ خطا، پھر بھی پشیمان رہے ہیں
کیا کیا غمِ حالات کے عنوان رہے ہیں

خود جن کو نہ عرفان تھا تقدیسِ جنوں کا
وہ بھی مری ہستی کے نگہبان رہے ہیں

جن کو مری ہر بات پہ وحشت کا گماں تھا
وہ میری خموشی کا بُرا مان رہے ہیں

دلچسپ نظر آئی تھی یہ رسم و رہِ دل
پر جان کا اک روگ ہے، اب جان رہے ہیں

جو بھی ہے، اسے تنگیٔ داماں کا گلہ ہے
ایک ایک کو ہم دور سے پہچان رہے ہیں



ہمارے حالِ زبوں پر ملال ہے کتنا
اسے بھی یارو ہمارا خیال ہے کتنا

بچایئے دلِ زندہ کو خون ہونے سے
نہ دیکھیے کہ غمِ ماہ و سال ہے کتنا

ہوئی خوشی جو میسّر تو یہ ہوا معلوم
خوشی کا بوجھ اٹھانا محال ہے کتنا

نباہ زیست سے کرتا ہوں عاشقانہ میں
یہ جانتا ہوں کہ جینا محال ہے کتنا

شاھین غازی پوری



مزاجِ گردشِ دوراں وہی سمجھتے ہیں
جو رسم و راہِ غمِ عاشقی سمجھتے ہیں

وہ کون لوگ تھے راس آئی جن کو غربت بھی
ہمیں تو اہلِ وطن اجنبی سمجھتے ہیں

شکستِ دل کا یہ اک لازمی نتیجہ ہے
حضور، آپ جسے سادگی سمجھتے ہیں

بڑی لطیف ہے یہ لذتِ طلب لیکن
کچھ اس کو تیرے گنہگار ہی سمجھتے ہیں

چھپاؤ ہم سے نہ شاہینؔ رازِ دل اپنا
کہ ہم زبانِ نگہِ شوق کی سمجھتے ہیں



ہم پہ جس طور بھی تم چاہو، نظر کر دیکھو
ہاں مگر بام کی رفعت سے اتر کر دیکھو

آبلہ پائی کی لذت بھی عجب لذت ہے
ساکنو! دشت میں اک بار سفر کر دیکھو

پھول ہی پھول دہکتے ہیں کراں تا بہ کراں
شعلہ زارِ غمِ ہستی سے گزر کر دیکھو

یہ تو معلوم ہے آئے گا نہ کوئی لیکن
آج کی رات بھی شاہینؔ سحر کر دیکھو

فخر زمان



لمحوں کا بھنور چیر کے انسان بنا ہوں
احساس ہوں مَیں، وقت کے سینے میں گڑا ہوں

کہنے کو تو ہر ملک میں گھوما ہوں، پھرا ہوں
سوچوں تو جہاں تھا، وہیں چپ چاپ کھڑا ہوں

فٹ پاتھ پہ عرصے سے پڑا سوچ رہا ہوں
پتّا تو مَیں سرسبز تھا، کیوں ٹوٹ گرا ہوں

اک روز زر و سیم کے انبار بھی تھے ہیچ
بکنے پہ جو آیا ہوں تو کوڑی پہ بکا ہوں

شاید کہ کبھی مجھ پہ بھی ہیرے کا گماں ہو
دیکھو تو مَیں پتھر ہوں، مگر سوچ رہا ہوں

حالات کا دھارا کبھی ایسے بھی رُکا ہے!
ناداں ہوں کہ میں ریت کے بند باندھ رہا ہوں

اک ریت کی دیوار کی صورت تھے سب آدرش
جن کے لیے اک عمر مَیں دنیا سے لڑا ہوں

احباب کی نظروں میں ہوں گر واجبِ تعظیم
کیوں اپنی نگاہوں میں بُری طرح گرا ہوں

اے فخر گرجنا مری فطرت سہی، لیکن
جو غیر کی مرضی سے ہی برسے وہ گھٹا ہوں

محسن زماں



اے ہمسفرو کیوں نہ نیا شہر بسالیں
اپنے ہی اصول، اپنی ہی اقدار بنالیں

جن لوگوں نے اب تک مرے ہونٹوں کو سیا ہے
سوزن سے مری سوچ کا کانٹا بھی نکالیں

برفوں پہ الاؤ نہیں سلگتے ہیں تو یارو
بجھتی ہوئی قندیل سے قندیل جلالیں

کہنے کو تو بازار کی ہم جنسِ گراں ہیں
لیکن ہمیں کوڑی پہ خریدار اٹھالیں

بوجھ اپنا بھی ہم سے تو اُٹھایا نہیں جاتا
اور آپ مُصِر، آپ کا بھی بوجھ اُٹھالیں

مخشر زماں



بہادری جو نہیں ہے تو بزدلی بھی نہیں
بہت ہی چاہا مگر ہم سے خودکشی نہ ہوئی

کچھ اس طرح سے خیالوں نے روشنی بخشی
تمہاری زُلف بھی بکھری تو تیرگی نہ ہوئی

کسی کے درد کو تم جانتے بھلا کیونکر
خود اپنے درد سے جب تم کو آگہی نہ ہوئی

وہ تیرگی تھی مسلط فضائے عالم پر
لہو کے دیپ جلے پھر بھی روشنی نہ ہوئی

میں جی رہا ہوں دلِ مُردہ لے کے سینے میں
اسے تو موت کہو، یہ تو زندگی نہ ہوئی



مشکل سے چمن میں ہمیں اک بار ملا پھول
بس ہاتھ لگایا تھا کہ ٹہنی سے جھڑا پھول

خوشبو جو نہیں ہے، نہ سہی، رنگ تو دیکھو!
بالوں میں سجا لو کوئی کاغذ کا بنا پھول

اس شب کو چمک کی نہیں، حاجت ہے مہک کی
آنکھوں سے ستارے نہیں، ہونٹوں سے گرا پھول

اب تک ترے ہونٹوں پہ تبسم کا گماں ہے
ہم کو تو ہے محبوب یہی آدھ کھلا پھول

اس دھوپ کی شدت میں بھی بے آب ہیں پودے
حالات یہی ہیں تو گماں ہے کہ گیا پھول

فخر زماں



جو دھوپ کی تپتی ہوئی سانسوں سے بچی سوچ
پھر چاندنی راتوں میں بڑی دیر جلی سوچ

آرام سے اک لمحہ بھی جینا نہیں ممکن
ہر وقت مرے ذہن میں رہتی ہے نئی سوچ

اس شہر میں آتا ہے نظر ہر کوئی اپنا
آواز کسے دوں، مجھے رہتی ہے یہی سوچ

دکھ درد کا مارا ہی کوئی سمجھے گا ہم کو
ہم تک نہ پہنچ پائے گی نازوں کی پلی سوچ



جائیں گے کہاں سر پہ جب آجائے گا سورج
وہ لوگ جو دیوار کے سائے میں کھڑے ہیں

اللہ! یہ لمحہ تو قیامت کی گھڑی ہے
انسان سے انسان کے سائے بھی بڑے ہیں

ہر موڑ پہ ہیں سر بفلک قصر نمایاں
ہر موڑ پہ کشکول لیے، لوگ کھڑے ہیں

اس درجہ گرانی ہے کہ پتھر نہیں ملتے
قبروں پہ صلیبیں نہیں، انسان گڑے ہیں

انجم انصاری



نطقِ اعجاز میں ڈھلتے نہیں اشعار ابھی
داد و تحسین کے محتاج ہیں افکار ابھی
لوٹ لائے ہو دھنیں تم لبِ گویائی سے
گیت آئے بھی نہیں ہیں سرِ بازار ابھی
ڈھونڈتا ہے ابھی خوابوں کی مہکتی زلفیں
وقت سے آنکھ ملاتا نہیں فنکار ابھی
حوصلوں کو نہ ابھی دیجیے اذنِ پرواز
اپنی آہٹ پہ لرز جاتی ہے رفتار ابھی
تُل رہا ہے زر و املاک پہ انساں کا لہو
بک رہے ہیں یہاں دولت کے خریدار ابھی
ظلمتیں چیر کے تم چاند کو آواز تو دو
سینۂ شب سے اُتر آئیں گے انوار ابھی
ہم نہ مانیں گے اُبھرتے ہوئے سورج کا غرور
دھوپ کے ساتھ سرکتی نہیں دیوار ابھی
مطلعِ عظمتِ انساں ہے غبار آلودہ
دھول بن بن کے اٹھے جاتے ہیں معیار ابھی۔
ہم نے بیچی نہیں تنہائیاں اپنی انجمؔ
ان کہشتوں کو بہاریں ہیں سزاوار ابھی

انجم انصاری



پرچھائیوں کے شہر زمیں پر بسا دیئے
بدلی ہٹا کے چاند نے جنگل سجا دیئے

کتنے ہی دائروں میں بٹا مرکزِ خیال
اک بت کے ہم نے سیکڑوں پیکر بنا دیئے

ٹوٹے کسی طرح تو فضاؤں کا یہ جمود
آندھی رکی تو ہم نے نشیمن جلا دیئے

اب راستوں کی گرد سے اٹھتے نہیں بدن
نقشِ قدم اسیرِ گلِ تر بنا دیئے

اک چاند کی تلاش میں گھومے نگر نگر
لوٹے تو آسماں نے ستارے بجھا دیئے

بازی تو ہم نے آج بھی ہاری نہیں حضور
نظریں بچا کے آپ نے مہرے اٹھا دیئے

ٹھہری ہوئی ہوا میں بھڑکتے نہیں چراغ
جھونکوں نے لو بڑھائی، دیئے جگمگا دیئے

انجم لبوں میں جذب ہوئیں تلخیاں تمام
مرجھا گئی بہار جو ہم مسکرا دیئے



انجانے خواب کی خاطر، کیوں اپنا چین گنوایا
کب وقت کا پنچھی ٹھہرا، کب سایہ ہاتھ میں آیا

اک نور کی چادر سمٹی، بے جان فضا دھندلائی
گھر آئے گھنیرے بادل، یا چاند گہن میں آیا

آنکھوں سے نشیلی شب کی، دھوتی رہی شبنم کاجل
ہر سمت سیاہی پھیلی، ہر سمت اندھیرا چھایا

جو بات لبوں پر آئی، وہ بات بنی افسانہ
اک گیت کو اس دنیا نے، کتنی ہی دھنوں میں گایا

دل درد سے بھر بھر آیا، پلکوں پہ نہ چمکے آنسو
آنکھوں نے سمندر بھر کے، قطرے کے لئے ترسایا

ایسے بھی زمانے گزرے۔ دن سویا راتیں جاگیں
احساس کا رنگیں آنچل سناٹوں میں لہرایا

خوشیوں کو تو چھوڑا ہم نے اک کھیل سمجھ کر انجم
جس غم کو رگِ جاں سمجھا، اس غم نے ہمیں ٹھکرایا



بنائے سب نے اسی خاک سے وسیلے اپنے
فلک سے ٹوٹ کے شمس و قمر نہیں آئے

گلی گلی ہو جہاں جگنوؤں کا گہوارہ
ہماری راہ میں ایسے نگر نہیں آئے

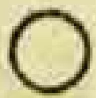
ہر ایک موڑ سے پوچھا ہے منزلوں کا پتہ
سفر تمام ہوا، راہبر نہیں آئے

غموں کے بوجھ سے ٹوٹی ہے زندگی کی کمر
بدن پہ زخم کہیں، چارہ گر! نہیں آئے

گلوں کی آنچ نے جھلسا دیا بہاروں کو
چمن کو لوٹنے برق و شرر نہیں آئے

ہوئے ہیں سینۂ شب میں جو دفن افسانے
لبِ سحر پہ کبھی بھول کر نہیں آئے

چمک اٹھے ہیں تھپیڑوں کی چوٹ سے قطرے
صدف کی گود میں انجم گہر نہیں آئے



باغ میں رہ کے بہاروں کو نبھانا ہوگا
اپنی روٹھی ہوئی خوشیوں کو منانا ہوگا

توڑنا ہوگا چھلکتے ہوئے ساغر کا غرور
بن پیئے بزم کو اب رنگ پہ آنا ہوگا

ڈھالنی ہوگی اسی رات کے دامن سے سحر
ٹوٹے تاروں کو ضیا بار بنانا ہوگا

تھامنی ہوں جو تجھے وقت کی نبضیں ہمدم
اڑتے لمحوں پہ کوئی نقش جمانا ہوگا

ان چراغوں میں بھڑک اٹھے ہیں شعلے انجم
اپنی راتوں میں دیا اور جلانا ہوگا

سلیم بیتاب

○

آنکھ کے کنج میں اک دشتِ تمنا لے کر
اجنبی دیس کو نکلے، دلِ تنہا لے کر
دیکھ تو، کھول کے تاریک مکاں کی کھڑکی
ہم ترے شہر میں آئے ہیں اُجالا لے کر
ہم بھی پہنچے تھے گلستاں میں سکوں کی خاطر
آگئے ذہن میں تپتا ہُوا صحرا لے کر
اب نگاہوں کی جراحت کو یہ سوچتے ہیں
کیوں گئے بزم میں ہم ذوقِ تماشا لے کر
کب سے فریاد بلب، آب طلب ہے شیریں
آج فرہاد بھی نکلا نہیں تیشہ لے کر
رُوسیہ تیرے بنے چشم و چراغِ زنداں
گھوم اب شہر میں تو، چہرۂ زیبا لے کر
اس چکا چوند میں اب مجھکو دکھائی کیا دے
آگئے آپ تو اِک نُور کا دریا لے کر
جب بھی حالات کے شعلوں میں گھرا ہوں بیتابؔ
آہی پہنچا ہے کوئی پھول سا چہرہ لے کر

سلیم بیتاب



صحراؤں میں جا پہنچی ہے شہروں سے نکل کر
الفاظ کی خوشبو مرے ہونٹوں سے نکل کر

سینے کو مرے کر گیا اک آن میں روشن
اک نور کا کوندا، تری آنکھوں سے نکل کر

میں قطرۂ شبنم تھا مگر آج ہوں سورج
آ بیٹھا ہوں میں صدیوں میں، لمحوں سے نکل کر

ہو جائیں گے بستی کے در و بام منوّر
سورج ابھی چمکے گا دریچوں سے نکل کر

کیا جانیے اب کونسی جانب کو گیا ہے؟
اک زرد سا چہرہ تری گلیوں سے نکل کر

ہر سمت تھا اک تلخ حقائق کا سمندر
دیکھا جو تصوّر کے جزیروں سے نکل کر

وہ پیاس ہے، مٹی پہ زباں پھیر رہے ہیں
ہم آئے ہیں احساس کے شعلوں سے نکل کر

ہر آن صدا دیتے ہیں معصوم اُجالے
بیتابؔ چلے آؤ، دھندلکوں سے نکل کر



پھولوں کی ہے تخلیق، کہ شعلوں سے بنا ہے
کندن سا ترا جسم، جو خوشبو میں بسا ہے

جنگل کے غزالوں پہ عجب خوف ہے طاری
طوفان کوئی شہر کی جانب سے اُٹھا ہے

یہ حسن چمن ہے مرے احساس کی تخلیق
ورنہ کہیں گُل ہے، نہ کہیں موجِ صبا ہے

ہر لفظ ترے چہرے کی تصویر بنا تھا
کس کرب سے سو بار ترے خط کو پڑھا ہے

ڈالو مرے کانوں میں بھی پگھلا ہُوا سیسہ
اے برہمنو! میں نے بھی تو، وید سُنا ہے

تم ڈھونڈتے پھرتے ہو جسے صحنِ چمن میں
وہ شخص ابھی کوچۂ قاتل کو گیا ہے

سلیم بیتاب



آگ سی برستی ہے، سبز سبز پتّوں سے
دور بھاگتے ہیں لوگ، شہر کے درختوں سے

پچھلی رات، جب ہر سُو ظلمتوں کا پہرہ تھا
ایک چاند نکلا تھا اُن حسیں دریچوں سے

جانے چھو گئے ہوں گے کس کے پھول سے پاؤں
اک مہک سی اُٹھتی ہے اس نگر کے رستوں سے

آج کے زمانے میں کس کو ہے سکوں حاصل؟
سب ہیں برسرِ پیکار، اپنی اپنی سوچوں سے

تیرگی سے بھی جس کی پھول سے جھڑیں بیتابؔ
کیوں وہ روشنی مانگے، دوسروں کی صبحوں سے



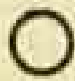
جی میں آتا ہے کہ اک روز یہ منظر دیکھیں
سامنے تجھ کو بٹھائیں، تجھے شب بھر دیکھیں

بند ہے شام سے ہی شہر کا ہر دروازہ
آ شبِ ہجر! کہ اب کوئی گھر دیکھیں

ایسے ہم دیکھتے ہیں دل کے اُجڑنے کا سماں
جس طرح داسیاں جلتا ہوا مندر دیکھیں

میرے جنگل میں ہی منگل کا سماں ہے پیدا
شہر کے لوگ مرے گاؤں میں آ کر دیکھیں

حمید الماس



یوں بھی کیا تھا، اور اب کیا رہ گیا
میں اکیلا تھا، اکیلا رہ گیا

ہجر میں ہے کون کتنا بے قرار
لیکن ان باتوں میں اب کیا رہ گیا

مصلحت کا فن بھی، باز آئی نہیں
دل وہ ناداں تھا کہ روتا رہ گیا

ساقیٔ عمرِ دو روزہ، یاد رکھ!
میری جانب سے تقاضہ رہ گیا

چارہ سازو، بھول جاؤں گا اسے
اب بتاؤ زخم کتنا رہ گیا

زندگی کچھ اس طرح کٹتی گئی
جیسے کوئی ہاتھ ملتا رہ گیا

بھیڑ، تنہائی کی چھٹتی ہی نہیں
ہر طرف چہرہ ہی چہرہ رہ گیا

موت کیا آتی بچھڑ کر دوست سے
دیکھ لو الماسؔ زندہ رہ گیا

حمید الماس



پھر کسی یاد کا دروازہ کھلا آہستہ
کون آتا ہے، چلا آئے ذرا آہستہ

دم زدن میں نہیں جائے گی بہارِ گلشن
آبلے پھوٹیں گے اے آبلہ پا آہستہ

بات وہ صاف ہی کب تھی جو سمجھ میں آتی
مجھ سے کچھ کہتی رہی چشمِ حیا آہستہ

شام ہے، ایک ستارہ ہے سرِ چرخِ وفا
مانگ اس وقت کوئی دل سے دعا آہستہ

ہائے اس شخص پہ کیا جانیے کیا گذری تھی
باتوں باتوں میں ترے گھر سے اُٹھا آہستہ

ہجر کی رات ہے، پچھلے کا سماں ہے الماس
درد آہستہ، ذرا بادِ صبا آہستہ



یادِ ماضی کے چراغوں کو بجھایا نہ کرو
تم بھی تنہا نہ رہو مجھ کو بھی تنہا نہ کرو

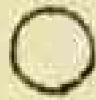
نفسِ بادِ صبا ہاتھ نہ آئے گا کبھی
گل کی اُڑتی ہوئی خوشبو کا احاطہ نہ کرو

ہم نے دیکھا ہے دمِ آخرِ شب خواب کوئی
تم سے کہنا ہے کہ تعبیر کا چرچا نہ کرو

کچھ نہ کچھ ہوگا مرے خاک اُڑانے کا سبب
جانے والو مجھے آوازۂ صحرا نہ کرو

یوں نہ محسوس ہو، افلاک نشیں ہے کوئی
اس قدر دور سے تو مجھ کو پکارا نہ کرو

ساقی فاروقی



پاؤں مارا تھا پہاڑوں پہ تو پانی نکلا
یہ وہی جسم کا آہن ہے کہ مٹی نکلا

میرے ہمراہ وہی تہمتِ آزادی ہے
میرا ہر عہد وہی عہدِ اسیری نکلا

ایک چہرہ تھا کہ اب یاد نہیں آتا ہے
ایک لمحہ تھا وہی جان کا بیری نکلا

ایک بات ایسی ہے جو ساتھ چلی آتی ہے
ورنہ ہر چال سے جیتے ہوئے بازی نکلا

میں عجب دیکھنے والا ہوں کہ اندھا کہلاؤں
وہ عجب خاک کا پُتلا تھا کہ نوری نکلا

جان پیاری تھی مگر جان سے بیزاری تھی
جان کا کام فقط جان فروشی نکلا

خاک میں اُس کی جدائی میں پریشان پھروں
جب کہ یہ ملنا بچھڑنا مری مرضی نکلا

اک نئے نام سے پھر اپنے ستارے اُلجھے
یہ نیا کھیل نئے خواب کا بانی نکلا

وہ مری رُوح کی اُلجھن کا سبب جانتا ہے
جسم کی پیاس بجھانے پہ بھی راضی نکلا

میری بجھتی ہوئی آنکھوں سے کرن چُنتا ہے
میری آنکھوں کا کھنڈر شہرِ معانی نکلا

میری عیار نگاہوں سے وفا مانگتا ہے
وہ بھی محتاج ملا ، وہ بھی سوالی نکلا

میں نے چاہا تھا کہ اشکوں کا تماشہ دیکھوں
اور آنکھوں کا خزانہ تھا کہ خالی نکلا

صرف حشمت کی طلب ، جاہ کی خواہش پائی
دل کو بے داغ سمجھتا تھا ، جذامی نکلا

اک بلا آتی ہے اور لوگ چلے جاتے ہیں
اک صدا کہتی ہے ، ہر آدمی فانی نکلا

میں وہ مردہ ہوں کہ آنکھیں مری زندوں جیسی
بین کرتا ہوں کہ میں اپنا ہی ثانی نکلا

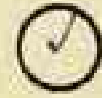
ساقی فاروقی



یہیں کہیں پہ کبھی شعلہ کار مَیں بھی تھا — شبِ سیاہ میں اک چشمِ مار مَیں بھی تھا
بہت سے لوگ تھے سقراط کار و عیسیٰ نفس — اسی ہجوم میں اک بے شمار مَیں بھی تھا
یہ چاند تارے مرے گرد رقص کرتے تھے — لکھا ہوا ہے، زمیں کا مدار مَیں بھی تھا
سنا ہے زندہ ہوں، حرص و ہوس کا بندہ ہوں — ہزار پہلے محبت گزار مَیں بھی تھا
جو میرے اشک تھے، برگِ خزاں کی طرح گرے — برس کے کھل گیا ابرِ بہار مَیں بھی تھا
وہ بیل بوٹے بنائے کہ دیکھتے رہے لوگ — یہ ہاتھ کاٹ لیے، مینا کار مَیں بھی تھا
مجھے سمجھنے کی کوشش نہ کی محبت نے — یہ اور بات، اُور اپیچ دار مَیں بھی تھا
سپردگی میں نہ دیکھی تھی تمکنت ایسی — یہ رنج ہے کہ انا کا شکار مَیں بھی تھا
مجھے عزیز تھا ہر ڈوبتا ہوا منظر — غرض کہ ایک زوال آشکار مَیں بھی تھا
مجھے گناہ میں اپنا سراغ ملتا ہے — وگرنہ پارسا و دین دار مَیں بھی تھا
برائے درس اب اطفالِ شہر آتے ہیں — حرام کارِ غنا و قمار مَیں بھی تھا
میں کیا بھلا تھا، یہ دُنیا اگر کمینی تھی — درِ کمینگی پہ چوب دار مَیں بھی تھا

وہ آسمانی بلا لوٹ کر نہیں آئی
اسی زمین پر امیدوار مَیں بھی تھا

ساقی فاروقی



وہ لوگ جو زندہ ہیں وہ مرجائیں گے اک دن
اک رات کے راہی ہیں، گزر جائیں گے اک دن

یوں دل میں اٹھی لہر، یوں آنکھوں میں بھرے رنگ
جیسے مرے حالات سنور جائیں گے اک دن

دل آج بھی جلتا ہے اسی تیز ہوا میں
اے تیز ہوا دیکھ، بکھر جائیں گے اک دن

یوں ہے کہ تعاقب میں ہے آسائشِ دنیا
یوں ہے کہ محبت سے مکر جائیں گے اِک دن

یوں ہوگا کہ ان آنکھوں سے آنسو نہ بہیں گے
یہ چاند ستارے بھی ٹھہر جائیں گے اِک دن

اب گھر بھی نہیں، گھر کی تمنا بھی نہیں ہے
مدت ہوئی، سوچا تھا کہ گھر جائیں گے اِک دن



میں پھر سے ہو جاؤں گا تنہا اک دن
بین کرے گا روح کا سناٹا اِک دن

جن میں ابھی اِک وحشی آگ کے سائے ہیں
وہ آنکھیں ہو جائیں گی صحرا اک دن

بیت چکا ہوگا یہ خوابوں کا موسم
بند ملے گا نیند کا دروازہ اِک دن

مٹ جائے گا سحر تمہاری آنکھوں کا
اپنے پاس بلائے گی دنیا اِک دِن

ڈوب رہا ہوں جھوٹ اور کھوٹ کے دریا میں
جانے کہاں لے جائے یہ دریا اِک دن

میں بھی لوٹ آؤں گا اپنے تعاقب سے
تم بھی مجھ کو ڈھونڈ کے تھک جانا اِک دن

ساقی فاروقی



وہ دکھ جو سوئے ہوئے ہیں اُنہیں جگا دوں گا
میں آنسوؤں سے ہمیشہ ترا پتہ دوں گا

تجھے لبوں پہ ہے بوسوں کی راکھ بکھری ہوئی
میں اس بہار میں یہ راکھ بھی اُڑا دوں گا

ہوا ہے تیز، نگہ اپنا دل نہ میلا کر
میں اس ہوا میں تجھے دور تک صدا دوں گا

مری صدا پہ نہ برسیں اگر تری آنکھیں
تو حرف و صوت کے سارے دیے بجھا دوں گا

جو اہلِ ہجر میں ہوتی ہے ایک دید کی رسم
تری تلاش میں وہ رسم بھی اُٹھا دوں گا

وہ ایک لمحہ جسے کھو دیا محبت نے
اُسے تلاش کروں گا، تجھے بھلا دوں گا

وہ لفظ ہاتھ نے لکھے ہیں جو نہ لکھنے تھے
میں اس خطا پہ اسے عمر بھر سزا دوں گا



بادِ نسیاں ہے مرا نام، بتا دو کوئی
ڈھونڈ کر لاؤ مجھے، میرا پتا دو کوئی

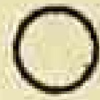
حادثہ ہے کہ ستاروں سے مجھے وحشت ہے
مجھ کو اس دشت کے آداب سکھا دو کوئی

وہ اندھیرا ہے کہ تنہائی سے ہول آتا ہے
سارے بچھڑے ہوئے لوگوں کو صدا دو کوئی

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں
ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی

موج در موج مری زندگی گرداب میں ہے
اس سفینے کو کنارے سے لگا دو کوئی

ساقی فاروقی



اک رات ہم ایسے ملیں جب دھیان میں سائے نہ ہوں
جسموں کی رسم و راہ میں روحوں کے سناٹے نہ ہوں

ہم بھی بہت مشکل نہ ہوں، تو بھی بہت آساں نہ ہو
خوابوں کی زنجیریں نہ ہوں، رازوں کے ویرانے نہ ہوں

اے کاش ایسا کر سکیں، آنکھوں کو زندہ کر سکیں
یہ کیا کہ دل میں گرد ہو، آنکھوں میں آئینے نہ ہوں

ہیں تیز دنیا کے قدم، شاید سنبھل چل پائیں ہم
اس بیسوا رفتار میں یادوں سے کیوں رشتے نہ ہوں

شوقِ فراواں سے پرے، لذّت کے زنداں سے پرے
اس آگ میں سُلگیں ذرا جس میں کبھی سُلگے نہ ہوں



مجھے خبر تھی مرا انتظار گھر میں رہا
یہ حادثہ تھا کہ میں عمر بھر سفر میں رہا

میں رقص کرتا رہا ساری عمر وحشت میں
ہزار حلقۂ زنجیرِ بام و در میں رہا

ترے فراق کی قیمت ہمارے پاس نہ تھی
ترے وصال کا سودا ہمارے سر میں رہا

یہ آگ ساتھ نہ ہوتی تو راکھ ہو جاتے
عجیب رنگ ترے نام سے ہنر میں رہا

اب ایک وادیٔ نسیاں میں چھپتا جاتا ہے
وہ ایک سایہ کہ یادوں کی رہگزر میں رہا

ساقی فاروقی



درد پرانا آنسو مانگے، آنسو کہاں سے لاؤں
روح میں ایسی کونپل پھوٹی، میں کمھلاتا جاؤں

میرے اندر بیٹھا کوئی میری ہنسی اڑائے
ایک پلک کو اندر جاؤں، باہر بھاگا آؤں

سارے موتی جھوٹے نکلے، سارے جادو ٹوٹے
میری خالی آنکھو، بولو، اب کیا خواب دکھاؤں

میرا کیسے کام چلے جب نام سے کرن نہ پھوٹے
اب کیا جینے پر اتراؤں، اب کیا نام کماؤں

اب بھی راکھ کے ڈھیر کے نیچے سسک رہی چنگاری
اب بھی کوئی جتن کرے تو جوالا مکھی بن جاؤں



یوں مرے پاس سے ہو کر نہ گزر جانا تھا
بول اے شخص، تجھے کون نگر جانا تھا

روح اور جسم جہنم کی طرح جلتے ہیں
اس سے روٹھے تھے تو اس آگ کو مر جانا تھا

راہ میں چھاؤں ملی تھی کہ ٹھہر سکتے تھے
اس سہارے کو مگر تنگیِ سفر جانا تھا

خواب ٹوٹے تھے کہ آنکھوں میں ستارے ناچے
سب کو دامن کے اندھیرے میں اتر جانا تھا

حادثہ یہ ہے کہ ہم جاں نہ معطر کر پائے
وہ تو خوشبو تھا، اُسے یوں بھی بکھر جانا تھا

اطہر نفیس



وہ دَور قریب آ رہا ہے
جب دادِ ہُنر نہ مِل سکے گی
اس شب کا نزول ہو رہا ہے
جس شب کی سحر نہ مل سکے گی
پوچھو گے ہر اک سے ہم کہاں ہیں
اور اپنی خبر نہ مل سکے گی
آساں بھی نہ ہو گا گھر میں رہنا
توفیقِ سفر نہ مل سکے گی
خنجر سی زباں کا زخم کھا کے
مرہم سی نظر نہ مل سکے گی
اس راہِ سفر میں سایہ افگن
اک شاخِ شجر نہ مل سکے گی
جاؤ گے کسی کی انجمن میں
پر اُس سے نظر نہ مل سکے گی
اک جنسِ وفا ہے جس کو ہر سُو
ڈھونڈو گے، مگر نہ مِل سکے گی
سیلابِ ہوس امڈ رہا ہے
اک تشنہ نظر نہ مل سکے گی

اطہر نفیس



نہ منزل ہوں نہ منزل آشنا ہوں
مثالِ برگ اُڑتا پھر رہا ہوں

مری آنکھوں کے خشک و تر میں جھانکو
کبھی صحرا کبھی دریا نما ہوں

وہ ایسا کون ہے جس سے بچھڑ کر
خود اپنے شہر میں تنہا ہوا ہوں

چمن میرا نہیں، پھر بھی چمن میں
میں تنہا رنگ و نکہت آشنا ہوں

نجانے کس لیے ہے ناز مجھ کو
نہ تجھ سا ہوں، نہ تجھ سے کچھ سوا ہوں

مرے انفاس کی توقیر کرنا
بڑی مشکل سے میں زندہ ہوا ہوں

جو میری روح میں اُترا ہوا ہے
میں اُس سے بے تعلق بھی رہا ہوں

میں اُس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں ہر سُو
جو مجھ سے کہہ سکے میں بے وفا ہوں

بتاتا کیوں نہیں کوئی کہ اب میں
کہاں ہوں، کس طرف کو جا رہا ہوں

ہوائے کوئے جاناں ملتفت ہے
سو اپنے رنج کہنے آ گیا ہوں

سُلا دو، اے ہواؤ، اب سُلا دو
بہت راتوں کا میں جاگا ہوا ہوں

اطہر نفیس



اطہر تم نے عشق کیا، کچھ تم بھی کہو کیا حال ہوا
کوئی نیا احساس ملا یا سب جیسا احوال ہوا

ایک سفر ہے وادیٔ جاں میں تیرے دردِ ہجر کے ساتھ
تیرا دردِ ہجر جو بڑھ کر لذتِ کیفِ وصال ہوا

راہِ وفا میں جاں دینا ہی پیشروؤں کا شیوہ تھا
ہم نے جب سے جینا سیکھا، جینا کارِ مثال ہوا

عشق فسانہ تھا جب تک اپنے بھی بہت افسانے تھے
عشق صداقت ہوتے ہوتے کتنا کم احوال ہوا

راہِ وفا دشوار بہت تھی، تم کیوں میرے ساتھ آئے
پھول سا چہرہ کمھلایا اور رنگِ حنا پامال ہوا



پھر کوئی نیا زخم، نیا درد عطا ہو
اُس دل کی خبر لے جو تجھے بھول چلا ہو

اب دل میں سرِ شام چراغاں نہیں ہوتا
شعلہ ترے غم کا کہیں بجھنے نہ لگا ہو

کب عشق کیا، کس سے کیا، جھوٹ ہے یارو
بس، بھول بھی جاؤ جو کبھی ہم سے سنا ہو

دروازہ کھلا ہے کہ کوئی لوٹ نہ جائے
اور اُس کے لیے، جو کبھی آیا نہ گیا ہو

شاید کہ ترے قرب سے آجائے میسّر
وہ درد کہ جو دردِ جدائی سے سوا ہو

اب میری غزل کا بھی تقاضا ہے یہ تجھ سے
انداز و ادا کا کوئی اسلوب نیا ہو

اطہر نفیس



تو ملا تھا، اور میرے حال پر رویا بھی تھا
میرے سینے میں کبھی اک اضطراب ایسا بھی تھا

جس طرح دل آشنا تھا شہر کے آداب سے
کچھ اُسی انداز سے شائستۂ صحرا بھی تھا

زندگی تنہا نہ تھی اے عشق تیری راہ میں
دھوپ تھی، صحرا تھا، اور اک مہرباں سایا بھی تھا

عشق کے صحرا نشینوں سے ملاقاتیں بھی تھیں
حُسن کے شہرِ نگاراں میں بہت چرچا بھی تھا

ہجر کے شب زندہ داروں سے شناسائی بھی تھی
وصل کی لذت میں گم، لوگوں سے اک ناتا بھی تھا

ہر فسردہ آنکھ سے مانوس تھی اپنی نظر
دُکھ بھرے سینوں سے ہم رشتہ میرا سینہ بھی تھا

تھک بھی جاتے تھے اگر صحرا نوردی سے تو کیا
متصل صحرا کے اک وجد آفریں دریا بھی تھا



سکوتِ شب سے اک نغمہ سُنا ہے
وہی کانوں میں اب تک گونجتا ہے

غنیمت ہے کہ اپنے غمزدوں کو
وہ حُسنِ خود نگر پہچانتا ہے

جسے کھو کر بہت مغموم ہوں میں
سُنا ہے! اُس کا غم مجھ سے سوا ہے

کچھ ایسے غم بھی ہیں جن سے ابھی تک
دلِ غم آشنا، نا آشنا ہے

بہت چھوٹے ہیں مجھ سے میرے دشمن
جو میرا دوست ہے، مجھ سے بڑا ہے

مجھے ہر آن کچھ بننا پڑے گا
مری ہر سانس میری ابتدا ہے

اطہر نفیس



شہِ بادِ صبا تیرے کوچے میں لے جانِ جاں آئے ہیں
چند ساعت رہیں گے، چلے جائیں گے، سرگراں آئے ہیں

شامِ آزردگی کے ستائے ہوئے، چوٹ کھائے ہوئے
مہرباں ہو کے مل، ہم بہت آج ناشادماں آئے ہیں

عشق کرنا جو سیکھا تو دُنیا برتنے کا فن آ گیا
کاروبارِ جنوں آ گیا ہے تو کارِ جہاں آئے ہیں

زخم کھلنے لگے پھر اُبھرنے لگیں دل کی محرومیاں
یاد پھر تیرے اندازِ دلداریٔ جسم و جاں آئے ہیں

داستانِ شبِ ہجر اُن کو سنانے کا دن یہ نہیں
محفلِ عشق میں آج ہی تو وہ کچھ مہرباں آئے ہیں



دم بہ دم بڑھ رہی ہے یہ کیسی صدا، شہر والو سنو
جیسے آئے دبے پاؤں سیلِ بلا، شہر والو سنو

خاک اُڑاتی نہ تھی اس طرح تو ہوا، اس کو کیا ہو گیا
دیکھو آواز دیتا ہے اک سانحہ، شہر والو سنو

یہ جو راتوں میں پھرتا ہے تنہا بہت، ہے اکیلا بہت
ہو سکے تو کبھی اس کا بھی ماجرا، شہر والو سنو

یہ ہمیں میں سے ہے، اس کے رنج و الم اس سے پوچھو کبھی
ہاں سنو اس کی روداد مہر و وفا، شہر والو سنو

اس کے جی میں ہے کیا، اس سے پوچھو ذرا، دیکھیں کہتا ہے کیا
کس نے اس شخص پر کوہِ غم ڈھا دیا، شہر والو سنو

عمر بھر کا سفر، جس کا حاصل ہے اک لمحۂ مختصر
کس نے کیا کھو دیا، کس نے کیا پا لیا، شہر والو سنو

اس کی بے خواب آنکھوں میں جھانکو کبھی، اس کو سمجھو کبھی
اس کو بیدار رکھتا ہے کیا واقعہ، شہر والو سنو

اطہر نفیس



کیا بات نرالی ہے مجھ میں کس فن میں آخر یکتا ہوں
کیوں میرے لیے تم کڑھتے ہو میں ایسا کون انوکھا ہوں

وہ لمحہ یاد کرو جب تم اس قلب سرا میں آئے تھے
اس روز سے اپنا حال ہے یہ کبھی ہنستا ہوں کبھی روتا ہوں

کچھ بھولی بسری یادوں کا البیلا شہر بسایا ہے
کوئی وقت ملے تو آ نکلو، یہیں ملتا ہوں، یہیں رہتا ہوں

کچھ اور بڑھے اس رستے میں انفاسِ رفاقت کی خوشبو
تم ساتھ سہی، ہمراہ سہی، میں پھر بھی تنہا تنہا ہوں

میں خاک بسر، میں عرش نشیں، میں سب کچھ ہوں، میں کچھ بھی نہیں
میں تیرے گماں سے پتھر ہوں، میں تیرے یقیں سے ہیرا ہوں

وہ عشق جو ہم سے رُوٹھ گیا، اب اُس کا حال بتائیں کیا
کوئی مہر نہیں، کوئی قہر نہیں، پھر سچا شعر سنائیں کیا

اک ہجر جو ہم کو لاحق ہے، تا دیر اُسے دہرائیں کیا
وہ زہر جو دل میں اُتار لیا، پھر اس کے ناز اٹھائیں کیا

پھر آنکھیں لہو سے خالی ہیں، یہ شمعیں بجھنے والی ہیں
ہم خود بھی کسی کے سوالی ہیں، اس بات پہ ہم شرمائیں کیا

اک آگ غمِ تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا جلتا ہو، پھر دامنِ دل کو بچائیں کیا

ہم نغمہ سرا کچھ غزلوں کے، ہم صورت گر کچھ خوابوں کے
بے جذبۂ شوق سنائیں کیا، کوئی خواب نہ ہو تو بتائیں کیا

احمد مشتاق



اب نہ بہل سکے گا دل، اب نہ دیئے جلائیے
عشق و ہوس ہیں سب فریب، آپ سے کیا چھپائیے

اُس نے کہا کہ یاد ہیں رنگ طلوعِ عشق کے
میں نے کہا کہ چھوڑیئے، اب اُنہیں بھول جائیے

کیسے نفیس تھے مکاں، صاف تھا کتنا آسماں
میں نے کہا کہ وہ سماں آج کہاں سے لائیے

کچھ تو سراغ مل سکے موسمِ دردِ ہجر کا
سنگِ جمالِ یار پر نقش کوئی بنائیے

کوئی شرر نہیں بچا پچھلے برس کی راکھ میں
ہمسفرانِ شعلہ خُو! آگ نئی جلائیے

احمد مشتاق



ترے دیوانے ہر رنگ رہے ترے دھیان کی جوت جگائے ہوئے
کبھی نتھرے ستھرے کپڑوں میں، کبھی انگ بھبوت رمائے ہوئے

اس راہ سے چھپ چھپ کر گذری رُت سبز سنہرے پھولوں کی
جس راہ پہ تم کبھی نکلے تھے گھبرائے ہوئے، شرمائے ہوئے

اب تک ہے وہی عالم دل کا، وہی رنگِ شفق، وہی تیز ہوا
وہی سارا منظر جادو کا، میرے نین سے نین ملائے ہوئے

چہرے پہ چمک، آنکھوں میں حیا، لب گرم، خنک چپ، نرم نوا
جنہیں اتنے سکوں میں دیکھا تھا، وہی آج ملے گھبرائے ہوئے

ہم نے مشتاق یونہی کھولا یادوں کی کتابِ مقدس کو
کچھ کاغذ نکلے خستہ سے، کچھ پھول ملے مرجھائے ہوئے

احمد مشتاق



اک پھول میرے پاس تھا، اک شمع میرے سات تھی
باہر خزاں کا زور تھا، اندر اندھیری رات تھی

ایسے پریشاں تو نہ تھے ٹوٹے ہوئے سناٹے
جب عشق کی، تیرے مرے غم پر، بسر اوقات تھی

کچھ تم کہو، تم نے کہاں، کیسے گذارے روز و شب
اپنے نہ ملنے کا سبب تو گردشِ حالات تھی

اک خامشی تھی تربتر، دیوارِ مژگاں سے ادھر
پہنچا ہوا پیغام تھا، برسی ہوئی برسات تھی

سب پھول دروازوں میں تھے، سب رنگ آوازوں میں تھے
اک شہر دیکھا تھا کبھی، اس شہر کی کیا بات تھی

یہ ہیں نئے لوگوں کے گھر، سچ ہے اب ان کو کیا خبر
دل بھی کسی کا نام تھا، غم بھی کسی کی ذات تھی



چاند بھی نکلا، ستارے بھی برابر نکلے
مجھ سے اچھے تو شبِ غم کے مقدّر نکلے

شام ہوتے ہی برسنے لگے کالے بادل
صبحدم لوگ دریچوں میں کھلے سر نکلے

کل ہی جن کو تری پلکوں پہ کہیں دیکھا تھا
رات اُسی طرح کے تارے مری چھت پر نکلے

دھوپ ساون کی بہت تیز ہے، دل ڈوبتا ہے
اس سے کہہ دو کہ ابھی گھر سے نہ باہر نکلے

پیار کی شاخ تو جلدی ہی ثمر لے آئی
درد کے پھول بڑی دیر میں جا کر نکلے

دلِ ہنگامہ طلب! یہ بھی خبر ہے تجھ کو
مدتیں ہو گئیں اک شخص کو باہر نکلے

احمد مشتاق



خواب کے پھولوں کی تعبیریں کہانی ہوگئیں
خون ٹھنڈا پڑ گیا، آنکھیں پرانی ہوگئیں

جس کا چہرہ تھا چمکتے موسموں کی آرزو
اس کی تصویریں بھی اوراقِ خزانی ہوگئیں

دل بھر آیا کاغذِ خالی کی صورت دیکھ کر
جن کو لکھنا تھا وہ سب باتیں زبانی ہوگئیں

جو مقدر تھا، اسے تو روکنا بس میں نہ تھا
ان کا کیا کرتے، جو باتیں ناگہانی ہوگئیں

رہ گیا مشتاق دل میں رنگِ یادِ رفتگاں
پھول مہنگے ہوگئے، قبریں پرانی ہوگئیں



چاند اُس گھر کے دریچوں کے برابر آیا
دلِ مشتاق ٹھہر جاؤ، وہی منظر آیا

میں بہت خوش تھا کڑی دھوپ کے سناٹے میں
کیوں تری یاد کا بادل مرے سر پر آیا

بجھ گئی رونقِ پروانہ تو محفل چمکی
سو گئے اہلِ تمنّا تو ستمگر آیا

یار سب جمع ہوئے رات کی خاموشی میں
کوئی رو کر تو کوئی بال بنا کر آیا

غزل ــــ ۱۳۰۸
احمد مشتاق



دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے

جہاں کہ داغ ہے، یاں آگے درد رہتا تھا
مگر یہ داغ بھی جاتا دکھائی دیتا ہے

پکارتی ہیں بھرے شہر کی گذرگاہیں
وہ روز شام کو تنہا دکھائی دیتا ہے

یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے

خزاں کے زرد دنوں کی سیاہ راتوں میں
کسی کا پھول سا چہرا دکھائی دیتا ہے

کہیں ملے وہ سرِ راہ تو لپٹ جائیں
بس اب تو ایک ہی رستا دکھائی دیتا ہے



ہر لحظہ ظلمتوں کی خدائی کا وقت ہے
شاید کسی کی چہرہ نمائی کا وقت ہے

کہتی ہے ساحلوں سے یہ جاتے سمے کی دھوپ
ہشیار! ندیوں کی چڑھائی کا وقت ہے

ہوتی ہے شام، آنکھ سے آنسو رواں ہوئے
یہ وقت قیدیوں کی رہائی کا وقت ہے

کوئی بھی وقت ہو کبھی ہوتا نہیں جدا
کتنا عزیز اس کی جدائی کا وقت ہے

دل نے کہا کہ شامِ شبِ وصل سے نہ بھاگ
اب پک چکی ہے فصل، کٹائی کا وقت ہے

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں، یہ ہوا، یہ رات
اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے

احمد مشتاق



ہاتھ سے ناپتا ہوں درد کی گہرائی کو
یہ نیا کھیل ملا ہے مری تنہائی کو

تھا جو سینے میں چراغِ دلِ پُرخوں نہ رہا
چاہیئے بیٹھ کے اب صبر و شکیبائی کو

دلِ افسردہ کسی طرح بہلتا ہی نہیں
کیا کریں آپ کی اِس حوصلہ افزائی کو

خیر بدنام تو پہلے بھی بہت تھے لیکن
تجھ سے ملنا تھا کہ پر لگ گئے رسوائی کو

نگہِ ناز! نہ ملتے ہوئے گھبرا ہم سے
ہم محبت نہیں کہنے کے شناسائی کو

دل ہے نیرنگیٔ ایام پہ حیراں اب تک
اتنی سی بات بھی معلوم نہیں بھائی کو



زلف دیکھی وُہ دھواں دھار؟ وہ چہرا دیکھا؟
سچ بتا دیکھنے والے! اسے کیسا دیکھا

رات ساری کسی ٹوٹی ہوئی کشتی میں کٹی
آنکھ بستر پہ کھلی، خواب میں دریا دیکھا

زرد گلیوں میں کھلے سبز دریچے، جن میں
دھوپ لیٹی رہی اور سائے کو جلتا دیکھا

کالے کمروں میں کٹی ساری جوانی اُس کی
جس نے اے صبحِ محبت، ترا رستا دیکھا

سنتے رہتے تھے کہ یُوں ہوگا، وہ ایسا ہوگا
لیکن اس کو تو کسی اور طرح کا دیکھا

اسلم انصاری



غبارِ احساسِ پیش و پس کی اگر یہ باریک تہ ہٹائیں
تو ایک پل میں نہ جانے کتنے زمانوں کے عکس تھرتھرائیں
خزاں اگر اپنا خوں نہ بخشے تو فصلِ گُل کیسے سُرخرو ہو
سکوت اپنا جگر نہ چیرے تو کیسے جھنکار دیں صدائیں
بکھر چلے ہیں، بکھر چکے ہیں گُلِ عبارت کے برگ ریزے
کتابِ جاں کی شہادتوں کا ورق ورق لے گئیں ہوائیں
ہوا کی بے رنگ تختیوں پر صدا کی تحریر کیا اُبھاریں
سکوت کے بے نشان کھنڈر میں چراغِ آواز کیا جلائیں
یہ شوق کی بے نصیب کلیاں، یہ درد کے بے خزاں شگوفے
تمہارے قدموں میں رکھ نہ پائے تو کس کی چوکھٹ پہ جا گرائیں
ہوا کی تلوار چل رہی ہو تو شاخِ اُمید کیا سنبھالیں
بدن کی دیوار گر رہی ہو، تو دل کی دیوار کیا بچائیں
تماشہ گاہِ طرب نشاں میں سبھی کو لازم ہے مسکرانا
جو غم فروشی نہ کرنا چاہیں، وہی یہاں بخت آزمائیں
مہیب راتوں میں ڈگمگاتے دُکھی بدن کے مسافروں کو
اکیلے پن میں ڈرا رہی ہے سمے کے جنگل کی سائیں سائیں
تمام الفاظ مر چکے ہیں، تمام احباب جا چکے ہیں
گئی رُتوں کے ستم کا قصہ سنائیں کیسے، کسے سنائیں

اسلم انصاری



اپنی صدا کی گونج ہی تجھ کو ڈرا نہ دے
اے دل، طلسمِ گنبدِ شب میں صدا نہ دے

دیوارِ خستگی ہوں، مجھے ہاتھ مت لگا!
میں گر پڑوں گا، دیکھ مجھے آسرا نہ دے

گُل کر نہ دے چراغِ وفا، ہجر کی ہوا
طولِ شبِ الم مجھے پتھر بنا نہ دے

ہم سب اسیرِ وحشتِ ہویدا ہیں دوستو!
ہم میں کوئی کسی کو کسی کا پتا نہ دے

سب محوِ نقشِ پردۂ رنگیں تو ہیں، مگر
کوئی ستم ظریف یہ پردہ ہٹا نہ دے

اک زندگی گزیدہ سے یہ دشمنی نہ کر
اے دوست، مجھ کو عمرِ ابد کی دُعا نہ دے

پیچھے ہٹوں تو پاؤں پکڑتی ہے یہ زمیں
آگے بڑھوں تو وہم کوئی راستہ نہ دے

ڈرتا ہوں، آئینہ ہوں، کہیں ٹوٹ ہی نہ جاؤں
اک لَو سی ہوں چراغ کی، کوئی بجھا نہ دے

ہاں، مجھ پہ فیضِ میرؔ و فراقؔ و ندیمؔ ہے
لیکن تو ہم سخن مجھے اتنی ہوا نہ دے!

اسلم انصاری



ہر شخص اس ہجوم میں تنہا دکھائی دے
دنیا بھی اک عجیب تماشا دکھائی دے

اک عمر قطعِ وادیٔ شب میں گزر گئی
اب تو کہیں سحر کا اجالا دکھائی دے

اے موجۂ سرابِ تمنا، ستم نہ کر
صحرا ہی سامنے ہے تو صحرا دکھائی دے

میں بھی چلا تو پیاس بجھانے کو تھا، مگر
ساحل کو دیکھتا ہوں کہ پیاسا دکھائی دے

الفاظ ختم ہوں تو ملے رشتۂ خیال
یہ گرد بیٹھ جائے تو رستہ دکھائی دے

کون اپنا عکس دیکھ کے حیران پلٹ گیا
چہرہ یہ موج موج میں کس کا دکھائی دے

تو منکرِ وفا ہے، تجھے کیا دکھاؤں دل
غم شعلۂ نہاں ہے، بھلا کیا دکھائی دے

ہر شب درِ خیال پہ ٹھہرے وہ ایک چاپ
ہر شب فصیلِ دل پہ وہ چہرہ دکھائی دے

لب بستگی سے اور کھِلے غنچۂ صدا
وہ چُپ رہے تو اور بھی گویا دکھائی دے

اسلمؔ غریبِ شہرِ سخن ہے، کبھی ملیں!
کہتے ہیں آدمی تو بھلا سا دکھائی دے



لرز لرز کے دلِ ناتواں ٹھہر ہی نہ جائے
فراقِ ساز، کہیں روحِ نغمہ مر ہی نہ جائے

اُتارے کسی شیشے میں ساعتِ نغمہ
صدائے قافلۂ گُل کہیں بکھر ہی نہ جائے

سُنا بھی دے کسی گُل کو فسونِ تنہائی
رہِ خیال سے یہ کارواں گزر ہی نہ جائے

ہے ایک قلزمِ خوں قریۂ جنوں سے اِدھر
یہاں جو آئے کوئی، اُس کی پھر خبر ہی نہ جائے

کسی کو مُہلتِ ہستی بھی دے غمِ جاناں!
یہ کیا کہ آئے کوئی تو پلٹ کے گھر ہی نہ جائے

وہ خوش مزاج ہے، اُس کو الم سے کیا نسبت
سنا نہ عشق کا غم، عشق سے وہ ڈر ہی نہ جائے

نگاہِ یار، غمِ جاں گُسل کا کیا ہوگا
ترے کرم سے نصیبِ وفا سنور ہی نہ جائے

بہا دے آج کچھ آنسو کہ پھر غنیمت ہیں
چڑھا ہے آج جو دریا وہ کل اُتر ہی نہ جائے

بجا کہ جاں سے گزرنا بہت کٹھن ہے مگر
ترے نثار، کوئی ایسا کام کر ہی نہ جائے

اسلم انصاری



مجھے تو یہ بھی فریبِ حواس لگتا ہے
وگرنہ کون اندھیروں میں ساتھ چلتا ہے

بکھر چکی جرسِ کاروانِ گُل کی صدا
اب اس کے بعد تو واماندگی کا وقفہ ہے

جو دیکھیے تو سبھی کارواں میں شامل ہیں
جو سوچیے تو سفر میں ہر ایک تنہا ہے

کسے خبر کہ یہ دوری کا بھید کیا شے ہے
قدم اٹھاؤ تو رستہ بھی ساتھ چلتا ہے

ابھر رہے ہیں جو منظر، فریبِ منظر ہیں
جو کھل رہا ہے دریچہ تو وہم اپنا ہے

طلب تو کر، کسے معلوم کامگار بھی ہو
زمانہ عیب و ہنر اب کہاں پرکھتا ہے

تری صدا ہے کہ ظلمت میں روشنی کی لکیر
ترا بدن ہے کہ نغموں کا دل دھڑکتا ہے

اداسیوں کو نہ چھونے دے پھول سا پیکر
ابھی کچھ اور تجھے اہلِ غم پہ ہنسنا ہے

مری وفا پہ بھی اے دوست اعتبار نہ کر
مجھے بھی تیری طرح سب سے پیار کرنا ہے

یہ پوچھنا ہے کہ غیروں سے کیا ملا تجھ کو
تری جفا کی شکایت تو کون کرتا ہے

چمن چمن ہے اگر گُل فشاں تو کیا کیجیے
ہمیں تو اپنے خرابے کو ہی پلٹنا ہے

یہ ایک چاپ جو برسوں سے سن رہا ہوں میں
کوئی تو ہے جو یہاں آ کے لوٹ جاتا ہے!



میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں

جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

دور و نزدیک سے اٹھتا نہیں شورِ زنجیر
اور صحرا میں کوئی نقشِ کفِ پا بھی نہیں

گُل بہر رنگ تبسم کا گنہ گار رہا!
زخمِ ہستی کا ہوا اس کے مداوا بھی نہیں

کون سا موڑ ہے، کیوں پاؤں پکڑتی ہے زمیں
اس کی بستی بھی نہیں، کوئی پکارا بھی نہیں

بے نیازی سے سبھی قریۂ جاں سے گزرے
دیکھتا کوئی نہیں ہے کہ تماشا بھی نہیں

وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تُو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

کس کو نیرنگیٔ ایّام کی صورت دکھلائیں
رنگ اُڑتا بھی نہیں، نقش ٹھہرتا بھی نہیں

یا ہمیں کو نہ ملا اس کی حقیقت کا سراغ
یا سرِ پردۂ عالم میں کوئی تھا بھی نہیں

اسلم انصاری



وہ رنگ اُڑے ہیں کہ اب کے برس بہاروں کے
کہ دل میں نقش اُبھرتے ہیں برف زاروں کے

یہ دشتِ دل، یہ بہر سُو غبارِ تنہائی
کہاں گئے وہ چمن اجنبی اشاروں کے

اُلجھ گئے ہیں کسی موجِ اضطراب میں پھر
وہ خواب —— رنگ میں ڈوبے ہوئے کناروں کے

چلو کہ اس سے کوئی صاف صاف بات کریں
کہ اب تو کھل ہی گئے بھید استعاروں کے

نہ جانے آخرِ شب کس کے دل پہ چوٹ پڑی
کہ ڈوب ڈوب گئے جیسے دل ستاروں کے

فراقِ گُل میں کٹی زندگی خزاؤں کی
سراغِ گُل میں لٹے قافلے بہاروں کے



اک برگ برگ دن کی خبر چاہیئے مجھے
میں شاخِ شب زدہ ہوں، سحر چاہیئے مجھے

میری طلب دہکتے الاؤ نہ تھے کبھی
انبارِ خس ہوں، ایک شرر چاہیئے مجھے

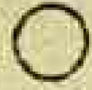
کب تک سُلگتی ریت پہ جیسے چھڑا رہوں
اُس گُل زمیں کی سمت سفر چاہیئے مجھے

سو بار جسم و جاں کو بنانا پڑا سوال
اس تجربے سے اب تو حذر چاہیئے مجھے

وہ ربطِ دوستی جسے پائندہ کہہ سکیں
ملتی نہیں یہ چیز —— مگر چاہیئے مجھے

مضمونِ آگہی ہوں، بیاں چاہتا ہوں میں
افسونِ بے اثر ہوں —— اثر چاہیئے مجھے

اسلم انصاری



درسِ آدابِ جنوں یاد دلانے والے
آ گئے پھر مری زنجیر ہلانے والے

کس طرح کھوئے گئے عکسِ رواں کی صورت
شہرِ حیراں میں ترا کھوج لگانے والے

غور سے دیکھ، کوئی ہے پسِ تصویرِ خزاں
ورنہ کس سمت گئے رنگ جمانے والے

خمِ محراب پہ صدیوں کی سیہ گرد بھی دیکھ
طاقِ ویراں میں لہو اپنا جلانے والے

زہر اب زہر ہے کرتا نہیں کارِ تریاک
مر گئے زہر کو تریاک بنانے والے

فصلِ بے برگ کچھ ایسی بھی تو بے رنگ نہیں
داستاں عہدِ بہاراں کی سنانے والے

دفِ گُل ٹوٹ گئی دستِ صبا میں لیکن
رقص کرتے ہی رہے وجد میں آنے والے

بجھ گئے شوخ دریچوں میں دمکتے مہتاب
سو گئے رات کی تقدیر جگانے والے

سوچتا ہوں کہ یہ معمورۂ غم، یہ دنیا
کس لیے تو نے بنائی ہے بنانے والے



جب ہمیں اذنِ تماشا ہوگا — تو کہاں انجمن آرا ہوگا
ہم نہ پہنچے سرِ منزل تو کیا — ہم سفر کوئی تو پہنچا ہوگا
اُٹھتی ہوگی کہیں خوشبوئے خیال — گُلِ معنی کہیں کھلتا ہوگا
ہر گُل و برگ ہے اک نقشِ قدم — کون اس رہ سے گزرا ہوگا
لبِ تصویر پہ گویا ہے سخن — کوئی سُن لے تو تماشا ہوگا
اب بھی گلپوش دریچے کے قریب — تو کسی سوچ میں ڈوبا ہوگا
آج کی شام بھی وہ سروِ جمیل — تیرے آنگن میں لہکتا ہوگا
تو نے جب ہاتھ چھڑایا تھا وہ پل — تجھ کو بھی یاد تو آتا ہوگا
دل یہ کہتا ہے تجھی سے ملیے — میں یہ کہتا ہوں کہ پھر کیا ہوگا

وحشتِ فرقت میں کھڑا سوچتا ہوں
تو کہاں انجمن آرا ہوگا!

جون ایلیا



نام ہی کیا نشاں ہی کیا، خواب و خیال ہو گئے
تیری مثال دے کے ہم تیری مثال ہو گئے

سایۂ ذات سے بھی رم، عکسِ صفات سے بھی رم
دشتِ غزل میں آ کے دیکھ، ہم تو غزال ہو گئے

کتنے ہی نشہ ہائے ذوق، کتنے ہی جذبہ ہائے شوق
رسمِ تپاکِ یار سے رُو بہ زوال ہو گئے

عشق ہے اپنا پائدار، تیری وفا ہے استوار
ہم تو ہلاکِ ورزشِ فرضِ محال ہو گئے

جادۂ شوق میں پڑا قحطِ غبارِ کارواں
واں کے شجر تو سر بسر دستِ سوال ہو گئے

سخت زمیں پرست تھے عہدِ وفا کے پاسدار
اُڑ کے بلندیوں میں ہم گردِ ملال ہو گئے

قربِ جمال اور ہم، عیشِ وصال اور ہم
ہاں یہ ہوا کہ ساکنِ شہرِ جمال ہو گئے

ہم نفسانِ وضعدار، مستمعانِ بُردبار
ہم تو تمہارے واسطے ایک وبال ہو گئے

کون سا قافلہ ہے یہ، جس کے جرس کا ہے یہ شور
"میں تو نڈھال ہو گیا، ہم تو نڈھال ہو گئے"

خار بہ خار گل بہ گل، فصلِ بہار آ گئی
فصلِ بہار آ گئی، زخم بحال ہو گئے

شور اُٹھا، مگر تجھے لذتِ گوش تو ملی
خون بہا، مگر ترے ہاتھ تو لال ہو گئے

جون کرو گے کب تلک اپنا مثالیہ تلاش
اب کئی ہجر ہو چکے، اب کئی سال ہو گئے

جون ایلیا



ایذا دہی کی داد جو پاتا رہا ہوں میں
ہر نازِ آفریں کو ستاتا رہا ہوں میں

اے خوش خرام، پاؤں کے چھالے تو گن ذرا
تجھ کو کہاں کہاں نہ پھراتا رہا ہوں میں

اک حسنِ بے مثال کی تمثیل کے لیے
پرچھائیوں پہ رنگ گراتا رہا ہوں میں

کیا مل گیا ضمیرِ ہنر بیچ کر مجھے
اتنا کہ صرف کام چلاتا رہا ہوں میں

روحوں کے پردہ پوش گناہوں سے بے خبر
جسموں کی نیکیاں ہی گناتا رہا ہوں میں

تجھ کو خبر نہیں کہ ترا کرب دیکھ کر
اکثر ترا مذاق اڑاتا رہا ہوں میں

شاید مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی
لیکن یقین سب کو دلاتا رہا ہوں میں

اک سطر بھی کبھی نہ لکھی میں نے تیرے نام
پاگل تجھی کو یاد بھی آتا رہا ہوں میں

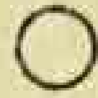
جس دن سے اعتماد میں آیا ترا شباب
اس دن سے تجھ پہ ظلم ہی ڈھاتا رہا ہوں میں

اپنا مثالیہ مجھے اب تک نہ مل سکا
ذروں کو آفتاب بناتا رہا ہوں میں

بیدار کر کے تیرے بدن کی خود آگہی
تیرے بدن کی عمر گھٹاتا رہا ہوں میں

کل دوپہر عجیب سی اک بے دلی رہی
بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں میں

جونؔ ایلیا



گنوائی کس کی تمنا میں زندگی میں نے
وہ کون تھا جسے دیکھا نہیں کبھی میں نے

ترا خیال تو ہے پر ترا وجود نہیں
ترے لیے تو یہ محفل سجائی تھی میں نے

ترے عدم کو گوارا نہ تھا وجود مرا
سو اپنی بیخ کنی میں کمی نہ کی میں نے

ہیں میری ذات سے منسوب صد فسانۂ رنگ
اور ایک سطر بھی اب تک نہیں لکھی میں نے

مرے حریف، مری یکہ تازیوں کے نثار
تمام عمر حلیفوں سے جنگ کی میں نے

بہت حسیں ہے کوئی، پر مجھے شکست تو دے
کہ اب تو اپنی سپر تک بھی پھینک دی میں نے

درونِ رقص گہِ دختران ساق فشاں
فقط خلوصِ ریاضت کی داد دی میں نے

حریمِ نخوتیانِ لباسِ شب خوابی
اڑائی ہے ترے لوگوں کی نیند بھی میں نے

خود اپنے عشوہ و انداز کا شہید ہوں میں
خود اپنی ذات سے برتی ہے بے رخی میں نے

خراشِ نغمہ سے سینہ چھلا ہوا ہے مگر
نہ ترک کی ہوسِ نغمہ پروری میں نے

زبانہ زن تھا جگر سوز تشنگی کا عذاب
سو جوفِ سینہ میں دوزخ انڈیل لی میں نے

دوا سے فائدہ مقصود تھا ہی کب کہ فقط
دوا کے شوق میں صحت تباہ کی میں نے

علاج یہ ہے کہ مجبور کر دیا جاؤں
وگرنہ یوں تو کسی کی نہیں سنی میں نے



نیا اک ربط پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم

خموشی سے ادا ہو رسمِ دوری
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم

یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں
وفاداری کا دعویٰ کیوں کریں ہم

وفا، اخلاص، قربانی، محبت
اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم

ہماری ہی تمنا کیوں کرو تم
تمہاری ہی تمنا کیوں کریں ہم

کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے
تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم

زلیخائے عزیزاں، بات یہ ہے
بھلا گھاٹے کا سودا کیوں کریں ہم

نہیں دنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم

اٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں
فقط کمروں میں ٹہلا کیوں کریں ہم

جو اک نسلِ فرومایہ کو پہنچے
وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم

چبا لیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچہ
تمہیں راتب مہیا کیوں کریں ہم

پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں
زمیں کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم

یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

۱۳۱۹

جونؔ ایلیا



شوق کا رنگ بجھ گیا، یاد کے زخم بھر گئے
کیا مری فصل ہو چکی، کیا مرے دن گزر گئے!

ہم بھی حجاب در حجاب چھپ نہ سکے مگر رہے
وہ بھی ہجوم در ہجوم رو نہ سکے، مگر گئے

رہگزرِ خیال میں دوش بدوش تھے جو لوگ
وقت کی گرد باد میں جانے کہاں بکھر گئے

شام ہے کتنی بے تپاک، شہر ہے کتنا سہمناک
ہم نفسو کہاں ہو تم، جانے یہ سب کدھر گئے

آج کی رات ہے عجیب، کوئی نہیں مرے قریب
آج سب اپنے گھر رہے، آج سب اپنے گھر گئے

حفظِ حیات کا خیال ہم کو بہت بُرا لگا
پس بہ ہجومِ معرکہ، جان کے بے سپر گئے

مَیں تو صفوں کے درمیاں کب سے پڑا ہوں نیم جاں
میرے تمام جاں نثار، میرے لیے تو مر گئے

رونقِ بزمِ زندگی، طُرفہ ہیں تیرے لوگ بھی
اک تو کبھی نہ آئے تھے، آئے تو رُوٹھ کر گئے

خوش نفسانِ بے نوا بے خبرانِ خوش ادا
تیرہ نصیب تھے مگر، شہر میں نام کر گئے

آپ ہیں جونؔ ایلیا سوچیے اب دھرا ہے کیا
آپ بھی اب سدھاریے آپ کے چارہ گر گئے

کس سے اظہارِ مدعا کیجے
آپ ملتے نہیں ہیں کیا کیجے

آپ تھے جس کے چارہ گر وہ جواں
سخت بیمار ہے، دُعا کیجے

مجھ کو عادت ہے رُوٹھ جانے کی
آپ مجھ کو منا لیا کیجے

ملتے رہیے اسی تپاک کے ساتھ
بیوفائی کی اِنتہا کیجے

ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے اسے خفا کیجے

ہے تقاضا مری طبیعت کا
ہر کسی کو چراغ پا کیجے

کوہکن کو ہے خودکشی خواہش
شاہ بانو سے اِلتجا کیجے

رنگ ہر رنگ میں ہے داد طلب
خون تھوکوں تو واہ وا کیجے

ہے تو بارے یہ عالمِ اسباب
بے سبب چیخنے لگا کیجے

نطق، حیوان پر گراں ہے ابھی
گفتگو کم سے کم کیا کیجے

جونؔ ایلیا



ہم نے شکست کھا کے بھی ذکرِ وفا نہیں کیا
خود کو ہلاک کر لیا ، خود کو فدا نہیں کیا

کیسے کہیں کہ اس کو بھی ہم سے کوئی لگاؤ ہے
اس نے تو ہم سے آج تک کوئی گِلہ نہیں کیا

مجھ کو یہ ہوش ہی نہ تھا تو مرے بازوؤں میں ہے
یعنی تجھے ابھی تلک میں نے رہا نہیں کیا

جانے تری نہیں کے ساتھ کتنے ہی جبر تھے کہ تھے
مَیں نے ترے لحاظ میں تیرا کہا نہیں کیا

جو بھی ہو تم پہ معترض اس کو یہی جواب دو
آپ بہت شریف ہیں آپ نے کیا نہیں کیا

تو بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہو غالباً
مَیں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا

ہاں وہ نگاہِ ناز بھی اب نہیں ماجرا طلب
ہم نے بھی اب کی فصل میں شور بپا نہیں کیا

خیرہ سرانِ عشق کا کوئی نہیں ہے جنبہ دار
شہر میں اس گروہ نے کس کو خفا نہیں کیا



عُمر گزرے گی امتحان میں کیا
داغ ہی دیں گے مجھ کو دان میں کیا

میری ہر بات بے اثر ہی رہی
نقص ہے کچھ مرے بیان میں کیا

مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں
یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا

خود کو دُنیا سے مختلف جانا
آ گیا تھا مرے گمان میں کیا

وہ ملے تو یہ پوچھنا ہے مجھے
اب بھی ہُوں مَیں تری امان میں کیا

ہے نسیمِ بہار گرد آلود
خاک اُڑتی ہے اس مکان میں کیا

یُوں جو تکتا ہے آسمان کو تُو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

جونؔ ایلیا



یہ اکثر تلخ کامی سی رہی کیا
محبت زک اُٹھا کر آئی تھی کیا

نہ کژدم ہیں نہ افعی ہیں نہ اژدر
ملیں گے شہر میں اِنسان ہی کیا

میں اب ہر شخص سے اُکتا چکا ہوں
فقط کچھ دوست ہیں اور دوست بھی کیا

یہ ربطِ بے شکایت اور یہ میں!
جو شے سینے میں تھی وہ بجھ گئی کیا

محبت میں ہمیں پاسِ انا تھا
بدن کی اشتہا صادق نہ تھی کیا

نہیں ہے اب مجھے تم پر بھروسا
تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی کیا

جوابِ بوسہ سچ، انگڑائیاں سچ
تو پھر وہ بیوفائی جھوٹ تھی کیا

شکستِ اعتمادِ ذات کے وقت
قیامت آ رہی تھی، آ گئی کیا؟



ایک ہی مژدہ صبح لاتی ہے
صحن میں دھوپ پھیل جاتی ہے

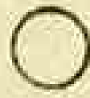
کیا سِتم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

سوچتا ہُوں کہ اس کی یاد آخر
اب کِسے رات بھر جگاتی ہے

اُس وفا آشنا کی فرقت میں،
خواہشِ غیر کیوں ستاتی ہے

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اِک چیز ٹوٹ جاتی ہے

سیف زلفی



سائے جو سنگِ راہ تھے، رستے سے ہٹ گئے
دل جل اُٹھا تو خود ہی اندھیرے سمٹ گئے

دن بھر جلے جو دھوپ کے بستر پہ، دوستو
سُورج چھپا تو چادرِ شب میں سمٹ گئے

وہ کرب تھا کہ دل کا لہُو آنچ دے اُٹھا
ایسی ہوا چلی کہ گریبان پھٹ گئے

وہ فکر تھی کہ دیدہ و دل مضمحل ہوئے
وہ گرد تھی کہ گھر کے در و بام اَٹ گئے

آئی جو موج، پاؤں زمیں پر نہ جم سکے
دریا چڑھا تو کتنے سفینے اُلٹ گئے

پھیلا غبارِ غم تو کہیں مُنہ چھپا لیا
آندھی اُٹھی تو گھر کے ستوں سے لپٹ گئے

کہتے تھے جس کو قرب، وہی فاصلہ بنا
بدلا جو رُخ ندی نے، کئی شہر کٹ گئے

گمنام تھے، تو سب کی طرف دیکھتے تھے ہم
شہرت ملی تو اپنی خودی میں سمٹ گئے

دستک ہوئی تو دل کا دریچہ نہ کھُل سکا
آئے اور آ کے یاد کے جھونکے پلٹ گئے

میں خود ہی اپنی راہ کا پتھر بنا رہا
ہر چند آپ بھی مرے رستے سے ہٹ گئے

دل کو کسی کی یاد کا غم چاٹتا رہا
یوں میری زندگی کے کئی سال گھٹ گئے

زندانِ غم کا دھیان بھی خنجر سے کم نہ تھا
زنجیر کی کھنک سے مرے پاؤں کٹ گئے

رِستے رہیں گے دیدۂ حسرت سے عمر بھر
زلفی جو زخم پائے طلب سے چمٹ گئے

سیف زلفی



کیوں جل بجھے، کہیں تو گرفتار بولتے
زنداں میں چپ رہے تو سرِ دار بولتے

گھر گھر یہاں تھا گوش برآواز دیر سے
آتی صدا تو سب در و دیوار بولتے

ہوتا تمہارے خون کا دریا جو موجزن
طوفاں سمندروں میں، بیک بار بولتے

دیتا تمہارا نطق دُہائی تو فطرتاً
لوح و قلم کے بام سے فنکار بولتے

تم بولتے اگر تو تمہاری ندا کے سا تھ
بستی کے سارے کوچہ و بازار بولتے

اب خلوتوں میں شور مچانے سے فائدہ
تھا حوصلہ تو بر سرِ دربار بولتے

دستِ خزاں تھا، خانہ برانداز جس گھڑی
کیوں گنگ تھے چمن کے پرستار بولتے

سورج نے کتنے جسم جلائے ہیں راہ میں
اتنا تو زیرِ سایۂ دیوار بولتے

لاتا وفا کی جنس جو بازار میں کوئی
بولی، بقدرِ ظرف، خریدار بولتے

زلفی گلی گلی میں مچلتا نیا لہو
آتا وہ سیلِ رنگ کہ گلزار بولتے

سیف زلفی



اوڑھی ردائے درد بھی، حالات کی طرح
تاریکیوں میں ڈوب گئے، رات کی طرح

شیوہ نہیں کہ شعلۂ غم سے کریں گریز
ہر زخم ہے قبول، نئی بات کی طرح

نیند آ رہی ہے کرب کی آغوش میں مجھے
سینے پہ دستِ غم ہے ترے ہات کی طرح

میں اپنے آپ سے کبھی باہر نہ آ سکا
اُلجھا رہا ہوں خود میں خیالات کی طرح

حیران ہوں کہ خود کو بھی پہچانتا نہیں
جذبے بدل رہے ہیں رسومات کی طرح

وہ دوڑ ہے کہ اپنی ہوا بھی نہ چھو سکوں
اُڑتی ہے میری فکر بھی لمحات کی طرح

کیا گُل کھلائے میری اُداسی کی لہر نے
ذہنوں کے رنگ زار میں برسات کی طرح

کیا بستیوں کا ذکر کہ احساس کی تپش
جنگل جلا گئی، مرے جذبات کی طرح

کیا خوب آشنا ہیں کہ پہچانتے نہیں
جب بھی ملے تو پہلی ملاقات کی طرح

دُنیا کا درد اپنے دکھوں میں سمیٹ کر
محسوس کر رہا ہوں غمِ ذات کی طرح

احباب کس خلوص سے، زلفی، مری غزل
رکھتے ہیں دل کے طاق میں سوغات کی طرح



یادوں کی گونج ذہن سے باہر نکالئے
گنبد نہ چیخ اُٹھے، کوئی در نکالئے

کھُل جائیے برستے ہوئے ابر کی طرح
جو چیز دل میں ہے اُسے باہر نکالئے

بن کر دکھائیے کسی بہزاد کا جواب
پتھر تراش کر کوئی پیکر نکالئے

رکھئے شناوری کا بھرم کچھ نہ کچھ ضرور
موتی نہ ہاتھ آئے تو پتھر نکالئے

منظور ہے غرورِ خزاں کی اگر شکست
گلشن سے رنگ و نور کے لشکر نکالئے

قادر ہے بحر و بر پہ جو انساں، تو آپ بھی
خط کھینچ کر زمیں سے سمندر نکالئے

رکھئے بعزمِ خاص رہِ زیست میں قدم
منزل بڑی کٹھن ہے مگر ڈر نکالئے

دشمن بھی تیر جوڑ کے بیٹھا ہے گھات میں
خندق سے دیکھ بھال کے اب سر نکالئے

پھر دوست کو لگائیے، دل سے بصد خلوص
پھر اپنی آستین سے خنجر نکالئے

پھر چھا رہی ہے دجلۂ مہتاب پر گھٹا
اس تیرگی سے پھر کوئی منظر نکالئے

جو ہو سکے، تو وقت کی زنجیر توڑ کر
شام و سحر کا پاؤں سے چکر نکالئے

زلفی گلی میں آج بہت تیز ہے ہوا
اس کاغذی بدن کو نہ باہر نکالئے

سیف زلفی



دل کے شجر کو خوں سے گلنار دیکھ کر
خوش ہوں نئی بہار کے آثار دیکھ کر

صحرا بھلے کہ ذہن کو کچھ تو سکوں ملے
گھبرا گیا ہوں شہر کے بازار دیکھ کر

آگے بڑھے تو تیرگیٔ شب نے آلیا
نکلے تھے گھر سے صبح کے آثار دیکھ کر

آنسو گرے تو دل کی زمیں اور جل اٹھی
برسا ہے ابر، خاک کا معیار دیکھ کر

سارے جہاں کو حلقۂ ماتم سمجھ لیا
اپنا وجود نقطۂ پرکار دیکھ کر

اوروں کو تو نے دولتِ کونین بانٹ دی
غم مجھ کو دے دیا ہے سزاوار دیکھ کر

بیٹھے تو آنچ دینے لگی پیپلوں کی چھاؤں
آئے تھے لوگ، سایۂ اشجار دیکھ کر

جس طرح کوئی بچھڑا ہوا دوست مل گیا
ہم مسکرا دئیے رسن و دار دیکھ کر

بیٹھا ہوں اپنے فکر کے سایہ میں دیر سے
ہر آشنا کو ان کا طرفدار دیکھ کر

زلفی آنکھوں کی دھوپ میں جلتے ہوئے بدن
بادل گزر گیا ہے کئی بار، دیکھ کر



اتنے دکھی ہیں ہم کہ مسرت بھی غم بنے
امرت ہمارے ہونٹ سے مس ہو تو سم بنے

روئے برنگِ ابر فرشتے بھی گوندھ کر
کس دشتِ اشک و آہ کی مٹی سے ہم بنے

کچھ اور بھی تو شیش محل راستے میں تھے
کیوں ہم فقط نشانۂ سنگِ ستم بنے

آنکھوں کے سامنے ہے شکستہ درِ سکوں
ہم تک رہے ہیں دیر سے، تصویرِ غم بنے

برسے ہیں دشتِ زیست میں ہم پر وہ سنگ و خشت
یک جا سمٹ کے آئیں تو کوہِ الم بنے

لہجے کے بانکپن میں چھپاتے ہیں دل کا سوز
ہم ایسے رکھ رکھاؤ کے فنکار کم بنے

جو داستاں مٹائی، زیادہ لکھی گئی
جتنے ہمارے ہاتھ تراشے، قلم بنے

زلفی، وہ سرزمیں کہ جہاں دفن ہے شکیب
وہ کیوں نہ اہلِ فن کے لئے محترم بنے

سیف زلفی



اب کیا گلہ کریں کہ مقدر میں کچھ نہ تھا
ہم غوطہ زن ہوئے تو سمندر میں کچھ نہ تھا

دیوانہ کر گئی تری تصویر کی کشش
چوما جو پاس جا کے تو پیکر میں کچھ نہ تھا

اپنے لہو کی آگ ہمیں چاٹتی رہی
اپنے بدن کا زہر تھا، ساغر میں کچھ نہ تھا

دیکھا تو سب ہی لعل و جواہر لگے مجھے
پرکھا جو دوستوں کو تو اکثر میں کچھ نہ تھا

سب رنگ، سیلِ تیرگیٔ شب سے دھل گئے
سب روشنی کے عکس تھے، منظر میں کچھ نہ تھا

یارو، وہ بانکپن سے تراشا ہوا بدن
فن کار کا خیال تھا، پتھر میں کچھ نہ تھا

دھرتی ہلی تو شہر زمیں بوس ہو گئے
دیکھا جو آنکھ کھول کے پل بھر میں کچھ نہ تھا

وہ رت جگے، وہ جشن، جو بستی کی جان تھے
یوں سو گئے کہ جیسے کسی گھر میں کچھ نہ تھا

زلفی، ہمیں تو جرأتِ پرواز لے اُڑی
ورنہ ہمارے زخم زدہ پر میں کچھ نہ تھا



لہجے کا رنگ، لفظ کی خوشبو بھی دیکھ لے
آ، مجھ سے کر کلام، مجھے تو بھی دیکھ لے

میں چودھویں کا چاند، سمندر ترا بدن
میری کشش کا بولتا جادو بھی دیکھ لے

کھلتا ہوں تیرے رُخ کی سجل چاندنی کے پاس
پہچان لے مجھے، مری خوشبو بھی دیکھ لے

تُو خارزار اور میں ابرِ برہنہ پا
میرے سفر کا کرب کبھی تو بھی دیکھ لے

اک شب ردائے ابر سے باہر نکل کے آ
کس کس کو ہے نگاہ پہ قابو بھی دیکھ لے

میرے لہو کی گونجتی فریاد پر نہ جا
آنکھوں میں اپنی، تیرتے آنسو بھی دیکھ لے

منزل پہ صرف چلتے ہوئے چاند ہی نہ دیکھ
چمکے کہیں جو راہ میں جگنو بھی، دیکھ لے

دستِ صبا کی ٹھیری ہوئی لوریوں سے بچ
دشتِ وفا میں چلتی ہوئی لُو بھی دیکھ لے

گھیرے ہیں آسماں نے، تجھے لے لیا تو کیا
اس دام سے فرار کا پہلو بھی دیکھ لے

سچائی کا علَم تو اُٹھاتا تو ہے، مگر
کٹتے ہیں اس جہاد میں بازو بھی، دیکھ لے

برہم ہے روز و شب کا مزاج، سکوں پسند
بکھرا دیئے ہیں وقت نے گیسو بھی، دیکھ لے

گنجان پانیوں پہ برسنے سے فائدہ!
اے ابر، تشنگانِ لبِ جُو بھی دیکھ لے

زلفی جو میرے طرزِ ادا کا اسیر ہے
وہ کاش میرے شعر کا جادو بھی دیکھ لے

سیف زلفی



اشکوں میں قلم ڈبو رہا ہے
فن کار، جوان ہو رہا ہے
مقتل کے دکھا رہا ہے منظر
کاغذ کو لہو سے دھو رہا ہے
ظالم کو سکھا رہا ہے انصاف
پتھر میں درخت بو رہا ہے
پربت سے لڑا رہا ہے آنکھیں
مٹی سے طلوع ہو رہا ہے
ہاری ہوئی رات کا سویرا
غنچوں کی جبیں بھگو رہا ہے
ذرے کو بنا کے ایک "قوت"
خود اپنا مقام کھو رہا ہے
لوہے کو اجل کی دھار دے کر
خود اس کا شکار ہو رہا ہے
محلوں میں نہیں کسی کو آرام
فٹ پاتھ پہ کوئی سو رہا ہے
چھوتا نہیں ڈر سے پھول کوئی
کانٹوں کو کوئی پرو رہا ہے
خنداں ہیں، گلی گلی ستارے
گھر گھر کا چراغ رو رہا ہے
سینے میں کوئی خیال زلفی
سوئیاں سی چبھو چبھو رہا ہے



تنہائی کے شعلوں پہ مچلنے کے لئے تھا
کیا مجھ سا جواں، آگ میں جلنے کے لئے تھا
کیا کاتبِ تقدیر سے زخموں کی شکایت
جو تیر تھا ترکش میں، سو چلنے کے لئے تھا
جلتا ہے میرے دل میں پڑا داغ کی صورت
جو چاند سرِ عرش نکلنے کے لئے تھا
اس جھیل میں تجھ سے بھی کوئی لہر نہ اٹھی
اور تو مری تقدیر بدلنے کے لئے تھا
مایوس نہ جا، اے غمِ دوراں مرے نزدیک
تو ہی مری بانہوں میں مچلنے کے لئے تھا
یہ ڈستی ہوئی رات گزر جائے گی یارو
وہ ہنستا ہوا دن بھی تو ڈھلنے کے لئے تھا
کچھ آنچ میرے لمس کی گرمی سے بھی پہنچی
وہ برف سا پیکر بھی پگھلنے کے لئے تھا
تفریق نے ملکوں کی تراشے ہیں عقائد
انساں بس اک راہ پہ چلنے کے لئے تھا
زندہ ہے مری فکر، مرے کرب سے زلفی
یہ پھول اسی شاخ پہ پھلنے کے لئے تھا

خلیل رامپوری



کیا بتلاؤں، کیسے دن میں کاٹ رہا ہوں
موتی ہوں اور رستے میں بیکار پڑا ہوں

لمبی لمبی کاروں والوں سے اچھا ہوں
روکھی سوکھی جو ملتی ہے، کھا لیتا ہوں

تنہائی میں اکثر میں سوچا کرتا ہوں
سورج چاند ستارے کیا ہیں اور میں کیا ہوں

بادل، پربت، دریا، چشمے، جنگل، صحرا
کیوں بھاتے ہیں، میں ان سب کا کیا لگتا ہوں

آگ اور پانی میں، کہتے ہیں، بیر بڑا ہے
لیکن میں تو اس سے مل کر خوش ہوتا ہوں

اتنی نفرت، یارو، مجھ سے کیوں کرتے ہو
میں بھی گلشن کا اک گل ہوں، تم جیسا ہوں

میرے چاہنے والوں کا بھی اک حلقہ ہے
میں بھی گلزاروں کی وادی کا جھرنا ہوں

میرے چال چلن سے بھی کچھ حاصل کر لو
میں بھی اک اوتار کا سا درجہ رکھتا ہوں

ایک ہی منظر نے آنکھوں کو ڈھانپ رکھا ہے
روزِ اوّل سے یہ سورج دیکھ رہا ہوں

خود سے جب باتیں کرنے کو جی چاہا ہے
گھر سے اُٹھ کر ندی کنارے جا بیٹھا ہوں

میرے حال سے دنیا کا اندازہ کر لو
میں پھلدار شجر کا اک پیلا پتا ہوں

دھیان کو، تنہائی کے گھر کا پیڑ سمجھیے
میں بھی اس کے سائے میں برسوں بیٹھا ہوں

جانے کس پل کی خوشبو ہے میرے آگے
جانے کس دُنیا کے پیچھے دوڑ رہا ہوں

کیسے کیسے لوگ گزرتے ہیں نظروں سے
سارا دن میں کیسے کیسے دُکھ سہتا ہوں

میرے خد و خال کو دیکھو اور پہچانو
میں بھی اپنی عمرِ فانی کا کتبہ ہوں

بس کے پہیے خاک اڑا جاتے ہیں مجھ پر
وہ کیا جانیں، کون ہوں اور کس کا چہرہ ہوں

اتا پتا کیا پوچھ رہے ہو میرا لوگو
رامپوری شاعر ہوں اور غزلیں کہتا ہوں

خلیل رامپوری



کب تلک شادابیٔ فکر و نظر کام آئے گی
گیلے کپڑے سے ہوا پانی اُڑا لے جائے گی

بھاگتے گھوڑے کی راسیں کھینچنے سے فائدہ!
ڈوبتے سورج کی کیا رفتار کم ہو جائے گی؟

ذہن پر پھیلا رکھے ہیں جھینگروں نے دائرے
آج جو بھی بات سوچوں گا، مجھے الجھائے گی

تک رہے ہیں کس کی جانب نجم، خیمے گاڑ کر
دھوپ نکلے گی تو پہلے میرے گھر میں آئے گی

کھل اٹھا ہوں آج میں بھی اس کی صورت دیکھ کر
یہ گھڑی جب آئے گی، مجھ کو یونہی جھکائے گی

فصل سُورج میں اُگی ہے، تمتماتی ہے زمیں
یہ کہانی پیار کرنے سے سمجھ میں آئے گی

جسم کی پُتلی کو روشن کر کے، دنیا سے گزر
آنکھ خواہش کی نظر رکھتی ہے، دھوکا کھائیگی

زرد پتے کی طرح بے گھر پڑا ہوں راہ میں
زرد پتے کو، کوئی شاخِ ہوا اپنائے گی

سپّیوں کی تہہ میں موتی، پانیوں پر دائرے
سوچتا ہوں، کونسی دولت مرے ہاتھ آئے گی

ساتھ لیتی جا ہمیں بھی، ڈوبتے سورج کی دھوپ!
رات کے غاروں میں تیری یاد ہم کو آئے گی

وہ بھی خوشبو کی طرح خود سے الگ رہنے لگا
جانے یہ موجِ خیال اس کو کہاں لے جائے گی

کھل رہی ہے خواہشوں کی دھوپ سارے جسم میں
آنکھ کھولوں گا تو یہ تصویر بھی کھو جائے گی

بستیوں میں، جنگلوں میں، وادیوں میں، کوہ میں
میری خوشبو، میری دھڑکن، میری آہٹ جائیگی

کتنی تصویریں مرے اندر سے اُبھریں گی خلیلؔ
جب تری آواز کانوں سے مرے ٹکرائے گی

خلیلؔ رامپوری



نقش وہ آنکھ میں اُترا تھا کہ جاتا ہی نہ تھا
میں نے اُس دھوپ کو ڈھلتے کہیں دیکھا ہی نہ تھا

روح کی پیاس بجھائے نہ بجھے گی، کیسی ڈھنگ
مجھ کو اس دشت کی پہنائی میں اگنا ہی نہ تھا

پہلے اس گھر کی ہر اک کھڑکی کھلی رہتی تھی
یوں ملا کرتے تھے جیسے کوئی پردا ہی نہ تھا

اب جو انسان ہواؤں میں اڑا پھرتا ہے
یہ کبھی پیڑ کے سائے سے نکلتا ہی نہ تھا

دوڑ پڑتا تھا جہاں ریت سے جلتے تھے قدم
ساتھ دریا تھا مگر ڈر سے اترتا ہی نہ تھا

ایسی سردی میں وہاں جا کے کہاں سستاتے
پار ندی کے، کوئی دھوپ کا خیمہ ہی نہ تھا

رات کا پیڑ اگا تھا کہ کوئی سایہ تھا
کیا کہوں ہاتھ لگا کر اسے دیکھا ہی نہ تھا

کتنے آزاد تھے برسات کے خود رو نالے
اپنی دنیا تھی، کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا

حادثہ ایسا بھی پیش آئے گا — مر جاؤں گا
خواب ایسا تو کبھی عمر میں دیکھا ہی نہ تھا

شاعری نے مجھے انسان بنایا ہے خلیلؔ
میں وہ شیشہ تھا کہ دنیا سے چمکتا ہی نہ تھا



وہ دھول جھاڑ رہا ہے، ردا کی چادر سے
جدا ہوا کبھی سایہ بھی اپنے پیکر سے!

میری نظر سے زیادہ چمک رہی ہے ریت
نکل رہا ہے نہا کر کوئی سمندر سے

میں آب خاک کے سینے میں لے رہا ہوں سانس
تمام رنگ ابھرتے ہیں میرے اندر سے

صدا لگا کہ خموشی کو بھی زباں لگ جائے
تمام دشت مہکتا ہے اک گلِ تر سے

خبر نہیں مری آنکھوں میں رہنے والوں کو
کہ کتنے لوگ ابھی پھر رہے ہیں بے گھر سے

ہوا چلے تو شجر تالیاں بجاتے ہیں
وہ حکم دے تو گرے آبشار پتھر سے

ازل سے شور زمینیں لکھی ہیں قسمت میں
کما رہا ہوں میں رزقِ حلال پتھر سے

میں لے رہا ہوں قلم سے سخنوروں کا کام
ہوائیں کاٹ رہا ہوں ہنر کے خنجر سے

کہاں سے آ گئے یہ لفظوں کے آئینوں میں عکس
خلیلؔ بول رہا ہے کوئی تو اندر سے

خلیل رامپوری



برف پتوں پہ جمی ہے، جسم جلتا ہے مرا
کوئی منظر دیکھ لوں تو دل پگھلتا ہے مرا

ذہن سوچوں کے نگر میں گم ہے، خامہ ہاتھ میں
دیکھئے احساس کس پیکر میں ڈھلتا ہے مرا

روح کا رشتہ کہوں اس کو کہ اپنی بزدلی
کودتا ہے وہ کنوئیں میں، دل اچھلتا ہے مرا

شعر وہ پڑھتا ہے لیکن دیکھتے ہیں مجھکو لوگ
جیسے اس قندیلِ تن میں تیل جلتا ہے مرا

جھانکتا ہے چاند جب کمرے میں روشندان سے
کیا کہوں، وہ کون ہے جو دل مسلتا ہے مرا

زندگی دینا نہ دینا بس اسی کے ہاتھ ہے
اپنی شہرت کے لئے وہ دل بدلتا ہے مرا

بولتے چہروں کی صحبت چاہئے مجھکو خلیلؔ
جی کہیں سادہ لفافوں سے بہلتا ہے مرا



روشنی لے کر اندھیری رات میں نکلا نہ کر
رات پردے کے لئے، خود کو بے پردا نہ کر

دہر کا پھیلاؤ بھی، نقطہ نظر آنے لگے
شعر کہتا ہے تو کہہ، اتنا مگر سوچا نہ کر

ایک دن تو بھی کسی تارے سے ٹکرا جائے گا
دوست میرے، رات کی گلیوں میں یوں گھوما نہ کر

چاند بھی اترا تھا پچھلی شب، اسی تالاب میں
کیوں چمکتا ہے نہا دھو کر بدن پونچھا نہ کر

آئینہ چمکائے رکھ، سب کچھ نظر آ جائے گا
جسکی چاہت ہو اُسے خود سے جُدا سمجھا نہ کر

دوپہر کی لہر چہرے کو جھلس دے گی خلیلؔ
گھر کی ٹھنڈک چھوڑ کر پیڑوں تلے بیٹھا نہ کر



رات کھڑی ہے، سر پہ سنہرے دیوں کا تھال لیئے
اے من، تو بھی عمر بِتا دے نقشِ خیال لیئے

لمحے، یہ بے رنگ پتنگے، کب آتے ہیں ہاتھ
سارا سارا دن پھرتا ہے سورج، جال لیئے

پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی ہیں شام کے دامن میں
کون کھڑا ہے نارنگی سا چہرہ ــــ لال لیئے

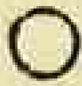
آج سمجھ میں آیا اپنی آنکھوں کا مفہوم
ہر انسان ہے صورت پہ دو زخمِ ملال لئے

اُجلی چاندنی رات سی آنکھیں، اُجلا دھوپ سا مکھ
ہائے رے وہ ہرنی سی لڑکی، شوقِ وصال لیئے

گھر والوں سے توڑ کے ناتا کس نے پایا سکھ
کہاں پھرو گے شاعر صاحب دستِ سوال لئے

گلزاروں میں بسنے والے! جھگر دیس بھی دیکھ
تھل کا ریگستان بھی ہے گدڑی میں لعل لیئے

آج تلک اس عورت سے آتا ہے خوف، خلیلؔ
گھر میں اکدن گھس آئی تھی، بکھرے بال لیئے



ہرا بھرا تھا کبھی جھاڑ سا بدن میرا
کہ آئینوں میں جھلکتا تھا بانکپن میرا

چراغ لے کے مجھے ڈھونڈنے نکلتا تھا
مرے بغیر نہ رہتا تھا، ہم سخن میرا

سیاہیوں کے بھنور سے نکل کے آیا ہوں
دُھلا رہی ہے اجالوں سے منہ، کرن میرا

سیاہ پھول کھلا دُھوپ کی منڈیروں پر
ہوا میں ٹانگ دیا کس نے پیرہن میرا

میں ریگ زار پہ لکھی ہوئی عبارت ہوں
ہوا چلے گی تو اڑ جائے گا بدن میرا

بلا رہی ہے مجھے برف سے ڈھکی چوٹی
پڑا ہوا ہے چٹانوں کے گھر کفن میرا

شمار ہونے لگے موتیوں میں کنکر بھی
خلیلؔ کام تو آیا کسی کے، فن میرا



آنکھوں کے آئینوں میں توانائی آئے گی
دیکھے گا سبز کھیت تو بینائی آئے گی

پائے گا خوشبوؤں سے زمینوں کے بھید بھی
اک روز تیرے کام شناسائی آئے گی

پیڑوں کی چھاؤں چھوڑ، کسی آب جو پہ بیٹھ
تجھ میں نہیں تو عکس میں رعنائی آئے گی

دنیا کی سیر کر کے نکھر جائے گا خیال
تازہ ہوا لگے گی تو دانائی آئے گی

ہر نقش آب و خاک کا دل میں اتار لے
فنکار ہے تو طاقتِ گویائی آئے گی

شاعر کی طرح ڈول رہا ہے خلاؤں میں
لوگوں میں بیٹھ، انجمن آرائی آئے گی

اندھوں کے اس نگر میں بینے کی مثال بن
صحرا میں گل کھلے گا تو یکتائی آئے گی

شفاف پانیوں کی طرح زندگی گزار
سورج کی طرح تجھ میں توانائی آئے گی

گھر میں دیا جلا کے گئے بولتا ہوا
دیوار و در پہ زینت و زیبائی آئے گی

سایہ بھی تیرا، تجھ کو کہیں چھوڑ جائے گا
آئی بھی تیرے کام تو تنہائی آئے گی

گرمی بہت ہے آج، کھلا رکھ مکان کو
اس کی گلی سے رات کو پروائی آئے گی

کافی ہے جو غزل کہی بیٹھے، کہہ لیا خلیل
آگے قدم رکھے گا تو گہرائی آئے گی



نام اس اللہ کے بندے کا بھی رسوائی میں ہے
جو سمندر کی طرح سے اپنی گہرائی میں ہے

شاخ سے پتہ بھی اڑتا ہے پرندے کی طرح
زندگی کی کوئی چنگاری تمنائی میں ہے

دھوپ کا دریا امڈ آتا ہے، جب چڑھتا ہے دن
کوئی ایسی لہر کیا اس کی بھی انگڑائی میں ہے

جب ہواؤں میں اڑے گا، سب پتہ لگ جائیگا
جھیل نیلے آسماں کی، کتنی گہرائی میں ہے

چھوڑ جاتی ہے، ہوا بھی نقش اپنے خاک پر
سوچتا ہوں، تو کہاں پر جلوہ آرائی میں ہے

ڈوب جاتے ہیں مناظر، ڈوبتے سورج کے ساتھ
سچ کہا کرتا تھا وہ، بھائی کی جاں بھائی میں ہے

لہلہاتی خاک کو دیکھا تو کیا دیکھا میاں
اس کو دیکھا چاہیئے جو اس کی رعنائی میں ہے

کوئی دروازے کی دستک کان میں پڑتی نہیں
بت بنا بیٹھا ہوں گھر میں، دھیان تنہائی میں ہے

گھیرے رہتا ہے مجھے لوگوں کی آوازوں کا شور
وہ اکیلا دیکھ کر کہتے ہیں — تنہائی میں ہے

اڑتے طیارے کی کھڑکی سے ذرا سا جھانک لے
اتنے ہنگاموں بھری دنیا بھی تنہائی میں ہے

ہم کسی شیشے کو اپنے منہ سے پتھر کیوں کہیں
جس کا جو کردار ہے وہ اس کی گویائی میں ہے

دوستو کیا پوچھتے ہو حال اس کے گاؤں کا
آئینہ لپٹا ہوا تالاب کی کائی میں ہے

اٹھ رہی تھیں دور تک پانی کی دیواریں خلیل
ہم یہ سمجھے نقص کوئی اپنی بینائی میں ہے

انور شعور



جو سنتا ہوں لکھوں گا میں، جو کہتا ہوں سنوں گا میں
ہمیشہ مجلسِ نطق و سماعت میں رہوں گا میں

نہیں ہے تلخ گوئی شیوۂ سنجیدگاں لیکن
وہ مجھ کو گالیاں دیں گے تو کیا چپ سادھ لوں گا میں

کم از کم گھر تو اپنا ہے، اگر ویران بھی ہو گا
تو دہلیز و در و دیوار سے باتیں کروں گا میں

بس اتنا علم کافی ہے کہ کیا تھا اور اب کیا ہوں
نہیں ہے مجھ کو یہ تشویش، آگے کیا بنوں گا میں

مری آنکھوں کا سونا خواہ مٹی میں بکھر جائے
اندھیری رات! تیری مانگ میں افشاں بھروں گا میں

تساہل ایک مشکل لفظ ہے، اس لفظ کا مطلب
کتابوں میں کہاں ڈھونڈوں، کسی سے پوچھ لوں گا میں

نزولِ آگہی کے وقت کاش اتنی خبر ہوتی
کہ یہ وہ آگ ہے جس آگ میں زندہ جلوں گا میں

کوئی ایک آدھ تو ہو گا جو مجھ کو راس آئے گا
بساطِ وقت پر ہیں جس قدر مہرے، چلوں گا میں

نہ لکھ پایا ترے دل میں اگر تحریرِ غم اپنی
ترے ماتھے پہ اک خطِ شکن ہی کھینچ دوں گا میں

کیا ہے گردشوں سے تنگ آ کر فیصلہ میں نے
کہ محنت کے علاوہ چاپلوسی بھی کروں گا میں

اگر اس مرتبہ بھی آرزو پوری نہیں ہو گی
تو اس کے بعد آخر کس بھروسے پر جیوں گا میں

یہی ہو گا کسی دن ڈوب جاؤں گا سمندر میں
تمناؤں کی خالی سیپیاں کب تک چنوں گا میں

انور شعور

نہ سہہ سکوں گا غمِ ذات گو اکیلا میں
کہاں تک اور کسی پر کروں بھروسا میں

ہُنر وہ ہے کہ جیوں چاندنی کے آنکھوں میں
رہوں دلوں میں قیامت کی طرح برپا میں

وُہ رنگ رنگ کے چھینٹے پڑے کہ اسکے بعد
کبھی نہ پھر نئے کپڑے پہن کے نکلا میں

نہ صرف یہ کہ زمانہ ہی مجھ پہ ہنستا ہے
بنا ہوا ہوں خود اپنے لئے تماشا میں

مجھے سمیٹنے آیا بھی تھا کوئی؟ جس وقت
دیار و دشت و دمن میں بکھر رہا تھا میں

نہ میں کسی کے لیے ہوں، نہ کوئی میرے لیے
یہ زندگی ہے تو کیا میری زندگی، کیا میں

یہ کس طرح کی محبت تھی، کیسا رشتہ تھا
کہ ہجر نے نہ رلایا اُسے، نہ تڑپا میں

پڑا رہوں نہ قفس میں تو کیا کروں آخر
کہ دیکھتا ہوں بہت دُور تک دُھندلکا میں

ہو زندگی میں اگر کوئی کام جیسا کام
تو جی چراؤں، ہوں ایسا ہی کیا نکما میں

مآل تھا یہی آوارگی تو آخر کیوں
اُسی کے ساتھ نہ ہر مرحلے سے گزرا میں

بہت ملول ہوں لے صورت آشنا، تجھ سے
کہ تیرے سامنے کیوں آ گیا سراپا میں

یہی نہیں کہ تجھی کو نہ تھی اُمید ایسی
مجھے بھی علم نہیں تھا کہ یہ کروں گا میں

تری زباں نہ کھلی تھی تو آنکھ تو اُٹھتی
سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا مگر سمجھتا میں

اب اس قدر نہ ستاؤ کہ سانس اکھڑ جائے
بساط سے کہیں بڑھ کر ہُوا ہوں رُسوا میں

میں خاک ہی سے بنا تھا تو کاش یوں بنتا
کہ اُس کے ہاتھ سے گرتے ہی ٹوٹ جاتا میں

انور شعور

ٹوٹا طلسمِ وقت تو کیا دیکھتا ہوں مَیں
اب تک اسی جگہ پہ اکیلا کھڑا ہوں مَیں

یہ کشمکش الگ ہے کہ کس کشمکش میں ہوں
آتا نہیں سمجھ میں، بہت سوچتا ہوں مَیں

میں اہل تو نہیں ہوں کہ دیکھے کوئی مگر
دُنیا! مجھے بھی دیکھ، ترا آئینہ ہوں مَیں

اکثر غرورِ فکر جب اترا دماغ سے
مَیں دنگ رہ گیا کہ یہ کیا لکھ گیا ہوں مَیں

میرا کلام وحی نہیں ہے تو پھر مجھے
یہ زعم کیوں نہ ہو کہ خود اپنا خدا ہوں مَیں

مجھ سے نہیں، اسے مرے فردا سے ہے امید
منزل ہے کوئی اور فقط راستہ ہوں مَیں

کیا فائدہ مجھے، جو پلٹ کر جواب دوں
اپنے لئے کہاں ہوں، بُرا یا بھلا ہوں مَیں

غافل اب اور کیا ہوں کسی سے کہ عمر بھر
آوارگی کی گود میں سوتا رہا ہوں مَیں

کیا یہ جگہ ہے؟؟ جس کی تمنا میں آج تک
دن رات، شہر شہر، بھٹکتا پھرا ہوں مَیں

مشعل بدست گھومتے گزری ہے ایک عمر
اَب کس کے انتظار میں ٹھہرا ہوا ہوں مَیں

کچھ دنوں اپنے گھر رہا ہوں مَیں
اور پھر در بہ در رہا ہوں مَیں

دوسروں کی خبر تو کیا لیتا
خود سے بھی بے خبر رہا ہوں مَیں

وقت گو ہمسفر نہ تھا میرا
وقت کا ہم سفر رہا ہوں مَیں

زینۂ ذات کا سفر اور رات
دھیرے دھیرے اتر رہا ہوں مَیں

یک بہ یک کس طرح بدل جاؤں
رفتہ رفتہ سدھر رہا ہوں مَیں

تو بھی دیکھے تو اجنبی جانے
اب کے وہ سوانگ بھر رہا ہوں مَیں

بے حقیقت ہے شورِ شہر کہ اب
گنگناتا گزر رہا ہوں مَیں

آگ ہے اور سنگ ہی ہے حیات
راکھ ہوں اور بکھر رہا ہوں مَیں

انور شعور



کچھ دن تو کر تعاون، اے خوش صفات مجھ سے
تنہا نہ ہو سکے گی تطہیرِ ذات مجھ سے

فریاد اے سماعت! انصاف اے فراست!
کرتے ہیں اہلِ دنیا، دنیا کی بات مجھ سے

حیران ہوں کہ اس تک کس کس جہت سے پہنچوں
آوارگی طلب ہیں صدہا جہات مجھ سے

کیوں اے حیاتِ رفتہ، روکے ہوئے ہے رستہ؟
کیا چاہتی ہے آخر اے بے ثبات! مجھ سے

یونان کے سخن تو تمخاب نذر کر دیں
باقی عزیز رکھیں اہلِ فرات مجھ سے

گردش میں ہیں ستارے، ہے کوئی جو پکارے؟
آ لے غریب کوچہ، بے جا زکوٰۃ مجھ سے

وا ہے دریچۂ دل، اک چیخ بن کے در آ
سرگوشیاں کہاں تک، اے سرد رات مجھ سے



اکیلے کیا پسِ دیوار و در گئے ہم تم
سگانِ خفتہ کو ہشیار کر گئے ہم تم

قدم قدم پہ عجب بے حیا لگا ہوں کا
حصار سا نظر آیا جدھر گئے ہم تم

گلوں نے خوب پذیرائی کی کہ بھولے سے
کسی چمن میں نہ بارِ دگر گئے ہم تم

امیدِ وصل کے دن کٹ گئے بھٹکنے میں
نہ ہوٹلوں پہ یقیں تھا، نہ گھر گئے ہم تم

ہوائے دہر نے سہما رکھا تھا کس درجہ
کواڑ بھی کہیں کھڑکا تو ڈر گئے ہم تم

فلک کی دھن تھی مگر فرش پر ہمارے پاؤں
جمے نہ تھے کہ خلا میں بکھر گئے ہم تم

زہے یہ ہمّتِ پرواز بھی مگر اب تو
نشیب میں کئی زینے اتر گئے ہم تم

اسنور شعور

اور نہ دَر بہ دَر پھرا، اور نہ آزما مجھے
بس مرے پردہ دار بس، اب نہیں حوصلہ مجھے

سخت نظر فریب ہے آئینہ خانۂ جمال
اس کی چمک دمک دیکھ، دیکھ بجھا بجھا مجھے

حبس ہجوم خلق سے گھٹ کے الگ ہُوا تو ہیں
قطرہ بہ سطح بحر تھا، چاٹ گئی ہوا مجھے

صبر کرو محاسبو، وقت تمہیں بتائے گا
دہر کو میں نے کیا دیا، دہر سے کیا ملا مجھے

تیرے ہی مصر کا ملال، تیرے ہی نجد کا خیال
شہر بہ شہر، کُو بہ کُو، گام بہ گام تھا مجھے

کارگہِ بقا مجھے ذات وحیات وکائنات
ذات وحیات وکائنات، دائرۂ فنا مجھے

ذات وحیات وکائنات بے سروپا، بے ثبات
بے سروپا و بے ثبات شے سے اُمید کیا مجھے

رات لغات عمر سے میں نے چنا تھا ایک لفظ
لفظ بہت عجیب تھا، یاد نہیں رہا مجھے

جو نہ سنا تھا دہر سے اس کی زباں سے سن لیا
اب مجھے کوئی کچھ کہے، فکر نہیں ذرا مجھے

فن کو سمجھ لیا گیا محض عطیۂ فلک
سعی و ریاض کا صلہ خوب دیا گیا مجھے

میں وہ نہیں کہ دوست کا نام ہی سن کے جھوم اٹھوں
صرف مہک گلاب کی کچھ نہیں اے صبا مجھے

محرمِ خاص دیکھنا سو تو نہیں گیا شعورؔ
دیر ہوئی مٹنے ہوئے کوئی نئی صدا مجھے

پیو کہ ماحصلِ ہوش کس نے دیکھا ہے
تمام وہم وگماں ہے تمام دھوکا ہے

نہ کیوں ہو صاحبِ جامِ جہاں نما کو حسد
شراب سے مجھے اپنا سراغ ملتا ہے

کسی نے خواب کے ریزے پلک پلک چن کر
جو شاہکار بنایا ہے، ٹوٹ سکتا ہے

میں انتظار کروں گا اگر مری فریاد
ابھی سکوت بہ گلشن، صدا بہ صحرا ہے

یہی ثواب ہے کیا کم مری ریاضت کا
کہ ایک خلق ترے نام سے شناسا ہے

زہے نصیب کہ اسکو مرا خیال آیا
مگر یہ بات حقیقت نہیں، تمنا ہے

گناہگار ہوں اے مادرِ عدم! مجھ کو
بلک بلک کے ترے بازوؤں میں رونا ہے

خمیر ایک ہے سب کا تو اے زمین، اے ماں!
زبان و مذہب و قوم و وطن، یہ سب کیا ہے؟

غلط سہی مگر آساں نہیں کہ یہ نکتہ
کسی حکیم نے اپنے لہو سے لکھا ہے

پیمبروں کو اتارا گیا تھا قوموں پر
خدا نے مجھ پہ مگر قوم کو اتارا ہے

انور شعور

میں خاک ہوں، آب ہوں، ہوا ہوں
اور آگ کی طرح جل رہا ہوں

تہ خانۂ ذہن میں نہ جانے
کیا شئے ہے جسے ٹٹولتا ہوں

بہروپ نہیں بھرا ہے میں نے
جیسا بھی ہوں، سامنے کھڑا ہوں

سنتا تو سبھی کی ہوں مگر میں
کرتا ہوں وہی جو چاہتا ہوں

اچھوں کو تو سب ہی چاہتے ہیں
ہے کوئی؟ کہ میں بہت برا ہوں

پاتا ہوں اسے بھی اپنی جانب
مڑ کر جو کسی کو دیکھتا ہوں

بچنا ہے محال اس مرض میں
جینے کے مرض میں مبتلا ہوں

سنتا ہی نہ ہو کوئی تو کیوں میں
چلاؤں، فغاں کروں، کراہوں

اوروں سے تو اجتناب تھا ہی
اب اپنے وجود سے خفا ہوں

باقی ہیں جو چند روز، وہ بھی
تقدیر کے نام لکھ رہا ہوں

لکھتا ہوں ہر ایک بات سن کر
ہر بات تو میں بھی کہہ چکا ہوں

ایسے دیکھا ہے کہ دیکھا ہی نہ ہو
جیسے مجھ کو تری پروا ہی نہ ہو

بعض گھر شہر میں ایسے دیکھے
جیسے ان میں کوئی رہتا ہی نہ ہو

مجھ سے کترا کے بھلا کیوں جاتا
شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو

یہ سمجھتا ہے ہر آنے والا
میں نہ آؤں تو تماشا ہی نہ ہو

یوں بھٹکنے پہ ہوں قانع جیسے
راستوں میں کوئی دریا ہی نہ ہو

رات ہر چاپ پہ آتا تھا خیال
اٹھ کے دیکھوں، کوئی آیا ہی نہ ہو

کیسے چھوڑوں در و دیوار اپنے
کیا خبر لوٹ کے آنا ہی نہ ہو

ہیں سبھی غیر تو اپنا مسکن
شہر کیوں ہو، کوئی صحرا ہی نہ ہو

یوں تو کہنے کو بہت کچھ ہے شعور
کیا کہوں جب کوئی سنتا ہی نہ ہو

حسن اختر جلیل



آئی پت جھڑ، گرے فصلِ گل کے نشاں رات بھر میں
کٹ گئے کیسے کیسے سجیلے جواں رات بھر میں

ٹوٹتی پتیوں کی نگاہوں میں بے چارگی ہے
راکھ سی بجھ گئی پنچھیوں کی فغاں رات بھر میں

دو گھڑی اور سُن میری فرقت کے بے تاب نوحے
ختم کیسے ہو اک عمر کی داستاں، رات بھر میں

تو جو آیا تو گزری بہاریں بھی ہمراہ لایا
یاد کے دشت میں کھل گئے گلستاں رات بھر میں

اس کو پہچان پائی نہ سورج کی پہلی کرن بھی
جیسے نورس کلی ہو گئی ہو جواں رات بھر میں

لایا کیا کیا گہر، سوچ ساگر سے سپنوں کا مانجھی
مل گئیں کتنی کھوئی ہوئی کشتیاں رات بھر میں

حسن اختر جلیل



نبھاؤ اب اسے، جو وضع بھی بنا لی ہے
دگرنہ دہر تو اہلِ وفا سے خالی ہے

حریمِ دل میں تری آرزو نے روشن کی
وہ آگ جس نے شبِ زندگی اُجالی ہے

تری نگاہِ کرم ہے دگرنہ اے غمِ دوست
زمانہ کیا ترے شیدائیوں سے خالی ہے

ستم ہے میری طرف پیار سے نظر نہ کرے
وہ بُت کہ جس میں مرے فن نے جان ڈالی ہے

بجا کہ حُسن کا احساس ہے فریبِ نظر
مگر وہ نقش جو دل میں ہے کب خیالی ہے

اُفق ہے گرد سے چھٹے تو خبر ملے شاید
سحر طلوع ہوئی ہے کہ ہونے والی ہے

اب اہلِ بزمِ غنیم تیرگی کریں تو کریں
ہمارے پاس تو جو شمع تھی، جلا لی ہے

ہوا کے دوش پہ اُڑتی ہوئی خبر تو سنو
ہوا کی بات بہت دُور جانے والی ہے

حسن اختر جلیل



شب کی دہلیز سے کس ہاتھ نے پھینکا پتھر
ہو گیا صبح کا نکھرا ہوا چہرا پتھر

کچھ انوکھی تو نہیں میری محبت کی شکست
آئنے جب بھی مقابل ہوئے، جیتا پتھر

اس ظلمات کی وادی میں پلٹ کر بھی نہ دیکھ
ورنہ ہو جائے گا خود تیرا سراپا پتھر

یاد کی لہر بہا لائی ہے کس دیس مجھے
ہے یہاں وقت کا بہتا ہوا دریا پتھر

کس کے پیکر میں سما تا مرے احساس کا لوچ
میں نے انساں خجل ہو کے تراشا پتھر

تیری آنکھوں میں ابھی نیند کے ڈورے کیوں ہیں
یاں تو اک چوٹ سے ہو جاتے ہیں بینا پتھر

کُند کر دیتا ہے یوں ذہن کو حالات کا زہر
جیسے بن جائے چمکتا ہوا سونا پتھر

تیری سوچوں کی قسم لے مرے خاموش خدا!
مجھ سے کرتے ہیں اطاعت کا تقاضا پتھر

مجھ سے مایوس نہ پلٹے مری تقدیر کے غم
میری انگلی میں نہ تھا کوئی چمکتا پتھر

کتنی دلدار ہے ساحل کی چمکتی ہوئی ریت
اب نہیں پاؤں تلے کوئی نکیلا پتھر

میں سرِ دار کھڑا ہوں کئی صدیوں سے جلیل
کون مارے گا مرے جسم پہ پہلا پتھر



چھانتی پھرتی ہیں احساس کے جنگل روحیں
کب سکوں پائیں گی بھٹکی ہوئی بے کل روحیں

پا شکستہ ہیں شب و روز کے ویرانے میں
ڈھونڈتی ہیں کسے اس دشت میں پاگل روحیں

جب بھی اُٹھتے ہیں لگا ہوں سے غمِ جاں کے حجاب
دیکھ لیتی ہیں کسی شوخ کا آنچل روحیں

رُونما ہو چمنِ دہر میں اے ابرِ نشاط
درد کی دھوپ میں سنولائی ہیں کومل روحیں

ق

دل کے اُجڑے ہوئے مندر کو بسانے کیلئے
لے کے آئی تھیں کسی یاد کی مشعل روحیں

رات سپنوں کی سبھا میں مرے ہمراہ رہیں
جب کھُلی آنکھ، ہوئیں آنکھ سے اوجھل روحیں

حسن اختر جلیل



رات لمبی بھی ہے اور تاریک بھی، شب گزاری کا ساماں کرو دوستو!
جانے پھر کب یہ ملنا مقدر میں ہو، اپنی اپنی کہانی کہو دوستو!

کس پری چہرہ سے پیار تم نے کیا، کون سے دیس کے شاہزادے ہو تم
اپنی روداد الفت سنا کر بہم، داستاں کوئی تشکیل دو دوستو!

مجھ کو احساس ہے تم بھی میری طرح جان و دل کوئے اُلفت میں ہار آئے ہو
اب یہ بازی نئے سر سے ممکن نہیں، اپنا انجام خود سوچ لو دوستو!

صبح ہوگی تو ظالم زمانے کے غم، تم پہ ابرِ ستم بن کے چھا جائیں گے
فرصتِ بزمِ شب ہے گھڑی دو گھڑی، بات آپس کی کوئی کرو دوستو!

ڈھل گئی رات تارے بکھرنے لگے، منتشر ہو چلے دھیان کے سلسلے
کوئی دم اور دل میں فروزاں رہو، ایک مدت کے بعد آئے ہو دوستو!



آرزو کی ہما ہمی اور مَیں
دردِ دل، دردِ زندگی اور مَیں

موجۂ قلزمِ ابد، اور تو
چند بوندوں کی تشنگی اور مَیں

رات بھر تیری راہ تکتے رہے
تیرے کوچے کی روشنی اور مَیں

چھپ کے ملتے ہیں تیری یادوں سے
شب کی تنہائی، چاندنی اور مَیں

ایک ہی راہ کے مسافر ہیں
بیکراں رات، خامشی اور مَیں

رات اِس پیکرِ خیال کے پاس
چند پھولوں کی باس تھی اور مَیں

یہ بھی اِک منزلِ جنوں تھی جلیل
ورنہ زندانِ آگہی، اور مَیں

حسن اختر جلیل



خلا کے دشت میں یہ طرفہ ماجرا بھی ہے
وہ آسمان جو سر پر تھا زیرِ پا بھی ہے

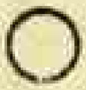
ہوا کے دوش پہ اک سرمئی لکیر کے ساتھ
مری تلاش میں شاید مری صدا بھی ہے

ڈرا ہوں یوں کبھی تنہائیوں کی آہٹ سے
کہ جیسے مجھ میں کوئی شے مرے سوا بھی ہے

بہت عزیز ہے مجھ کو یہ برگِ نو جس میں
زمیں کا حُسن بھی ہے، شوخیٔ صبا بھی ہے

مری جفا طلبی کا خیال ہے اُس کو
وگرنہ پیار کا انداز دوسرا بھی ہے

رگِ حیات میں رقصاں مری توانائی
میں کیسے مان لوں میرے لیے فنا بھی ہے



یہ رات کاش اسی دلکشی سے ڈھلتی رہے
افق کے پاس پہاڑوں میں آگ جلتی رہے

دراز تر ہو خیالوں کی بستیوں کا سفر
مری تلاش سدا زاویے بدلتی رہے

کوئی چراغ نہ میرے حریمِ غم میں جلے
خود اپنی آنچ میں یہ تیرگی پگھلتی رہے

شکستہ ہو کے بھی نومید ہو نہ دل تیرا
بجھے چراغ میں بھی روشنی مچلتی رہے

سفینے ڈوب گئے کتنے دل کے ساگر میں
خدا کرے تری یادوں کی ناؤ چلتی رہے

حسن اختر جلیل



دل کی طرف نگاہِ تغافل رُبا کرے
اس خاکِ راہ کو بھی کوئی کیمیا کرے

ہیرے کی کان دیکھ کے آتا ہے یہ خیال
کاش اس زمیں سے دانۂ گندم اُگا کرے

ٹوٹے کسی طرح تو دھوئیں کا سیہ طلسم
ہر شام اس دیار میں آندھی چلا کرے

دھیمے دکھوں کی راکھ بدن پر ملی تو ہے
وہ ڈال دے نظر تو مجھے آئنا کرے

خوشبو مرے غموں کی بکھر جائے دُور دُور
یوں چُپ رہوں کہ ایک زمانہ سُنا کرے

بجھنے لگی ہے شام کے آنگن میں روشنی
اب موجِ خونِ دل ہی کوئی معجزا کرے



جلتی ہوئی رُتوں کے خریدار کون ہیں
اے پیکرِ غزل ترے بیمار کون ہیں

خوشبو کی ساعتوں کے طلبگار کون ہیں
اس زلفِ مشک بو کے گرفتار کون ہیں

کب تک چھپے رہیں گے ازل خامشی کے بھید
شہرِ صدا کے محرمِ اسرار کون ہیں

کرنوں کی رہگزار پہ اُڑتی ہے دھول سی
جو اس طرف گئے ہیں وہ جی دار کون ہیں

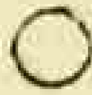
سینوں میں لے کے ولولۂ زندگی کی آگ
عصرِ رواں سے برسرِ پیکار کون ہیں

صدیوں سے منتظر ہیں سلگتی مسافتیں
آسائشِ جنوں کے طلبگار کون ہیں

سرمست کر گئی جنھیں اپنے لہو کی لے
وہ عرصۂ نبرد کے فن کار کون ہیں

میں تو غریبِ شہرِ سخن ہوں مگر جلیل
فرمانروائے کشورِ اظہار کون ہیں

رضی اختر شوق



کیسے اس شہر میں رہتا ہوگا — ہائے وہ شخص کہ مجھ سا ہوگا
رنگ بکھریں گے جو میں بکھروں گا — تو جو بکھرے گا تو ذرّہ ہوگا
خشک آنکھوں سے اسی سوچ میں ہیں — ابر اس بار بھی برسا ہوگا
اب بھی پہروں ہے یہی سوچ مجھے — وہ مجھے چھوڑ کے تنہا ہوگا
وہ بدن خواب سا لگتا ہے مجھے — جو کسی نے بھی نہ دیکھا ہوگا
یہ تغیّر کی ہوا ہے پیارے — اب جہاں پھول ہیں صحرا ہوگا
دیکھنا تم کہ یہی کنجِ بہار — پھر جو گزرو گے تو سونا ہوگا
نہ یہ چہرے نہ یہ میلے ہونگے — نہ کوئی دوست کسی کا ہوگا
ایسا بدلے گا ستمگر موسم — خون شاخوں سے ٹپکتا ہوگا
نہ کسی سر میں محبت کا جنوں — نہ کسی دل میں یہ سودا ہوگا
حسن مجبورِ تہِ دامِ ہوس — عشق محرومِ نظارا ہوگا

ہم نے گھر اپنا جلایا ہے کہ شوق
شہر میں کچھ تو اجالا ہوگا

رضی اختر شوق



الٰہی گلیوں میں اک ایسی گلی ہے — جو میرے نام سے تنہا رہی ہے
اب اس سے اور بھی شمعیں جلا لو — سوادِ جاں میں اک مشعل جلی ہے
ہمارے سر گئے سنگِ حریفاں — سے مے و مینا سے آفت ٹل گئی ہے
میں بہرِ آزمائش بھی جلا ہوں — کہ دیکھوں مجھ میں کتنی روشنی ہے
الٰہی خیر ہو ان بستیوں کی — پسِ دیوار اک پرچھائیں سی ہے
سوادِ شہر میں کوئی بلا ہے — جو وحشت بن کے پیچھا کر رہی ہے
ہوئی پھر شام، پھر دن بھر کی شورش — گلی کوچوں میں چھپ کر سو گئی ہے
کچھ ایسے سو رہے ہیں شہر والے — کہ اک مدت میں نیند ان کو ملی ہے
یہ گھر سوتے کے سوتے ہی نہ رہ جائیں — ہوائے حشر ساماں چل رہی ہے
ہوئی پھر صبح زخموں کے افق سے — فضا پھر تازہ دم ہو کر اٹھی ہے
کسی قیدی کو پھر خوابوں سے اٹھ کر — کسی زنجیر نے آواز دی ہے
گھروں سے چند لمحوں کی رفاقت — بچھڑ کر شہر کی جانب چلی ہے
لہو رستا ہے دستِ شیشہ گر سے — فضا آئینہ خانہ بن گئی ہے
پھر اپنے دائرے قوسیں بنائے — وہی مٹی وہی کوزہ گری ہے

تم اس سے کیا بچو گے شوقؔ صاحب
کہ قسمت میں ہی گردش لکھی ہے

رضی اختر شوق

وہ شاخِ گل کی طرح ، موسمِ طرب کی طرح
میں اپنے دشت میں تنہا چراغِ شب کی طرح

خیال و فکر کی سچائیاں بھی شامل ہیں
مرے لہو میں مرے شجرۂ نسب کی طرح

وہ اپنی خلوتِ جاں سے پکارتا ہے مجھے
میں چاہتا ہوں اُسے حرفِ زیرِ لب کی طرح

خوشا یہ دور کہ وہ بھی ہے ساتھ ساتھ مرے
مرے خیال کی صورت، مری طلب کی طرح

میں اپنے عہد کی آوازِ نارسا ہی سہی
دھڑک رہا ہوں دلوں میں سکوتِ شب کی طرح

نہ کھل کے سبز ہوائیں، نہ جل کے راکھ ہوا
کہ میری پیاس بھی ہے تیرے رنگِ لب کی طرح

وہ شاخِ گل کہ جو آوازِ عندلیب بھی تھی
ہوئی جو خشک تو میرے لیے صلیب بھی تھی

دیارِ سنگ میں سر پھوڑتی پھری برسوں
مری صدا کہ جو اس دور کی نقیب بھی تھی

جو شمع دور تھی، اس نے فقط دھواں ہی دیا
اُسی کی لو سے جلا ہوں جو کچھ قریب بھی تھی

سرشتِ حسن عجب ہے کہ وصل کے ہنگام
نگاہِ یار میں کیفیتِ رقیب بھی تھی

سکوں کہاں کہ میں آشوبِ فکر رکھتا ہوں
جو مہر تھا تو تمازت مرا نصیب بھی تھی

رضی اختر شوق

کبھی خورشیدِ ضیا بار ہوں میں
کبھی سایہ پسِ دیوار ہوں میں

یہ جو کچھ رنگ مری ذات میں ہیں
کون سمجھے گا کہ دشوار ہوں میں

نارسیدہ ہے ابھی میری مہک
شاخِ نوخیز و گرانبار ہوں میں

ہے کوئی ناز اٹھانے والا
ایک ٹوٹا ہوا پندار ہوں میں

لوگ یوں بچ کے گزر جاتے ہیں
جیسے گرتی ہوئی دیوار ہوں میں

میں نے مانا کہ بہت تلخ ہوں شوقؔ
اپنا پیرایۂ اظہار ہوں میں

سنگ ہیں، ناوکِ دشنام ہیں، رسوائی ہے
یہ ترے شہر کا اندازِ پذیرائی ہے

کتنا پھیلے گا یہ اک وصل کا لمحہ آخر
کیا سمیٹو گے کہ اک عمر کی تنہائی ہے

کچھ تو یاروں سے ملا، سنگِ ملامت ہی سہی
کس نے اس شہر میں یوں دادِ ہنر پائی ہے

ایک پتھر ادھر آیا ہے تو اس سوچ میں ہوں
میری اس شہر میں کس کس سے شناسائی ہے

شوقؔ جس دن سے چراغاں ہے خیالوں کی گلی
جشن سا جشن ہے، تنہائی سی تنہائی ہے

رضی اختر شوقی



یہ دورِ کم نظراں ہے تو پھر صلہ کیسا
یہ اپنا عہد ہے، اِس عہد کا گلہ کیسا

بہت دنوں سے نہیں مجھ کو اضطرابِ غزل
رُکا ہوا ہے خیالوں کا قافلہ کیسا

کہاں یہ شام، کہاں میرے آشنا چہرے
سمٹ رہا ہے تصور میں فاصلہ کیسا

کہاں یہ رات، کہاں تیری بوئے پیراہن
چلا تھا آج خیالوں کا سلسلہ کیسا

کئی چراغ، کئی صورتیں، کئی سائے
گزر رہا ہے نہ جانے یہ قافلہ کیسا



کچھ لوگ سمجھنے ہی کو تیار نہیں تھے
ہم ورنہ کوئی عقدۂ دشوار نہیں تھے

صد حیف کہ دیکھا ہے تجھے دھوپ سے بے کل
افسوس کہ ہم سایۂ دیوار نہیں تھے

ہم اتنے پریشاں تھے کہ حالِ دلِ سوزاں
ان کو بھی سنایا کہ جو غم خوار نہیں تھے

سچ یہ ہے کہ اک عمر گزاری سرِ مقتل
ہم کون سے لمحے میں سرِ دار نہیں تھے

مانا کہ بہت تیز تھی رفتارِ حوادث
ہم بھی کوئی گرتی ہوئی دیوار نہیں تھے

یہ اس کی عنایت ہے کہ اپنا کے تمہیں شوقؔ
وہ زخم دیے، جن کے سزاوار نہیں تھے

خوشبو ہیں تو ہر دور کو مہکائیں گے ہم لوگ
مٹی ہیں تو پل بھر میں بکھر جائیں گے ہم لوگ

یہ شعلۂ بے مہر تو بس آنچ ہی دے گا
ہاں اور ترے حسن سے کیا پائیں گے ہم لوگ

کیا ہم سے بچو گے کہ جدھر جائیں گی نظریں
اس آئینہ خانہ میں جھلک جائیں گے ہم لوگ

کہتا ہے یہ ناقدریِ اربابِ جہاں سے
اِک بار جو بکھرے تو نہ ہاتھ آئیں گے ہم لوگ

بیٹھو کہ ابھی ہے یہ گھنی چھاؤں میسّر
ڈھلتا ہوا سایا ہیں، گزر جائیں گے ہم لوگ

ہم روحِ سفر ہیں، ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آ جائیں گے ہم لوگ

ہم جہاں نغمہ و آہنگ لیے پھرتے ہیں
لوگ ہاتھوں میں وہاں سنگ لیے پھرتے ہیں

ہم ہی اِس عہد کا معیارِ تغیّر ہوں گے
ہم کہ ہر دور میں سو رنگ لیے پھرتے ہیں

کیا ہو شوریدہ سروں کی گزر اوقات کہ لوگ
دستِ بے فیض و دلِ تنگ لیے پھرتے ہیں

سب ترا حسن، ترے حسن سبھی قد میں نہیں
ہم بھی آنکھوں میں عجب رنگ لیے پھرتے ہیں

شوقؔ دشوار ہے اب معجزۂ فن کی نمود
لوگ اشعار میں فرہنگ لیے پھرتے ہیں

مظفرؔ وارثی



کیا بھلا مجھ کو پرکھنے کا نتیجہ نکلا
زخمِ دل آپ کی نظروں سے بھی گہرا نکلا

تشنگی جم گئی پتھر کی طرح ہونٹوں پر
ڈوب کر بھی ترے دریا سے میں پیاسا نکلا

جب کبھی تجھ کو پکارا مری تنہائی نے
بُو اُڑی پھول سے، تصویر سے سایا نکلا

کوئی ملتا ہے تو اب اپنا پتہ پوچھتا ہوں
میں تری کھوج میں تجھ سے بھی پرے جا نکلا

توڑ کر دیکھ لیا آئینۂ دل تُو نے
تیری صورت کے سِوا اور بتا، کیا نکلا

مجھ سے چھُپتا ہی رہا تُو مجھے آنکھیں دے کر
میں ہی پردہ تھا، اٹھا میں تو تماشا نکلا

نظر آیا تھا سرِ بام مظفرؔ کوئی
پہنچا دیوار کے نزدیک تو سایا نکلا

مظفر وارثی



جی بہلتا ہی نہیں سانس کی جھنکاروں سے
پھوڑ لوں سر نہ کہیں جسم کی دیواروں سے

اپنے رِستے ہوئے زخموں پہ چھڑک لیتا ہوں
راکھ جھڑتی ہے جو احساس کے انگاروں سے

گیت گاؤں تو لپک جاتے ہیں شعلے دل میں
ساز چھیڑوں تو نکلتا ہے دھواں تاروں سے

یوں تو کرتے ہیں سبھی عشق کی رسمیں پوری
دودھ کی نہر نکالے کوئی کہساروں سے

زندہ لاشیں بھی دکانوں میں سجی ہیں شاید
بوئے خوں آتی ہے کھلتے ہوئے بازاروں سے

کیا مرے عکس میں چھپ جائیں گے ان کے چہرے
اتنا پوچھے کوئی ان آئینہ برداروں سے

پیار ہر چند چھلکتا ہے اُن آنکھوں سے مگر
زخم بھرتے ہیں مظفرؔ کہیں تلواروں سے

مظفر وارثی



منتظر رہنا بھی کیا چاہت کا خمیازہ نہیں
کان دستک پر لگے ہیں گھر کا دروازہ نہیں

ہاتھ پر تو نے مقدر کی لکیریں کھینچ دیں
کیا تجھے بھی میرے مستقبل کا اندازہ نہیں

دیکھنا چاہوں تو خوشبو، چھونا چاہوں تو ہوا
میرے دامن تک جو آئے، تو وہ شیرازہ نہیں

دفن ہوں احساس کی صدیوں پرانی قبر میں
زندگی اک زخم ہے اور زخم بھی تازہ نہیں

تم ہی اے خاموشیو پتھر اٹھا لو ہاتھ میں
کوئی نغمہ، کوئی نالہ، کوئی آوازہ نہیں

حسن پہچانے گی میرا، دیکھنے والی نظر
خون تو ہے آنکھوں میں چہرے پہ گر غازہ نہیں

مانگتے ہیں کیوں مظفر لوگ بارش کی دعا
تشنگیٔ روح کا جسموں کو اندازہ نہیں



پتھر مجھے شرمندۂ گفتار نہ کر دے
اونچا مری آواز کو دیوار نہ کر دے

مجبورِ سخن کرتا ہے کیوں مجھ کو زمانہ
لہجہ مرے جذبات کا اظہار نہ کر دے

زنجیر سمجھ کر مجھے توڑا تو ہے تُو نے
اب تجھ کو پریشاں مری جھنکار نہ کر دے

چلتا ہوں تو پڑتے ہیں قدم میرے ہوا پہ
ڈرتا ہوں، ہوا چلنے سے انکار نہ کر دے

رہ جاؤں نہ میں اپنے ہی نقشوں سے کچل کر
پامال مجھے خود مری رفتار نہ کر دے

میں خود کو مٹا کر ترا شہکار بنا ہوں
نیلام مجھے تُو سرِ بازار نہ کر دے

ہر سانس نئے زخم لگاتی ہے مظفر
ٹکڑے مرے اک روز یہ تلوار نہ کر دے

مظفر وارثی



آدمی چونک چکا ہے مگر اُٹھا تو نہیں
میں جسے ڈھونڈ رہا ہوں، یہ وہ دنیا تو نہیں

روح کو درد ملا، درد کو آنکھیں نہ ملیں
تجھ کو محسوس کیا ہے، تجھے دیکھا تو نہیں

رنگ سی شکل ملی ہے تجھے خوشبو سا مزاج
لالہ و گل کہیں تیرا ہی سراپا تو نہیں

چہرہ دیکھوں تو خد و خال بدل جاتے ہیں
چھپ کے آئینے کے پیچھے کوئی بیٹھا تو نہیں

پھینک کر مار نہیں پر نہ زمانے مجھ کو
ٹوٹ ہی جاؤں گا جیسے میں کھلونا تو نہیں

زندگی تجھ سے ہر اک سانس پہ سمجھوتا کروں
شوق جینے کا ہے مجھ کو مگر اتنا تو نہیں

میری آنکھوں میں ترے نقشِ قدم کیسے ہیں
اس سرائے میں مسافر کوئی ٹھہرا تو نہیں

سوچتے سوچتے دل ڈوبنے لگتا ہے مرا
ذہن کی تہ میں مظفرؔ کوئی دریا تو نہیں



تیری جھلک، نگاہ کے ہر زاویے میں ہے
دیکھوں تو شکل اپنی مرے آئینے میں ہے

لٹکی ہوئی ہے روح کی سولی پہ زندگی
سانسوں کا سلسلہ ہے کہ رسی گلے میں ہے

کانٹوں کی پیاس نے مجھے کھینچا برہنہ پا
جیسے بھری سبیل ہر اک آبلے میں ہے

سانسوں کی اوٹ لے کے چلا ہوں چراغِ دل
سیلنے ہیں جو نہیں وہ گھٹن راستے میں ہے

میری صدا کے پھول چڑھاتے ہیں مجھ پہ لوگ
زندہ تو ہوں مگر مرا فن مقبرے میں ہے

ڈالوں کہاں پڑاؤ کہ رستے بھی ہیں رواں
منزل کہاں ملے کہ وہ خود قافلے میں ہے

میں تجھ کو چاہتا رہوں، حاصل نہ کر سکوں
لذت وہ قرب میں کہاں جو فاصلے میں ہے

پایا صلہ یہ تجھ کو مظفرؔ نے ڈھونڈ کر
شامل اب اس کا نام بھی تیرے پتے میں ہے

مظفر وارثی



آگ سے سیراب دشتِ زندگانی ہو گیا
شعلۂ دل آنکھ میں آیا تو پانی ہو گیا

درد سینے میں اٹھا، ماتھے پہ شکنیں پڑ گئیں
رنگ چہرے کا صدائے بے زبانی ہو گیا

تیری آنکھیں آئینہ خانوں میں لے کر آ گئیں
روبرو ہو کر ترے میں اپنا ثانی ہو گیا

جب بھڑک اٹھا تھا تیرے قرب سے میرا بدن
نام اُن حساس لمحوں کا جوانی ہو گیا

کہہ دیا تھا میں نے جو آوارہ پتوں پر رقم
راز وہ رسوا ہواؤں کی زبانی ہو گیا

ایک انمٹ روشنی تھا عرش کی محراب پر
آدمی کے روپ میں آ کر میں فانی ہو گیا

جن کے سینوں میں دھڑکتا تھا مظفر میرا دل
آج میں ان کے لئے بھولی کہانی ہو گیا



زندگی کھنچ گئی مجھ سے ترے ابرو کی طرح
اپنے ہی خون کا پیاسا ہوں لبِ جُو کی طرح

وہ ستارا جو مرے نام سے منسوب ہوا
دیدۂ شب میں ہے اک آخری آنسو کی طرح

شعلۂ سوزِ دروں سرد ہوا جاتا ہے
کوئی سمجھائے صبا کو کہ چلے لُو کی طرح

کوئی دیوانہ اٹھے خاک اڑانے کیلئے
آج بھی دشت ہیں پھیلے ہوئے بازو کی طرح

اس بھرے شہر میں کرتا ہوں ہوا سے باتیں
پاؤں پڑتا ہے زمیں پر مرا آہو کی طرح

شبنمی ہاتھ بڑھاؤ کہ کھلے دروازہ
بن کھلے پھول کے زنداں میں ہوں خوشبو کی طرح

چاہتے ہیں جو مظفر غمِ ہستی سے فرار
بیٹھ جائیں وہ گڑھا کھود کے سادھو کی طرح

مظفر وارثی



سفر بھی دور کا ہے، راہ آشنا بھی نہیں
چلا اُدھر کو ہوں جس سمت کی ہوا بھی نہیں

گزر رہا ہوں قدم رکھ کے اپنی آنکھوں پہ
گئے دنوں کی طرف مڑ کے دیکھتا بھی نہیں

مرا وجود مری زندگی کی حد نہ سہی
کبھی جو طے ہی نہ ہو، میں وہ فاصلہ بھی نہیں

فضا میں پھیل چلی میری بات کی خوشبو
ابھی تو میں نے ہواؤں سے کچھ کہا بھی نہیں

سمجھ رہا ہوں مظفر اُسے شریکِ سفر
جو میرے ساتھ قدم دو قدم چلا بھی نہیں



زندگی جس پہ ہنسے، ایسی کوئی خواہش نہ کی
گھاؤ سینے میں سجائے، گھر کی آرائش نہ کی

نکتہ چینی پر مری تم اتنے برگشتہ نہ ہو
کہہ دیا جو کچھ بھی دل تھا مگر سازش نہ کی

ایک سے حالات آئے ہیں نظر ہر دور میں
رک گئے میرے قدم یا وقت نے گردش نہ کی

جھک گیا قدموں پہ تیرے، پھر بھی سر اونچا رہا
آنکھ پتھر ہو گئی، جلووں کی فرمائش نہ کی

لاکھ نظروں کو اچھالا، تو نہ آیا بام پر
سائے سر پٹخا کئے، دیوار نے جنبش نہ کی

نور کی شبنم سے نکھریں گی بدن کی پتیاں
درد کے سورج نے کرنوں کی اگر بارش نہ کی

رہ کے محدودِ وسائل کی مظفر نے بسر
پاؤں پھیلا کر کبھی چادر کی پیمائش نہ کی

مرتضیٰ برلاس



اک برگِ سبز شاخ سے کر کے جدا بھی دیکھ
میں پھر بھی جی رہا ہوں، مرا حوصلہ بھی دیکھ

ذرّے کی شکل میں مجھے سمٹا ہوا نہ جان
صحرا کے روپ میں مجھے پھیلا ہوا بھی دیکھ

تُو نے تو مشتِ خاک سمجھ کے اُڑا دیا
اب مجھکو اپنی راہ میں بکھرا ہوا بھی دیکھ

مانا کہ تیرا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں
ملنے کے بعد مجھ سے، ذرا آئینہ بھی دیکھ

تیرے لیے تو صرف اشاروں کا کھیل تھا
مجکو جو پیش آیا ہے، وہ حادثہ بھی دیکھ

اوروں کے پاس جا کے مری داستاں نہ پوچھ
جو کچھ ہے میرے چہرے پہ لکھا ہوا بھی دیکھ

ہموار راستوں پہ مرا ساتھ چھوڑ کر
آگے نکل گیا تھا تو اب راستہ بھی دیکھ

چہرے کی چاندنی پہ نہ اتنا بھی مان کر
وقتِ سحر تُو رنگ کبھی چاند کا بھی دیکھ



جیتے جی میرے، ہر اک مجھ پہ ہی تنقید کرے
اور مر جاؤں تو دنیا مری تقلید کرے

میں تو کہتا ہوں کہ تم ابرِ کرم ہو لیکن
کاش صحرا مرے الفاظ کی تائید کرے

جب ہر اک بات یہاں تشنۂ تکمیل رہے
پھر کرے کوئی تو کیا جرأتِ تمہید کرے

پہلے ہر شخص گریبان میں اپنے جھانکے
پھر بصد شوق کسی اور پہ تنقید کرے

میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سا کوئی مغموم نہیں
حال ہر شخص کا لیکن مری تردید کرے

میں ہی اب زہر پیئے لیتا ہوں سچ کی خاطر
کوئی تو سنتِ سقراط کی تجدید کرے

وہ مری جرأتِ پرواز کو کیا سمجھے گا
جو فضاؤں کو محیطِ مہ و خورشید کرے

مرتضیٰ برلاس



آنکھ برسی ہے ترے نام پہ ساون کی طرح
جسم سلگا ہے تری یاد میں ایندھن کی طرح

لوریاں دی ہیں کسی قرب کی خواہش نے مجھے
کچھ جوانی کے بھی دن گذرے ہیں بچپن کی طرح

اس بلندی سے مجھے تو نے نوازا کیوں تھا
گر کے میں ٹوٹ گیا کانچ کے برتن کی طرح

مجھ سے ملتے ہوئے یہ بات بھی سوچی ہوتی
میں ترے دل میں سما سکتا ہوں دھڑکن کی طرح

اب زلیخا کو نہ بدنام کرے گا کوئی
اس کا دامن بھی دریدہ ہے مرے دامن کی طرح

منتظر ہے کسی مخصوص سی آہٹ کے لیے
زندگی بیٹھی ہے دہلیز پہ برہن کی طرح

نہ کوئی راہ اجالی، نہ شبستاں میں جلا
ٹمٹماتا ہوں چراغِ سرِ مدفن کی طرح



موج در موج نظر آتا تھا سیلاب مجھے
پاؤں ڈالا تو یہ دریا ملا پایاب مجھے

بت تو دنیا نے بہر گام تراشے لیکن
سر جھکانے کے نہ آئے کبھی آداب مجھے

شدتِ کرب سے کملا گئے چہرے کے خطوط
اب نہ پہچان سکیں گے مرے احباب مجھے

ایک سایہ کہ مجھے چین سے سہنے بھی نہ دے
ایک آواز کہ کرتی رہے بیتاب مجھے

جس کی خواہش میں کسی بات کی خواہش نہ رہے
ایسی جنت کے دکھائے نہ کوئی خواب مجھے

وسعتیں دامنِ صحرا کو بھی بخشی ہوتیں
تو نے بخشی تھی اگر فطرتِ سیماب مجھے

مرتضیٰ برلاس



ہم کہ تجدیدِ عہدِ وفا کر چلے، آبروئے جنوں کچھ سوا کر چلے
خود تو جیسے کٹی زندگی کاٹ لی، ہاں نئے دَور کی ابتدا کر چلے

زرد سورج کی مشعل بھی کجلا گئی، چاند تاروں کو بھی نیند سی آ گئی
اب کسی کو اگر روشنی چاہیے، اپنی پلکوں پہ شمعیں جلا کر چلے

حال اپنا ہر اک سے چھپاتے رہے، زخم کھاتے رہے مسکراتے رہے
تیری تشہیر ہم نے گوارا نہ کی، دردِ دل ہم ترا حق ادا کر چلے

لاکھ الزام پر ہم کو الزام دو، اور تر دامنی کے فسانے کہو
تم میں ایسا بھی کوئی تو ہو دوستو، دو قدم ہی سہی سر اٹھا کر چلے

چوٹ جو بھی پڑی شیشۂ دل پہ پڑی، اس پہ بھی ہم نے رنگِ طلب تو رکھی
ہم تو مٹ کے بھی اے گردشِ آسماں، تیرے شانے سے شانہ ملا کر چلے



تم اِک ایسے شخص کو پہچانتے ہو یا نہیں
جس کا چہرہ بولتا ہے اور لب گویا نہیں

صبح کو دیکھا تو دو گھاؤ مرے چہرے پہ تھے
رات کچھ رونے کی خواہش تھی مگر رویا نہیں

پھیلتا جاتا ہے خود رَو سبزۂ غم چار سو
کھیت وہ کاٹوں گا جو مَیں نے کبھی بویا نہیں

خواب دیکھا تھا کوئی بچپن کی کچی نیند میں
دوستو پھر چین سے میں آج تک سویا نہیں

زینتِ ملبوسِ ہستی بڑھ گئی جس داغ سے
زندگی بھر میں نے ایسے داغ کو دھویا نہیں

مرتضیٰ برلاس



جنوں کا ذکر سرِ عام ہو گیا تو کیا
میں تیرے شہر میں بدنام ہو گیا تو کیا

کوئی اصول مرا مطلعِ نظر تو رہا
شہیدِ حسرتِ ناکام ہو گیا تو کیا

جہاں نے کس کو سزاوارِ آگہی جانا
جو میں بھی موردِ الزام ہو گیا تو کیا

کوئی صلیب پہ لٹکا، کسی نے زہر پیا
مرا بھی گر یہی انجام ہو گیا تو کیا

ہزار شمعیں جلا کر غبار بکھر گیا
نمودِ شمس میں جو سرِ شام ہو گیا تو کیا

حریفِ گردشِ ایام تو رہا برسوں
میں آج کشتۂ آلام ہو گیا تو کیا



کاش بادل کی طرح پیار کا سایا ہوتا
پھر میں دن رات ترے شہر پہ چھایا ہوتا

راہ میں آگ کے دریا سے گزرنا تھا اگر
تو نے خوابوں کا جزیرہ نہ دکھایا ہوتا

مجھ سی تخلیق کا الزام نہ آتا تجھ پر
میں اگر نقشِ غلط تھا، نہ بنایا ہوتا

خواب ٹوٹے تھے اگر تیرے بھی میری ہی طرح
بوجھ کچھ تیری بھی پلکوں نے اٹھایا ہوتا

بس ہاتھوں کا بھی کافی تھا پگھلنے کے لیے
موم کے بت کو زمیں پر نہ گرایا ہوتا



صدا یہ کس کی ہے جو دُور سے بلائے مجھے
قریب جاؤں تو کچھ بھی نظر نہ آئے مجھے

میں بُجھتے بُجھتے دھوئیں کی لکیر چھوڑوں گا
یہ بادِ تند ذرا سوچ کر بجھائے مجھے

غروب کے نہیں آثار یہ تو پھر کیا ہیں
کہ جسم سے بڑے لگتے ہیں اب تو سائے مجھے

جلا ہو دھوپ میں اور خال و خد نہ بگڑے ہوں
بھرے جہاں میں وہ اِک شخص تو دکھائے مجھے

کسی کے لمس سے کندن میں ہو تو سکتا ہوں
مگر یہ شرط، کوئی ہاتھ تو لگائے مجھے



ہم ضمیروں سے جو مجھ کو وہ اعزاز نہ دے
شوق سے تُو مجھے اب قوتِ پرواز نہ دے

دائرے ٹوٹ نہ جائیں مرے خوابوں کے کہیں
سوگیا ہوں مجھے اب کوئی بھی آواز نہ دے

تجھ کو دینا ہے اگر تلخیٔ انجام کا زہر
دینے والے مجھے خوش فہمیٔ آغاز نہ دے

رازداروں کا کہا مان کے یہ حال ہُوا
مشورہ کوئی مجھے اب مرا ہم راز نہ دے

ق

یا فضاؤں کو محیطِ مہ و خورشید نہ کر
یا مری فکر کو تو جراُتِ پرواز نہ دے

یا زمانے کو تُو محرومِ سماعت کر دے
یا مجھے درد میں ڈوبی ہوئی آواز نہ دے

کشور ناہید



میں نظر آؤں ہر اک سمت، جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں

میں ترا رنگ ہر اک مطلعِ در سے مانگوں
میں ترا سایہ ہر اک راہگذر سے چاہوں

صحبتیں خوب ہیں خوش وقتیٔ غم کی خاطر
کوئی ایسا ہو جسے جان و جگر سے چاہوں

میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
میں اُسے چاہوں تو خود اپنی خبر سے چاہوں

آنکھ جب تک ہے نظارے کی طلب ہے باقی
تیری خوشبو کو میں کس ذوقِ نظر سے چاہوں

گھر کے دھندے کہ نمٹتے ہی نہیں ہیں ناہید
میں نکلنا بھی اگر شام کو گھر سے چاہوں

کشور ناہید



وہ اجنبی تھا، غیر تھا، کس نے کہا نہ تھا
دل کو مگر یقین کسی پر ہوا نہ تھا

ہم کو تو احتیاطِ غمِ دل عزیز تھی
کچھ اس لیے بھی کم نگہی کا گلہ نہ تھا

دستِ خیالِ یار سے پھوٹے شفق کے رنگ
نقشِ قدم بھی رنگِ حنا کے سوا نہ تھا

ڈھونڈا اُسے بہت کہ بلایا تھا جس نے پاس
جلوہ مگر کہیں بھی صدا کے سوا نہ تھا

کچھ اس قدر تھی گرمیٔ بازارِ آرزو
دل جو خریدتا تھا اُسے دیکھتا نہ تھا

کیسے کریں گے ذکرِ حبیبِ جفا پسند
جب نام دوستوں میں بھی لینا روا نہ تھا

کچھ یونہی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا

کشور ناہید



تمہاری یاد میں ہم جشنِ غم منائیں بھی
کسی طرح سے مگر تم کو یاد آئیں بھی

چھلک ہی پڑتے ہیں خود ہی گلاب آنکھوں کے
وہ پاس آئیں تو یہ داستاں سنائیں بھی

ہر ایک لمحہ یہی بے کلی سی ہے دل میں
کہ ان کو یاد کریں، ان کو بھول جائیں بھی

جوان گیہوں کے کھیتوں کو دیکھ کر رو دیں
وہ لڑکیاں کہ جنہیں بھول بیٹھیں مائیں بھی

تمام عمر یونہی رتجگوں سے کیا حاصل
انہیں بھلائیں ذرا نیند کو بلائیں بھی

سکون ملتا ہے جلتی ہوئی دوپہروں میں
بنی ہیں مرہمِ دل دھوپ کی شعاعیں بھی

روا روی میں ہے ہر ایک صحبتِ یاراں
ملیں سکوں سے، تو قصے ترے سنائیں بھی

وہ جن کے ذکر سے ناہید زندگی ہے حسیں
وہ لوگ آئیں تو آنکھوں پہ ہم بٹھائیں بھی



ترے قریب پہنچنے کے ڈھنگ آتے تھے
یہ خود فریب مگر راہ بھول جاتے تھے

تماشہ بینِ وفا تھا تعلقِ یاراں
وہ زخمۂ رگِ جاں چھیڑ چھیڑ جاتے تھے

وہ لوگ کیا ہوئے جو اونگھتی ہوئی شب میں
درِ فراق کی زنجیر سی ہلاتے تھے

ہمیں عزیز ہیں ان بستیوں کی دیواریں
کہ جن کے سائے بھی دیوار بنتے جاتے تھے

وہ اور کون ترے قرب کو ترستا تھا
فریب خوردہ ہی تیرا فریب کھاتے تھے

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے تھے

اب ایک عمر سے دکھ بھی کوئی نہیں دیتا
وہ لوگ کیا تھے جو آٹھوں پہر رلاتے تھے

کشور ناہید



گریہ، مایوسی، غمِ ترکِ وفا، کچھ نہ رہا
زندگی رہ گئی، جینے کا مزا کچھ نہ رہا

روشنی تھی تو ہر اک شے کی حقیقت تھی عیاں
تیرگی میں مری آنکھوں کے سوا کچھ نہ رہا

پیرہن رنگ برنگے نکل آتے اتنے
نو دمیدہ گلِ شبو میں چھپا کچھ نہ رہا

کھا گئی خاک کو ہی خاک، کہیں کسی سے گلہ
کیا کہہ دیں کہ تہہِ خاک چھپا کچھ نہ رہا

تیرے ملنے کے نئے ڈھنگ بھی تسلیم مگر
ذائقہ اس طرح بدلا کہ مزا کچھ نہ رہا

کیوں نہ ہو حشر بپا، دادِ وفا کیوں نہ ملے
جب ترے چاہنے والوں کے سوا کچھ نہ رہا

کیوں نہ مہمانوں کے کمرے میں سجائیں انکو
علم کا نام کتابوں کے سوا کچھ نہ رہا

خوشبوئے وصل، توجہ کا وہ عالم، وہ خلوص
ڈوبتے چاند کی آغوش میں کیا کچھ نہ رہا



تشنگی اچھی نہیں رکھنا بہت
روزنِ گل سے اسے تکنا بہت

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت

جس کی آنکھوں میں نہ جھانکا جائے گا
اس کی ہی تحریر کو پڑھنا بہت

موجۂ ریگِ رواں ہے زیرِ آب
اپنی ہستی دیکھ کر بڑھنا بہت

برف کی مانند جینا عمر بھر
ریت کی صورت مگر تپنا بہت

عمر بھر کی بندشیں، خواب و خیال
دو قدم بھی ساتھ ہے چلنا بہت

خستگی ناہید بن جائے نہ جرم
اپنی ہستی دیکھ کر بڑھنا بہت

کشور ناہید

حوصلہ، شرطِ وفا کیا کرنا
بند مٹھی میں ہوا کیا کرنا

جب کوئی سنتا نہ ہو، بولنا کیا
قبر میں شور بپا، کیا کرنا

تہہ ہے لطف کی صورت آباد
اپنی آنکھوں کو بھی وا، کیا کرنا

درد ٹھہرے گا دنیا کی منزل
عکس شیشے سے جدا کیا کرنا

دل کے زنداں میں ہے آرام بہت
وسعتِ دشت نما کیا کرنا

شمعِ کشتہ کی طرح جی لیجے
دَم گھٹے بھی تو گلہ کیا کرنا

میرے پیچھے میرا سایہ ہوگا
پیچھے مڑ کر بھی بھلا کیا کرنا

کچھ کر دیں کہ زمانہ دیکھے
شور گلیوں میں سدا کیا کرنا

حسرت ہے تجھے سامنے بیٹھے کبھی دیکھوں
میں تجھ سے مخاطب ہوں، ترا حال بھی پوچھوں

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

جس نام سے تو نے مجھے بچپن سے پکارا
اک عمر گزرنے پہ بھی وہ نام نہ بھولوں

تو اشک ہی بن کے مری آنکھوں میں سما جا
میں آئینہ دیکھوں تو ترا عکس بھی دیکھوں

پوچھوں کبھی غنچوں سے، ستاروں سے، ہوا سے
تجھ سے ہی مگر آ کے ترا نام نہ پوچھوں

جو شخص کہ ہے خواب میں آنے سے بھی خائف
آئینۂ دل میں اسے موجود ہی دیکھوں

اے میری تمنا کے ستارے تو کہاں ہے
تو آئے تو یہ جسم شبِ غم کو نہ سونپوں

کشور ناہید



خیالِ طوقِ تعلق کو ٹالتے رہیے
ہوا میں کوئی ہیولہ اچھالتے رہیے

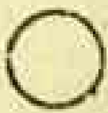
پرانے آشنا چہروں کو یاد کر کر کے
ہجومِ غم میں بھی دل کو سنبھالتے رہیے

تمام عمر یونہی کیجیے حسرتوں کا شمار
تمام عمر یونہی دکھ سنبھالتے رہیے

سجا کے روز نئی محفلیں، نئے چہرے
زرِ فسردہ دلی کو اچھالتے رہیے

رہیں نہ دشت جو صحرا نوردیوں کے لیے
تو اپنے صحن میں پتھر اچھالتے رہیے

نہ مل سکیں جو وہ یارانِ گل صفت ناہید
تو اپنے آپ کو سانچوں میں ڈھالتے رہیے



کبھی نظر تو آ آنکھوں کی روشنی بن کر
زمینِ خشک کو سیراب کر، نمی بن کر

رچا ہوا ہے تری کم نگاہیوں کا کرم
نشے کی طرح مرے دل میں، سرخوشی بن کر

کبھی تو آ ستمِ جاں گسل ہی دینے کو
کبھی گزر انہی راہوں سے، اجنبی بن کر

خوشا کہ اور ملا غم کا تازیانہ ہمیں
خوشا وہ درد جو چھایا ہے نغمگی بن کر

ہوئی نہ ان سے وفا، تم سے کیا ہوا ناہید
ابھی تلک جیسے جاتی ہو باولی بن کر

عبیداللہ علیم



یہ اور بات کہ اِس عہد کی نظر میں ہوں
ابھی میں کیا کہ ابھی منزلِ سفر میں ہوں،

ابھی نظر نہیں ایسی کہ دُور تک دیکھوں،
ابھی خبر نہیں مجھ کو کہ کس اثر میں ہوں

پگھل رہے ہیں جہاں لوگ شعلۂ جاں سے
شریک میں بھی اسی محفلِ ہنر میں ہوں

جو چاہے سجدہ گزارے، جو چاہے ٹھکرا دے
پڑا ہوا میں زمانے کی رہ گذر میں ہوں

جو سایہ ہو تو ڈروں اور دھوپ ہو تو جلوں،
کہ ایک نخلِ مزحتکِ نوحہ گر میں ہوں

کرن کرن کبھی خورشید بن کے نکلوں گا
ابھی چراغ کی صورت میں اپنے گھر میں ہوں

بچھڑ گئی ہے وہ خوشبو، اجڑ گیا ہے وہ رنگ
بس اب تو خواب سا کچھ اپنی چشمِ تر میں ہوں

عبید اللہ علیمؔ



خیال و خواب ہوئی ہیں محبتیں کیسی
لہو میں ناچ رہی ہیں یہ وحشتیں کیسی

نہ شب کو چاند ہی اچھا نہ دن کو مہر اچھا
یہ ہم پہ بیت رہی ہیں قیامتیں کیسی

وہ ساتھ تھا تو خدا بھی تھا مہرباں کیا کیا
بچھڑ گیا تو ہوئی ہیں عداوتیں کیسی

عذاب جن کا تبسّم، ثواب جن کی نگاہ
کھنچی ہوئی ہیں پسِ جاں یہ صورتیں کیسی

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

جو بے خبر کوئی گذرا تو یہ صدا دی ہے
میں سنگِ راہ ہوں مجھ پر عنایتیں کیسی

نہیں کہ حسن ہی نیرنگیوں میں طاق نہیں
جنوں بھی کھیل رہا ہے سیاستیں کیسی،

نہ صاحبانِ جنوں ہیں نہ اہلِ کشف و کمال
ہمارے عہد میں آئیں کثافتیں کیسی

جو ابر ہے، سو وہ اب سنگ و خشت لاتا ہے
فضا یہ ہو تو دلوں کی نزاکتیں کیسی

یہ دورِ بے ہنراں ہے، بچا رکھو خود کو
یہاں صداقتیں کیسی، کرامتیں کیسی

عبید اللہ علیم



ہر آواز زمستانی ہے ہر جذبہ زندانی ہے
کوچۂ یار سے دار و رسن تک ایک سی ہی ویرانی ہے

کتنے کوہ گراں کاٹے تب صبح طرب کی دید ہوئی
اور یہ صبح طرب بھی یارو کہتے ہیں بیگانی ہے

جتنے آگ کے دریا ہیں سب پار ہمیں کو کرنا ہیں
دُنیا کس کے ساتھ آئی ہے، دُنیا تو دیوانی ہے

لمحہ لمحہ خواب دکھائے اور سو سو تعبیر کرے
لذت کم آزار بہت ہے جس کا نام جوانی ہے

دل کہتا ہے وہ کچھ بھی ہو اس کی یاد جگائے رکھ
عقل یہ کہتی ہے کہ توہم پر جینا نادانی ہے

تیرے پیار سے پہلے کب تھا دل میں ایسا سوز و گداز
تجھ سے پیار کیا تو ہم نے اپنی قیمت جانی ہے

آپ بھی کیسے شہر میں آ کر شاعر کہلائے ہیں علیم
درد جہاں کمیاب بہت ہے نغموں کی ارزانی ہے



پا بہ زنجیر سہی، زمزمہ خواں ہیں ہم لوگ
محفلِ وقت، تری روحِ رواں ہیں ہم لوگ

دوش پر بارِ شبِ غم لیے گل کی مانند
کون سمجھے کہ محبت کی زباں ہیں ہم لوگ

خوب پایا ہے صلہ تیری پرستاری کا
دیکھ اے صبحِ طرب، آج کہاں ہیں ہم لوگ

اک متاعِ دل و جاں پاس تھی، سو ہار چکے
ہائے یہ وقت کہ اب خود پہ گراں ہیں ہم لوگ

نکہتِ گل کی طرح ناز سے چلنے والو
ہم بھی کہتے تھے کہ آسودۂ جاں ہیں ہم لوگ

کوئی بتلائے کہ کیسے یہ خبر عام کریں،
ڈھونڈتی ہے جسے دُنیا وہ نشاں ہیں ہم لوگ

قسمتِ شب زدگاں جاگ ہی جائے گی علیم
جرسِ قافلۂ خوش خبراں ہیں ہم لوگ

عبیداللہ علیم



گذرو نہ اس طرح کہ تماشا نہیں ہوں میں
سمجھو کہ اب ہوں اور دوبارہ نہیں ہوں میں

اِک طبعِ رنگ رنگ تھی سو نذرِ گُل ہوئی
اب یہ کہ اپنے ساتھ بھی رہتا نہیں ہوں میں

تم نے بھی میرے ساتھ اُٹھائے ہیں دُکھ بہت
خوش ہوں کہ راہِ شوق میں تنہا نہیں ہوں میں

پیچھے نہ بھاگ، وقت کی اے ناشناس دُھوپ
سایوں کے درمیان ہوں، سایہ نہیں ہوں میں

جو کچھ بھی ہوں میں اپنی ہی صورت میں ہوں علیم
غالب نہیں ہوں میر و یگانہ نہیں ہوں میں



جوانی کیا ہوئی اِک رات کی کہانی ہوئی
بدن پُرانا ہوا، روح بھی پُرانی ہوئی

کوئی عزیز نہیں ماسوائے ذات ہمیں
اگر ہوا ہے تو یوں جیسے زندگانی ہوئی

نہ ہوگی خشک کہ شاید وہ لوٹ آئے پھر
یہ کشت گذرے ہوئے ابر کی نشانی ہوئی

تم اپنے رنگ نہاؤ میں اپنی موج اُڑوں
وہ بات بھول بھی جاؤ جو آنی جانی ہوئی

میں اس کو بھول گیا ہوں، وہ مجھ کو بھول گیا
تو پھر یہ دل پہ کیوں دستک سی ناگہانی ہوئی

کہاں تک اور بھلا جاں کا ہم زیاں کرتے
بچھڑ گیا ہے تو یہ اس کی مہربانی ہوئی

فنون ـــ ۱۳۴۳

عبید اللہ علیم



عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی سنبھل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

مِلے ہیں یُوں تو بہت، آؤ اب مِلیں یُوں بھی،
کہ رُوح گرمیِ انفاس سے پگھل جائے

محبّتوں میں عجب ہے دِلوں کو دھڑکا سا
کہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے

زہے وہ دِل جو تمنّائے تازہ تر میں رہے
خوشا وہ عمر جو خوابوں ہی میں بہل جائے

مَیں وہ چراغِ سرِ رہگزارِ دُنیا ہُوں
جو اپنی ذات کی تنہائیوں میں جل جائے

ہر ایک لحظہ یہی آرزو، یہی حسرت
جو آگ دل میں ہے وہ شعر میں بھی ڈھل جائے



مَیں جس میں کھو گیا ہوں مرا خواب ہی تو ہے
یک دو نفس نمود سہی، زندگی تو ہے

جلتی ہے کتنی دیر ہواؤں میں میرے ساتھ
اِک شمع پھر مرے لیے روشن ہوئی تو ہے

جس میں بھی ڈھل گئی اسے مہتاب کر گئی
میرے لہو میں ایسی بھی اِک روشنی تو ہے

پرچھائیوں میں ڈوبتا دیکھوں بھی مہرِ عشر
اور پھر بچا نہ پاؤں، یہ بے چارگی تو ہے

تو بوئے گل ہے اور پریشاں ہوا ہوں مَیں
دونوں میں ایک رشتۂ آوارگی تو ہے

اے خواب خوابِ عمرِ گریزاں کی ساعتو
تم سُن سکو تو بات مری گفتنی تو ہے

عبید اللہ علیمؔ



بنا گلاب تو کانٹے چبھا گیا اِک شخص
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اِک شخص

تمام رنگ مرے اور سارے خواب مرے
فسانہ تھے کہ فسانہ بنا گیا اِک شخص

مَیں کس ہوا میں اُڑوں، کس فضا میں لہراؤں
دُکھوں کے جال ہر اِک سو بچھا گیا اِک شخص

پلٹ سکوں ہی نہ آگے ہی بڑھ سکوں جس پر
مجھے یہ کون سے رستے لگا گیا اِک شخص

محبتیں بھی عجب اُس کی نفرتیں بھی کمال
مری طرح کا ہی مجھ میں سما گیا اِک شخص

محبتوں نے کسی کی بُھلا رکھا تھا اُسے
ملے وہ زخم کہ پھر یاد آ گیا اِک شخص

وہ ماہتاب تھا، مرہم بدست آیا تھا،
مگر کچھ اور سوا دل دُکھا گیا اِک شخص

کُھلا یہ راز کہ آئینہ خانہ ہے دُنیا
اور اُس میں مجھ کو تماشا بنا گیا اِک شخص



شکستِ جاں سے سوا بھی ہے کارِ فن کیا کیا
عذاب کھینچ رہا ہے مرا بدن کیا کیا

نہ کوئی ہجر کا دن ہے نہ کوئی وصل کی رات
مگر وہ شخص کہ ہے جانِ انجمن کیا کیا

ادا ہوئی ہے کئی بار ترکِ عشق کی رسم
مگر ہے سر پہ وہی فتنۂ حسن جان و تن کیا کیا

نگاہِ بوالہوساں ہائے کیا قیامت ہے
بدل رہے ہیں گل و لالہ پیرہن کیا کیا

گزر گئے تو گزرتے رہے بہت خورشید
جو رنگ لائی تو لائی ہے اِک کرن کیا کیا

قریب تھا کہ میں کارِ جنوں سے باز آؤں
کھنچی خیال میں تصویرِ کوہکن کیا کیا

ریاض مجید



بدل سکا نہ جدائی کے غم اُٹھا کر بھی
کہ میں تو میں ہی رہا تجھ سے دُور جا کر بھی

میں سخت جان تھا اس کرب سے بھی بچ نکلا
میں جی رہا ہوں تجھے ہاتھ سے گنوا کر بھی

خدا کرے تجھے دُوری ہی راس آجائے
تو کیا کرے گا بھلا اب یہاں پر آ کر بھی

ابھی تو میرے بکھرنے کا کھیل باقی ہے
میں خوش نہیں ہوں ابھی اپنا گھر لُٹا کر بھی

میں اس کو سطح سے محسوس کر کے بھی خوش ہوں
وہ مطمئن ہی نہیں میری تہہ کو پا کر بھی

ابھی تک اُس نے کوئی بھی تو فیصلہ نہ کیا
وہ چپ ہے مجھ کو ہر اک طرح آزما کر بھی

اِسی ہجوم میں لڑ بھڑ کے زندگی کر لو
رہا نہ جائے گا دُنیا سے دُور جا کر بھی

وہ لوگ اور ہی تھے جن کا عجز پھل لایا
ہمیں تو کچھ نہ ملا اپنے کو مٹا کر بھی

کھُلا یہ بھید کہ تنہائیاں ہی قسمت ہیں
اک عمر دیکھ لیا محفلیں سجا کر بھی

غزل کہے پہ بھی سوچوں کا بوجھ کم نہ ہوا
سکوں نہ مل سکا احوالِ دل سُنا کر بھی

رُکا نہ ظلم میرے راکھ بننے پر بھی ریاضؔ
ہوا کی خُو تو وہی ہے مجھے جلا کر بھی

ریاض مجید



درد غزل میں ڈھلنے سے کتراتا ہے
خالی کاغذ میری ہنسی اڑاتا ہے

کس چاہت سے قلم پکڑ کر بیٹھے تھے
اب تو ایک بھی لفظ نہیں بن آتا ہے

آڑی ترچھی لکیروں سے کب بات بنی
شوق اندھا ہے، ہوا پہ نقش بناتا ہے

کس کی صدائیں میرا تعاقب کرتی ہیں
دیس نکالے شخص کو کون بلاتا ہے

یادیں ٹیسیں سی بن کر رہ جاتی ہیں
گزرا موسم پھر کب لوٹ کے آتا ہے

کس کا رستہ دیکھ رہے ہیں گھر کے کواڑ
سُونا سُونا آنگن کِسے بلاتا ہے

کن کن صحراؤں کی خاک اڑانی پڑی
دل بھی کیسے کیسے ناچ نچاتا ہے

جھوٹی سچی، جو جی چاہے، کہتے جاؤ
کون کسی کے دل میں اُترا جاتا ہے

وقت کی بات ہے پیارے، چاہے مان نہ مان
میٹھا کڑوا سب سُننا پڑ جاتا ہے

میرے آگے بھاگ رہے ہیں چاند ریاضؔ
میرے پیچھے میرا سایہ آتا ہے

ریاض مجید



رات دن آغوشِ وا اک وہ کھُلا در ہی تو تھا
منتظر میرا وطن میں اک مرا گھر ہی تو تھا

آنکھ میں کب اس کی قربت کی چمک محفوظ تھی
نقش تھا جو ذہن پر، رخصت کا منظر ہی تو تھا

جو بہا کر لے گئیں، چاہت کی لہریں ہی تو تھیں
جس میں ڈوبا ہوں وہ خواہش کا سمندر ہی تو تھا

رُوح کی تہ میں جو اُترا ہے بدن کو چھید تا
وہ تری جانب سے پھینکا ایک کنکر ہی تو تھا

جس کو چمکاتے رہے، وہ اُس کی قسمت ہی تو تھی
بس نہ جس پر چل سکا، اپنا مقدّر ہی تو تھا

مجھ کو لے ڈوبی ادھوری رہ نوردی کی تھکن
پاؤں کا چھالا، مرے رستے کا پتھر ہی تو تھا

میں اُسے چھُو بھی اگر لیتا تو کیا ہوتا ریاضؔ
جس نے مجھ کو روک رکھا تھا، مرا ڈر ہی تو تھا



جب اگلے سال یہی وقت آ رہا ہوگا
یہ کون جانتا ہے، کون کس جگہ ہوگا

تو میرے سامنے بیٹھا ہے اور میں سوچتا ہوں
کہ آتے لمحوں میں جینا بھی اک سزا ہوگا

ہم اپنے اپنے بکھیڑوں میں پھنس چکے ہوں گے
نہ تجھ کو میرا، نہ مجھ کو ترا پتہ ہوگا

یہی جگہ جہاں ہم آج مل کے بیٹھے ہیں
اسی جگہ پہ، خدا جانے، کل کو کیا ہوگا

یہی دہکتے ہوئے پل دھواں دھواں ہوں گے
یہی چمکتا ہوا دن بجھا بجھا ہوگا

لہو رُلائے گا وہ دھوپ چھاؤں کا منظر
نظر ٹھاؤں گا جس سمت، جھٹپٹا ہوگا

بچھڑنے والے! تجھے دیکھ دیکھ سوچتا ہوں
تو پھر ملے گا تو کتنا بدل چکا ہوگا

ریاض مجید



چھپے ہوئے تھے جو نقدِ شعور کے ڈر سے
نکل سکے نہ وہ جذبات میرے اندر سے
کبھی بھی شہرِ طلسماتِ دل کی سیر نہ کی
ہر ایک جلوہ لیا مستعار باہر سے
رہے ہم اپنی ہی گہرائیوں سے ناواقف
اُتر سکی نہ کبھی کائی سطحِ دل پر سے
سکوں کی جنتیں دوزخ نہیں اذیت کا
عجیب حال ہوا آگہی کے محشر سے
ہماری بچوں سی معصومیت ہوئی زخمی
لہولہان ہوا دل خرد کے پتھر سے
نظر سے دیکھ لو ہم ریت کے گھروندوں کو
ہمیں نہ چھوڑ کہ ہم کھوکھلے ہیں اندر سے
ہماری کوشش بے سود اُس کو کیا پاتی
حصول جس کا تھا ممکن فقط مقدر سے
ریاض شام ڈھلی، اب تو گھر کو لوٹ چلو
طلوعِ صبح سے پہلے کے نکلے ہو گھر سے



کسی بھی طور طبیعت کہاں سنبھلنے کی
تو مل بھی جائے تو حالت نہیں بدلنے کی
خود اپنی ہم سفری سے بھی ہو گئے محروم
کہ آرزو تھی تجھے ساتھ لے کے چلنے کی
کسی طرح تو ملے قہرِ بےکسی سے نجات
کوئی تو راہ ہو اس کرب سے نکلنے کی
اسیر ہی رہے ہم پچھلے عہد ناموں کے
ہمیں خبر ہی نہیں تھی رُتیں بدلنے کی
ہواؤں نے ہمیں جڑ سے اُکھاڑ کر پھینکا
کہ آرزو تھی ہمیں پھولنے کی، پھلنے کی
بنا لیا ہمیں اپنی ہی طرح کا تو نے
ہمیں جو ضد تھی تری خواہشوں میں ڈھلنے کی
اُداس شاموں کو کیا دیکھ دیکھ روتے ہو
ابھی تو آئیں گی راتیں لہو اُگلنے کی
ایک ایسے وقت میں، جب زندگی بھی موڑ گئی
ریاض کون سی صورت ہو دل بہلنے کی

ریاض مجید



کون سے جذبات لے کر تیرے پاس آیا کروں
تو بتا، کس زاویے سے میں تجھے دیکھا کروں

یہ بھی اک شرطِ سفر ہے، ہم سفر کوئی نہ ہو
جس کسی بھی راستے کو طے کروں، تنہا کروں

اے گزرتے وقت! تو کب میرے بس میں آئے گا
لمحۂ پرّاں! بتا کب تک ترا پیچھا کروں

حلقۂ احباب بڑھتا جا رہا ہے دن بدن
اب میں اپنے آپ کو بھی اور کچھ گہرا کروں

کیا ترے ہی قرب کے محتاج تھے سب سلسلے
کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ میں اب کیا کروں

ان گنت بنتی بگڑتی خواہشوں کی زد میں ہوں
دل کہیں ٹھہرا بھی ہو، میں دل کا کیا کہنا کروں

میرے ملنے والوں میں سے کون ملتا ہے تجھے
تو کہاں ہے، اور کیسا ہے، کسے پوچھا کروں

مجھ میں بھی تیری طبیعت کا ذرا سا رنگ ہے
تو نہیں تو کیوں نہ اپنے آپ کو چاہا کروں

میرے شعروں میں تری بے چارگی کا دکھ بھی ہو
کاش جو تو سوچتا ہے، وہ بھی میں لکھا کروں

کیا سے کیا ہوتے کا دکھ بھی کتنا کرب انگیز ہے
کس توقع پر ریاض، اب آئینہ دیکھا کروں



وہ دل کہ تھا کبھی سرسبز کھیتوں کی طرح
سُلگ رہا ہے جھلستے ہوئے تھلوں کی طرح

یہ شہر جس کی زمیں کو بھی مجھ سے شکوے ہیں
رہے گا یاد، پرانی محبتوں کی طرح

کسی جگہ پہ بھی سیماب دل ٹھہر نہ سکا
جہاں کی سیر کو نکلے مسافروں کی طرح

اُترتی ذہن میں بھی خوشگوار دھوپ کبھی
شروعِ گرما کے کھلتے ہوئے دنوں کی طرح

لہو رُلاتی ہے، بے وقت تنگ کرتی ہے
یہ اس کی یاد بھی بے رُت کی بارشوں کی طرح

تمہاری چاہ کا انجام، دیکھیے کیا ہو
لگا کے بیٹھے ہیں داؤ، جواریوں کی طرح

خود اپنے سائے سے بھی کانپ کانپ اٹھتا ہوں
میں سہما پھرتا ہوں، مفرور ملزموں کی طرح

اُس آنکھ میں کوئی بے رنگ سی کشش تھی ریاض
پرانے قلعوں میں کندہ عبارتوں کی طرح

ریاض مجید



سطح بیں تھے سب، رہے باہر کی کائی دیکھتے
لوگ کیسے میرے اندر کی صفائی دیکھتے

اس سے ملنے کا نشاں تک بھی نظر آتا نہیں
ایک مدت ہو گئی راہِ جدائی دیکھتے

ہم تو اپنی وسعتِ دل سے بھی کوسوں دور تھے
تیرے دل تک کس طرح اپنی رسائی دیکھتے

آپ ہی تھک ہار کر اپنے کو بے حس کر لیا
زندگی! کب تک تری بے اعتنائی دیکھتے

یوں نہ کھو جاتے فضائے یاس میں دنیا کے ساتھ
کاش! اپنا ہی لب و لہجہ رجائی دیکھتے

دل کی مجبوری سے بڑھ کر کوئی مجبوری نہ تھی
ہم بھی کچھ کرتے اگر خود سے رہائی دیکھتے

کاش! دھرتی پہ گرا خوں رنگ سے آثارِ جن
جیتے جی ہم اپنی فصلوں کی کٹائی دیکھتے



معصوم خواہشوں کی پشیمانیوں میں تھا
جینے کا لطف تو انہی نادانیوں میں تھا

آنکھیں بچھاتے ہر کس و ناکس کی راہ میں
یوں جذبۂ خلوص فراوانیوں میں تھا

ندی میں پہروں جھانکتے رہتے تھے پل سے ہم
کیا بھید تھا جو بہتے ہوئے پانیوں میں تھا

پتھر بنے کھڑے تھے تجسس کے دشت میں
دل گم طلسمِ شوق کی حیرانیوں میں تھا

یوں رینگ رینگ کر نہ گزرتے تھے روز و شب
دریائے زیست بھی کبھی جولانیوں میں تھا

سنجیدگی کی گہری لکیروں میں ڈھل گیا
معصومیت کا نور جو پیشانیوں میں تھا

اک گھر بنا کے کتنے جھمیلوں میں پھنس گئے
کتنا سکون بے سر و سامانیوں میں تھا

دن آرزو کے یونہی اداسی میں کٹ گئے
وہ اپنے دکھ میں، اپنی پریشانیوں میں تھا

اُس کے لئے بھی زندگی پل پل عذاب تھی
وہ بھی شگفتہ وقت کے زندانیوں میں تھا

وہ ضبط و اعتدال و توازن کہاں ریاضؔ
معیارِ فن کہ جو کبھی یونانیوں میں تھا

انور مسعود



پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ مٹ بھی گئی تھی
بجلی نے گھٹاؤں پہ جو تحریر لکھی تھی

اُس شہر کے دیوار و در آسیب زدہ تھے
گلیوں میں بھی تا حدِّ نظر برف جمی تھی

چُپ سادھ کے بیٹھے تھے سبھی لوگ وہاں پر
پردے پہ جو تصویر تھی، کچھ بول رہی تھی

لہراتے ہوئے آئے تھے وہ امن کا پرچم
پرچم کو اٹھائے ہوئے نیزے کی انی تھی

ڈوبے ہوئے تاروں پہ میں کیا اشک بہاتا
چڑھتے ہوئے سورج سے مری آنکھ لڑی تھی

اس وقت وہاں کون دھواں دیکھنے جائے
اخبار میں پڑھ لیں گے، کہاں آگ لگی تھی

شبنم کی تراوش سے بھی دُکھتا تھا دلِ زار
گھنگھور گھٹاؤں کو برسنے کی پڑی تھی

میں رات تڑپتا ہی رہا وقفہ بہ وقفہ
پازیب تری یاد کی تھم تھم کے بجی تھی

تم نے نہ سُنی عدل کی زنجیر کی آواز
میں نے تو خموشی کی بھی فریاد سُنی تھی

پلکوں کے ستارے بھی اُڑا لے گئی انورؔ
وہ درد کی آندھی کہ سرِ شام چلی تھی

انور مسعود



اُسے تو پاسِ خلوصِ وفا ذرا بھی نہیں
مگر یہ آس کا رشتہ، کہ ٹوٹتا بھی نہیں

گھرے ہوئے ہیں خموشی کی برف میں کب سے
کسی کے پاس کوئی تیشۂ صدا بھی نہیں

مآلِ غنچہ و گُل ہے مری نگاہوں میں
مجھے تبسمِ کاذب کا حوصلہ بھی نہیں

طلوعِ صبحِ ازل سے میں ڈھونڈتا تھا جسے
ملا تو ہے، پہ مری سمت دیکھتا بھی نہیں

مری صدا سے بھی رفتار تیز تھی اُس کی
مجھے گلہ بھی نہیں ہے جو وہ رُکا بھی نہیں

بکھر گئی ہے نگاہوں کی روشنی ورنہ
نظر نہ آئے وہ، اتنا تو فاصلہ بھی نہیں

سُنا ہے آج کا موضوعِ مجلسِ تنقید
وہ شعر ہے کہ ابھی میں نے جو کہا بھی نہیں

سمٹ رہے ہیں ستاروں کے فاصلے انورؔ
پڑوسیوں کو مگر کوئی جانتا بھی نہیں

انور مسعود



دنیا بھی عجب قافلۂ تشنہ لباں ہے
ہر شخص سرابوں کے تعاقب میں رواں ہے

تنہا تری محفل میں نہیں ہوں کہ مرے ساتھ
اک لذتِ پابندیِ اظہار و بیاں ہے

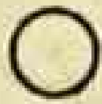
حق بات پہ ہے زہر بھرے جام کی تعزیر
اے غیرتِ ایماں، لبِ سقراط کہاں ہے

کھیتوں میں سماتی نہیں پھولی ہوئی سرسوں
باغوں میں ابھی تک وہی ہنگامِ خزاں ہے

احساس مرا ہجر گزیدہ ہے ازل سے
کیا مجھ کو اگر کوئی قریبِ رگِ جاں ہے

جو دل کے سمندر سے ابھرتا ہے، یقیں ہے
جو ذہن کے ساحل سے گزرتا ہے، گماں ہے

پھولوں پہ گھٹاؤں کے تو سائے نہیں انورؔ
آوارۂ گلزار نشیمن کا دھواں ہے



جو بارشوں میں جلے، تند آندھیوں میں جلے
چراغ وہ جو بگولوں کی چمنیوں میں جلے

وہ لوگ تھے جو فریبِ نظر کے متوالے
تمام عمر سرابوں کے پانیوں میں جلے

کچھ اس طرح سے لگی آگ بادبانوں کو
کہ ڈوبنے کو بھی ترسے جو کشتیوں میں جلے

یہی ہے فیصلہ تیرا کہ جو تجھے چاہے
وہ درد و کرب و الم کی کٹھالیوں میں جلے

دامِ فراق یہ مانا وہ مسکرایا تھا
مگر وہ دیپ کہ چپکے سے انکھڑیوں میں جلے

وہ جھیل جھیل میں جھرمٹ نہ تھے ستاروں کے
چراغ تھے کہ جو چاندی کی تھالیوں میں جلے

دھواں دھواں ہے درختوں کی داستاں انورؔ
کہ جنگلوں میں پلے اور بستیوں میں جلے

انور مسعود



اِس ابتدا کی سلیقے سے انتہا کرتے
وہ ایک بار ملے تھے تو پھر ملا کرتے

گواڑ گرچہ مقفّل تھے اس حویلی کے
مگر فقیر گزرتے رہے صدا کرتے

تجھے نہیں ہے ابھی فرصتِ کرم، نہ سہی
تھکے نہیں ہیں مرے ہاتھ بھی دعا کرتے

تری جفا کا فلک سے نہ تذکرہ چھیڑا
ہنر کی بات کسی کم ہنر سے کیا کرتے

ہمیں قرینۂ رنجش کہاں میسّر ہے
ہم اپنے بس میں جو ہوتے، ترا گلا کرتے

انہیں شکایتِ بے ربطیِ سخن تھی مگر
جھجک رہا تھا میں اظہارِ مدّعا کرتے

چقیں گری تھیں دریچوں پہ چار سُو انورؔ
نظر جھکا کے نہ چلتے تو اور کیا کرتے



درمیاں گر نہ ترا وعدۂ فردا ہوتا
کس کو منظور یہ زہرِ غمِ دنیا ہوتا

کیا قیامت ہے کہ اب میں بھی نہیں، وہ بھی نہیں
دیکھنا تھا تو اُسے دُور سے دیکھا ہوتا

کاسۂ زخمِ طلب لے کے چلا ہوں خالی
سنگریزہ ہی کوئی آپ نے پھینکا ہوتا

فلسفہ سر بگریباں ہے بڑی مدّت سے
کچھ نہ ہوتا تو خدا جانے کہ پھر کیا ہوتا

ہم بھی نوخیز شعاعوں کی بلائیں لیتے
اپنے زنداں میں اگر کوئی دریچہ ہوتا

آپ نے حالِ دلِ زار تو پوچھا لیکن
پوچھنا تھا تو کوئی اس کا مداوا ہوتا

دستِ مفلس سے تہی تر ہے سفینہ انورؔ
اس پہنچنے سے تو ساحل پہ نہ پہنچا ہوتا

انور مسعود



میں دیکھ بھی نہ سکا میرے گرد کیا کیا تھا
کہ جس مقام پہ میں تھا، وہاں اُجالا تھا

درست ہے کہ وہ جنگل کی آگ تھی لیکن
وہیں قریب ہی دریا بھی اِک گزرتا تھا

تم آ گئے تو چمکنے لگی ہیں دیواریں
ابھی ابھی تو یہاں پر بڑا اندھیرا تھا

لبوں پہ خیر تبسم بکھر بکھر ہی گیا
یہ اور بات کہ ہنسنے کو دل ترستا تھا

سنا ہے لوگ بہت سے ملے تھے رستے میں
مری نظر سے تو بس ایک شخص گزرا تھا

اُلجھ پڑی تھی مقدر سے آرزو میری
دمِ فراق اُسے روکنا بھی چاہا تھا

مہک رہا ہے چمن کی طرح وہ آئینہ
کہ جس میں تو نے کبھی اپنا روپ دیکھا تھا

گھٹا اٹھی ہے تو پھر یاد آ گیا انور
عجیب شخص تھا، اکثر اداس رہتا تھا



میری قسمت کہ وہ اب ہیں مرے غمخواروں میں
کل جو شامل تھے ترے حاشیہ برداروں میں

زہر ایجاد کرو اور یہ پیہم سوچو
زندگی ہے کہ نہیں دوسرے سیاروں میں

کتنے آنسو ہیں کہ پلکوں پہ نہیں آ سکتے
کتنی خبریں ہیں جو چھپتی نہیں اخباروں میں

اب تو دریا کی طبیعت بھی ہے گرداب پسند
اور وہ پہلی سی سکت بھی نہیں پتواروں میں

آپ کے قصر کی جانب کوئی دیکھے تو بجا
جرم ثابت ہو تو چن دیجیے دیواروں میں

آج تہذیب کے تیور بھی ہیں غاروں جیسے
دفن ہو جائے نہ کل اپنے ہی انباروں میں

اپنی آواز کو بھی کان ترستے ہیں مرے
جنسِ گفتار لیے پھرتا ہوں بازاروں میں

تہمتیں حضرتِ انساں پہ نہ دھریے انور
دشمنی ہے کہ چلی آتی ہے تلواروں میں

انور مسعود



درد بڑھتا ہی رہے ایسی دوا دے جاؤ
کچھ نہ کچھ میری وفاؤں کا صلا دے جاؤ

یوں نہ جاؤ کہ میں رو بھی نہ سکوں فرقت میں
میری راتوں کو ستاروں کی ضیا دے جاؤ

ایک بار آؤ کبھی اتنے اچانک پن سے
نااُمیدی کو تحیُّر کی سزا دے جاؤ

دشمنی کا کوئی پیرایۂ نادر ڈھونڈو
جب بھی آؤ مجھے جینے کی دعا دے جاؤ

وہی اخلاص و مروّت کی پُرانی تہمت
دوستو، کوئی تو الزام نیا دے جاؤ

کوئی صحرا بھی اگر راہ میں آئے انورؔ
دل یہ کہتا ہے کہ اک بار صدا دے جاؤ



اگلے دن کچھ ایسے ہوں گے
چھلکے پھلوں سے مہنگے ہوں گے

ننھی ننھی چیونٹیوں کے بھی
ہاتھی جیسے سائے ہوں گے

بھیڑ تو ہو گی لیکن پھر بھی
سُونے سُونے رستے ہوں گے

پھول کھلیں گے تنہا تنہا
جھرمٹ جھرمٹ کانٹے ہوں گے

لوگ اسے بھگوان کہیں گے
جس کی جیب میں پیسے ہوں گے

ریت جلے گی دھوپ میں انورؔ
برف پہ بادل چھائے ہوں گے

زبیر رضوی



پوچھ نہ ہم سے کیسے تجھ تک نقدِ دل و جاں لائے ہم
کن راہوں سے بچ کر نکلے، کس کس سے کترائے ہم

رات اکیلا پا کر خود کو میخانے لے آئے ہم
پی کر جھومے، جھوم کے ناچے، دیر تلک لہرائے ہم

دنیا والوں نے جینے کی شرطیں کٹھن لگائی تھیں
خوشبو بن کر پھیل گئے ہم، بادل بن کر چھائے ہم

کیسے کیسے رشتے جوڑے اجنبیوں نے بھی ہم سے
ساگر تہہ سے دو اِک موتی جب سے چُن کر لائے ہم

شہرِ دل میں رات کوئی سوداگر بن کر آیا تھا
نقدِ دل و جاں سونپ گئے اس کو، صبح بہت پچھتائے ہم

تشبیہوں کے رنگ محل میں کوئی نہ تجھ کو جان سکا
گیت سنا کر، غزلیں کہہ کر، دیوانے کہلائے ہم

چندا جیسا روپ تھا اپنا، پھولوں جیسی رنگت تھی
تیرے غم کی دھوپ میں جل کر کملائے مرجھائے ہم

زبیر رضوی



دل کے تاتار میں یادوں کے اب آہو بھی نہیں

آئینہ مانگیں جو ہم سے وہ پری رو بھی نہیں

دشتِ تنہائی میں آواز کے گھنگھرو بھی نہیں

اور ایسا بھی کہ سناٹے کا جادو بھی نہیں

زندگی جن کی رفاقت پہ بہت نازاں تھی

ان سے بچھڑی تو کوئی آنکھ میں آنسو بھی نہیں

تلخیاں نیم کے پتوں کی ملی ہیں ہر سُو

یہ مرا شہر کسی پھول کی خوشبو بھی نہیں

جانے کیا سوچ کے ہم رُک گئے ویرانوں میں

پرتوِ رُخ بھی نہیں، سایۂ گیسو بھی نہیں

حُسنِ امروز کو تشبیہوں میں تولیں کیسے

اب وہ پہلے سے خمِ کاکل و ابرو بھی نہیں

بے حجاب ایسے کہ پہلو سے نہ ہٹ کر بیٹھیں

احتیاط ایسی، کبھی ہم کو کہا تُو بھی نہیں

ہم نے پائی ہے ان اشعار پہ بھی داد زبیرؔ

جن میں اُس شوخ کی تعریف کے پہلو بھی نہیں

زبیر رضوی



شوق، عریاں ہے بہت جن کے شبستانوں میں
وہ ملے ہم کو حجابوں کے صنم خانوں میں،

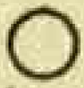
کھڑکیاں کھولو کہ در آئے کوئی موجِ ہوا!!
راکھ کا ڈھیر ہیں۔ کچھ لوگ طرب خانوں میں

شہرِ خورشید کے لوگوں کو خبر دو کوئی
دن کے غم ڈوب گئے رات کے پیمانوں میں

جب کوئی ساعتِ شاداب ملی جام بکف
جان سی پڑ گئی بجھتے ہوئے ارمانوں میں

اے صبا، بیکسے چل آ کسی بادل کی پھوار
خاک اُڑتی ہے بہت دل کے بیابانوں میں

اے غزالانِ وطن، ناز کرو ہم پہ، کہ ہم
آخری پشت ہیں خوباں کے ثنا خوانوں میں



اپنے گھر کے در و دیوار کو اونچا نہ کرو
اتنا گہرا مری آواز سے پردہ نہ کرو

کل نہ ہو یہ کہ ترس جائے مکینوں کو یہ گھر
دل کے آسیب کا ہر ایک سے چرچا نہ کرو

جو نہ اک بار بھی چلتے ہوئے مڑ کے دیکھیں
ایسی مغرور تمناؤں کا پیچھا نہ کرو

اپنی پہچان کے سب رنگ مٹا دو نہ کہیں
خود کو اتنا غمِ جاناں سے شناسا نہ کرو

ہو اگر ساتھ کسی شوخ کی خوشبوئے بدن
راہ چلتے ہوئے مہ پاروں کو دیکھا نہ کرو

عشق آثار زلیخاؤں کی اس بستی میں
صاحبو، پاکئ داماں پہ بھروسا نہ کرو

زبیر رضوی



برسوں میں تجھے دیکھا تو احساس ہُوا ہے
ہر زخم تری یاد کا اندر سے ہرا ہے

وہ کون تھا کس سمت گیا، ڈھونڈ رہا ہوں
زنجیرِ درِ دل کوئی کھٹکا کے گیا ہے

جی چاہے اسے وقت کے ہاتھوں سے اُڑا لے
جو روح کی خاموش گپھاؤں میں ملا ہے

پتھر کے صنم پوجو کہ مٹی کے خُداوند
ہر بابِ کرم، دیر ہوئی بند پڑا ہے

پوچھو نہ مرے عہد کے انساں کی حکایت
تنہائی کے صحراؤں میں حیران کھڑا ہے



چھوڑ کر گھر کی فضا رعنائیاں پچھتا گئیں
راستوں کی دھول میں آرائشیں کمھلا گئیں،

کس نے پھیلا دی مرے آنگن میں چادر دھوپ کی
میرے مہتابوں کی ساری صورتیں کملا گئیں

مدتوں کے بعد جی چاہا تھا، چھت پر سوئیے
رات پہلو میں نہ آئی تھی کہ بوندیں آ گئیں

کوچہ کوچہ کاٹتے پھرتے ہیں یادوں کا لکھا
دل کو جانے کیا تری رسوائیاں سمجھا گئیں

دور تک کوئی نہ آیا ان رُتوں کو چھوڑنے
بادلوں کو جو دھنک کی چوڑیاں پہنا گئیں

شام کی دہلیز پہ ٹھہری ہوئی یادیں زبیرؔ
غم کی محرابوں کے دھندلے آئینے چمکا گئیں

زبیر رضوی



کبھی خرد سے، کبھی دل سے دوستی کر لی
نہ پوچھ، کیسے بسر ہم نے زندگی کر لی

اندھیری رات کا منظر بھی خوب تھا لیکن
تم آگئے تو چراغوں میں روشنی کر لی

تمہارا جسم ہے جاڑوں کا سرد سناٹا
حرارتوں سے کہاں تم نے دوستی کر لی

حضورِ دوست عجب حادثہ ہوا یارو
ہر ایک حرفِ شکایت نے خودکشی کر لی

لیے پھرے ہیں بہت غم کو دل کی گلیوں میں
اس ایک بات پہ دنیا نے دشمنی کر لی

ہر ایک موڑ پہ خنجر بکف تھی تنہائی
غریبِ شہر نے گھبرا کے خودکشی کر لی



ہم بچھڑ کے تم سے بادل کی طرح روتے رہے
تھک گئے تو خواب کی دہلیز پہ سوتے رہے

لوگ لہجے کا سہانا پن، سخن کی نغمگی
شہر کی آبادیوں کے شور میں کھوتے رہے

کیوں تماشا دل کے لٹ جانے کا کوئی غم کرے
شہرِ دلّی میں تو ایسے واقعے ہوتے رہے

سرخیاں اخبار کی گلیوں میں غل کرتی رہیں
لوگ اپنے بند کمروں میں پڑے سوتے رہے

محفلوں میں ہم رفیق و رازداں سمجھے گئے
گھر کے آنگن میں مگر تنہائیاں بوتے رہے

زبیر رضوی



پتھر کی قبا پہنے ملا، جو بھی ملا ہے
ہر شخص یہاں سوچ کے صحرا میں کھڑا ہے

نے جام کھنکتے ہیں نہ کافی کے پیالے
دل، شب کی صداؤں کا جہاں ڈھونڈ رہا ہے

سڑکوں پہ کہ وہ دوڑتے پہیوں کا تعاقب
اُمڈی ہوئی آکاش پہ ساون کی گھٹا ہے

جاتے ہوئے گھر، تم جو مجھے سونپ گئے تھے
وہ وقت مجھے چھوڑ کے بیگانہ ہُوا ہے

تم پاس جو ہوتے تو فضا اور ہی ہوتی
موسم مرے پہلو سے ابھی اُٹھ کے گیا ہے

ملبوس سے چھنتے ہوئے شاداب بدن نے
تہذیبِ خیالات کو آوارہ کیا ہے



خورشید کی بیٹی کہ جو دھوپوں میں پلی ہے
تہذیب کی دیوار کے سائے میں کھڑی ہے

دھندلا گئے رنجش میں اس آواز کے شیشے
برسوں جو سماعت سے ہم آغوش رہی ہے

اب تک ہے وہی سلسلۂ خانہ خرابی
اے عشقِ ستم پیشہ! تری عمر بڑی ہے

ہم آئیں تو غیروں کی طرح بزم میں بیٹھیں!
اے صاحبِ خانہ تری یہ شرط کڑی ہے

ڈسوایا ہے پھنکارتے سانپوں سے بدن کو
تب جا کے یہ اک دولتِ فن ہاتھ لگی ہے

نقاد کے ہاتھوں میں ہیں تنقید کے تیشے
سہمی ہوئی تخلیق کتابوں میں پڑی ہے

رام ریاض



ذرّہ انسان کبھی، دشت نگر لگتا ہے
بعض اوقات ہمیں ایسا بھی ڈر لگتا ہے

ہمنشیں، تیری بھی آنکھوں میں جھلکتا ہے دھواں
تو بھی منجملۂ اربابِ نظر لگتا ہے

کوئی لیتا ہے ترا نام تو رُک جاتا ہوں
اب ترا ذکر بھی صدیوں کا سفر لگتا ہے

ہم پہ بیداد گرو! سنگ اٹھانا ہے فضول
کہیں افتادہ درختوں پہ ثمر لگتا ہے

میرے دل میں بڑے آئینے ہیں، تصویریں ہیں
سچ بتانا تمھیں کیسا مرا گھر لگتا ہے

شب کے محبوس ہیں، سونے کی اجازت ہی نہیں
آنکھ لگتی ہے تو دیوار سے سر لگتا ہے

رامؔ اس دَور میں قامت کی بلندی کے لیے
سر پہ انسان کے 'سرخاب کا پَر' لگتا ہے

رام ریاض



زنداں میں بھی وہی لب و رخسار دیکھتے
دروازہ دیکھتے، کبھی دیوار دیکھتے

پستی نشین ہو کے میں کتنا بلند تھا
گردن جھکا کے تم مرا معیار دیکھتے

سب دوڑتے تھے اس کی عیادت کے واسطے
جس کو ذرا سا نیند سے بیدار دیکھتے

دل بیٹھنے لگے تو نگاہیں بھی تھک گئیں
کب تک تری طرف ترے بیمار دیکھتے

کس درجہ آنے والے زمانے کا خوف تھا
بجھتا گجر تو شام کے آثار دیکھتے

اب کیا کہیں وہ اجنبی کیسا تھا، ہم جسے
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے بھی لاچار دیکھتے

تیرے سوا بھی کچھ نظر آنا محال تھا
دنیا کو دیکھتے کہ ترا پیار دیکھتے

نا آشنا ہیں رامؔ جو غربت کے نام سے
وہ کاوشیں میرے دور کے فنکار دیکھتے

رام ریاض



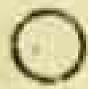
سر ماتھا مگر پھر بھی وہ دن کتنے بڑے تھے
اس چاند سے جب پہلے پہل نین لڑے تھے

رستے بڑے دشوار تھے اور کوس کڑے تھے
لیکن تری آواز پہ ہم دوڑ پڑے تھے

بہتا تھا مرے پاؤں تلے ریت کا دریا
اور دھوپ کے نیزے مری نس نس میں گڑے تھے

پیڑوں پہ کبھی ہم نے بھی بسیرا کیا تھا
شاخوں سے مگر سوکھے ہوئے پات جھڑے تھے

اے راؔم وہ کس طرح گئے پار مسافر
جن کے سروسامان بھی مٹی کے گھڑے تھے



یادوں کے دریچوں کو ذرا کھول کے دیکھو
ہم لوگ وہی ہیں کہ نہیں، بول کے دیکھو

ہم اوس کے قطرے ہیں کہ بکھرے ہوئے موتی
دھوکا نظر آئے تو ہمیں رول کے دیکھو

کانوں میں بڑی دیر تلک گونج رہے گی
خاموش چٹانوں سے کبھی بول کے دیکھو

ذرّے ہیں مگر کم نہیں پاؤ گے کسی سے
پھر جانچ کے دیکھو ہمیں، پھر تول کے دیکھو

سقراط سے انسان ابھی ہیں کہ نہیں راؔم
تھوڑا سا کسی جام میں بس گھول کے دیکھو

رام ریاض



روشنی والے تو دنیا دیکھیں
ہم اندھیرے کے سوا کیا دیکھیں

اپنی قسمت میں بھی کچھ ہے کہ نہیں
اب ذرا ہاتھ تو پھیلا دیکھیں

تو کبھی صبح کا تارا بن جائے
ہم تجھے دُور سے تنہا دیکھیں

آگ پانی میں اگر جنگ ہوئی
کس طرف آدمی ہو گا، دیکھیں

جان سے ہاتھ نہ دھوئے جائیں
اور بہتا ہوا دریا دیکھیں

کِس کے آنگن کو اُجالا بخشے
راؔم ٹوٹا ہوا تارا دیکھیں



کسی مرقد کا ہی زیور ہو جائیں
پھُول ہو جائیں کہ پتھر ہو جائیں

خشکیاں ہم سے کنارا کر لیں
تم اگر چاہو سمندر ہو جائیں

تو نے مُنہ پھیرا تو ہم ایسے لگے
جس طرح آدمی بے گھر ہو جائیں

یہ ستارے، یہ سمندر، یہ پہاڑ
کِس طرح لوگ برابر ہو جائیں

اپنا حق لوگ کہاں چھوڑتے ہیں
دوست بن جائیں، برادر ہو جائیں

آمدِ شب کا یہ مطلب ہو گا
راؔم کچھ چہرے اُجاگر ہو جائیں

رام ریاض



گذشتہ اہلِ سفر کو جہاں سکون مِلا
نجانے کیوں ہمیں ان منزلوں پہ خون مِلا

خراب وقت ہے اب فاصلہ ہی بہتر ہے
کبھی ملیں گے جو ماحول پُر سکون مِلا

کبھی زمانے سے مانگا تھا پیکرِ شیریں
تراشنے کو ہمیں کوہِ بے ستون مِلا

وہ راؔم نخلِ وفا ہے میں برگِ آوارہ
اُسے جمود مِلا ہے، مجھے جنون مِلا



آنکھوں میں تیز دھوپ کے نیزے گڑے رہے
ہم تیرے انتظار میں پھر بھی کھڑے رہے

تم رُک گئے پہ سنگ کا میلہ نہ کم ہوا
اس کارواں کے ساتھ مسافر بڑے رہے

میرے بدن پہ صرف ہوا کا لباس تھا
تیری قبا میں چاند ستارے جڑے رہے

سائے کو لوگ پوجتے آئے ہیں دیر سے
پتّے ہمیشہ پاؤں میں بکھرے پڑے رہے

شاید وہ راؔم میری طرح بدنصیب تھے
جو لوگ تیرے پیار کی ضد پر اڑے رہے



فروغِ شمر کی جلتی ہوئی فضا سے بچا
تو اپنے آپ کو اس آب، اس ہوا سے بچا

کسی کا دل نہ دکھایا، کسی کی آہ نہ لی
تمام عمر میں لوگوں کی بد دعا سے بچا

کئی زمین پہ دوڑے، کئی خلا میں اُڑے
کوئی عذاب سے چھوٹا، کوئی قضا سے بچا؟

کبھی یہ رات نہ ہوتی نہ ایسا دن ہوتا
یہ سب نظام مرے دستِ نارسا سے بچا

بڑے سکون سے پانی کی تہہ میں بیٹھ گیا
کوئی تو رامؔ یہاں اس قدر ہوا سے بچا



کسی نے دُور سے دیکھا، کوئی قریب آیا
امیرِ شہر میں جب بھی کوئی غریب آیا

ہوا میں زہر گھُلا، پانیوں میں آگ لگی
تمھارے بعد زمانہ بڑا عجیب آیا

بریدہ دست، برہنہ بدن، شکستہ پا
ترے دیار میں کیا کیا نہ بدنصیب آیا

کسی کو اب نہ ستائے گی مرگِ نامعلوم
چراغِ دار جلے، موسمِ صلیب آیا

برس مہینوں میں، ہفتے دنوں میں ڈھلنے لگے
جو رامؔ دُور تھا وہ وقت اب قریب آیا

روحی کنجاہی



پُر ہول خرابوں سے شناسائی مری ہے
ہنگامے اگر تیرے ہیں، تنہائی مری ہے

اے حسن، تو ہر رنگ میں ہے قابلِ عزت
میں عشق ہوں، ہر حال میں رسوائی مری ہے

جو سطح پہ ہے، تیری رسائی ہے اُسی تک
فنکار ہوں میں، زیست کی گہرائی مری ہے

ہستی کے اُجالے ہیں مری آنکھ کا پرتو
ہر چشمۂ پُرنور میں بینائی مری ہے

ہر نقشِ حسیں ہے مری کاوش کا نتیجہ
ہر منظرِ دلکش میں توانائی مری ہے

شاعر ہوں، صداقت کا پرستار ہوں روحی
ہر رنگ میں، ہر دور کی سچائی مری ہے

روحی کنجاہی



مُنصفِ وقت سے بیگانہ گزرنا ہو گا
فیصلہ اپنا ہمیں آپ ہی کرنا ہو گا

زخمِ احساس کبھی چین نہ لینے دے گا
سرِ میدانِ تمنّا ہمیں مرنا ہو گا

تجھے چھو کر بھی تجھے پا نہ سکیں گے، تو ہمیں
صورتِ درد ترے دل میں اُترنا ہو گا

جانے لے آئی کہاں تیزیٔ رفتار ہمیں
کہ ٹھہر جائیں تو صدیوں کا ٹھہرنا ہو گا

عصرِ حاضر میں ہے جینا ہی جہادِ اکبر
جس کی خاطر ہمیں ہر شے سے گزرنا ہو گا

حشر سے کم نہ کسی دن کے جھمیلے ہوں گے
اک قیامت ہمیں ہر شب کا گزرنا ہو گا

روئیں کیا ڈوبتے سورج کے لیے ہم روحی
کہ نئی شان سے کل اس کو اُبھرنا ہو گا

روحی کنجاہی



اور ابھی تیز دوڑنا ہے مجھے
زندگی دُور کی صدا ہے مجھے

ہوں مسلسل سفر میں مثلِ ہوا
خود سری میری، رہنما ہے مجھے

جانے اس کی جُدائی کیا ہوگی
جس کا ملنا ہی حادثہ ہے مجھے

وہ بھی یاد آئے گا خُدا کے ساتھ
وہ بھی ممنون کر گیا ہے مجھے

ہو چکا ختم دَور خوابوں کا
اب حقائق کا سامنا ہے مجھے

وقت جابر ہے خواہشیں معصوم
زیست میدانِ کربلا ہے مجھے

ختم ہے دل پہ داستاں گوئی
کچھ مسلسل سنا رہا ہے مجھے



پھر کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں
کوئی ان کی طرح ملا ہی نہیں

ہو چکی پتھروں کی بارش تک
زخمِ احساس جاگتا ہی نہیں

سر سے پانی گزر چکا ہے مگر
دل کسی طور ڈوبتا ہی نہیں

طے ہوئے مرحلے کئی لیکن
فاصلہ تو کوئی مٹا ہی نہیں

ان کو کیا کیا گلے رہے ہم سے
ہمکو جن سے کوئی گلہ ہی نہیں

آس نے آکے دم کہاں توڑا
اب کے روحی پتہ چلا ہی نہیں

روحی کنجاہی



منہ زور آرزوؤں کی بے مہریاں نہ پوچھ
بیگانہ ہو رہی ہیں یہ لا کر کہاں، نہ پوچھ

فہرست محسنوں کی نہایت طویل ہے
مجھ سے مری تباہیوں کی داستاں نہ پوچھ

مجھ کو پناہ دی نہ ترے غم نے بھی کبھی
میں دے رہا ہوں کتنے غموں کو اماں نہ پوچھ

ہر زخم چند زخموں کی کرتا ہے پرورش
کیسے سدا بہار ہے یہ گلستاں نہ پوچھ

دشتِ وفا کی وسعتوں کو پا سکا ہے کون
گم کس قدر ہوئے ہیں یہاں کارواں، نہ پوچھ

وابستہ موڑ موڑ سے ہیں کتنے حادثات
یہ قتل گاہ ہے کہ دیارِ بتاں، نہ پوچھ



ظالم پہ عذاب ہو گیا ہوں
میں روزِ حساب ہو گیا ہوں

ہر لفظ مرا ہے ایک گھاؤ
زخموں کی کتاب ہو گیا ہوں

میں خود میں سمٹ کے تھا سمندر
پھیلا تو حباب ہو گیا ہوں

خود اپنی تلاش کر رہا تھا
دیکھا تو سراب ہو گیا ہوں

یوں اُٹھ گیا اعتبارِ ہستی
میں خود کوئی خواب ہو گیا ہوں

مٹی ہوئی یوں خراب میری
صحرا کا جواب ہو گیا ہوں

روحی کنجاہی

(۱)

چین گھر میں، نہ کبھی تیرے نگر میں پاؤں
خود کو ہر لمحہ میں اک لمبے سفر میں پاؤں

کوئی آواز، نہ سایہ، نہ ہوا میں ہلچل
معترض! سوچ میں کیا بیٹھ کے گھر میں پاؤں

تو کبھی پھول کبھی چاندنی تھا میرے لیے
اب تجھے پیرہنِ برق و شرر میں پاؤں

میں کہیں جسم کہیں اور مری روح کہیں
خود کو بکھرا ہوا ہر راہگذر میں پاؤں

مجھ سے ہر لمحہ کوئی جرم نیا ہوتا ہے
اک نہ اک حادثہ ہر تازہ خبر میں پاؤں

میں گواہی پہ تو تیار ہوں، خود اپنے خلاف
وقعتِ عدل جو منصف کی نظر میں پاؤں

( )

یوں آج اپنے آپ سے الجھا ہوا ہوں میں
جیسے کہ خود نہیں ہوں، کوئی دوسرا ہوں میں

ذہن اور دل میں چھیڑ گیا کوئی سرد جنگ
اک سیلِ کشمکش کے مقابل کھڑا ہوں میں

آجائے سامنے کوئی معیار تو ترا
یہ سوچ کر نگاہ سے اکثر گرا ہوں میں

خود کو تو کھو کے تجھ کو نہیں پا سکا، مگر
کھویا تجھے تو جانے، کیسے پا گیا ہوں میں

یوں تو ہوں ایک لفظ ہی میں بھی لغات کا
مفہوم کے لحاظ سے سب سے جدا ہوں میں

رُوحی کنجاہی



کس لیے پھرتا ہوں تنہا، نہ کسی نے پُوچھا
کیوں کہیں جی نہیں لگتا، نہ کسی نے پوچھا

ذہن آوارہ، دل آوارہ، نظر آوارہ
کیسے اس حال کو پہنچا، نہ کسی نے پوچھا

کون ہے، آیا ہے کس دیس سے، کس سے ملنے
سب نے دیکھا مگرِ آشنا نہ کسی نے پوچھا

جانے کیا کہتے اگر پوچھتے احوال کوئی
خیر یہ بھی ہوا اچھا، نہ کسی نے پوچھا

بے تعلق ہوئے رُوحی عجب انداز سے لوگ
کس پہ کیا حادثہ گزرا، نہ کسی نے پوچھا



یہ سلسلۂ شام و سحر یونہی نہیں ہے
ہر قافلہ سرگرمِ سفر یونہی نہیں ہے

ہنگامے بپا کرتی ہے ہر آن تری یاد
پہ شورِ دل و جاں کا نگر یونہی نہیں ہے

تاریخ سُنا سکتی ہے صدیوں کے سفر کی
یہ گردِ سرِ راہگذر یونہی نہیں ہے

اُبھرے گا یقیناً کوئی دم میں کوئی سورج
بے تابیِ اربابِ نظر یونہی نہیں ہے

منزل بھی کوئی خاص ملے گی ہمیں رُوحی
دشوار سے دشوار سفر یونہی نہیں ہے

فرید جاوید



ناشگفتہ کلیوں میں شوق ہے تبسم کا
بار سہہ نہیں سکتیں دیر تک تلاطم کا

جانے کتنی فریادیں ڈھل رہی ہیں نغموں میں
چھڑ رہی ہے دُکھ کی بات، نام ہے ترنم کا

کتنے بے کراں دریا پار کر لیے ہم نے
موج موج میں جن کی، زور تھا تلاطم کا

اے خیال کی کلیو، اور مسکرا لینیں
کچھ ابھی تو آیا تھا رنگ سا تبسم کا

گفتگو کسی سے ہو، تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

حسرت و محبت سے دیکھتے رہو جاویدؔ
ہاتھ آ نہیں سکتا حسن، ماہ و انجم کا

نوید جاوید



غبارِ دل پہ بہت آگیا ہے، دھولیں آج
کھلی فضا میں کہیں دُور جا کے رو لیں آج

دیارِ غیر میں اب دُور تک ہے تنہائی
یہ اجنبی در و دیوار کچھ تو بولیں آج

تمام عمر کی بیداریاں بھی سہہ لیں گے
ملی ہے چھاؤں تو بس ایک نیند سو لیں آج

طرب کا رنگ محبت کی لَو نہیں دیتا
طرب کے رنگ میں کچھ درد بھی سمو لیں آج

کِسے خبر ہے کہ کل زندگی کہاں لے جائے
نگاہِ یار! ترے ساتھ ہی نہ ہو لیں آج

شوید جاوید



ہم جسے سمجھتے تھے سعیٔ رائیگاں یارو
اب اسی سے ملتا ہے اپنا کچھ نشاں یارو

رُک سکے تو ممکن ہے نغمگی میں ڈھل جائے
اُٹھ رہی ہے سینوں میں شورشِ فغاں یارو

کیا خیال ہے تم کو، کیا ملال ہے تم کو
پوچھتا کوئی تم سے کیوں ہو سرگراں یارو

برق سے تصادم کا وقت آ ہی جائے گا
ڈھونڈتے رہو گے تم برق سے اماں یارو

سچ سے پیار کرنے کا حوصلہ نہیں ہے اور
مصلحت کی راہوں سے دل ہے بدگماں یارو

کچھ سرور تو ہوگا، کوئی نور تو ہو گا
جس سے ظلمتِ شب میں دل ہے نغمہ خواں یارو

کم ثبات ہوتی ہے تازگی و رعنائی
دیر تک نہیں رہتا صبح کا سماں یارو



تلخ گذرے کہ شادماں گذرے
زندگی ہو تو کیوں گراں گذرے

تھا جہاں مدتوں سے سناٹا
ہم وہاں سے بھی نغمہ خواں گذرے

مرحلے سخت تھے مگر ہم لوگ
صورتِ موجۂ رواں گذرے

میرے ہی دل کی دھڑکنیں ہوں گی
تم مرے پاس سے کہاں گذرے

کیوں نہ ڈھل جائے میرے نغموں میں
کیوں ترا حسن رائیگاں گذرے

چند لمحے خیال و خواب سہی
چند لمحے ایسے جاں گذرے

کتنے خاموش حادثے جاویدؔ
دل ہی دل میں نہاں نہاں گذرے

فنویہ جاوید



شوق کا سلسلہ بیکراں ہے
زندگی کارواں کارواں ہے

حاصلِ نرمیٔ شبنم و گل
آتشِ غم کا سیلِ رواں ہے

ہم نفس میں تری آہٹیں ہیں
ہر نفس زندگی کا نشاں ہے

اپنی ویرانیوں پر ابھی تک
دل کو شادابیوں کا گماں ہے

ہم نفس! دل دھڑکتے ہیں جب تک
کاروبارِ محبت جواں ہے

تہمت مے کشی بھی اٹھائی
تشنگی ہے کہ شعلہ بجاں ہے

ان کے دامن میں بھی پھول ہوتے
جن سے رعنائیٔ گلستاں ہے



جب بھی شمعِ طرب جلائی ہے
آنچ محرومیوں کی آئی ہے

راستے اتنے بے کراں تو نہ تھے
جستجو کتنی دُور لائی ہے

زحمتِ جستجو سے کیا ہو گا
بوئے گل کس کے ہاتھ آئی ہے

کتنی رنگینیوں میں تیری یاد
کس قدر سادگی سے آئی ہے

کہہ کے جانِ غزل تجھے ہم نے
اپنی کم مائیگی چھپائی ہے

جب بھی جاویدؔ چھیڑ دی ہے غزل
بات وارفتگی تک آئی ہے

فرید جاوید



ہمارے سامنے بیگانہ وار آؤ نہیں
نیازِ اہلِ محبت کو آزماؤ نہیں

ہمیں بھی اپنی تباہی پہ رنج ہوتا ہے
ہمارے حالِ پریشاں پہ مسکراؤ نہیں

جو تار ٹوٹ گئے ہیں وہ جُڑ نہیں سکتے
کرم کی آس نہ دو، بات کو بڑھاؤ نہیں

دیئے خلوص و محبت کے بجھتے جاتے ہیں
گراں نہ ہو تو ہمیں اس قدر ستاؤ نہیں

دل و نگاہ کو کب تک کوئی بچائے رہے
یہ دیکھ کر کہ ادھر سے کوئی جھکاؤ نہیں

یہ اور بات ہے کانٹوں میں جی بہل جائے
نہیں کہ لالہ و گل سے مجھے لگاؤ نہیں



کس اجالے کا نشاں ہیں ہم لوگ
کن اندھیروں میں رواں ہیں ہم لوگ

نورِ خورشید کو الزام نہ دو
صبح کا خوابِ گراں ہیں ہم لوگ

جیسے بھٹکا ہوا راہی ہو کوئی
یونہی ہر سو نگراں ہیں ہم لوگ

کبھی آوارگیِ نکہتِ گل
کبھی زنجیرِ گراں ہیں ہم لوگ

دور تک وحشتِ جنوں ہے جاوید
آبلہ پا گزراں ہیں ہم لوگ



میکدے کے سوا ملی ہے کہاں
اور دُنیا میں روشنی ہے کہاں

آرزوؤں کا اک ہجوم سہی
فرصتِ شوق کھو گئی ہے کہاں

جتنے وارفتۂ سفر ہیں ہم
اتنی راہوں میں دلکشی ہے کہاں

ساتھ آئے کوئی کہ رہ جائے
زندگی مُڑ کے دیکھتی ہے کہاں

خوش ادا سب ہیں آشنا جاوید
اپنی آوارگی چھپی ہے کہاں



تم ہو شاعر مری جان، جیتے رہو
شعر کہتے رہو، زہر پیتے رہو

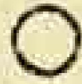
سینۂ چاک ہی مشعلِ نور ہے
سینہ چاکو، اسی طرح جیتے رہو

رات جاگی ہوئی ہے، ہوا مہرباں
پھر یہ لمحے کہاں، آج پیتے رہو

روک لو دل پہ سیلِ گرانِ الم
دوستو زندگی کے پچھیتے رہو

اتنی فرصت کسے ہے کہ دیکھے تمہیں
چاک کر لو گریباں کہ سیتے رہو

کمار پاشی



چال اک ایسی چلی، ہر شخص سیدھا ہو گیا
بات بس اتنی کہ میں تھوڑا سا ترچھا ہو گیا

لوگ بولے : اب نیا ہو جا، پرانا پن اُتار
میں بھی کیا کرتا، سرِ بازار ننگا ہو گیا

اس جنم میں پھر مجھے ویسی ہی گمنامی ملی
اتفاق ایسا کہ پھر اُس گھر میں پیدا ہو گیا

ٹوٹ کر تارے گرے کل شب مری دہلیز پر
اس کی بھی آنکھیں گئیں اور میں بھی اندھا ہو گیا

چھ دنوں تک شہر میں گھوما وہ بچوں کی طرح
ساتویں دن جب وہ گھر پہنچا تو بوڑھا ہو گیا

دو دنوں میں ہم ذرا کچھ اور لمبے ہو گئے
قد ہمارے دوستوں کا اور چھوٹا ہو گیا

چل دیے دُنیا سے ہم پاشیؔ بھی کچھ تیاگ کر
اور ہمارے ساتھ ہی اک دَور پُورا ہو گیا

کسمادرپاشی



محفل میں کسی کی ہم نے اُنھیں اک بار ذرا دیکھا ہی تو ہے
یوں نام پہ اُن کے دھڑکے ہے دِل گویا اُن سے رشتہ ہی تو ہے

یادوں کے سُہانے موسم میں اُس گرم بدن کی آنچ لیے
چل نکلے ہیں ہم یوں خوش خوش سے جیسے وہ اِدھر رہتا ہی تو ہے

ہم کچھ بھی کہیں لیکن اُن سے جو ایک تعلق تھا ۔۔۔ نہ رہا
رشتے کی حقیقت کیا معنیٰ بس ٹوٹ گیا، دھاگا ہی تو ہے

کیا کیا نہ عجب لمحے گزرے تنہائیِ شب میں اس دل پر
خوش فہمی ۔۔۔ کہ سب کہہ ڈالوں گا جیسے وہ مری سُنتا ہی تو ہے

بے سمت چلے تو ہیں لیکن ہم جانتے ہیں انجامِ سفر
بیکار ہے جی کو کلپانا، دو چار گھڑی چلنا ہی تو ہے

آپ اپنے سے باہر آ کر بھی سب دیکھ لیا، سب جان لیا
عالم ہے یہ سارا بھید بھرا، پردے سے پرے پردا ہی تو ہے

تنہائی میں شامِ فرقت کی یہ سوچ کے خوش ہے جی اپنا
آئے گا منا لیں گے اُس کو جیسے وہ اِدھر آتا ہی تو ہے

ہر صنفِ سخن کو آشتی جی اک طرز نئی دی ہے ہم نے
ہر اک سے الگ ہر اک سے جُدا، ہر شعر میں عکس اپنا ہی تو ہے

کمار پاشی



اک انجانی دنیا ڈھونڈھ رہا ہوں
تاریکی میں رستہ ڈھونڈھ رہا ہوں

تنہا تنہا گھوم رہا ہوں گم سم
گلی گلی کوئی خود سا ڈھونڈھ رہا ہوں

پتہ پتہ ناچ رہی ہے زردی
گلشن گلشن سبزہ ڈھونڈھ رہا ہوں

رنگوں کے اس گھور گھنے جنگل میں
کھویا ہوا اک چہرہ ڈھونڈھ رہا ہوں

بیٹھ کے تنہائی میں آپ اپنے سے
کوئی پرانا رشتہ ڈھونڈھ رہا ہوں



کیسا عجب تماشا دیکھ رہا ہوں
عالم عالم سایا دیکھ رہا ہوں

ذرہ ذرہ ٹوٹ رہی ہے دھرتی
خود کو جیسے لٹتا دیکھ رہا ہوں

رستہ رستہ سہل ہوا ہے چلنا
آگے آگے سایا دیکھ رہا ہوں

موسم موسم پھیل رہی ہے خوشبو
دور سے تجھ کو آتا دیکھ رہا ہوں

بوچھاروں میں برس رہے ہیں بادل
اور میں خود کو جلتا دیکھ رہا ہوں

کمار پاشی



جو کچھ نظر پڑا، میرا دیکھا ہوا لگا
یہ جسم کا لباس بھی پہنا ہوا لگا

جو شعر بھی کہا، وہ پُرانا لگا مجھے
جس لفظ کو چھُوا، وہی برتا ہوا لگا

دل کا نگر تو دیر سے ویران تھا مگر
سُورج کا شہر بھی مجھے اُجڑا ہوا لگا

اپنا بھی جی اُداس تھا موسم کو دیکھ کر
اُس شوخ کا مزاج بھی بدلا ہوا لگا

پاشی سے کھل کے بات ہماری بھی کل ہوئی
وہ نوجوان تو ہمیں سلجھا ہوا لگا



ہوا کے رنگ میں دُنیا پہ آشکار ہُوا
میں قیدِ جسم سے نکلا تو بے کنار ہُوا

ستارے ٹوٹ گئے تاریکیاں بکھیر گئے
یہ حادثہ بھی سفر میں ہزار بار ہُوا

بلندیوں پہ تھا محوِ سفر ہوا کی طرح
لباسِ خاک جو پہنا تو خاکسار ہُوا

لہو لہان ہُوا بحر و بر کا ہر منظر
جو میرے سامنے آیا، مرا شکار ہُوا

تمام شہر نے مجرم مجھی کو گردانا
تمام شہر میں اک میں ہی سنگسار ہُوا

کمار پاشی



آیا بسنت، پھول بھی شعلوں میں ڈھل گئے
میں چومنے لگا تو مرے ہونٹ جل گئے

پکا مرے خیال کا کوندا کچھ اس طرح
چاروں طرف جو لفظ پڑے تھے، پگھل گئے

رنگوں کے اہتمام میں صورت بگڑ گئی
لفظوں کی دُھن میں ہاتھ سے معنی نکل گئے

جھونکے نئی رتوں کے جو گزرے قریب سے
بیتے دنوں کی دُھول مرے منہ پہ مل گئے

سر پر ہمارے دُھوپ کی چادر سی تن گئی
گھر سے چلے تو شہر کے منظر بدل گئے



کیوں ڈراتے ہو مجھے موت کا سایا بن کر
میرے سینے میں اُتر جاؤ اُجالا بن کر

کیوں نہیں چلتے کہ جانا ہے بہت دُور ابھی
کیوں یہاں رُک گئے بیکار تماشا بن کر

ٹوٹ کر بجھ گئے آکاش کے سارے سورج
اور میں رہ گیا اس شہر میں اندھا بن کر

میں ہی اک زہر لگا اپنوں کو بیگانوں کو
میں ہی اک قتل ہوا شہر میں سچا بن کر

کیوں بھلا چھوڑ نہیں دیتا وہ تنہا مجھ کو
کیوں مرے ساتھ لگا رہتا ہے سایا بن کر

کمار پاشی



ہے تاحدِ نظر نیلا سمندر
بدن میں پھڑپھڑاتا ہے کبوتر

اب اس کا نام تک باقی نہیں ہے
وہی: جو جی رہا تھا میرے اندر

بتا اے دل! مرے بجھتے ہوئے دل!
یہ کس آسیب کا سایہ ہے تجھ پر

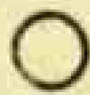
معانی کا ہے باطن سے تعلق
بہت کچھ کہہ گئے چپ چپ سے منظر

مری دہلیز پر چپکے سے پاشیؔ
یہ کس نے رکھ دی میری لاش لاکر



اب بھی پل پل جی دُکھتا ہے
جیسے سب کچھ ابھی ہوا ہے
کبھی نہ پھر ملنا ہو جیسے
آج وہ مجھ سے یوں بچھڑا ہے
بادل تو کھل کر برسا تھا
پھر بھی سارا تن جلتا ہے
ہم بھی کبھی خوش ہو لیتے تھے
آج اچانک یاد آیا ہے
ساون ہو پت جھڑ ہو کہ گُل رُت
دل ہر موسم میں تنہا ہے
بادل بدن خوشبو پھیلی ہے
گھونگھٹ گھونگھٹ پھول کھلا ہے
میں ہوں مور گھنے جنگل کا
تو کالی گھنگھور گھٹا ہے
میں اک دکھ سے بھری کہانی
تو میٹھا، سندر سپنا ہے
پاشیؔ کس کی مدح میں تم نے
آج اتنا کچھ کہہ ڈالا ہے

شہر یار



شمعِ دل، شمعِ تمنا نہ جلا، مان بھی جا
تیز آندھی ہے، مخالف ہے ہوا، مان بھی جا

ایسی دنیا میں جنوں، ایسے زمانے میں وفا
اس طرح خود کو تماشا نہ بنا، مان بھی جا

کب تلک ساتھ ترا دیں گے یہ دھندلے سائے
دیکھ نادان نہ بن، ہوش میں آ، مان بھی جا

زندگی میں ابھی خوشیاں بھی ہیں رعنائی بھی
زندگی سے ابھی دامن نہ چھڑا، مان بھی جا

شہر پھر شہر ہے، یاں جی تو بہل جاتا ہے
شہر کو چھوڑ کے صحرا کو نہ جا، مان بھی جا

شہریار



سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو!
تا حدِ نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی
وہ زود پشیمان، پشیمان سا کیوں ہے

کیا کوئی نئی بات نظر آئی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

شہریار



دامِ الفت سے چھوٹتی ہی نہیں
زندگی تجھ کو بھولتی ہی نہیں

کتنے طوفاں اُٹھائے آنکھوں نے
ناؤ یادوں کی ڈوبتی ہی نہیں

تجھ سے ملنے کی، تجھ کو پانے کی
کوئی تدبیر سوجھتی ہی نہیں

ایک منزل پہ رُک گئی ہے حیات
یہ زمیں جیسے گھومتی ہی نہیں

لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے
غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں



عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سامنے سے کل رات ڈر گیا یارو

ہر ایک نقشِ تمنّا کا ہو گیا دُھندلا
ہر ایک زخم مرے دل کا بھر گیا یارو

بھٹک رہی تھی جو کشتی، وہ غرقِ آب ہوئی
چڑھا ہوا تھا جو دریا، اُتر گیا یارو

وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اُسے
سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

میں جس کو لکھنے کے ارمان میں جیا اب تک
ورق ورق وہ فسانہ بکھر گیا یارو

شہسوار



کس کس طرح سے مجھ کو نہ رسوا کیا گیا
غیروں کا نام میرے لہو سے لکھا گیا

نکلا تھا میں صدائے جرس کی تلاش میں
دھوکے سے اس سکوت کے صحرا میں آ گیا

میں جسم کے حصار میں محصور ہوں ابھی
وہ روح کی حدوں سے بھی آگے چلا گیا

کیوں آج اُس کا ذکر مجھے خوش نہ کر سکا
کیوں آج اُس کا نام مرا دل دُکھا گیا

اس حادثے کو سُن کے کرے گا یقیں کوئی
سُورج کو ایک جھونکا ہوا کا بجھا گیا



جستجو جس کی تھی اُس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

سب کا احوال وہی ہے جو ہمارا ہے آج
یہ الگ بات کہ شکوہ کیا تنہا ہم نے

خود پشیمان ہوئے نہ اُسے شرمندہ کیا
عشق کی وضع کو کیا خوب نبھایا ہم نے

عمر بھر سچ ہی کہا، سچ کے سوا کچھ نہ کہا
اجر کیا اس کا ملے گا، یہ نہ سوچا ہم نے

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

شہزاد



آندھی کی زد میں شمعِ تمنّا جلائی جائے
جس طرح بھی ہو لاج جنوں کی بچائی جائے

بے آب بے گیاہ ہے یہ دل کا دشت بھی
اک نہر آنسوؤں کی یہاں بھی بہائی جائے

عاجز ہیں اپنے طالعِ بیدار سے بہت
ہر روز ہم کو کوئی کہانی سنائی جائے

سب کچھ بدل چکا ہے مگر لوگ ہیں بضد
مہتاب ہی میں صورتِ جاناں دکھائی جائے

کچھ ساغروں میں زہر ہے کچھ میں شراب ہے
یہ مسئلہ ہے، تشنگی کس سے بجھائی جائے

شہروں کی سرحدوں پہ ہے صحراؤں کا ہجوم
کیا ماجرا ہے، آؤ خبر تو لگائی جائے

نازل ہو جسم و روح پہ جب بے حسی کا قہر
اُس وقت دوستو یہ غزل گنگنائی جائے



جہاں پہ تیری کمی بھی نہ ہو سکے محسوس
تلاش ہی رہی آنکھوں کو ایسے منظر کی

ہمیں تو خود نہیں معلوم کیا کسی کو بتائیں
کہ تجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیوں مکرّر کی

مگر یہ ذوقِ پرستش کہ اب بھی تشنہ ہے
جبیں کو چوم چکے ایک ایک پتھر کی

کہاں پہ دفن وہ پرچھائیاں کریں یارو
جو تاب لا نہ سکیں روشنی کے خنجر کی

ہر ایک گل کو ہے عشقِ سموم کا سودا
ہر ایک شاخ یہاں معتقد ہے صرصر کی

جدھر اندھیرا ہے، تنہائی ہے، اداسی ہے
سفر کی ہم نے وہی سمت کیوں مقرر کی

شہریار



فضائے میکدہ بے رنگ لگ رہی ہے مجھے
رگِ گلاب رگِ سنگ لگ رہی ہے مجھے

یہ چند دن میں قیامت گزر گئی کیسی
کہ آج صلح تری جنگ لگ رہی ہے مجھے

مرے مکان سے دو گام پر ہے تیری گلی
یہ آج سیکڑوں فرسنگ لگ رہی ہے مجھے

نوا و نغمہ بھی ہیں سوز و ساز سے خالی
فغاں بھی خارج از آہنگ لگ رہی ہے مجھے

ضرور پھر کوئی افتاد پڑنے والی ہے
کہ یہ زمین بہت تنگ لگ رہی ہے مجھے



معبدِ زیست میں بُت کی مثال جڑے ہوں گے
یہ ننھے بچے جس روز بڑے ہوں گے

اتنے دکھی، اس درجہ اداس جو سائے ہیں
رات کے دشت میں تیز ہوا سے لڑے ہوں گے

دھوپ کے قہر کی لذت کے شیدائی ہیں
یہ اشجار بھی خواب سے چونک پڑے ہوں گے

ہم کو خلا کی وسعت سے فرصت نہ ملی
لاکھ خزانے اس دھرتی میں گڑے ہوں گے

وہ دن ہوگا آخری دن ہم سب کے لیے
آئینہ دیکھنے جب ہم لوگ کھڑے ہوں گے

آصف جمال



ایک سرد جنگ ہے، اب محبتیں کہاں
ٹوٹتے ہوئے طلسم، پھیلتا ہوا دھواں

وہ بھی اپنے حسن سے بے خیال ہو چلا
اور خواب بن گئیں میری سرگرانیاں

قیس کی محبتیں، کوہکن کی چاہتیں
اور یہ روائتیں، بھولتی کہانیاں

ہم سے پہلے اور بھی، کر گئے وفا بہت
خاک میں ملا چلے ہم بھی زندگانیاں

اپنے سلسلے سے بھی کیا خیال آئے ہیں
جاں کی قدر کچھ نہیں، دل بدستِ دلبراں

آصف جمال



آنکھ بے خواب ہوئی ہے کیسی
یہ ہوا اب کے چلی ہے کیسی

تو مری یاد میں روتا تو نہیں!
یہ ہواؤں میں نمی ہے کیسی

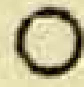
سایہ ہے اور کشیدہ کتنا
دھوپ ہے اور کڑی ہے کیسی

کیسا سویا ہے مقدّر اپنا
اور زمیں گھوم رہی ہے کیسی

رسمِ دُنیا ہے، جسے جانا ہے
ہم پہ اُفتاد پڑی ہے کیسی

گنگ ہیں زندہ دلانِ لاہور
رسمِ پرسش بھی اُٹھی ہے کیسی

آصف جمال



مگر نہیں تھا فقط میر خوار، میں بھی تھا
کہ اہلِ درد میں آشفتہ کار میں بھی تھا

صبا کی طرح اُسے بھی نہ تھا ثبات کہیں
نہ جانے کیا تھا، بہت بے قرار میں بھی تھا

پناہ لینی پڑی تھی مجھے بھی سائے میں
رہینِ منتِ دیوارِ یار میں بھی تھا

ہزار اپنی طبیعت پہ جبر کرتا تھا
میں صبر کرتا تھا، بے اختیار میں بھی تھا

یہ کس نے دیکھا کہ مجھ بے نوا کے دامن میں
محبتیں تھیں بہت، سایہ دار میں بھی تھا



صحرا سے بھی ویراں مرا گھر ہے کہ نہیں ہے
اس طرح سے جینا بھی ہُنر ہے کہ نہیں ہے
یہ دنیا لبالب ہے جو اک بے خبری کی
اس میں کہیں یادوں کا گزر ہے کہ نہیں ہے
ہے جسم کے زنداں میں وہی روح کی فریاد
اس کربِ مسلسل سے مفر ہے کہ نہیں ہے
دیوار کے سائے نے تمہیں روک لیا تھا
اب ہمتِ ایمائے سفر ہے کہ نہیں ہے
جس کے لیے بے خواب رہا کرتی ہیں آنکھیں
وہ آنکھ بھی آشفتہ مگر ہے کہ نہیں ہے
ہم شعلۂ جاں تیز ہواؤں سے بچا کر
زندہ ہیں، مگر اس کو خبر ہے کہ نہیں ہے
اب کون رہا ہے جو ہمیں اتنی خبر دے
جو حال اِدھر ہے وہ اُدھر ہے کہ نہیں ہے

آصف جمالی



وہ بے ہنر ہوں کہ ہے زندگی وبال مجھے
کمال گر نہیں دیتا تو دے زوال مجھے

وہ بدگمان ہُوا ہوں کہ اعتبار اُٹھا
صداقتوں پہ بھی کیا کیا ہیں احتمال مجھے

میں اپنے آپ کو پہچاننے سے ڈرتا ہوں
تباہ کر گئی یہ گردِ ماہ و سال مجھے

غضب ہُوا، تری یادوں نے ساتھ چھوڑ دیا
ہنوز میری محبت ہے اک سوال مجھے

یہ کیا ہُوا کہ ہوس کی گرفت تنگ ہوئی
میں تجھ سے ہاتھ چھڑانے کو ہوں سنبھال مجھے

وہ فاصلے ہیں کہ آنکھوں میں خواب ناچتے ہیں
ملی فراق میں بھی لذّتِ وصال مجھے

وہ بے وفا ہے تو اس کا بھی غم بہت ہے مگر
میں باوفا ہوں تو اس کا بھی ہے ملال مجھے



سائے کی طرح کوئی مرے ساتھ لگا تھا
کیا گھر کی طرح دشت بھی آسیب زدہ تھا

پرسش کو نہ تھا کوئی تو تنہا تھا بہت میں
محروم جو تھا، سب سے خفا رہنے لگا تھا

ہر دم نئے احساس کا طوفان بپا تھا دل میں
کیا جانئے میں کون سی مٹی سے بنا تھا

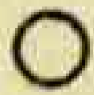
کیا کیا نہ پریشانیِ خاطر سے گذر آئے
کیا کیا نہ پڑے رنج کہ دیکھا نہ سُنا تھا

نالے کو اُسی دل میں اُتر جانے کی حسرت
اور نَے کو اُسی بھولنے والے کا گِلہ تھا

آشفتگیِ سر کی جو تہمت ہے، غلط ہے
میں اپنی ہی خوشبو سے پریشان پھرا تھا

یہ کون دل و جاں سے ہم آہنگ ہُوا ہے
اس درجے تو محسوس خدا بھی نہ ہُوا تھا

آصف جمال



ہم بھی تھے گوشہ گیر کہ گمنام تھے بہت
اُس طرزِ زیست میں مگر آرام تھے بہت

دنیا ہے کارخانۂ وہم و گماں تمام
سچے وہی فسانے تھے جو عام تھے بہت

خود اپنے اضطرارِ طبیعت سے تنگ تھے
ہم، جو شکارِ گردشِ ایام تھے بہت

لپٹی رہی تو سربسر اسرار تھی، وہ زلف
کھلتی کبھی تو اُس کے بھی پیغام تھے بہت

اک عمر تجربات میں گزری تو یہ کھُلا
یاں آزمودہ کار ہی ناکام تھے بہت



بھولے ہوئے ہیں سب کہ ہے کارِ جہاں بہت
لیکن وہ ایک یاد ہے دل پر گراں بہت

کچھ رفتگاں کے غم نے بھی رکھا ہمیں نڈھال
کچھ صدمہ ہائے نو سے رہے نیم جاں بہت

ہم کو نہ زلفِ یار، نہ دیوار سے غرض
ہم کو تو یادِ یار کی پرچھائیاں بہت

وہ سرد مہریاں کہ ہمیں راکھ کر گئیں
سنتے ہیں پہلے ہم بھی تھے آتش بجاں بہت

اک موجِ فتنہ سر کہ رواں ہر نفس میں ہے
ہر دم یقیں سے پہلے اُٹھے ہیں گماں بہت

اب کے جنوں میں موجِ صبا کا بھی ہاتھ ہے
موجِ صبا کہ اب کے اُٹھی سرگراں بہت

اب یہ خبر نہیں وہ سمندر ہے یا سراب
اپنے یہاں ہے تشنگیٔ جسم و جاں بہت

صحرا سے ڈر نہ اپنا علاقہ نہیں ہے کچھ
آشفتگیٔ سر کی ہوا ہے یہاں بہت

آصف جمال



دل ہے کہ ہمیں پھر سے اُدھر لے کے چلا ہے
امید سے پھر رشتۂ جاں باندھ لیا ہے

آہٹ پہ نہ چونکو کہ نہ آئے گی یہاں موت
دستک پہ نہ جاؤ کہ یہ آوارہ ہوا ہے

اب سنگ مداوا نہیں آشفتہ سری کا
یاں سنگ سے بھی پھوڑ کے سر دیکھ لیا ہے

کیا کیجیے، ہر کاوشِ درماں ہوئی محدود
ہر جادۂ امکاں ہے کہ مسدود ہوا ہے

زندہ ہیں بہ ہر طور کہ مرنا نہیں بس میں
تا عمر ہمارے لیے جینے کی سزا ہے

اے دل، کبھی پتھر بھی کہیں موم ہوئے ہیں!
جو خواب میں دیکھا ہے کہیں سچ بھی ہوا ہے!



کیسی آشفتگی، سر ہے یہاں
راس صحرا یہاں، نہ گھر ہے یہاں

ایک غم ہے کہ بے مداوا ہے
ایک رونا کہ عمر بھر ہے یہاں

جو بھی کاوش ہے بے صلہ، بے سود
جو شجر ہے وہ بے ثمر ہے یہاں

اک مسافت کہ طے نہیں ہوتی
منزلوں منزلوں سفر ہے یہاں

یوں روایت سے کٹ گئے لیکن
تجربہ جو ہے، تلخ تر ہے یہاں

محمدؐ علوی



دن اِک کے بعد ایک گزرتے ہوئے بھی دیکھ
اِک دن تُو اپنے آپ کو مرتے ہوئے بھی دیکھ

ہاں دیکھ برف گرتی ہوئی بال بال پر
تپتے ہوئے خیال ٹھٹھرتے ہوئے بھی دیکھ

ہر وقت کھلتے پھول کی جانب تکا نہ کر
مرجھا کے پتّیوں کو بکھرتے ہوئے بھی دیکھ

پیوند بادلوں کے لگے دیکھ جا بجا
بگلوں کو آسمان کترتے ہوئے بھی دیکھ

اُس کو خبر نہیں ہے ابھی اپنے حُسن کی
آئینہ دے کے بنتے سنورتے ہوئے بھی دیکھ

حیران مت ہو تیرتی مچھلی کو دیکھ کر
پانی میں روشنی کو اُترتے ہوئے بھی دیکھ

دیکھا نہ ہو گا تُو نے مگر انتظار میں
چلتے ہوئے سمے کو ٹھہرتے ہوئے بھی دیکھ

تعریف سُن کے دوست سے علویؔ تو خوش نہ ہو
اُس کو کبھی برائیاں کرتے ہوئے بھی دیکھ

محمد علوی



زمیں کہیں بھی نہ تھی، چار سُو سمندر تھا
کسے دکھاتے، بڑا ہولناک منظر تھا

لڑھک کے میری طرف آ رہا تھا اک پتھر
پھر ایک اور، پھر اِک اور بڑا سا پتھر تھا

فصیلیں دل کی گراتا ہوا جو در آیا
وہ کوئی اور نہ تھا، خواہشوں کا لشکر تھا

سحر کا نکلا ہوا رات کو میں آتا تھا
مکاں سے دُور، بہت دُور میرا دفتر تھا

بلا رہا تھا کوئی چیخ چیخ کر مجھ کو
کنویں میں جھانک کے دیکھا تو میں ہی اندر تھا

بہت سے ہاتھ اُگ آئے تھے میری آنکھوں میں
ہر ایک ہاتھ میں اِک نوک دار خنجر تھا

وہ جنگلوں میں درختوں پہ کودتے پھرنا
بُرا بہت تھا مگر آج سے تو بہتر تھا

ہمارے واسطے علوی کے شعر کیا کم ہیں
چلو قبول کہ غالب بڑا سخن ور تھا

محمد علوی



شریفے کے درختوں میں چھپا گھر دیکھ لیتا ہوں
میں آنکھیں بند کر کے گھر کے اندر دیکھ لیتا ہوں

اُدھر اُس پار کیا ہے، یہ کبھی سوچا نہیں میں نے
مگر میں روز کھڑکی سے سمندر دیکھ لیتا ہوں

سڑک پر چلتے، پھرتے، دوڑتے لوگوں سے گھبرا کر
کسی چھت پر مزے میں بیٹھے بندر دیکھ لیتا ہوں

یہ سچ ہے اپنی قسمت کوئی کیسے دیکھ سکتا ہے
مگر میں تاش کے پتے اٹھا کر دیکھ لیتا ہوں

گلی کوچوں میں، چوراہوں پہ، بس کی قطاروں میں
میں اُس چپ چاپ سی لڑکی کو اکثر دیکھ لیتا ہوں

چلا جاؤں گا جیسے خود کو تنہا چھوڑ کر علویؔ
میں اپنے آپ کو راتوں میں اُٹھ کر دیکھ لیتا ہوں



ہوا چلی تو میرے جسم نے کہا مجھ کو
اکیلا چھوڑ کے تو بھی کہاں چلا مجھ کو

میں کب سے ڈھونڈتا پھرتا ہوں اپنی قسمت کو
یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے، ذرا دکھا مجھ کو

دہکتی جلتی ہوئی دوپہر ملی، لیکن
کسی درخت کا سایا نہ مل سکا مجھ کو

میں اپنے دُم کی بتی جلائے بیٹھا ہوں
ارے یہ شام سے پہلے ہی کیا ہوا مجھ کو

بلا کے شور میں ڈوبی ہوئی صدا ہوں میں
کسی سے کیا کہوں، میں نے بھی کب سنا مجھ کو

وہ کوئی اور ہے علویؔ جو شعر کہتا ہے
تم اس کے جرم کی دیتے ہو کیوں سزا مجھ کو

محمد علوی



زمیں لوگوں سے ڈر گئی ہے
سمندروں میں اُتر گئی ہے

خموشیوں میں صدا گجر کی
خیال کے پر کتر گئی ہے

کھڑے ہیں بے برگ سر جھکائے
ہوا درختوں کو چر گئی ہے

ہمیں تو نیند آئے گی نہ لیکن
یہ رات بھی تو ٹھہر گئی ہے

کہاں بھٹکتے پھروگے علوی
سڑک سے پوچھو کدھر گئی ہے



ایسا ہوا نہیں ہے پر ایسا نہ ہو کہیں
اس نے مجھے نہ دیکھ کے دیکھا نہ ہو کہیں

قدموں کی چاپ دیر سے آتی ہے کان میں
کوئی مرے خیال میں پھرتا نہ ہو کہیں

سنکی ہوئی ہواؤں میں خوشبو کی آنچ ہے
پتوں میں کوئی پھول دہکتا نہ ہو کہیں

یہ کون جھانکتا ہے کواڑوں کی اوٹ سے
بتی بجھا کے دیکھ، سویرا نہ ہو کہیں

علوی خدا کے واسطے گھر میں پڑے رہو
باہر نہ جاؤ، پھر کوئی جھگڑا نہ ہو کہیں

محمد علوی



نیند راتوں کی اڑا دیتے ہیں
ہم ستاروں کو دعا دیتے ہیں

روز اچھے نہیں لگتے آنسو!
خاص موقعوں پہ مزا دیتے ہیں

اب کے ہم جان لڑا بیٹھیں گے
دیکھیں اب کون سزا دیتے ہیں

دی ہے خیرات اِسی در سے کبھی
اب اِسی در پہ صدا دیتے ہیں

ہائے وہ لوگ جو دیکھے بھی نہیں
یاد آئیں تو رُلا دیتے ہیں

آگ اپنے ہی لگا سکتے ہیں
غیر تو صرف ہوا دیتے ہیں

کتنے چالاک ہیں خوباں علوی
ہم کو الزامِ وفا دیتے ہیں



اسے نہ دیکھ کے دیکھا تو کیا ملا مجھ کو
میں آدھی رات کو روتا ہوا ملا مجھ کو

ترا نہ ملنا عجب گل کھلا گیا اب کے
ترے ہی جیسا کوئی دوسرا ملا مجھ کو

کل ایک لاش ملی تھی مجھے سمندر میں
اسی کی جیب سے تیرا پتہ ملا مجھ کو

میں شہر شہر کی سڑکوں پہ گھوم آیا ہوں
سڑک سڑک پہ سپاہی کھڑا ملا مجھ کو

بہت ہی دُور کہیں کوئی بم گرا تھا مگر
مرا مکان بھی جلتا ہوا ملا مجھ کو

پھر ایک بار مجھے خود پہ رحم آنے لگا
پھر ایک شاعرِ شیریں نوا ملا مجھ کو

مری غزل تھی یہ علوی کا نام تھا اس پر
غزل پڑھی تو انوکھا مزا ملا مجھ کو

محمد علوی



روشنی کچھ تو ملے جنگل میں
آگ لگ جائے گھنے جنگل میں

آپ کو شہر میں ڈر لگتا ہے
ہم تو بے خوف رہے جنگل میں

ایک اک شاخ زباں ہو جائے
کوئی آواز تو دے جنگل میں

پیڑ سے پیڑ لگا رہتا ہے
پیار ہوتا ہے بھرے جنگل میں

شہر میں کان ترستے ہی رہے
چہچہے ہم نے سنے جنگل میں

شام ہوتے ہی اتر آتے ہیں
شوخ پریوں کے پرے جنگل میں

شورخ ہرنوں نے قلانچیں ماریں
مور کے رقص ہوئے جنگل میں

اب بھی قدموں کے نشاں ملتے ہیں
گاؤں سے دور پرے جنگل میں

اب بھی پھرتی ہے کوئی پرچھائیں
رات کے وقت بھرے جنگل میں

خوب نکلے حضرت آدم علوی
بستیاں چھوڑ گئے جنگل میں



سچ ہے کہ وہ بُرا تھا ہر اِک سے لڑا کیا
لیکن اُسے ذلیل کیا، یہ بُرا کیا

گل دان میں گلاب کی کلیاں مہک اُٹھیں
کرسی نے اس کو دیکھ کے آغوش وا کیا

گھر سے چلا تو چاند مرے ساتھ ہو لیا
پھر صبح تک وہ میرے برابر چلا گیا

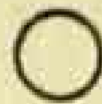
کوٹھوں پہ منہ اندھیرے ستارے اتر پڑے
بن کے پتنگ میں بھی ہوا میں اڑا کیا

اس سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا
یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا

محمل کے ساتھ ساتھ نہ جانے کدھر گیا
مجنوں کے انتظار میں صحرا جلا کیا

چھوڑو پرانے قصوں میں کچھ بھی دھرا نہیں
آؤ تمہیں بتائیں کہ علوی نے کیا کیا

رشید قیصرانی



صدیوں سے میں اس آنکھ کی پُتلی میں چھپا تھا
پلکوں پہ اگر مجھ کو سجا لیتے تو کیا تھا
تُو پھیل گیا تا بہ افق مجھ سے بچھڑ کر
میں جسم کے زنداں میں تجھے ڈھونڈ رہا تھا
ہاں مجھ کو ترے سرخ لبادے کی قسم ہے
اس راہ میں پہلے کوئی گھنگھرو نہ بجا تھا
گزرے تھے مرے سامنے تم دوش ہوا پر
میں دُور کہیں ریت کے ٹیلے پہ کھڑا تھا
سینے میں ابھرتے ہوئے سورج کا تلاطم
آنکھوں میں تری، ڈوبتی راتوں کا نشہ تھا
گزرا نہ اِدھر سے کوئی پتھر کا پجاری
مدت سے میں اس راہ کے ماتھے پہ سجا تھا
جب وقت کی دہلیز پہ شب کانپ رہی تھی
شعلہ سا مرے جسم کے آنگن سے اُٹھا تھا
اب جانیے کیا نقش ہواؤں نے بنا لئے
اس ریت پہ میں نے تو ترا نام لکھا تھا
اے دیدۂ حیراں، تُو ذرا اور قریب آ
اے ڈھونڈنے والے، میں تجھے ڈھونڈ رہا تھا

رشید قیصرانی



کچھ سائے سے ہر لحظہ کسی سمت رواں ہیں
اس شہر میں ورنہ نہ مکیں ہیں، نہ مکاں ہیں

ہم خود سے جدا ہو کے تجھے ڈھونڈنے نکلے
بکھرے ہیں اب ایسے کہ یہاں ہیں نہ وہاں ہیں

جاتی ہیں ترے گھر کو سبھی شہر کی سڑکیں
لگتا ہے کہ سب لوگ تری سمت رواں ہیں

اے موجۂ آوارہ، کبھی ہم سے بھی ٹکرا
اِک عمر سے ہم بھی سرِ ساحل نگراں ہیں

تُو ڈھونڈ ہمیں وقت کی دیوار کے اُس پار
ہم دُور، بہت دور کی منزل کا نشاں ہیں

سمٹے تھے کبھی ہم تو سمائے سرِ مژگاں
پھیلے ہیں اب ایسے کہ کراں تا بہ کراں ہیں

توڑو نہ ہمارے لیے آواز کا آہنگ
ہم لوگ تو اک ڈوبتے لمحے کی فغاں ہیں

رشید قیصرانی



مانا وہ ایک خواب تھا، دھوکا نظر کا تھا
اس بے وفا سے ربط مگر عمر بھر کا تھا

خوشبو کی چند مست لکیریں ابھار کر
لوٹا ادھر ہوا کا وہ جھونکا، جدھر کا تھا

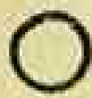
نکلا وہ بار بار گھٹاؤں کی اوٹ سے
اس سے معاملہ تو فقط اک نظر کا تھا

تم مسکرا رہے تھے تو شب ساتھ ساتھ تھی
آنسو گرے تھے جس پہ وہ دامن سحر کا تھا

ہم آج بھی خود اپنے ہی سائے میں گھر گئے
سر میں ہمارے، آج بھی سودا سفر کا تھا

صحرا کے سر کی مانگ ہے اب تک وہ اک لکیر
حاصل جسے غرور تری رہگذر کا تھا

کالی کرن، یہ گنگ صداؤں کے دائرے
پہنچا کہاں رشیدؔ، ارادہ کدھر کا تھا



تنہائیوں کا حبس مجھے کاٹتا رہا
مجھ تک پہنچ سکی نہ ترے شہر کی ہوا

وہ قہقہوں کی سیج پہ بیٹھا ہوا ملا
میں جس کے در پہ درد کی بارات لے گیا

اک عمر جستجو میں گذاری تو یہ کھلا
وہ میرے پاس تھا، میں جسے ڈھونڈتا رہا

نکلا ہوں لفظ لفظ سے میں ڈوب ڈوب کر
یہ تیرا خط ہے یا کوئی دریا چڑھا ہوا

نظریں ملیں تو وقت کی رفتار تھم گئی
نازک سے ایک لمحے پہ صدیوں کا بوجھ تھا

میں نے بڑھا کے ہاتھ اُسے چھو لیا رشیدؔ
اتنا قریب آج مرے، چاند آگیا

رشید قیصرانی



جب رات کے سینے میں اترنا ہے تو یارو
بہتر ہے کسی چاند کو شیشے میں اتارو

دیوار پگھلتی ہے، جھلس جاتے ہیں سائے
یہ دھوپ نگاہوں کی بہت تیز ہے یارو

پرچھائیاں پوچھیں گی کہاں تک یہ پجاری
اپناؤ کوئی جسم، کوئی روپ تو دھارو

خود اہلِ قلم اس میں کئی رنگ بھرینگے
تم ذہن کے پردے پہ کوئی نقش ابھارو

تم وقت کی دہلیز پہ دم توڑ رہے ہو
میں بھاگتا لمحہ ہوں، مجھے تم نہ پکارو

حالات یہ کہتے ہیں کہ تم زندہ رہو گے
پلکوں پہ لرزتے ہوئے خوش بخت ستارو



میں نے کبھی کہی تھیں آپ سے باتیں بھلی بھلی
رسوا کیا ہے آپ نے مجھ کو گلی گلی

میں نے کہا نہیں تھا کہ شعلہ بدن ہیں لوگ؟
اب کیوں دکھارہے ہتھیلی جلی جلی

گلشن میں جو چلی ہے ہوا، کتنی تیز ہے
بکھری پڑی ہے شاخ سے کٹ کر کلی کلی

ایک اور شب کی راہ میں آنکھیں بچھایئے
یہ شب، بصورتِ شبِ فتنہ، ڈھلی ڈھلی

کیسے سرک کے بھری گاگریں گریں
جب میرے ساتھ ساتھ کوئی منچلی چلی

میں نے غزل سنائی تو اک اہلِ دل رشید
سینے پہ ہاتھ رکھ کے پکارا "ولی ولی"

رشید قیصرانی



ہے شوق تو بے ساختہ آنکھوں میں سمو لو
یوں مجھ کو نگاہوں کے ترازو میں نہ تولو

میں بھی ہوں کسی آنکھ سے ٹپکا ہوا موتی
مجھ کو بھی کسی ریشمی ڈوری میں پرو لو

لایا ہوں میں خود دل کو ہتھیلی پہ سجا کر
اس جنس کے بازار میں کیا دام ہیں، بولو

میں کانچ کے ٹکڑوں کی طرح بکھرا پڑا ہوں
بھولے سے کبھی مجھکو بھی پاؤں میں چبھو لو

پھر جانیے کب وقت کی رفتار تھمے گی
ٹھہرے ہوئے لمحے کو نگاہوں میں پرو لو

اب کون بکھیرے گا کڑی دھوپ میں گیسو
خود اپنے ہی دل کے کسی تہ خانے میں سو لو

دن بھر تو رشید آپ کو ہنسنا ہی پڑے گا
رونا ہے تو اب رات کی تنہائی میں رو لو



گاتا رہا ہے دور کوئی "ہیر" رات بھر
میں دیکھتا رہا تری تصویر رات بھر

تاروں کے ٹوٹنے کی صدا گونجتی رہی
ہوتی رہی ہے رات کی تشہیر رات بھر

سورج نے صبحدم مرے پاؤں میں ڈال دی
میں توڑتا رہا ہوں جو زنجیر رات بھر

میں خامشی میں ڈوب کے کچھ سوچتا رہا
کچھ بولتی رہی تری تصویر رات بھر

میں چل پڑا تو کٹ کے وہ قدموں میں آ گری
لٹکی ہے میرے سر پہ جو شمشیر رات بھر

میں سو گیا رشید تو ہالہ بکھر گیا
سوجھی نہ کوئی چاند کو تدبیر رات بھر



اُٹھ گئی آج چاند کی ڈولی
کتنی ویراں ہے رات کی جھولی

اپنا سایہ سمیٹ کر رکھنا
مجھ سے اک بھاگتی کرن بولی

اب تو جاگ، اے شبوں کی شہزادی
تجھ کو سونا تھا عمر بھر، سو لی

سانس روکو، چراغ گل کر دو
آج بدلے گی چاندنی چولی

میں ہوں ساتھی سلگتے صحرا کا
تو ٹھٹھرتی کرن کی ہمجولی

ایک دریا سنبھل سنبھل کے چلا
ایک کشتی قدم قدم ڈولی

آسماں، تو ابھی زمیں پہ نہ آ
میں نے مٹھی ابھی نہیں کھولی

کب تک کوئی دل پہ کان دھرے
کون سمجھے رشید کی بولی



دم بھر کی خوشی باعثِ آزار بھی ہو گی
اس راہ میں سایہ ہے تو دیوار بھی ہو گی

صدیوں سے جہاں جس کے تعاقب میں رواں ہے
وہ ساعتِ صد رنگ گرفتار بھی ہو گی

رنگوں کی ردا اوڑھ کے اس ریگِ رواں پر
اتری ہے جو شب، وہ شبِ دیدار بھی ہو گی

کہتا ہے میرے کان میں خوشبو کا پیامی
منہ بند کلی مائلِ گفتار بھی ہو گی

سائے سے لپٹ جائیں گے قدموں سے بہر گام
رسوائی کچھ اپنی سرِ بازار بھی ہو گی

اے شب، نہ کٹے گی تیرے سینے کی سیاہی
اک شوخ کرن مفت گنہگار بھی ہو گی

سنتے ہیں کہ ہر صبح کے ہاتھوں میں رشید اب
اک زہر میں ڈوبی ہوئی تلوار بھی ہو گی

عادل منصوری



دُور افق کے پار سے آواز کے ہمرو دگار
صدیوں سوئی خامشی کو سامنے آ کر پکار

جانے کن ہاتھوں نے کھیلا رات ساحل پر شکار
شیر کی آواز کو ترسا کیا سونا کچھار

خواب کے سوکھے ہوئے خاکوں میں لذت کا غبار
نیند کے دیمک زدہ گتے کے پیچھے انتظار

تیرگی کیسے مٹے گی تیری نصرت کے بغیر
آسماں کی سیڑھیوں سے نقرئی فوجیں اُتار

آخرِ شب سب ستارے سو رہے ہیں بے خبر
کوئی سُورج کو خبر کر دے کہ اب شب خون مار

پھیلتا جاتا ہے کرنوں کا سنہری جال پھر
جگمگا اٹھی ہیں شمشیریں، قطار اندر قطار

جانے کس کو ڈھونڈنے داخل ہوا ہے جسم میں
ہڈیوں میں راستہ کرتا ہوا پیلا بخار

جسم کی مٹی نہ لے جائے بہا کر ساتھ میں
دل کی گہرائی میں گرتا خواہشوں کا آبشار

عادل منصوری



مجھے پسند نہیں ایسے کاروبار میں ہوں
یہ جبر ہے کہ میں خود اپنے اختیار میں ہوں

حدودِ وقت سے باہر عجب حصار میں ہوں
میں ایک لمحہ ہوں، صدیوں کے انتظار میں ہوں

ابھی نہ کر میری تشکیل، مجھ کو نام نہ دے
ترے وجود سے باہر میں کس شمار میں ہوں

میں ایک ذرّہ، میری حیثیت ہی کیا ہے مگر
ہوا کے ساتھ ہوں، اُڑتے ہوئے غبار میں ہوں

بس آس پاس یہ سُورج ہے اور کوئی نہیں
چمک رہا تو ہوں لیکن میں ریگ زار میں ہوں

عادل منصوری



پھیلے ہوئے ہیں شہر میں سائے نڈھال سے
جائیں کہاں نکل کے خیالوں کے جال سے

مشرق سے میرا راستہ مغرب کی سمت تھا
اس کا سفر جنوب کی جانب شمال سے

کیسا بھی تلخ ذکر ہو، کیسی بھی ترش بات
ان کی سمجھ میں آئے گی گل کی مثال سے

چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں کچھ بولتے نہیں
بچے بگڑ گئے ہیں بہت دیکھ بھال سے

رنگوں کو بہتے دیکھئے کمرے کے فرش پہ
کرنوں کے وار روکئے شیشے کی ڈھال سے

آنکھوں میں آنسوؤں کا کہیں نام تک نہیں
اب جتے صاف کیجیے اُن کے رومال سے

چہرہ بجھا بجھا سا، پریشان زلف زلف
اللہ دشمنوں کو بچائے وبال سے

پھر پانیوں میں نقرئی سائے اتر گئے
پھر رات جگمگا اٹھی چاندی کے تھال سے



وسعتِ دامنِ صحرا دیکھوں
اپنی آواز کو پھیلا دیکھوں

ہاتھ میں چاند کو پگھلا دیکھوں
خواب دیکھوں کہ خرابہ دیکھوں

سطح پر عکس کو بہتا دیکھوں
دریا دریا ترا سایہ دیکھوں

اپنے سائے کو برہنہ پاؤں
ساتھ رسوائی کو ہنستا دیکھوں

ریتلی دھوپ میں آتے جاتے
محملِ وقت کو ٹھہرا دیکھوں

صبح کے پھول کو ہنستا پا کر
رات کی آنکھ میں کانٹا دیکھوں

شہر میں لوگ جسے ڈھونڈتے ہیں
اپنے گھر میں اسے بیٹھا دیکھوں



عاشق تھے شہر میں جو پرانے شراب کے
ہیں ان کے دل میں وسوسے اب احتساب کے

وہ جو تمہارے ہاتھ میں آ کر نکل گیا
ہم بھی قتیل ہیں اسی خانہ خراب کے

پھولوں کی سیج پر ذرا آرام کیا کیا
اس گلبدن پہ نقش اُٹھ آئے گلاب کے

سوئے تو دل میں ایک جہاں جاگنے لگا
جاگے تو اپنی آنکھ میں جالے تھے خواب کے

بس تشنگی کی آنکھ سے دیکھا کرو انہیں
دریا رواں دواں ہیں چمکتے سراب کے

"اوکاڑہ" اتنی دور نہ ہوتا تو ایک دن
بھرلاتے سانس سانس میں "گل آفتاب" کے

کس طرح جمع کیجئے اب اپنے آپ کو
کاغذ بکھر رہے ہیں پرانی کتاب کے



وہ برسات کی شب وہ پچھلا پہر
اندھیرے کے پہلو میں سنسان گھر

کھلیں گے ابھی اور کس کس کے در
کہاں ختم ہوگا لہو کا سفر

کچھ اپنے عقائد بھی کمزور تھے
لرزتے تھے سائے بھی دیوار پر

اجالے سمٹتے رہے آنکھ میں
ستارے بکھرتے رہے فرش پر

بدن میں پگھلتی رہی چاندنی
لہو میں سلگتی رہی دوپہر

کبھی خاک والوں کی باتیں بھی سن
کبھی آسمانوں سے نیچے اتر

قدم گھر میں رکھتے ہی گھائل ہوا
گرے ٹوٹ کر مجھ پہ دیوار و در

عادل منصوری



یہ پھیلتی شگفتگی احساس کی طرف
دریا رواں دواں ہیں میری پیاس کی طرف

اس کا بدن جھکا ہوا پتھر کی بینچ پر
اپنے قدم بھی مڑتے ہوئے گھاس کی طرف

دکھلا رہی ہے دھوپ بشاشت کا آئینہ
اور چھاؤں کھینچتی ہے مجھے یاس کی طرف

اشیاء کی لذتوں میں اٹکتا ہوا بدن
اور روح کا کھنچاؤ ہے بن باس کی طرف

سب یہ سمجھ رہے تھے کہ نروان مل گیا
چکرا رہی ہے چیل مگر ماس کی طرف



کون تھا وہ خواب کے ملبوس میں لپٹا ہوا
رات کے گنبد سے ٹکرا کر پلٹ آئی صدا

میں تو تھا بکھرا ہوا ساحل کی پیلی ریت پر
اور دریا میں تھا نیلا آسماں ڈوبا ہوا

سوچ کی سوکھی ہوئی شاخوں سے مرجھائے ہوئے
ٹوٹ کر گرتے ہوئے لفظوں کو میں چنتا رہا

جب بھی خود کی کھوج میں نکلا ہوں اپنے جسم سے
کالی تنہائی کے جنگل سے گزرنا ہی پڑا

پھیلتا جاتا ہے ٹھنڈی چاندنی کے ساتھ ساتھ
شعلہ شعلہ لذتوں کی تشنگی کا دائرہ

عادل منصوری



ہاتھ میں آفتاب پگھلا کر
رات بھر روشنی سے کھیلا کر

یوں کھلے سر نہ گھر سے نکلا کر
دیکھ، بوڑھوں کی بات مانا کر

آئینہ آئینے میں کیا دیکھے
ٹوٹ جاتے ہیں خواب ٹکرا کر

ایک دم یوں اچھل نہیں پڑتے
بات کے پینترے بھی سمجھا کر

دیکھ، ٹھوکر بنے نہ تاریکی
کوئی سویا ہے پاؤں پھیلا کر

اونٹ جانے کدھر نکل بھاگا
جلتے صحرا میں ہم کو ٹھہرا کر



ہوا ختم دریا تو صحرا لگا
سفر کا تسلسل کہاں جا لگا

عجب رات بستی کا نقشہ لگا
ہر اک نقش اندر سے ٹوٹا لگا

تمہارا ہزاروں سے رشتہ لگا
کہو سائیں کا کام کیسا لگا

ابھی کھنچ ہی جاتی لہو کی دھنک
میاں تیر تک تیرا ترچھا لگا

لہو میں اترتی رہی چاندنی
بدن رات کا کتنا ٹھنڈا لگا

تعجب کے سوراخ سے دیکھتے
اندھیرے میں کیسا نشانہ لگا

غلام جیلانی اصغر



موجِ صرصر کی طرح دل سے گزر جاؤ گے
کس کو معلوم تھا، تم دل میں اُتر جاؤ گے

چار سُو وقت کی گردش کی فصیلِ شب ہے
بچ کے اس گردشِ دوراں سے کدھر جاؤ گے

آئینہ خانے سے دامن کو بچا کر گزرو
آئینہ ٹوٹا تو ریزوں میں بکھر جاؤ گے

اک ذرا اور قریبِ رگِ جاں آؤ تو
میرے خوننابِ میں تم ڈھل کے سنور جاؤ گے

دیکھو وہ چاند سسکتا ہے اُفق کی حد پر
تم بھی اس چاند کی مانند گزر جاؤ گے

اس بھری بزم سے ہنس بول کے رخصت ہو لو
کل جو اُٹھو گے تو با دیدۂ تر جاؤ گے

غلام جیلانی اصغر



تو انگ انگ میں خوشبو سی بن گیا ہوگا
میں سوچتا ہوں کہ تجھ سے گریز کیا ہوگا

تمام رات مرے دل سے آنچ آتی رہی
کہیں قریب کوئی شہر جل رہا ہوگا

تو میرے ساتھ بھی رہ کر میرے قریب نہ تھا
اب اس سے اور فزوں فاصلہ بھی کیا ہوگا

مجھے خود اپنی وفا پر بھی اعتماد نہیں
کبھی تو تُو بھی میری طرح سوچتا ہوگا

کبھی تو سنگِ ملامت کہیں سے آئے گا
کوئی تو شہر میں اپنا بھی آشنا ہوگا

ذرا سی بات پہ کیا دوستوں کے منہ آئیں
غریب دل تھا، مروّت میں جل بجھا ہوگا

غلام جیلانی اصغر



کچھ تمھاری انجمن میں ایسے دیوانے بھی تھے
جو بکارِ خویش دیوانے بھی، فرزانے بھی تھے

یوں تو ہر صورت پہ تھا بیگانگی کا شائبہ
ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو جانے پہچانے بھی تھے

سب بہ توفیقِ مروّت دوستی کرتے رہے
لوگ کیا کرتے کہ خود ان کے صنم خانے بھی تھے

تو نے اپنی آگہی کے ظرف سے جانچا مجھے
آگہی، ناآگہی کے اور پیمانے بھی تھے

دل کے جانے کا بہر صورت بہت صدمہ ہُوا
اِس سے البتہ کئی لوگوں کے افسانے بھی تھے



کتنے دریا اس نگر سے بہہ گئے
دل کے صحرا خشک پھر بھی رہ گئے

آج تک گُم سُم کھڑی ہیں شہر میں
جانے دیواروں سے تم کیا کہہ گئے

ایک تو ہے، بات بھی سہتا نہیں
ایک ہم ہیں، تیرا غم بھی سہہ گئے

تجھ سے جگ بیتی کی سب باتیں کہیں
کچھ سخن ناگفتنی بھی رہ گئے

تیری میری چاہتوں کے نام پر
لوگ کہنے کو بہت کچھ کہہ گئے

غلام جیلانی اصغر



اب کے بازار میں یہ طرفہ تماشا دیکھا
بیچنے نکلے تو یوسف کا خریدار نہ تھا

دوستو رسمِ محبت پہ یہ کیا بیت گئی
شہرِ یاراں میں کوئی شخص سرِدار نہ تھا

اور بھی لوگ تھے توفیقِ وفا رکھتے تھے
ایک میں ہی تو ترے غم کا سزاوار نہ تھا

دل کے کہنے پہ لگا لی ہے وفا کی تہمت
ورنہ جینا تو مجھے باعثِ آزار نہ تھا

مصلحت کیش بنے بیٹھے ہیں سب اہلِ وفا
اتنا رسوا تو کبھی عشق کا پندار نہ تھا

تجھ کو چاہا تو کسی اور کو چاہا نہ گیا
میں تو فن کار تھا، غالبؔ کا طرفدار نہ تھا



ہمارا اُن کا تعلق جو رسم و راہ کا تھا
بس اس میں سارا سلیقہ مرے نباہ کا تھا

تجھے قریب سے دیکھا تو دل نے سوچا ہے
کہ تیرا حسن بھی اک زاویہ نگاہ کا تھا

تجھے تراش کے دل میں سجا لیا میں نے
قصور اس میں مری رفعتِ نگاہ کا تھا

چلے تھے یوں تو کئی لوگ کوئے جاناں کو
ذرا سا ہم سے مگر اختلاف راہ کا تھا

تری جفا کا خدا سلسلہ دراز کرے
کہ اس سے اپنا تعلق بھی گاہ گاہ کا تھا

غلام جیلانی اصغر



ملے بھی دوست تو اس طرز بے دلی سے ملے
کہ جیسے اجنبی کوئی اک اجنبی سے ملے

قدم قدم پہ خلوصِ وفا کا ذکر کیا
عدو ملے بھی تو کس حسن سادگی سے ملے

ستم کرو بھی تو اندازِ منصفی سے کرو
کوئی سلیقہ تو عنوانِ دوستی سے ملے

تری تلاش میں نکلے تھے تیرے دیوانے
ہر ایک موڑ پہ خود اپنی زندگی سے ملے

وہ لوگ اپنی ہی زنجیرِ پا کے قیدی ہیں
جنھیں نشانِ سفر بھی تری گلی سے ملے

چلو کہ ترکِ تعلق کی بات ختم ہوئی
نہ تم خوشی سے ملے ہو، نہ ہم خوشی سے ملے



تو سرحدِ خیال سے آگے گزر گیا
میں تیری جستجو میں بہ حدِ نظر گیا

دل کو کریدنے سے مری جان! فائدہ؟
اک زخم تھا کہ وقت کی آندھی سے بھر گیا

ساحل تمام عمر یونہی تشنہ لب رہا
سیلاب کتنی بار یہاں سے گزر گیا

عمرِ گریز پا کو کہاں ڈھونڈنے چلیں
وہ نقشِ لوحِ وقت سے کب کا اتر گیا

اقبال ساجد



دہر کے اندھے کنویں میں کس کے آوازہ لگا
کوئی پتھر پھینک کر پانی کا اندازہ لگا

ذہن میں سوچوں کا سورج برف کی صورت نہ رکھ
گھر کے دیوار و در پر دھوپ کا غازہ لگا

رات بھی اب جا رہی ہے اپنی منزل کی طرف
کس کی دُھن میں جاگتا ہے، گھر کا دروازہ لگا

کانچ کے برتن میں جیسے سرخ کاغذ کا گلاب
وہ مجھے اتنا ہی اچھا اور تر و تازہ لگا

پیار کرنے بھی نہ پایا تھا کہ رسوائی ملی
جرم سے پہلے ہی مجھ کو سنگِ خمیازہ لگا

شہر کی سڑکوں پہ اندھی رات کے پچھلے پہر
میرا ہی سایہ مجھے رنگوں کا شیرازہ لگا

جانے، رہتا ہے کہاں اقبال ساجد آج کل
رات دن دیکھا ہے اُس کے گھر کا دروازہ لگا

اقبال ساجد



غار سے سنگ ہٹایا تو وہ خالی نکلا
کسی قیدی کا نہ کردار مثالی نکلا

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

سب کی شکلوں میں تری شکل نظر آئی مجھے
قرعۂ فال مرے نام پہ گالی نکلا

راس آئے مجھے مرجھائے ہوئے زرد گلاب
غم کا پرتو مرے چہرے کی بحالی نکلا

کٹ گیا جسم مگر سائے تو محفوظ رہے
میرا شیرازہ بکھر کر بھی مثالی نکلا

رات جب گزری تو پھر صبح حنا رنگ ہوئی
آسماں جاگی ہوئی آنکھ کی لالی نکلا

رات مجھ سے بھی تو ہر گھر کے در و بام سجے
چاند کی طرح مرا عکس خیالی نکلا

تخت خالی ہی رہا دل کا ہمیشہ ساجد
اس ریاست کا تو کوئی بھی نہ والی نکلا

اقبال ساجد



وہ چاند ہے تو عکس بھی پانی میں آئے گا
کردار خود ابھر کے کہانی میں آئے گا

چڑھتے ہی دھوپ شہر کے کھل جائینگے کواڑ
جسموں کا ریگزار روانی میں آئے گا

آئینہ ہاتھ میں ہے تو سورج پہ عکس ڈال
کچھ لطف بھی سراغِ رسانی میں آئے گا

دل میں لگے گی آگ تو سلگے گی آنکھ بھی
یہ شعلہ خود ہی آبِ معانی میں آئے گا

رخصت سفر بھی ہو گا مرے ساتھ شہر میں
صحرا بھی شوقِ نقلِ مکانی میں آئے گا

پھر آئے گا وہ مجھ سے بچھڑنے کے واسطے
بچپن کا دور پھر سے جوانی میں آئے گا

کب تک لہو کے حبس سے گرمائے گا بدن
کب تک ابال آگ سے پانی میں آئے گا

صورت تو بھول بیٹھا ہوں، آواز یاد ہے
اک عمر اور ذہن گرانی میں آئے گا

ساجدؔ تو اپنے نام کا کتبہ اٹھائے پھر
یہ لفظ کب لباسِ معانی میں آئے گا



اک طبیعت تھی سو وہ بھی لاابالی ہو گئی
ہائے یہ تصویر بھی رنگوں سے خالی ہو گئی

آنکھ جب برسی تو سارا جسم تازہ ہو گیا
پہلی بارش سے ہی غائب خشک سالی ہو گئی

جو مرے چہرے پہ لکھا تھا وہ سب نے پڑھ لیا
حرف کاسہ بن گئے، صورت سوالی ہو گئی

باغ کا سب سے بڑا جو پیڑ تھا وہ جھک گیا
پھل لگے اتنے کہ بوجھل ڈالی ڈالی ہو گئی

پڑھتے پڑھتے تھک گئے سب لوگ تحریریں مری
لکھتے لکھتے شہر کی دیوار کالی ہو گئی

کھل گئی مٹھی تو میرا ہاتھ خالی رہ گیا
مجھ میں جو روشن تھا، اس کی شکل کالی ہو گئی

اب تو دروازے سے اپنے نام کی تختی اتار
لفظ ننگے ہو گئے، شہرت بھی گالی ہو گئی

اتنی تصویریں جلیں سینے کے آتشدان میں
گھر کے روشندان کی لکڑی بھی کالی ہو گئی

صبح کو دیکھا تو ساجدؔ، دل کے اندر کچھ نہ تھا
یاد کی بستی بھی راتوں رات خالی ہو گئی

اقبال ساجد

○

تم مجھے بھی کانچ کی پوشاک پہنانے لگے
میں جسے دیکھوں وہی پتھر نظر آنے لگے

بے سبب گھر سے نکل کر آ گئے بازار میں
آئینہ دیکھا نہیں، تصویر چھپوانے لگے

دشت میں پہنچے تو تنہائی مکمل ہو گئی
بڑھ گئی وحشت تو پھر خود سے ہی ٹکرانے لگے

خون کا نشہ چڑھا تو جسم زہریلا ہوا
خواہشوں کے پانیوں میں سانپ لہرانے لگے

کچھ نہیں ہے ذہن میں تو وہم کی شکلیں بنا
روشنی ہو گی، اگر سائے نظر آنے لگے

دیکھنا چاہا تو وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا
چومنا چاہا تو میرے ہونٹ پتھرانے لگے

رنگ آخر لے ہی آیا میری سوچوں کا جمود
برف کے سورج بلا کی دھوپ پھیلانے لگے

چل پڑے تو ہو لیے اقبال ساجد اپنے ساتھ
تھک گئے تو اپنے ہی سائے میں سستانے لگے

○

پیاسے کے پاس رات سمندر پڑا ہوا
کروٹ بدل رہا تھا برابر پڑا ہوا

باہر سے دیکھیے تو بدن ہیں ہرے بھرے
لیکن لہو کا کال ہے اندر پڑا ہوا

دیوار تو ہے راہ میں سالم کھڑی ہوئی
سایہ ہے درمیان سے کٹ کر پڑا ہوا

اندر تھی جتنی آگ وہ ٹھنڈی نہ ہو سکی
پانی تھا صرف گھاس کے اوپر پڑا ہوا

ہاتھوں پہ بہہ رہی ہے لکیروں کی آبجو
قسمت کا کھیت پھر بھی ہے بنجر پڑا ہوا

پر خود ہی آسمان کی وسعت میں قید ہے
کیا دیکھتا ہے چاند کو، چھت پر پڑا ہوا

جلتا ہے روز شام کو گھاٹی کے اس طرف
دن کا چراغ، جھیل کے اندر پڑا ہوا

مارا کسی نے سنگ تو ٹھوکر لگی مجھے
دیکھا تو آسمان تھا زمیں پر پڑا ہوا

اقبال ساجد



پھینک یوں پتھر کہ سطحِ آب بھی بوجھل نہ ہو
نقش بھی بن جائے اور دریا میں بھی ہلچل نہ ہو

پھول یوں بھینچو کہ اک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک، لمحہ کوئی اوجھل نہ ہو

ہے سفر درپیش تو پرچھائیں کی انگلی پکڑ
راہ میں تنہائی کے احساس سے پاگل نہ ہو

پہلی سیڑھی پہ قدم رکھ، آخری سیڑھی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں رائیگاں اک پل نہ ہو

ذہن خالی ہو گئے ہیں وقت کے احساس سے
سامنے وہ مسئلہ رکھ جس کا کوئی حل نہ ہو

سب کے ہی سینوں میں ہے پھیلا ہوا سانسوں کا حبس
کوئی شہر ایسا نہیں جس کی فضا بوجھل نہ ہو

لوگ اکثر اپنے چہرے پر چڑھا لیتے ہیں خول
تو جسے سونا سمجھتا ہے، کہیں پیتل نہ ہو

جستجو اس پیڑ کی کیوں ہو کہ جو سایہ نہ دے
ہاتھ اس ڈالی پہ کیا پہنچے کہ جس پہ پھل نہ ہو

روز و شب لگتا رہے سوچوں کا میلہ ذہن میں
شور سے خالی کبھی احساس کا جنگل نہ ہو

گرم کر ساجد لہو کو دھیمی دھیمی آنچ سے
وقت سے پہلے ترے جذبات میں ہلچل نہ ہو



ہر گھڑی کا ساتھ دکھ دیتا ہے، جانِ من، مجھے
ہر کوئی کہنے لگا تنہائی کا دشمن مجھے

دن کو کرنیں، رات کو جگنو پکڑنے کا ہے شوق
جانے کس منزل میں لے جائے گا پاگل پن مجھے

سادہ کاغذ رکھ کے آیا ہوں نمائش گاہ میں
دیکھ کر ہوتی تھی ہر تصویر کو الجھن مجھے

ناچتا تھا پاؤں میں لمحوں کے گھنگرو باندھ کر
دے گیا دھوکا سمٹ کر وقت کا آنگن مجھے

نیکیوں کے پھل نہیں لگتے بدی کے پیڑ پر
اس نے واپس کر دیا ہے پھر تہی دامن مجھے

دوستو! سن لی خدا نے کل مری پہلی دعا
شرم سے آخر جھکانی پڑ گئی گردن مجھے

کیا ملا تجھ کو، بتا، اندھے سے لاٹھی چھین کر
کر دیا کیوں آس سے محروم، جانِ من، مجھے

سرد ہو سکتی نہیں ساجد کبھی سینے کی آگ
دل جلانے کو ملا ہے یاد کا ایندھن مجھے

اقبال ساجد



گڑے مُردوں نے اکثر زندہ لوگوں کی قیادت کی
مری راہوں میں بھی حائل ہیں دیواریں قدامت کی

نئی کرنیں پرانے آسماں میں کیوں جگہ پائیں
وہ کافر ہے کہ جس نے چڑھتے سورج کی عبادت کی

پرانی سیڑھیوں پر میں نئے قدموں کو کیوں رکھوں
گراؤں کس لئے چھت سر پہ بوسیدہ عمارت کی

ترا احساس بھی ہو گا کبھی میری طرح پتھر
نکل جائے گی آئینے سے پرچھائیں نزاکت کی

وہ میرا بت تھا جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے توڑا
کہ برسوں کی یہ محنت ایک لمحے میں اکارت کی

اگر ہے نام کی خواہش تو دیواروں پہ چسپاں کر
بنا کر جھوٹ کے رنگوں سے تصویریں صداقت کی

ابھی سینوں میں لہراتے ہیں میری یاد کے پرچم
ابھی تک ثبت ہیں مہریں دلوں پر بادشاہت کی

ابھی سب حرف تازہ ہیں مگر تاکیوں ہے معنی سے
سیاہی خشک بھی ہونے نہیں پائی عبارت کی

کوئی میٹھے پھلوں کی آس میں کیوں تلخ دن کاٹے
کسے فرصت ہے ساجد آج کل صبر و قناعت کی



سائے کی طرح بڑھ نہ کبھی قد سے زیادہ
تھک جائے گا مُجھ جائے گا اگر حد سے زیادہ

ممکن ہے ترے ہاتھ سے مٹ جائیں لکیریں
امید نہ رکھ گوہرِ مقصد سے زیادہ

لگ جائے نہ تجھ پر ہی ترے قتل کا الزام
بدنام تو ہوتا ہے بُرا بد سے زیادہ

خواہش ہے بڑائی کی تو اندر سے بڑا بن
کر ذہن کی بھی نشو و نما قد سے زیادہ

دیکھوں تو مرے جسم پہ شاخیں ہیں نہ پتے
سوچوں تو گھنا چھاؤں میں، برگد سے زیادہ

رہنے دو خلاؤں میں مری قبر نہ کھودو
ہے پیار مجھے خاک کی مسند سے زیادہ

آنکھیں تو لگی رہتی ہیں دروازے کی جانب
ملتی ہے خوشی اپنی ہی آمد سے زیادہ

کیا جانیے کیا بات ہے، اک عمر سے ساجد
ویران ہے ٹوٹے ہوئے مرقد سے زیادہ

صدیق افغانی

○

شہرِ احساس میں زخموں کے خریدار بہت
ہاتھ میں سنگ اُٹھا، شیشوں کے بازار بہت

کوئی کھڑکی ہے سلامت نہ کوئی دروازہ
میرے گھر کے سبھی کمرے ہیں ہوادار بہت

ہاتھ تھکتے نہیں رنگوں کے ہیولے بُن کر
اہلِ فن کو سرِ کاغذ، خطِ پرکار بہت

دشت میں بھی وہی آثار ہیں آبادی کے
پھیلتا جاتا ہے اب سایۂ دیوار بہت

دھوپ کا پھول گرا شاخِ شفق سے جس دم
دن کا چہرہ نظر آتا تھا شکن دار بہت

نقش ہے ذہن پہ یوں تیرا طلسمی پیکر
میں ہوں خود اپنی نگاہوں میں پُراسرار بہت

لفظ کرنوں کی طرح دل میں اُتر جاتے ہیں
دل نشیں ہے ترا پیرایۂ اظہار بہت

خوف دشمن کی طرح میرے تعاقب میں بھی تھا
خنجرِ وہم کے میں نے بھی سہے وار بہت

تن گئے اتنے مرے گرد ہواؤں کے پہاڑ
سانس لینا بھی ہے میرے لیے دشوار بہت

اب بھی لمحوں سے سلاسل کی کھنک آتی ہے
اب بھی ہیں وقت کے زنداں میں گرفتار بہت

زخم کے چاند نہ راتوں کو مرے دل میں اُتار
میرے سینے پہ نہ رکھ سنگِ گراں بار بہت

تیرگی آئے نہ صدیق ضیا کے نزدیک
کاٹ رکھتی ہے یہ ٹوٹی ہوئی تلوار بہت

صدیق افغانی



غازہ تو ترا اُتر گیا تھا میں دیکھ کے خود کو ڈر گیا تھا
اب شہر ہیں راستے کا پتھر میں جنگلوں سے گزر گیا تھا
تحریرِ جبیں مٹی ہوئی تھی تقدیر کا زخم بھر گیا تھا
بے نور تھی جھیل بھی کنول سے سورج بھی خلا میں مر گیا تھا
احساس، شباب، غم، محبت ایک ایک نشہ اُتر گیا تھا
دل کو وہ سکوں ملا ترے پاس جیسے میں نگر نگر گیا تھا
کیا چیز تھی بادِ صبحگاہی رُوئے گُلِ تر نکھر گیا تھا
ہمراہ تھے ان گنت زمانے مَیں دشت سے اپنے گھر گیا تھا
نظروں کا ملاپ کون بھولے اک سانحہ سا گزر گیا تھا
اقرارِ وفا کیا تھا اُس نے میں فرطِ خوشی سے مر گیا تھا

صدیق چلی تھی تیز آندھی
مٹی کا بدن بکھر گیا تھا

صدیق افغانی



بوالہوس میں بھی نہ تھا، وہ بت بھی ہرجائی نہ تھا
پھر بھی ہم بہروپیوں کو خوفِ رسوائی نہ تھا

آندھیوں نے سب مٹا ڈالے نقوشِ رہگذار
ریت کے سینے پہ داغِ آبلہ پائی نہ تھا

رات کے کالے کنوئیں میں چھپ گیا سایہ مرا
اس سے پہلے تو کبھی یہ ننگِ تنہائی نہ تھا

وہم کا پیکر تھا آویزاں در و دیوار پر
کھڑکیوں میں چاند محوِ جلوہ آرائی نہ تھا

سبز پیڑوں کے تنے کٹ کٹ کے کیوں گرنے لگے
اے ہوا میں قتل و غارت کا تماشائی نہ تھا

روشنی دیتی تھی چمکیلے بدن کی تازگی
ورنہ میں چہرے کے خال و خد کا شیدائی نہ تھا

کیا تر و تازہ تھا آبِ صبح سے نخلِ شفق
بجھتے سورج میں تو یہ اندازِ رعنائی نہ تھا

ایک اک کردار تھا اپنی اداکاری میں گم
اس تماشا گاہ میں کوئی تماشائی نہ تھا

مر گیا صدیق کوہِ غم سے ٹکر مار کر
سر میں سودا تھا مگر ذوقِ جبیں سائی نہ تھا



سحر کو دھند کا خیمہ جلا تھا
ہیولا کہر کے اندر چھپا تھا

مکاں جسموں کی خوشبو سے تھا خالی
مگر سایوں سے آنگن بھر گیا تھا

جلی حدت سے نم آلود مٹی
کوئی سورج زمیں میں دھنس گیا تھا

خموشی کی گھٹن سے چیخ اٹھا
مرا گنبد بھی صحرا کی صدا تھا

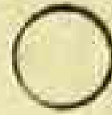
ابھر آئی تھی جو پاؤں میں خشکی
مگر ڈھلوان پر پانی کھڑا تھا

اڑا تھا میں ہواؤں کے سہارے
رکی آندھی تو نیچے گر پڑا تھا

چھپا کب تھا مرے اندر کا انساں
میں اس کو دیکھ کر کتنا ڈرا تھا

لہو صدیق اب تک بہہ رہا ہے
کبھی اک پھول ماتھے پہ لگا تھا

صدیق افغانی



جب کھلے مٹھی تو سب پڑھ لیں خطِ تقدیر کو
جی میں آتا ہے مٹا دوں ہاتھ کی تحریر کو

جسم سناٹے کے عالم سے گزرتا ہی نہیں
بے حسی نے اور بوجھل کر دیا زنجیر کو

بہتا دریا ہے کہ آئینہ گری کا سلسلہ
دیکھتا رہتا ہوں پانی میں تری تصویر کو

صبحِ نو نے کاٹ ڈالے شامِ ظلمت کے حصار
کس طرح روکے کوئی کرنوں کی جوئے شیر کو

دھڑکنوں کی چاپ رک جائے تو آئے نیند بھی
ساتھ لے کر پھر رہا ہوں شورِ دار و گیر کو

جب معانی کا اجالا ہی نہ ہو الفاظ میں
کیوں کریں روشن سخن کی شمعِ بے تنویر کو

دھند سائے، خوف، گہری چپ، ہوا کی بے رخی
کیسے عالم میں چلا ہوں دہر کی تسخیر کو

اپنی پیشانی پہ شہرت کی لکیریں کھینچ لے
اپنے سینے سے لگا لے کتبۂ تشہیر کو

عکس آئینے سے پہلے تھا تو پھر صدیق کیوں
خواب سے پہلے نہ دیکھا خواب کی تعبیر کو



لے اڑے خاک بھی صحرا کے پرستار مری
راہ تکتے ہی رہے شہر کے بازار مری

تیز آندھی نے کئے مجھ پہ بلا کے حملے
پھر بھی قائم رہی مٹی کی یہ دیوار مری

چھپ گیا تھا مرے جنگل میں کوئی سایہ سا
آج تک اس کے تعاقب میں ہے تلوار مری

گونج ابھرے گی مری روح کے سناٹوں سے
سلب ہو جائے گی جب طاقتِ گفتار مری

ٹوٹتی جاتی ہیں سانسوں کی شکستہ کڑیاں
پھیلتی جاتی ہے صحراؤں میں جھنکار مری

کتنا بے کیف تماشائے بہاراں نکلا
جب خزاں بن گئی بھی خواہشِ اظہار مری

ہم سفر چاند نہ سورج نہ ستارے نکلے
تیز ہے گردشِ دوراں سے بھی رفتار مری

آتش و آب و ہوا خاک و خلا و افلاک
کتنے قلعوں پہ بیک وقت ہے یلغار مری

غم زمانے میں کوئی جنس تو صدیق نہیں
کیا خریدیں گے کوئی چیز خریدار مری

صدیق افغانی



جھونکا نفس کا موجۂ صرصر لگا مجھے
بات آگئی تو خود سے بڑا ڈر لگا مجھے

اتنا گداز ہے مرا دل فرطِ درد سے
پھینکا کسی نے پھول تو پتھر لگا مجھے

خود ہی ابھر کے ڈوب گیا اپنی ذات میں
سورج اک اضطراب کا پیکر لگا مجھے

یہ شامِ وعدہ ہے کہ پڑاؤ ہے وقت کا
اک لمحہ اک صدی کے برابر لگا مجھے

جیسے میں تیری ذات کا عکسِ جمیل ہوں
یوں بھی ترے فراق میں اکثر لگا مجھے

اس شور میں محال تھا تیرا خیال بھی
صحرا بھی تیرے شہر سے بہتر لگا مجھے

دامن سے دھو سکا تھا میں دھبے گناہ کے
قطرہ بھی آنسوؤں کا سمندر لگا مجھے

تازہ ہوا میں سکھ کا کوئی سانس لے سکوں
اے ربِ کائنات، ذرا پر لگا مجھے



ہوا چلی تو پسینہ رگوں میں بیٹھ گیا
نمی کا زہر شجر کی جڑوں میں بیٹھ گیا

اداس کیوں نہ ہوں اب تیرے قرب کی صبحیں
شبِ فراق کا ڈر سا دلوں میں بیٹھ گیا

ابھی فضاؤں میں برقِ صدا ہی کوندی تھی
زمانہ خوف کے مارے گھروں میں بیٹھ گیا

نہ کام آ سکی اعضا کی چار دیواری
مکاں بدن کا زمیں کی تہوں میں بیٹھ گیا

امید و بیم کے سائے ہیں جس طرف دیکھوں
میں چلتے چلتے یہ کن جنگلوں میں بیٹھ گیا

ہوا کا سامنا پتے غریب کیا کرتے
کھڑا درخت بھی تیز آندھیوں میں بیٹھ گیا

برس پڑیں مرے سر پہ سیاہیاں صدیق
سحر کا روپ نگر ظلمتوں میں بیٹھ گیا

صدیق افغانی



جب دھیان میں وہ چاند سا پیکر اُتر گیا
تاریک شب کے سینے میں خنجر اُتر گیا

جب سب پہ بند تھے مری آنکھوں کے راستے
پھر کیسے کوئی جسم کے اندر اُتر گیا

ساحل پہ ڈر گیا تھا میں لہروں کو دیکھ کر
جب غوطہ زن ہوا تو سمندر اتر گیا

اک بھی لکیر ہاتھ پہ باقی نہیں رہی
دستِ طلب سے نقشِ مقدر اتر گیا

وہ آئینے کے سامنے کیا رونما ہوئے
سادہ ورق رنگ کا منظر اتر گیا

چہرے کی تیز دھار بھی بیکار ہو گئی
جب چشمِ آبدار سے جوہر اُتر گیا

کس درجہ دلفریب تھی دانے کی شکل بھی
پنچھی ہرے شجر سے زمیں پہ اتر گیا



آ رہی تھی بند کلیوں کے چٹکنے کی صدا
میں سراپا گوش ہو کر رات بھر سنتا رہا

بہہ گیا ظلمات کے سیلاب میں ایوانِ رنگ
دھوپ جب نکلی، تمازت سے سمندر جل اٹھا

جب رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا یہ حبس
روزنِ دیوار سے مجھ پہ ہنسی ٹھنڈی ہوا

سبز کھیتوں سے کوئی صحرا میں لے جائے مجھے
میں ہرے سورج کی تابانی سے اندھا ہو گیا

بن گئی زنجیر، خوشبودار مٹی کی کشش
میں زمیں سے جب خلاؤں کی طرف جانے لگا

شمس الرحمٰن فاروقی



موسمِ سنگ و رنگ سے ربطِ شرار کس کو تھا

لمحہ بہ لمحہ جل گئی، دردِ بہار کس کو تھا

سرحدِ آسماں کے پاس جال بچھے تھے ہر طرف

کس نے کیا ہمیں اسیر، شوقِ شکار کس کو تھا

آج سے پہلے ہم سبھی سمجھے تھے اس کو برگِ گل

تجربۂ جلالتِ روئے نگار کس کو تھا

شمس و نجوم بے کراں، ہفت فلک نبرد گاہ

روشنیوں کی دوڑ میں پائے فرار کس کو تھا

چشمِ شفق تھی خوں نشیں، چہرۂ شب تھا تیغ تیز

خواب پڑے تھے تار تار، صبر و قرار کس کو تھا

سایۂ ہر شجر میں تھا رینگتے لمحوں کا ہجوم

خام خیال تیزیٔ لیل و نہار کس کو تھا

سایۂ ابلق شجر، گھات میں چشمِ نیم وا

پاؤں جہاں تھے جم گئے، ہوشِ فرار کس کو تھا



لغزشِ پائے ہوش کا حرفِ جواز لے کے ہم
خود کو سمجھنے آئے ہیں رنجِ مجاز لے کے ہم

کربِ جہے ایک لمحے میں لاکھ برس گذر گئے
مالکِ حشر! کیا کریں عمرِ دراز لے کے ہم

شام کی دھندلی چھاؤں میں پھیلے ہیں سائے دار کے
سجدہ کریں کہ آئے ہیں ذوقِ نماز لے کے ہم

دُور افق پہ جا کہیں دونوں لکیریں مل گئیں
آئے تو تھے حضورِ دل ناز و نیاز لے کے ہم

رات ڈھلی ہے، چاند گم، دُور جلے ہیں دو دیئے
راز تو ہے یہ کس کے پاس جائیں یہ راز لے کے ہم

رقصِ شرر میں کھو گئے، برق کے دل سے مل گئے
لالہ و گل میں کھل گئے، موت کا راز لے کے ہم

رشتۂ سخن بدل گیا، بڑھنے لگے ہیں فاصلے
آہ سکوتِ منجمد! بیٹھے ہیں ساز لے کے ہم

شمس الرحمٰن فاروقی



دیکھئے[1] بے بدنی، کون کہے گا قاتل ہے
سایہ آسا جو پھرے اس کو پکڑنا مشکل ہے

رگِ ہر لفظ سے رستے ہوئے خوں سے گھبرا کر
میں جو خاموش رہا، سب نے کہا، تو جاہل ہے

تجربہ دل میں رہے تو کھلے آنسو بن بن کر
اور کاغذ پہ چھلک جائے تو شمعِ محفل ہے

جو بھری دنیا کی سنگین عجائب نگری میں
اپنا سر آپ نہ پھوڑے وہ جہنم واصل ہے

لبِ دریا کو ملانے کا طریقہ کیا ہو گا
دونوں جھکتے ہیں مگر بیچ میں دریا حائل ہے



دن بھر کی دوڑ، رات کے اوہام و وسوسے
ٹھنڈی سلونی شام کی خوشبو میں ڈھل گئے

کردار قتل کرنے لگے لوگ یوں کہ ہم
اپنے ہی گھر میں بیٹھ کے آوارہ بن گئے

رقصِ نسیم موت تھا ہر چند مختصر
دریا کے منہ پہ پھر بھی اچھل آئے آبلے

نازک ہے مثلِ ماہ، مگر سرمئی بدن
اے جاں تجھے یہ کس نے دیے غسل آگ کے!

[1] اس غزل کا وزن فاعلاتن فعلاتن مفعولن ہے اور بحر رمل مثمن مخبون مشعث

شمس الرحمٰن فاروقی



موجِ دریا کو پیش، کیا غمِ خمیازہ کریں
رگِ افسردۂ صحرا میں لہو تازہ کریں

دل کے محبس میں کریں ذات کا ماتم کب تک
آؤ باہر تو چلیں، وقت کا اندازہ کریں

خوں ہے اک دولتِ دل، لوٹ ہی لیں اہلِ فلک
چہرۂ داغِ قمر پر تو نیا غازہ کریں

انگلیاں سرد ہیں، پھونکیں تو انہیں ہوش میں لائیں
اپنے سینوں پہ لکھیں، حرفِ وفا تازہ کریں

شیشہ تھا اک غمِ دل، ٹوٹ کے ساحل پہ گرا
منتشر ریت کے ہر ذرے کا شیرازہ کریں

رگِ احساس سے بچنے کی تو کوئی نہیں راہ
سنگِ تخئیل پہ نہ بند آنکھ کا دروازہ کریں



محفل کا نور، مرجعِ اغیار کون ہے
ہم ہیں ہلاکِ طالعِ بیدار کون ہے

ہم اپنے سائے سے تو بھڑک کر الگ ہوئے
دیکھا نہیں مگر پسِ دیوار کون ہے

ہر لمحہ کی کمر پہ ہے اک محملِ سکوت
لوگو، بتاؤ! قائلِ گفتار کون ہے

گھر گھر کھِلے ہیں ناز سے سورج مکھی کے پھول
سورج کو پھر بھی مانعِ دیدار کون ہے

پتھر اٹھا کے درد کا ہیرا جو توڑ دے
وہ کج کلاہ، بانکا طرحدار کون ہے

شمس الرحمٰن فاروقی



پتھر کی بھوری اوٹ میں لالہ کھلا تھا کل
آج اس کو نوچ لے گئیں دو بچیاں جناب

آنکھوں میں روشنی کی جگہ تھا خُدا کا نام
پاؤں تڑا کے مر رہے، جانے کہاں جناب

ہم برگِ زرد، سبز خلاؤں میں چھپ گئے
ہم کو ہوائے سرد تھی سنگِ گراں جناب

بوسے کے داغ سے ہے منوّر جبیں مگر
جلتی پڑی ہے شمع سی پیاسی زباں جناب

کالی زمیں پہ چھنتی دریچوں سے روشنی
باہر تو جھانکئے، ہے انوکھا سماں جناب

نیلی چمکتی دھوپ تو بکتی نہیں کہیں
ہم کس کے ہاتھ بیچ دیں لفظ و بیاں جناب



کنارِ بحر ہے، دیکھوں گا موجِ آب میں سانپ
یہ وقت وہ ہے، دکھائی دے ہر حباب میں سانپ

وہ کون تھا؟ وہ کوئی ہم نژاد تو نہ تھا کل رات
جب اس کے نام کو پوچھا، کہا جواب میں سانپ

اسے مظاہرِ ہستی سے سخت الفت تھی
علاوہ شخص چھپائے ہوئے نقاب میں سانپ

گذشتہ رات مجھے پڑھتے وقت وہم ہُوا
لکھے ہیں حرف ورق پہ کہ ہیں کتاب میں سانپ

یہ ڈھلتی رات، یہ کمرے میں گونجتا صحرا
امڈتا خوف ہے دل میں کہ پیچ و تاب میں سانپ

تمام جلوۂ وحدت ہے شام ہو کہ سحر
ہے جس حساب میں صحرا اسی حساب میں سانپ

اگرچہ ہم نے مضامیں کو خوب بس میں کیا
مگر نہ باندھ سکے قافیہ "شراب" میں سانپ"

شمس الرحمٰن فاروقی



ان کا خیال ہر طرف، ان کا جمال ہر طرف
حیرتِ جلوہ روبرو، دستِ سوال ہر طرف

نغمہ گراں ہے بوند بوند، پھر بھی اٹھی ہے کتنی گونج
اڑتی پھرے ہے ذہن میں گردِ خیال ہر طرف

مجھ سے شکستہ پا سے ہے شہر کی تیرے آبرو
چھوڑ گئے مرے قدم نقشِ کمال ہر طرف

ہم ہیں جواں بھی، پیر بھی، ہم ہیں عدم بھی زیست بھی
ہم ہیں اسیرِ حلقۂ قولِ محال ہر طرف

قلبِ حیات و موت سے مل نہ سکا کوئی جواب
پھینکا کئے ہیں گرچہ ہم سنگِ سوال ہر طرف



ہر جلوۂ حسن بے وطن ہے
شاید کہ یہ محفلِ سخن ہے
اک وجد میں جسم و جانِ فنکار
ہے رقص کہ روح کا بدن ہے
ہر نکتہ مثالِ چہرہ روشن
ہر شعر میں بوئے پیرہن ہے
کافور کی شمعیں جل اٹھی ہیں
ابلاغِ خیال کا کفن ہے
ہر ساز کی آرزو — تکلم
ہر ساز سکوتِ پیرہن ہے

خاور رضوی



حور و قصور سے نہ بہشتِ بریں سے ہے
نازاں ہوں میں کہ میرا تعلق زمیں سے ہے

وقفِ فروغِ رنگ، نظر اور دل، بضد
پیراہنِ حیات دریدہ کہیں سے ہے

سجدوں کی ضَو نہیں ہے تو زخموں کے پھول ہیں
باقی کوئی تو سنگ کا رشتہ جبیں سے ہے

کیا ذکرِ بے رُخی کہ یہ شیوہ ہے حُسن کا
شکوہ مجھے تری نگہِ اوّلیں سے ہے

میں تیرا بانکپن ہوں، مجھے ہاتھ سے نہ کھو
انگشتری کی زینت و قیمت نگیں سے ہے

دھول اڑ رہی ہے دیدۂ خونابہ بار میں
قائم اب اشکِ غم کا بھرم آستیں سے ہے

ہم بھاگتے پھریں، یہ مروّت سے ہے بعید
جب گردشِ جہاں کو عقیدت ہمیں سے ہے

آشوبِ روزگار نے یہ حال کر دیا
باتیں کہیں کی ہیں تو حوالہ کہیں سے ہے

خاورؔ کسی بھی رشتے کو حاصل نہیں ثبات
جز رشتۂ وفا جو دمِ واپسیں سے ہے

خاور رضوی



جتنا برہم وقت تھا، اُتنے ہی خودسر ہم بھی تھے
موجِ طوفاں تھا اگر پل پل تو پتھر ہم بھی تھے

کاش کوئی اک اچٹتی سی نظر ہی ڈالتا
چور تھے زخموں سے لیکن ایک منظر ہم بھی تھے

گرد بالِ دوش تھا سر، ہاتھ میں تیشہ بھی تھا
اک طرح سے تو نصیبے کے سکندر ہم بھی تھے

خود شناسی کا بھلا ہو، راکھ کی چٹکی ہیں آج
ورنہ اک رخشندہ و تابندہ گوہر ہم بھی تھے

سطح بیں تھے لوگ، کیا پاتے ہماری وسعتیں
جھانکتا دل میں کوئی تو اک سمندر ہم بھی تھے

چڑھتے سورج کی پرستش گو تھا دنیا کا اصول
ہم کسی کو پوجتے کیسے کہ خاور ہم بھی تھے

خاور رضوی



بڑھیں گے اور بھی یوں سلسلے حجابوں کے
کر اپنی بات ــ حوالے نہ دے کتابوں کے

میں شہرِ گل کا مسافر، مرے شریکِ سفر
صعوبتوں کی یہ راتیں، یہ دن عذابوں کے

تری نظر سے عبارت تھے، تیرے ساتھ گئے
وہ پھول میرے خیالوں کے، رنگ خوابوں کے

تمام عمر پھر اک کرب کی چتا میں جلے
ہم ایک پل جو رکے شہر میں گلابوں کے

ہٹایا رنگ کا پردہ تو زخم زخم تھا پھول
چمن چمن تھے وہی سلسلے سرابوں کے

ابھی وہ حبس ہے خاورؔ کہ دم الجھتا ہے
ابھی کھلے رکھو دروازے اپنے خوابوں کے



اک خلش، اک کرب، پنہاں میری خاکستر میں ہے
میرا دشمن ــ حادثہ یہ ہے کہ ــ میرے گھر میں ہے

کون کس کے اشک پونچھے، کون کس کا دکھ بٹائے
جو ہے وہ محرومیوں کے گنبدِ بے در میں ہے

ضربِ تیشہ چاہیئے اور دستِ آذر چاہیئے
اک جہانِ خال و خد خوابیدہ ہر پتھر میں ہے

اس زمانے میں مری سادہ دلی، میرا خلوص
ایک منظر ہے مگر بے ربط پس منظر میں ہے

بیچ دی حسنؔ ور یہاں یاروں نے ناموسِ وفا
تو بھی پیارے کس بھلاوے میں ہے، کس چکر میں ہے

خاور رضوی



با ہمہ یورشِ آلام و ستم، زندہ ہوں میں
مصحفِ وقت کا اک بابِ درخشندہ ہوں میں

میرے سینے میں دھڑکتا ہے دلِ عصرِ رواں
اس زمانے کا مفسر ہوں، نمائندہ ہوں میں

میں کہ حق تھا۔ ہوا ہر دَور میں مصلوب۔ مگر
کل بھی پائندہ تھا میں، آج بھی پائندہ ہوں میں

تو تمنائی ہے اک جنتِ موعودہ کا
اپنی گُم کی ہوئی فردوس کا جوئندہ ہوں میں

میرے زخموں سے ہویدا ہے حنا بندیٔ گل
اک نویدِ چمن آرائیِ آئندہ ہوں میں

مدح خوانِ شبِ تاریک مجھے کیا سمجھے
صبحِ گلریز کے نغموں کا نویسندہ ہوں میں

یہ جہاں کیسے فراموش کرے گا مجھکو
اس کے افلاک کا اک خاورِ تابندہ ہوں میں



تھے دامنِ حیات پہ اک داغ ہم، گئے
لیکن یہ کیا ہُوا، تری زلفوں کے خم گئے

اک احتجاج جسے ہیں عبارت حیات و موت
ڈستے ہوئے جو آئے تو باچشمِ نم گئے

طے کر سکا نہ وسعتِ دشتِ وفا کوئی
دعوے جنھیں بہت سے تھے، قدم دو قدم گئے

کچھ دیر کھیلتے رہے موجِ بلا سے ہم
کچھ دُور ساتھ ساتھ وجود و عدم گئے

ٹھہرے ہوئے ہیں برگِ خزاں دیدہ کی طرح
سنکی ہوا ذرا بھی تو سمجھو کہ ہم گئے

یہ ماجرا ہے کیا کہ زمیں ڈولنے لگی
یہ کیا ہوا کہ چلتے ہوئے لوگ تھم گئے

خاور رضوی



(نذرِ شاہ نصیر)

ہے قتل گہہِ شوق میں غنچہ ہمہ تن چشم
منظر ہمہ تن گل، گلِ منظر ہمہ تن چشم

ہے کون جو آشفتہ مزاجی کی رکھے لاج
اُس کوئے ملامت کے ہیں پتھر ہمہ تن چشم

کب آئے گا انصاف کا دن، داورِ محشر!
اک عمر سے میں ہوں سرِ محشر ہمہ تن چشم

یہ صبح تو وہ صبح نہیں جس کی طلب میں
تارے سرِ مژگاں رہے، شب بھر ہمہ تن چشم

اے جانِ غزل! تو ہے کہاں؟ تیرے لیے ہے
خاور ہمہ تن دل، دلِ خاور ہمہ تن چشم



یوں تو ہر چھب، وہ نرالی، وہ فسوں ساز کہ بس
ہائے وہ ایک نگاہِ غلط انداز کہ بس

دیکھنے والو! ذرا رنگ کا پردہ تو ہٹاؤ
سینۂ گل پہ ہے زخموں کا وہ انداز کہ بس

دل کے داغوں کو چھپایا تو اُبھر آئے اور
رازداری ہی نے یوں کھول دیئے راز کہ بس

ہم نے بخشی ہے زمانے کو نظر، اور ہمیں
یوں زمانے نے کیا ہے نظر انداز کہ بس

رنج و غم، عشق و جنوں، درد و خلش، سوز و فراق
ایسے ایسے ملے خاور ہمیں دم ساز کہ بس

خاور رضوی



دل ہی دل میں گھٹ کے رہ جاؤں، یہ میری خو نہیں
آج اے آشوبِ دوراں! میں نہیں یا تو نہیں

سنگ کی صورت پڑا ہوں وقت کی دہلیز پر
ٹھوکروں میں زندگی ہے، آنکھ میں آنسو نہیں

شب غنیمت تھی کہ روشن تھے اُمیدوں کے خطوط
دن کے صحرا میں کوئی تارا، کوئی جگنو نہیں

چار جانب یہ سجے چہرے ہیں یا کاغذ کے پھول
رنگ کے جلوے تو ہیں لیکن کہیں خوشبو نہیں

تیری رحمت کا نہیں ہرچند میں منکر مگر
سر پہ جو چڑھ کر نہ بولے، وہ کوئی جادو نہیں

مصلحت ہے جن کا مسلک، وہ مرے بھائی کہاں
جو نہ اٹھیں میرے دشمن پر، مرے بازو نہیں



گرتے شیش محل دیکھو گے
آج نہیں تو کل دیکھو گے

اس دنیا میں نیا تماشا
ہر ساعت، ہر پل دیکھو گے

کس کس تربت پر روؤ گے
کس کس کا مقتل دیکھو گے

دیر ہے پہلی بوند کی ساری
پھر ہر سُو جل تھل دیکھو گے

ہر ہر زخمِ شجر سے خاور
پھوٹتی اک کونپل دیکھو گے

شمیم حنفی



اب قیس ہے کوئی نہ کوئی آبلہ پا ہے — دل آٹھ پہر اپنی حدیں ڈھونڈ رہا ہے
احساس کی وادی میں کوئی صوت نہ صورت — یہ منزلِ عرفان تلک آنے کا صلہ ہے
زخموں کے بیاباں میں کوئی پھول نہ پتھر — یادوں کے جزیرے میں نہ بُت ہیں نہ خُدا ہے
اِک خاک کے پُتلے کا تماشہ ہے سڑک پر — ہر شخص یہاں قبر کی تصویر بنا ہے
مٹی کے گھروندے میں ستاروں کے دیئے ہیں — آنگن میں اندھیرا نہ اجالا نہ ہوا ہے
اب انجمنِ شوق میں شمعیں نہ پتنگے — اب مرگِ مسلسل کی سزا ہے نہ جزا ہے
چشموں کو شکایت ہے کہ شعلوں میں گھرے ہیں — صحرا کو یہ دُکھ ہے کہ پڑا سوکھ رہا ہے
اب نخلِ رہِ شوق نہ سائے نہ منازل — اب آبروئے عشق نہ سودا نہ وفا ہے
اب پاؤں مسافر ہیں، نفس مرحلۂ زیست — اب وقت کے ہاتھوں پہ نہ خوں ہے نہ حنا ہے
خوں رنگ، شفق رنگ، خزاں رنگ ہیں چہرے — جسموں پہ کفن ہے نہ کوئی سُرخ قبا ہے
سُورج کو ہتھیلی پہ لکیروں کی تمنا — اب چاند کی تھالی میں کرن ہے نہ دیا ہے
اب دشت کے سینے پہ فقط آگ بچھی ہے — اب نقشِ کفِ پا ہے نہ اب بانگِ درا ہے
ہر آنکھ چلاتی ہوئی تشکیک کے نیزے — ہر ذہن تجسس کی ردا اوڑھ چکا ہے
الفاظ کے چہرے سے عیاں شانِ خموشی — ہونٹوں پہ سوالات کا اِک جال بچھا ہے
کیوں شام کو باہوں میں اُلجھنے کی ہوس ہے — کیوں صبح کی پلکوں میں کوئی خواب چھپا ہے
کیوں رات کے ماتھے پہ چمکتے ہیں نگینے — کیوں دن کے رگ و پے میں کوئی حشر بپا ہے
مشرق کے دریچوں سے گھٹن جھانک رہی ہے — مغرب کی فضاؤں میں دھواں پھیل چکا ہے
آشوبِ نظر ہو کر تمناؤں کے نشتر — ہر طشت میں زخموں کا اِک انبار لگا ہے
مندر کے گجر خاک بسر چُپ سے پڑے ہیں — مسجد کے مناروں کا سرا ٹوٹ چکا ہے
دیوار بھی دیوار سے آزاد نہیں ہے — موہوم خلاؤں میں بھی زندانِ ہوا ہے
سقراط تہِ خاک یہی سوچ رہا ہے — اب زہر فقط پیاس بجھانے کی دوا ہے
اب نجد کے صحرا میں نہ کانٹے نہ صدا ہیں — اب قیس ہے کوئی، نہ کوئی آبلہ پا ہے
یوں رات جب آئی ہے تو رُکنا ہی پڑا ہے — "دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"[1]
"مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ اُلفت"[2] — ہر عہد میں تہذیب نے یہ ڈھونگ رچا ہے

۱ ، ۲ : غالب

شمیم حنفی



وہ ایک شور سا زنداں میں رات بھر کیا تھا،
مجھے خود اپنے بدن میں کسی کا ڈر کیا تھا،

کوئی تمیز نہ کی خون کی شرارت نے
اِک ابر و باد کا طوفاں تھا، دشت و در کیا تھا

زمیں پہ کچھ تو ملا، چند الجھنیں ہی سہی
کوئی نہ جان سکا، آسمان پر کیا تھا،

مرے زوال کا ہر رنگ تجھ میں شامل ہے
تو آج تک مری حالت سے بے خبر کیا تھا

اب ایسی فصل میں شاخ و ثمر پہ بار نہ بن
یہ بھول جا کہ پسِ سایۂ شجر کیا تھا

چٹختی گرتی ٹوٹی چھت، اُجاڑ دروازے
اِک ایسے گھر کے سوا حاصلِ سفر کیا تھا

شمیم حنفی



بند کرلے کھڑکیاں، یوں رات کو باہر نہ دیکھ
ڈوبتی آنکھوں سے اپنے شہر کا منظر نہ دیکھ

میں نے پتھر سہہ لیے لیکن صدا قاتل ہوئی
خود کو لفظوں سے بچا، گرتے ہوئے پتھر نہ دیکھ

ایسا ہنگامہ کہ آوازِ نفس بھی کھو گئی
زندگی کی بات کر، یہ عرصۂ محشر نہ دیکھ

کیا پتہ، زنجیر میں ڈھل جائے بستر کی شکن
یہ سفر کا وقت ہے، اب جانبِ بستر نہ دیکھ

خاک وخوں میراث تیری، خاک وخوں تیرا نصیب
اس زیاں خانے میں اپنے پاؤں کا چکر نہ دیکھ

تو نے جو پرچھائیاں چھوڑیں وہ صحرا بن گئیں
اے نگارِ وقت! اب پیچھے کبھی مڑ کر نہ دیکھ

سورج دھیرے دھیرے پگھلا، پھر تاروں میں ڈھلنے لگا
میرے اندر کا سناٹا جاگ کے آنکھیں ملنے لگا

شام نے برف پہن رکھی تھی، روشنیاں بھی ٹھنڈی تھیں
میں اس ٹھنڈک سے گھبرا کر اپنی آگ میں جلنے لگا

سارا موسم بدل چکا تھا، پھول بھی تھے اور آگ بھی تھی
رات نے جب یہ سوانگ رچایا، چاند بھی کروٹ بدلنے لگا

آوازوں کے انگ انگ میں درد کے نشتر چبھنے لگے
پیاسی آنکھوں کے صحرا میں ریت کا جھکڑ چلنے لگا

نیلے، سرخ، سفید، سنہرے، ایک ایک کر کے ڈوب گئے
سمتوں کی ہر پگڈنڈی پر کالا رنگ پگھلنے لگا

شمیم حنفی



یہ رشتۂ جاں میری تباہی کا سبب ہے
اس قید سے چھٹنے کی تمنا بھی عجب ہے

اِس عرصۂ محشر میں خموشی بھی صدا ہے
ٹوٹی ہُوئی قبروں میں بڑا شور و شغب ہے

سُورج کو یہ ضد، اوس کی اک بوند نہ رہ جائے
ہونٹوں کو فقط پیاس بجھانے کی طلب ہے

چہرے پہ تھکن، سانس کی زنجیر پریشاں
آنکھوں میں مگر اب بھی وہی غیظ و غضب ہے

کیوں دل کو یہ حسرت ہے کسی اور کو پالے
اِس شہر میں مجھ سا کوئی پہلے تھا نہ اب ہے



پرچھائیوں کی بات نہ کر رنگِ حال دیکھ
آنکھوں سے اب ہوا و ہوس کا مآل دیکھ

وہ شیر جس کے قہر کی جنگل میں دُھوم تھی
میری نشست گاہ میں اب اس کی کھال دیکھ

خوشبو کی طرح گونج اُٹھا حرفِ آگہی
اے دل، ذرا حصارِ نفس کا زوال دیکھ

تجھ سے قریب آئے تو اپنی خبر نہ تھی
دُوری کا یہ عذاب برنگِ وصال دیکھ

بُجھتی ہُوئی صدا کی طرح خُود میں ڈوب جا
پیشِ نگاہ جب بھی تمنّا کا جال دیکھ

پلکوں میں تیز دھوپ کا منظر سمیٹ لے
پھر کاسۂ بدن میں لہو کا اُبال دیکھ

شمیم حنفی

○

ہجر کا قصّہ بہت لمبا نہیں، بس رات بھر ہے
ایک سنّاٹا مگر، چھایا ہوا احساس پر ہے

اک سمندر بے حسی کا، ایک کشتی آرزو کی
ہائے کم ہمتی، مختصر، لوگوں کی روداد سفر ہے

میں ازل سے چل رہا ہوں، تھک گیا ہوں، سوچتا ہوں
کیا تری دنیا میں، ہر منزل نشانِ رہگزر ہے

اس فصیلِ غم کو سر کرنے پہ بھی کیا مل سکے گا
ایک دیوارِ ہوا ہے، ایک تیرا سنگِ در ہے

ڈوبنے والے ستارے کو بھلا کب تک پکارے
زندگی کی رات کو سورج کے ہنس دینے کا ڈر ہے

دیکھ لے مجھ کو، ابھی کچھ روشنی باقی ہے مجھ میں
شام تک اک ریت کا طوفان آنے کی خبر ہے

○

تیرگی چاند کو انعامِ وفا دیتی ہے
رات بھر ڈوبتے سورج کو صدا دیتی ہے

میں نے چاہا تھا کہ باتوں میں چھپا لوں خود کو
خامشی لفظ کی دیوار گرا دیتی ہے

یوں کسی بھولی ہوئی یاد کی تصویر نہ بن
تیری صورت مرے زخموں کا پتہ دیتی ہے

کوئی سایہ تو ملا دھوپ کے زندانی کو
میری وحشت تری چاہت کو دعا دیتی ہے

اے ہوا، پھول کو چپ چاپ پڑا رہنے دے
دھیان کرتے ہوئے جوگی کو جگا دیتی ہے

کتنی صدیوں کے دریچے میں ہے بس ایک وجود
زندگی سانس کو تلوار بنا دیتی ہے

قفسِ رنگ میں دن رات وہی پیاس کا درد
آگہی بھی مجھے جینے کی سزا دیتی ہے

شمیم حنفی



سفر نصیب اگر ہو تو یہ بدن کیوں ہے
دیارِ غیر تمہارے لئے وطن کیوں ہے

ہوائے شبنم و گل ہے تو بے خودی کیسی
حصارِ ذات میں آشوبِ ما و من کیوں ہے

بس ایک عکسِ نظارہ ہے انکشافِ وجود
کلاہِ شیشہ گراں میں یہ بانکپن کیوں ہے

نشاطِ بے طلبی جادۂ نجات ہوا
خبر نہیں کہ اسی راہ میں چمن کیوں ہے

لباسِ خاک شفق رنگ مثلِ شاخِ چنار
بساطِ سوختہ آموزِ فکر و فن کیوں ہے

گراں ہے طبعِ زمانہ پہ ہر صدائے نفس
خیال و خواب پہ لفظوں کا پیرہن کیوں ہے



شام کے ساحل پہ سورج کا سفینہ آ لگا
ڈوبتی آنکھوں کو یہ منظر بہت اچھا لگا

درد کے پتھر سبھی آبِ رواں میں گھُل گئے
شور تھا کتنا مگر آنکھوں کو سناٹا لگا

چار سُو پھیلی ہُوئی موجِ نفس کی گونج تھی
مجھ کو پیاسی ریت کا صحرا بھی اک دریا لگا

ان گنت سائے تری تصویر میں ڈھلتے گئے
چاندنی جاگی تو ہر چہرہ ترا چہرہ لگا

مخمور سعیدی



جادۂ مرگِ مسلسل سے گزرتا جاؤں
زندگی یہ ہے کہ ہر سانس میں مرتا جاؤں
خون ہر لمحۂ موجود کا کرتا جاؤں
رنگ تصویرِ شب و روز میں بھرتا جاؤں
منتشر سلسلۂ غم کو تو کرتا جاؤں
ساتھ ہی ساتھ مگر خود بھی بکھرتا جاؤں
بس یونہی ہمسریِ اہلِ جہاں ممکن ہے
دم بہ دم اپنی بلندی سے اُترتا جاؤں
میں کسی منزلِ ہستی پہ کہاں رُکتا تھا
راہ میں تم جو نہ مل جاؤ، گزرتا جاؤں
عمر بھر جادۂ پُرخار پہ چلنا ہوگا
دو گھڑی سایۂ گل میں بھی ٹھہرتا جاؤں
اپنی قسمت ہوں، الجھتا ہی چلا جاتا ہوں
تیری تقدیر نہیں ہوں کہ سنورتا جاؤں
مد و جزرِ یمِ احساس کا پروردہ ہوں
ڈوبتا جاؤں مگر خود ہی اُبھرتا جاؤں
آ ہی نکلا ہوں جو یادوں کے کھنڈر تک مخمورؔ
بھولے بسروں سے ملاقات بھی کرتا جاؤں

مخمور سعیدی



آ گیا ہو نہ کوئی بھیس بدل کر، دیکھو
دو قدم سائے کے ہمراہ بھی چل کر دیکھو

میہماں روشنیو! سخت اندھیرا ہے یہاں
پاؤں رکھنا مری چوکھٹ پہ سنبھل کر، دیکھو

کبھی ایسا نہ ہو پہچان نہ پاؤ خود کو
بار بار اپنے ارادے نہ بدل کر، دیکھو

ابر آئے گا تبھی پیاس بجھانے، پہلے
ریگِ صحرا کی طرح دھوپ میں جل کر، دیکھو

دن کی دیکھی ہوئی ہر شکل بدل جائے گی
رات کے ساتھ ذرا گھر سے نکل کر دیکھو

موم ہو جائے گا پتھر سا یہ دل سینے میں
لمحہ بھر کو کسی پہلو میں پگھل کر دیکھو

عمرِ رفتہ کو کہاں ڈھونڈھ رہے ہو مخمور
اُس کے کوچے میں ملے گی، وہیں چل کر دیکھو

مخمور سعیدی



یاد پھر بھولی ہوئی ایک کہانی آئی
دل ہوا خون طبیعت میں روانی آئی

صبحِ نو نغمہ بہ لب ہے مگر اے ڈوبتی رات
میرے حصے میں تری مرثیہ خوانی آئی

زرد رُو تھا کسی صدمے سے ابھرتا سورج
یہ خبر ڈوبتے تاروں کی زبانی آئی

ہر نئی رت میں ہم افسردہ و دلگیر رہے
یاد گزرے ہوئے موسم کی جوانی آئی

پا گئے زندگی تو کئی مٹتے ہوئے رنگ
ذہن میں جب کوئی تصویر پرانی آئی

خشک پتوں کو چھوئے یہ سمجھ کر چن لو
ہاتھ شادابیِ رفتہ کی نشانی آئی

یاد کا چاند جو ابھرا تو یہ آنکھیں ہوئیں نم
غم کی ٹھہری ہوئی ندی میں روانی آئی

بے وفائی کا گلہ کس سے کریں ہم مخمور
خود ہمیں رسمِ محبت نہ نبھانی آئی



جب کوئی شامِ حسیں نذرِ خرابات ہوئی
اکثر ایسے میں ترے غم سے ملاقات ہوئی

آپ اپنے کو نہ پہچان سکے ہم تا دیر
ان سے بچھڑے تو عجب صورتِ حالات ہوئی

حسن سے نبھ نہ سکی وضعِ کرم آخر تک
اوّل اوّل تو محبت کی مدارات ہوئی

روز ہی جی نے تمہیں یاد کیا ہے، لیکن
آج تم یاد نہ آتے، یہ نئی بات ہوئی

اس نے آواز میں آواز ملا دی تھی کبھی
آج تک ختم نہ موسیقیِ جذبات ہوئی

دل پہ اک غم کی گھٹا چھائی ہوئی تھی کب سے!
آج اُن سے جو ملے، ٹوٹ کے برسات ہوئی

کس کی پرچھائیں پڑی، کون اِدھر سے گزرا؟
اتنی رنگیں جو گزرگاہِ خیالات ہوئی

اُن سے اُمیدِ ملاقات کے بعد اے مخمور
مدّتوں تک نہ خود اپنے سے ملاقات ہوئی

مخمور سعیدی



نہ کم ہوا ہے، نہ ہو، سوزِ اضطرابِ دروں
ترے قریب رہوں میں کہ تجھ سے دور رہوں

کہیں کوئی ترا محرم ہے اے دلِ محزوں
مجھے بتا کہ کدھر جاؤں، کس سے بات کروں!

تری نظر نے بہت کچھ سکھا دیا دل کو
کچھ اتنا سہل نہ تھا ورنہ کاروبارِ جنوں

پکارتی ہیں مجھے وسعتیں دو عالم کی
میں اپنے آپ سے دامن چھڑا سکوں تو چلوں

تری وفا نہ مجھے راس آسکی، لیکن
میں سوچتا ہوں، تجھے کیسے بے وفا کہہ دوں

مری شکستہ دلی کا نہ کر خیال اتنا
کہیں نہ میں ترے خوابوں میں تلخیاں بھر دوں

گرفتِ عصرِ رواں! اس قدر تو مہلت دے
کہ مٹ رہی ہے جو دنیا، اسے میں دیکھ تو لوں

یہ کس خیال نے کی ہے مری زباں بندی
تجھی سے کہنے کی باتیں، تجھی سے کہہ نہ سکوں

وہ اضطرابِ طلب تھا کسی توقع پر
اب اُٹھ چکی ہے توقع، اب آچلا ہے سکوں



دل کے ورقِ سادہ پہ کچھ رنگ اُبھاریں
خوں گشتہ تمناؤں کی تصویر اُتاریں

شاید کوئی روزن، کوئی کھڑکی نکل آئے
سر اپنا چلو وقت کی دیوار سے ماریں

کب تک دلِ دیوانہ یہ بے وجہ تعاقب؟
اب ہاتھ کہاں آئیں گی رم کردہ بہاریں

برہم ہوئی وہ محفلِ یارانِ خوش اوقات
تنہائی کے لمحات کہاں جاکے گزاریں!

آنگن کی اداسی کو فزوں کر گئیں مخمورؔ
دیوار پہ بیٹھی ہوئی چڑیوں کی قطاریں

مخمور سعیدی



لفظوں کے سیہ پیراہن میں لپٹی ہوئی کچھ تنویریں ہیں
اے دیدۂ درد! پہچانو تو، کس ہاتھ کی یہ تحریریں ہیں!
جاتی ہوئی رُت کب رُکتی ہے، اے دل یہ عبث تدبیریں ہیں
جو قید ہواؤں کو کر لیں، کیا ایسی بھی کچھ زنجیریں ہیں!
نغمہ وہ کس نے چھیڑا ہے، بچھڑے ہوئے غم سب آن ملے
آواز کی لہروں پر لرزاں سو مُہر بہ لب تصویریں ہیں
آوارہ ہوا کے جھونکوں پہ اکثر یہ گماں گزرا جیسے
یہ ہم سے پریشاں حالوں کی بے سمت و جہت تقدیریں ہیں
اس شہر میں لے کر آتے ہیں ہم شبنم و گل کی سوغاتیں
آنکھوں میں جہاں انگارے ہیں ہاتھوں میں جہاں شمشیریں ہیں
کچھ خواب اجالوں کے ہم نے دیکھے تھے مگر تا حدِ نظر
جو ظلمت بن کر پھیل گئیں، کن خوابوں کی تعبیریں ہیں
کیوں آج کی جانی پہچانی شکلوں سے نظر مانوس نہیں
آنکھوں میں جو پھرتی رہتی ہیں کس دور کی یہ تصویریں ہیں
ہم اپنی ذات کے زنداں سے باہر جو نکل آئے بھی تو کیا
قدموں سے جو لپٹی پڑتی ہیں، دراصل یہی زنجیریں ہیں



وہ دورِ نشاطِ دیدہ و دل جیسے بس ابھی گزرا ہی تو ہے
سینے کی کسک کس طرح مٹے، ہر داغِ کہن تازہ ہی تو ہے
تو ساتھ کہاں لیکن اب تک ہر رہگذرِ تنہائی پر
جو آگے آگے چلتا ہے اے دوست کوئی تجھ سا ہی تو ہے
اس طائرِ آوارہ کے لیے یوں جال نہ بُن امیدوں کے
اُڑتا ہوا لمحہ جیسے ابھی رو کے سے ترے رُکتا ہی تو ہے
معلوم نہیں کس وقت یہ کیا برتاؤ کسی سے کرتی ہے
دنیا سے کوئی اُمید نہ رکھ، مایوس نہ ہو، دنیا ہی تو ہے
کرنیں نئے دن کے سورج کی پھیلیں گی تو گم ہو جائے گا
تاریک ہے جس سے دل کا افق، گزری شب کا سایا ہی تو ہے
لمحوں کے ہجومِ گریزاں میں اک لمحہ جسے اپنا کہیے
جاں دے کے بھی ہاتھ آ جائے اگر مہنگا کب ہے سستا ہی تو ہے
مخمور تعاقب کر دیکھو کچھ دور نہیں، ہاتھ آ جائے
اک گم شدہ خوشبو کا جھونکا آنگن سے ابھی گزرا ہی تو ہے

مخمور سعیدی



خوار و رُسوا نہ سرِ کوچہ و بازار ملے
ہے یہی عشق کا اعزاز سرِ دار ملے

زندگی سے یہ رہا اپنی ملاقات کا حال
کسی بیزار سے جیسے کوئی بیزار ملے

ہم سے پہلے بھی یہ افسانہ بیاں ہوتا تھا
کتنے غم پھر بھی ہمیں تشنۂ اظہار ملے

زندگی نے کوئی آئینہ دکھایا جب بھی
اپنے چہرے پہ ہمیں موت کے آثار ملے

فکرِ تعبیر میں نیند اُڑ گئی دیوانوں کی
خواب اپنے ہی ان آنکھوں میں جو بیدار ملے

مسکراتے ہوئے چہروں پہ نہ جاؤ مخمورؔ
شاید ان میں بھی کوئی تم سا دلِ افگار ملے



دیدہ و دل کی فضا پر غم کے بادل چھا گئے
اُس کے جلتے ہی نگاہوں کے افق سنولا گئے

دل تو پتھر بن گیا تھا، موم کس نے کر دیا
مدتوں بعد آج کیوں آنکھوں میں آنسو آگئے

تھی سکوتِ دل سے پہلے بزمِ ہستی پُرخروش
پھر وہ سناٹا ہوا طاری کہ ہم گھبرا گئے

بے حسی کا سرد موسم زندگی پر چھا گیا
دل میں روشن تھے جو انگارے وہ سب کجلا گئے

رو برو اک اجنبی چہرہ سوالی کی طرح
آئینہ دیکھا تو اسے مخمورؔ ہم گھبرا گئے

حسن نعیم



میں کس ورق کو چھپاؤں، دکھاؤں کون سا باب
کسی حبیب نے مانگی ہے زندگی کی کتاب

ہمیں نہ بھولنا، اے امامِ صد زماں! کہ یہاں
ہمیں ہیں مسکنِ حرماں، ہمیں ہیں بیتِ عذاب

انہی سے شب میں اجالا، انہی سے نورِ خیال
مرے لیے تو بہت کچھ ہیں دیدۂ بے خواب

گیا تھا دشت سے اُٹھ کر سمندروں کی طرف
وہاں بھی تشنہ نصیبی، وہاں بھی مرگِ سراب

بکڑ کے دامنِ دل یا جھٹک کے سر اپنا
دیا ہے خوابِ شکستہ کا ہر کسی کو حساب

مرے کلام کی تفسیر کے لیے پڑھیے
جمالِ فکر کی آیت، نوائے جاں کی کتاب

وہ آنکھیں پیار کے لہجے میں کہہ رہی تھیں حسنؔ
ہمیں سے مانگ پیالہ، ہمیں سے مانگ شراب

ہوا بہار کے موسم میں یوں چلی کہ نعیمؔ
نہ سرخرو تھا گلستاں، نہ سرخرو تھے گلاب

(نیویارک)

حسن نعیم



چہرے پہ مہرِ غم ہے خط و خال کی طرح
ماضی بھی دم کے ساتھ ہے اب حال کی طرح

پتے تھے خاک بوس تو شاخیں تھیں سرنگوں
کنجِ چمن بھی تھا دلِ پامال کی طرح

اپنے حروفِ شوق جو شعلہ بجاں تھے کل
ٹھنڈے پڑے ہیں آج وہ اقوال کی طرح

تہذیب ہے کہ آئے تو ہنس بول کر گئے
چپکے سے جائیے نہ مہ و سال کی طرح

سب کے ستارے دیکھ کے دل نے صلاح دی
گردش میں کیوں پڑو کسی رمال کی طرح

آنچل میں نیند باندھ کے اے رات! آ بھی جا
یہ دن لگا ہے جان کو جنجال کی طرح

رکھیے چھپا کے اپنا دفینہ حسنؔ نعیم
غم کو لٹائیے نہ زر و مال کی طرح

(نیو یارک)

حسن نعیم

وہ کج نگاہ نہ وہ کج شعار ہے تنہا
بس اک پیمبرِ جنّت نثار ہے تنہا

نہ بلبلوں کی اذاں ہے، نہ تتلیوں کا طواف
ابھی چمن میں گلِ نوبہار ہے تنہا

اٹھائے منّتِ صرصر کہ نازِ بادِ نسیم
ہر ایک حال میں صحرا شکار ہے تنہا

فلک نجوم سے روشن، زمین چراغوں سے
ہجومِ نور میں اک شامِ تار ہے تنہا

جمی ہے بزمِ مسرّت غزال چشموں سے
جسے ملی ہے نظر، اشکبار ہے تنہا

ہمیں نے خیمۂ ہجراں میں کاٹ دیں راتیں
ہمیں کو فکر بھی بے حد کہ یار ہے تنہا

چہل پہل ہے بہت یوں تو میکدے میں نعیمؔ
میانِ جام و سبو بادہ خوار ہے تنہا

(نیویارک)

سارے جہاں کی سیر کا امکان مل گیا
بوئے چمن کو راہ میں طوفان مل گیا

سوزِ وفا کو حسن کا پیغام کیا ملا
اک غم زدہ کو میرؔ کا دیوان مل گیا

مشکل پسندیوں سے طبیعت جو خوش ہوئی
دشواریوں کو حیلۂ آسان مل گیا

مغرب ہے وہ دیار کہ بوس و کنار کیا
مٹی میں یاں وصال کا ارمان مل گیا

یادیں تھیں محوِ خواب، تو نغمے تھے گم نعیمؔ
کشتی ملے تو شعر کا سامان مل گیا

(نیویارک)

حسن نعیم



خواب ٹھہرا سیرِ منزل، نہ تہِ بام کبھی
اس مسافر نے اٹھایا نہیں آرام کبھی

شب بخیر اُس نے کہا تھا کہ ستارے لرزے
ہم نہ بھولیں گے جدائی کا وہ ہنگام کبھی

سرکشی اپنی ہوئی کم، نہ اُمیدیں ٹوٹیں
مجھ سے کچھ خوش نہ گیا موسمِ آلام کبھی

ہم سے آواروں کی صحبت میں ہے وہ لُطف کہ بس
دو گھڑی مل تو سہی، گردشِ اَیّام کبھی

اے صبا! میں بھی تھا آشفتہ سروں میں یکتا
پوچھنا دلّی کی گلیوں سے مرا نام کبھی

(نیویارک)



کوہ کے سینے سے آبِ آتشیں لاتا کوئی
اس نوائے آگہی کو ڈوب کر گاتا کوئی

دیکھتا مستی کا سنگم لب ہے یا گفتار ہے
جام سے میرے جو اپنا جام ٹکراتا کوئی

بادلوں کی طرح آیا، برق آسا چل دیا
چاند کی مانند شب بھر تو ٹھہر جاتا کوئی

حسن کا دل سے تعلق دائمی ہے، گرم ہے
ورنہ کس کا کس سے ہے رشتہ کوئی، ناتا کوئی

مانگنے کو مانگ لیں اشعارِ غم سے دل کشی
مل نہیں سکتا ہے ان کو فکر سا داتا کوئی

نازشِ فردا مرا حسنِ تغزّل ہے حسنؔ
رنج ہوتا، آج گر کچھ قدر فرماتا کوئی

(نیویارک)

غزل — ۱۴۹۳

حسن نعیم



کوئے رسوائی سے اُٹھ کر دار تک تنہا گیا
مجھ سے جیتے جی نہ دامن خواب کا چھوڑا گیا

کیا بساطِ خار و خس تھی، پھر بھی یوں شب بھر جلے
دوش پر بادِ سحر کے، دُور تک شعلہ گیا

کس کو بے گردِ مسافت شوق کی منزل ملی
نغمہ گر کی خلوتوں تک بارہا نغمہ گیا

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب
میں چلا برسوں تو اِن تک جسم کا سایہ گیا

کون مجھ کو ڈھونڈتا تھا کچھ پتہ چلتا نہیں
بزمِ خوباں میں ہزاروں بار میں آیا گیا

(نیویارک)



بیانِ شوق بنا، حرفِ اضطراب بنا
وہ اک سوال کہ جس کا نہ کچھ جواب بنا

میں ایک باب تھا افسانۂ وفا کا مگر
تمہاری بزم سے اٹھا تو اِک کتاب بنا

میں جس خیال کو اپنا جنوں سمجھتا تھا
وہی خیال زمانے کا حسنِ خواب بنا

مجھے سفیر بنا اپنا، کو بہ کو اے عشق!
کسے ہوس ہے کہ دنیا میں کامیاب بنا

کبھی تو وجہِ کرم بن گئی ہے خود داری
کبھی نیازِ طلب باعثِ عتاب بنا

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں یہ رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریکِ خواب بنا

جو میرے کشتِ جنوں میں تھا، فرقِ لُٹے بہار
وہی خرد کے خرابے میں اک گلاب بنا

(نیویارک)

حسن نعیم



خیر سے دل کو تری یاد سے کچھ کام تو ہے
وصل کی شب نہ سہی، ہجر کا ہنگام تو ہے

نورِ افلاک سے روشن ہو شبِ غم کہ نہ ہو
چاند تاروں سے مرا نامہ و پیغام تو ہے

بامِ خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح
خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

کم نہیں اے دلِ بیتاب! متاعِ اُمید
دستِ میخوار میں خالی ہی سہی، جام تو ہے

جو بھی الزام مرے عشق پہ آیا ہو نعیمؔ
ان سے وابستہ کسی طور مرا نام تو ہے

(جدہ)



صبحِ طرب تو مست و غزل خواں گذر گئی
شامِ الم جو آئی تو آ کر ٹھہر گئی

دیکھا کسی نے اوجِ تصور نہ اوجِ فن
پنہاں تھا داغِ عیب تو سب کی نظر گئی

یادِ خدا سے بابِ حرم تک کھلا نہیں
یادِ بتاں سے دل پہ قیامت گذر گئی

تڑپا قفس میں کون، جو اے صبحِ نو بہار!
روئے گل و گیاہ، صبا چشم تر گئی

اتنا دلِ نعیمؔ کو ویران نہ کر، حجاز!
روئے گی موجِ گنگ جو اس تک خبر گئی

(دکتہ)

فضیل جعفری



موجِ خوں سر سے گذر جاتی ہے ہر رات مرے
پھوٹ کر خوابوں میں روتا ہے کوئی ساتھ مرے

اب نہ وہ گیت، نہ چوپال، نہ پنگھٹ نہ الاؤ
کھو گئے شہروں کے ہنگاموں میں دیہات مرے

وہ کسی اور کا ہو کر بھی مرا ہی رہتا
خود مرے پاؤں کی زنجیر ہیں حالات مرے

زندگی بھول گئی اپنے غموں میں، اُس کو
دولتِ دردِ وفا بھی نہ لگی ہات مرے

مدّتوں پہلے کہ جب تجھ سے تعارف بھی نہ تھا
تیری تصویر بناتے تھے خیالات مرے

اب سرِ غنچۂ دل یاد کی شبنم بھی نہیں
پھونک دیں مجھ کو نہ یہ آتشیں لمحات مرے

ننھّے بجروں کی طرح تیرتے پھرتے ہیں فضیلؔ
سطحِ دریائے غمِ عشق پہ جذبات مرے

فضیل جعفری



دلوں کے آئینے دھندلے پڑے ہیں
بہت کم لوگ خود کو جانتے ہیں
خزاں کے خشک پتوں کو نہ چھیڑو
تھکے ماندے مسافر سو رہے ہیں
ہماری غمگساری میں، شبِ غم
چراغ آہستہ آہستہ جلے ہیں
نشاں پاتا نہیں کوئی کسی کا
سبھی اک دوسرے کو ڈھونڈتے ہیں
بس اک موجِ ہوائے غم ہے کافی
ارادے کیا؟ گھروندے ریت کے ہیں
خدا دل کا نگر آباد رکھے
ہزاروں طرح کے غم پل رہے ہیں
شبِ مہتاب — یادیں گلرخوں کی
سفینے موجِ خوں میں تیرتے ہیں

فضیل جعفری



صاحب دلوں سے راہ میں آنکھیں ملا کے دیکھ
رکھتا ہے تُو بھی دل تو اُسے آزما کے دیکھ

پہچاننے کی پیار کو، کوشش کبھی تو کر
خود کو کبھی تو اپنے بدن سے ہٹا کے دیکھ

یا لذّتوں کو زہر سمجھ اور دُور رہ
یا شعلۂ گناہ میں دامن جلا کے دیکھ

ہر چند ریگ زار سہی زندگی، مگر
پل بھر کو اپنے جسم کا جادو جگا کے دیکھ

سائے کی طرح ساتھ چلے گی کوئی صدا
سنسان جنگلوں میں اکیلے بھی جا کے دیکھ



بھُولے بسرے ہوئے غم پھر اُبھر آتے ہیں کئی
آئینہ دیکھیں تو چہرے نظر آتے ہیں کئی

وہ بھی اک شام تھی جب ساتھ چھُٹا تھا اُس کا
واہمے دل میں، سرِ شام در آتے ہیں کئی

پاؤں کی دُھول بھی بن جاتی ہے دشمن اپنی
گھر سے نکلو تو پھر ایسے سفر آتے ہیں کئی

قریۂ جاں سے گذرنا بھی کچھ آسان نہیں
راہ میں جعفریؔ شیشے کے گھر آتے ہیں کئی

فضیل جعفری



نومید کرے دل کو نہ منزل کا پتا دے
اے رہگزرِ عشق! ترے کیا ہیں ارادے؟
ہر رات گزرتا ہے کوئی دل کی گلی سے
اوڑھے ہوئے یادوں کے پُراسرار لبادے

ق

بن جاتا ہوں سرتا بہ قدم دستِ تمنّا
ڈھل جاتے ہیں اشکوں میں مگر شوخ ارادے
اُس چشمِ فسوں گر میں نظر آئی ہے اکثر
اِک آتشِ خاموش کہ جو دل کو جلا دے
آزردۂ اُلفت کو، غمِ زندگی ۔ جیسے
تپتے ہوئے جنگل میں کوئی آگ لگا دے
یادوں کے مہ و مہر، تمنّاؤں کے بادل
کیا کچھ نہ دہ سوغات سرِ "دشتِ وفا" دے
یاد آتی ہے اُس حُسن کی یوں جعفریؔ جیسے
تنہائی کے غاروں سے کوئی خود کو صدا دے



خون پلکوں پہ سرِ شام جمے گا کیسے
درد کا شہر جو اُجڑا تو بسے گا کیسے

روز و شب یادوں کے آسیب ستائیں گے کوئی
شہر میں تجھ سے خفا ہو کے رہے گا کیسے

دل جلا لیتے تھے ہم لوگ اندھیروں میں مگر
دل بھی ان تیز ہواؤں میں جلے گا کیسے

کس مصیبت سے یہاں تک ترے ساتھ آئے تھے
راستہ تجھ سے الگ ہو کے کٹے گا کیسے

آخر اُس کو بھی ہے کچھ جعفریؔ دنیا کا خیال
دیر تک رات گئے ساتھ رہے گا کیسے

تفضیل جعفری



چہرے، مکان، راہ کے پتھر بدل گئے
جھپکی جو آنکھ، شہر کے منظر بدل گئے

شہروں میں ہنستی کھیلتی چلتی رہی مگر
جنگل میں بادِ صبح کے تیور بدل گئے

ہاں اس میں کامدیو کی کوئی خطا نہیں
رستے وفا کے سخت تھے، دِلبر بدل گئے

وہ آندھیاں چلی ہیں سرِ دشتِ آرزو
دِل بجھ گیا، وفاؤں کے محور بدل گئے

پھوٹی کرن تو جاگ اُٹھی زندگی تفضیل
سنسان راستوں کے مقدر بدل گئے



آخر چراغ دردِ محبت بجھا دیا
سر سے کسی کی یاد کا پتھر گرا دیا

ڈھونڈے جنم جنم بھی تو دُنیا نہ پا سکے
یوں ہم نے اس کو اپنی غزل میں چھپا دیا

خوشبو سے اس کے جسم کی، آنگن مہک اُٹھا
کمرے کو اُس نے اپنی ہنسی سے سجا دیا

یہ کِس کے انتظار میں جھپکی نہیں پلک
یہ کِس نے مجھ کو راہ کا پتھر بنا دیا

کیا کم ہے جعفری کہ مشینوں کے شور نے
لوگوں کو اپنے آپ سے ملنا سکھا دیا



ہے عبارت جو غمِ دل سے، وہ وحشت بھی نہ تھی
سچ ہے شائد کہ ہمیں اُس سے محبت بھی نہ تھی

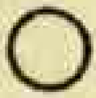
زندگی اور پُر اسرار ہوئی جاتی ہے
عشق کا ساتھ نہ ہوتا تو شکایت بھی نہ تھی

تجھ سے چھُٹ کر نہ کبھی پیار کسی سے کرتے
دل کو بہلانے کی لیکن کوئی صورت بھی نہ تھی

گھور اندھیروں میں خود اپنے کو صدا دے لیتے
راہ چلتے ہوئے لوگوں میں یہ جراُت بھی نہ تھی

ضد میں دُنیا کی بہرحال ملا کرتے تھے
ورنہ ہم دونوں میں ایسی کوئی اُلفت بھی نہ تھی

مر مٹے لوگ سرِ رہگذرِ عشق فضیل
اپنے حصّے میں یہ چھوٹی سی سعادت بھی نہ تھی



کیسا مکان ؟ سایۂ دیوار بھی نہیں
جیتے ہیں، زندگی سے مگر پیار بھی نہیں

اُٹھتی نہیں ہے ہم پہ کوئی مہرباں نگاہ
کہنے کو شہر، محفلِ اغیار بھی نہیں

رُک رُک کے چل رہے ہیں کہ منزل نہیں کوئی
ہر کوچہ ورنہ کوچۂ دلدار بھی نہیں

گذری ہے یوں تو دشت میں تنہا یوں بھی عمر
دل بے نیازِ کوچہ و بازار بھی نہیں

آگے بڑھائیے تو قدم آپ جعفری
دنیا، اب ایسی وادیٔ پُر خار بھی نہیں

محمود شام

ٹوٹے ہیں کیسے، خواہشوں کے آئینوں کو دیکھ
پلکوں کی تہ میں بکھری ہوئی کرچیوں کو دیکھ

میں ہوں ترا ہی عکس، مرے رنگ پر نہ جا
آنکھوں میں جھانک، اپنی ہی تنہائیوں کو دیکھ

یہ آسماں کے بدلے ہوئے رنگ، غور کر
ان موسموں کے بپھرے ہوئے تیوروں کو دیکھ

سُن تو درِ خیال پہ فردا کی دستکیں
خود کا حصار توڑ کے جاتی رُتوں کو دیکھ

گلیوں میں گھومتی ہیں ہزاروں کہانیاں
چہروں پہ نقش، وقت کی پہنائیوں کو دیکھ

اِک اِک پلک پہ چھائی ہے محرومیوں کی شام
ضبطِ سخن کی آگ میں جلتے لبوں کو دیکھ

کہتی ہے شامؔ کچھ تو مکانوں کی خامشی
بے مدّعا نہیں ہیں، کھلے روزنوں کو دیکھ

فنون — ۱۵۰۲

محمود شام

اونے پونے غزلیں بیچیں، نظموں کا بیوپار کیا
دیکھو ہم نے پیٹ کی خاطر کیا کیا کاروبار کیا

اس بستی کے لوگ تو سب تھے چلتی پھرتی دیواریں
ہم نے رنگ لٹاتی شب سے، اجلے دنوں سے پیار کیا

ذہن سے اک اک کر کے تیری ساری باتیں اتر گئیں
کبھی کبھی تو وقت نے ہم کو ایسا بھی ناچار کیا

اپنا آپ بھی کھویا ہم نے لوگوں سے بھی چھوٹا ساتھ
اک سائے کی دھن نے ہم کو کیسے کیسے خوار کیا

سارے عہد کا بوجھ تھا سر پر دل میں سارے جہاں کا غم
وقت کا جلتا بلتا صحرا ہم نے جس دم پار کیا

جاگتی گلیوں، اونچے گھروں میں زرد اندھیرا ناچتا ہے
جس لمحے سے ہم ڈرتے تھے اس نے آخر وار کیا

شام کی ٹھنڈی آہوں میں بھی تیری خوشبو شامل تھی
رات گئے تک پیڑوں نے بھی تیرا ذکر اذکار کیا

محمود شام



ڈگر پہ آج کوئی اس سا آشنا بھی نہ تھا
وہ اس سے پہلے اگرچہ کہیں ملا بھی نہ تھا

اسی نے آج بتایا مجھے کہ کون ہوں میں
وہ جس کو آج سے پہلے میں جانتا بھی نہ تھا

کہاں ہوں کیوں ہوں، ہر اک سانس پوچھتی ہے مجھے
کبھی میں اپنے سوالوں میں یوں گھرا بھی نہ تھا

کسی کی میز پہ ہی رہ گئی نہ جانے کیوں
وہ ڈائری کہ ابھی جس پہ کچھ لکھا بھی نہ تھا

تمام شہر صداؤں کے اک بھنور میں ہے
مرا مکان کبھی ایسے ڈولتا بھی نہ تھا

مجھے نہ جانے وہ سینے سے کیوں لگائے پھرا
میں کوئی نگ بھی نہ تھا، موجۂ ہوا بھی نہ تھا

وہ جس کی دھن میں ہم اتوار کو بھی گھر نہ رہے
ملا تو اپنی طرف شام دیکھتا بھی نہ تھا



کتنے در وا ہیں، کہیں آنکھ ملائیں تو سہی
اس نئے شہر سے کچھ ربط بڑھائیں تو سہی

کسی خوشبو کے تعاقب میں چلیں گام دو گام
دھیان میں چاندنی کا شہر بسائیں تو سہی

کچھ تو کہتی ہے سرِ شام سمندر کی ہوا
کبھی ساحل کی خنک ریت پہ جائیں تو سہی

کیا خبر اوٹ میں ہوں اس کی، مناظر کیا کیا
اپنے پندار کی دیوار گرائیں تو سہی

دل کے اوراق پہ اب تازہ حکایات لکھیں
نئے لمحوں میں نیا خون رچائیں تو سہی

اپنے بکھرے ہوئے ذروں کو سمیٹیں پھر سے
بزم پھر رقصِ تمنا کی سجائیں تو سہی

شام، یہ روشنی، یہ رنگ کے پھیلے ہوئے جال
اک ذرا ان کے طلسمات میں آئیں تو سہی

محمود شام



عمر گزری کہ تری دھن میں چلا تھا دریا
جا بجا گھومتا ہے آج بھی پگلا دریا

بنتی جاتی ہیں گہر کتنی ہی بھولی یادیں
یہ مرا دل ہے کہ ٹھہرا ہوا گہرا دریا

نہ کسی موج کا نغمہ ہے نہ گرداب کا رقص
جانے کیا بات ہے، خاموش ہے سارا دریا

تھل کے سینے پہ پگھل جاتی ہے جب چاند کی برف
دور تک ریت پہ بہتا ہے سنہرا دریا

ہائے وہ رنگ بھرے، پیار کے مسکن بیتے
ہائے وہ ناؤ سے رہ رہ کے لپٹتا دریا

شام آکاش پہ جب پھیلتا ہے دن کا لہو
ڈوب جاتا ہے کسی سوچ میں بہتا دریا



دل میں جب تیری لگن رقص کیا کرتی تھی
میری ہر سانس میں خوشبو سی بسا کرتی تھی

اب تو محفل سے بھی ہوتا نہیں کچھ غم کا علاج
پہلے تنہائی بھی دکھ بانٹ لیا کرتی تھی

اب جو رقصاں ہے کئی رنگ بھرے چہروں میں
یہی مٹی کبھی بے کار اڑا کرتی تھی

رنگ کے جال ہی ملتے ہیں، جدھر جاتا ہوں
روشنی یوں نہ مجھے تنگ کیا کرتی تھی

اب مجھے چاندنی کچھ بھی تو نہیں کہتی ہے
کبھی یہ تیرے سندیسے بھی دیا کرتی تھی

کس قدر پیار سے یہ پیڑ بلاتے تھے مجھے
کس طرح چھاؤں ترا ذکر کیا کرتی تھی

محمود شام



وقت کے کتنے ہی رنگوں سے گزرنا ہے ابھی
زندگی ہے تو کسی طرح سے مرنا ہے ابھی

کٹ گیا دن کا دہکتا ہُوا صحرا ابھی تو کیا
رات کے گہرے سمندر میں اترنا ہے ابھی

ذہن کے ریزے تو پھیلے ہیں فضا میں ہر سو
جسم کو ٹوٹ کے ہر گام بکھرنا ہے ابھی

کون ہے جس کے لیے اب بھی دھڑکتا ہے دل
کس کو اس اجڑے جزیرے میں ٹھہرنا ہے ابھی

ایک اک رنگ اڑا لے گئی بے مہر ہوا
کتنے خاکے ہیں جنہیں شامؔ جی! بھرنا ہے ابھی



بس ایک اپنے ہی قدموں کی چاپ سنتا ہوں
میں کون ہوں کہ بھرے شہر میں بھی تنہا ہوں

جہاں میں جسم تھا، تو نے وہاں تو ساتھ دیا
وہاں بھی آ کہ جہاں میں تمام سایا ہوں

تری جدائی کا غم ہے، نہ تیرے ملنے کا
میں اپنی آگ میں دن رات جلتا رہتا ہوں

مرے بغیر ہے ممکن کہاں تری تکمیل
مجھے پکار! کہ میں ہی ترا کنارا ہوں

کبھی تو ڈوب سہی شامؔ کے سمندر میں
کہ میں سدا ہی جواہر نکال لایا ہوں

محمود شام



اس کو تکتے بھی نہیں تھے پہلے
ہم بھی خوددار تھے کتنے، پہلے

اس کو دیکھا تو یہ محسوس ہوا
ہم بہت دور تھے خود سے، پہلے

دل نظر آتے ہیں اب آنکھوں میں
کتنے گہرے تھے یہ چشمے، پہلے

کھوئے رہتے ہیں اب اس کی دھن میں
جس کو تکتے نہ تھے پہلے پہلے

ہم کو پہچان لیا کرتے تھے
یہ ترے شہر کے رستے پہلے

اب اجالوں میں بھٹک جاتے ہیں
رہ سمجھاتے تھے اندھیرے پہلے

اب نہ الفاظ نہ احساس نہ یاد
اتنے مفلس نہ ہوئے تھے پہلے

رنگ کے جال میں آتے نہ کبھی
پاس سے دیکھ جو لیتے پہلے

گرم ہنگامہ کاغذ ہے یہاں
بے مہک پھول کہاں تھے پہلے



پھر اک ساتھی مجھے اکیلا چھوڑ گیا
آپ سدھارا، اپنا سایا چھوڑ گیا

اس کو کتنے پیڑ صدائیں دیتے تھے
وہ تو سب کو یونہی بلاتا چھوڑ گیا

اب تک میدانوں کے جسم چمکتے ہیں
جانے کیسی مٹی دریا چھوڑ گیا

لپٹ لپٹ کر اک دوجے سے روتے ہیں
جن پتوں کو ہوا کا جھونکا چھوڑ گیا

چاندنی شب اتو جس کو ڈھونڈنے آئی ہے
یہ کمرہ وہ شخص تو کب کا چھوڑ گیا

چال تھی کتنی تیز، بدلتے موسم کی
کتنے ہی لمحوں کو سسکتا چھوڑ گیا

ساری منڈیریں ویراں ویراں رہتی ہے
جب سے شام نگر تو اپنا چھوڑ گیا

انوار انجم



ہوا کرے اگر اس کو کوئی گلہ ہوگا ۔۔۔ زباں کھلی ہے تو پھر کچھ تو فیصلہ ہوگا

کبھی کبھی تو یہ دل میں سوال اُٹھتا ہے ۔۔۔ کہ اس جدائی میں کیا اُس نے پا لیا ہوگا

وہ گرم گرم نفس کیسے ٹھہرتے ہوں گے ۔۔۔ اب ان شبوں کو وہ کیسے گزارتا ہوگا

کبھی جو گزروں ترے شہر سے تو سوچتا ہوں ۔۔۔ کہ اس زمین پہ کیا کیا قدم پڑا ہوگا

خوشا وہ رونقِ ہنگامۂ وصال، اب تو ۔۔۔ یقین ہی نہیں آتا کہ یوں ہُوا ہوگا

وہ کھوئی کھوئی وفاؤں کا بھولا بسرا گیت ۔۔۔ کبھی تو اس کے شبستاں میں بھی گیا ہوگا

نکل پڑے تھے یونہی ہم تو ایک دن گھر سے ۔۔۔ کسے خبر تھی کہ یوں تم سے سامنا ہوگا

تری برات میں دن بھر یہی خیال رہا ۔۔۔ کہ اس خوشی کا اثر تیرے دل پہ کیا ہوگا

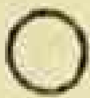
کبھی اُٹھے ہی نہیں ہم تلاش کو ورنہ ۔۔۔ کوئی تو شہر میں اپنا بھی آشنا ہوگا

یہ ہولناک خموشی، جدائی کا آشوب ۔۔۔ میں سوچتا ہوں کہ یونہی رہا تو کیا ہوگا

پھر آج شام سے ہی ذہن کو فراغت ہے ۔۔۔ پھر آج شب وہی یادوں کا سلسلہ ہوگا

کس آرزو میں اُٹھے، کس طرف چلے انجم
اس آدھی رات میں اب کس کا در کھلا ہوگا

انوار انجم



دھوپ ہو گئے سائے، جل گئے شجر جیسے
جم گئی فضاؤں میں اب کے دوپہر جیسے

زیست کے خرابے میں اک سیاہ گھر دل کا
اور دل میں یاد اُس کی، روشنی کا در جیسے

کیسے کیسے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے دن رات
لگ گئی نگاہوں کو اپنی ہی نظر جیسے

یا تو آنے سے پہلے گھر کا پوچھتے احوال
آ گئے تو اب یہ بھی، ہو گزر بسر جیسے

ایسے تکتا رہتا ہوں اُس گلی کے لوگوں کو
لے کے آئے گا کوئی میری بھی خبر جیسے

مدتوں میں گزرا تھا اُس کے شہر سے لیکن
سب مکان لگتے تھے اب بھی اُس کے گھر جیسے

نقش گاہِ ہستی میں دیکھی اپنی بھی تصویر
ایک کاغذِ سادہ آنسوؤں سے تر جیسے

چاہتی ہے اب وحشت دور تک بیابانی
کاٹنے کو آتے ہیں گھر کے بام و در جیسے

مجھ سے کیا سمجھ جاتے، اُن کی بزم کے آداب
اشک مانگتے تھے وہ، اشک بھی گہر جیسے

میں بھی کتنا سادہ ہوں، رہگزر پہ بیٹھا ہوں
روک لے گا وہ پاؤں مجھ کو دیکھ کر جیسے

میری خواہشیں انجم جیسے ناچتی پریاں
میرا سارا مستقبل، خواب کا نگر جیسے

انور انجم



یہ نرم ہاتھ مرے ہاتھ میں تھما دیجے
تھکا ہوا ہوں، ذرا دل کو حوصلہ دیجے

بس اب ملے ہیں تو کیجے نہ آس پاس کا خوف
جو سنگِ راہ ملے، پاؤں سے ہٹا دیجے

یہ اور دور ہے اور سب یہاں مجھی سے ہیں
وہ کمسنی کی حکایات اب بھلا دیجے

نہیں ہے آپ کو فرصت اگر توجہ کی
تو میں بھی لوٹتا ہوں گھر کو، آگیا دیجے

وفا ہے جرم تو اقرارِ جرم ہے مجھ کو
یہ میں ہوں، یہ مرا دل، لیجیے سزا دیجے

مرا وجود بھی ہے آپ کی جبیں کا داغ
اسے بھی حرفِ غلط کی طرح مٹا دیجے

کل آپ نے جو چھڑایا تو چھٹ سکے گا نہ ہات
جو الجھنیں ہیں مجھے آج ہی بتا دیجے

یہ کھیل کھیلا ہے جب پیار کا تو پھر اے دل
اب اپنے آپ کو بھی داؤں پر لگا دیجے

تمام عمر بھٹکتی رہی نظر کہ کہیں
ملے کوئی جسے نذرانۂ وفا دیجے

مری تو جنبشِ لب بھی ہے ناخوشی کا سبب
اب آپ ہی کوئی طرزِ بیاں سکھا دیجے

وہ سہمے سہمے جدائی کے مضطرب لمحے
مری نگاہ میں اک بار پھر بسا دیجے

گیا نہیں ہے ابھی دور آپ کا انجم
جو دل اداس ہو تو پھر اسے صدا دیجے



کب لذتوں نے ذہن کا پیچھا نہیں کیا
یہ میرا حوصلہ تھا کہ لب وا نہیں کیا

تجدیدِ ارتباط بھی ممکن تھی، بعد میں
میں نے ہی اس روش کو گوارا نہیں کیا

پہلے تو اک جنون سا عرضِ طلب کا تھا
جب وہ ملا تو دل نے تقاضا نہیں کیا

سورج رہا جو دن میں مرے گھر سے دور دور
پھر میں نے رات میں بھی اجالا نہیں کیا

کیا وہم تھا کہ کھلتے ہی لب بند ہو گئے
کیا بات تھی کہ لفظ بھی پورا نہیں کیا

جب میرا اشتیاق ہوا ضبط آزما
پھر اس نے اپنے آپ ہی پردا نہیں کیا

میں سادہ لوح، سادہ بیاں، سادہ آرزو
اور اس نے سادگی پہ بھروسا نہیں کیا

میں نے بھی چلتے چلتے کیا تھا یونہی سوال
کیا ہو گیا جو آپ نے پورا نہیں کیا

وہ کم نگاہ تھا مگر اس سے چرا کے آنکھ
میں نے بھی اپنے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا

امرت سمجھ کے پی لیا انجم نے زہرِ غم
لیکن تمہارے نام کو رسوا نہیں کیا

انوار انجم



کھلا ہے پھول بہت دنوں میں مقدر کا
بس اب بند ہو دروازہ تیرے مندر کا

تمام شہر ہے ہنگامۂ نشاط میں گم
مگر یہ کرب، یہ سناٹا میرے اندر کا

کبھی نہ کھل کے ہنسا ہوں، نہ رو یا جی بھر کے
رکھا ہے میں نے ہمیشہ قدم برابر کا

صدا کسی کی ہو، آتا ہے اپنے آپ سے خوف
وہ اجنبی ہوں کہ گھر کا رہا نہ باہر کا

گریز ہے اسے میری گلی سے یوں جیسے
یہاں جو آیا تو ہو جائیگا وہ پتھر کا

یہ راہ ہے گھر کا ملنا بھی کوئی ملنا ہے
جو ہو سکے تو پتہ دیجیئے کبھی گھر کا

کبھی کبھی کا ہو قصہ، تو کوئی دکھ بھی سنے
اٹھائے بوجھ بھلا کون زندگی بھر کا

اسیرِ دامِ فریبِ زباں ہوا انجمؔ
دا اعتبار جسے آیا دیدۂ تر کا

غمِ زمانہ ہے وہ تیغ تشنہ کام انجمؔ
اڑے ہیں پاؤں اگر وار بچ گیا سر کا



کوئی صدا، نہ دور تلک نقشِ پا کوئی
وہ موڑ ہے کہ ملتا نہیں راستا کوئی

ہاں دل کی دھڑکنوں سے صدا آ چکی ہو مگر
چپ چاپ ہی جو آ کے یہاں بس گیا کوئی؟

مانا کہ تیرے در پہ جھکیں آ کے منزلیں
پر ہم سا بھی ملا ہے تجھے، سچ سچ بتا، کوئی؟

دل کی زباں بہت ہے، کوئی ہو جو اہلِ دل
ہونٹوں سے کیا بتائے بھلا مدعا کوئی

آنکھیں جو بند کیں تو وہ ابھرے ہیں آفتاب
باہر کی دھوپ ہے نہ رہا واسطہ کوئی

حیران ہو کے دل سے یہ پوچھا نگاہ نے
کیا واقعی ملا نہ تجھے آشنا کوئی؟

یا آسمان تک نہیں جاتی مری نوا
یا آسماں پہ سنتا نہیں ہے نوا کوئی

جتنے خیال، اتنے ہی رنگوں کے دائرے
ملتا نہیں کسی سے کہیں سلسلہ کوئی

اس سادہ دل کو کیا خبر اس اونچ نیچ کی
انجمؔ کے پاس جا کے بنے کیا بڑا کوئی



چپ بیٹھا میں اکثر سوچتا رہتا ہوں
آخر میں کیوں اتنا تنہا تنہا ہوں

پہروں جن کی جھیل میں کھویا رہتا تھا
ان آنکھوں کی یاد میں ڈوبا رہتا ہوں

تم جو باتیں بھول چکے ہو مدت سے
مَیں تو ان میں اب بھی الجھا رہتا ہوں

تم بدلو تو بدلو اپنی راہ ، مگر
میں تو ایک ڈگر پر چلتا رہتا ہوں

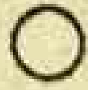
سادہ پن کچھ نیکی ہی کا نام نہیں
دیکھنے میں تو میں بھی سیدھا سادا ہوں

تیرے گھر بھی پہنچا ہے یہ شور کبھی
یا میں ہی انجان صدائیں سنتا ہوں

گھر کی دیواروں میں یوں دل تنگ نہ ہو
ڈھونڈ مجھے مَیں اس گھر کا دروازہ ہوں

جس نے پیار سے دیکھا اُسکے ساتھ ہُوا
سچ پوچھو تو میں بھی اب تک بچہ ہوں

انجمؔ میں کیوں دنیا پہ الزام رکھوں
آنکھیں ہیں تو پھر کیوں ٹھوکر کھاتا ہوں



چاند تارے جسے ہر شب دیکھیں
ہم بھی اس شوخ کو، یا رب! دیکھیں

یوں ملیں ان سے کہ اپنا چہرہ
وہ بھی حیران ہوں، کل جب دیکھیں

پہلے بس دل کو خبر تھی دل کی
اب وفا عام ہوئی، سب دیکھیں

قرب میں کیا ہے جو دوری میں نہیں
تم جو آؤ تو کسی شب دیکھیں

جی میں ہے، پھر کریں اظہارِ وفا
پھر ترے لرزتے ہوئے لب دیکھیں

میں کہ ہوں ایک ہی آشفتہ خیال
لوگ ہر بات میں مطلب دیکھیں

جو کسی نے کبھی دیکھے ہونگے
وہ تماشے، وہ فسوں اب دیکھیں

لاکھ پتھر سہی وہ بت انجمؔ
دو گھڑی ہم سے ملے، تب دیکھیں

بشیر بدر

شعلۂ گل، گلابِ شعلہ کیا
آگ اور پھول کا یہ رشتہ کیا

تم مری زندگی ہو، یہ سچ ہے
زندگی کا مگر بھروسا کیا

کتنی صدیوں کی قسمتوں کا امیں!
کوئی سمجھے بساطِ لمحہ کیا

جو نہ آدابِ دشمنی جانے
دوستی کا اسے سلیقہ کیا

کام کی پوچھتے ہو گر صاحب
عاشقی کے علاوہ پیشہ کیا

بات مطلب کی سب سمجھتے ہیں
صاحبِ نشہ، غرقِ بادہ کیا

دل دکھوں کو سبھی سناتے ہیں
شعر کیا، گیت کیا، فسانہ کیا

سب ہیں کردار اک کہانی کے
ورنہ شیطان کیا، فرشتہ کیا

دن حقیقت کا ایک جلوہ ہے
رات بھی ہے اسی کا پردہ کیا

تو نے مجھ سے کوئی سوال کیا
کاروانِ حیاتِ رفتہ کیا

جان کر ہم بشیر بدر ہوئے
اس میں تقدیر کا نوشتہ کیا

بشیر بدر



پچھلی رات کی نرم چاندنی، شبنم کی خنکی سے رچا ہے
یوں کہنے کو اس کا تبسم برق صفت ہے، شعلہ نما ہے

وقت کو ماہ و سال کی زنجیروں میں جکڑ کر کیا پایا ہے
وقت تو ماہ و سال کی زنجیروں میں اور بھی تیز بڑھا ہے

اک معصوم سے پیار کا تحفہ گھر کے آنگن میں پایا تھا
اس کو غم کے پاگل پن میں کوٹھے کوٹھے بانٹ دیا ہے

آنسو، تارے، رنگ، گلاب، سبھی پردیس چلے جاتے ہیں
آخر آخر تنہائی ہے، کس نے کس کا ساتھ دیا ہے

نظم، غزل، افسانہ، گیت ۔ اک تیرا ہی غم تھا جس کو ہم نے
کیسا کیسا نام دیا ہے، کیسے کیسے بانٹ لیا ہے

آہوں کے بادل کیوں دل میں بن برسے ہی لوٹ گئے ہیں
اب کے برس ساون کا مہینہ کیسا پیاسا پیاسا گیا ہے

بھول سی ہر تصویر میں ذہن کی دیواروں سے اتار چکا ہوں
پھر بھی دل میں کانٹا سا کیوں رہ رہ کر جھنجھنا رہتا ہے

مجبوری تھی صبر کیا ہے، پاؤں کو توڑ کے بیٹھ رہے ہیں
نگری نگری دیکھ چکے ہیں، دوارے دوارے جھانک لیا ہے

مجھ کو اُن سچی باتوں سے اپنے جھوٹ بہت پیارے ہیں
جن سچی باتوں سے اکثر انسانوں کا خون بہا ہے

بدرؔ تمھاری فکرِ سخن پر اک علامہ ہنس کر بولے
"وہ لڑکا، نوعمر پرندہ، اُونچا اڑنا سیکھ رہا ہے"



خون پتوں پہ جما ہو جیسے
پھول کا رنگ ہرا ہو جیسے

بارہا یہ ہمیں محسوس ہوا
درد سینے کا خدا ہو جیسے

یوں ترس کھا کے نہ پوچھو احوال
تیر سینے پہ لگا ہو جیسے

پھول کی آنکھ میں شبنم کیوں ہے
سب ہماری ہی خطا ہو جیسے

کرچیاں چبھتی ہیں بہت سینے میں
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے

سب ہمیں دیکھنے آتے ہیں مگر
نیند آنکھوں سے خفا ہو جیسے

اب چراغوں کی ضرورت بھی نہیں
چاند اس دل میں چھپا ہو جیسے

روز آتی تھی ہوا اس کی طرح
اب وہ آیا تو ہوا ہو جیسے



جب سحر چپ ہو، ہنسا لو ہم کو
جب اندھیرا ہو جلا لو ہم کو

ہم حقیقت ہیں، نظر آتے ہیں
داستانوں میں چھپا لو ہم کو

خون کا کام رواں رہنا ہے
جس جگہ چاہو بہا لو ہم کو

دن نہ پا جائے کہیں شب کا راز
صبح سے پہلے اٹھا لو ہم کو

ہم زمانے کے ستائے ہیں بہت
اپنے سینے سے لگا لو ہم کو

وقت کے ہونٹ ہمیں چھو لیں گے
ان کہے بول ہیں، گا لو ہم کو

بشیر بدر



مری نظر میں خاک، تیرے آئینے پہ گرد ہے
یہ چاند کتنا زرد ہے، یہ رات کتنی سرد ہے

کبھی کبھی تو یوں لگا کہ ہم سبھی مشین ہیں
تمام شہر میں نہ کوئی زن نہ کوئی مرد ہے

خدا کی نظموں کی کتاب ساری کائنات ہے
غزل کے شعر کی طرح ہر ایک فرد فرد ہے

حیات آج بھی کنیز ہے حضورِ جبر میں
جو زندگی کو جیت لے، وہ زندگی کا مرد ہے

اسے تبرکِ حیات کہہ کے پلکوں پر رکھوں
اگر مجھے یقین ہو یہ راستے کی گرد ہے

وہ جن کے ذکر سے رگوں میں دوڑتی تھیں بجلیاں
انھیں کا ہاتھ ہم نے چھو کے دیکھا، کتنا سرد ہے



نہ جی بھر کے دیکھا، نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی ملاقات کی

شبِ ہجر تک کو یہ تشویش ہے
مسافر نے جانے کہاں رات کی

مقدر مری چشم پر آب کا
برستی ہوئی رات برسات کی

اجالوں کی پریاں نہانے لگیں
ندی گنگنائی خیالات کی

میں چپ تھا تو چلتی ہوا رک گئی
زباں سب سمجھتے ہیں جذبات کی

کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں
کہاں دن گزارا کہاں رات کی

بشیر بدر



وہ سادگی نہ کرے کچھ بھی تو ادا ہی لگے
وہ بھول پن ہے کہ بے باکی بھی حیا ہی لگے

یہ زعفرانی "پلوور" اُسی کا حصّہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

نہیں ہے میرے مقدّر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھولو، ذرا صبح کی ہوا ہی لگے

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

لرزتے پردوں میں تُو جیسے جھانک کے چھپ جائے
ترے خیال میں سناٹا بھی صدا ہی لگے

حسیں تو اور ہیں لیکن کوئی کہاں تجھ سا
جو دل جلائے بہت، پھر بھی دلربا ہی لگے



تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون، پروئے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں، کہ دلِ شاعر پر چھائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پر چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اُس جانِ تغزل نے جب بھی کہا، کچھ کہیئے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

سحر انصاری



اِک شرارِ گرفتہ رنگ ہوں میں
پھول سے لے کے تا بہ سنگ ہوں میں

بادِ صرصر کی طرح گرم عناں
سینۂ ریگ کی امنگ ہوں میں

ذرّہ ذرّہ نے کر دیا حیراں
اور حیرانیوں پہ دنگ ہوں میں

فتح بھی اک شکست ہی ہوگی
آرزوؤں سے محوِ جنگ ہوں میں

کیسے تجھ کو بہا کے لے جاؤں
موج ہمسایۂ نہنگ ہوں میں

شہر و صحرا کی کچھ نہیں تخصیص
وسعتِ دشتِ جاں سے تنگ ہوں میں

کس نے دیکھا فشارِ موجۂ جاں
آج تک آب زیرِ سنگ ہوں میں

سکندر انصاری



ہم اہلِ ظرف کہ غم خانۂ ہنر میں رہے
سفالِ نم کی طرح دستِ کوزہ گر میں رہے

قرار مل نہ سکا جس جسم و جاں سے کہ ہم
طلسم خانۂ تکرارِ خیر و شر میں رہے

کسی کو قربِ مسلسل کا حوصلہ نہ ہوا
مثالِ دودِ پریشاں ہم اپنے گھر میں رہے

نہ سنگِ میل تھا کوئی نہ کوئی نقشِ قدم
تمام عمر، ہوا کی طرح سفر میں رہے

نہ ہم شرارِ دلِ سنگ تھے نہ رنگِ حنا
سخن کی آگ بنے، حرفِ تازہ تر میں رہے

وہ لوگ جن کی زباں شعلہ منت تھی
سوال بن کے زمانے کی چشمِ تر میں رہے

سحر انصاری



راستوں میں اک نگر آباد ہے
اس تصور ہی سے گھر آباد ہے

کیسی کیسی صورتیں گم ہو گئیں
دل کسی صورت مگر آباد ہے

کیسی کیسی محفلیں سونی ہوئیں
پھر بھی دنیا کس قدر آباد ہے

زندگی پاگل ہوا کے ساتھ ساتھ
مثلِ خاکِ رہگزر آباد ہے

دشت و صحرا ہو چکے قدموں کی گرد
شہر اب تک دوش پر آباد ہے

بے خودی رسوا تو کیا کرتی مجھے
مجھ میں کوئی بے خبر آباد ہے

دھوپ بھی سنولا گئی ہے جس جگہ
اُس خرابے میں سحر آباد ہے



ہم نے آدابِ غم کا پاس کیا
نقدِ جاں کو زیاں قیاس کیا

زیست کے تجربات کا ہم نے
مثلِ آئینہ انعکاس کیا

خبر و آگہی کے پردے میں
عمر بھر ماتمِ حواس کیا

تہمتِ شعلۂ زباں لے کر
صورتِ زخم التماس کیا

کیسے اک لفظ میں بیاں کر دوں
دل کو کس بات نے اُداس کیا

آگیا جب سلیقۂ تعمیر
قصرِ ہستی کو بے اساس کیا

کیوں سحر تم نے اپنے صحرا کو
موجِ دریا سے روشناس کیا

سحر انصاری



محسوس کیوں نہ ہو مجھے بیگانگی بہت
میں بھی تو اس دیار میں ہوں اجنبی بہت

آساں نہیں ہے کشمکشِ ذات کا سفر
ہے آگہی کے بعد غمِ آگہی بہت

ہر شخص پُر خلوص ہے ہر شخص باوفا
آتی ہے اپنی سادہ دلی پر ہنسی بہت

اُس جانِ جاں سے قطعِ تعلق کے باوجود
اس رہگزر میں آج بھی ہے دلکشی بہت

اس وضعِ احتیاط کی زنجیر کے لیے
میں نے بھی کی ہے شہر میں آوارگی بہت

مستانہ وار وادیٔ غم طے کرو سحرؔ
باقی ہیں زندگی کے تقاضے ابھی بہت



پیمانۂ محال ہو گئے ہم
گردش میں مثال ہو گئے ہم

تکمیلِ کمال ہوتے ہوتے
تمہیدِ زوال ہو گئے ہم

امکانِ وجود کے سفر پر
نکلے تو محال ہو گئے ہم

آئینۂ کربِ لفظ و معنی
فرہنگِ ملال ہو گئے ہم

پہلے تو رہے حقیقت افروز
پھر خواب و خیال ہو گئے ہم

احمد ہمدانی



دلوں کو رنج یہ کیسا ہے، یہ خوشی کیا ہے
یہ ظلمتوں سے اجالوں کی ہمدمی کیا ہے

ہوائیں شہر سے روتی ہوئی گزرتی ہیں
دلوں میں خوف کی یہ ایک لہر سی کیا ہے

اداسیوں کی یہ پرچھائیاں سی دور تلک
مہ و نجوم کی آنکھوں میں یہ نمی کیا ہے

یہ کھلکھلاتے در و بام میں گھٹن کیسی
یہ جگمگاتے مکانوں میں تیرگی کیا ہے

بھرے جہان میں بن باس کی یہ کیفیت
ہر ایک سمت نہ جانے یہ گونج سی کیا ہے

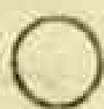
ترے خیال میں کٹتی ہے عمر، پھر بھی ہم
یہ سوچتے ہیں کہ اپنی بھی زندگی کیا ہے

تمازتوں میں بس اک خشک پیڑ کی چھاؤں
ہے جس پہ ناز بہت، وہ بھی آگہی کیا ہے

یہ اشک اشک سے خوابوں میں رونقیں کیسی
یہ داغ داغ تمنا میں تازگی کیا ہے

ملے ہیں دکھ تو ہمیں روز ہی ترے در سے
مگر یہ آج دکھوں میں نئی خوشی کیا ہے

احمد ہمدانی



اب یہ ہوگا شاید، اپنی آگ میں خود جل جائیں گے
تم سے دُور بہت رہ کر بھی کیا پایا، کیا پائیں گے

دُکھ بھی سچے، سُکھ بھی سچے، پھر بھی تیری چاہت میں
ہم نے کتنے دھوکے کھائے، کتنے دھوکے کھائیں گے

کل کے دُکھ بھی کونسے باقی، آج کے دُکھ بھی کٹ جائیں گے
جیسے دن پہلے کاٹے تھے، یہ دن بھی کٹ جائیں گے

عقل پہ ہم کو ناز بہت تھا لیکن یہ کب سوچا تھا
عشق کے ہاتھوں یہ بھی ہوگا، لوگ ہمیں سمجھائیں گے

آنکھوں سے اوجھل ہونا کیا دل سے اوجھل ہونا ہے
تجھ سے چھٹ کر بھی اہلِ غم کیا تجھ سے چھٹ جائیں گے

ہم سے آبلہ پا جب تنہا گھبرائیں گے صحرا میں
راستے سب تیرے ہی گھر کی جانب کو مڑ جائیں گے

احمد ہمدانی



یہ وفائیں ساری دھوکے، پھر یہ دھوکے بھی کہاں
چند دن کی بات ہے، پھر لوگ ہم سے بھی کہاں

تم کو آنا تھا نہ آئے، وقت لیکن کٹ گیا
مضمحل ہوتے ہو کیوں، ہم رات روئے بھی کہاں

پیڑ یہ سوکھے ہوئے، کچھ یہ زمیں تپتی ہوئی
چلتے چلتے آج ٹھہرے ہم تو ٹھہرے بھی کہاں

آج تو وہ دیر تک بیٹھے رہے خاموش سے
رفتہ رفتہ بن گئے حالات پہنچے بھی کہاں

چند یادیں، چند آنسو، چند شکوے اور عمر
عشق تو کیا تھا مگر اب یہ سلیقے بھی کہاں

دل لہو ہوتا ہے یارو بات یہ آساں نہیں
لحظہ لحظہ روتے گذری اور روئے بھی کہاں



منہ اندھیرے گھر سے نکلے پھر تھے ہنگامے بہت
دن ڈھلا تنہا ہوئے اور رات بھر پگھلے بہت

رنج کے اندھے کنوئیں میں رات اب کیسے کٹے
دیکھنے کو دن میں دیکھے چاند سے چہرے بہت

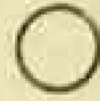
پھر بھی ہم اک دوسرے سے بدگماں کیا کیا رہے
جھوٹ ہم نے بھی نہ بولا تم بھی تھے سچے بہت

تھا ارادہ ان کے گھر سے بچ کے ہم نکلیں مگر
ہر قدم پر ان کے گھر کے راستے آئے بہت

ان دنوں رہتے ہیں لوگوں سے ہمیں کیا کیا گلے
اور لگتے بھی ہیں ہم کو لوگ سب اچھے بہت

پیڑ اپنے دشت میں اب ہم لگا کر کیا کریں
دھوپ نے پھیلا دیئے ہیں دور تک سائے بہت

احمد ہمدانی



یاد کیا کیا لوگ دشتِ بیکراں میں آئے تھے
رنگ لیکن کب یہ چشمِ خونفشاں میں آئے تھے

کس تمنا سے تمہیں دیکھا تھا، کس چاہت سے ہم
رقص کرتے حلقۂ آوارگاں میں آئے تھے

صورتیں کیا کیا دلِ آئینہ گر میں بس گئیں
ہم سے بے صورت بھی تو بزمِ جہاں میں آئے تھے

سادگی سے ہم نے سمجھا تھا، ہمارا ذکر ہے؟
تذکرے کچھ اور ہی ان کے بیاں میں آئے تھے

ہر نئی شکل پہ ہم سوچا کئے ہیں دیر تک
لوگ پہلے بھی تو کچھ شہرِ بتاں میں آئے تھے

یہ گلِ تر کی سی خوشبو کس طرف سے آگئی
ہم بگولے تھے، بھلا کب گلستاں میں آئے تھے

کیوں ہمارے سانس بھی ہوتے ہیں لوگوں پہ گراں
ہم بھی تو اک عمر لے کراس جہاں میں آئے تھے



گرد کیسی ہے یہ، دھواں سا کیا
جا رہا ہے وہ کارواں سا کیا

ہو گیا کوئی مہرباں سا کیا
رنج کا بندھ گیا سماں سا کیا

تک رہے ہیں خلا میں ہم کس کو
بن رہا ہے وہ اک نشاں سا کیا

بستیاں کب کی ہو چکیں برباد
دل کو غم پھر بھی ناگہاں سا کیا

سلسلہ کچھ اداسیوں کا بھی
جگمگاتا ہے کہکشاں سا کیا

ہم بھی اچھے ہیں، درد بھی کم ہے
دل سے اٹھا مگر دھواں سا کیا

کیسے ٹوٹا سکوتِ شامِ فراق
ہر طرف شور بے اماں سا کیا

یہ محبت ہے یا ہے کوئی طلسم
پیچھا کرتا ہے اک گماں سا کیا

احمد ہمدانی



یہ تیری چاہ بھی کیا، تیری آرزو بھی کیا
ہمارے جسم میں یہ دوڑتا لہو بھی کیا

ہے جس کے دھیان میں ہر لمحہ خواب کا عالم
ملے کہیں تو کریں اس سے گفتگو بھی کیا

ترے خیال کی خوشبو، ترے جمال کا رنگ
ہمارے دشت میں لیکن یہ رنگ و بو بھی کیا

یہ تپتی ریت، یہ پیاسی زمیں، یہاں لوگو
کسی کے پیار سے مہکی ہوئی نمو بھی کیا

ہزار کوہ و بیاباں کئے ہیں طے لیکن
ہوئے ہم آبلہ پایاں لہو لہو بھی کیا

کسی کی یاد میں کٹ جائے زندگی ساری
اک آرزو تو ہے لیکن یہ آرزو بھی کیا



نہیں ملتے وہ اب تو کیا بات ہے
یہاں خود سے بھی کب ملاقات ہے

ترے دھیان کے سب اُجالے گئے
بس اب ہم ہیں اور دکھ بھری رات ہے

ہماری طرف بھی کبھی اِک نگاہ
ہمیں بھی بہت نشۂ ذات ہے

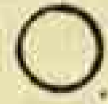
سُلگتا ہُوا دن جو کٹ بھی گیا
تو پھر آنچ دیتی ہوئی رات ہے

شکایت کسی سے تو کیا تھی مگر
گلہ اِک رسمِ خرابات ہے

نیا دُکھ تو ملتا ہے کس کو یہاں
مگر غم کی ہر شب نئی رات ہے

ہر اک شام تازہ اُمیدِ وصال!
ہر اک روز، روزِ مکافات ہے

احمد ہمداف

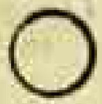


ازل ابد سے بہت دور جھومتے تھے ہم
کسی کے دھیان میں کچھ دن کو جا بسے تھے ہم

وہ غم ہو یا وہ خوشی، کیف کم نہ ہوتا تھا
عجیب راہ سے ہو کر گذر رہے تھے ہم
بہت عزیز تھے ہم کو ہمارے دوست مگر
اک اجنبی کے لیے سب سے چھٹ گئے تھے ہم

کرم سے آپ کے سرشار تھا یہ دل لیکن
خوشی کی آنچ میں کیا کیا پگھل رہے تھے ہم
تمہیں تو یاد کہاں ہوں گے اب، مگر وہ دن
نہ دیکھ کر تمہیں ہر لمحہ دیکھتے تھے ہم

وہ ایک کیف کا عالم، وہ آرزومندی
نہ جانے کونسی دنیا میں جی رہے تھے ہم



دل تجھے پا کے بھی تنہا ہوتا
دور تک ہجر کا سایہ ہوتا
اور تو اپنے لیے کیا ہوتا
اپنا دکھ ہی کوئی اپنا ہوتا
آپ آتے کہ نہ آتے، دل میں
جلتا بجھتا کوئی شعلہ ہوتا
آرزو پھر نئی کرتے تعمیر
پھر نیا کوئی تماشا ہوتا
پھر وہی ایک خلش سی ہوتی
پھر کسی نے ہمیں دیکھا ہوتا
زخم پھر کوئی مہکتا دل میں
سامنے پھر کوئی چہرہ ہوتا
پھر گلے وحشتیں ملتیں ہم سے
پھر وہی ہم، وہی صحرا ہوتا
تھے خفا تم تو ہمارا دم ساز
آفتِ جاں کوئی تم سا ہوتا
تجھکو نفرت ہے تو اپنا دل بھی
رفتہ رفتہ تجھے بھولا ہوتا
تھک کے سویا ہے جو، اب رات گئے
شام ہوتے اسے دیکھا ہوتا

بشر نواز



جب چھائی گھٹا، لہرائی دھنک، اک حسنِ مکمل یاد آیا
ان ہاتھوں کی مہندی یاد آئی، ان آنکھوں کا کاجل یاد آیا

سو طرح سے خود کو بہلا کر ہم جس کو بھلائے بیٹھے تھے
کل رات اچانک جانے کیوں، وہ ہم کو مسلسل یاد آیا

تنہائی کے سائے، بزم میں بھی پہلو سے جدا جب ہو نہ سکے
جو عمر کسی کے ساتھ کٹی، اُس عمر کا پل پل یاد آیا

جو زیست کے تپتے صحرا پر بھولے سے کبھی برسا بھی نہیں
ہر موڑ پہ، ہر اک منزل پر، پھر کیوں وہی بادل یاد آیا

ہم زود فراموشی کے لیے بدنام بہت ہیں، پھر بھی بشرؔ
جب جب بھی چلی مدماتی پون، اڑتا ہوا آنچل یاد آیا



چپ چاپ سلگتا ہے دیا، تم بھی تو دیکھو
کس درد کو کہتے ہیں وفا، تم بھی تو دیکھو
مہتاب بکف رات کسے ڈھونڈ رہی ہے
کچھ دُور چلو، آؤ ذرا، تم بھی تو دیکھو
کس طرح کناروں کو ہے سینے سے لگائے
ٹھہرے ہوئے پانی کی ادا تم بھی تو دیکھو
یادوں کے سمن زار سے آئی ہوئی خوشبو
دامن میں چھپا لائی ہے کیا، تم بھی تو دیکھو
کچھ رات گئے روز جو آتی ہے فضا سے
کس ڈوبتے دل کی ہے صدا، تم بھی تو دیکھو
ہر ہنستے ہوئے پھول سے رشتہ ہے خزاں کا
ہر دل میں ہے اک زخم چھپا، تم بھی تو دیکھو
کیوں آنے لگیں سانس میں گہرائیاں، سوچو
کیوں ٹوٹ چلے بندِ قبا، تم بھی تو دیکھو

بشر نواز



دل کے ہر درد نے اشعار میں ڈھلنا چاہا
اپنا پیراہنِ بے رنگ بدلنا چاہا

کوئی انجانی سی طاقت تھی جو آڑے آئی
ورنہ ہم نے تو بہر گام سنبھلنا چاہا

چاہتے تو کسی پتھر کی طرح جی لیتے
ہم نے خود موم کی مانند پگھلنا چاہا

آنکھیں جلنے لگیں، تپتے ہوئے بازاروں میں
دل نے جب بھی کسی منظر پہ مچلنا چاہا

صرف ہم ہی نہیں، ہر ایک نے جینے کے لیے
اک نہ اک جھوٹے سہارے سے بہلنا چاہا

کون ہے یہ جو سسکتا ہے مرے سینے میں
کون ہے جس نے مرے خون پہ پلنا چاہا



عکس ہر روز کسی غم کا پڑا کرتا ہے
دل وہ آئینہ کہ چپ چاپ تکا کرتا ہے

بہتے پانی کی طرح، درد کی بھی شکل نہیں
جب بھی ملتا ہے، نیا روپ ہوا کرتا ہے

میں تو بہروپ ہوں اس کا، جو ہے میرے اندر
وہ کوئی اور ہے جو مجھ میں جیا کرتا ہے

رنگ سا روز بکھر جاتا ہے دیواروں پر
کچھ دیئے جیسا دریچے میں جلا کرتا ہے

جانے وہ کون ہے جو رات کے سناٹے میں
کبھی روتا ہے، کبھی خود پہ ہنسا کرتا ہے

روز راہوں سے گزرتا ہے صداؤں کا جلوس
دل کا سناٹا مگر روز بڑھا کرتا ہے

بشر نواز



بازارِ زندگی میں جمے کیسے اپنا رنگ
ہیں مشتری کے طور نہ بیوپاریوں کے ڈھنگ

مدت سے پھر رہا ہوں خود اپنی تلاش میں
ہر لمحہ لڑ رہا ہوں خود اپنے خلاف جنگ

اک نام لوحِ ذہن سے مٹتا نہیں ہے کیوں
کیوں آخر اس پہ وقت چڑھاتا نہیں ہے زنگ

اس سے الگ بھی عمر تو کٹ ہی گئی مگر
ایک ایک پل کے بوجھ سے دکھتا ہے انگ انگ

شاخِ نہالِ ذہن پہ خوابوں کے پھول تھے
ہوتا نہ اپنا دستِ جنوں کاش زیرِ سنگ

آواز کے حصار میں دل اب بھی قید ہے
مانگے ہے اب بھی پیرہنِ لفظ ہر امنگ

کچھ تجربہ بھی اب تو زمانے کا ہو گیا
کچھ دل کے بچپنے سے بھی ہم آ گئے ہیں تنگ

کوچہ بہ کوچہ پھرتے ہیں اب اس طرح بشرؔ
بھٹکے ہے جیسے، ہاتھ سے ٹوٹی ہوئی پتنگ



کوئی صنم تو ہو، کوئی اپنا خدا تو ہو
اس دشتِ بےکسی میں کوئی آسرا تو ہو

کچھ دھندلے دھندلے خواب ہیں، کچھ کانپتے چراغ
زادِ سفر یہی ہے، کچھ اس کے سوا تو ہو

سورج ہی جب نہ چمکے تو پگھلے گی برف کیا
بن جائیں وہ بھی موم مگر دل دکھا تو ہو

ہر چہرہ مصلحت کی نقابوں میں کھو گیا
دل بیٹھیں کس کے ساتھ، کوئی آشنا تو ہو

خاموش پتھروں کی طرح کیوں ہوا ہے شہر
دھڑکن دلوں کی گر نہیں، آوازِ پا تو ہو

باقی ہے ایک درد کا رشتہ، سو وہ بھی اب
کس سے نبھائیں ہم، کوئی درد آشنا تو ہو

بشر نواز



"آہٹ پہ کان، در پہ نظر" اس طرح نہ تھی
ایک ایک پل کی ہم کو خبر اس طرح نہ تھی

تھا دل میں درد پہلے بھی لیکن نہ اس قدر
ویراں تو تھی حیات مگر اس طرح نہ تھی

ہر ایک موڑ مقتلِ ارمان و آرزو
پہلے تو تیری راہگزر اس طرح نہ تھی

جب تک صبا نے چھیڑا نہ تھا، نکہتِ گلاب
کوچہ بہ کوچہ محوِ سفر اس طرح نہ تھی

برسوں میں پہلے ہوتی تھی نم آستیں کبھی
ارزاں متاعِ دیدۂ تر اس طرح نہ تھی

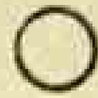


چھیڑا ذرا صبا نے تو گلنار ہو گئے
غنچے بھی، مہ جمالوں کے رخسار ہو گئے

وہ لوگ جن کی دشت نوردی کی دھوم تھی
مدت ہوئی کہ سنگِ درِ یار ہو گئے

صدیوں کا غم سمٹ کے، دلوں میں اُتر گیا
ہم لوگ زندگی کے گنہگار ہو گئے

زلفوں کی طرح پہلے بھی بادل حسین تھے
ڈولی پون تو اور طرحدار ہو گئے



جب کبھی ہوں گے تو ہم مائلِ غم ہی ہوں گے
ایسے دیوانے بھی اس دور میں کم ہی ہوں گے

ہم تو زخموں پہ بھی یہ سوچ کے خوش ہوتے ہیں
تحفۂ دوست ہیں جب یہ، تو کرم ہی ہوں گے

بزمِ عالم میں جب آئے ہیں تو بیٹھیں کچھ اور
بس یہی ہوگا نا، کچھ اور ستم ہی ہوں گے

جب بھی بربادِ وفا کوئی نظر آئے تمہیں
غور سے دیکھ لیا کرنا، وہ ہم ہی ہوں گے

کوئی بھٹکا ہوا بادل، کوئی اُڑتی خوشبو
کون کہہ سکتا ہے، اک دن یہ ہم ہی ہوں گے



ربط ہر بزم سے ٹوٹے، تری محفل کے سوا
رنجشیں سب کی گوارہ ہیں، ترے دل کے سوا

ایسے پہلو میں سما جاؤ کہ جیسے دل ہو
چین ملتا ہے کہاں موج کو ساحل کے سوا

چیخ ٹکرا کے پہاڑوں سے پلٹ آتی ہے
کون سہتا ہے بھلا وار، مقابل کے سوا

خشک پتوں سے چھڑا لیتی ہیں شاخیں دامن
کس نے یادوں سے نبھائی ہے یہاں دل کے سوا

ایک بچھڑے ہوئے سائے کے تعاقب میں بشرؔ
سبھی راہوں پہ گئے ہم، رہِ منزل کے سوا

نذیر قیصر



کبھی ہنس کر، کبھی آنسو بہا کر دیکھ لیتا ہوں
میں ہر چہرے کو آئینہ دکھا کر دیکھ لیتا ہوں

بہت بے چین کر دیتی ہیں جب تنہائیاں گھر کی
در و دیوار پر شکلیں بنا کر دیکھ لیتا ہوں

چھپاتا ہے بہت مجھ کو مرا سایہ، مگر پھر بھی
میں خود کو روشنی سے دُور جا کر دیکھ لیتا ہوں

نظر آتا نہیں جب حرف کوئی لوحِ عالم پر
میں اپنا نام لکھ کر اور مٹا کر دیکھ لیتا ہوں

جسے دیکھا نہیں ہے دیکھ کر بھی میری آنکھوں نے
میں اُس کو اپنے خوابوں میں سجا کر دیکھ لیتا ہوں

نہیں ملتا کہیں جب اپنی ہستی کا نشاں مجھ کو
ہوا کے سامنے شمعیں جلا کر دیکھ لیتا ہوں

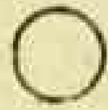
جدا کرتی نہیں مجھ سے مجھے بہتی ہوئی لہریں
میں اپنا عکس پانی میں بہا کر دیکھ لیتا ہوں

جسے دیکھا نہیں، روتا ہوں اس کی یاد میں شب بھر
جسے پایا نہیں، اُس کو گنوا کر دیکھ لیتا ہوں

کبھی کرنا ہو اندازہ جب اپنے درد کا مجھ کو
میں اس بے درد کے دل کو دُکھا کر دیکھ لیتا ہوں

پہن لیتی ہیں جب شاخیں ہرے موسم کے پیراہن
کوئی ٹوٹا ہوا پتا اٹھا کر دیکھ لیتا ہوں

نذیر قیصر



آنکھیں کس کا کھوج لگاتی رہتی ہیں
شکلیں اپنا آپ چھپاتی رہتی ہیں
آنے والے دنوں کی دھندلی تصویریں
گئے دنوں کے خواب دکھاتی رہتی ہیں
موسم کی روداد رقم کرنے کے لیے
شاخیں اپنے ہاتھ کٹاتی رہتی ہیں
مٹی کیوں رنگوں کو ظاہر کرتی ہے
خوشبوئیں کیوں خاک اڑاتی رہتی ہیں
کون ہوائیں ہیں جو لوحِ عالم پر
آنکھیں، چہرہ، ہاتھ بناتی رہتی ہیں
تنہائی میں خاموشی کی آوازیں
مجھ کو میرا نام بتاتی رہتی ہیں
ساری رات گلی کے خالی نکڑ پر
تیز ہوائیں لمپ ہلاتی رہتی ہیں



ساحل کی ریت چاند کے منہ پر نہ ڈالیے
ہمت جو ہو تو بحر سے موتی نکالیے

خوشبو کی طرح تھام کے چلیے ہوا کا ہاتھ
مثلِ غبار، بوجھ فضا پر نہ ڈالیے

آوارہ موسموں کے بگولوں کے ساتھ ساتھ
پھرتا ہے کوئی مجھ کو ہوا در ہوا لیے

کھلتا نہیں کہ کس کے لیے سرگراں ہوں میں
قدموں میں خاک، سر پہ فلک کی ردا لیے

سائے کی طرح رینگ رہا ہوں زمین پر
گزرے ہوئے زمانوں کی آوازِ پا لیے

اک حرف میرے کان میں کہتا ہے رات دن
مجھ کو کتابِ خاک سے باہر نکالیے

ممکن ہے کوئی شکل ابھر آئے سامنے
آئینۂ خلا میں کوئی عکس ڈالیے

آزاد ہو سکا نہ بدن قیدِ خاک سے
ہر چند ہم نے پاؤں ہوا میں جما لیے

اک شمعِ بے نشاں کا پتہ ڈھونڈتے ہوئے
ہم نے دل و نگاہ کے سورج بجھا لیے



کون ہوں، کیوں زندہ ہوں، سوچتا رہتا ہوں
خوابوں کی دنیا میں جاگتا رہتا ہوں

رنگ اور خوشبو سے دھندلائے رستوں میں
ہوا کی انگلی تھام کے چلتا رہتا ہوں

آوازوں کی گٹھڑی سر پہ اٹھائے ہوئے
خاموشی کے زینے چڑھتا رہتا ہوں

جہاں سے میرے جسم کو اک دن اگنا ہے
میں اس بانجھ زمین کو ڈھونڈتا رہتا ہوں

آنکھوں کی عریانی سے چھپنے کے لیے
نئے نئے ملبوس پہنتا رہتا ہوں

صبح و شام ہوا کی اندھی لہروں میں
ذرہ ذرہ ہو کے بکھرتا رہتا ہوں

سوئی ہوئی راہوں میں تنہا چاند کے ساتھ
ساری ساری رات بھٹکتا رہتا ہوں

لوحِ جہاں پر بنتی بگڑتی تحریریں
دیکھتا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں

جسم و جاں کی دھوپ سے جلتے صحرا میں
اپنا سایہ اوڑھ کے چلتا رہتا ہوں

نذیر قیصر



تجھ کو لکھنا ہے تو ایسا کوئی صفحہ لکھ دے
جاگتے لفظوں میں خوابوں کا سراپا لکھ دے

پہلے جو شکل نہیں دیکھی تھی، وہ سامنے لا
پہلے جو نام کتابوں میں نہیں تھا، لکھ دے

گنبدِ شب میں مہ و نجم سجانے والے
ان گلی کوچوں کی قسمت میں دریچہ لکھ دے

اَن لکھے لفظوں میں لکھ مژدہ نئے موسم کا
کہیں مہتاب، کہیں گل، کہیں چہرہ لکھ دے

زرد شاخوں میں نئی کونپلیں لکھنے والے
پیڑ سے ٹوٹتے پتوں کا بھی نوحہ لکھ دے

یوں بھی ترتیب دے قصہ کبھی فصلِ گل کا
باغ میں شمع جلا، طاق میں سبزہ لکھ دے

کھینچ دے خط نئی صبحوں کے افق تا بہ افق
خاکِ تیرہ کے مقدر میں اجالا لکھ دے

کھول دے آنکھوں پہ دروازۂ حیرت قیصرؔ
حرفِ پنہاں کے معانی سرِ پردہ لکھ دے



تنگ ہوئی جاتی ہے زمین انسانوں پر
کاش کوئی ہل پھیر دے قبرستانوں پر

اب کھیتوں میں کچھ بھی نہیں پانی کے سوا
یہ کیسی رحمت برسی دہقانوں پر

کبھی کبھی تنہائی میں یوں لگتا ہے
جیسے کسی کا ہاتھ ہے میرے شانوں پر

میں وہ پچھلے پہر کی ہوا کا جھونکا ہوں
دستک دیتا پھرے جو بند مکانوں پر

کبھی تو چاپ ملے گی آتی صدیوں کی
کان دھرے بیٹھا ہوں گئے زمانوں پر

نذیر قیصر



دل تنگ ہوں مکان کے اندر پڑا ہوا
باہر ابد کا قفل ہے دَر پر پڑا ہوا

مجھ پر گراں گزرتی ہے میری صدا کی گونج
چپ ہوں درونِ گنبدِ بے در پڑا ہوا

ممکن جو ہو تو ایک نظر مڑ کے دیکھ لے
اِک نقش ہے زمین پہ مٹ کر پڑا ہوا

یُں ہی نہیں ہوں دِن کے بگولے کے ساتھ ساتھ
سوُرج کے پاؤں میں بھی ہے چکر پڑا ہوا

کھل ہی گئی ہے آنکھ تو آواز دے کے دیکھ
خاموش کیوں ہے شب کا سمندر پڑا ہوا

بیٹھا ہوا ہوں چھپ کے ہوا کے حصار میں
ہر سمت ہے غنیم کا لشکر پڑا ہوا

مجھ کو ہوائیں چلنے سے پہلے سمیٹ لو
میں رہگذار میں ہوں بکھر کر پڑا ہوا

جیسے ہو کوئی میرے تعاقب میں رات دن
اپنے وجود کا ہے مجھے ڈر پڑا ہوا

میں چھپتا پھر رہا ہوں خود اپنی ہی ذات سے
قیصرؔ مرا عذاب ہے مجھ پر پڑا ہوا



ہر نقش ہے وجودِ فنا میرے سامنے
حیران ہوں یہ رنگ ہے کیا میرے سامنے

اک شکل سی ہے میری طرح میرے روبرو
اک حرف سا ہے میرے سوا میرے سامنے

گم سم کھڑی ہے میری صدا میرے آس پاس
دیوار بن گئی ہے ہوا میرے سامنے

کھلتا نہیں کہ آئینۂ کائنات میں
کیا ہے مثالِ عکس نوا میرے سامنے

جنگل کا وہ سفر بھی مبارک ہوا مجھے
جب چل رہا تھا میرا خدا میرے سامنے

اک اجنبی صدا سی تعاقب میں تھی مرے
دیکھا جو مڑ کے، کچھ بھی نہ تھا مرے سامنے

اب سوچتا ہوں بکھرا ہوا دشتِ خاک میں
یہ کون مجھ کو توڑ گیا میرے سامنے

قیصرؔ ہوا تھا سامنا اک شکل سے مرا
پھر اس کے بعد کچھ نہ رہا میرے سامنے

ــــ نذیر قیصر



مٹی پہ کوئی نقش بھی ابھرا نہ رہے گا
گر جائے گی دیوار تو سایہ نہ رہے گا

آئے گا نظر دھوپ میں چھت پر وہ کھلے سر
گلیوں میں یہ راتوں کا نکلنا نہ رہے گا

شاخوں سے نوا، پتوں سے چھن جائے گی خوشبو
کٹ جائے گا جب پیڑ تو کیا کیا نہ رہے گا

سوچوں تو کوئی لفظ ملے گا نہ ترے نام
لکھوں گا تو کاغذ کوئی سادہ نہ رہے گا

بکھرے ہوئے چہروں میں کھڑا سوچ رہا ہوں
آنکھیں نہ رہیں گی کہ تماشا نہ رہے گا

مٹ جاؤں گا لکھتے ہوئے رودادِ شب و روز
جب میں نہ رہوں گا، مرا افسانہ رہے گا

کھو جائے گی خاموشی میں آوازِ جرس بھی
راہوں میں کہیں نقشِ کفِ پا نہ رہے گا

آگے بھی دکھائی نہیں دے گی کوئی منزل
اور گھر کو پلٹنے کا بھی رستہ نہ رہے گا

میں حرف ہوں، لکھ لو مجھے، آواز ہوں، سن لو
آتے ہیں وہ دن جب کوئی مجھ سا نہ رہے گا



گلیاں اداس، کھڑکیاں چپ، در کھلے ہوئے
اکتا گیا ہوں میں تو یہ سب دیکھتے ہوئے

ہاتھوں پہ لکھ کے چومتا رہتا ہوں اس کا نام
مدت گزر گئی ہے جسے خط لکھے ہوئے

خوشبو و رنگ، آب و ہوا، ساز و خامشی
کیا قافلے ہیں دشتِ خلا میں رکے ہوئے

کچھ پوچھتی ہیں پیڑوں کی سرسبز ٹہنیاں
کچھ کہہ رہے ہیں راہ میں پتے گرے ہوئے

ہاتھوں میں لے کے چلتا ہوں آنکھوں کی مشعلیں
ہر سمت ہیں فضاؤں میں چہرے بنے ہوئے

محتاج ابر و باد ہوئے اہلِ خاکداں
ہر چند اس زمیں میں تھے دریا چھپے ہوئے

اے ماورائے فکر، اب آواز دے، کہ ہم
خود سے بچھڑ گئے ہیں تجھے ڈھونڈتے ہوئے

سلطان اختر



تنہائیوں کی برف بھی بستر پہ جا بجا
شعلوں کا رقص رات بدن پہ نہ ہو سکا

پرچھائیوں کے عارض و لب کون چومتا
لذت فروش جسم سے میں دور ہی رہا

میں نے ہی اپنے دل کے ورق پر اُسے لکھا
جو حادثہ کسی سے رقم ہو نہیں سکا

ہر سمت کھنچ گئے تری یادوں کے سائبان
کل رات درد لوٹ گیا، چیختا ہوا

یادوں نے اضطراب کی ریکھائیں کھینچ دیں
ورنہ مرے سکون کا کاغذ سفید تھا

چہروں سے اُڑ چکے ہیں شناسائیوں کے عکس
اب دوستوں کی کھوج میں تُو عمر مت گنوا

دل میں ستم کا زہر، لبوں پہ تھے خلوص
یارانِ خوش کلام کا اب تجربہ ہوا

شاید اسے یقین کی انگلی نہ چھُو سکے
اک شخص اپنے آپ سے برسوں نہیں ملا

حائل تھی راستے میں روایات کی خلیج
وہ دل کی بات اپنی زباں تک نہ لا سکا

میں چپ رہا تو قید کی میعاد بڑھ گئی
چیخا تو اور حلقۂ زنجیر کس گیا

پانی کے انتظار میں پھر ریت پھانکیے
اختر یہ دن بھی دھوپ کی دلدل میں دھنس گیا

سلطان اختر



ہرا شجر نہ سہی، خشک گھاس رہنے دے
زمیں کے جسم پہ کوئی لباس رہنے دے

کہیں نہ راہ میں سورج کا قہر ٹوٹ پڑے
تو اپنی یاد مرے آس پاس رہنے دے

بکھر چکے ہیں سماعت کے تلخ شیرازے
اب اپنے نرم لبوں کی مٹھاس رہنے دے

وہ دیکھ ڈھے چکیں وہم و گماں کی دیواریں
یقیں پہ چیخ رہا ہے، قیاس رہنے دے

بڑا لطیف اندھیرا ہے، روشنی نہ جلا
عروسِ شب کو ابھی خوش لباس رہنے دے

تصوّرات کے لمحوں کی قدر کر پیارے
ذرا سی دیر تو خود کو اُداس رہنے دے

سلطان اختر



برائے نام سہی دن کے ہاتھ پیلے ہیں
کہیں کہیں پہ ابھی روشنی کے ٹیلے ہیں

تمام رات مرے غم کا زہر چوسا ہے
اسی لیے تری یادوں کے ہونٹ نیلے ہیں

ہر ایک شخص ہے پیغمبرانہ سوچ میں غرق
حصولِ زیست کے شاید یہی وسیلے ہیں

انہیں بھی آج کی تہذیب چاٹ جائے گی
کہیں کہیں پہ جو سمٹے ہوئے قبیلے ہیں

بدن کا لوچ، لبوں کی مٹھاس، قُرب کا لمس
تصورات کے سب ذائقے رسیلے ہیں

ہمارے ضبط کی دیوار آہنی نہ سہی
تمہارے طنز کے نیزے کہاں نکیلے ہیں



ہر چند اپنے عکس کا دل دردمند ہو
آئینے کے لبوں پہ اگر زہرِ خند ہو؟

بے مہرِ آفتاب کا دروازہ بند ہو
آندھی ذرا اٹھے تو گھٹا سر بلند ہو

ہر لحظہ اُس کی مدح سرائی نہ کیجئے
ممکن ہے ایسی بات اُسے ناپسند ہو

ہر گام حوصلوں کا یہی مدعا رہا
گمراہِ زندگی کی مسافت دوچند ہو

اختر، ہیں اختلاف کا قائل نہیں مگر
احباب کا مزاج ہی جب شر پسند ہو؟

سلطان اختر



جس کو قریب پایا اُسی سے لپٹ گئے
سورج ڈھلا تو لوگ قبیلوں میں بٹ گئے

وہ گُل پرست جن پہ بہاروں کو ناز تھا
آئی خزاں تو پائے خزاں سے لپٹ گئے

کس کس کی، بیں ہجوم میں آنکھیں نکالتا
اچھا ہوا کہ آپ دریچے سے ہٹ گئے

جو تھے کہ جان سے زیادہ عزیز تھے
زندہ دلی کے نام پہ کل وہ بھی بٹ گئے

ٹھٹھرے ہوئے بدن کو حرارت نہ مل سکی
چھت پر چڑھے تو دھوپ کے سائے سمٹ گئے

جن حوصلوں پہ کوہِ گراں کا گمان تھا
آندھی چلی تو سیکڑوں حصوں میں بٹ گئے



زنگ آلود زباں تک پہونچی ہونٹوں کی مقراض
خاموشی کی جھیل میں ڈوبی پس ماندہ آواز

کاغذ پر اُلجھاتے رہیے شبدوں کی زنجیر
آتے آتے آجائے گا لکھنے کا انداز،

حال کا ماتم کرتے کرتے آنکھیں خشک ہوئیں
مستقبل کی سوچ رہا ہے ماضی کا نباض

خوشیوں کی دھندلی تصویریں، رونے کی تمہید
اشکوں کی کالی پرچھائیں، ہنسنے کا آغاز

آؤ! سورج نوچ کے اندھی آنکھوں میں بھر لیں
کب تک آخر چاٹی جائے تاریکی کی بیاض

سلطان اختر



تنہائی کی خلیج ہے یوں درمیان میں
ہر شخص جیسے قید ہو اندھے مکان میں

اُس کے لبوں پہ سات سمندر کا عکس تھا
صدیوں کی پیاس جذب تھی بیری زبان میں

آئی اگر گھٹا، اسے سورج نے کھا لیا
اب کے برس بھی آگ لگی آسمان میں

ٹکرا کے اختلاف کی دیوار توڑ دی
ضدی تھا، سر بلند ہوا خاندان میں

یوں بھی دہکتے دشت سے کیا کم تھی زندگی
بے کار دھوپ کود پڑی درمیان میں

بہتر ہے اپنے آپ سے کچھ بولتے رہو
یوں چُپ رہے تو زنگ لگے گا زبان میں



ہنگاموں کے قحط سے کھڑکی، دروازے بھوت
آنگن آنگن ناچ رہے ہیں سناٹوں کے بُھوت

بوجھل آنکھیں، پتھریلے لب، اُجڑے ہوئے رُخسار
سب کے کاندھوں پر رکھے ہیں چہروں کے تابوت

الگ الگ خود ہی کر لے گی لمحوں کی میزان
کس کو فرصت، کون گنے اب، اُبرے بھلے کرتوت

چمک رہے ہیں مایوسی کے تیز نکیلے دانت
دل کے چوراہے پر زخمی اُمیدیں مبہوت

حال سے اب سمجھوتا کر کے تازہ دم ہو لو
مستقبل تک ڈھو نہ سکو گے ماضی کا تابوت

سلطان اختر



کوئی بھی شہر میں کھل کر نہ بغل گیر ہوا
میں بھی اُکتائے ہوئے لوگوں سے اُکتا کے ملا

دن کے کاندھے پہ دہکتے ہوئے سورج کی صلیب
رات کی گود میں ٹھٹھرا ہوا مہتاب ملا

کہیں اشکوں کے دیئے ہیں نہ تبسم کے چراغ
لوگ پتھر کے ہوئے جاتے ہیں رفتہ رفتہ

نیند پلکوں کے دریچے سے لگی بیٹھی ہے
سونے دیتا ہی نہیں گرم ہوا کا جھونکا

وہ چہکتی ہوئی کھڑکی، نہ مہکتے در و بام
اُن کے کوچے میں بھی کل موت کا سناٹا تھا

لاکھ تہذیب کے غاروں میں چھپے ہم اختر
پھر بھی عریانیت وقت سے دامن نہ بچا



خوابوں کی لذتوں پہ تھکن کا غلاف تھا
آنکھیں لگیں تو نیند کا میدان صاف تھا

دیوارِ دل سے اُتری ہیں تصویریں سینکڑوں
پس ماندہ خواہشوں سے اُسے اختلاف تھا

دیکھا قریب جا کے تو شرمندگی ہوئی
چہرے پہ اپنے گرد تھی آئینہ صاف تھا

اب کے سفر میں دھوپ کی دریادلی نہ پوچھ
اور سایۂ شجر سے مرا اختلاف تھا

مصحف اقبال توصیفی



چاند نے اپنا دیپ جلایا، شام بجھی ویرانے میں
اس کی بستی دور ہے شاید دیر ہے اس کے آنے میں

کیا پتھر کی بھاری سِل ہے ایک اک لمحہ ماضی کا
دیکھو، دب کر رہ جاؤ گے اتنا بوجھ اُٹھانے میں

اُس کو نہیں دیکھا ہے جس نے، مجھ کو بھلا کیا سمجھے گا
اُن آنکھوں سے گذرنا ہوگا میرے دل تک آنے میں

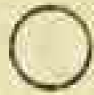
اپنی ذات سے کچھ نسبت تھی وہ بھی اس کی خاطر سے
میرا ذکر نہیں ملتا ہے اب میرے افسانے میں

ایک ہی دُکھ تھا میرا اپنا، وہ بھی اسکو سونپ دیا
آخر دل کی بات زباں تک آ ہی گئی انجانے میں

اب تو تم بھی جان گئی ہو، تم کو کیا دکھ ملتا تھا
میرے گھر کے کام میں میری ماں کا ہاتھ بٹانے میں

میری راتوں میں جھکے ہیں جو سپنوں کی ڈالی سے
رنگ ہے ان پھولوں کا شامل آج ترے شرمانے میں

جس سے بات بھی کرنی مشکل وہ بھی اس محفل میں ہے
مصحف کیسا لطف رہے گا اس کو شعر سنانے میں



اپنا شہکار ابھی ، اے مرے بت گر، نہ بنا

دل دھڑکتا ہے مرا، تو مجھے پتھر نہ بنا

قیدِ آوارگیٔ جاں ہی بہت ہے مجھ کو

ایک دیوار مری رُوح کے اندر نہ بنا

آتی جاتی ہوئی سانسوں پہ لکیریں مت کھینچ

میری تصویر مجھے پاس بٹھا کر نہ بنا

وہ گھروندے ترے بچپن میں بھی ڈھا دیتی تھی

اب تو وہ کھیل کی باتیں بھی نہیں، گھر نہ بنا

اِک ترا دھیان جو ٹوٹے گا ، بکھر جاؤں گا

مجھ کو اِک لہر پہ بہنے دے ، سمندر نہ بنا

مصحف اقبال توصیفی



صدا، ز فیضِ اثر، خامشی نہ بن جائے
جو بات کہہ نہ سکوں، آپ ہی نہ بن جائے

کس انتظار میں ہے گھر کا بند دروازہ
ہوا بھی سایۂ زنجیر ہی نہ بن جائے

وہ گھٹ کے مر ہی نہ جائے جو میرے اندر ہے
مرا وجود ہی میری نفی نہ بن جائے

تری وفا مری نس نس میں زہر بھر دے گی
یہ دوستی بھی تری، دشمنی نہ بن جائے

تمہارے ماتھے پہ ابھری ہے جو شکن کی طرح
یہی لکیر بھٹک کر ہنسی نہ بن جائے

اٹھاؤں نظم کا گھونگھٹ تو سامنے تم ہو
غزل کہوں تو تمہاری "چھبی" نہ بن جائے

اب کسی کو دیکھ کر اک سمت مڑ جاتے ہیں ہم
جس سے ملنا چاہتے ہیں اس سے کتراتے ہیں ہم

لوگ تجھ کو بے وفا کہتے ہیں، ان سے کیا گلہ
رنگِ دنیا دیکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں ہم

یہ نمی آنکھوں کی، سینے کی جلن جاتی نہیں
تیری محفل میں بھی تنہائی سے گھبراتے ہیں ہم

مڑ کے دیکھا تھا تو سارا شہر پتھر ہو گیا
لوٹ کر آئے تو ہر پتھر سے ٹکراتے ہیں ہم

کیوں زمانے بھر کی خوشیوں سے ہے کوئی غم عزیز
آئینے کے پاس آؤ، تم کو سمجھاتے ہیں ہم،

مصحف اقبال توصیفی



یاد پھر آئی تری ، موسم سلونا ہو گیا
شغل سا آنکھوں کا بس دامن بھگونا ہو گیا

اب کسی سے کیا کہیں ، ہم کس لیے برباد ہیں
اب کسی کی کیوں سنیں ، جو کچھ تھا ہونا ہو گیا

گیت بابل کے سنانے تیری سکھیاں آ گئیں
میں ترے بچپن کا اک ٹوٹا کھلونا ہو گیا

میری پلکوں پر مرے خوابوں کی کرچیں گڑ گئیں
نیند گھائل ہو گئی آنکھوں میں ۔ سونا ہو گیا

پھر کسی کی یاد کیوں آتی ہے یارب ، خیر ہو
میں تو آنسو پونچھ کر خوش تھا کہ رونا ہو گیا



آتی جاتی سانس کیسے تیرے غم سے من گئی
کیا بتائیں ، زندگی خود رفتگی کیوں بن گئی

بات بھی سہہ لیں کسی کی ، اب کہاں اتنا دماغ
تم سے روٹھے تھے ، لڑائی دوسروں سے ٹھن گئی

کاغذوں سے میں تراشوں بدن ڈھلکنے لگا
جو بچا رکھی تھی اب تک ، وہ متاعِ فن گئی

ریزہ ریزہ چاند پلکوں کی چٹانوں پر ملا
رات کاٹے غم کی ، ایسے جھاڑ کر دامن گئی

روز و شب کی یہ مسافت جانے کب ہو گی تمام
پھر ہوا لیکر ہمارے جسم کا ایندھن گئی

مراتب اختر



سارے منظر خاک ہوتے جا رہے ہیں دوستو
ہم نے جو پایا ہے کھوتے جا رہے ہیں دوستو

آؤ پیدل ہی سفر کے سلسلوں کو روند دیں
بیٹھے بیٹھے بانجھ ہوتے جا رہے ہیں دوستو

سانس کی ڈوری میں اُجڑے موسموں کی سیپیاں
اک تسلسل سے پروتے جا رہے ہیں دوستو

تیرتی، مڑ مڑ کے تکتی کشتیوں کے بادباں
رفتہ رفتہ دُور ہوتے جا رہے ہیں دوستو

ناسمجھ، اس سرزمیں پر آنے والوں کے لیے
نت نئے بحران بوتے جا رہے ہیں دوستو

یہ گھنی چھاؤں پڑاؤ تھی نئے آغاز کا
اس گھنی چھاؤں میں سوتے جا رہے ہیں دوستو



آئے تھے جس طرف سے وہ اک دن، اُدھر گئے
برگد کا پیڑ کٹ گیا، سادھو گذر گئے

کیا زندگی ملی انھیں طوفان کی گود میں
دو جسم ایک جسم ہوئے اور مر گئے

کرنے لگے قیاس — کہیں قتل ہو گیا
آندھی کا رنگ سُرخ تھا، سب لوگ ڈر گئے

اب مجھ کو بھول بھال گئے سب معاشقے
ساون کی رُت گذر گئی، دریا اُتر گئے

اک جسم میں اُتر گیا اک سال، دن بہ دن
اک ایک کر کے صحن میں پتّے بکھر گئے

چھُپ کر ملے، بچھڑ گئے اور پھر نہ مل سکے
اک پل میں داستان کی تکمیل کر گئے



سرزد ہوئی تھی ایک خطا کھیل کھیل میں
پھر میں اسیر ہو گیا پیکر کے جیل میں

اب لوٹ آ — بدل گئی رُت — پھول کھل گئے
دیوار پہ لٹکتی ہوئی زرد بیل میں

کتنے سمے فراق کے دُہرا گئے مجھے
کتنی رتیں بکھر گئیں دو پل کے میل میں

شعلوں کا رقص تجھ کو نہیں تھا اگر پسند
یہ آگ کیوں لگائی تھی مٹی کے تیل میں



پیوندِ نو زمیں کی ردا سے لگا دیا
میں حصۂ فنا تھا، فنا سے ملا دیا

پل میں سمیٹ لی ہے صدی سی طویل رات
پھیلا کے ایک دن کو زمانہ بنا دیا

اس نے مجھے دکھا کے، مری سمت دیکھ کر
تتلی کا پر، ہتھیلی پہ رکھ کر، اڑا دیا

ہر وقت اک یہ دھن ہے کہ میں تجزیہ کروں
مجھ کو میرے جنونِ تجسس نے کیا دیا

مراتب اختر



یہ گھر کے بھید ہیں کہوں کیسے زبان سے
کیا دکھ ملے ہیں مجھ کو میرے بھائی جان سے

کیفے کے ایک کونے میں مصروفِ گفتگو
مغموم، بے حیات بدن، بے زبان سے

یہ دن جو آج بیت گیا، پھر نہ آئے گا
یہ تیر بھی نکل گیا تو بس کمان سے

اچھے بشر ہیں، جن کو نہیں ڈھونڈنے کی دھن
اچھا خدا ہے، دور ہے وابستگان سے

الٹے کنوئیں کے قعر میں لٹکا دیئے گئے
اُترے تھے دو فرشتے کبھی آسمان سے



جاگ اُٹھیں چنگھاڑتی موجیں، سفینہ چاہیئے
چار جانب موت ہے، ہمت سے جینا چاہیئے

میز پر اک فائلوں کا ڈھیر، ذہنی کرب، خون
آدمی سے کام لینے کا قرینہ چاہیئے

آگ برسائی اُدھر انسان پر انسان نے
اور حریفوں کو اِدھر صحرائے سینا چاہیئے

اس بھرے بازار، اس بغداد سے گذرا ہوں میں
مَیں یہاں بھوکا ہوں، مجھ کو بھی دفینہ چاہیئے

دشمنوں کو ہی نہ کیجے قتل اِس تلوار سے
دوستوں کے واسطے بھی دل میں کینہ چاہیئے

سراج اختر



میں وہ دریا ہوں، چڑھا ہو جو اترنے کے لئے
جی رہا ہوں میں یہاں ہم زاد، مرنے کے لئے

چائے خانے کی نشستوں پہ جریدوں کے ورق
پیڑ سے پتے جھڑے، اڑنے بکھرنے کے لئے

ایک میں بمقابل وسعتِ آفاق میں
اور ساری طاقتیں گمراہ کرنے کے لئے

حافظہ ویران ہونے کے لئے آباد تھا
نام کچھ ہونٹوں پہ آئے تھے، ابھرنے کے لئے

کارخانوں کو چلے انبوہ در انبوہ لوگ
جانور نکلے چراگاہوں میں چرنے کے لئے

روشنی میں خوف کا احساس یکسر ہوتا نہیں
کر دیا ہے آف، ٹیبل لیمپ، ڈرنے کے لئے



چاروں طرف ہے خون کا دریا چڑھا ہوا
کشمیر، سرزمینِ مقدس، روڈیشیا

چائے کی پیالیوں سے اٹھے گی نئی مہک
بے برگ ٹہنیوں پہ نیا رنگ آئے گا

جینے کی اک امنگ جو کل تھی سو اب بھی ہے
مرنے کا وقت آج بھی ہے، کل بھی آئیگا

پتو! مجھے لپیٹ لو اپنی رداؤں میں
میں وہ درخت ہوں جسے کچھ بھی نہیں ملا

شیشوں کی طرح ٹوٹ گئیں شہ حقیقتیں
پتھر پگھل گئے بہنے لگا، انجماد کا

مراتب اختر



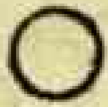
افق یہ بات سہی، پھر بھی کر دکھائیں گے
بلندیوں پہ پہنچ کر تجھے بلائیں گے

مجھے وہ وقت وہ لمحات یاد آئیں گے
یہ ننھے لان میں جب تتلیاں اڑائیں گے

کیا ہے عہد، اکیلے رہیں گے ہم دائم
بھری رہے۔ تیری دنیا میں ہم نہ آئیں گے

سموں کا راستہ تکتی رہیں گی سانولیاں
جو پنچھیوں کی طرح لوٹ کر نہ آئیں گے

مری قسم تجھے شہلا، نہ رو نہ ہو بیتاب
ترے زوال کے یہ دن بھی بیت جائیں گے



پہنچا ہوں آسماں پہ تجھے ڈھونڈتا ہوا
اے مختصر بسیط ستارے، قریب آ

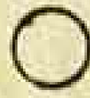
بکھرے ہوئے طلب کے تقاضے اِدھر اُدھر
کپڑے، گلاس، قہقہے، ساحل پہ جا بہ جا

بیٹا سنو! کہا یہ مجھے اک بزرگ نے
محدود کس قدر ہے یہ ٹکڑا زمین کا

ان بستیوں کے پار، اُدھر، دُور، اُس طرف
لرزاں ہے خوفِ مرگ سے انسان آج کا

پاگل سا ایک آدمی، کل دور تک مجھے
مڑ مڑ کے دیکھتا گیا، پہچانتا گیا

اختر امام رضوی



(نذرِ شکیب)

وہ خود تو مر ہی گیا تھا، مجھے بھی مار گیا
وہ اپنے روگ مری روح میں اتار گیا

سمندروں کی یہ شورش اسی کا ماتم ہے
جو خود تو ڈوب گیا، موج کو ابھار گیا

ہوا کے زخم کھلے تھے اداس چہرے پر
خزاں کے شہر سے کوئی تو پُربہار گیا

اندھیری رات کی پرچھائیوں میں ڈوب گیا
سحر کی کھوج میں جو بھی اُفق کے پار گیا

وہ روشنی کا مسافر، میں تیرگی کا دھواں
تو پھر بھلا وہ مجھے کس لیے پکار گیا

میں اپنے سوچ کے ہمزاد کا پجاری تھا
ترا جلال مری عاقبت سنوار گیا

احتشام امام رضوی



دل وہ پیاسا ہے کہ دریا کا تماشا دیکھے
اور پھر لہر نہ دیکھے، کفِ دریا دیکھے

میں ہر اک حال میں تھا گردشِ دوراں کا امیں
جس نے دنیا نہیں دیکھی مرا چہرہ دیکھے

اب بھی آتی ہے تری یاد پہ اس کرب کے ساتھ
ٹوٹتی نیند میں جیسے کوئی سپنا دیکھے

رنگ کی آنچ میں جلتا ہوا خوشبو کا بدن
آنکھ اُس پھول کی تصویر میں کیا کیا دیکھے

کوئی چوٹی نہیں اب تو مرے قد سے آگے
یہ زمانہ تو ابھی اور بھی اُونچا دیکھے

پھر وہی دھند میں لپٹا ہوا پیکر ہوگا
کون بے کار میں اُٹھتا ہوا پردہ دیکھے

ایک احساسِ ندامت سے لرز اٹھتا ہوں
جب رمِ موج مری وسعتِ صحرا دیکھے

اختر امام رضوی



ہر بُت یہاں ٹوٹے ہوئے پتھر کی طرح ہے
یہ شہر تو اُجڑے ہوئے مندر کی طرح ہے

میں تشنۂ دیدار کہ جھونکا ہوں ہوا کا
وہ جھیل میں اُترے ہوئے منظر کی طرح ہے

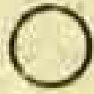
کم ظرف زمانے کی حقارت کا گلہ کیا
میں خوش ہوں، مرا پیار سمندر کی طرح ہے

اس چرخ کی تقدیس کبھی رات کو دیکھو
یہ قبر پہ پھیلی ہوئی چادر کی طرح ہے

میں سنگِ تہِ آب کی صورت ہوں جہاں میں
اور وقت بھی سوئے ہوئے ساگر کی طرح ہے

روتے ہیں بگولے مرے دامن سے لپٹ کر
صحرا بھی طبیعت میں مرے گھر کی طرح ہے

اشعار مرے درد کی خیرات ہیں اختر
اک شخص یہ کہتا تھا کہ غم زر کی طرح ہے



جو سنگ ہو کے ملائم ہے سادگی کی طرح
پگھل رہا ہے مرے دل میں چاندنی کی طرح

مجھے پکارو تو دیوار ہوں، سنو تو صدا
میں گونجتا ہوں فضاؤں میں خامشی کی طرح

میں اس کو نور کا پیکر کہوں کہ جانِ خیال
جو میرے دل پہ اُترتا ہے شاعری کی طرح

کسی کی یاد نے مہکا دیا ہے زخمِ طلب
صبا کے ہاتھ سے مسلی ہوئی کلی کی طرح

تھکا ہوا ہوں، کسی سایے کی تلاش میں ہوں
بچھڑ گیا ہوں ستاروں سے روشنی کی طرح

میں اپنے کرب میں غلطاں، وہ اپنے کیف میں گم
ہے اس کی جیت بھی میری شکست ہی کی طرح

خزاں کے زہر کا تریاق اگر نہیں یارو
گلوں کی بات ہے بے وقت راگنی کی طرح

اختر امام رضوی



دنیا بھی پیش آئی بہت بے رُخی کے ساتھ
ہم نے بھی زخم کھائے بڑی سادگی کے ساتھ

اک مشتِ خاک، آگ کا دریا، لہو کی لہر
کیا کیا روائتیں ہیں یہاں آدمی کے ساتھ

اپنوں کی چاہتوں نے بھی کیا کیا دیئے فریب
روتے رہے لپٹ کے ہر اک اجنبی کے ساتھ

جنگل کی دھوپ چھاؤں ہی جنگل کا حُسن ہے
سایوں کو بھی قبول کرو روشنی کے ساتھ

تم راستے کی گرد نہ ہو جاؤ تو کہو
دو چار گام چل کے تو دیکھو کسی کے ساتھ

کوئی دھواں اٹھا نہ کوئی روشنی ہوئی
جلتی رہی حیات بڑی خامشی کے ساتھ



جرمِ ہستی کی سزا کیوں نہیں دیتے مجھ کو
لوگ جینے کی دعا کیوں نہیں دیتے مجھ کو

صرصرِ خوں کے تصوّر سے لرزتے کیوں ہو
خاکِ صحرا ہوں، اُڑا کیوں نہیں دیتے مجھ کو

کیوں تکلّف ہے مرے نام پہ تعزیروں کا
میں بُرا ہوں تو بھلا کیوں نہیں دیتے مجھ کو

اب تمہارے لیے خود اپنا تماشائی ہوں
دوستو، دادِ وفا کیوں نہیں دیتے مجھ کو

میں مسافر ہی سہی رات کی خاموشی کا
تم سحر ہو تو صدا کیوں نہیں دیتے مجھ کو

جنسِ بازار کی صورت ہوں جہاں میں اختر
لوگ شیشوں میں سجا کیوں نہیں دیتے مجھ کو

اختر امام رضوی



اشک جب دیدۂ تر سے نکلا
ایک کانٹا سا جگر سے نکلا

پھر نہ میں رات گئے تک لوٹا
ڈوبتی شام جو گھر سے نکلا

ایک میّت کی طرح لگتا تھا
چاند جب قیدِ سحر سے نکلا

مجھ کو منزل بھی نہ پہچان سکی
میں کہ جب گردِ سفر سے نکلا

ہائے دنیا نے اسے اشک کہا
خون جو زخمِ نظر سے نکلا

اک اماوس کا نعیبا ہوں میں
آج یہ چاند کدھر سے نکلا

جب اُڑا جانبِ منزل اختؔر
ایک شعلہ مرے پَر سے نکلا



چاندنی کے ہاتھ بھی جب ہو گئے شل رات کو
اپنے سینے پر سنبھالا میں نے بوجھل رات کو

رات بھر چھایا رہا گھر کی فضا پر اک ہراس
دستکیں دیتا تھا در پر کوئی پاگل رات کو

چاندنی میں گھُل گیا جب دل کی مایوسی کا زہر
میں نے خود کفنا دیا سایوں میں کومل رات کو

کرب کے لاوے اُبلتے تھے سکوں کے آس پاس
اُف وہ نیندیں، وہ گراں خوابی کی دلدل رات کو

آج پھر دھندلا گئی اختؔر مری شامِ فراق
سوچتا ہوں، آج پھر برسیں گے بادل رات کو

اختر امام رضوی



اپنا دکھ اپنا ہے پیارے، غیر کو کیوں الجھاؤ گے
اپنے دُکھ میں پاگل ہو کر اب کس کو سمجھاؤ گے

درد کے صحرا میں لاکھوں اُمید کے لاشے گلتے ہیں
ایک ذرا سے دامن میں تم کس کس کو کفناؤ گے

توڑ بھی دو احساس کے رشتے، چھوڑ بھی دو دکھ اپنانے
رو رو کے جیون کاٹو گے، رو رو کے مر جاؤ گے

راز کی بات کو خاموشی کا زہر سمجھ کر پی جانا
کہنے سے بھی رہ نہ سکو گے، کہہ کر بھی پچھتاؤ گے

آج یہاں پردوں سے اُدھر عریانی ہی عریانی ہے
تم بھی ننگے ہو کر ناچو، یوں کب تک شرماؤ گے



جیتے جی دکھ سکھ کے لمحے آتے جاتے رہتے ہیں
ہم تو ذرا سی بات پہ پہروں اشک بہاتے رہتے ہیں

وہ اپنے ماتھے پر جھوٹے روگ سجا کر پھرتے ہیں
ہم اپنی آنکھوں کے جلتے زخم چھپاتے رہتے ہیں

سورج سے پیکر کیسے ترشے، سورج کا انت نرالا ہے
خاک پہ بیٹھے آڑے ترچھے نقش بناتے رہتے ہیں

ساحل ساحل دار سجے ہیں، موج موج زنجیریں ہیں
ڈوبنے والے دریا دریا جشن مناتے رہتے ہیں

اختر اب انصاف کی آنکھیں زر کی کھنک سے کھلتی ہیں
ہم پاگل ہیں، لوہے کی زنجیر ہلاتے رہتے ہیں

نثار ناسک



کس بھروسے پہ نکلتا گھر سے باہر میں اکیلا
چار سُو اُٹھے ہوئے ہاتھوں میں پتھر میں اکیلا

مصلحت زادوں کی ناؤ ساحلوں پر جا لگی ہے
رہ گیا سیلاب میں پسرِ پیمبر، میں اکیلا

میرے پرچم پہ مری رسوائی کی تحریر ہے
دشمنوں سے جا ملا ہے میرا لشکر، میں اکیلا

میں یہ کس کوُئے ہراساں میں ہوں تصویرِ سوال
سب کھڑے ہیں اپنے ہی سایوں سے لگ کر میں اکیلا

صحن میں آہٹ ہے کوئی اور نہ چھت پر چاپ ہے
شام ہے اور بے دلی کی سیڑھیوں پر میں اکیلا

مجھ سے باہر زندگی، آزادیاں، آبادیاں
اور اِس تاریک سے کمرے کے اندر میں اکیلا

سب کے اعمالوں کی ناسک! لگ چکی ہیں قیمتیں
رہ گیا ہوں اب سرِ بازارِ محشر میں اکیلا



شاعری میری تپسیا، لفظ ہے برگد مرا
یہ زمیں ساری زمیں، مشفق زمیں، معبد مرا

میں گیا کی روشنی ہوں، میں حرا کا نور ہوں
تو فنا کے ہاتھ سے کیوں ناپتا ہے قد مرا

دھیان کے گونگے سفر سے بھی نکل جاؤں مگر
راستہ روکے کھڑی ہے سانس کی سرحد مرا

عمر بھر سورج تھا سر پر، دھوپ تھی میرا لباس
اب یہ خواہش ہے، گھنی چھاؤں میں ہو مرقد مرا

کہہ دیا تھا، میں پرانی سوچ کا شجرہ نہیں
آج تک منہ دیکھتے ہیں میرے خال و خد مرا

مجھ سے آگے بھی ہیں کچھ تازہ صداؤں کے علم
میں ظفر[1] کا لاڈلا ہوں پیش رو امجد[2] مرا

[1] ظفر اقبال
[2] مجید امجد

نثار ناسک



مجھے سنبھال، مرا ہاتھ تھام کر لے جا
تھکا ہُوا ہوں کئی دن کا، مجھ کو گھر لے جا

گرفتِ گل سے نکل کر بکھرتا جاتا ہوں
مجھے ہوا کے پروں میں سمیٹ کر لے جا

جہاں سے مانگ مرے نام پر حیات کی بھیک
تو میرا کاسۂ احساس در بدر لے جا

جہانِ پست کو پھر دیکھنے کی خواہش ہے
شعورِ غم! مجھے غم کے پہاڑ پر لے جا

اب اس سے آگے ہر اک موڑ پر اندھیرا ہے
تو اپنے ساتھ مرے پیار کی سحر لے جا

تُو جس کی راہ میں رویا ہے عمر بھر ناسکؔ
وہ صبح راکھ ہُوئی، اپنی جھولی بھر لے، جا



آدھی آدھی رات تک سڑکوں کے چکر کاٹیے
شاعری بھی اک سزا ہے، زندگی بھر کاٹیے

شب گئے بیدار لوگوں کو جگانا ظلم ہے
آپ ہی مظلوم بنیے، رات باہر کاٹیے

جال کے اندر بھی میں تڑپوں گا چیخوں گا ضرور
مجھ سے خائف ہیں تو میری سوچ کے پر کاٹیے

کوئی تو ہو جس سے اُس ظالم کی باتیں کیجیے
چودھویں کا چاند ہو تو رات چھت پر کاٹیے

رونے والی بات بھی ہو تو لطیفہ جانیے
عمر کے دن کاٹنے ہی ہیں تو ہنس کر کاٹیے

نثار ناسک



میری اپنائی ہوئی قدروں نے ہی نوچا مجھے
تُو نے کس تہذیب کے پتھر سے لا باندھا مجھے

میں نے ساحل پر جلا دیں مصلحت کی کشتیاں
اب کسی کی بے وفائی کا نہیں کھٹکا مجھے

دستِ پابستہ کھڑا ہوں پیاس کے صحراؤں میں
اے فراتِ زندگی تو نے یہ کیا بخشا مجھے

چند کرنیں جو مرے کاسے میں ہیں ان کے عوض
شب کے دروازے پہ بھی دینا پڑا پہرا مجھے

ساتھیو! تم ساحلوں پر چین سے سوئے رہو
لے ہی جائے گا کہیں بہتا ہوا دریا مجھے



یہ غم بھی ہے کہ تیرے پیار کا دعویٰ نہیں کرتا
خوشی بھی ہے کہ اپنے آپ سے دھوکا نہیں کرتا

اگر میں نے تجھے دنیا پہ قرباں کر دیا تو کیا
یہاں انسان جینے کے لیے کیا کیا نہیں کرتا

جو اُن سونے کی دہلیزوں پہ جا کر ختم ہوتی ہیں
میں ان گلیوں سے اب تیرا پتہ پوچھا نہیں کرتا

وہ جس پر تو نے دو دل ایک ناوک سے گزارے تھے
میں اب اُس پیڑ کے سائے میں بھی بیٹھا نہیں کرتا

میں اپنے آپ کو ڈھونڈوں گا اپنی شکل کے اندر
میں اپنی بے دلی کا آئینہ میلا نہیں کرتا

میں اپنے جسم کے ساحل پہ تیری آرزو لکھوں
یقیں ہو گر کہ پانی ریت سے گزرا نہیں کرتا

نثار ناسک



جو میرے دل میں فروزاں ہے شاعری کی طرح
میں اُس کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں نوکری کی طرح

جو میری ذات کا اظہار ہے' وہ لفظ ابھی
مرے لبوں پہ سسکتا ہے خامشی کی طرح

ہوا کا ساتھ نہ دے اس نگر برس کے گزر
میں بے حیات ہوں سُوکھی ہُوئی ندی کی طرح

تو لازوال ہے بے معنویتوں کی مثال
میں بے ثبات ہوں مانگی ہُوئی ہنسی کی طرح

نہ کوئی یاد ملی ہے نہ کوئی زخم بھرا
نثار! عمر کٹی ہے مسافری کی طرح



بجھ گئیں عقلوں کی آنکھیں گل گئے جذبوں کے پر
گھر کے پنجرے میں تڑپے ہیں پرندے رات بھر

جانے پھر کن دلدلوں سے آخری آواز دیں
اپنی بے منشور عمریں' اپنے بے منزل سفر

میرے باہر چار سُو مرتی صداؤں کا سراب
تو بکھرنا چاہتا ہے تو مرے اندر بکھر

تو کنول کی شکل میں پھوٹے گا اپنی ذات سے
جسم کی خواہش کے گہرے پانیوں میں بھی اُتر

پھر مری مٹی میں اپنی چاہتوں کو سونگھنا
پہلے میری سانس کے سنسان جنگل سے گزر

دل میں نا سکتا رہ گئی ہیں آرزو کی دو لویں
ایک خوش عادت سی لڑکی اور اک چھوٹا سا گھر

سرمد صہبائی



نیند سے جاگی ہوئی آنکھوں کو اندھا کر دیا
دُھند نے شفاف آئینوں کو دھندلا کر دیا

جوڑتا رہتا ہوں ٹوٹے رابطوں کا فاصلہ
مجھ کو لمحوں کے سرابوں نے اکیلا کر دیا

چیختا پھرتا ہے سڑکوں پر صداؤں کا ہجوم
کس خموشی نے گلی کوچوں کو بہرا کر دیا

ہر صدا ٹکرا کے بے حس خامشی سے گر پڑی
ہر صدا نے خامشی کو اور گہرا کر دیا

ہم نے پھر شفاف رستوں پر بچھائی آنکھ آنکھ
ہم نے پھر آئینۂ دل ریزہ ریزہ کر دیا

ہم نے پہنائے ہیں خواہش کو رگوں کے پیرہن
اُس نے مانگی بوند، ہم نے خون دریا کر دیا

شہر کی بے تاب گلیوں نے اُگل ڈالے ہیں لوگ
کس نے میرے شہر میں مُردوں کو زندہ کر دیا

جم گئے دیوار و در پر گونجتے لفظوں کے نقش
ایک ہنگامے نے سارا شہر گونگا کر دیا

آنکھ میں دھندلا گیا نکھرے ہوئے چہروں کا رنگ
جگمگاتے آئنوں کو کس نے میلا کر دیا

ایک اک چہرے پہ سرمدؔ پڑ گئی دُشک کی لکیر
جانے کس بد روح نے لوگوں پہ سایا کر دیا

نمونہ — ۱۵۶۷

سرمد صہبائی



مرنے کا پتہ دے، مرے جینے کا پتہ دے
اے بے خبری! کچھ مرے ہونے کا پتہ دے

اک دوسرے کی آہٹوں پہ چلتے ہیں سب لوگ
ہے کوئی یہاں، جو مجھے رستے کا پتہ دے

خود آپ سے بچھڑا ہوں میں اس اندھے سفر میں
اے تیرگیٔ شب، مرے سائے کا پتہ دے

اس آس پہ ہر آئینے کو جوڑ رہا ہوں
شاید کوئی ریزہ مرے چہرے کا پتہ دے

گزری ہے مری عمر سرابوں کے سفر میں
اے ریگِ رواں، اب کسی چشمے کا پتہ دے

ہر پل کسی آہٹ پہ مرے کان لگے ہیں
جیسے ابھی کوئی ترے آنے کا پتہ دے

بکھرا ہوا ہوں صدیوں کی بے انت تہوں میں
مجھ کو کوئی کھوئے ہوئے لمحے کا پتہ دے

دہلیز دلاسا ہے نہ دیوار اماں ہے
اے دربدری، میرے ٹھکانے کا پتہ دے

ہوں قیدِ حصارِ رگِ گرداب میں سرمد
کوئی نہیں جو مجھ کو کنارے کا پتہ دے

سرمد صہبائی



کسی شخص کی تلاش میں سر پھوڑتی رہی
سنسان جنگلوں میں ہوا چیختی رہی

ماتھے پہ دھول، ہاتھ میں کانٹے لیے حیات
صحرا سے خوشبوؤں کا پتہ پوچھتی رہی

دل بجھ گیا تو رات کی صورت تھی زندگی
جب تک یہ اک چراغ رہا، روشنی رہی

میں آج بھی نہ اُس سے کوئی بات کر سکا
لفظوں کے پتھروں میں تمنا دبی رہی

سنسان راستوں پہ بھٹکتی تھی چاندنی
شب بھر نہ جانے کس کے لیے جاگتی رہی

وہ پیڑ جو ہرا تھا بہاروں کے بعد بھی
حیرت سے اُس کو زرد ہوا دیکھتی رہی

سورج نہ کوئی میری گلی میں اُتر سکا
شب بھر مرے مکان کی کھڑکی کھلی رہی



روشنی رنگوں میں سمٹا ہوا دھوکا ہی نہ ہو
میں جسے جسم سمجھتا ہوں وہ سایا ہی نہ ہو

آئینہ ٹوٹ گیا، چنتا ہوں ریزہ ریزہ
اسی آئینے میں میرا کہیں چہرہ ہی نہ ہو

میں جو دیوار کے اِس پار رواں ہوں کب سے
کوئی دیوار کے اُس پار بھی چلتا ہی نہ ہو

وہ جو سُنتا ہے مری بات بڑے غور کے ساتھ
بعد جانے کے مرے مجھ پہ وہ ہنستا ہی نہ ہو

موڑ ہر راہ پہ، پاؤں سے لپٹ جاتے ہیں
وہ مجھے چھوڑ کے چل دے کہیں ایسا ہی نہ ہو

اُس کے ملنے پہ بھی محسوس ہوا ہے سرمد
اُس نے دیکھا ہی نہ ہو میں نے بلایا ہی نہ ہو

سرمد صہبائی



سر جھکا لیتا تھا پہلے جس کو اکثر دیکھ کر
آج پاگل ہو گیا اُس کو برابر دیکھ کر

خواہشوں میں بہہ گیا کمزور مٹی کا حصار
جسم قطرے میں سمٹ آیا سمندر دیکھ کر

سوچتا ہوں رات کے اندھے سفر کے موڑ پہ
چاند گھبرایا تو ہوگا خالی بستر دیکھ کر

آنکھ کھلتے ہی ہر اک لمحے میں میرا عکس تھا
میں بکھر جاتا ہوں اس کھڑکی کے باہر دیکھ کر

تو ہی اُترے گا خرابوں میں فرازِ عرش سے
ہم تو بے حس ہو چکے ہیں اب یہ منظر دیکھ کر

چاند نکلنے کی تمنا لے کے واپس آ گیا
دوسروں کے گھر کو اپنی چھت سے اُوپر دیکھ کر

اب تو مڑ کر بھی کسی آواز کو سنتا نہیں
جا بجا بکھرے ہوئے سڑکوں پہ پتھر دیکھ کر

مجھ کو سرمدؔ اپنی بھی پہچان تک باقی نہیں
شخص اک اپنے ہی جیسا اپنے اندر دیکھ کر



بے دلی میں بھی دل بڑا رکھنا
یہ دریچہ سدا کھُلا رکھنا

رات کے سحر میں ہے سارا نگر
اپنے گھر کا دیا جلا رکھنا

یہ گھڑی صبر آزما ہو گی
زندہ رہنے کا حوصلہ رکھنا

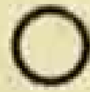
ساری خوشیاں وفا نہیں کرتیں
درد سے دل کو آشنا رکھنا

بھول کر بھی نہ دل پہ مَیل آئے
آئینہ یہ سدا دُھلا رکھنا

سینچ کر خوں سے ایک اک لمحہ
پیڑ بیت جھڑ میں بھی ہرا رکھنا

پھل کبھی تو کھلائے گی یہ ہوا
اپنی نیت کا آسرا رکھنا

خاقان خاور



مہر بن کر جو میں اک روز بھی اُبھرا ہوتا
برف کی طرح ہے جو شخص، وہ دریا ہوتا

تجھ سے دلکش ہے کہیں، تیرے تصوّر کا جہاں
تو مرے پاس بھی ہوتا تو میں تنہا ہوتا

اپنے ماحول کو ہر پھول نے مہکایا ہے
مجھ کو ہونا تھا کسی کا، تو میں اپنا ہوتا

پوچھتا کون ہے سیپی میں چھپے موتی کو
جو ترے دل میں تھا، ہونٹوں پہ بھی آیا ہوتا

کس نے رکھا ہے مرے سر پہ کڑی دھوپ میں ہاتھ
چھت جو ہوتی تو مرے گھر میں بھی سایا ہوتا

یوں گزرتا نہ ترے سر سے یہ پانی خاور
تو نے طوفان کو اُٹھتے ہی جو روکا ہوتا

خاقان خاور



بار بار ایک ہی نظارہ نہ دکھلایا کر
بات دلکش بھی اگر ہو، تو نہ دُہرایا کر

لوگ گِر جاتے ہیں مٹی کے گھروندوں کی طرح
اس طرح بارشِ دیدار نہ برسایا کر

پیڑ کا سایا نہیں، ٹوٹا ہُوا پتّہ ہوں
مجھ کو جذبات کے دریا میں نہ ٹھہرایا کر

ٹوٹ جائے نہ کسی روز ترا شیش محل
یوں سرِ راہ نہ دیوانوں کو سمجھایا کر

میرے احساس کو اک پھول بہت ہے خاور
میرے احساس پہ یوں سنگ نہ برسایا کر



چپ سے اس وشت میں ظلمت کا سماں ہے
پتھرائی ہُوئی آنکھ میں شعلہ بھی کہاں ہے

سوکھے ہُوئے پتّوں کو جو روندو تو صدا دیں
پِستے ہُوئے انسان کے منہ میں تو زباں ہے

عظمت کی بلندی پہ میں جس سمت گیا ہوں
دیکھا ہے، ترے پاؤں کا پہلے ہی نشاں ہے

آندھی جو چلی، ساتھ اُڑا لے گئی سب کو
کیا جانیے اس دشت میں اب کون کہاں ہے

روکیں بھی تو خاورؔ اسے روکا نہیں جاتا
جھونکے پہ مجھے عمرِ گریزاں کا گماں ہے



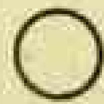
میلوں میں پھیلتے گئے پودے کپاس کے
محتاج کتنے لوگ ہیں پھر بھی لباس کے

کیا کیا نہ ڈوبتے رہے اوروں کی ذات میں
کیا کیا مظاہرے نہ کیے ہم نے پیاس کے

ہر آدمی کو رنگ سے ہے ان دنوں غرض
قصّے پرانے ہو گئے پھولوں کی باس کے

خاورؔ کہیں ہَوا کا، نہ ہے دھوپ کا گذر
اُونچے ہیں سب مکان مِرے آس پاس کے

امجد اسلام امجد



دامِ خوشبو میں گرفتار صبا ہے کب سے
لفظ اظہار کی اُلجھن میں پڑا ہے کب سے

اے کڑی چپ کے در و بام سجانے والے
منتظر کوئی سرِ کوہِ ندا ہے کب سے

کور چشموں کے لیے آئینہ خانہ، معلوم!
ورنہ ہر ذرہ ترا عکس نما ہے کب سے

دیکھیے، خون کی برسات کہاں ہوتی ہے
شہر پر چھائی ہوئی سرخ گھٹا ہے کب سے

چاند بھی میری طرح حسن شناسا نکلا
اس کی دیوار پہ حیران کھڑا ہے کب سے

بات کرتا ہوں تو لفظوں سے مہک آتی ہے
کوئی انفاس کے پردے میں چھپا ہے کب سے

شعبدہ بازیٔ آئینۂ احساس، نہ پوچھ
حیرتِ چشم وہی شوخ قبا ہے کب سے

کھوج میں کس کی بھرا شہر لگا ہے امجدؔ
ڈھونڈتی کس کو سرِ دشت، ہوا ہے کب سے



رات مَیں اس کشمکش میں ایک پل سویا نہیں
کل مَیں جب جانے لگا تو اس نے کیوں روکا نہیں

یوں اگر سوچوں تو اک نقش ہے سینے پہ نقش
ہائے وہ چہرہ کہ پھر بھی آنکھ میں بنتا نہیں

کیوں اُڑاتی پھر رہی ہے در بدر مجھ کو ہوا
میں اگر اک شاخ سے ٹوٹا ہوا پتا نہیں

آج تنہا ہوں تو کتنا اجنبی ماحول ہے
ایک بھی رستے نے تیرے شہر میں روکا نہیں

حرف برگِ خشک بن کر ٹوٹتے گرتے رہے
غنچۂ عرضِ تمنا ہونٹ پر پھوٹا نہیں

درد کا رستہ ہے یا ہے ساعتِ روزِ حساب
سینکڑوں لوگوں کو روکا، ایک بھی ٹھہرا نہیں

شبنمی آنکھوں کے جگنو، کانپتے ہونٹوں کے پھول!
ایک لمحہ تھا جو امجد آج تک گزرا نہیں



اوروں کا تھا بیان تو موجِ صدا رہے
خود عمر بھر اسیرِ لبِ مدعا رہے

مثلِ حباب، بحرِ غمِ حادثات میں
ہم زیرِ بارِ منتِ آب و ہوا رہے

ہم اس سے اپنی بات کا مانگیں اگر جواب
لہروں کا پیچ و خم وہ کھڑا دیکھتا رہے

آیا تو اپنی آنکھ بھی اپنی نہ بن سکی
ہم سوچتے تھے، اس سے کبھی سامنا رہے

ق
گلشن میں تھے تو رونقِ رنگِ چمن بنے
جنگل میں ہم امانتِ بادِ صبا رہے

سُرخی بنے تو خونِ شہیداں کا رنگ تھے
روشن ہوئے تو مشعلِ راہِ بقا رہے

امجد درِ نگار پہ دستک ہی دیجیے
اس بیکراں سکوت میں کچھ غلغلا رہے

تشہیر اپنے درد کی ہر سو کرائیے
جی چاہتا ہے، منتِ طفلاں اٹھائیے

خوشبو کا ہاتھ تھام کے کیجیے تلاشِ رنگ
پاؤں کے نقش دیکھ کے رستہ بنائیے

پھر آج پتھروں سے ملاقات کیجیے
پھر آج سطحِ آب پہ چہرے بنائیے

ہر انکشاف درد کے پردے میں آئے گا
گر ہو سکے تو خود سے بھی خود کو چھپائیے

پھولوں کا راستہ نہیں یارو، مرا سفر
پاؤں عزیز ہیں تو ابھی لوٹ جائیے

کب تک حنا کے نام پہ دیتے رہیں لہو
کب تک نگارِ درد کو دلہن بنائیے

امجد متاعِ عمر! ذرا دیکھ بھال کے
ایسا نہ ہو کہ بعد میں آنسو بہائیے

امجد اسلام امجد



تیرا یہ لطف کسی زخم کا عنواں نہ ہو
یہ جو ساحل سا نظر آتا ہے طوفاں نہ ہو

کیا بلا شہر پہ ٹوٹی ہے، خدا خیر کرے
یوں سرِ شام کوئی دشت بھی ویراں نہ ہو

رنگ خوشبو سے جدا ہو تو بکھر جاتا ہے
دیکھنے والے، مرے حال پہ حیراں نہ ہو

بات بنتی ہے تو پھر آپ ہی بن جاتی ہے
اتنی مایوس مقدر سے، مری جاں، نہ ہو

سیکھ اس شہر میں جینے کا سلیقہ امجدؔ
کوئی مرتا ہے مرے، آپ کا نقصاں نہ ہو



جب بھی اس شخص کو دیکھا جائے
کچھ کہا جائے نہ سوچا جائے

دیدۂ کور ہے قریہ قریہ
آئینہ کس کو دکھایا جائے

دامنِ عہدِ وفا کیا تھامیں
دل ہی ہاتھوں سے جو نکلا جائے

دردمندوں سے تغافل کب تک
اس کو احساس دلایا جائے

کیا وہ اتنا ہی حسیں لگتا ہے
اس کو نزدیک سے دیکھا جائے

وہ کبھی سُر ہے، کبھی رنگ امجدؔ
اس کو کس نام سے ڈھونڈا جائے



یاد کے صحرا میں کچھ تو زندگی آئے نظر
سوچتا ہوں اب بنا لوں ریت سے ہی کوئی گھر

کس قدر یادیں اُبھر آئی ہیں تیرے نام سے
ایک پتھر پھینکنے سے پڑ گئے کتنے بھنور

وقت کے اندھے کنوئیں میں پل رہی ہے زندگی
اے مرے حسنِ تخیل، بام سے نیچے اُتر

تو اسیرِ آبروئے شیوۂ پندارِ حسن
میں گرفتارِ نگاہِ زندگیٔ مختصر

ضبط کے قریے میں امجد دیکھیے کیسے کٹے
سوچ کی سونی سڑک پر یاد کا لمبا سفر



کھیل اُس نے دکھا کے جادُو کے
میری سوچوں کے قافلے لُوٹے

یا تو دھڑکن ہی بند ہو جائے
یا یہ خاموشیٔ فضا ٹُوٹے

تم جہاں بھی ہو، میرے دل میں ہو
تم مرے پاس تھے تو ہر سُو تھے

نغمۂ گل کی باس آتی ہے
تار کس نے ہلائے خوشبُو کے

اُس کو لائیں تو ایک بات بھی ہے
ورنہ سب دوست، آشنا جھُوٹے

نخلِ اُمید سبز ہے امجد
لاکھ جھکڑ چلا گئے لُو کے

امجد اسلام امجد



سوچ کے گنبد میں اُبھری ٹوٹتی یادوں کی گونج
میری آہٹ سن کے جاگی سینکڑوں قدموں کی گونج

آنکھ میں بکھرا ہُوا ہے جاگتے خوابوں کا رنگ
کان میں سمٹی ہوئی ہے بھاگتے سایوں کی گونج

جانے کیا کیا دائرے بنتے ہیں میرے ذہن میں
کانپ اٹھتا ہوں میں سن کر ٹوٹتے شیشوں کی گونج

رنگ میں ڈوبا ہُوا ہے قریۂ چشمِ خیال
بام دور سے پھوٹتی ہے خوشنما چہروں کی گونج

جاتے جاتے آج امجدؔ پاؤں پتھر ہو گئے
ہاتھ پر میرے گری جب نرگسی آنکھوں کی گونج



بند تھا دروازہ بھی اور گھر میں بھی تنہا تھا میں
وہم تھا جانے مرا یا آپ ہی بولا تھا میں

یاد ہے اب تک مجھے وہ بدحواسی کا سماں
تیرے پہلے خط کو گھنٹوں چومتا رہتا تھا میں

راستوں پر تیرگی کی یہ فراوانی نہ تھی
اس سے پہلے بھی تمہارے شہر میں آیا تھا میں

میری انگلی پر ہیں اب تک میرے دانتوں کے نشاں
خواب ہی لگتا ہے پھر بھی جس جگہ بیٹھا تھا میں

آج امجدؔ وہم ہے میرے لیے جس کا وجود
کل اُسی کا ہاتھ تھامے گھومتا پھرتا تھا میں

عدیم ہاشمی



میرے رستے میں بھی اشجار اگایا کیجے
میں بھی انساں ہوں، مرے سر پہ بھی سایا کیجے

رات دن راہ میں آنکھیں نہ بچھایا کیجے
روشنی میں تو چراغوں کو بجھایا کیجے

آپ اتنا تو مرے واسطے کر سکتے ہیں
آپ اُس شخص کی باتیں ہی سنایا کیجے

ہاتھ میں جو ہے بہار، اس کو تو آنے دیجے
کاغذوں پر تو ہرے پیڑ بنایا کیجے

راستے دھوپ سے پگھلے ہی چلے جاتے ہیں
آپ بادل ہیں تو پھر شہر پہ سایا کیجے

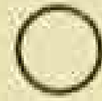
قیدِ تنہائی میں کیا آئے گی کوئی آواز
بیٹھ کر اپنی ہی زنجیر ہلایا کیجے

جا چکا شہر سے وہ، اپنی اداسی لے کر
عمر بھر اب در و دیوار سجایا کیجے

لیجئے ٹوٹ گیا دم وہ صداؤں کا ڈسا
چیخئے اب کہ یہاں شور مچایا کیجے

پھول کھلتے ہیں کہاں خشک چٹانوں میں عدیم
راہ کے سنگ ہی آنکھوں سے لگایا کیجے

عدیم ہاشمی



شور سا ایک، ہر اک سمت بپا لگتا ہے
وہ خموشی ہے کہ لمحہ بھی صدا لگتا ہے
کتنا ساکت نظر آتا ہے ہواؤں کا بدن
شاخ پر پھول بھی پتھرایا ہوا لگتا ہے
چیخ اٹھتی ہوئی ہر گھر سے نظر آتی ہے
ہر مکاں شہر کا، آسیب زدہ لگتا ہے
آنکھ ہر راہ سے چپکی ہی چلی جاتی ہے
دل کو ہر موڑ پہ کچھ کھویا ہوا لگتا ہے
کتنا حاسد ہوں کہ اک تو ہی مرا اپنا ہے
اور تو ٹھیک سے ہنستا بھی بُرا لگتا ہے
میرے احساس نے ساون میں گنوائی ہے نظر
مجھکو سُوکھا ہوا جنگل بھی ہرا لگتا ہے
سوچتا ہوں تو ہر انسان پرانی صُورت
دیکھتا ہوں تو ہر اک شخص نیا لگتا ہے
اپنا احساس کہ رہتا ہوں کھنڈر میں جیسے
شہر اپنا کہ زمینوں میں دبا لگتا ہے
دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں فقط اک شب کی پناہ
صاف انکار ہر اک در پہ لکھا لگتا ہے
جان تو کس کے لیے اپنی گنواتا ہے عدیم
خوبصورت ہے وہ لیکن ترا کیا لگتا ہے

عدیم ہاشمی

○

تعلق اپنی جگہ تجھ سے برقرار بھی ہے
مگر یہ کیا کہ ترے قرب سے فرار بھی ہے

گزیدہ اور زمیں، موسموں کے متلاشی!
یہیں کہیں مری کھوئی ہوئی بہار بھی ہے

یہی نہ ہو تری منزل ذرا ٹھہر اے دل
وہی مکاں ہے، دیوں کی وہی قطار بھی ہے

یونہی تو روح نہیں توڑتی حصارِ بدن
ضرور اپنا کوئی بادلوں کے پار بھی ہے

میں پتھروں سے ہی سر کو پٹخ کے لوٹ آیا
چٹان کہتی رہی مجھ میں شاہکار بھی ہے

یہ کیا کہ روک کے بیٹھا ہوا ہوں سیلِ ہوس
مچان پر بھی ہوں اور سامنے شکار بھی ہے

چھپا ہوا بھی ہوں جینے کی آرزو ہے کہ
پناہ گاہ مری، شیر کی کچھار بھی ہے

عدیمؔ اس سے کرے دل بھی تو کس طرح کا سلوک
حریف بھی ہے وہ اپنا، وہ اپنا یار بھی ہے

○

رختِ سفر یونہی تو نہ بیکار لے چلو
رستہ ہے دھوپ کا، کوئی دیوار لے چلو

طاقت نہیں زباں میں تو لکھ ہی لو دل کی بات
کوئی تو ساتھ صورتِ اظہار لے چلو

دیکھوں تو وہ بدل کے بھلا کیسا ہو گیا
مجھ کو بھی اس کے سامنے اک بار لے چلو

کب تک ندی کی تہہ میں اتارو گے کشتیاں
اب کے تو ہاتھ میں کوئی پتوار لے چلو

پڑتی ہیں دل پہ غم کی اگر سلوٹیں تو کیا
چہرے پہ تو خوشی کے کچھ آثار لے چلو

جتنے بھنور کہو گے، پہن لوں گا جسم پر
اک بار تو ندی کے مجھے پار لے چلو

کچھ بھی نہیں اگر تو ہتھیلی پہ جاں سہی
تحفہ کوئی تو اس کے لیے یار لے چلو

جنگل میں آئے گا کوئی گاہک کہاں عدیمؔ
بکتا ہے گر تو ساتھ خریدار لے چلو

عدیم ہاشمی



غم کے ہر اک رنگ سے مجھ کو شناسا کر گیا
وہ مرا محسن، مجھے پتھر سے ہیرا کر گیا

گھومتا تھا میں خلا میں تو سجی تھیں محفلیں
میرا آنکھوں کا جھپکنا، مجھ کو تنہا کر گیا

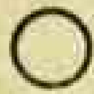
ہر طرف اُڑنے لگا تاریک سایوں کا غبار
شام کا جھونکا، چمکتا شہر میلا کر گیا

چاٹ لی کرنوں نے میرے جسم کی ساری مٹھاس
میں سمندر تھا، وہ سورج مجھ کو صحرا کر گیا

ایک لمحے میں بھرے بازار سونے ہو گئے
ایک چہرہ سب پرانے زخم تازہ کر گیا

میں اسی کے رابطے میں جس طرح ملبوس تھا
یوں وہ دامن کھینچ کر مجھ کو برہنہ کر گیا

رات بھر ہم روشنی کی آس میں جاگے عدیم
اور دن آیا تو آنکھوں میں اندھیرا کر گیا



فاصلے ایسے بھی ہوں گے، یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا

آنکھ کا دھوکا کہوں اس کو کہ سائے کا وجود
میں اسے محسوس کر سکتا تھا چھو سکتا نہ تھا

خود چڑھا رکھے تھے تن پر اجنبیت کے غلاف
ورنہ کب اک دوسرے کو ہم نے پہچانا نہ تھا

رات بھر پچھلی سی آہٹ کان میں آتی رہی
جھانک کر دیکھا گلی میں، کوئی بھی پھرتا نہ تھا

یہ سبھی ویرانیاں اس کے جدا ہونے سے تھیں
آنکھ دھندلائی ہوئی تھی، شہر دھندلایا نہ تھا

سینکڑوں طوفان لفظوں کے دبے تھے زیرِ لب
ایک پتھر تھا خموشی کا کہ جو ہٹتا نہ تھا

یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی تھی عدیم
اب سوائے بھول جانے کے کوئی چارہ نہ تھا

عدیم ہاشمی



آغوشِ ستم میں ہی چھپا لے کوئی آکر
تنہا تو تڑپنے سے بچا لے کوئی آکر

صحرا میں اُگا ہوں کہ مری چھاؤں کوئی پائے
ہلتا ہوں کہ پتوں کی ہوا لے کوئی آکر

بکتا تو نہیں ہوں، نہ مرے دام بہت ہیں
رستے میں پڑا ہوں کہ اٹھا لے کوئی آکر

کشتی ہوں، مجھے کوئی کنارے سے تو کھولے
طوفاں کے ہی کر جائے حوالے کوئی آکر

جب کھینچ لیا ہے مجھے میدانِ ستم میں
دل کھول کے حسرت بھی نکالے کوئی آکر

دو چار خراشوں سے ہو تسکینِ جفا کیا
شیشہ ہوں تو پتھر پہ اچھالے کوئی آکر

میرے کسی احسان کا بدلہ نہ چکائے
اپنی ہی وفاؤں کا صلہ لے کوئی آکر

اتنا تو ہو، پتھرائے ہوئے اشک پگھل جائیں
اپنا ہی مجھے درد سنا لے کوئی آکر

ہر سر ہے یہاں زخم، ہر اک ہاتھ ہے پتھر
اس شہر میں کس کس کو سنبھالے کوئی آکر

گر جائیں نہ جاگی ہوئی راتیں مرے سر سے
تھوڑا سا تو یہ بوجھ اٹھا لے کوئی آکر

سر کو نہ عدیم آ کے کوئی شخص سنبھالے
دیوار ہی گرنے سے بچا لے کوئی آکر



ایسا بھی نہیں، اس سے ملا دے کوئی آکر
کیسا ہے وہ، اتنا تو بتا دے کوئی آکر

یہ بھی تو کسی ماں کا دلارا کوئی ہوگا
اس قبر پہ بھی پھول چڑھا دے کوئی آکر

سوکھی ہیں بڑی دیر سے پلکوں کی زبانیں
بس آج تو جی بھر کے رلا دے کوئی آکر

برسوں کی دعا پھر نہ کہیں خاک میں مل جائے
یہ ابر بھی آندھی نہ اڑا دے کوئی آکر

یہ کوہ، یہ سبزہ، یہ مچلتی ہوئی ندیاں
مر جاؤں جو منزل کا پتا دے کوئی آکر

ہر گھر پہ ہے آواز، ہر اک در پہ ہے دستک
بیٹھا ہوں کہ مجھ کو بھی صدا دے کوئی آکر

اس خواہشِ ناکام کا خوں بھی مرے سر ہے
زندہ ہوں کہ اس کی بھی سزا دے کوئی آکر

عدیم ہاشمی



میں گفتگو ہوں کہ تحریر کے جہان میں ہوں
مجھے سمجھ تو سہی، میں تری زبان میں ہوں

خود اپنی سانس کہ رکتی ہے اپنے چلنے سے
یہ کیا گھٹن ہے! میں کس تنگ سے مکان میں ہوں

جلا رہا ہے مرے جسم کو مرا ہی کمال
میں ایک تیر ہوں، ٹوٹی ہوئی کمان میں ہوں

گزر رہی ہے مرے سر سے گاہکوں کی نگاہ
ذرا سی چیز ہوں لیکن بڑی دکان میں ہوں

مرے قریب سے گزرا نہیں ہے سنگ تراش
مجسمہ ہوں میں، اب تک مگر چٹان میں ہوں

مجھی میں گونج رہی ہے مرے سخن کی صدا
نوائے گم ہوں میں، دشتِ بے زبان میں ہوں

عدیم بیٹھا ہوا ہوں پروں کے ڈھیر پہ میں
خوش اس طرح ہوں کہ جیسے کسی اڑان میں ہوں



لوگوں کے درد، اپنی پشیمانیاں ملیں
ہم شاہِ غم تھے، ہمکو یہی رانیاں ملیں

صحراؤں میں بھی جا کے نظر آئے سیلِ آب
دریا سے دور بھی ہمیں طغیانیاں ملیں

آیا نہ پھر وہ دور کہ جی بھر کے کھیلئے
بچپن کے بعد پھر نہ وہ نادانیاں ملیں

رہ کر الگ بھی ساتھ رہا ہے کوئی خیال
تنہائی میں بھی خود پہ نگہبانیاں ملیں

پانی کے ساتھ عکس بھی بہہ کر چلے گئے
سوکھی ندی تو پھر وہی ویرانیاں ملیں

اپنی ہی آنکھ پہ گئے لمحوں کا بوجھ تھا
اس کی نظر میں تو وہی جولانیاں ملیں

بیٹھا رہا ہُمائے ستم سر پہ ہی عدیم
ہر دشتِ کرب کی ہمیں سلطانیاں ملیں

خالد شیرازی



جو مرے دل میں ہے، لوگوں سے چھپاؤں کس طرح
کانچ کے اس شہر کو، خالدؔ، بچاؤں کس طرح

تُو تو پہلے سے بھی اب معصوم ہے میرے لیے
میں تری عزت کو مٹی میں ملاؤں کس طرح

اپنا پیکر بھی مجھے زنداں نظر آنے لگا
کشمکش میں ہوں، رہائی خود سے پاؤں کس طرح

میں کسی کے عدل کی ٹوٹی ہوئی زنجیر ہوں
مجھ پہ جو بیتی ہے، دنیا کو بتاؤں کس طرح

دیکھ کر عکسِ مقابل، جسم پتھر ہو گیا
چھوڑ کر اب آئینہ خانے کو جاؤں کس طرح

جاگتے لمحوں کی زنجیروں میں ہوں جکڑا ہوا
خواب کی دیوار کے سائے میں آؤں کس طرح

رتجگوں کے شہر میں جا کر اُسے کیا ہو گیا
وہ تو کہتا تھا کہ میں تجھ کو بھلاؤں کس طرح

خالد شیرازی



نہیں ضرور کہ تکمیلِ مدعا دیکھیں
مگر ہے جی میں کہ خونِ جگر بہا دیکھیں

نقوشِ پا، جو ہوئے جا رہے ہیں گرد، انہیں
تھکاوٹوں سے شرابور لوگ کیا دیکھیں

یہ کیا سفر ہے کہ سیدھے سپاٹ رستے ہیں
کبھی تو ہم کوئی پُر پیچ راستا دیکھیں

فصیلِ شب سے اُدھر دے رہا ہو کوئی صدا
حصارِ خواب میں لیکن مجھے گھرا دیکھیں

فضا میں تیر رہے ہوں ہرے بھرے چہرے
خود اپنے چہرے کو لیکن بجھا ہوا دیکھیں

سفر میں شل ہوئے جاتے ہوں دھوپ کے پاؤں
افق کی آنکھ سے بہتی ہوئی حنا دیکھیں

طلوعِ مہر سے پہلے بس ایک پل کے لیے
کسی دیے کی طرح ہم بھی جھلملا دیکھیں

یہ دن بھی خالدِ شیراز دیکھنے تھے ہمیں
نظر اٹھائیں تو پت جھڑ کا سلسلہ دیکھیں

خالد شیرازی



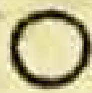
نت نئی خوش فہمیوں میں مبتلا رکھتا ہوں میں
خلق کے ہاتھوں کو مصروفِ دعا رکھتا ہوں میں

خشک دھرتی کو عطا کرتا ہوں سایہ ابر کا
قطرۂ باراں پہ دریا کی بنا رکھتا ہوں میں

ڈھونڈ ہی لیتی ہے مجھکو ڈھونڈنے والی نظر
اپنے سائے کو اگرچہ لاپتہ رکھتا ہوں میں

کیوں بھلا آسودگی میرے مقدر میں نہیں؟
کس لئے دن رات خود کو جاگتا رکھتا ہوں میں

پھونکتا رہتا ہوں بحرِ لفظ میں، خالد، فسوں
موجِ معنیٰ کو تلاطم آشنا رکھتا ہوں میں



پکارا نت نئے محور بدلنے والوں نے
پلٹ کے دیکھا نہ لیکن سنبھلنے والوں نے

کیا نہ ایک بھی پل کے لئے قیام کہیں
زمیں کی خاک پہ صدیوں سے چلنے والوں نے

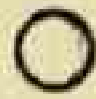
نظر سے آئی صدائے شکستِ خواہشِ قرب
بڑھائے ہاتھ اگر ہات ملنے والوں نے

قبول کر لیا ہر دائرے کی دعوت کو
حصارِ جبر سے باہر نکلنے والوں نے

مرے وجود کے خورشید کی شعاعوں کو
سُلا دیا ہے اندھیروں میں، جلنے والوں نے

وہ خوف کیا تھا، کہ جس کے نزول پر خالد
کہا نہ کچھ بھی بہت کچھ اگلنے والوں نے

خالد شیرازی



جب شاخِ گل چٹخ کے گری راز کی طرح
خوشبو کا دل لرز اٹھا، آواز کی طرح

وہ دھول، جس کو دی نہ کسی شہر نے اماں
لپٹی ہوئی ہے پاؤں سے، دمساز کی طرح

اتنا حواس گیر تھا سورج کا اضطراب
منظر بدل گئے، ترے انداز کی طرح

پاؤں تلے زمیں نہیں ـــ لیکن خلاؤں سے
رشتہ بڑھا رہا ہوں رگِ ساز کی طرح

اس منجمد سکوت میں، خالد، مری صدا
بکھرا گئی ہے حسرتِ پرواز کی طرح



کھل اُٹھے پھول، مہک مجھ کو ہوا سے آئی
ابر کے روپ میں بلقیس، سبا سے آئی

کان کے ساتھ کھلی آنکھ کی پتلی، لیکن
کوئی تصویر ابھر کے نہ صدا سے آئی

ریگِ ساحل کی تب و تاب کی دشمن ٹھہری
لہر جو بھی پسِ دیوارِ ہوا سے آئی

دائمی کر لیا اُس کو، کہ سرِ عرصۂ شب
دل کو جو ساعتِ غم دینے دلاسے آئی

جو تمنا کبھی آئی نہ تھی لب پہ خالد
آج خوش ہو کے رہی دیدۂ وا سے آئی

○

کہتی ہوئی یہ مجھ سے ہوائے سحر گئی
دشتِ طلب میں شبنمِ احساس مر گئی

رکھا نہ تھا قدم ابھی دشتِ سکوت میں
آواز میری اپنے ہی سائے سے ڈر گئی

میں اس کا نو حرین کے اندھیرے میں گھل گیا
وہ اک کرن جو میرے لئے در بدر گئی

میں لکھ رہا تھا پھول کی پتی پہ تیرا نام
کانٹے کی نوک سینۂ گل میں اُتر گئی

محفل میں رات نت نئے چہروں کے شور میں
وہ کون تھا، کہ جس سے پلٹنے نظر گئی

جس سے تھی آبروئے تلاطم، وہ موج بھی
خالدؔ کنارِ خاک پہ سر رکھ کے مر گئی

○

میری تخلیق ہوئی جس کی گمِ تاز کے ساتھ
وہی ذرّہ مجھے تکتا ہے بڑے ناز کے ساتھ

جُرم کے بعد کھلا دل پہ درِ خوفِ سزا
ذہن بیدار ہوا صبح کے آغاز کے ساتھ

میں نے بھی توڑ دیا خاک کی خوشبو کا طلسم
کھو گیا میں بھی خلاؤں میں ترے راز کے ساتھ

پھر مری راہ میں حائل ہے وہی کوہِ سکوت
میں نے کاٹا تھا جسے تیشۂ آواز کے ساتھ

ڈھونڈتی پھرتی ہے کردار کو تمثیلِ کُہنہ
رتجگے ختم ہوئے خالدؔ شیراز کے ساتھ

خالد شیرازی



ہر نقش ہُوا ہو کے بکھر جائے گا آخر
خالدؔ، ترا احساس بھی مر جائے گا آخر

مٹ جائیگا خواہش کا نشاں موت کے ہاتھوں
یہ سانپ بھی سینے سے اتر جائے گا آخر

دن جس کے لئے رات بڑے کرب میں کاٹی
سایوں کے تعاقب میں گزر جائے گا آخر

میں خوف ہوں، بیٹھا ہوں، کمیں گاہِ فنا میں
تو بچ کے مری زد سے کدھر جائے گا آخر

جو سائے کے مانند رواں ہے مرے ہمراہ
وہ شخص بھی تنہا مجھے کر جائے گا آخر



آنکھ کی ضد کو ہمیشہ ہی سے بہلایا گیا
ایک چہرے کو کئی چہروں میں دکھلایا گیا

میرے پاؤں نت نئے رستوں سے تھے کب آشنا
صدیوں پہلے تھا جہاں، مجھ کو وہیں پایا گیا

پھر ہوئی بیدار خواہش، آنکھ میں آئی چمک
پھر کسی کو دھوپ سا ملبوس پہنایا گیا

سننے والوں نے تو دیکھا بھی نہیں تھا چونک کر
راز سینے سے نکل کے ہونٹ پر آیا، گیا

اس قدر تھا سنگدل، جیسے کسی قاتل کا دل
مجھ سے وہ ماحول اے خالدؔ نہ اپنایا گیا

خالد احمد



سنم طراز فلک، زخم آشنا بھی تو ہو
افق افق شفقِ درد کی حنا بھی تو ہو

خلا بہ پا ہوں مگر دشت دشت خاک بہ سر
کچھ اپنا آپ مٹانے کی انتہا بھی تو ہو

میں خاک بن کے فضا میں بکھر بکھر جاؤں
کسی کے پاؤں تلے زینۂ صبا بھی تو ہو

ہوس کی برف، بدن سے پگھل تو جائے مگر
شرر شرر کوئی پیکر کبھی چھوا بھی تو ہو

نظر نظر میں ہزاروں سوال ہیں لیکن
فلک سے کوئی مری سمت دیکھتا بھی تو ہو

نئی گھڑی نئے صحرا، نئے افق لائی
کسی طرح حقِ آشفتگی ادا بھی تو ہو

برہنگی مرا مذہب، مرا سلوک بنے
مگر بدن پہ کسی قدر کی ردا بھی تو ہو

مری دعاؤں کی گہرائیوں کا کھوج تو لے
وہ بحرِ حسن کبھی ظرف آزما بھی تو ہو

فقط بیانِ حقیقت نہیں ہے منزلِ حق
جہت شناس وہ ہے جو جہت نما بھی تو ہو

ترے سوا بھی کسی کو کہوں ندیمؔ مگر
"ترے سوا کوئی شائستہ وفا بھی تو ہو"[1]

---

[1] یہ احمد ندیم قاسمی کا مصرعہ ہے

خالد احمد



نور نور ذہنوں میں، خوف کے اندھیرے ہیں
روشنی کے پیڑوں پر، راستے کے بسیرے ہیں

شہر شہر سناٹے، یوں صدا کو گھیرے ہیں
جس طرح جزیروں کے، پانیوں میں ڈیرے ہیں

نیند کب میسّر ہے، جاگنا مقدر ہے
زلف زلف اندھیارے، خم بہ خم سویرے ہیں

دل اگر کلیسا ہے، غم شبیہِ عیسیٰ ہے
پھول راہبہ بن کر، روح نے بکھیرے ہیں

عشق کیا؟ وفا کیا ہے؟ وقت کیا، خدا کیا ہے؟
ان لطیف جسموں کے، سائے کیوں گھنیرے ہیں

ذوقِ آگہی بھی دیکھ، طوقِ بے کسی بھی دیکھ
پاؤں میں ہیں زنجیریں، ہاتھ میں پھریرے ہیں

ہو بہو وہی آواز، ہو بہو وہی انداز
تجھ کو میں چھپاؤں کیا، مجھ میں رنگ تیرے ہیں

توڑ کر حدِ امکاں، جائے گا کہاں عرفاں
راہ میں ستاروں نے، جال کیوں بکھیرے ہیں

فہم لاکھ سلجھائے، وہم لاکھ الجھائے
حُسن ہے حقائق کا، کیا خیال میرے ہیں!

ہم تو ٹھہرے دیوانے، بستیوں میں ویرانے
اہلِ عقل کیوں خالدؔ، پاگلوں کو گھیرے ہیں

خالد احمد



ربط کس سے تھا کسے، کس کا شناسا کون تھا؟
شہر بھر تنہا تھا، لیکن مجھ سا تنہا کون تھا؟

میں سمندر تھا، مگر ویراں تھا صحرا کی طرح
میرے گھر تک چل کے آتا، اتنا پیاسا کون تھا

ریزۂ سنگِ انا تھا ذرہ کا کوہِ گراں
بڑھ کے لگ جاتا مرے سینے سے ایسا کون تھا

سطح پر خاموشیوں کی گونج ہے نوحہ کناں
اپنی گہرائی کے دریا میں جو ڈوبا کون تھا

ذات آخر ذات تھی، شہکار پھر شہکار تھے
کس کے فن کے واسطے کس کو سمجھا کون تھا

پاؤں دھرتی پر تھے لیکن ذہن تھے آکاش پر
سب کے سب میری طرح بکھرے تھے یکجا کون تھا

کچھ برے تھے کچھ بھلے تھے، خار کچھ، گلزار کچھ
ہر کوئی انسان تھا، آخر فرشتہ کون تھا

وہ بھڑک اٹھا تو خالدؔ سوچتا ہی رہ گیا
خوب رُو پیکر کے اندر تند خو سا کون تھا



بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے
لب رسیلے نہ رہے، نین نشیلے نہ رہے

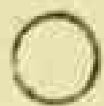
اشک برسے تو دروں خانۂ جاں سیل گیا
درد چمکا تو درد بام بھی گیلے نہ رہے

پھول سے باس جدا، فکر سے احساس جدا
فرد سے ٹوٹ گئے فرد، قبیلے نہ رہے

ٹیس اٹھتی ہے مگر چیخ نہیں ہو پاتی
تیرے پھینکے ہوئے پتھر بھی نکیلے نہ رہے

موت نے چھین لیا، رنگ بھی، نم بھی، خالدؔ
آنکھ بھی سوکھ گئی، ہونٹ بھی نیلے نہ رہے

خالد احمد



شکل شکل زندانی، سحر بے رخی کی ہے
آرزوؤں کی بستی میں، دھوم سامری کی ہے

چپ کا زہر پی لینا، غم کے ہونٹ سی لینا
مصلحت نہیں یارو، بات بے حسی کی ہے

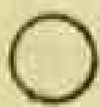
راہ راہ دیواریں، گام گام بے گاریں
شہرِ سنگ میں کیونکہ میں نے زندگی کی ہے

عکس ہوں، ہیولیٰ ہوں، بے سکوں بگولا ہوں
میرے جسم میں شاید، روح اجنبی کی ہے

چند سرد مہروں نے، چاند چاند چہروں نے
آفتاب سے بڑھ کر دل میں روشنی کی ہے

سسکیوں کے نغمے بھی، ہچکیوں کے وقفے بھی
آنسوؤں کی رم جھم میں، گونج نغمگی کی ہے

جام جام بے تابی، گھونٹ گھونٹ زہرابی
موت کیوں سزا خالد، جرم زندگی کی ہے



ابھری نہ کوئی شکل نہ پیکر نظر آیا
تصویر میں رنگوں کا سمندر نظر آیا

اے دوست، ترا شہر بھی ہے شہرِ طلسمات
چھو کر جسے دیکھا وہی پتھر نظر آیا

ہر شخص حقائق کی کڑی دھوپ کے ڈر سے
تانے ہوئے اوہام کی چادر نظر آیا

ہر شخص نیا شخص تھا جب غور سے دیکھا
انسان اک انسان کے اندر نظر آیا

میں خواب میں کل رات جسے چوم رہا تھا
جاگا تو اسی ہاتھ میں پتھر نظر آیا

جب ٹوٹنے لگا پیچ خیالات کے خالد
ہر لفظ کا دامن مجھے بنجر نظر آیا

خالد احمد



بے وفا ہوں نہ وفادار ہوں میں
سچ تو یہ ہے کہ اداکار ہوں میں

سی دیئے اس نے مرے ہونٹ تو کیا
اب مجسم لبِ اظہار ہوں میں

میرے ہاتھوں میں گڑے ہیں کانٹے
پھول ہوں اور سرِ دار ہوں میں

ہر کرن ڈوب چلی صورتِ نبض
کن اندھیروں میں ضیا بار ہوں میں

ذہن ہے سر پہ لٹکتی تلوار
کن عقائد میں گرفتار ہوں میں

اس لیے مجھ سے خفا ہے کوئی
اس کا ہوتے ہوئے خوددار ہوں میں



اس طرح پھوٹ کے رویا کوئی
بے کسوں کا نہیں گویا کوئی

شور میں گونجتے سناٹوں کے
وا کرے کیا لبِ گویا، کوئی

سنگ دل جب بھی کوئی یاد آیا
لگ کے دیوار سے رویا کوئی

ٹوٹ کر بھی کوئی بے چین رہا
لٹ کے بھی چین سے سویا کوئی

حشر ساماں ہوئیں ویراں آنکھیں
پھر کسی خواب میں کھویا کوئی

زیست کا دشت سمن زار ہوا
بیج کیا درد نے بویا کوئی؟

خالد احمد



لب سیئے دیکھا کروں، سوچا کروں
میرے بس میں کچھ نہیں میں کیا کروں

راہ میں ہے درد کا کوہِ گراں
کوہکن بھی میں نہیں میں کیا کروں

شہر کے شور و شغب سے بھاگ کر
کوئی کنجِ عافیت ڈھونڈا کروں

گنگ، گمسُم صداؤں کی طرح
گنبدِ تنہائی میں گونجا کروں

اور ان مبہم صداؤں کا، اگر
کوئی مطلب ہو تو وہ لکھا کروں

اور جب اپنی سمجھ میں کچھ نہ آئے
چیخ اُٹھوں — کیا کروں میں کیا کروں

شہر کی ویرانیوں پہ نوحہ گر
روح بن کر رات بھر بھٹکا کروں



تند خوئی پہ طنز کر جاؤں
بن کے خوشبو، ہوا کے گھر جاؤں

دشمنِ جاں نفس نفس میرا
دھول کا پھول ہوں، کدھر جاؤں

تو بھلائے تو کیا بھلائے مجھے
نشہ ہوں کس طرح اُتر جاؤں

خود اُلجھتا ہوں، خود سلجھتا ہوں
کچھ نکھر جاؤں، کچھ سنور جاؤں

جسم اور عشق کے حوالے سے
میں تری روح میں اُتر جاؤں

بُت کو دیکھا تو بُت ہوا خالد
جی میں تھا، دیکھ کر گزر جاؤں

افتخار نسیم



شام سے تنہا کھڑا ہوں، یاس کا پیکر ہوں میں
اجنبی ہوں اور فصیلِ شہر سے باہر ہوں میں

تُو تو آیا ہے یہاں پر قہقہوں کے واسطے
دیکھنے والے! بڑا غمگین سا منظر ہوں میں

میں بچا لوں گا تجھے دنیا کے سرد و گرم سے
ڈھانپ لے مجھ سے بدن اپنا، تری چادر ہوں میں

اب تو ہلتے ہیں ہوا سے بھی در و دیوار جسم
باسیو، مجھ سے نکل جاؤ، شکستہ گھر ہوں میں

میں تمھیں اُڑتے ہوئے دیکھوں گا میرے ساتھیو
میں تمھارا ساتھ کیسے دوں، شکستہ پر ہوں میں

میرے ہونے کا پتہ لے لو در و دیوار سے
کہہ رہا ہے گھر کا سناٹا، ابھی اندر ہوں میں

کون دے گا اب یہاں سے تیری دستک کا جواب
کس لیے مجھ کو صدا دیتا ہے، خالی گھر ہوں میں

افتخار نسیم



اس طرح سوئی ہیں آنکھیں، جاگتے سپنوں کے ساتھ
خواہشیں لپٹی ہوں جیسے بند دروازوں کے ساتھ

رات بھر ہوتا رہا ہے اُس کے آنے کا گماں
ایسے ٹکراتی رہی ٹھنڈی ہوا پردوں کے ساتھ

ایک لمحے کا تعلق عمر بھر کا روگ ہے
دوڑتے پھرتے رہو گے بھاگتے لمحوں کے ساتھ

میں اُسے آواز دے کر بھی بلا سکتا نہ تھا
اس طرح ٹوٹے زباں کے رابطے لفظوں کے ساتھ

ایک سناٹا ہے، پھر بھی ہر طرف اک شور ہے
کتنے چہرے آنکھ میں پھیلے ہیں آوازوں کے ساتھ

جانی پہچانی ہیں باتیں، جانے بوجھے نقش ہیں
پھر بھی ملتا ہے وہ سب سے مختلف چہروں کے ساتھ

دل دھڑکتا ہی نہیں ہے اُس کو پا کر بھی نسیم
کس قدر مانوس ہے یہ انت نئے صدموں کے ساتھ

افتخار نسیم



کسی کے حق میں سہی، فیصلہ ہُوا تو ہے
بُرا نہیں، وہ کسی شخص کا ہُوا تو ہے

یہی بہت ہے کہ اُس نے مجھے بھی مس تو کیا
یہ لمس مجھ میں ابھی تک رچا ہُوا تو ہے

اُسے میں کھل کے کبھی یاد کر تو سکتا ہوں
مجھے خوشی ہے، وہ مجھ سے جُدا ہُوا تو ہے

سکوتِ شب ہی سہی میرا ہمسفر لیکن
مرے سوا بھی کوئی جاگتا ہُوا تو ہے

گھٹن کہ بڑھتی چلی جا رہی ہے اندر کی
تمام خوش ہیں کہ موسم کھُلا ہُوا تو ہے

یہ اور بات کہ میں زندہ رہ گیا ہوں نسیمؔ
ہر اک ستم مری جاں پر روا ہُوا تو ہے



یوں ہے تری تلاش پہ اب تک یقیں مجھے
جیسے تو مل ہی جائے گا پھر سے کہیں مجھے

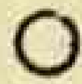
میں نے تو جو بھی دل میں تھا چہرے پہ لکھ لیا
تُو ہے کہ ایک بار بھی پڑھتا نہیں مجھے

ڈھلتے ہی شام، ٹوٹ پڑا سر پہ آسمان
پھر میرا بوجھ لے گیا زیرِ زمیں مجھے

تعبیر جاگتی ہُوئی آنکھوں کو کیا ملے
اک خواب بھی تو شب نے دکھایا نہیں مجھے

کندہ ہے میرا نام جہاں آج بھی نسیمؔ
پہچانتے نہیں اُسی گھر کے مکیں مجھے

افتخار نسیم



سزا ہی دی ہے، دعاؤں میں بھی اثر دے کر
زبان لے گیا میری، مجھے نطق دے کر

خود اپنے دل سے مٹا دی ہے خواہشِ پرواز
اُڑا دیا ہے مگر اُس کو اپنے پر دے کر

نکل پڑے ہیں سبھی اب پناہ گاہوں سے
گزر گئی ہے سیہ شب، غمِ سحر دے کر

اُسے ہیں اپنی صفائی میں کیا بھلا کہنا
وہ پوچھتا تھا جو مہلت بھی مختصر دے کر

پکارتا ہوں کہ تنہا میں رہ گیا ہوں نسیم
کہاں گیا ہے وہ مجھ کو مری خبر دے کر



بن گیا ہے جسم گزرے قافلوں کی گرد سا
کتنا ویراں کر گیا مجھ کو مرا ہمدرد سا

کیا ابھی تک اُس کا رستہ روکتی ہے کوئی سوچ
میرے ہاتھوں میں ہے اُس کا ہاتھ لیکن سرد سا

اس طرح گھل مل گیا آ کر نئے ماحول میں
وہ بھی اب لگتا ہے میرے گھر کا ہی اک فرد سا

جذب تھا جیسے کوئی سوچ ہی اُس کے جسم میں
دور سے وہ سنگ لگتا تھا بظاہر سرد سا

آج تک آنکھوں میں ہے منظر بچھڑنے کا نسیم
پیرہن میلا سا اُس کا اور چہرا زرد سا

افتخار نسیم



وہ ملا مجھ کو نہ جانے خول کیسا اوڑھ کر
روشنی گم ہو گئی اپنا ہی سایا اوڑھ کر

نیند سے بوجھل ہیں پتے، اونگھتے سے پیڑ ہیں
شہر سویا ہے خموشی کا لبادہ اوڑھ کر

ڈھونڈتا پھرتا تھا میں ہر شخص کے اصلی نقوش
لوگ ملتے تھے مجھے چہرے پہ چہرا اوڑھ کر

منجمد سا ہو گیا ہوں خنکیٔ احساس سے
دھوپ بھی نکلی ہے لیکن تن پہ کپڑا اوڑھ کر

رنگ سارے دھو گیا ہے رات کا بادل نسیمؔ
اور گھر ننگے ہوئے پانی برستا اوڑھ کر



اپنا سارا بوجھ زمیں پر پھینک دیا
تجھ کو خط لکھا اور لکھ کر پھینک دیا

خود کو ساکن دیکھا ٹھہرے پانی میں
جانے کیا کچھ سوچ کے پتھر پھینک دیا

دیواریں کیوں خالی خالی لگتی ہیں
کس نے سب کچھ گھر سے باہر پھینک دیا

میں تو اپنا جسم سکھانے نکلا تھا
بارش نے پھر مجھ پہ سمندر پھینک دیا

وہ کیسا تھا، اُس کو کہاں پر دیکھا تھا
اپنی آنکھوں نے ہر منظر پھینک دیا

افتخار نسیم



نام بھی جس کا زباں پر تھا دعاؤں کی طرح
وہ مجھے ملتا رہا نا آشناؤں کی طرح

آ کہ تیرے منتظر ہیں آج بھی دیوار و در
گونجتا ہے گھر میں سناٹا، صداؤں کی طرح

وہ شجر جلتا رہا خود کس کڑکتی دھوپ میں
جس کا سایہ تھا مرے سر پر گھٹاؤں کی طرح

جھک رہے تھے باغ کے سب پھول اُس کے سامنے
گھاس پر بیٹھا تھا وہ فرمانرواؤں کی طرح

میں بھلا کیسے اُسے اک اجنبی کہہ دوں نسیم
جس نے دیکھا تھا پلٹ کر آشناؤں کی طرح



ہے جستجو اگر اُس کو اِدھر بھی آئے گا
نکل پڑا ہے تو پھر میرے گھر بھی آئے گا

تمام عمر کٹے گی یونہی سرابوں میں
وہ سامنے بھی نہ ہوگا، نظر بھی آئے گا

جو گم ہوا ہے نئے شہر کے مکانوں میں
وہ دیکھنے کو کبھی یہ کھنڈر بھی آئے گا

رچی ہے میرے بدن میں تمام دن کی تھکن
ابھی تو رات کا لمبا سفر بھی آئے گا

ذرا سی دیر میں ہر شے چمک اُٹھے گی نسیم
سحر ہوئی ہے تو نورِ سحر بھی آئے گا

نصیر ترابی



مرہمِ وقت نہ اعجازِ مسیحائی ہے
زندگی روز نئے زخم کی گہرائی ہے

پھر مرے گھر کی فضاؤں میں ہُوا سناٹا
پھر در و بام سے اندیشۂ گویائی ہے

تجھ سے بچھڑوں تو کوئی پھول نہ مہکے مجھ میں
دیکھ کیا کرب ہے، کیا ذات کی سچائی ہے

ترا منشا ترے لہجے کی دھنک میں دیکھا
تری آواز بھی شاید تری انگڑائی ہے

کچھ عجب گردشِ پرکار سفر رکھتا ہوں
دو قدم مجھ سے بھی آگے مری رسوائی ہے

کچھ تو یہ ہے کہ مری راہ جُدا ہے تجھ سے
اور کچھ قرض بھی مجھ پر تری تنہائی ہے

کس لیے مجھ سے گریزاں ہے، مرے سامنے آ
کیا تری راہ میں حائل مری بینائی ہے

وہ ستارے جو چمکتے ہیں ترے آنگن میں
اُن ستاروں سے تو اپنی بھی شناسائی ہے

جس کو اک عمر غزل سے کیا منسوب نصیرؔ
اُس کو پرکھا تو کھُلا، قافیہ پیمائی ہے



میں بھی اے کاش کبھی موجِ صبا ہو جاؤں
اس توقع پہ کہ خود سے بھی جُدا ہو جاؤں
ابر اُٹھے تو سمٹ جاؤں تری آنکھوں میں
دھوپ نکلے تو ترے سر کی ردا ہو جاؤں
آج کی رات اُجالے مرے ہمسایہ ہیں
آج کی رات جو سو لوُں تو نیا ہو جاؤں
اب یہی سوچ لیا دل میں کہ منزل کے بغیر
گھر پلٹ آؤں تو میں آبلہ پا ہو جاؤں
پھول کی طرح مہکتا ہوں تری یاد کے ساتھ
یہ الگ بات کہ میں تجھ سے خفا ہو جاؤں
جس کے کوچے میں برستے رہے پتھر مجھ پر
اُس کے ہاتھوں کے لیے رنگِ حنا ہو جاؤں
آرزو یہ ہے کہ تقدیسِ ہُنر کی خاطر
تیرے ہونٹوں پہ رہوں، حمد و ثنا ہو جاؤں
مرحلہ اپنی پرستش کا ہو درپیش تو میں
اپنے ہی سامنے مائل بہ دعا ہو جاؤں
تیشۂ وقت بتائے کہ تعارف کے لیے
کن پہاڑوں کی بلندی پہ کھڑا ہو جاؤں
ہائے وہ لوگ کہ میں جن کا پجاری ہوں نصیرؔ
ہائے وہ لوگ کہ میں جن کا خدا ہو جاؤں

نصیر ترابی



رچے بسے ہوئے لمحوں سے جب حساب ہوا
گئے دنوں کی رُتوں کا زیاں ثواب ہوا

گزر گیا تو پسِ موج بے کناری تھی
ٹھہر گیا تو وہ دریا مجھے سراب ہوا

سپردگی کے تقاضے کہاں کہاں سے پڑھوں
ہنر کے باب میں پیکر ترا کتاب ہوا

ہر آرزو مری آنکھوں کی روشنی ٹھہری
چراغ سوچ میں گم ہیں، یہ کیا عذاب ہوا

کچھ اجنبی سے لگے آشنا دریچے بھی
کرن کرن جو اجالوں کا احتساب ہوا

وہ یخ مزاج رہا فاصلوں کے رشتوں سے
مگر گلے سے لگایا تو آب آب ہوا

وہ پیڑ جس کے تلے روح گنگناتی تھی
اسی کی چھاؤں سے اب مجھ کو اجتناب ہوا

ان آندھیوں میں کسے مہلتِ قیام یہاں
کہ ایک خیمۂ جاں تھا، سو بے طناب ہوا

صلیبِ سنگ ہو یا پیرہن کے رنگ نصیر
ہمارے نام سے کیا کیا نہ انتساب ہوا



اس کڑی دھوپ میں سایہ کرکے
تو کہاں ہے مجھے تنہا کرکے

میں تو ارزاں تھا خدا کی مانند
کون گزرا مرا سودا کرکے

تیرگی ٹوٹ پڑی ہے مجھ پر
میں پشیماں ہوں اجالا کرکے

لے گیا چھین کے آنکھیں میری
مجھ سے کیوں وعدۂ فردا کرکے

لَو ارادوں کی بڑھا دی شب نے
دن گیا جب مجھے پسپا کرکے

کاش یہ آئینۂ ہجر و وصال
ٹوٹ جائے مجھے اندھا کرکے

ہر طرف سچ کی دہائی ہے نصیر
شعر لکھتے رہو سچا کرکے



درد کی دھوپ سے چہرے کو نکھر جانا تھا
آئینہ دیکھنے والے، تجھے مر جانا تھا

راہ میں ایسے نقوشِ کفِ پا بھی آئے
میں نے دانستہ جنہیں گردِ سفر جانا تھا

وہم و ادراک کے ہر موڑ پہ سوچا میں نے
تو کہاں ہے، مرے ہمراہ اگر جانا تھا

آگہی زخمِ نظارا نہ بنی تھی جب تک
میں نے ہر شخص کو محبوبِ نظر جانا تھا

قربتیں ریت کی دیوار ہیں، گر سکتی ہیں
مجھ کو خود اپنے ہی سائے میں ٹھہر جانا تھا

تو کہ وہ تیز ہوا جس کی تمنّا بے سود
میں کہ وہ خاک جسے خود ہی بکھر جانا تھا

آنکھ ویران سہی پھر بھی اندھیروں کو نصیرؔ
روشنی بن کے مرے دل میں اتر جانا تھا



صبا کا نرم سا جھونکا بھی تازیانہ ہوا
یہ وار مجھ پہ ہوا بھی تو غائبانہ ہوا

اسی نے مجھ پہ اٹھائے ہیں سنگ جس کیلئے
میں پاش پاش ہوا، گھر نگار خانہ ہوا

جھلس رہا تھا بدن گرمیٔ نفس سے مگر
ترے خیال کا خورشید شامیانہ ہوا

خود اپنے ہجر کی خواہش مجھے عزیز رہی
یہ تیرے وصل کا قصّہ تو اک بہانہ ہوا

خلا کی سرد مزاجی سما گئی مجھ میں
مری تلاش کا سودا پیمبرانہ ہوا

میں اک شجر کی طرح رہگزر میں ٹھہرا ہوں
تھکن اتار کے تو کس طرف روانہ ہوا

وہ شخص جس کے لئے شعر کہہ رہا ہوں نصیرؔ
غزل سنائے ہوئے اسکو اک زمانہ ہوا

نصیر ترابی



انجیلِ رفتگاں کی حدیثوں کے ساتھ ہوں
عیسیٰ نفس ہوں اور صلیبوں کے ساتھ ہوں

پابندِ رنگ و نقش ہوں، تصویر کی طرح
میں بے حجاب، اپنے حجابوں کے ساتھ ہوں

اوراقِ آرزو پہ بہ عنوانِ جاں کنی
میں بے نشاں سی چند لکیروں کے ساتھ ہوں

شاید یہ انتظار کی لَو فیصلہ کرے
میں اپنے ساتھ ہوں کہ دریچوں کے ساتھ ہوں

تو فتحمند، میرا تراشا ہوا صنم
میں بُت تراش اپنی شکستوں کے ساتھ ہوں

موجِ صبا کی زد پہ سرِ رہگذارِ شوق
میں بھی نصیرؔ گھر کے چراغوں کے ساتھ ہوں



شِکل صحرا ہے رفاقت کا چمن بھی اب کے
جل بجھا اپنے ہی شعلوں میں بدن بھی اب کے

خار و خس ہوں تو شرر خیزیاں دیکھوں پھر سے
آنکھ لے آئی ہے اک ایسی کرن بھی اب کے

ہم تو وہ پھول جو شاخوں پہ یہ سوچیں پہروں
کیوں صبا بھول گئی، اپنا چلن بھی اب کے

منزلوں تک نظر آتا ہے شکستوں کا غبار
ساتھ دیتی نہیں اکیسے میں تھکن بھی اب کے

منسلک ایک ہی رشتے میں نہ ہو جائے کہیں
تیرے ماتھے، ترے بستر کی شکن بھی اب کے

بے گناہی کے لبادے کو اتارو بھی نصیرؔ
راس آ جائے اگر جرمِ سخن بھی اب کے

نصیر ترابی



سکوتِ شام سے گھبرا نہ جائے آخر تُو
مرے دیار سے گزری جو، اے کرن، پھر تُو

لباسِ جاں میں نہیں شعلگی کا رنگ مگر
جھلس رہا ہے مرے ساتھ کیوں بظاہر تُو

وفائے وعدہ و پیماں کا اعتبار بھی کیا
کہ میں تو صاحبِ ایماں ہوں اور منکر تُو

مرے وجود میں اک بے زباں سمندر ہے
اُتر کے دیکھ سفینے سے میری خاطر تُو

میں شاخِ سبز نہیں، محرمِ صبا بھی نہیں
مرے فریب میں کیوں آگیا ہے طائر تُو

اسی امید پہ جلتے ہیں راستوں میں چراغ
کبھی تو لوٹ کے آئیگا، اے مسافر، تُو



کوئی آواز، نہ آہٹ، نہ خیال ایسے میں
رات مہکی ہے مگر جی ہے نڈھال ایسے میں

میرے اطراف تو گرتی ہوئی دیواریں ہیں
سایۂ عمرِ رواں، مجھکو سنبھال ایسے میں

جب بھی چڑھتے ہوئے دریا میں سفینہ اترا
یاد آیا ترے لہجے کا کمال ایسے میں

آنکھ کھلتی ہے تو سب خواب بکھر جاتے ہیں
سوچتا ہوں کہ بچھا دوں کوئی جال ایسے میں

مدتوں بعد اگر سامنے آئے ہم تم
دھندلے دھندلے سے ملیں گے خد و خال ایسے میں

ہجر کے پھول میں ہے درد کی باسی خوشبو
موسمِ وصل! کوئی تازہ ملال ایسے میں

حامد جیلانی



خاک پر پھینکا ہواؤں نے، اُٹھا لے مجھ کو
پھول ہوں، کوٹ کے کالر پہ سجا لے مجھ کو

کب سے میں ریت کے مرقد میں پڑا ہوں زندہ
سطح پر موج کسی دن تو اُچھالے مجھ کو

سرخیٔ خوں میں چمک ہے کہ مری آنکھوں میں
روز وہ رنگ دکھاتا ہے نرالے مجھ کو

ساتھ ہی مجھ کو گرا لے نہ لچکتا ہُوا پیڑ
اُڑتا بادل نہ کہیں ساتھ اُڑا لے مجھ کو

کانپ اُٹھتی ہے کسی اور کے گھر کی بنیاد
اور کوئی چیختا ہے مجھ میں ــ بچا لے مجھ کو

راکھ ہو جاؤں نہ خواہش کی جلن سے حامد
کوئی اس جلتے جزیرے سے نکالے مجھ کو

حامد جیلانی



بھول جا، مت رہ کسی کی یاد میں کھویا ہُوا
اس اندھیرے غار میں کچھ بھی نہیں رکھا ہُوا

روشنی مل جائے تو مطلب عبارت کا سمجھ
ہے کتابِ خاک میں کالک سے کچھ لکھا ہُوا

چھُو کے جب دیکھا، مجھے بے حد پشیمانی ہوئی
وہم کا پیکر تھا میرے سامنے بیٹھا ہُوا

اس مکاں میں دیر سے شاید کوئی رہتا نہیں
در کھلے، دالان سارا کائی میں ڈوبا ہُوا

جاگتا ہے پھر بھی آنکھوں میں ہے منظر نیند کا
خواب کی صورت ہُوں اُس کے ہر طرف پھیلا ہُوا

سب کے سب حامد یہاں گُم سُم ہیں اپنے آپ میں
ہوں کھلونوں سے سجے بازار میں آیا ہُوا



قبائے گرد ہوں، آتا ہے یہ خیال مجھے
سبک چلے ہَوا تو کہوں کس سے میں سنبھال مجھے

سکوتِ مرگ کے گنبد میں اک صدا بن کے
کبھی حصارِ غمِ زیست سے نکال مجھے

کوئی بھی راہ کا پتھر نظر نہیں آتا
میں دیکھتا ہوں اُسے حیرتِ سوال مجھے

مرے وجود میں اک کرب بن کے بکھرا ہے
یہ میرا دل کہ ہُوا باعثِ وبال مجھے

ہُوں زیرِ سنگ، رواں آب کی طرح حامدؔ
نمو دے گا مری فکر کا اُبال مجھے

حامد جیلانی



دیکھنے والے کو باہر سے گماں ہوتا نہیں
آگ کچھ ایسے لگائی ہے، دھواں ہوتا نہیں

اپنے ہونے کی خبر دیتا ہے خوشبو سے مجھے
پھیلتا ہے چار سُو اور درمیاں ہوتا نہیں

روشنی کر دے، تماشا گاہ سے وحشت مٹے
کہر اتنا ہے کہ پس منظر عیاں ہوتا نہیں

سوچنا چاہو تو زیرِ پائے ہفت آسماں
دیکھنا چاہو تو زینے کا نشاں ہوتا نہیں

منتظر رہنے سے حامدؔ قفل کو ضربیں لگا
آپ ہی کھل جائے در، ایسا یہاں ہوتا نہیں



جب طلسمِ اثر سے نکلا تھا
زہر، شیریں ثمر سے نکلا تھا

اُڑ گئے آندھیوں میں جب پتّے
خون کتنا شجر سے نکلا تھا

مجھ سے پوچھا اُسی نے میرا پتہ
ڈھونڈنے جس کو گھر سے نکلا تھا

دھوپ چمکی، تو میہماں کی طرح
سایہ دیوار و در سے نکلا تھا

لوگ سوئے پڑے تھے اور خورشید
جلد، ابرِ تر سے نکلا تھا

حامد جیلانی



دن کو نہ گھر سے جائیے لگتا ہے ڈر مجھے
اس پارۂ سحاب کو سورج نہ دیکھ لے

اُس ہاتھ کی چمک سے مرے ہاتھ شل ہوئے
اُس قرب سے ملے مجھے صدیوں کے فاصلے

میری لویں بجھا نہ سکیں تیز آندھیاں
جھونکوں کی نرم دھار سے کہسار کٹ گئے

اپنی صدا کو روک لو، کیا اس سے فائدہ
ڈھلوان پر بھلا کبھی پتھر ٹھہر سکے

حامدؔ عجب ادا سے کیا خوں نے سفر
پلکوں کو سرخ کر گئے پاؤں کے آبلے



اپنے حصارِ جسم سے باہر بھی دیکھتے
ہم آئینے کے سامنے ہو کر بھی دیکھتے

عکسِ فلک سے ٹوٹتا کیسے جمودِ آب
پتھر گرا کے جھیل کے اندر بھی دیکھتے

کرتے پلٹ کے اپنے ہی سائے سے گفتگو
صحرا میں زرد رنگ سمندر بھی دیکھتے

دنیا کا خوف تھا تو لگاتے نہ آگ ہی
یا موم کا پگھلتا ہوا گھر بھی دیکھتے

حامدؔ تمام عمر یہ خواہش رہی ہمیں
اپنے بدن کی مرگ کا منظر بھی دیکھتے

محمد جلیل عالی



موڑ موڑ گھبرایا، گام گام دہلائیں
جانے کن خرابوں کے، راستوں پہ نکلائیں

سطحِ آب کہہ پائے کیا تہوں کے افسانے
سامعِ لبِ ساحل، بحر سے بھی گہرائیں

اور کچھ تقاضے کا سلسلہ چلے یارو
پل میں کیسے من جاؤں، مدتوں کا روٹھائیں

وہ کہ ہے مرا اپنا، حرفِ مدعا اس کو
غیر کے حوالے سے کس طرح سمجھتائیں

جانے جذب ہو جاؤں، کب فضا کے آنچل میں
ساعتوں کی آنکھوں سے اشک بن کے ڈھلکائیں

ایک روز تو گرتیں، فاصلوں کی دیواریں
ایک روز تو اپنے ساتھ ساتھ چلتائیں

کون ہے مرا قاتل، کس کا نام لوں عالیؔ
اپنی ہی وفاؤں کے پانیوں میں ڈوبائیں

محمد جلیل عالی



جسم کے خول سے نکلوں تو فضا کو دیکھوں
بُت کو رستے سے ہٹاؤں تو خدا کو دیکھوں

ایسا کیا جرم ہُوا ہے کہ تڑپتے مرتے
اپنے احساس کی سُولی پہ اَنا کو دیکھوں

بولتی آنکھ کا رس، ہنستے ہُوئے لفظ کا روپ
بات نظروں کی سنوں یا کہ صدا کو دیکھوں

اُن کی قسمت کہ کھِلیں روز تمنّا کے گلاب
میری تقدیر کہ زخموں کی چِتا کو دیکھوں

اس توقع پہ کہ شاید کوئی درویش ملے
غور سے شہر کے ایک ایک گدا کو دیکھوں

مجھ کو تہذیب کے مکتب نے سکھایا ہے یہی
تختیٔ دل نہ پڑھوں رنگِ قبا کو دیکھوں

محمد جلیل عالی

○

کسے خبر ابتدا کی، انجام کون جانے
گمان باطل، خیال سب خام، کون جانے

تمام لفظوں کا ایک مفہوم کون سمجھے
تمام چیزوں کا ایک ہی نام کون جانے

پجاریوں کے لیے ازل سے تڑپ رہے ہیں
صنم کے پہلو میں کتنے اصنام کون جانے

نکل کے دن کی تمازتوں سے وفا کا سورج
ہوا ہے خوں کس طرح سرِ شام، کون جانے

اُداس جذبوں کے دلدلی راستوں پہ عالی
سنبھل گیا چل کے گام دو گام کون جانے

○

دل ہے کہ غمِ دل کا عزادار نہیں ہے
جاں ہے کہ غمِ زیست سے بے زار نہیں ہے

یا قد کوئی اٹھتی ہوئی دیوار نہیں ہے
یا سر کوئی سودا کا سزاوار نہیں ہے

الفاظ کے رنگوں نے جو تصویر بنائی
یہ تو مرے جذبات کا اظہار نہیں ہے

نزدیک بھی آ، جھانک کے دل میں بھی ذرا دیکھ
ملبوس ہی انسان کا معیار نہیں ہے

نکلے ہو کڑی دھوپ میں جس راہ پہ عالی
اس رہ میں کہیں سایۂ اشجار نہیں ہے

محمد جلیل عالی



کچھ اور مرے درد کے شعلوں کو ہوا دو
بے نور ہوئے داغ، اندھیرا ہے ضیا دو

پیچھے غم و اندوہ کے فرعون کا لشکر
آگے الم و یاس کا دریا ہے، عصا دو

میں دشتِ غمِ عشق میں ہنستا ہُوا آؤں
رستے سے غمِ دہر کی دیوار ہٹا دو

میں اور سلگتا ہُوا صحرائے تجسس
بھٹکا ہُوا راہی ہوں کوئی راہ دکھا دو

کیوں میری شکستوں کو سہارا نہیں ملتا
انسان ہوں، محتاج خدا کا ہوں، خدا دو

اس شہر میں جینے کی ہے اب ایک ہی صورت
احساس کے منصور کو سولی پہ چڑھا دو

اس دَور کا سقراط ہوں، سچ بول رہا ہوں
کیا دیر ہے، کیوں چپ ہو، مجھے زہر پلا دو



ہوا بھی زور پہ تھی، تیز تھا بہاؤ بھی
لڑی ہے خوب مگر کاغذی سی ناؤ بھی

ابھی سے ہاتھ چھڑاتے ہو واپسی کے لیے
جو چل پڑے ہو تو پھر ساتھ ساتھ آؤ بھی

جسے جہاں کی روش دُور لے گئی، اس کو
قریب لا نہ سکیں تم، مری وفاؤ، بھی

بندھا رہا بہر انداز حلقۂ یاراں
ہُوا ہے سرد کہیں درد کا الاؤ بھی

بجا کہ میری طبیعت بھی لااُبالی تھی
پہ زود رنج تھا دنیا ترا سبھاؤ بھی

عبادتوں کی شرابیں بھی پی چکا لیکن
سکون دے نہ سکے تم مرے خداؤ بھی

محمد جلیل عالی



کس دن، برنگِ زخم، نیا گل کھلا نہیں
کس شب، بہ فیضِ اشک، چراغاں ہوا نہیں

اک سہم ہے کہ ہر کہیں رہتا ہے ساتھ ساتھ
اک وہم ہے کہ آج بھی دل سے گیا نہیں

اے دوست راہِ زیست میں چل احتیاط سے
گرتے ہوئے کو کوئی یہاں تھامتا نہیں

گو ذہن سے شبیہ تری محو ہو گئی
لیکن ترے خیال کا سورج بجھا نہیں

من کا تمام ذوقِ سفر گھٹ کے رہ گیا
تن کے سمندروں میں کہیں راستہ نہیں

عالیؔ ورودِ شعر میں وقفہ بجا مگر
اب کے تو ایک عمر ہوئی، کچھ کہا نہیں



گزر گیا جو مرے دل پہ سانحہ بن کر
اُتر گیا وہ مری روح میں خدا بن کر

ترا خیال، شبِ ہجر، پھیلتا ہی گیا
ہزار رنگ کی سوچوں کا سلسلہ بن کر

وفا کے سنگ سے ٹکرا کے احتجاجِ انا
صلیبِ لب پہ سسکنے لگا دعا بن کر

بدن کے دشت میں من کی حسین صبحوں کو
نگل رہا ہے غمِ دہر، اژدہا بن کر

کبھی تو دیپ جلیں، گل کھلیں، فضا مہکے
کبھی تو آ شبِ ویراں میں رتجگا بن کر

تمام عمر جسے ڈھونڈتے رہے عالیؔ
کہیں ملا بھی اگر وہ تو فاصلہ بن کر

محمد جلیل عالی



زندگی زندہ ہے لیکن کسی دمساز کے ساتھ
ورنہ یوں جیسے کبوتر کوئی شہباز کے ساتھ

بجلیاں ساتھ لیے زہر بھرے لمحوں کی
وقت چلتا ہے زمانے میں کس انداز کے ساتھ

آسماں جانے کہاں لے کے چلا ہے مجھ کو
اوپر اٹھتا ہے برابر مری پرواز کے ساتھ

آج تنہا ہوں تو کیا دیکھتے رہنا، کل تک
لو آوازیں بھی ہوں گی مری آواز کے ساتھ

ایک آغاز ابھرتا ہے ہر انجام کے بعد
ایک انجام بھی پلتا ہے ہر آغاز کے ساتھ

ایک لمحہ! کہ گراں ہے مجھے تنہائی میں
ایک دنیا! کہ جواں ہے مرے ہمراز کے ساتھ



سلگ اٹھی ہے کوئی آگ سی ہواؤں میں
بدل گئی ہیں بہاریں مری خزاؤں میں

نہ آئی راس بناوٹ کی زندگی مجھ کو
میں شہر چھوڑ کے پھر آگیا ہوں گاؤں میں

قدم قدم پہ نیا اک خدا نظر آیا
نہ جانے کون سا برحق ہے ان خداؤں میں

کوئی امید کی بارش کا اہتمام کرو
میں جل رہا ہوں غم و یاس کی چتاؤں میں

بہت کٹھن ہے محبت کے راستوں کا سفر
جفا کی دھوپ چھپی ہے وفا کی چھاؤں میں

اعجاز آصف



ہر ایک شے کی حقیقت سے باخبر دیکھوں
میں اپنی خاک میں پنہاں تجھے بھی کر دیکھوں

یہ کیا کہ ہاتھ بڑھاؤں تو سنگ ریزے ملیں
کہیں تو میں بھی دمکتے ہوئے گہر دیکھوں

ہو آنکھ میں کسی چہرے کا ڈوبتا منظر
میں پانیوں میں منقید کسی کا گھر دیکھوں

تمام عمر اُسی سائے کی تلاش کروں
کہ جس کو دیکھنا چاہوں تو دربدر دیکھوں

نظر کے سامنے جب ہو نہ کوئی تیرے سوا
میں تیری سمت نہ دیکھوں تو پھر کدھر دیکھوں

ہے آرزو یہی آصفؔ کہ راہِ ظلمت میں
اُسے بھی اپنی طرح میں کبھی نڈر دیکھوں

اعجاز آصف



روشنی کو تیرگی کا قہر بن کر لے گیا
آنکھ میں محفوظ تھے جتنے بھی منظر، لے گیا

اجنبی سا لگ رہا ہوں آج اپنے آپ کو
آئینے کے سامنے میں کس کا پیکر لے گیا

کیوں نظر آتی نہیں اب کائی سطحِ آب پر
کھینچ کر ندی کے سر سے کون چادر لے گیا

پھر ہوئی آمادۂ پیکار پیڑوں سے ہوا
پھر کوئی جھونکا کئی پتے اُڑا کر لے گیا

روکتے ہی رہ گئے دیوار و در آصف مجھے
میں مگر چپ چاپ خود کو گھر سے باہر لے گیا



بے نیازِ صوت و محرومِ بیاں رکھا گیا
یعنی حرفِ شوق کو زیرِ زباں رکھا گیا

خواب میں رکھی گئی بنیادِ شہرِ آرزو
قید میں برفاب کی، شعلہ جواں رکھا گیا

رہنمائی دی گئی ہر موجِ تند و تیز کو
پانیوں پر ہر سفینے کو رواں رکھا گیا

قدسیوں کو رفعتیں بخشی گئیں فردوس کی
خاک کے پتلے کو زیرِ آسماں رکھا گیا

دوپہر کی دھوپ میں آصف جلا جاتا ہے جسم
سایۂ اشجار کو جانے کہاں رکھا گیا



کئے ہیں مجھ پہ جو احساں، جتا نہیں سکتا
وہ شخص تو مرا دل بھی دکھا نہیں سکتا

چھپا ہوا ہوں تہِ سنگ، ایک مدت سے
ہوا کا جھونکا مری سمت آ نہیں سکتا

پرے ہے آج بھی وہ سرحدِ تصور سے
میں اُس کو پُوج تو سکتا ہوں، پا نہیں سکتا

دکھا رہا ہے وہی موج موج عکس مجھے
وہ تیرا عکس، جسے میں بنا نہیں سکتا

میں ایک نغمۂ سادہ مزاج ہوں آصف
قبائے ساز میں خود کو چھپا نہیں سکتا

اعجاز آصف



آگیا ایثار میرے حلقۂ احباب میں
پھر کسی شعلے نے پائی ہے نمو برفاب میں

کہہ رہی ہے ساحلوں سے ڈوبنے والے کی لاش
میں نے پایا ہے سکوں اک مضطرب گرداب میں

کانپ اٹھا ہوں ورودِ بارشِ موعودہ پر
غرق ہونے کو ہے سارا شہر سیلِ آب میں

میرے ہاتھوں میں اگر تقدیرِ صبح و شام ہو
تتلیاں تعبیر کی رکھ دوں کتابِ خواب میں

خاک کے پتلے نے آخر کر دیا افشا اُسے
دفن تھا جو راز اب تک سینۂ مہتاب میں

سامنے کی چیز میں آصفؔ نہیں کوئی کشش
تک نہ یوں حیرت سے اپنے عکس کو تالاب میں



ہوں میں بھی شعبدہ کوئی دنیا کے سامنے
حیران ہو رہی ہے مجھے پا کے سامنے

ذرّے نے آج اپنی حقیقت کو پا لیا
ذرّہ نہ سرنگوں ہوا صحرا کے سامنے

اُکسا رہی ہے کوئی خلش دیر سے مجھے
رکھ دل سا پھول خارِ تمنا کے سامنے

خلوت میں کر رہا تھا گناہوں کا اعتراف
ہونٹوں کو وا نہ کر سکا دنیا کے سامنے

آصفؔ تمام مرحلے آسان ہو گئے
ٹھہری نہ اک چٹان بھی دریا کے سامنے

اعجاز آصف



کس دل سے ہم ارادۂ ترکِ جنوں کریں
ممکن نہیں کہ خواہشِ صحرا کا خوں کریں

کچھ گفتگو ہو آج عروسِ بہار سے
کچھ، ہم خزاں رسیدہ بھی حاصل سکوں کریں

ہاں بے کناریوں سے کریں آشنا اُسے
ہاں دردِ انتظار کو کچھ تو فزوں کریں

منزل کا جس سے مل نہ سکے تا ابد سُراغ
وہ راہ اختیار بتاؤ تو، کیوں کریں؟

دیں آرزو کو رنگِ رہِ یارِ خوش خرام
فرصت ملے تو آصفؔ و خالدؔ بھی یوں کریں

ــــه خالد شیرازی



نویدِ لوم بہاراں! خزاں سے ظاہر ہو
مثالِ صوتِ پریشاں، فغاں سے ظاہر ہو

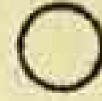
تجھے گماں ہے اگر خود پہ لفظِ روشن کا
ردائے شبنمِ عجزِ بیاں سے ظاہر ہو

چمک اُٹھے مری آنکھوں میں اشک کی صورت
جو آگ دل میں ہے روشن، زباں سے ظاہر ہو

کسی بھی سمت سے اُبھرے ستارۂ آواز
نہیں یہ قید کہ وہ آسماں سے ظاہر ہو

وہ کائنات کا خالق سہی مگر آصفؔ
یقیں ہے خود پہ اُسے تو گماں سے ظاہر ہو

اعجاز آصف



صدائے عہدِ وفا کو زوال کیوں آیا
لبِ سکوت پہ حرفِ سوال کیوں آیا

کسے خبر کہ چمن میں خزاں کی آمد پر
غرورِ شعلۂ گل کو جلال کیوں آیا

بجھا رہا تھا میں اپنے وجود کا خورشید
تری نگاہ میں رنگِ ملال کیوں آیا

شبِ فراق نے دیکھی نہ تھی مری صورت
شبِ فراق کو میرا خیال کیوں آیا

چبھن ہے ذہن میں آصف کہ اس اندھیرے میں
اُفق کے ہاتھ پہ آخر ہلال کیوں آیا



پھولوں سے ہو گی دھول جُدا، دیکھتے رہو
منظر نکھار دے گی ہوا، دیکھتے رہو
لائے گی رنگ لغزشِ پا، دیکھتے رہو
منزل بھی دے گی اپنا پتا، دیکھتے رہو

ہاں بزم میں کسی کے گریبانِ گوش تک
پہنچے گا میرا دستِ صدا، دیکھتے رہو

نیندوں میں کھو کے سیپیاں خوابوں کی دوستو
چُننے کو ہے یہ دیدۂ وا، دیکھتے رہو

کب آفتابِ تازہ کی پہلی شعاع سے
ہوتی ہے چاک شب کی ردا، دیکھتے رہو

اس کج ادا کی سمت بہ ایں جورِ مستقل
آصف بطرزِ اہلِ وفا دیکھتے رہو

اعجاز گل



ہم تم جب بھی پیار کریں گے، جان و دل صدقے ہوں گے
روحوں کی خوشبوئیں ہوں گی، باہوں کے گجرے ہوں گے

پیشرو! تم بیت چکے، اب ہم لوگوں کی باری ہے
زندانوں کے در تو وا ہوں، ہم آگے آگے ہوں گے

گمنامی کی گلیوں میں تاریخ کہاں تک پہنچے گی ؟
ایک تمھی سقراط نہیں ہو، اور بہت گزرے ہوں گے

حسن اگر زنجیر کیا ہے، عشق بھی پھر زنجیر کرو
ورنہ بات بہت پھیلے گی، دور تک چرچے ہوں گے

اے "چکوال" سے آنے والو! کچھ تو حال احوال کہو
پھول سے عارض، چاند سے چہرے، تم نے بھی دیکھے ہوں گے

اعجاز گُل



اسی جنّت جہنّم میں مروں گا
گئے موسم کو آوازیں نہ دوں گا

نئے جسموں سے مقتل جاگتے ہیں
نئے لوگوں کے رستے پر چلوں گا

مری آنکھیں سلامت ہیں تو پھر میں
پرائے خواب لے کر کیا کروں گا

لہو کی سرخیاں ـــ میرے علم ہیں
خزاں کے زرد لشکر سے لڑوں گا

کسی خطّے میں قتلِ روشنی ہو
میں اپنے شہر پر نوحہ کہوں گا

اور اس پر جو ستم ٹوٹے گا، اس کو
تمہارے نام لکھوں گا، سہوں گا



رو رہے ہیں مکیں شبوں کے
کیا ہُوئے ڈھیر سورجوں کے

آنکھ میں خواب منجمد ہیں
رنگ برساؤ حوصلوں کے

خون سے طے کیے گئے ہیں
راستے زرد موسموں کے

مقتلوں سے اُٹھائے میں نے
پھُول سے جسم دوستوں کے

اے زمیں! تیری عظمتوں میں
بہہ گئے شہر واہموں کے

اعجاز گل



کسے خیال تھا ایسی بھی ساعتیں ہوں گی
کہ میرے نام سے بھی تجھ کو وحشتیں ہوں گی

سزائے مرگ کی صورت وصال گزرا تھا
بچھڑ گئے ہیں تو کیا کیا قیامتیں ہوں گی

جدائیوں میں زمانے نے کیا سلوک کیا
کبھی دوبارہ ملے تو حکایتیں ہوں گی

خوشا کہ اپنی وفا فاصلوں کی نذر ہوئی
ہمارے بعد زمیں پر رفاقتیں ہوں گی

اُجڑ گیا ہوں مگر حوصلے سلامت ہیں
کہ ایک دن تجھے شاید ندامتیں ہوں گی



صورتِ سحر جاؤں اور دربدر جاؤں
اب تو فیصلہ ٹھہرا، رات سے گزر جاؤں

واہموں کے زنداں کا ذہن ذہن قیدی ہے
بولِ فکرِ تابندہ، میں کدھر کدھر جاؤں

میری نارسائی سے قافلہ نہ رُک جائے
میں کہ پا شکستہ ہوں، راستے میں مر جاؤں

عشق کی صداقت پر جبکہ میرا ایماں ہے
کیسے خودکشی کر لوں، کیوں بکھر بکھر جاؤں

سوانحی اشارے

صوفی تبسم

پیدائش: ۴ اگست ۱۸۹۹ء۔ امرتسر

نام: صوفی غلام مصطفیٰ

والد: صوفی غلام رسول

ابتدائی تعلیم: چرچ مشن ہائی سکول امرتسر (قائم شدہ ۱۸۵۲ء) جہاں سے میٹرک پاس کیا۔ بی۔اے تک خالصہ کالج امرتسر میں پڑھتا رہا۔ پھر بی۔اے کے آخری سال میں ایف۔سی کالج لاہور آ گیا۔ وہاں سے بی۔اے آنرز کیا۔ ایم۔اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ پھر بی۔ٹی سنٹرل ٹریننگ کالج سے کیا۔

چند ماہ گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں اور پھر اے۔ڈی۔آئی امرتسر ہی رہا۔ وہاں سے ستمبر ۱۹۲۷ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں متعین ہوا۔ ستمبر ۱۹۳۱ء تک وہاں رہا۔ پھر گورنمنٹ کالج میں آ گیا اور ۱۹۵۴ء میں وہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ ۲۵ سال یونیورسٹی میں فارسی اور اردو ایم۔اے اور آنرز کی تدریس میں شرکت کی۔

ریٹائر ہونے کے بعد چھ سال تک خانۂ فرہنگ ایران کا ڈائرکٹر رہا اور ساتھ ہی، سول سروس اکیڈمی اور فنانس سروسز اکیڈمی میں اردو پڑھاتا رہا۔ دو سال ایڈیٹر ہفتہ وار "لیل و نہار" رہا اور اس کے بعد آج تک ریڈیو سے وابستہ ہوں۔

اعزازات: (۱) حسن کارکردگی (ادب) ۱۹۶۲ء (۲) ستارۂ امتیاز۔ ۱۹۶۷ء (۳) نشانِ فضیلت (حکومت ایران)

تصنیفات: (۱) انجمن (مجموعۂ کلام فارسی، اردو، پنجابی) (۲) جھولنے۔ بچوں کی نظمیں (انعام یافتہ)

(۳) مسلمانوں کا علم جغرافیہ اور شوقِ سیاحت (۴) جاہ و جلال (ڈرامہ)

(۵) حکمت قرآن (دینی) (۶) علامہ اقبال (۷) دو ناٹک (ڈرامے) پنجابی

SEVERAL TALKS, FEATURES, PLAYS, SHORT STORIES AND CRITICAL ARTICALS ETC.

سات آٹھ کتابیں تیار پڑی ہیں۔ طباعت کا موقع نصیب نہیں ہوا۔

معین احسن جذبی

پیدائش: ۱۹۱۲ء

مقام: مبارک پور (ضلع اعظم گڑھ)

تعلیم: جھانسی، آگرہ، دہلی اور علی گڑھ میں۔ ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے اور ۱۹۵۶ء میں پی ایچ ڈی کیا۔

ملازمت: ۱۹۴۲ء میں ایم اے کرنے کے بعد رسالہ "آج کل" دہلی کا اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں وہاں سے مستعفی ہو کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں لکچرار۔ آج کل اسی شعبہ میں بحیثیت ریڈر کام کر رہا ہوں۔

تصانیف: فروزاں (مجموعہ کلام)

سید عبدالحمید عدم

نام: سید عبدالحمید — تاریخ پیدائش: ۱۰ اپریل ۱۹۱۰ء

آبائی وطن: تلونڈی موسیٰ خان، تحصیل و ضلع گوجرانوالہ۔ لیکن اپریل ۱۹۱۰ء میں والد صاحب چونکہ کاروبار کے سلسلے میں عارضی طور پر لائل پور میں اقامت پذیر تھے اس لیے راقم الحروف کی تشریف آوری وہیں ہوئی۔ تعلیم کچھ گوجرانوالہ میں اور کچھ لاہور میں مکمل ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو کر اسی محکمے سے منسلک ہو گیا۔ ۱۹۴۱ء میں محکمے کا بلند ترین امتحان (ایس۔اے۔ایس) اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر کے عہدے سے عقد ہو گیا اور اپریل ۱۹۶۶ء میں اسی عہدے سے پنشن پر رخصتی ہوئی۔

تصانیف کی تفصیل: خرابات۔ گردشِ جام۔ رمِ آہو۔ شہرِ خوباں۔ قصرِ شیریں۔ شہرِ فرہاد۔ دو جام۔ جنسِ گراں۔ پیچ و خم۔ قول و قرار۔ زیرِ لب اور متعدد دیگر۔

رئیس امروہوی

نام محمد مہدی۔ سید کے اضافے کے ساتھ۔ تخلص رئیس۔ جس میں تاحال "امروہوی" کا دُم چھلا لگا ہوا ہے۔ پیدائش کا جرم ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کو سرزد ہوا۔ پہلی جنگِ عظیم عمر میں مجھ سے ایک ہفتے بڑی ہے۔ اُدھر یورپ میں بڑی لڑائی چھڑی اِدھر امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ (ثم یوپی ثم اترپردیش) میں اس خاکسار نے ظہور فرمایا۔ میرا خاندان شروع میں سپاہی پیشہ تھا۔ راقم الحروف کے تمام بزرگ فیروز شاہ تغلق کے عہد سے شاہ عالم اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانے تک سلکِ منصبدارانِ شاہی میں منسلک تھے جب شاہانِ مغلیہ نے سپہ گری کے بجائے سخن وری کا پیشہ اختیار کیا اور زبانِ تیغ کے بجائے تیغِ زبان پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے۔ ہمارے بزرگوں نے بھی الناس علیٰ دینِ ملوکہم کی تقلید میں تلوار نیام میں ڈالی اور قلمدان سے قلم نکال لیا۔ الحمدللہ کہ نان و نمک کی فکر سے بے نیاز تھے۔ شاہی معافیاں اور جاگیریں بقدرِ ضرورت بلکہ اس سے بھی زیادہ تھیں۔ اس ماحول میں آنکھ کھولی۔ شرفازادوں کی طرح تعلیم کی ابتدا مکتب سے ہوئی۔ باپ (علامہ سید شفیق حسن مرحوم) شاعر بھی تھے فلسفی بھی تھے، ہیئت داں بھی تھے، مصنف بھی تھے اور علمِ روحانیات کے محقق بھی۔ وید، اپنشد، اوستا، اناجیل اربعہ اور قرآن مجید یہ کتابیں ہمیشہ زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ صحائفِ ارضی کے بجائے صحفِ سماوی کا مطالعہ مرحوم کا محبوب مشغلہ تھا۔ سیکڑوں مضامین اور ہزاروں شعر لکھے اور سب کو بہ احتیاط تمام صندوقوں میں بند اور بستوں میں نظر بند کر کے رکھ دیا۔ پہلا شعر دس سال کی عمر میں کہا۔ اور اس وقت سے اب تک یکواس جاری ہے۔ کسی علم کی مجتہدانہ تکمیل نہیں کی نہ کسی فن میں امتیاز حاصل کیا۔ شعر گوئی، صحافت اور ادب سے تعلق ہے اور امید نہیں کہ تادمِ آخر اس مرضِ جانکاہ سے چھٹکارا نصیب ہو سکے۔ ۲۱ برس سے روزنامہ "جنگ" سے تعلق ہے۔ یہ ہیں مختصر حالاتِ زندگی!

افسانۂ ما بیش ازیں نیست کہ گفتیم
رفتیم و گذشتیم و پدیدیم و نہفتیم

اختر انصاری دہلوی

میں ۱۹۰۹ء میں اپنے آبائی وطن بدایوں (یو۔پی) میں پیدا ہوا لیکن اپنے والد کے دہلی میں سکونت پذیر ہو جانے کے باعث تقریباً ابتدائے عمر سے دہلی میں رہا، اور تربیت و تعلیم کی منزلیں بھی دہلی میں طے کیں۔ اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی، ہندو کالج دہلی اور سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۰ء میں دہلی یونیورسٹی سے تاریخ میں بی۔اے (آنرز) کیا۔ ۱۹۳۱ء میں انگلستان گیا، لیکن یہ سفر سراسر ناکام رہا۔ ۱۹۳۲ء میں لاء میں داخلہ لیا جس کو ایک سال پڑھ کر چھوڑ دیا۔ ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۴ء میں مسلم یونیورسٹی سے بی۔ٹی کر کے یونیورسٹی ہی کے ایک اسکول میں ملازم ہو۔ ۱۹۴۷ء میں اردو میں ایم۔اے کیا، اور اسکول سے منتقل ہو کر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آ گیا۔ تین سال یہاں رہا۔ پھر ۱۹۵۰ء میں شعبۂ تعلیمات (ٹیچرز ٹریننگ کالج) میں منتقل ہو گیا جہاں اب بھی ہوں۔

میں نے ۱۹۲۵ء میں شاعری شروع کی اور ۱۹۳۲ء میں اپنا پہلا مجموعۂ کلام "نغمۂ روح" شائع کیا۔ اس وقت سے اب تک "نغمۂ روح" کے علاوہ نو شعری مجموعے، جو قطعات، غزلیات، رباعیات اور نظموں پر مشتمل ہیں شائع ہو چکے ہیں۔ منتخب کلام کے مجموعے ان کے علاوہ ہیں۔ مختصر افسانوں کے تین مجموعے اور نقد و انتقاد سے متعلق چار تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ تعلیم کے موضوع پر ایک کتاب اردو میں اور دو انگریزی میں چھپ چکی ہیں۔ متعدد تصانیف طباعت کی منتظر ہیں۔

باقی صدیقی

نام: محمد افضل	آبائی گاؤں: سہام تحصیل راولپنڈی
سن پیدائش: ۱۹۰۹ء	تعلیم: میٹرک
شعری مجموعے: جام جم (اردو نظمیں)	دارو رسن (اردو نظمیں اور غزلیں)
زخم بہار (اردو غزلیں)	بارِ سفر (اردو غزلوں کا نیا مجموعہ۔ زیر طبع)
کچے گھڑے (پنجابی نظمیں)	

یوسف ظفر

نام: محمد یوسف

تاریخ پیدائش: یکم دسمبر ۱۹۱۴ء

پہلی غزل ۱۹۲۹ء میں کہی۔ جب سے ۱۹۳۹ء تک کا کلام محفوظ نہیں۔ ۱۹۳۹ء میں نظم گوئی شعار ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں اہل غزل کے طعن و تشنیع سے غزل کی طرف لوٹا۔ شاید اس لیے بھی کہ حالاتِ زندگی کو مختصر طور پر بیان کرنے کے لیے غزل سے بہتر کوئی پیرایہ نہیں۔ بقول میر:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا ... وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

ادا جعفری

تاریخ پیدائش: ۲۲ اگست ۱۹۲۴ء ... مقام: بدایوں (یو۔پی) ... تعلیم: ایف۔اے

تصانیف: "میں ساز ڈھونڈتی رہی" (۱۹۵۰ء) ... "شہر درد" (۱۹۶۷ء)

قتیل شفائی

میری شاعری نے اگر لکھنؤ، دہلی، دکن یا پنجاب میں آنکھ کھولی ہوتی تو ایک بات بھی تھی لیکن میری شاعری نے تو وہاں جنم لیا

جہاں شاید چند لوگوں نے کسی کتاب میں سے پڑھ رکھا ہوگا یا کسی آتے جاتے سیاح کی زبانی سن لیا ہوگا کہ اس کائنات میں شاعر نام کی بھی ایک مخلوق پائی جاتی ہے اور یہ ایک ایسی مخلوق ہے جس کی نحوست، بھری پری آبادیوں کو اجاڑ دیتی ہے۔ غالباً اسی مفروضے کی بنا پر میری شفیق ماں راتوں کو اٹھ اٹھ کر مجھے مشقِ سخن سے ٹوک روک دیتی تھیں۔

میں ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوا۔ میرے دادا اکوڑہ خٹک سے یہاں آئے تھے۔ بہت ممکن ہے خوشحال خان خٹک کے پاؤں سے اُڑی ہوئی خاک کا کوئی ذرہ میرے اجداد کے دامن کو مالا مال کر گیا اور وہی دولت بالآخر مجھے اپنے باپ سے وراثت میں ملی ہو۔

یوں تو مجھے بارہ تیرہ برس کی عمر ہی سے میری سوچ بے چین سی رکھتی تھی لیکن محسوس کر کے شعر کہنے کی ابتدا ۱۹۳۵ء سے ہوئی جب اچانک میرے شاہ خرچ باپ کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا اور میرے شعور نے رنگا رنگ تجربوں کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کیا۔ اور مجھے زندگی میں پہلی بار اس حقیقت کو سمجھنے کی فرصت ملی کہ لوگ ایک ایک چہرے پر کئی کئی چہرے سجائے بیٹھے ہیں۔

فکرِ معاش کی زو میں آیا تو ہری پور کے سبزہ زاروں کو چھوڑ کر راولپنڈی آنا پڑا۔ یہ شہر اور اس شہر کا مزاج مجھے ایسا راس آیا کہ اس شہر کی بوباس اب تک اپنی سانسوں میں رچی ہوئی محسوس کرتا ہوں اور اکثر سوچتا ہوں کہ اگر میں راولپنڈی نہ آیا ہوتا تو مجھے اپنی سوچ کی انگلی پکڑے نہ جانے کہاں کہاں گھومنا پڑتا۔ راولپنڈی میں "تلوک چند محروم تھے، عبدالعزیز فطرت تھے، عبدالحمید عدم تھے، باقی صدیقی تھے، انجم رومانی تھے اور نوجوانوں میں احمد ظفر تھے، جمیل ملک تھے، جگن ناتھ آزاد تھے، منظور عارف تھے، حسن طاہر تھے اور ان سب سے بڑھ کر حضرت شفا تھے جنھوں نے میری شاعری کو اپنے پاؤں چلنا سکھایا اور پھر اسی راولپنڈی میں بیٹھے بیٹھے اپنے ندیم صاحب کوسوں کی دوری کے باوجود میری روح میں آ بسے اور نوجوان شعرا کے ایک بہت بڑے ہجوم میں مجھے ایک الگ پہچان کا مالک بنا دیا۔

آج میں لاہور میں مقیم ہوں۔ یہاں میرا قیام ۱۹۴۷ء سے ہے۔ اس دوران میں نے نظمیں کہیں، گیت لکھے، غزلوں کو ذریعۂ اظہار بنایا لیکن یہ سب کچھ میں نے محض رسمی یا روایتی ڈھب سے نہیں کیا۔ بلکہ میں نے تکنیک کے لاتعداد تجربوں کے علاوہ شاعری کو اپنا الگ رنگ اور اپنا الگ اسلوب بھی دیا۔ میری نظمیں، میرے گیت اور میری غزلیں لوگ صرف پڑھتے ہی نہیں انھیں اپنے حافظے میں محفوظ بھی رکھتے ہیں، انھیں دہراتے بھی ہیں، انھیں گنگناتے بھی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک شاعر کے لئے دس جانبدار نقادوں سے ایک غیر جانبدار قاری زیادہ اہم ہے۔

میں بنیادی طور پر ایک غنائی مزاج رکھنے والا شاعر ہوں۔ مجھے اس بات پر پوری پوری قدرت حاصل ہے کہ ایک رستے ناسور سے جذبے کو بھی چاندی کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کا ہار پہنا دوں۔ میرے نزدیک ماتھے پر تیوریاں چڑھائے ہوئے شعر کی قیمت اس کاہن سے زیادہ نہیں جس کی عظمت سے لوگ ڈرتے تو ہیں مگر اس سے پیار نہیں کرتے اور میں وہ خوش قسمت شاعر ہوں جسے قاری کا پیار ملا ہے۔

قیوم نظر

پیدائش: مارچ ۱۹۱۴ء
تعلیم: ایم اے (پنجاب)
مشاغل: پڑھنا، پڑھانا
تصانیف: قندیل، پون جھکولے، سویرا، ہم صفیر

مجید امجد

پیدائش: ۱۹۱۴ء مقام: جھنگ مگھیانہ

۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔اے کی ڈگری لی۔ آٹھ نو سال ہفتہ وار اخبار "عروج" جھنگ کا ایڈیٹر رہا۔ اس کے بعد سرکاری ملازمت میں آگیا۔ آج کل محکمہ خوراک میں اے۔ایف۔سی ہوں۔ اور ساہی وال (سابق منٹگمری) میں مقیم ہوں۔ نظموں کا ایک مجموعہ "شب رفتہ" ۱۹۵۸ء میں چھپا تھا۔ یہ سب غزلیں اس مجموعے کے بعد کی ہیں۔

شان الحق حقی

پیدائش: دہلی، ۱۵ ستمبر ۱۹۱۷ء تعلیم: دلّی، پشاور، علی گڑھ

۱۹۴۴ء میں سلمیٰ سے شادی ہوئی جو اس وقت علی گڑھ کے زنانہ کالج میں لیکچرار تھیں اور اب گورنمنٹ گرلز کالج کراچی میں اردو پڑھاتی ہیں۔

۱۹۴۷ء سے قیام کراچی میں ہے۔ سنٹرل انفرمیشن سروس سے تعلق ہے۔ محکمہ مطبوعات و فلم سازی سے وابستہ۔ مدیر اعلیٰ "ماہ نو" سرپرست جنرل منیجر سیلز پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن۔

۱۹۵۸ء سے ترقی اردو بورڈ کے ساتھ وابستگی ہے۔ بحیثیت معتمد اعزازی و مدیر "اردو نامہ"

مطبوعات: انتخاب ظفر مع مقدمہ (انجمن ترقی اردو ہند)۔ تار پیراہن (مجموعۂ نظم)۔ نشید حریت، صور اسرافیل (منظوم تراجم از نذر الاسلام)، خیابان پاک۔

ضیا جالندھری

پورا نام، ضیا نثار احمد۔ ۲ر فروری ۱۹۲۳ء کو جالندھر شہر میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ والد سید سردار احمد شاہ سرکاری ملازم تھے۔ ان کی ملازمت کا بیشتر حصہ جالندھر اور لاہور میں گذرا۔ سوائے ایک آدھ سال کے جب وہ پٹھان کوٹ میں تھے اور میں تیسری جماعت میں تھا۔ والدین لاہور چلے جاتے تو میں جالندھر میں اپنی نانی کے پاس رہتا۔ سکول میں کرکٹ کا شوق تھا۔ سکول کی تعلیم کے بعد لاہور آگیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۹۳۹ء میں داخل ہوا اور ۱۹۴۵ء میں اسی کالج سے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کیا۔ اس سے پہلے بی۔اے کے ساتھ فارسی میں آنرز کر چکا تھا۔

ایم اے کے بعد کچھ دن اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچراری کی۔ پھر دسمبر ۱۹۴۵ء میں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے پر ریڈیو پاکستان کے لاہور سٹیشن پر اور ۱۹۴۸ء میں کراچی میں نیا ریڈیو سٹیشن کھلنے پر وہاں اسی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۹ء میں اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوا جس کے نتیجے کے طور پر ڈاک خانوں کے محکمے سے وابستہ ہو گیا۔ اس محکمے میں مختلف حیثیتوں سے کام کرتا رہا۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک دو سال کے لئے پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کا ڈائرکٹر اور وائس چیئرمین رہا۔ آج کل محکمہ ڈاک کا ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ہوں۔

اب تک شاعری کے دو مجموعے "سرِ شام" اور "نارسا" شائع ہو چکے ہیں۔

فارغ بخاری

نام: احمد شاہ
تاریخ پیدائش: نومبر ۱۹۱۷ء (پشاور)
تعلیم: ایف۔اے (اردو آنرز) منشی فاضل، پشتو فاضل)
مشاغل: طبابت، صحافت، تصنیف و تالیف

تصانیف: ۱۔ادبیات سرحد (اردو) (سرحد کے اردو شعرا و ادبا کا تذکرہ)
۲۔پشتو لوک گیت
۳۔عورت کا گناہ (افسانے)
۴۔زیر و بم (مجموعۂ کلام)
۵۔باچا خان (خان عبدالغفار خان کے سوانح حیات)
۶۔آیات زندگی (ایک طویل نظم)
۷۔نوبان راوان (ہندکو کے جدید شعرا کے کلام کا انتخاب)
۸۔اٹک کے اس پار
۹۔خوشحال خان کے افکار
۱۰۔رحمان بابا کے افکار
۱۱۔پٹھانوں کے رومان
۱۲۔پشتو شاعری
}یہ کتابیں رضا ہمدانی اور میری مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

اور بچوں کی کتابیں۔ زیر طبع: پشتو نثر۔ ہندکو ادب
دوسرا مجموعۂ کلام

شہرت بخاری

نام: سید محمد انور
تاریخ ولادت: ۲ر دسمبر ۱۹۲۵ء
تعلیم: ایم۔اے (فارسی و اردو)
ملازمت: صدر شعبۂ اردو و فارسی، اسلامیہ کالج، سول لائینز۔ لاہور
غزلوں کا پہلا مجموعہ طاقِ ابرو کے نام سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔

جعفر طاہر

نام: سید جعفر طاہر
تاریخ پیدائش: ۲۹ر مارچ ۱۹۱۷ء
مقام پیدائش: جھنگ شہر
تعلیم: بی۔اے
تصنیفات: ہفت کشور (آدم جی انعام یافتہ نظمیہ)، ہفت آسمان (کینٹوز کا مجموعہ) (زیر تکمیل) گرد سحر۔ غزلیات کا مجموعہ (زیر ترتیب)

ظہور نظر

۲۲ر اگست ۱۹۲۳ء کو پولیس لائینز منٹگمری (ساہی وال) میں پیدا ہوا۔ مجھ سے پہلے لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں جن میں سے سات بفضل خدا اب بھی زندہ ہیں۔ ذرا سیانا ہوا تو معلوم ہوا ماں اور بہنیں مجھ سے عبادت کی حد تک محبت کرتی ہیں۔ یہ ایک عجیب احساس تھا جس کی بنا پر میں خود کو اپنے ساتھی بچوں سے بہت افضل خیال کیا کرتا تھا مگر یہ افضلیت جلد ہی ختم ہو گئی۔ سات سال کا تھا کہ والد جو شدید بیماری کے باعث پنشن لینے کے بعد منٹگمری کے ایک قریبی چک ۵-۹ میں مقیم ہو گئے تھے، وفات پا گئے۔ میں ان دنوں منٹگمری ڈسٹرکٹ جیل کے سکول میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا۔ کچھ عرصہ بعد دو میل دور اسکول جانے کی زحمت سے بچانے کے لئے مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لئے سینکڑوں میل دور قادیان بھیج دیا گیا جہاں کچھ عرصہ پہلے میری ایک بہن بیاہی گئی تھی۔ میرے والد کے تمام عم زاد احمدی تھے، یہ سب کچھ انہی کے مشورے سے ہوا۔ ماں سے یہ میری پہلی جدائی تھی۔ ماں نے اسے کیسے برداشت کیا، یہ میں نہیں جانتا لیکن میرے لئے یہ صدمہ آج بھی ناقابل برداشت ہے۔ میری زندگی کے سارے المیے اسی صدمے کی پیداوار ہیں۔ اسکول اور رشتہ داروں سے نفرت پہلا ردعمل تھا۔ میں کہ ایک ہونہار اور خوش مزاج

طالب علم تھا، یکسر بدل گیا۔ قادیان پہنچتے ہی میں سنکی بن گیا۔ دن بھر اسکول سے بھاگنے کی تدبیریں سوچتا اور رات بھر جاگ جاگ کر ماں سے ملنے کی دعائیں مانگتا۔ راتوں کو جاگنے کی عادت مجھے انھیں دنوں سے ہے۔ ماں تو ایک سال کے بعد مل گئی لیکن تعلیم حاصل کرنے کا شوق دوبارہ نہ مل سکا۔ اسکول سے بھاگنے اور آوارہ پھرنے کی عادت روز بروز پکی ہوتی گئی۔ نئے رشتہ دار جو یقیناً میرے ہمدرد ہوں گے میری آوارگی پر آپے سے باہر ہو گئے ایسی ایسی سخت سزائیں دیں کہ میں بھی آپے سے باہر ہو گیا، چنانچہ آوارگی کے ساتھ غنڈہ گردی بھی شروع کر دی۔ اب میری زندگی کا واحد نصب العین تعلیم اور رشتہ داروں سے نفرت تھا۔ فیل تو کبھی نہ ہوا لیکن ہر قسم کی سختیوں کے باوجود آٹھویں جماعت سے آگے قدم نہ دھرا۔ اسکول چھوڑنے کے چند ماہ بعد ہی شہر کے لفنگے لڑکوں میں میرا نام سر فہرست تھا۔ انھیں دنوں مجھے اس سانولی لڑکی کے گھر آنے سے روک دیا گیا جو اب بھی اکثر میرے دل کے آنگن میں آنکھ مچولی کھیلنے آنکلتی ہے۔ اسے دیکھ کر میرے دل سے نفرت کے سارے داغ دُھل جایا کرتے تھے۔ اس پابندی نے مجھے حواس باختہ کر دیا اور میں خطرناک قسم کا غنڈہ بن گیا۔ نئے رشتہ داروں میں سے ایک جس کا تشدد مجھے آج بھی یاد ہے، میری حقارت کا محور بن گیا۔ میں اسے قتل کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ اب میں پل بھر میں بھڑک اٹھنے والا شعلہ تھا۔ اُدھر کسی نے بات کی اِدھر میں نے چاقو نکالا۔ لوگ میرے کمانی دار چاقو سے خائف رہنے لگے تھے۔

اسکول سے بھاگنے پر ملنے والی خوفناک سزائیں میں نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کی تھیں لیکن سانولی سے نہ ملنے کی پابندی میری برداشت سے باہر تھی، میں مشتعل ہو گیا۔ نفرت، حقارت اور عداوت کا الاؤ ہر وقت میرے سینے میں جلنے لگا اور میں آوارگی کی معراج پر پہنچ گیا۔ چوری ٹھگی اور سینہ زوری معمول بن گئی۔ چھوٹی سی عمر میں میرے اعصاب ہر نشہ آور چیز کا ذائقہ چکھ چکے تھے اور میرا جسم معصوم اور گناہگار ہر قسم کے نسوانی بدن کی لذت سے آشنا ہو چکا تھا۔ بات بہت بڑھنے لگی تو ماں نے اپنی محبت کا واسطہ دے کر روکا اور میں رک گیا۔ شاید میں خود بھی تنگ آ چکا تھا۔ سب کچھ چھوڑ دیا سوائے شراب کے۔ یہ ۱۹۳۹ء کے آخر کی بات ہے۔ اس عرصے میں کئی چھوٹے موٹے کام بھی سیکھے تھے۔ جلد سازی، ٹرنک سازی، مشین مینی وغیرہ۔ آوارگی چھوڑ کر جب ان پیشوں میں سے کسی ایک کو مستقل طور پر اپنانے کے لئے غور کیا تو رو دیا۔ پورے خاندان میں دور دور تک ایک بھی تو ایسا نہ تھا۔ سب بڑے لوگ تھے۔ ماں نے کہا، "روتا کیوں ہے؟ اب بھی وقت ہے، پڑھ لے۔ ہم محنت مزدوری کر کے تمھیں پڑھائیں گے۔" مجھ سے بڑی بہن جو لوگوں کے کپڑے سی سی کر گھر کا خرچ چلایا کرتی تھی، ڈبڈبائی آنکھوں سے ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی اور میں بوجھل دل کے ساتھ دوبارہ اسکول میں داخل ہو گیا جہاں میری حیثیت ایک عادی مجرم کی سی تھی۔ اسکول میں ہونے والی ہر چھوٹی بڑی واردات پر مجھے سزا دینا فرض سمجھ لیا گیا تھا۔ سر بیجا جھوٹے الزامات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں پھر بھڑک گیا اور تعلیم چھوڑ کر اپنی ایک سگی بہن کے پاس لاہور چلا آیا۔ جہاں میری طرح کے دو آوارہ بگڑے ہوئے لڑکے جو میرے قریب کے رشتہ دار تھے، کراچی سے سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ میں داخل ہونے آئے تھے اور سیر کی غرض سے چند دنوں کے لئے لاہور میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ماں مجھے قادیان لے جانے کے لئے لاہور آئی تو بہنوئی نے مجھے بھی سکول فار الیکٹریشنز میں داخل کرانے کا مشورہ دیا۔ ماں اور مجھے دونوں کو یہ تجویز پسند آئی اور میں اس عہد کے ساتھ کہ اب کے پوری محنت کے ساتھ پڑھوں گا اس اسکول میں داخل ہو گیا۔ لیکن کوشش کے باوجود اس عہد پر قائم نہ رہ سکا۔ اسکول میں داخل ہوتے ہی تعلیم حاصل کرنے سے نفرت کی برق پھر چمکنے لگی۔ آوارگی کے بادل پھر اُمڈنے لگے۔ ماں کی یاد سے زیادہ سانولی کی یاد ستانے لگی۔ جلد ہی مجھ پر یہ انکشاف ہو گیا کہ سانولی کے بغیر جینا ناممکن ہے۔ میں نے پھر پرانے دھندے شروع کر دیئے۔ شراب نوشی تو روزمرہ میں شامل تھی۔ ماں کو پتہ چلا تو لدھیانہ آ گئی۔ شاید اسے علم تھا کہ میرے بگڑنے کی وجہ اس کی پہلی جدائی تھی۔ میں اور میرے دونوں رشتہ دار لڑکے

ہوسٹل چھوڑ کر ماں کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ لیکن اب کے ماں کا میرے پاس آجانا بھی مفید ثابت نہ ہو سکا۔ ساتوی کی جدائی بہت خوفناک ثابت ہوئی۔ اس یقین کے بعد کہ وہ کبھی میری نہ ہو سکے گی، میں نے اس بار اسکول چھوڑنے کی بجائے دنیا چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ تین بار خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ دو بار تو خوفِ مرگ سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ تیسری بار بچا لیا گیا۔ ایک سال کے بعد اسکول میں فوجی بھرتی ہوئی۔ پتہ چلا کہ وہ لڑکے بھی جن کا کورس ختم ہونے میں چھ ماہ باقی ہیں بھرتی ہو سکتے ہیں۔ انہیں مکمل تعلیم کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید موت آسان ہو جائے، میں نے بھی بھرتی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ماں سے کہا کہ کچھ دنوں کے لئے جگندر نگر جا رہا ہوں اور جا پہنچا انبالہ چھاؤنی جہاں دو ہفتے خاردار تاروں میں بجلی دوڑانے کی تربیت دینے کے بعد اس رجمنٹ کے ساتھ ہوڑہ بھیج دیا گیا جو چند روز وہاں قیام کرنے کے بعد برما جا رہی تھی۔ ہوڑہ پہنچا تو یہ سوچ سوچ کر دماغ پھٹنے لگا کہ جب ماں کو میرے بھرتی ہو کر محاذ پر چلے جانے کا علم ہوگا تو صدمے سے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ دو لڑکے کئی دنوں سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ میں نے ان کی ہمت بندھائی اور خود بھی ان کے ساتھ بھاگ نکلا کچھ دن دلی میں مزدوری اور آوارگی کرنے کے بعد گھر پہنچا تو ماں قریب المرگ تھی۔ میرے آنے پر وہ ساری رات سجدے میں پڑی رہی۔ صبح میں نے سبزی لانے کے لئے گھر سے باہر جانے پر انکار کیا تو اس نے بڑے اعتماد سے کہا، تمہیں کوئی نہیں پکڑے گا، اللہ نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے لیکن میں نہ مانا۔ کافی دنوں تک باقاعدہ چھپا رہا۔ پھر کبھی کبھار باہر نکلنے لگا۔ دو ماہ تک کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو بے دھڑک لدھیانہ کی گلیوں میں آوارگی کرنے لگا۔

اقبال ہوٹل لدھیانہ کے مالک سے میری کافی واقفیت تھی۔ اس نے مجھے بیکار گھومتے دیکھا تو معمولی سے مشاہرے پر بطور اسسٹنٹ منیجر ملازم رکھ لیا۔ چند ہی مہینوں میں وہ مجھ پر غیر معمولی طور پر اعتماد کرنے لگا جس میں محبت کی جھلک بھی تھی۔ آہستہ آہستہ میں اقبال ہوٹل کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اصل میں مالک مجھے معشوقوں کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ یہیں میری جان پہچان لدھیانہ کے ادبی حلقوں سے ہوئی۔ ساحر، حافظ، احمد ریاض، اعجاز اکرم، م حسن لطیفی تو روز کے آنے والے تھے۔ کبھی کبھی کمانڈر انور، انشاء اور گرپال متل بھی آجاتے تھے۔ مجھے یہ لوگ اچھے لگے شاعری سے مجھے بچپن ہی سے بڑی دلچسپی تھی۔ بیت بازی کی وجہ سے بہت سے اشعار ازبر تھے۔ بڑے اور چھوٹے مرزا صاحب کے مجموعے "درِ ثمین" اور "درِ شہوار" تو مجھے پورے کے پورے یاد تھے۔ بزم اقبال کے اجلاس ہوٹل ہی میں ہوا کرتے تھے۔ میں بھی دلچسپی لینے لگا۔ اسی بزم کے اجلاس میں میں نے اپنی پہلی غزل پڑھی جو مصرع طرح پر لکھی گئی تھی۔ رات بھر جاگنے کے باوجود میں صرف تین شعر لکھ سکا تھا۔ چار شعر حافظ نے لکھ کر دیئے تھے۔ یہ غزل میری زندگی کا اہم ترین موڑ ثابت ہوئی۔ عشق کا جنون شباب پر تھا۔ میں باقاعدگی سے شعر کہنے لگا۔ دوستوں نے ہمت افزائی کی اور کلاسیکی ادب کے مطالعہ کا مشورہ دیا اور میں کہ پڑھنے کے نام سے بھی بدکتا تھا، دن رات پڑھنے لگا۔ جو کچھ ملا پڑھ ڈالا پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے انگریزی پڑھنے کی ترغیب دی۔ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کا ایک مشہور و معروف طالب علم مرتضیٰ کسی مسئلے پر میرے ساتھ بحث کر رہا تھا۔ بحث نے جھگڑے کی صورت اختیار کر لی تو اس نے مجھے "پیٹی بورژوا" کہا۔ میں سمجھا کوئی گندی گالی ہے۔ وہ ہنگامہ ہوا کہ خدا کی پناہ۔ بات کھلی تو اس نے مجھے جی بھر کر جاہل کہا۔ مجھے شدید احساسِ کمتری ہوا۔ اسی دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ انگریزی ضرور سیکھنی چاہیے گائڈ بکس خریدی گئیں۔ ٹیوٹر رکھا گیا۔ اور یوں وہ مضمون جو مجھے اسکول میں سب سے زیادہ ناپسند تھا، میرا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ آہستہ آہستہ ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لینے لگا۔ یہ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ "کانگریس"، "سوشلسٹ"، "کمیونسٹ" و "مسلم لیگ" ساری جماعتیں زور و شور سے کام کر رہی تھیں۔ تاریک ماضی نے کمیونسٹ پارٹی کی طرف رہنمائی کی، اور میں کچے دھاگے سے بندھا ہوا

پارٹی کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۲ء تک جاری رہا، سوائے تھوڑی تھوڑی دیر کے دو وقفوں کے۔ پہلا وقفہ میری پہلی شادی تھی جو میں نے ایک بڑے گھر کی لڑکی سے خفیہ طور پر کی تھی۔ یہ وقفہ میری زندگی کے خوبصورت ترین دنوں پر مشتمل تھا لیکن تھا بہت مختصر۔ شادی سے صرف گیارہ ماہ بعد میری بیوی نے ایک بچی کو جنم دیا جو جان لیوا ثابت ہوا، اُس کے لئے بھی اور بچی کے لئے بھی۔ دوسرا وقفہ بھی نیم ازدواجی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ تقریباً ۲ سال ایک لڑکی سے شادی کی امید میں بہاولپور بیٹھا رہا۔ یہ لڑکی میری ماں اور دوسرے قریبی عزیزوں کی پسند تھی، جو پھر بعد میں میری پسند بھی بن گئی تھی۔ یہ عرصہ میں نے چند ماہ ڈرافٹسمین، چند ماہ الیکٹریشن، اور باقی بطور ایڈیٹر ہفت وار "خلیج" بہاولپور بسر کیا۔ پھر وہ ہوائی محل اچانک گر گیا جسے میرے اور میری ماں کے خوابوں نے مل کر تعمیر کیا تھا۔ پنجاب میں اُن رشتہ داروں کے طنز کا ڈر تھا جنھوں نے مجھے بہاولپور جانے سے روکا تھا، اس لئے کراچی چلا گیا اور وہاں پھر سے سیاسی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا جو کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی عاید ہونے تک جاری رہا۔ ۱۹۵۲ء میں پھر بہاولپور چلا آیا۔ شاید قسمت میں باقاعدہ ازدواجی زندگی بسر کرنا بہاولپور میں ہی لکھا تھا۔ تب سے یہیں ہوں۔ چھ بچوں کا باپ ہوں جن میں پانچ لڑکیاں ہیں۔ زندہ رہنے کے لئے نامہ نگاری کرنے، اخبار نکالنے، ٹھیکیداری کرنے، کاشتکاری کرنے، ہوٹل چلانے اور فلمی گانے لکھنے کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کئی اور کام بھی کر چکا ہوں۔ دستاویزی فلمیں بنانے کا کام بھی شروع کیا تھا جو بُری طرح ناکام رہا۔ اقتصادی طور پر بھی اور جذباتی طور پر بھی۔ مقروض بھی ہوا اور دو بڑے پیارے دوستوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ "پڑوسی" کے گانے لکھنے کے بعد بیکار ہوں۔ پہلا مجموعہ "جھلملیاں" ۱۹۴۵ء میں عباسیہ اکیڈمی بہاولپور نے شائع کیا تھا۔ یہ مجموعہ جو ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک کی نظموں، غزلوں اور گیتوں پر مشتمل تھا، میرے پبلشر کے جھگڑے کی وجہ سے غارت ہو گیا۔ صرف چند شہروں میں چند کاپیاں فروخت ہوئیں، باقی پبلشر کے گودام میں دیمک نے چاٹ لیں۔ دوسرا مجموعہ جو ۱۹۴۴ء سے ۱۹۶۰ء تک کی منتخب نظموں پر مشتمل ہے، گذشتہ سال "ریزہ ریزہ" کے نام سے "کتاب نما" سے شائع ہوا۔ تیسرا مجموعہ "زنجیر وفا" جس کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے، عنقریب ادارۂ نگارشات لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔

مجروح سلطان پوری

یوپی میں پیدا ہوا۔ اودھ کے ایک چھوٹے سے ضلع سلطان پور کا باشندہ ہوں۔ تعلیم عربی و فارسی ہے۔ لکھنؤ سے طب یونانی میں سند حاصل کی۔ شاعری ۱۹۳۹ء سے شروع کی۔ ۱۹۴۵ء سے بمبئی میں ہوں۔ کبھی کبھی شعر کہتا ہوں۔ زیادہ تر فلموں کے گیت لکھتا ہوں کہ گذر اوقات کا ذریعہ یہی ہے۔ مارکسزم کو مانتا ہوں، کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں ہوں۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے علاوہ عملاً کسی تحریک سے کبھی وابستگی نہیں رہی۔ عمر تقریباً ۴۰ سال ہے۔

عظیم مرتضیٰ

۱۳ر ستمبر ۱۹۳۳ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ بچپن سوجان پور (ضلع گورداس پور، بھارت) میں گذرا۔ قیام پاکستان کے وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کا ایم اے کر رہا تھا جب تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے سیکریٹریٹ میں ملازم ہو گیا۔ آج کل زرعی ترقیاتی کارپوریشن میں بطور اسسٹنٹ ڈائرکٹر فنانس کام کر رہا ہوں۔

رضا ہمدانی

نام: مرزا رضا حسین ہمدانی　　مقام پیدائش: پشاور محلہ خداداد　　تاریخ پیدائش: مارچ ۱۹۱۶ء

تعلیم: اسکول کے ذریعہ، میٹرک — پرائیویٹ، منشی فاضل، پشتو فاضل　　　　پیشہ: میڈیکل پریکٹیشنر
مذہبی تعلیم: (۱) رئیس الحفاظ علامہ حافظ کفایت حسین صاحب قبلہ — (ان سے چھ پارے قرآن مجید کے بھی حفظ کئے تھے)
(۲) علامہ سید عدیل اختر صاحب قبلہ مرحوم پرنسپل مدرسۃ الواعظین لکھنؤ (ان سے جزوی طور پر عربی بھی پڑھی تھی)
ادبی رجحانات: (۱) اردو، فارسی، پشتو اور ہندکو پنجابی میں شعر و شاعری، نظم غزل وغیرہ
(۲) نثر میں، تنقیدی و تحقیقی مضامین — افسانہ، ریڈیائی فیچر، فارسی اور پشتو نیز کشمیری ادب کے تراجم
تصانیف و مطبوعات: (۱) پشتو ادب جلد ۱ (پشتو کے قدیم شعراء کا تذکرہ اور تنقیدی جائزہ)
(۲) پشتو افسانے: جدید پشتو کے منتخب افسانوں کا اردو روپ (۳) حیات جمال الدین افغانی
(۴) بچوں کے لئے نصف درجن کتابچے (کہانیاں اور مضامین)۔ (۵) رگ مینا۔ اردو غزلیات کا مجموعہ
(۶) مراۃ الاسلام۔ مذہبی مضامین کا مجموعہ۔ (۷) ستوری (ستارے) پشتو زبان میں ادبی تنقیدی و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ
فارغ بخاری کے اشتراک سے حسب ذیل تصانیف و تالیف
(۱) "منتخب ادب" — (اردو ادب جدید کی نظم و نثر کا انتخاب)۔ (۲) "رحمان بابا کے افکار" — پشتو کے مشہور شاعر رحمان بابا کے منتخب اشعار کا منظوم اردو ترجمہ)
(۳) "خوشحال خان کے افکار" — (پشتو کے مشہور شاعر خوشحال خان خٹک کے منتخب اشعار کا اردو نظم میں ترجمہ)
(۴) "پٹھانوں کے رومان" — (پٹھانوں کی لوک کہانیوں کا افسانوی روپ)
(۵) "اٹک کے اس پار" — (پٹھانوں کی زبان، ادب اور کلچر کے متعلق مختلف مضامین)
(۶) "پشتو شاعری" — کلاسیکل پشتو شاعری کا منظوم اردو ترجمہ۔ ایک ضخیم و طویل تبصرہ و مقدمہ)
زیر قلم یا غیر مطبوعہ مسودے: (۱) پشتو کے جدید شعراء کا تذکرہ۔ (۲) "... اور سعدی نے کہا" گلستان سعدی شیرازی کے انتخاب کا اردو ترجمہ
(۳) "اٹک کے اس پار" دوسرا حصہ۔ (۴) "پشتو ڈرامہ" — پشتو کے ڈراموں کا اردو ترجمہ مع مقدمہ
(۵) پشتو زبان میں تنقیدی مضامین کا مجموعہ　(قول پارسنگ) پشتو غزل، ڈرامہ اور افسانہ کا جائزہ۔
۱۹۳۹ء میں ایک ادبی ماہنامہ "ندا" نکالا۔ فارغ بخاری کے ساتھ دو سال تک ماہنامہ "سنگ میل" مرتب کیا۔ ۱۹۵۲ء میں اس کا ڈیکلریشن ضبط ہو گیا۔ اس سے پہلے ۱۹۳۸ء میں ہفت روزہ "شباب" پشاور سے اور پھر لاہور سے نکالا۔

تابش دہلوی

نام: مسعود الحسن　　　　مقام پیدائش: دلی　　　　تاریخ پیدائش: ۹ نومبر ۱۹۱۳ء
تعلیم: بی۔اے　　　　مشاغل: ملازمت ریڈیو پاکستان
تصانیف: مجموعۂ غزلیات "نیم روز" (اشاعت ۱۹۶۳ء)۔ مجموعۂ غزلیات (زیر طبع)۔ مجموعۂ منظومات (زیر طبع)
فانی — شخصیت اور شاعری (زیر طبع)

افضل پرویز

پیدائش ۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو راولپنڈی میں ہوئی۔ تعلیم اسلامیہ سکول راولپنڈی میں حاصل کی اور وہیں سے میٹرک کا امتحان

پاس کیا۔ عربی فارسی کی تعلیم والد صاحب سے حاصل کی جو ایک جید عالمِ دین تھے۔ میری پدری زبان فارسی اور بلوچی ہے۔ والدہ ماجدہ کی طرف سے پنجابی اور پوٹھوہاری زبان گھٹی میں ملی اور پنجابی ادب عالیہ کی تعلیم بھی انہی کی مرہونِ منت ہے۔ خود گورمکھی اور ہندی میں دسترس حاصل کی۔ خاکسار تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ قید و بند کی مصیبت بھی جھیلی۔ جنگِ عظیم دوم میں وارنٹ افسر کی حیثیت سے برما فرنٹ پر خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں سول میں نوکری کی اور پھر صحافت کے میدان میں اُتر آیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا سرگرم رکن رہ چکا ہوں۔ راولپنڈی میں کئی ثقافتی انجمنوں کی داغ بیل ڈالی اور انھیں پروان چڑھایا۔ موسیقی کی تعلیم آفتابِ موسیقی استاد اسد علی خاں صاحب اور پٹیالہ گھرانے کے استاد عاشق علی خاں مرحوم کے شاگرد اُستاد نواب خاں سے حاصل کی۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے سولہ سال سے وابستہ ہوں۔ موسیقی کے پروگرام دس سال تک کئے۔ اب فیچر، ڈرامے، غنائیے لکھتا اور پوٹھوہاری پروگرام "جمہور دی واز" میں چودھری کی حیثیت سے کمپیئر کرتا ہوں۔ ٹیلی ویژن سے کئی فیچر اور ڈرامے اپنی زیرِ ہدایت پیش کر چکا ہوں۔ روزنامہ "جنگ" راولپنڈی کے نیوز سیکشن سے منسلک ہوں۔

جلیل حشمی

میرا نام میرے لئے ابھی اجنبی ہے ——— جلیل الرحمٰن!

جلیل حشمی بننے کی کیا تقریب تھی یہ بتانا پرانے کھاتے کھولنے کے برابر ہے۔ تاریخِ پیدائش لکھنا گویا ہندسوں کو بلا ضرورت استعمال کرنا ہے کیا عمر کا اندازہ اس سے نہیں لگایا جا سکتا کہ پچھلے دو برسوں سے میری کنپٹیوں کے بالوں میں چاندی کے تاروں کا دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا ہے۔

یہ دوسری جنگِ عظیم کی بات ہے جب میں نویں درجے میں پڑھتا تھا۔ جانے کیا ہوا کہ ایک صبح میں سکول کو جانے کے بجائے فوجی بارک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیس پردیس کا مفہوم اس وقت معلوم ہوا جب ملک کے طول و عرض کے علاوہ باہر کا تھکا دینے والا سفر کیا۔ مجھے آج تک قحطِ بنگال کے مناظر نہیں بھولے۔ حملہ آور جہازوں کی زہرہ گداز اُڑانیں، جھیموں کی اُڑتی ہوئی کترنیں، ہنستے بستے شہروں کے ملبے، بموں کے دھماکے، برما کے مہاجرین کی زبوں حالی اور سفید فام آقاؤں کا سلوک ——— اور بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی آوازیں اب بھی میرے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں۔ جنگِ عظیم کے سفر کے اختتام پر اندر کا سفر شروع ہوا جو ابھی جاری ہے۔

سکول کی بات کو چھوڑیئے۔ میں نے تو حقیقی تعلیم جنگ کی آشوب گاہ میں حاصل کی ہے۔ یونیفارم اتارنے کے بعد ایک عرصہ تک آڈٹ کی حالانکہ حساب مجھے جب آتا تھا نہ اب آتا ہے۔ گزشتہ چودہ برسوں سے معلمی کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ یہ بتانا تو بھول گیا کہ میں پشاور میں پیدا ہوا تھا لیکن:

اے پشاور تری گلیوں پہ فدا ہو جاؤں　　　گھر سے جب نکلوں میں آبلہ پا ہو جاؤں

بے مہریٔ احباب کا شکوہ اور سنگینیٔ حالات کی شکایت! یہ ایسی باتیں ہیں جن پر کبھی میں نے سوچا ہی نہیں۔

موضوعات میں جنگ سے نفرت اور محبت کے روپ نے مجھے ہمیشہ اپنی طرف کھینچا ہے۔ نظم میری محبوب ترین صنف تھی اور اس نے مجھے محنت کرنا سکھایا ہے۔ لیکن ۳۱ مئی ۱۹۷۶ء کی ایک شام جب مجھ سے میرا چہاردہ[۱۴] سالہ اکلوتا بیٹا معظم عقیل ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا تو غزل کی دیوی مہربان ہوئی۔

غلام ربانی تاباں

تاریخ پیدائش: ۱۴ر فروری ۱۹۱۴ء
مقام پیدائش: قائم گنج۔ ضلع فرخ آباد (یوپی)

تعلیم: بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی
مشاغل: ملازمت۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کا جنرل مینیجر ہوں

تصنیفات: "سازِ لرزاں" نظموں کا مجموعہ (۱۹۵۰ء) ـ "حدیثِ دل" غزلوں کا مجموعہ (۶۲/۱۹۶۰ء)

منظور عارف

نام: منظور الٰہی
آبائی گاؤں: اکوڑہ خٹک (ضلع پشاور)

پیدائش: حضرو (ضلع کیمبل پور)
تاریخ پیدائش: یکم ستمبر ۱۹۲۴ء

تعلیم: بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (پنجاب یونیورسٹی)

اردو غزلوں اور نظموں کا مجموعہ بغرضِ اشاعت زیرِ ترتیب ہے۔

پروین فنا سیّد

نام: پروین سیّد
تاریخ پیدائش: ۳ر ستمبر ۱۹۳۶ء

وطن: لاہور
تعلیم: بی۔ اے (مقامِ تعلیم: لاہور کالج فار وومن۔ لاہور)

مشاغل: شاعری۔ موسیقی۔ کلام کا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

اساتذہ جن سے متاثر ہوں: میر، غالب، فانی، جگر
موجودہ شعراء: مجاز، جذبی، فیض۔ ندیم

شیر افضل جعفری

مقامِ پیدائش: جھنگ شہر
تاریخ تولد: یکم ستمبر ۱۹۰۹ء

تعلیم: میٹرک، ایس۔ وی
شغل: ملازمت، افسر لازمی تعلیم

تصنیف: "سانولے من بھانولے"

عظیم قریشی

محمد عظیم قریشی نام ہے۔ والد مرحوم کا نام محمد مستقیم قریشی ہے۔ احسن تخلص فرماتے تھے اور صنفِ غزل کے مستند استادوں میں تھے۔ یوں شاعری مجھے ورثے میں ملی ہے۔ کشمیر وطن ہے۔ ۲۴ر مارچ ۱۹۲۱ء کو وادیٔ کشمیر کے پربہار، حسین و جمیل شہر اننت ناگ میں پیدا ہوا۔ ہوش انبالہ چھاؤنی میں سنبھالا۔ گریجوایشن پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔ محکمہ ڈاک سے منسلک ہوا اور اس وقت لاہور جنرل پوسٹ آفس میں اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر ہوں۔ عین عالمِ طفولیت میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور بارہ برس کی عمر میں غزل سے آغاز کیا۔ اختر شیرانی اور میراجی کے پرانے ساتھیوں میں سے ہوں۔ شاعری کا آغاز غزل سے ہوا مگر میں نے بیشتر نظمیں لکھی ہیں ـــ خاص طور پر مختصر نظمیں۔ یہ صنف میرے نام کے ساتھ مخصوص ہو چکی ہے۔

نظموں کا اولین مجموعہ "آج کے نغمے کل کے شعلے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جدید نظموں کے دو اور مجموعے بعنوان "نقشِ عظیم" اور "سرودِ آدم" طبع ہونے والے ہیں ـــ "رادھا کے گیت" میری نثری نظموں (PROSE_POEMS) کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ تصنیف آزادی سے پہلے اردو ادب

کے ممتاز نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ غزل بہت کم کہی ہے، مگر اس صنف میں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتا ہوں غزلیات کا دیوان بھی زیرِ ترتیب ہے۔

ابتدا میں افسانے بھی لکھے ہیں جو اختر شیرانی کے "خیالستان"، "بہارستان" اور "رومان" اور مولینا صلاح الدین احمد اور منصور احمد کے "ادبی دنیا" میں شائع ہوتے رہے ہیں "پرتگالی راہبہ کے محبت نامے" (جو دنیا کے چند در چند المیوں میں سے ایک شاہکار المیہ ہے!) کا کامیاب ترجمہ بھی کر چکا ہوں۔ نثری نظموں کی ایک اور طبعزاد تخلیق بہ عنوان "کنوارے سپنے" زیرِ طباعت ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ یا دش بخیر ڈاکٹر تاثیر نے سپردِ قلم کیا ہے۔ جس وقت انھوں نے اپنا پیش لفظ مجھے لکھ کر دیا تھا تو انھوں نے اس کتاب کا نام "جب جینیس مسکراتا ہے!" "WHEN A GENIUS SMILES" تجویز کیا تھا بعض احباب کے مشوروں سے اس کا نام بدل کر "کنوارے سپنے" رکھ دیا گیا۔ یہ کتاب اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوگی۔ بچوں کے ادب سے بھی والہانہ عشق ہے۔ حال ہی میں بچوں کی نظموں کا مجموعہ "اور بچے گاتے رہے" شائع ہوا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی "پاک و ہند جنگ" پر سترہ بند پر مشتمل ایک اور مختصر سی کتاب بہ عنوان "بقائے دوام کے راہی" شائع ہو کر اعلیٰ ذوق کے طبقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے اب — قومی اور ملی تخلیقات اور نعتیہ کلام کے دو اور مجموعے بھی زیرِ ترتیب ہیں۔

سیّد ضمیر جعفری

پیدائش: یکم جنوری ۱۹۱۵ء (بمقام چک عبدالخالق تحصیل و ضلع جہلم) — تعلیم: بی۔اے (اسلامیہ کالج لاہور)

تصانیف: لہو ترنگ (ملی نظمیں)، جزیروں کے گیت (نظم)، جنگ کے رنگ (نثر) اُڑتے ہوئے خاکے (فکاہی مضامین)

مشاغل: ملازمت

حمایت علی شاعر

تاریخ پیدائش: ۲۷ رجون ۱۹۳۰ء

مقام: اورنگ آباد (دکن)

تعلیم: ایم۔اے (سندھ یونیورسٹی)

مشاغل: فلم سازی، ہدایت کاری، نغمہ نگاری اور ڈرامے کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی کی تیاری

تصانیف: آگ میں پھول (مجموعہ کلام)
ثلاثی (نئی صنفِ سخن)
شکست کی آواز (منظوم ڈرامے)
برزخ (نثری ڈرامے)
مہران موج (شاہ بھٹائی کی کہانیوں کا تمثیلی روپ)

سردر بارہ بنکوی

تاریخ پیدائش: جنوری ۱۹۳۰ء — مقام پیدائش: بارہ بنکی (یو۔پی) — تعلیم: انٹرمیڈیٹ

مشاغل: ۱۹۵۸ء سے ۶۲ء تک انجمن ترقی اُردو مشرقی پاکستان سے بحیثیت سکریٹری متعلق رہا۔ اسی درمیان میں "آب و گل" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ ۱۹۵۹ء سے مشرقی پاکستان کی فلموں کے لئے نغمے اور مکالمے لکھنا شروع کئے اور ۱۹۶۵ء سے ذاتی فلمیں بنانے کا آغاز کیا۔

اختر انصاری اکبر آبادی

پیدائش: اکبر آباد — آبائی وطن: مدینہ شریف — عمر: پچاس سال

لکھنے پڑھنے کا شوق سترہ سال کی عمر سے ہے، اردو علم و فن سے والہانہ لگاؤ ہمیشہ رہا، یہی سبب ہے، منشی، منشی فاضل، ادیب اور ادیب عالم کے امتحانات دیئے مگر یہ جب کی بات ہے جب آتش جواں تھا یعنی غیر منقسم ہندوستان کے زمانے کی۔

شروع میں افسانے لکھے جو "آج کل" دہلی، "اضطراب" لکھنؤ، "حریم" لکھنؤ، "محشر خیال" دہلی، "حریت" دہلی میں شائع ہوئے۔ غیر منقسم ہندوستان کے زمانے میں (۱) زندگی کے رُخ (افسانوں کا مجموعہ)۔ (۲) گیت و رنگ (مجموعۂ کلام)۔ (۳) حسنِ تضمین (معروف شعراء کی غزلوں کی تضمین (۴) فردوسِ مغلیہ (مغل عمارات کی تاریخ)۔ (۵) سبد گلچیں (ترتیب) یہ پانچ کتابیں شائع ہوئیں۔ ۲۰ سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک کا زمانہ دہلی اور میرٹھ میں گذرا۔

پاکستان کے قیام کے بعد کراچی سکونت اختیار کی جہاں نشیمن، ربط اور مشرب کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ کراچی آٹھ سال قیام رہا۔ اس دوران یہ چھ کتابیں شائع ہوئیں (۱) نظریات (مضامین کا مجموعہ)۔ (۲) نالۂ پابندِ نَے (غزلوں اور گیتوں کا مجموعہ) (۳) نئی رہگذر نئی کہکشاں (نظمیں، غزلیں)۔ (۴) دلِ رسوا (نظمیں، غزلیں)۔ (۵) اکبر اس دور میں (ترتیب)۔ (۶) لسان العصر (ترتیب)

اُردو کی خدمت کا سودا حیدرآباد سندھ لے آیا، یہاں اُردو کی جو خدمت کی وہ کسی اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ کم و بیش بارہ سال سے "نئی قدریں" جاری ہے۔ یہ وادیٔ مہران کا واحد رسالہ ہے جو نامساعد حالات کے باوجود زندہ ہے۔

حیدرآباد سے مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں:۔

(۱) غمِ فردا (مجموعۂ کلام)۔ (۲) جمالِ آگہی (مضامین کا مجموعہ)۔ (۳) مفکرِ مہران (شاہ لطیفؒ پر تعارفی کتاب)۔ (۴) نغماتِ لطیفؒ (ترتیب)۔ (۵) نگارشات (ترتیب)۔ (۶) شاہ عبداللطیفؒ، حیات اور شاعری (شاہ صاحب کے دور اور شاعری کا مفصل جائزہ) آخرالذکر کتاب کے متعلق تبصرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع کا کامل احاطہ کرتی ہے۔

اس طرح تصانیف کی تعداد بارہ ہے اور مرتب کردہ کتابوں کی تعداد پانچ۔

بشیر احمد بشیر

تاریخِ پیدائش: ۸ر مارچ ۱۹۲۲ء
مقام: کالرہ اسٹیٹ۔ ضلع سرگودھا

آبائی وطن: قصبہ ساہیوال، ضلع سرگودھا
موجودہ سکونت: چک نمبر ۸۲/۱۲ ایل، ضلع ساہیوال (منٹگمری)

پیشہ: زمینداری اور باغبانی

تعلیم: گورنمنٹ ہائی سکول ضلع ساہیوال۔ (میٹرک) گورنمنٹ کالج لائلپور (۱۹۴۳ء) بی۔ اے،

شعبۂ ادب: غزل و نظم
تصنیف: "ذوقِ خیال" زیرِ ترتیب

شرفِ تلمذ: لسان العرفان حضرت شیخ عطاء اللہ جنونؔ

جعفر شیرازی

تاریخِ پیدائش: یکم جنوری ۱۹۲۰ء
مقامِ پیدائش: موضع اکبر تحصیل اوکاڑہ، ضلع ساہیوال (منٹگمری)

تعلیم: بی۔ ایس سی (ایگریکلچر)
مشاغل: سروس۔ خدمتِ ادب

تصانیف: شعری مجموعہ "ہوا کے رنگ"

نور بجنوری

نام: نورالحق صدیقی — مشاغل: ملازمت، شاعری

تعلیم: بی۔اے (آنرز) — پیدائش: ۲۴ جنوری ۱۹۲۴ء، بجنور (یو۔پی)

میں ۲۴ جنوری ۱۹۲۴ء کو بجنور کے ایک شریف اور خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں میٹرک کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لے لیا۔ والد کی وفات کے باعث تعلیم مکمل نہ کر سکا اور یوں پندرہ سولہ برس کی عمر میں پہلی بار مجھے زندگی کی تلخیوں سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔ دو برس بیکار رہنے کے بعد میرے بارسوخ اور سرمایہ دار عزیزوں نے مجھے ایک معمولی سی ملازمت دلوا دی اور میں اپنے نوخیز خوابوں کی لاشیں اٹھائے چاکری کی گاڑی میں جت گیا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد دہلی سے لاہور آگیا۔ اس وقت تک یہیں ہوں اور چاہتا ہوں کہ میری قبر بھی یہیں بنے۔

میں غالباً ۱۹۳۹ء سے باقاعدہ شعر کہہ رہا ہوں۔ ۱۹۴۰ء میں پہلی بار میری کوئی غزل ماہنامہ "حسین دنیا" میں چھپی تھی کچھ نہ پوچھیے ملے خوشی کے قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ ۱۹۴۳ء کے بعد سے میری نظمیں اور غزلیں اس دور کے نمایندہ ادبی پرچوں میں چھپتی رہیں۔ میں نے کافی تعداد میں نظمیں غزلیں کہی ہیں۔ بہت سی نظمیں اور غزلیں مطبوعہ ہونے کے باوجود میری لاپروائی کے باعث گم ہو چکی ہیں۔ آج کل بہت کم شعر کہتا ہوں، کم بخت زندگی مہلت ہی نہیں دیتی۔

اپنی شاعری کے متعلق صرف اتنا عرض کروں گا کہ میرے اشعار بڑی حد تک میرے اپنے احساسات کی شدت کے آئینہ دار بھی ہیں اور عکاس بھی۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ تین بچے ہیں جن کی پیاری پیاری باتیں جب مجھے یاد دلاتی ہیں کہ نور صاحب! آپ کے خوبصورت اشعار ان بچوں کے رہنے کے لیے مکان مہیا نہیں کر سکتے، ان کی فیس ادا نہیں کر سکتے تو میں کانپ اٹھتا ہوں اور سوچتا ہوں یہ کیسی روشنی ہے کہ اگر زر اندھیرے میں ڈوبتی چلی جا رہی ہے۔ میرے تخیل کی اپسرائیں چڑیلیں بن کر مجھے ڈرانے لگتی ہیں.... مگر یہ کیفیت بھی عارضی ہوتی ہے۔ آپ کو تو علم ہے کہ ہم لوگ بڑے سخت جان واقع ہوئے ہیں۔ ہاتھ قلم ہو جانے کے بعد بھی "جنوں کی حکایت خوں چکاں" لکھنے سے باز نہیں آتے جو غم بھی ہاتھ لگتا ہے اسے غم جاناں بنا دینے سے نہیں چوکتے اس لیے یقین ہے کہ یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔

نظیر فتحپوری

تاریخ پیدائش: ۱۳ مئی ۱۹۳۵ء — مقام: ایرایاں سادات فتحپور ہسوہ (یو۔پی)

تعلیم: ایم۔اے (اردو) پی ایچ۔ڈی (اردو) پنجاب یونیورسٹی، مشاغل: لیکچرار، گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج، راولپنڈی

تصانیف: (۱) رسوا کی ناول نگاری (۲) پریم چند کی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ (۳) اردو ادب کی جمالیاتی قدریں۔ (۴) مجموعۂ کلام (سب غیر مطبوعہ)

محب عارفی

نام: محمد محب اللہ صدیقی — عمر: پچاس سال کے قریب

مقام پیدائش: قصبہ یوسف پور ضلع غازی پور، مشرقی یو۔پی (اودھ)

تعلیم: ابتدائی تعلیم اپنے نانا کے مکتب میں پائی۔ ۱۹۲۷ء میں بنارس شہر کے ایک انگریزی اسکول میں داخلہ ہوا، آٹھویں جماعت

تک وہاں پڑھا۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۰ء تک کا زمانہ علی گڑھ یونیورسٹی میں گزرا۔ بی۔اے کے بعد تعلیم جاری نہ رہ سکی۔

پیشہ: مرکزی سکریٹریٹ کے محکمہ مالیات میں، بہ حیثیت کلرک، ملازمت ۱۹۴۰ء میں شروع کی۔ آج کل وزارت مالیات، اسلام آباد میں ایک ادنیٰ درجہ کی افسری پر گزر اوقات ہے۔

شاعری: اس فن کی ابجد، شاد عارفی سے سیکھی۔ ۱۹۴۶ء کے اواخر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ چند غزلوں اور نظموں کا ایک مختصر مجموعہ "گل آگہی" ۱۹۶۳ء میں "تین کتابیں" نام کی ایک کتاب کے ایک جزو کی حیثیت سے کراچی سے شائع ہوا۔

مسلک: شاعری ایک طرح کی ذہنی مباشرت ہے۔ شعر سے شاعر اور باذوق سامع/قاری دونوں فریقوں کی تسکین ہونی چاہیے۔ جو شعر جس مرتبے کے شعری ذوق کو وجد میں لائے گا، اس شعر کا وہی مرتبہ ہوگا۔ اعلیٰ درجہ کی شاعری کیسے وجود میں آتی ہے اور اعلیٰ درجہ کا شعری ذوق کس طرح ترتیب پاتا ہے، یہ مسائل تفصیل طلب ہیں۔

اختر ہوشیار پوری

تاریخ پیدائش: ۲۰ر اپریل ۱۹۱۸ء
مقام پیدائش: ہوشیار پور (مشرقی پنجاب۔ بھارت)
تعلیم: بی۔اے۔ ایل ایل۔بی
مشاغل: وکالت

رفیق خاور جسکانی

پورا نام: حافظ احمد رفیق خاور جسکانی
تاریخ پیدائش: ۲۶ر مارچ ۱۹۳۰ء
وطن: ڈیرہ غازی خاں شہر
تعلیم: بی۔اے (آنرز) ایم اے ایم او ایل (فارسی) ایم اے (سیاسیات)
مشاغل: سرکاری ملازمت (تحصیلدار)

زیر ترتیب و اشاعت تصانیف: تقریب بے صدا (شعری مجموعہ) ـــ ریت کی روایت (علاقائی ادب) قائم چاند پوری (تنقید) ـــ حاصل مطالعہ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

سلیمان اریب

تاریخ پیدائش: ۵ر اپریل ۱۹۲۲ء (حیدر آباد، دکن)

(ایک اقتباس "حیدر آباد کے شاعر" سے) سلیمان اریب ہندوستان کے مشہور اردو شعرا میں سے ایک ہیں۔ اسکول ہی کے دنوں میں انھوں نے کہانیاں، ڈرامے اور انشائیے لکھنا شروع کر دیے تھے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۴ء تک کمیونسٹ پارٹی کے رکن رہے مگر ۱۹۵۴ء کے بعد وہ سیاسیات سے الگ ہو گئے اور صرف ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ ہفت روزہ "جمہور" کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ "چراغ" کے مدیر تھے اور ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ "سب رس" مرتب کرتے رہے۔ ۱۹۵۵ء کے بعد سے اب تک وہ ماہنامہ "صبا" مرتب کر رہے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے ان کی ادبی خدمات کو عملاً سراہا۔ اگلے سال ان کا مجموعہ کلام "پاس گریباں" انجمن ترقی اردو حیدر آباد سے شائع ہوا۔ ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے انھوں نے "حیدر آباد کے شاعر" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اب انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی مرکزی کمیٹی نے ان کا منتخب کلام شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

محسن بھوپالی

تاریخ پیدائش: ۲۹ ستمبر ۱۹۳۲ء مقام: بھوپال (وسط ہند)

تعلیم: انٹرمیڈیٹ (آرٹس) اور این۔ ای۔ ڈی انجینیرنگ کالج کراچی سے میکنیکل الیکٹریکل انجینیرنگ میں ڈپلوما

مشغلہ: محکمۂ تعمیرات مغربی پاکستان میں اسسٹنٹ انجینیر

تصانیف: پہلا مجموعۂ کلام "شکستِ شب" ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ قطعات کا مجموعہ "جستہ جستہ" زیرِ طبع ہے۔

گوہر ہوشیارپوری

نام: محمد اشرف خاں تاریخ پیدائش: ۱۵ اپریل ۱۹۳۰ء

مقام پیدائش: ہوشیارپور (مشرقی پنجاب) تعلیم: میٹرک مشاغل: ملازمت

صادق نسیم

نام: سردار غلام صادق خاں تاریخ پیدائش: ۲۳ ستمبر ۱۹۲۵ء

مقام پیدائش: موضع خرم نزد ٹیکسلا تحصیل راولپنڈی تعلیم: بی۔ اے

مشاغل: مطالعہ تصانیف: مجموعۂ غزل زیرِ ترتیب

صہبا اختر

پیدائش: ۳۰ ستمبر ۱۹۳۲ء۔ جموں اصل نام: اختر علی رحمت

والد کا نام: رحمت علی رحمت جو ڈرامہ نگار شاعر، موسیقار اور اپنے سٹیج کے اداکار بھی تھے۔

تعلیم: ایف۔ ایس سی تک (علی گڑھ یونیورسٹی میں) پرورش: بریلی (یوپی) میں

والد کا انتقال میرے بچپن میں ہو گیا تھا اس لئے صرف والدہ نے پرورش فرمائی۔ فاقوں سے لے کر دسترخوانوں تک اور غریبی سے لے کر امیری تک زندگی کو ہر روپ میں دیکھا ہے اور برتا ہے۔

ادب: نثر بہت کم اور ضرورتاً لکھی ہے۔ صرف شاعری مقسوم حیات رہی ہے۔ کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا اور نہ ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والا ہے۔

شاعری میں سوداؔ، انیسؔ، غالبؔ، نظیرؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور احمد ندیم قاسمی کے بعد صرف اپنا قائل ہوں

حزیں لدھیانوی

(ایک اقتباس) "حزیں لدھیانوی ۱۹۲۰ء میں بمقام لدھیانہ پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ محترم شیر محمد شاعر تھے اور ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد بچپن ہی میں حزیں صاحب پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ہر طرف پریشاں حال انسانیت اور معاشرے کے نشیب و فراز کے دل خراش مناظر نے انھیں شدید متاثر کیا، چونکہ یہ خود بھی سماجی ظلم و ستم کا شکار ہوئے اور یہی زندگی کی تلخیاں ان کو شاعر بنانے کا باعث بنیں، ان کی شعری ابتدا ایک طنزیہ نظم "عازم بیت اللہ سے" ہوئی۔ آزادی کے بعد حزیں صاحب لائلپور میں مقیم ہوئے۔ حزیں لدھیانوی ایک خوددار اور حساس شاعر ہیں، یہ کئی ایک علمی و ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے ہیں اور اب بھی آپ

لائلپور کی ممتاز ادبی تنظیموں سے وابستہ ہونے کے علاوہ رائٹرز گلڈ کے ممبر بھی ہیں۔ حزیں صاحب سب سے زیادہ میر، غالب اور یگانہ چنگیزی سے متاثر ہوئے۔ اور ان کے موجودہ دور کے پسندیدہ شاعروں میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور ساحر لدھیانوی کے نام قابل ذکر ہیں جو ان کے مشفق دوست بھی ہیں۔ آپ ترقی پسند اور رجائیت پسند شاعر ہیں اور ہر اندھیرے کو عارضی تصور کرتے ہیں۔ حزیں صاحب معاشرے کے طبقاتی تضاد کے سخت خلاف ہیں اور اس سلسلے میں سامراج جو کردار ادا کر رہا ہے اسے مکمل شکست دینا حزیں صاحب کا نصب العین ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام جس طرح انسانی عظمتوں اور شرافتوں کو پامال کر رہا ہے اسے ختم کرنا ان کے نزدیک جہاد ہے اور ایسا جہاد جس میں وہ پورے تیقن سے صف اول کے دستے میں ہیں۔ آپ ادب میں نئے اسلوب اظہار کو پسند کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ فکر و فن کا امتزاج بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ حزیں صاحب زبان و بیان میں جدت اور نئے نئے تجربات کو اپناتے ہیں۔ ان کے ہاں نئی نئی تشبیہیں، نادر استعارات اور الفاظ کا چناؤ بڑا معتبر ہوتا ہے۔"

حنیف فوق

پیدائش بھوپال میں ہوئی اور وہاں سے ہائی اسکول، کانپور سے انٹرمیڈیٹ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ لکھنؤ اور کانپور کی ادبی ہنگامہ آرائیوں میں شرکت کی۔ پھر کچھ مدت تک بھوپال کی ادبی و سیاسی تحریکوں سے وابستہ رہا۔ ۱۹۵۵ء سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی سے منسلک ہوں۔ یہیں سے پی ایچ ڈی کیا۔ مقالہ کا موضوع "THE SOCIAL ANALYSIS OF URDU POETRY—DURING 1857 AND AFTER" (اردو شاعری کا سماجی تجزیہ — ۱۸۵۷ء سے اب تک) ہے۔ تنقید اور شاعری سے دلچسپی رہی ہے۔ تنقیدی مضامین کے چار مجموعوں کا مواد موجود ہے لیکن ابھی تک نہ پی ایچ ڈی کے مقالے اور نہ ان مجموعوں کے چھپنے کی نوبت آئی ہے کیونکہ ناشروں نے دروازے کی خاک لینا تو کجا، دروازے پر دستک بھی نہ دی اور میرا ان سے صرف اتنا تعلق ہے کہ ان کی چھاپی ہوئی کتابیں پڑھ لیتا ہوں۔ بہرحال تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "مثبت قدریں" اپنے ہی اہتمام و انصرام سے حال ہی میں چھپ گیا ہے۔

عرش صدیقی

تاریخ پیدائش: ۲۱ جنوری ۱۹۲۷ء — مقام پیدائش: گورداسپور

تعلیم: ایم اے انگریزی — مشاغل: شاعری، افسانہ نویسی، تنقید، درس و تدریس (گورنمنٹ کالج ملتان)

تصنیفات و تالیفات: (۱) دیدۂ یعقوب (مجموعۂ کلام)۔ (۲) سب رنگ (مسعود اشعر کے ساتھ مل کر ملتانی ادبا و شعرا کا انتخاب) (۳) میرزا ادیب کے بہترین افسانے (۴) افسانوں کا مجموعہ زیر اشاعت

نظیر صدیقی

نظیر صدیقی، ۷ دسمبر ۱۹۳۰ء کو بہار کے ایک گاؤں سرائے ساہو (ضلع چھپرا) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک اور ۱۹۴۸ء میں ایسٹ پاکستان بورڈ سے آئی اے کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکے آگئے۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے ۱۹۵۰ء میں بی۔اے اور ۱۹۵۳ء میں ایم اے کیا۔ ۱۹۵۴ء سے ڈھاکے کے متعدد تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے ہیں۔ اس وقت نوٹرے ڈیم کالج ڈھاکا میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ شعبۂ صحافت ڈھاکا یونیورسٹی اور مدرسہ عالیہ ڈھاکا میں جز وقتی لکچرر بھی ہیں۔ اس وقت تک ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انشائیوں کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" (۱۹۶۱ء)، تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "تاثرات و تعصبات" (۱۹۶۲ء) اور تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ "میرے خیال میں" (جون ۱۹۶۵ء)۔ مجموعۂ کلام "حرف پریشاں" زیر طبع ہے۔

خاطر غزنوی

نام: محمد ابراہیم بیگ   تعلیم: ایم اے (اردو) گولڈ میڈلسٹ ـ ڈپلوما چینی زبان (پیکنگ)۔ آنرز (پشتو)

ملازمت: آل انڈیا ریڈیو ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۷ء ـ ریڈیو پاکستان ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۲ء ـــ پشاور یونیورسٹی ۱۹۶۳ء سے اب تک

تصنیفات: پھول اور پتھر (ناول) ـــ چٹانیں اور رومان (علاقائی کہانیاں) ـــ سرحد کے رومان (کہانیاں) ـ جدید اردو ادب (تنقیدی مضامین) روپ رنگ (گیتوں کا مجموعہ) ـــ خیال (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) ـــ پٹھان اور ذوقِ سلیم (ثقافت) ـــ چین نامہ (خطوط) جھرنے (بچوں کی نظمیں) ـــ ایک تھا کتا (بچوں کے لئے کہانیاں)

تالیفات و ترجمہ: پاکستان میں اردو (تاریخ و تنقیدِ ادب) ـــ خیابانِ اقبال (اقبالیات) ـ ودرنگ ہائٹس (ناول کی ڈرامائی تشکیل) جنگِ افیون سے آزادی تک (تاریخ چین) ـــ جدید نظمیں (نظم) ـــ ڈھول سپاہی (ثقافت)

مندرجہ ذیل رسائل کی ادارت کی ہے: سنگِ میل پشاور ـــ زندگی پشاور ـــ خیاباں پشاور ـــ مشرقی دنیا لاہور ـــ فطرت پشاور نغمۂ حیات پشاور ـــ تنویر پشاور ـــ تعمیرِ نو پشاور

ہوش ترمذی

نام: سید سبطِ حسن۔ تخلص پہلے ظہیر تھا۔ ۱۹۴۲ء سے ہوش ہے   عقائد: اثنا عشری

وطن مالوف: قصبہ ساڈھورہ، ضلع انبالہ (مشرقی پنجاب)

۱۹۴۷ء میں پاکستان آیا۔ اب مستقل وطن لاہور ہے۔ مورثِ اعلیٰ کبھی ترمذ سے آئے تھے اس لئے ترمذی ہوں۔

تاریخ پیدائش میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے مطابق یکم جنوری ۱۹۲۰ء ہے   تعلیم: ایم اے۔ ۱۹۵۳ء

ملازمت: ریلوے۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ انشورنش کمپنی۔ اخبارات۔ ۱۹۵۵ء سے صوبائی حکومت کے محکمۂ اطلاعات میں ہوں۔

شعر کی سمجھ بوجھ بچپن سے ہے۔ ۱۹۳۶ء میں سب سے پہلے روزنامہ "احسان" میں غزل شائع ہوئی تھی۔ باقاعدہ تلمذ کوئی نہیں، شاعری کو وہبی صلاحیت سمجھتا ہوں کسبی نہیں۔ شعر گوئی کے علاوہ ڈرامہ اور انشائیہ نویسی کا بھی شغل کر لیتا ہوں مجموعۂ کلام "متاعِ جنوں" کے نام سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ انشائیوں کی اشاعت کا بھی ارادہ ہے مگر فرصت کم ہے۔ کوشش میں ہوں کہ نثری مجموعہ بھی ترتیب دے سکوں۔ تمام قدیم و جدید شعرا کا ذلہ بردار اور خوشہ چیں ہوں۔ انیس، غالب، داغ اور جوش ملیح آبادی خاص طور پر میرے ذوقِ سخن کی پیاس بجھاتے ہیں۔ کبھی کبھی نظم بھی کہہ لیتا ہوں لیکن دراصل غزل ہی فکرِ شعر کا محور ہے۔

مجیب خیر آبادی

(ایک اقتباس) "مجیب ۱۹۲۳ء کو خیر آباد ضلع سیتا پور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان بہت عرصہ پہلے حیدر آباد دکن میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو چکا تھا اس لئے وہ کمسنی میں حیدر آباد آ گئے اور اپنے چچا حکیم انیس احمد خیر آبادی کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کی ابتدائی تعلیم سٹی کالج میں ہوئی۔ ۱۹۴۰ء سے شعر کہتے ہیں۔ حسرت ترمذی اور قاضی خورشید احمد علیگ (مرحوم) سے ابتدا میں مشورۂ سخن کرتے تھے نظمیں کم اور غزلیں زیادہ کہتے ہیں۔ ترقی پسند رجحانات سے زیادہ متاثر ہیں۔ اپنے ماحول اور نظامِ معاشرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حادثات کے طوفانوں میں چٹان کی طرح سینہ سپر ہونے کی آرزو لے کر جادۂ حیات میں آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ ان کے دل کی امنگیں

اور جوان تمنائیں زندگی کے غم و آلام سے دوچار ہوتی ہیں لیکن وہ مایوس نہیں ہوتے اور گھبراتے نہیں بلکہ مستقبل کو سنوارنے کی جد و جہد کرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں لاہور چلے گئے اور ۱۹۵۳ء تک برما آئل کمپنی میں ملازمت کی۔ اس کے بعد صحافت میں قدم رکھا ہے اور اب یہی ان کا ذریعۂ معاش ہے[1]۔ —— (۱۹۵۸ء سے پی آئی اے کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ ہیں)

اقبال عظیم

پیدائش: میرٹھ (یوپی)، ۸ر جولائی ۱۹۱۳ء

بی۔اے ۱۹۳۴ء (لکھنؤ یونیورسٹی)، ایم۔اے ۱۹۴۳ء (آگرہ یونیورسٹی)

سرکاری ملازمت بحیثیت معلم، یوپی۔ ۹ر جولائی ۱۹۵۰ء تک۔ آمد مشرقی پاکستان، ۱۰ر جولائی ۱۹۵۰ء۔ پروفیسر اُردو

تصانیف: "مشرقی بنگال میں اُردو" ۱۹۵۴ء، "دیوانِ ناطق" ۱۹۵۶ء۔ مجموعۂ کلام "سازِ غزل" زیرِ طبع۔ ۱۹۳۵ء سے صرف غزل کہتے ہیں۔

اختر لکھنوی

میرا اصل نام محمود الحسن ہے مگر کم لوگ ہیں جو اس نام سے واقف ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں شہر لکھنؤ میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۰ء تک وہیں رہا ۱۹۵۰ء میں ڈھاکے آگیا۔ یہاں ابتدا میں انجمن ترقی اُردو سے وابستہ رہا، پھر روزنامہ "انقلاب" کے اڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہو گیا۔ اور ۱۹۵۸ء میں جب یہ اخبار بند ہو گیا تو میں نے خود ایک روزنامہ "امن" جاری کیا جسے کچھ عرصہ بعد پریس کی واضح سہولتیں حاصل نہ ہونے کی وجہ سے بند کر دینا پڑا۔ امن کے بعد ۱۹۵۹ء میں ایک ماہنامہ ادبی رسالہ "فنکار" نکالا جس کے ۶ شمارے پابندی سے نکلے مگر وہ بھی طباعت کی سہولتیں نہ ملنے کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اب ۱۹۶۱ء سے ریڈیو پاکستان ڈھاکے سے بحیثیت مصنف، اناؤنسر اور ڈرامہ پروڈیوسر منسلک ہوں۔

میں ۱۹۴۷ء سے شعر کہہ رہا ہوں، ابتدا میں نظمیں کہتا تھا مگر ۱۹۵۰ء سے غزلوں کی طرف آگیا۔ باضابطہ کسی کا شاگرد نہیں۔ لکھنؤ میں جب تک رہا مجاز کے ساتھ زیادہ رہا، جو کچھ کہتا تھا دوستوں کو سنا کر خود اصلاح کر لیا کرتا تھا۔ یہاں بھی یہی سلسلہ ہے۔

ان دنوں مشرقی پاکستان کے شعرائے اُردو پر مشتمل ایک تذکرہ "کاروانِ خیال" کے عنوان سے مرتب کر رہا ہوں جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

بشیر منذر

نام: بشیر احمد

تعلیم: ایم۔اے (اردو)

تاریخ پیدائش: یکم جنوری ۱۹۲۵ء

مقامِ پیدائش: ناہوریاں، ضلع گجرات

مشاغل: کاروبار

تصانیف (زیرِ طبع) شاخ در شاخ (اردو شاعری) لغران (پنجابی نظماں)

عبد اللہ جاوید

نام: محمد عبد اللہ خاں

قلمی نام: جاوید یوسف زئی۔ عبد اللہ جاوید

ولدیت: محمد اسمٰعیل خاں مرحوم

پیدائش: غازی آباد۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۳۱ء

تعلیم: ایم اے (انگریزی)، ایم اے (اردو)، ایل ایل۔بی

پیشہ: درس و تدریس

پیشۂ آبا: سپہ گری

تصانیف: "کانٹوں کا زہر" پہلا شعری مجموعہ (زیرِ طبع)۔ "ڈوبتے سورج" تنقیدی مضامین (زیرِ ترتیب)

مسلک: ہم نے اس صنف کو برتا تو سمندر پایا ۔۔۔ لوگ کہتے ہیں کہ دامانِ غزل تنگ بھی ہے

---

[1] اقتباس دیباچہ ۱۶۹، مطبوعہ پرنٹنگ ساہتیہ اکادمی حیدرآباد۔ "حیدرآباد کے شاعر" انتخاب کلام (۱۶۷۰ء سے ۱۹۵۸ء تک) مرتب خواجہ حمید الدین شاہد۔ سنہ طباعت دسمبر ۱۹۵۸ء

حفیظ تائب

نام: عبدالحفیظ
مقام پیدائش: احمد نگر ضلع گوجرانوالہ
تاریخ پیدائش: ۱۴؍فروری ۱۹۳۱ء
تعلیم: بی۔اے
مشاغل: ملازمت
تصانیف (زیرطبع): آیۂ رحمت (نعتیہ کلام)

احمد فراز

سنہ پیدائش: ۱۹۳۱ء
مقام پیدائش: کوہاٹ
والد کا نام: آغا برق
تعلیم: ایم اے (اُردو) ایم اے (فارسی ادبیات)

پیشہ: ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۶ء نشریات ۔ ۱۹۵۶ء تا حال ۔ یونیورسٹی ملازمت (درس و تدریس)

تصانیف: تنہا تنہا (شاعری) درد آشوب (شاعری) موم کے پتھر (منظوم ڈرامے)

جمیل الدین عالی

میرا تعلق ریاست لوہارو سے ہے۔ دلّی میں پیدا ہوا۔ اینگلو عربک کالج (قدیم دلّی کالج) سے بی۔اے کیا۔ اردو فارسی گھر پر پڑھی تعلیم ایم اے سے چھوٹ گئی۔ عمر تینتالیس برس ہو رہی ہے۔

۱۹۴۴ء میں شادی کی پانچ بچے پیدا ہوئے۔ ایک مرگیا۔

پیشہ ملازمت: پہلے سرکاری، پھر نیم سرکاری۔ اب غیر سرکاری۔ آج تک نیشنل بینک میں انکم ٹیکس ایڈوائزر ہوں پچھلے دنوں ایک برس بیکار بھی رہ چکا ہوں۔

باقاعدہ شعری تصنیف ایک ہے "غزلیں، دوہے، گیت"۔ ایک طویل منظوم ڈرامہ "انسان" شاید ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۸ء تک نیا دور میں قسط وار چھپا، پھر کچھ اضافے کیے مگر وہ اب تک کتابی صورت میں نہیں آیا۔ مجموعے کے بعد دوہے بھی کہے، چند غزلیں بھی کہیں مگر دوسری کتاب مرتب نہیں ہوئی۔ ایک عالمی سفرنامہ "دنیا مرے آگے" دو برس تک اخبار "جنگ" میں ہفتہ وار چھپا، وہ بھی زیر ترتیب رہتا ہے۔ جانے کب چھپے گا دو برس سے تقریباً باقاعدہ اخباری مضمون یعنی کالم لکھتا ہوں عنوان ہے "تماشا مرے آگے"۔

پچھلے دس برس سے انجمن ترقی اُردو اور گلڈ سے رضاکارانہ متعلق ہوں۔ وقت اور محنت کے لحاظ سے بہت کام کیا ہے۔ نتائج پر تبصرہ قبل از وقت بھی ہے اور مجھے زیب بھی نہیں دیتا۔

دوسروں کی کتابیں بہت چھاپی ہیں۔ کئی لغات کی اشاعت میں حصہ لیا ہے۔ اردو کالج کے انتظام میں شریک رہتا ہوں۔ اردو یونیورسٹی کے منصوبے پر کام کرتا ہوں۔

یونیسکو کا فیلوشپ کیا۔ ہارورڈ کے بین الاقوامی مذاکرے میں شریک ہوا۔ چین، روس اور بہت سے دوسرے ممالک میں مذاکرات کیے۔ گھوما پھرا۔ حجاز جانے کی آرزو ہے۔

افریشیائی تحریک ادبا میں حصہ لیتا ہوں۔ کچھ مدت سے استحصال، استعمار اور انقلاب کے مسائل زیر غور ہیں۔ اب اس عمر میں بھی کم از کم فکری سطح پر کچھ نہ کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔ محنت کی عادت ہے۔ کام کا شوق۔ آگے اللہ مالک ہے۔

شاذ تمکنت

تاریخ پیدائش: ۳۱ جنوری ۱۹۳۳ء — وطن: حیدر آباد (دکن)

تعلیم: ایم۔ اے (عثمانیہ) — پیشہ: لکچرر

خلیل الرحمٰن اعظمی

۹ اگست ۱۹۲۶ء کو اعظم گڑھ (یو۔ پی) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم شبلی نیشنل اسکول میں حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ آیا۔ یہاں سے ۱۹۴۹ء میں بی۔ اے اور ۱۹۵۱ء میں ایم۔ اے (اردو) کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دو سال تک "مسلم یونیورسٹی گزٹ" کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں ترقی پسند تحریک پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

زمانۂ طالب علمی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا کئی سال تک سکریٹری رہا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ختم ہو جانے کے بعد ایک ادبی انجمن کی تشکیل ہوئی جس کا نام "ادبی انجمن" تھا۔ اس کی سکریٹری شپ کے فرائض بھی میں نے ہی انجام دیے۔ اس انجمن کے صدر مجنوں گورکھپوری تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں "علی گڑھ میگزین" کا ایڈیٹر بھی رہا اور شعبۂ اردو کی "انجمن اردوئے معلے" کا سکریٹری بھی۔

اب تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) کاغذی پیرہن (پہلا مجموعہ کلام ۱۹۵۵ء) — (۲) فکر و فن (تنقیدی مضامین) ۱۹۵۶ء

(۳) نوائے ظفر (بہادر شاہ ظفر کے کلام کا تنقیدی مطالعہ اور انتخاب) ۱۹۵۷ء — (۴) مقدمہ کلام آتش ۱۹۵۹ء

(۵) نیا عہدنامہ (دوسرا مجموعۂ کلام) ۱۹۶۵ء — (۶) زاویۂ نگاہ (تنقیدی مضامین) ۱۹۶۶ء

"ترقی پسند ادبی تحریک" پر میری کتاب انجمن ترقی اردو کی طرف سے عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

محسن احسان

نام: احسان الٰہی — تاریخ پیدائش: ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء

تعلیم: ایم اے (انگریزی ادبیات) — مشاغل: شاعری، نثر نگاری

تصانیف (زیر ترتیب) زنجیرِ صدا، خوں بہا (شاعری) جان ڈرائیڈن کے مشہور ڈرامے ALL FOR LOVE کا ترجمہ چھپ چکا ہے

عمیق حنفی

۲ نومبر ۱۹۲۸ء کو مہو چھاؤنی مدھیہ پردیش میں پیدا ہوا۔ سیاسیات اور تاریخ میں ایم اے ہوں۔ ۱۹۵۲ء سے باقاعدہ شعر و تنقید، ڈراما نگاری اور انشا پردازی سے شغف ہے۔ "سنگ پیرہن" (۱۹۵۸ء) پہلا مجموعہ تھا۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے اردو شاعروں کے انتخابی سلسلے میں شامل کیا۔ طویل نظم سندباد کتابی صورت میں چھپی۔ ۱۹۵۹ء سے آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ایگزیکیوٹیو ہوں اور بھوپال اور دہلی کے بعد یہاں (۱۹۶۳ء سے) مقیم ہوں۔

جاوید شاہین

۲۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو امرتسر میں پیدا ہوا۔ والد سرکاری ملازم تھے۔ لہٰذا ایک جگہ ٹک کر تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ میٹرک سیالکوٹ سے

اور بی۔اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔ سنہ ۱۹۵۹ء سے محکمہ بنیادی جمہوریت سے وابستہ ہوں اور ان دنوں اسی محکمے کے ماہانہ جریدے "نظام نو" کا ایڈیٹر ہوں۔

متعدد انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کر چکا ہوں۔ حال ہی میں "آٹھ غزل گو" نام کی کتاب مرتب کی ہے جس میں نئی اردو غزل کے آٹھ نمائندہ شاعروں کا منتخب مجموعہ کلام اور ہر شاعر پر تنقیدی تبصرہ شامل ہے

وحید اختر

نام: وحید اختر　　تاریخ پیدائش: ۱۲ اگست ۱۹۳۵ء　　مقام پیدائش: اورنگ آباد (دکن)

تعلیم: میٹرک سے ایم اے تک سارے امتحانات درجۂ اول میں امتیاز کے ساتھ کامیاب کیے۔ تعلیم انٹر تک اورنگ آباد میں اور اس کے آگے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں حاصل کی۔

سنہ ۱۹۵۵ء میں فلسفے سے درجۂ اول میں ایم۔اے کیا۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں فلسفے ہی میں، خواجہ میر درد کے تصوف پر تحقیقی مقالہ داخل کر کے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔

سنہ ۱۹۶۰ء سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ میں تدریس کا کام کر رہا ہوں۔

تصانیف: نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "پتھروں کا مغنی" اردو گھر علی گڑھ سے شائع ہو گیا ہے جس پر اتر پردیش گورنمنٹ نے اردو کا سب سے بڑا انعام "غالب انعام" اسی سال دیا ہے۔

"خواجہ میر درد — تصوف اور شاعری" انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت پریس میں ہے۔

"نئی تنقید" تنقیدی اور نظریاتی مضامین کا مجموعہ اردو گھر کے اہتمام سے شائع ہو رہا ہے۔ ان کے علاوہ "تصوف کے بنیادی تصورات" کے عنوان سے ایک کتاب کا مسودہ تیار ہے۔ دوسری کتاب "فلسفے کے ہم عصر مکاتیب" زیر تکمیل ہے۔

عرفانہ عزیز

تاریخ پیدائش: ۵ فروری سنہ ۱۹۴۰ء　　مولد و مسکن: کراچی

آبا و اجداد افغانستان سے ترک سکونت کر کے پنجاب میں آباد ہو گئے تھے۔

والد محترم ملک عبدالعزیز کا شمار سرزمین پنجاب کے غیور اور خوددار جانبازوں میں ہوتا ہے۔ امرتسر میں قیام کے دوران وہ کانگریس سے وابستہ رہے اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کے تعاون سے جدوجہد آزادی میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ جولائی سنہ ۱۹۱۹ء میں حادثۂ جلیانوالہ کے سلسلے میں ایک خصوصی ٹریبونل نے جو جج براڈوے، مسٹر کراون اور میاں رحیم بخش پر مشتمل تھا، انھیں عمر قید کی سزا سنائی، لیکن ایک سال کے بعد عام رہائی کا حکم ہوا اور والد صاحب صعوبت زنداں سے آزاد ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں سندھ تشریف لے آئے اور یہاں محترم پیر علی محمد راشدی، سر عبداللہ ہارون مرحوم، شیخ عبدالمجید سندھی اور پیر غلام مجدد سرہندی کے ساتھ مل کر سندھ میں مسلم لیگ کے قیام اور فروغ کے لیے کام کیا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں کراچی سے "الحبیب" اخبار جاری کیا۔ ان کی حق گوئی کے پیش نظر ۱۹۳۲ء ہی میں حکومت کی طرف سے دو دفعہ زبان بندی کا حکم جاری ہوا۔ اور تین بار "الحبیب" پر مقدمہ دائر کیا گیا لیکن والد صاحب کے جوش و ولولہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ دراصل صداقت پرستی ہم سب بہن بھائیوں نے والد صاحب سے ورثے میں پائی ہے۔ میرے برادر عزیز احسان ملک نئی نسل

کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ اُن کا جراحت کا لہجہ معاشرے کے ناسوروں کو برہنہ کر دیتا ہے۔ میری ذہنی تربیت میں میرے محترم ماموں قیوم ملک کا بھی بڑا حصہ ہے وہ میری تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتے جس کے باعث میری تعلیمی زندگی بڑی تابناک رہی۔ میں نے ہر امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ سینٹ جوزفز کالج کراچی سے بی۔ اے اور کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے اقتصادیات کی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۹ء میں قومی بجٹ کے موضوع پر کل پاکستان مقابلہ مضمون نویسی میں اول رہی اور حکومت پاکستان سے پانچ صد روپے کا انعام بحیثیت ایک محقق طالبہ کے حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملک کے مشہور معیشت داں قاضی فرید مرحوم کی ملک گیر مہم AUSTERITY ECONOMY میں ملکی خواتین کی نمائندگی کی۔ کامرس اور اقتصادیات کے اساتذہ کی ایک انجمن تشکیل دی اور فرید مرحوم کی رہنمائی میں شریک معتمد کے فرائض انجام دیئے۔ دسمبر ۱۹۶۳ء میں کراچی میں "بزمِ طلوعِ فکر" قائم ہوئی تو اس کی صدارت کے فرائض مجھے سونپے گئے۔ آج کل سرسید گرلز کالج کراچی میں صدرِ شعبہ معاشیات کی حیثیت سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہوں۔ مصوری کے شغف کے تحت "کراچی رنگ آرٹ سنٹر" سے بھی وابستہ ہوں اور موسیقی کے ساتھ دیگر فنونِ لطیفہ کی تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔

جہاں تک ذوقِ سخن کا تعلق ہے یہ میں نے ورثے میں پایا ہے۔ والد صاحب بڑا ستھرا علمی و ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ہوش سنبھالا تو گھر کی فضا آسودگی و محبت کا گہوارہ تھی گرد و پیش شعر گو اور شعر فہم ہستیاں نظر آئیں۔ بارہ سال کی عمر سے باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا۔ اوائلِ شباب میں قدم رکھا تو سادہ طبعی نے موہ لیا ـــ خواجہ فرید ـــ سچل سرمست ـــ عبداللطیف بھٹائی ـــ کبیر اور میرا بائی کا اثر قبول کیا۔ شاعری کی ابتدا گیتوں سے ہوئی۔ عمر اور وقت کے ساتھ ساتھ مزاجِ شاعری بھی بدلتا رہا۔ اور طبیعت غزل کی طرف راغب ہوئی۔ میرے دورِ تغزل کا تعلق ساہیوال کے سرسبز و شاداب علاقے سے ہے۔ کپاس کا پھول، گندم کی ڈال، دھان کے کھیت، نہر کی ندیاں، بچھڑی کونج، سرسوں کے کھیت، ساون کی خوشبو ـــ یہ تھے میرے شعری محرکات جنھیں میں اپنی غزلوں میں بعض اوقات رمز و کنایہ کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ جب تک زندگی سکون آشنا رہی اس کی شگفتگی نوبالیدہ ذہن کو متاثر کرتی رہی لیکن اب تخیل کا پھیلاؤ اور کرب کی گہرائی فکر و خیال کی نئی دنیاؤں کی سیاحت کرنے پر اکساتی ہے اور اس کے لئے میں نظم کا سہارا لیتی ہوں ـــ اجتماعی احساسات وحدتِ فکر اور مشترک تہذیب کی قائل ہوں۔ انسانیت سے محبت میرا مسلک ہے۔

توصیف تبسم

تاریخ پیدائش: ۲ر اگست ۱۹۲۸ء

مقام پیدائش: سہسوان ضلع بدایوں (یوپی)

تعلیم: ایم۔ اے

مشاغل: استاد اردو گورڈن کالج راولپنڈی

مستقل تصنیف: (کوئی نہیں)

ادیب سہیل

نام: سید محمد ظہور الحق

مقام پیدائش: چمارہ ضلع مونگیر صوبہ بہار

پیدائش: ۱۹۲۷ء

شاعری کی ابتدا ۱۹۴۲ء کے لگ بھگ ہوئی۔

شعر و شاعری کے علاوہ نثر نگاری سے بھی شغف رہا ہے۔ مقالات کے علاوہ سینکڑوں فیچر اور ہلکے پھلکے مضامین لکھ چکا ہوں۔ موسیقی سے بھی لگاؤ ہے۔ موسیقی پر ایک کتاب "فرہنگِ موسیقی" ترتیب دی ہے۔ اب تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ کچھ موسیقی کے لئے

میں نے ستار کو بطور ساز انتخاب کیا لیکن اُسے بھی آگے نہیں بڑھا سکا۔ تعلیم میٹرک تک ہے۔ اس کے بعد میں نے آئی کام میں نام لکھایا لیکن حالات نے اس کی تکمیل سے بھی روک دیا۔ ویسے ابتدائی زمانے میں جب میری عمر سات آٹھ برس تھی میرے مولوی صاحب مجھے حافظِ قرآن تو نہ بنا سکے لیکن فارسی کی پہلی، دوسری کا حافظ ضرور بنا دیا۔ میں نے غزل، نظم، دوہا اور گیت سبھی میں طبع آزمائی کی ہے۔

شہاب جعفری

تاریخ پیدائش: ۲ رجون ۱۹۳۰ء

وطن اور خاندان: ضلع بنارس میں کاشی وسارناتھ کے قریب مقدس گنگا کے کنارے جاگیردار اہلِ سادات کی ایک بہت قدیم بستی۔ یاد ایام!

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

تعلیم: ۱۹۵۲ء میں بی۔ایس سی: ۱۹۵۳ء میں ایم۔ایس سی حال اول: ۱۹۵۵ء تک جنون زندگی و قلندری: ۱۹۵۶ء میں ایم اے (اردو) یہ سب کچھ خاندانی مادر درسگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے۔ پھر دوران پیشہ "ادب"، "ادب برائے زندگی" کے اصول کے مطابق ۱۹۶۸ء میں ایم۔لٹ دہلی یونیورسٹی سے۔ نمبر سے پی۔ایچ۔ڈی بھی ہوا ہی چاہتا ہوں۔

لطیفہ: علی گڑھ میں بزرگ شاعر اور اردو کے استاد ڈاکٹر معین احسن جذبی کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے پر جب ہم چند طالب علموں نے مبارک باد دی اور انھیں بے تکلفی کی بنا پر مزاحاً ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کیا تو وہ اپنی مخصوص خندہ آمیز آہِ سرد بھر کر بولے "میاں ڈاکٹر و اکٹر کیا سب روزی روٹی کا چکر ہے ورنہ شاعر ہونے کے بعد ڈاکٹر ہونا تو ایسا ہی ہے جیسا ڈاکٹر ہونے کے بعد کمپاؤنڈر ہو جانا ــــ اللہ بس باقی ہوس!"

علی گڑھ میں دورانِ تعلیم ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک (۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۵ء کے دو سال کا وہ وقفہ بھی جو شہر شہر قریہ قریہ بے زنجیر پھرتے گذرا) بالخصوص بعد تعلیم ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۰ء تک احباب اور بہی خواہوں کے درمیان یوں رہا کہ ــــ دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ ــــ شکر ہے کہ یہی میری شخصیت و شاعری کا بہترین تشکیلی دور ثابت ہوا۔

ملازمت: ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ چھوٹ گیا۔ چلئے ــــ بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد ــــ تب سے اردو لکچرار ہوں پہلے تین برس سری وینکٹیشور یونیورسٹی، ترپتی (جنوبی ہند) میں گذارے، یوں کہ ــــ مار دیا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور ــــ گزشتہ پانچ برسوں سے دہلی یونیورسٹی کے ایک کالج میں ہوں، یوں کہ ــــ عاقبت کی خبر خدا جانے ــــ اس طرح زندگی میں دو بار بن باس لے چکا ہوں ــــ شمال سے جنوب پھر جنوب سے شمال!

شاعری: لگ بھگ ۱۹۴۸ء۔۱۹۴۹ء سے غزل، نظم، گیت اور رباعی کو "ہم" کہنا شروع کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے تقدس اور معصومی کا خدا کے تقدس اور معصومی سے زیادہ قائل اور محافظ رہا ہوں۔ شاعری "عزتِ سادات" کی طرح عزیز رہی ہے کہ آج تک یہ آزادانہ اظہارِ ذات اور حق گوئی دعا کی کا وسیلہ ہے "ذریعہ عزت" نہیں ــــ اس کے لئے میں خود کافی ہوں۔

تصنیف: پہلا مجموعۂ کلام "سورج کا شہر" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ شاید پسند بھی کیا جا رہا ہے۔ "تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "تہذیب سخن" زیر طبع ہے شاید اس کی بھی کچھ پوچھ گچھ ہو جائے۔

ان کے علاوہ بھی متعدد مسودات ہیں جو "زیور طبع سے آراستہ" ہونے کے لئے درپے آزار ہیں۔

دیگر کوائف: بچپن سے مصوری، موسیقی، ڈرامہ، اسپورٹس (کھیتی باڑی، باغبانی، سیر و شکار وغیرہ) کا دیوانہ تھا۔ رفتہ رفتہ ان سب کے

زندگی کرنے کے اصول اور شاعری جیسے زندانہ شوقِ فضول نے ان دونوں بڑی حد تک گھر سے باہر کر رکھا ہے کہ زندگی کی کم فرصتی نے اسی کو اپنایا ہے۔ لے دے کے اپنے گھر کا معمار اور مالی رہ گیا ہوں — بار بار گھر بناتا اور چین لگاتا ہوں۔ ہر بار دوست نما حاسدان کرام اُجاڑ دیتے ہیں — یہ مزاج کی شہزادگی و قلندری ہے کہ بار بار مجھے زندہ رکھتی ہے:

زندگی بے در و دیوار مکاں ہے کوئی — کب سے اک حسرتِ تعمیر لئے بیٹھے ہیں

سلیم شاہد

۳ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔

میٹرک پاس کرنے کے فوراً بعد E.S.D ملٹری سٹور میں بطور کلرک ملازم ہوا۔ دو سال بعد جب وہاں سے نکال دیا گیا تو سٹیٹ بینک آف پاکستان لاہور میں ملازمت اختیار کر لی اور گذشتہ ۴ اسال سے وہیں ہوں۔

بچپن سے ہی شعر و ادب سے دلچسپی تھی۔ مگر میں نے باقاعدہ شعر ۱۹۵۸ء میں کہنا شروع کیے۔ اس وقت میری شادی ہو چکی تھی

سر دست میری کوئی تصنیف نہیں۔

جمیل یوسف

دسمبر ۱۹۳۹ء۔ پیدائش بمقام لنگاہ تحصیل چکوال (مغربی پاکستان)

۱۹۵۲ء۔ کلام اشاعت پذیر ہونا شروع ہوا — ۱۹۵۳ء۔ پہلی غزل کی اشاعت

۱۹۵۹ء۔ بی۔ اے آنرز کا امتحان امتیازی حیثیت سے فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔

۱۹۵۹ء۔ آل پاکستان انٹر کالجیٹ مشاعرہ منعقدہ لاء کالج لاہور میں پہلا انعام حاصل کیا۔

۱۹۶۰ء۔ چاند کرن کے نام سے چکوال کے منتخب شعراء، ریاض چشتی، افتخار تاطق، انور علی انور، جمیل ہاشمی اور راقم الحروف کے کلام پر مشتمل ایک انتخاب کلام ترتیب دیا جو مکتبہ ادبیات چکوال نے شائع کیا۔ یہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔

۱۹۶۱ء۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے تاریخ کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۶۲ء۔ گورنمنٹ ڈگری کالج رحیم یار خاں میں بطور استاذ تاریخ تقرر ہوا۔

۱۹۶۳ء۔ رحیم یار خاں سے گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں جا پہنچا۔

۱۹۶۳ء۔ عہد مغلیہ کی تاریخ "تہذیب" بابر سے ظفر تک "کے نام سے لکھی اور خود چھپوائی کیونکہ پبلشروں کو یہ شکوہ تھا کہ یہ سوالاً جواباً نہیں لکھی ہوئی ہے — "نوائے وقت" "امروز" اور "پاکستان ٹائمز" کے تبصرہ نگاروں نے اس کتاب پر یہ رائے دی کہ اُردو زبان میں اس انداز سے اور اتنے بے شمار حوالوں سے کام لے کر اس دور پر اور کوئی کتاب موجود نہیں بعض احباب نے جس میں مولانا ماہر القادری بھی شامل ہیں اسے ایک ادبی تخلیق قرار دیا۔

۱۹۶۳ء۔ حکومت پاکستان کی مرکزی اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلہ کے امتحان میں بیٹھا۔

۱۹۶۴ء۔ مقابلہ کے امتحان کے نتیجہ کے طور پر میرے حصے میں پاکستان ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹس سروس (کلاس ون) آئی۔

۱۹۶۶ء۔ کنٹونمنٹ ایگزیکٹو آفیسر کے طور پر مری میں تقرری ہوئی۔

۱۹۶۷ء۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹس پشاور ریجن کے طور پر میرا تبادلہ پشاور ہو گیا۔

۱۹۶۸ء۔ جنوری کے مہینے میں ایگزیکٹو آفیسر چٹاگانگ کنٹونمنٹ کی حیثیت سے مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا اور اب تک وہیں ہوں۔

افضل منہاس

نام: وزیر احمد — وطن مالوف: تحصیل چکوال ضلع جہلم، عمر ۴۴ سال

تقریباً ۱۵ سال سے صحافت میں ہوں۔ روزنامہ "ناقوس" راولپنڈی کا ایڈیٹر رہ چکا ہوں۔ گذشتہ آٹھ سال سے روزنامہ "تعمیر" راولپنڈی سے منسلک ہوں۔ ماہنامہ "نیرنگ خیال" لاہور کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے چکا ہوں۔

دس بارہ سال سے شعر کہہ رہا ہوں۔ نظم بھی کہتا ہوں مگر غزل زیادہ عزیز ہے۔ غزلوں کا پہلا مجموعہ "روشنی کے زخم" زیر طبع ہے۔

شعر عبادت سمجھ کر کہتا ہوں —— اور بس!

عطاء الرحمٰن جمیل

عطاء الرحمٰن جمیل ۲۲ جون ۱۹۲۷ء کو بہار شریف ضلع پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ سائنس کالج سے بی۔ ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ڈھاکے چلے آئے۔ احسن اللہ انجینیرنگ کالج ڈھاکہ سے انجینیرنگ کی تعلیم مکمل کی۔ ان دنوں حکومت مشرقی پاکستان کے محکمہ تعمیرات میں ایگزیکٹو انجینیر کے عہدے پر فائز ہیں۔ نظم اور غزل دونوں کہتے ہیں۔ مجموعہ کلام عنقریب بزمِ اردو مشرقی پاکستان کی طرف سے شائع ہونے والا ہے۔

افسر ماہ پوری

نام: ظہیر عالم صدیقی — مقام و تاریخ پیدائش: موضع ماہ پور ضلع چھپرا (بہار، بھارت) ۱۹۱۵ء

تعلیم: میٹریکولیٹ۔ کلکتہ یونیورسٹی ۱۹۳۵ء

مشغلہ: اسسٹنٹ، ایس اینڈ جی اے (ریکارڈس)، ڈیپارٹمنٹ، حکومت مشرقی پاکستان، ڈھاکہ

تصنیف و تالیف: "جام کوثر" (قاضی نذر الاسلام کی اسلامی نظموں کے منظوم تراجم)

ناصر زیدی

مختصر طور پر حالاتِ زندگی اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ:

۸ر اپریل ۱۹۴۳ء کو مظفر نگر (یو۔ پی، بھارت) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ لاہور میں ہوش سنبھالا۔ تعلیم فی الحال بی۔ اے تک ہے۔ تصنیف کوئی نہیں۔ ان دنوں "ادبِ لطیف" کا مدیر ہوں۔

زاہد فارانی

تاریخ پیدائش: ۸ر مارچ ۱۹۴۴ء — مقام پیدائش: لاہور

تعلیم: ایم۔ اے (اردو) — مشاغل: ملازمت

ساجد الباقری

۲۳ر جولائی ۱۹۲۸ء کو محمد آباد ضلع آگرہ میں پیدا ہوا۔ اعتماد پور سے مڈل کلاس اور ریلوے ہائی اسکول ٹونڈلہ سے میٹرک پاس

گیا۔ چند ماہ سینٹ جانس کالج آگرہ میں زیرِ تعلیم رہا۔ ۱۹۴۳ء میں صاحبزادہ محمود الحسن کی وساطت سے ایک دفاعی ورکشاپ میں ملازم ہو گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد راولپنڈی آگیا۔ ادیب فاضل اور بی۔ اے کی ڈگریاں پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کیں اور محکمہ ترقی دیہات میں ضلع راولپنڈی کا پبلسٹی آفیسر مقرر ہو گیا۔ اس محکمے کے ختم ہو جانے پر محکمۂ اطلاعات حکومت مغربی پاکستان کی ملازمت اختیار کی۔

۱۹۴۲ء سے شاعری کر رہا ہوں۔ ۱۹۴۵ء میں ہفت روزہ "سحر" بمبئی کا اعزازی مدیر معاون مقرر ہو گیا تھا۔ یہ سلسلہ پاکستان کے قیام کے بعد تک جاری رہا۔ یہاں بھی متعدد جرائد کا اعزازی مدیر معاون رہا ہوں۔

ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ خصوصاً غزل میں روایت سے ہٹ کر کہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میرے ۱۴ مختصر افسانوں کا مجموعہ "تاک جھانک" شائع ہو کر لاتعداد اربابِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ نئی غزلوں، گیتوں، قطعات اور رباعیات کے مجموعے زیرِ طبع ہیں۔ آج کل متوازن اور اثر انگیز جدیدیت کے فروغ کے لئے کوشاں ہوں۔

میرا ذریعۂ معاش بالخصوص سرکاری ملازمت ہے۔ ۶ بچوں اور ایک شریکِ حیات کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتا ہوں اور میرا بنک بیلنس نہ ہونے کے برابر ہے۔

احمد معصوم

مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں ۱۹۳۷ء میں ایک مذہبی سنّی گھرانے میں پیدا ہوا۔ آزادی کے بعد والدین کے ساتھ میانی (ضلع سرگودھا) میں سکونت اختیار کی۔ بچپن میں گلستان و بوستاں والد سے پڑھیں۔ گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ سے میٹرک پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم اسلامیہ کالج لاہور اور گورڈن کالج راولپنڈی میں حاصل کی اور اردو و سیاسیات میں ایم۔ اے کیا۔

تقریباً دو سال ڈیفنس آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کی۔ ۱۹۶۲ء میں صحافت اختیار کی۔ تب سے ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (اے پی پی) کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہوں۔

شاعری کے علاوہ، افسانے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔

مقبول نقش

نام: عبد السبحان پیدائش: ۲۱ اپریل ۱۹۲۲ء کو جمشید پور میں پیدا ہوا۔ آبائی وطن مدراس

تعلیم: اردو، عربی، فارسی کا سلسلۂ تعلیم بطریقِ قدیم گھر پر شروع ہوا مگر میری عمر سولہ سال کی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم جاری نہ رہ سکا۔

ذریعۂ معاش: پاکستان آنے سے قبل تک بحیثیت میکانک، لوہے کے ایک بہت بڑے کارخانے میں ملازم تھا۔ پاکستان آنے کے بعد مختلف قسم کی ملازمتیں کرتا رہا اور اب ایک تعمیراتی کمپنی میں نگرانِ کار کے طور پر ملازم ہوں۔

اصنافِ سخن: غزل، نظم، رباعی اور قطعات۔ گیت لکھنے کی کوشش نہیں کی۔

تصنیفات: "جوئے خوں" یہ ایک طویل نظم ہے، جو کشمیر کے فروخت ہونے سے قبل شروع ہو کر ستمبر ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ کے خاتمے پر ختم ہوتی ہے۔ اسے منظوم تاریخِ آزادیٔ کشمیر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا —— "زہرِ آگہی"، اور "حرف و صوت" یہ دونوں مجموعے غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہیں اور زیرِ ترتیب ہیں۔ ایک مجموعہ قطعات و رباعیات کا بھی مکمل ہے۔

عیش برنی

غلام محمد نام۔ عیش تخلص۔ بلند شہر سے وطنی تعلق کی بنا پر اپنے کو عیش برنی کہتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ مختلف فرموں میں ملازمتیں کرتے رہے ہیں۔ ابھی تک کوئی کتاب شائع نہیں کی۔ ان دنوں بزم اردو مشرقی پاکستان کے شعبۂ تصنیف و تالیف کے سکریٹری ہیں۔

شاہین غازی پوری

نام: سید ولی عالم
آبائی وطن: موضع غازی پور ضلع مونگیر۔ بہار (بھارت)
سنہ پیدائش: ۱۱ر جنوری ۱۹۳۸ء
والد کا نام: میر نوید علی مرحوم

ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں غازی پور، تمری بختیار پور اور بھاگل پور میں حاصل کی۔ میٹرک آدرش ودیالیہ نارا پور سے ۱۹۵۳ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۶۰ء میں بہار یونیورسٹی سے شماریات میں ایم ایس سی کیا اور یونیورسٹی میں اول آیا۔

ایم ایس سی کرنے کے فوراً بعد کچھ دنوں تک مارواڑی کالج بھاگل پور میں لکچرر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ بعد ازیں حکومت ہند کے ادارے NATIONAL SAMPLESURVEY سے چھ ماہ تک وابستگی رہی۔ ستمبر ۱۹۶۱ء میں دوبارہ مارواڑی کالج میں ملازمت اختیار کی جہاں پاکستان آنے سے قبل ۱۹۶۴ء کے آخر تک لکچرر شماریات کے فرائض انجام دیتا رہا۔ یہاں آکر پاکستان ٹی بورڈ ڈھاکہ میں ایک سال سے کچھ زائد عرصے تک ماہر شماریات کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد اب تقریباً ڈھائی سال سے آدم جی جوٹ ملز لیمٹڈ سے وابستہ ہوں جہاں شعبۂ شماریات کی سربراہی میرے ذمے ہے۔

باقاعدہ شاعری ۱۹۵۵ء سے شروع کی۔ شاعری میں اصلاح و تربیت کا قائل ہونے کے باوجود بدقسمتی یا خوش قسمتی سے کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع نہ ملا۔

میں نے اپنا مجموعۂ کلام "رگِ ساز" ۱۹۶۷ء میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ اردو کی حد تک یہ مشرقی پاکستان سے شائع ہونے والا پہلا شعری مجموعہ ہے اور آفسیٹ طباعت پر پہلی کتاب بھی۔

میری شاعری بالواسطہ ترقی پسند تحریک سے متاثر رہی ہے۔

فخر زماں

گجرات (پنجاب) سے تعلق رکھتا ہوں۔ وہاں سے ایک انگریزی ماہنامہ "وائس" اور اردو ماہنامہ "بازگشت" نکالتا رہا ہوں۔ پہلا مجموعۂ کلام "زہراب" شائع ہو چکا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے چند ایک ڈرامے بھی لکھے ہیں جو مقبول ہوئے ہیں۔ آجکل لاہور میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کا افسر اعلیٰ ہوں۔

سلیم بیتاب

تاریخ پیدائش: ۲ر اپریل ۱۹۴۰ء
مقام پیدائش: جالندھر

تعلیم: (۱) بی۔ اے (اسلامیہ کالج لائلپور)۔ (۲) ایم۔ اے (اردو ادبیات، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور)

مشاغل: استاد ادبیات اردو، اسلامیہ کالج لائلپور۔

اطہر نفیس

اصل نام: اطہر علی خاں — عمر: (تقریباً) چونتیس ۳۴ ، پینتیس سال

وطن: (حال)، کراچی — وطن سابق: ضلع علی گڈھ کا ایک قصبہ

اب تک کوئی شعری مجموعہ یا تصنیف "زیورِ طبع" سے آراستہ نہیں ہو سکی ہے مگر ایک مجموعہ زیرِ ترتیب ضرور ہے۔

اسلم انصاری

تاریخ پیدائش: ۳۰ر اپریل ۱۹۴۰ء — مقام پیدائش: ملتان

تعلیم: بی: اے (آنرز)، ایم اے (اردو) — مشغلہ: تدریس — تصانیف: ابھی کوئی تصنیف شائع نہیں ہوئی

سیف زلفی

تاریخ پیدائش: تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود — والدین نے تاریخ پیدائش کسی کتاب یا ڈائری میں نہیں لکھی۔ شاید اس لئے کہ ہم دس بھائی بہن ہیں۔ بہرحال ایک محتاط اندازے کے مطابق میری عمر — تیس بتیس برس ہو گی۔

مقام پیدائش: بریلی (یوپی۔ بھارت) — تعلیم: (ڈگریوں کے علاوہ) — دیوانِ غالب سے کلام شکیب جلالی تک

مشاغل: "گلفشاں" کی ادارت

تصانیف: (۱) "ہمارے ہیں حسین"، جس کی اشاعت کے بعد افواہ اڑی کہ سیف زلفی میر، غالب اور جوش کے عقیدے کا شاعر ہے حالانکہ میرا مسلک ندیم کی سی انسان دوستی ہے جو میں نے حسینؑ کے کردار سے چھینی ہے۔ (۲) "بچہ لیگ" (۳) "منزل کی طرف" ہر دو کے حقوق بحق ناشر محفوظ (۱۹۵۵ء بہ سن ۱۹۶۰ء)۔ (۴) "سخن ور" — میری غزلوں کا مجموعہ۔ جو ابھی چھپنے والا ہے۔ (۵) دوہوں کا مجموعہ۔ جو عنقریب چھپے گا آخری دو مجموعے بلا منتِ غیرے جلد چھپ جائیں گے اس لئے کہ اب میں خود ناشر ہوں۔

خلیل رامپوری

۱۹۲۳ء میں بمقام آغا پور پیدا ہوا۔ آغا پور رامپور کے ایک مشہور گاؤں کا نام ہے۔ تعلیم رامپور میں پائی جو نہ پانے کے برابر تھی لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں کے طفیل اُسے اُس معیار سے ہمکنار کیا کہ آج انسرِ بہبود کی خدمات کا وی تھل ٹیکنیکل طرز بھگر میں انجام دے رہا ہوں اور خلیل الرحمان خاں کے نام سے معروف ہوں۔

۱۹۵۲ء سے خلیل رامپوری کے نام سے ادبی جرائد میں چھپ رہا ہوں۔ آج کل شعری دنیا میں میرا مقام کیا ہے۔ یہ میری غزلوں کے معیار سے متعین کیا جا سکتا ہے جو قارئین کے سامنے ہیں۔ میرا اب تک کوئی شعری مجموعہ بازار میں نہیں آیا، اور نہ ہی آئندہ آنے کے آثار ہیں۔ رہا یہ سوال کہ شاعری سے میں نے کیا پایا تو اس کے جواب میں صرف اپنا ایک مقطع پیش کروں گا اور بس — !!

شاعری نے مجھے انسان بنایا ہے خلیلؔ — میں وہ شیشہ تھا کہ دنیا سے چمکتا ہی نہ تھا

انور شعور

گیارھویں اپریل ۱۹۴۳ء کو بمبئی میں پیدا ہوا لیکن شعر کہنے کی باقاعدہ مشق کراچی میں ۱۹۵۵ء سے شروع کی جو اب تک جاری ہے۔

انجمن ترقی اردو (کراچی) سے وابستہ ہوں — مشاغل میں تیرنا اور کرکٹ کھیلنا وغیرہ شامل ہیں۔

حسن اختر جلیل

نام: حسن اختر تاریخ پیدائش، ۲۴ر جولائی ۱۹۳۵ء مقام پیدائش: جھنگ

تعلیم اور مشاغل: زندگی کے ابتدائی بیس برس سرگودھا میں گزرے جہاں گورنمنٹ کالج سے ۱۹۵۵ء میں بی۔ اے کیا۔ اس وقت محکمہ مال میں نائب تحصیلدار ہوں اور بسلسلہ ملازمت جھنگ میں مقیم

تصانیف: غزلوں اور نظموں کے دو مجموعے اپنے ناشر کے انتظار میں ہیں۔

رضی اختر شوق

میری تاریخ پیدائش ہے: ۲۳ر اپریل ۱۹۳۳ء مقام پیدائش: سہارنپور (یوپی)

۱۹۶۱ء سے بہ حیثیت پروگرام پروڈیوسر ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ ہوں اور شعبۂ ڈرامہ سے بہ حیثیت پروڈیوسر متعلق ہوں ریڈیو ڈرامہ پیش کرنا ملازمت بھی ہے اور ذاتی شوق بھی۔ مشاغل میں ادب، شاعری اور ڈرامہ کا مطالعہ شامل ہے۔

ابھی تصانیف کتابی صورت میں کوئی نہیں۔

مظفر وارثی

نام: محمد مظفر الدین احمد پیدائش: ۲۳ر دسمبر ۱۹۳۳ء

مقام: ضلع میرٹھ (یوپی) تعلیم: میٹرک۔ ادیب فاضل

مشاغل: ملازمت اسٹیٹ بنک آف پاکستان۔ فلمی گیت نگاری تصنیف: شعری مجموعہ "زنجیر نغمہ" زیر اشاعت

مرتضیٰ برلاس

پیدائش: ۱۹۳۴ء بمقام مراد آباد (یوپی) تعلیم: ایم۔ ایس سی (ریاضی)

مشاغل: دوران تعلیم میاچنے کھیل کود۔ ۱۹۵۵ء میں فارغ التحصیل ہو کر درس و تدریس سے منسلک رہا۔ ۱۹۵۶ء میں پی سی ایس میں منتخب ہو کر ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں مجسٹریٹ، مہتمم خزانہ، چیئرمین میونسپل کمیٹی کے فرائض منصبی سرانجام دیئے۔ ۱۹۶۱ء میں صوبائی حکومت نے میری خدمات مرکزی حکومت کو عارضی طور سے سونپ دیں۔ ۱۹۶۲ء تک وہیں رہا۔ آج کل گجرات میں ہوں۔

مجموعہ کلام زیر ترتیب ہے۔

کشور ناہید

پیدائش: ۱۸ر جون ۱۹۴۰ء مقام: بلند شہر (یوپی)

۱۹۴۹ء میں لاہور آئی اور اب تک لاہور میں ہوں۔ تعلیم لاہور کالج اور گورنمنٹ کالج سے حاصل کی۔ اب مرکزی محکمہ اطلاعات میں ملازم ہوں۔ پہلا مجموعہ کلام زیر طبع ہے۔ اس میں صرف غزلیں شامل ہیں۔ نظموں کا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

شادی ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ ماشاء اللہ دو بچوں کی ماں ہوں۔

عبید اللہ علیم

بھوپال میں پیدا ہوا۔ اسکول سرٹیفکٹ کے اعتبار سے میرا سن پیدائش ۱۲ر جنوری ۱۹۳۹ء ہے اور میرے بڑے بھائی کا ۱۹۴۱ء

میرے دادا جان کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ وہیں کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ میرے والد صاحب وہاں سے پہلے ناگپور اور پھر بھوپال پہنچے اور وہاں کوئی ۴۰ برس رہے۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان لایا گیا۔ ذات کا کشمیری بٹ ہوں۔ والدین کا رکھا ہوا نام عبید اللہ ہے۔ میں نے بغیر کسی شاعرانہ تصور کے علیم کا اضافہ اس وقت کیا جب میں نویں درجے کا طالب علم تھا اور شعر لکھنے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ۱۹۵۷ء میں ایک آدھ غزل لکھی اور باقاعدہ لکھنا ۱۹۵۹ء سے شروع کیا جب میں اردو کالج میں سالِ اول فنون کا طالب علم تھا۔ کراچی یونیورسٹی سے بی۔ اے فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ ایم۔ اے سالِ اول پاس کر چکا ہوں، کچھ مادی اور روحانی الجھنوں کی بنا پر فائنل کا امتحان ابھی تک نہیں دے پایا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازم ہوں۔ پہلا مجموعۂ کلام "لہو لہو زنجیر" کے نام سے زیرِ ترتیب ہے جو انشاء اللہ جنوری ۱۹۶۹ء تک منظرِ عام پر آجائے گا۔

ریاض مجید

تاریخِ پیدائش اور مقامِ پیدائش: عید الفطر کی صبح ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو جالندھر میں پیدا ہوا۔ تقسیم پاک و ہند کے بعد گھر والوں کے ساتھ لائل پور چلا آیا۔

تعلیم: گورنمنٹ کالج لائلپور سے ۱۹۶۳ء میں بی۔ اے (آنرز) ان انگلش کیا۔ ۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔ اے (اردو) کیا۔

مشاغل: کچھ عرصہ تک لائلپور گورنمنٹ کالج میں لکچرر رہا۔ آج کل وادیٔ ونہار کے گورنمنٹ کالج بھوچال کلاں (جہلم) میں تعلیم و تدریس اردو کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔

تصانیف: "تذکرہ" (جدید نظموں کا مجموعہ) کتابیات لاہور میں زیرِ طبع ہے۔ "سرگزشت" (غزلوں کا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے)

انور مسعود

نام: محمد انور مسعود — تاریخِ پیدائش: ۸ نومبر ۱۹۳۵ء

مقامِ پیدائش: گجرات (پاکستان) — تعلیم: ایم۔ اے (فارسی)

مشاغل: زیادہ تر وقت درس و تدریس میں صرف ہوتا ہے۔ ۱۹۶۲ء سے مختلف سرکاری کالجوں میں فارسی کی تدریس پر مامور ہوں۔ آج کل یہ فریضہ گورنمنٹ کالج گوجر خاں میں ادا کر رہا ہوں۔ فرصت کے اوقات بالعموم فکرِ سخن کی نذر ہوتے ہیں۔

تصانیف: فی الحال کوئی تصنیف شائع نہیں ہوئی۔ پنجابی کلام کا مجموعہ مرتب ہو چکا ہے اور عنقریب شائع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ جدید و قدیم فارسی ادب پر کچھ تحقیقی اور تنقیدی مقالے بھی زیرِ طبع ہیں۔

زبیر رضوی

پیدائش: ۱۵ اپریل ۱۹۳۵ء — وطن مالوف: امروہہ (یو۔پی)

ابتدائی اور ہائر سکنڈری تک تعلیم حیدرآباد دکن میں حاصل کی۔ شعر و ادب سے دلچسپی حیدرآباد کے ادبی ماحول کی دین ہے۔ ۱۹۵۱ء میں حیدرآباد سے دلی آ گیا تھا اور تب سے یہیں ہوں۔ دلی یونیورسٹی سے اس سال ایم۔ اے (اردو) فائنل کر رہا ہوں۔ ریڈیو اسٹیشن پر اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ملازم ہوں۔ ۱۹۶۴ء میں میرا پہلا منتخب شعری مجموعہ "لہر لہر ندیا گہری" کے نام سے مکتبہ صبا، حیدرآباد نے شائع کیا تھا۔ اب دوسرا مجموعہ "درد کا شجر" کے نام سے کتاب پبلشرز لکھنؤ شائع کر رہا ہے۔ اصنافِ سخن میں مجھے نظم کے بعد غزل کی صنف بے حد عزیز ہے۔

رام ریاض

تاریخ پیدائش: ۱۳ر جنوری ۱۹۳۲ء
مقام پیدائش: ضلع مظفر نگر (یو۔پی)
تعلیم: بی۔اے۔ ڈپلومہ ان وول ٹیکنولوجی
مشاغل: کرکٹ کھیلنا۔ تاش کھیلنا۔ مطالعہ کرنا۔
تصانیف: فی الحال کوئی نہیں۔

روحی کنجاہی

نام: امر الٰہی
مقام پیدائش: کنجاہ (گجرات)
تاریخ پیدائش: ۱۴ر اگست ۱۹۳۹ء
تعلیم: بی۔اے
تصنیف: "لمحہ لمحہ" (مجموعہ کلام زیر ترتیب)
مشاغل: (۱) ملازمت محکمہ مغربی پاکستان زرعی ترقیاتی کارپوریشن لاہور (۲) آوارہ گردی اور مطالعہ کتب

کمار پاشی

۳ر جولائی ۱۹۳۵ء کو بغداد الجدید (مغربی پاکستان) میں پیدا ہوا تھا۔ تقسیم کے بعد سے دلّی میں ہوں۔ تعلیم انٹرنک ہے اور پیشہ ملازمت۔ شعری مجموعے "پرانے موسموں کی آواز" اور "خواب تماشا" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ "پہلے آسمان کا زوال" (افسانے) زیر طبع ہے۔ میرا المیہ یہ ہے کہ میں اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جس کے کندھوں پر اردو زبان کا جنازہ رکھ دیا گیا ہے۔

شہریار

نام: کنور اخلاق محمد خاں
تعلیم: ایم۔اے

۱۶ر جون ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوا۔ والد صاحب پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ بڑے بھائی بھی پولیس میں انسپکٹر ہیں۔ دادا کا پیشہ بھی یہی تھا۔ والد صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ میں اس "چراغ" کو بجھنے نہ دوں یعنی یہی ملازمت اختیار کروں۔ ان کا خیال تھا کہ میں صحت، صورت، صلاحیت اور ذہانت کے اعتبار سے اس کے لئے موزوں ترین آدمی ہوں لیکن میں ان کی یہ خواہش پوری نہ کر سکا۔ وہ انتقال (۱۹۶۳ء) سے کچھ پہلے تک مجھ سے اس بات پر خفا رہے۔

ابتدائی تعلیم قصبہ ہیبڑی ضلع بریلی، بینی گنج ضلع ہردوئی اور شہر ہردوئی میں حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء سے مسلسل علی گڑھ میں ہوں اور اسکول سے یونیورسٹی تک کی تمام تعلیم یہیں حاصل کی۔ اسکول کے زمانے میں میری دلچسپی کھیل کود سے زیادہ تھی۔ میرا شمار اسکول کے اچھے کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ ہاکی اور ایتھلیٹکس میں میں نے نمایاں کامیابیاں بھی حاصل کی تھیں۔ اسکول کے زمانے کی مجھے کوئی ایسی بات یاد نہیں آتی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ مجھ میں شاعری کے جراثیم تھے۔ یونیورسٹی کا شروع کا ایک سال بھی اس کا کوئی سراغ نہیں دیتا۔ اس کے بعد میں نے شاعری شروع کر دی۔ ابتدا میں خاصی روایتی قسم کی چیزیں لکھیں۔ لیکن بہت جلد میرے اندر تبدیلی پیدا ہو گئی۔

یونیورسٹی کی طالب علمی کے زمانے میں انجمن اردوئے معلّٰی کا سکریٹری اور علی گڑھ میگزین (اردو) کا ایڈیٹر رہا۔ دو ذاتی اخبار "جھپال" اور "غالب" بھی نکالے۔ امتیاز کے ساتھ ایم۔اے کرنے کے بعد آٹھ ماہ تک انجمن ترقی اردو کے صدر دفتر (علی گڑھ) میں لٹریری اسسٹنٹ کے فرائض انجام دیتا رہا۔ پھر یونیورسٹی کا ریسرچ فیلوشپ مل گیا۔ تین سال کے بعد جب یہ فیلوشپ ختم ہو گیا تو

پھر انجمن میں لٹریری اسسٹنٹ ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے میرا تقرر ہو گیا۔ یہ ملازمت مستقل ہے۔ اس کے علاوہ جو حالات ہیں وہ بتانے کے نہیں "تحقیق" کرنے کے ہیں لیکن منظرِ عام پر نہ لانے کی شرط کے ساتھ۔ ۱۹۶۵ء میں میرا پہلا مجموعہ "اسم اعظم" شائع ہوا۔ دوسرا زیرِ ترتیب ہے۔

جمال آصف

پڑھے لکھے باپ کا جاہل بیٹا۔ شعر کے واسطے سے کم اور کھیل کے لئے زیادہ مشہور۔ شعر بہت ہی کم کہے ہیں۔ میرے احباب اس کا ذمہ دار بھی میری کاہلی کو ٹھہراتے ہیں۔ بہر حال یہاں میں اُن سے اختلاف رکھتا ہوں۔ آخری شعر جو ایک سال پہلے کہا تھا کچھ اس طرح ہے:

اپنی خبر سے کیا گئے، اُس کے پیام سے گئے   یوں ہے کہ صاحبانِ درد، شعر کے کام سے گئے

محمد علوی

تاریخ پیدائش: ۱۰ر اپریل ۱۹۲۷ء   مقام پیدائش: احمد آباد (بھارت)   تعلیم: نان میٹرک

تصانیف: ۱۔ خالی مکان (۲) آخری دن کی تلاش   مشاغل: برج کھیلنا۔ کتابیں پڑھنا۔ فلم دیکھنا اور شعر کہنا

رشید قیصرانی

تاریخ پیدائش: ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۰ء   مقام: کوٹ قیصرانی ضلع ڈیرہ غازی خان

تعلیم: بی۔اے   مشاغل: سکواڈرن لیڈر، پاک ایر فورس

تصانیف: مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

عادل منصوری

تاریخ پیدائش: ۱۸ر مئی ۱۹۳۶ء   مقامِ پیدائش: احمد آباد (بھارت)   تعلیم: صفر

تصانیف: (۱) کلامِ منسوخ (۲) ایک رنگ (گجراتی) زیرِ طبع۔ مشاغل: نماز پڑھنا

غلام جیلانی اصغر

پیدائش: یکم جون ۱۹۱۵ء (ممکن ہے یہ تاریخ سرے سے غلط ہو کیونکہ جون کا مہینہ میرے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا)

تعلیم: ایم۔اے انگریزی ادبیات

پیشہ: تعلیم و تدریس۔ پچھلے ۲۶ سال سے انگریزی پڑھا رہا ہوں۔ ہر صبح لغت کی مدد سے اپنے تلفظ کی اصلاح کرتا ہوں اور شام تک میری انگریزی پر اردو لہجہ غالب آجاتا ہے۔ ممکن ہے قارئین اسے میری کسرِ نفسی یا مشرقی خاکساریت سے منسوب کریں لیکن دراصل یہ میرے پنجابی خون کی عطا ہے۔ کچھ دوست جو اردو کی لفظی صحت پر اصرار کرتے ہیں، میری لسانی اور جسمانی صحت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ بقول ان کے کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے۔ مجھے ہر اس زبان سے بیگانگی کی بو آتی ہے جو لکھنے والے کے خون میں پیوست نہ ہو۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ ہے جسے میں اپنی غلطیوں کے جواز میں پیش کر سکتا ہوں۔

تصنیف و تالیف: عرصہ ہوا انگریزی کی ایک کتاب لکھی تھی اور اب تک اس پر شرمندہ ہوں۔ شعروں کا ایک مجموعہ پچھلے بیس سال سے مرتب کر رہا ہوں لیکن ہر سال اس سے پچھلے سال کی غزلیں اور نظمیں نکال دیتا ہوں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نثر میں خاصے مضامین لکھے ہیں۔

کچھ چھپ چکے ہیں اور کچھ مدیران کے شکریہ کے ساتھ واپس آگئے ہیں۔ دراصل یہی وہ مضامین تھے جن کی افادیت میرے نزدیک مسلم تھی۔

پتہ: ان دنوں گورنمنٹ کالج سرگودھا میں شعبۂ انگریزی کا سربراہ ہوں۔ فاعتبروا یا اولوا الابصار

ادبی مسلک: جدید اردو نظم اپنے اندر اظہار کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے لیکن اس کی جدیدیت سے ڈر لگتا ہے۔ غزل اور خصوصاً موجودہ غزل کی توانائی کا معترف ہوں لیکن اس جدید غزل سے گھبراتا ہوں جس کی ممبازم انتہائی طور پر شخصی ہو۔ غزل اجتماعی ابلاغ کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہ ہر دور کے فکر کی حکاسی کرتی ہے لیکن اس کی داخلی توانائی اسی وقت برقرار رہ سکتی ہے جبکہ جدت روایت کے ساتھ ساتھ چلے ورنہ اچھا بھلا ظفر اقبال اپنے راستہ سے بھٹک جائے گا۔

اقبال ساجد

میں ریاست لنڈھورہ ضلع سہارنپور۔ یوپی (انڈیا) میں تقریباً ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوا۔ تاریخ پیدائش تقسیم کی نذر ہو گئی۔ میرے والد غلام محمد صاحب فوج میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اُن کا انتقال دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر ہوائی جہاز کے سفر کے دوران حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوا۔ حکومتِ برطانیہ نے ان کی کارکردگی پر شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ ناز و نعم میں پل رہے تھے جب بچپن ہی میں ہم باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ ماں نے بیوگی کی چادر اوڑھ لی اور ہمارے لئے بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کیں۔ پھوپھا پھوپھی نے ہی تعلیم و تربیت کا ذمہ لیا۔ میں نے ابتدائی تعلیم قصبہ شیر کوٹ ضلع بجنور یوپی اور تقسیم کے بعد لاہور میں حاصل کی۔ اس عرصہ میں باپ کا دستِ شفقت اور سایہ سر پر نہ ہونے کا شدید احساس ہوا۔ اس لئے اپنے ہی سائے کی انگلی پکڑ کر زندگی کا سفر شروع کیا۔ سکھ کی نہر نکالنے کے لئے دکھوں کے پہاڑ کاٹے۔ خاندان کے زیادہ تر افراد تاجر اور فنِ سنگ تراشی میں ماہر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور میں مقیم ہوئے۔ یہاں پر بھی ڈیزل انجن کی مشینری اور پتھروں کا کاروبار کرنے لگے۔ میں نے بھی مشینری کا چھوٹا سا کام شروع کیا۔ گزر اوقات کے لئے کئی مرحلوں سے گزرا۔ مختلف چیزیں بیچیں۔ قلم کی مزدوری کی۔ کچھ عرصہ ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ رہا۔ آج کل ایک رشتہ دار کی مشینری کی دوکان پر لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں۔

سکول کے زمانے ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ بچپن کا یہ پودا میرے ساتھ ساتھ جوان ہوا ہے۔ میں نے اس کو بڑے پیار، محبت اور محنت سے خونِ دل دے کر پروان چڑھایا ہے۔ اب اس پیڑ کے تازہ پھل اردو ادب کے دامن میں گرنے لگے ہیں۔ وقت میری محنت کا صلہ دے یا نہ دے، حالات مجھ سے صلح کریں یا نہ کریں لیکن مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں ادب کی خدمت کرتا رہوں گا۔

صدیق افغانی

نام محمد صدیق خاں — تاریخ پیدائش: ۹ ستمبر ۱۹۳۳ء

مقامِ پیدائش: نواب سٹریٹ، کوچہ مہر شاہ دی رین بازار، مزنگ لاہور — تعلیم: ایف۔ اے

مشاغل: کاروبار کے علاوہ مطالعہ، شعر و شاعری، ہاکی اور کرکٹ کے میچ دیکھنا، فلم بینی بھی عادت میں شامل ہے۔

تصانیف: غزلوں کا ایک مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

میرے والد خان احمد جان خاں صاحب والیٔ افغانستان سردار ایوب خاں کے ساتھ نظربند ہو کر چوبرجی لاہور میں قیام پذیر تھے۔ سردار صاحب کی وفات کے بعد انھوں نے مزنگ میں مستقل رہائش اختیار کر لی اور یہیں کے ہو رہے۔ وہ گرمیوں میں کشمیر میں جنگل کا ٹھیکہ

ے لیتے اور پوری گرمیاں کشمیر میں لکڑی کا کاروبار کرتے۔ موسم سرما میں سردی کی زیادتی کی وجہ سے وہاں قیام ناممکن ہو جاتا اس لئے ہم سب لاہور واپس آجاتے۔ سردیوں کے چھ مہینے وہ اپنے احباب کے ساتھ سیر و شکار اور دیگر تفریحات میں گزار دیتے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے نہر کی ٹھیکیداری شروع کر دی۔ اس طرح انھوں نے بی۔ آر۔ بی لنک، ہیڈ بلوکی بیلمانکی لنک و دیگر نہروں پر کام کیا۔ میری تعلیم کا سلسلہ چونکہ ایف۔ اے میں منقطع ہو گیا تھا لہٰذا میں بھی ان کے ساتھ نہر پر ٹھیکیداری کرنے لگا۔ بدقسمتی سے ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا میں اپنے بڑے بھائی محمد عثمان خان کے ساتھ تونسہ بیراج ڈیرہ غازی خان میں کام کرنے لگا۔ اس طرح مختلف مقامات پر کام کرنے کے بعد آج کل لاہور میں ٹھیکیداری کر رہا ہوں۔ عنفوان شباب ہی میں محبت میں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ شاید اسی لئے طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل ہو گئی۔ غزل پر جان دیتا ہوں۔ شاعری کی دیگر اصناف نظم، رباعی، مثنوی وغیرہ کا بھی منکر نہیں۔ شروع سے ہی طبیعت جدید شاعری کی طرف مائل رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میر و غالب کا منکر ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

تعلیم: ایم۔ اے (انگریزی)
عمر: ۳۲ سال اور کچھ مہینے
پیشہ: سرکاری ملازمت (انڈین پوسٹل سروس)

تصنیفات: فاروقی کے تبصرے (۱۹۶۸ء)، نئے نام (نئی شاعری کا انتخاب)، حامد حسین حامد کے ساتھ مل کر ترتیب دی (۱۹۶۷ء میں)
لفظ و معنی (مضامین کا مجموعہ) زیر طبع ہے۔

شمیم حنفی

میرے حالاتِ زندگی کا تصور خود مجھ پر بار ہے۔ عملی طور پر کوائف اور تجربات کی دنیا زیادہ ناخوشگوار نہیں رہی لیکن داخلی کرب و اضطراب کا سیل میرے وجود کو ہمیشہ متزلزل رکھتا ہے۔ تاریخ پیدائش ۱۷ مئی ۱۹۳۸ء ہے۔ تعلیم ایم۔ اے (تاریخ عہد وسطیٰ) ایم۔ اے (اردو)۔ اور محمد حسین آزاد کے ادبی کارناموں پر ڈاکٹریٹ کی سند تک ہے۔ شعرگوئی کی ابتدا اب سے تقریباً چار برس پہلے کی۔

روشنی کے جن ذخائر سے میں نے براہ راست استفادہ کیا ان میں استاذی سید احتشام حسین اور فراق صاحب کے اثرات مجھ پر بہت گہرے رہے ہیں۔ ادبی زاویہ نظر کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں چنانچہ ان بزرگوں کے سایۂ شفقت میں بھی میں ایک نامعلوم سی تشنگی اور تشکیک کی کھٹک سے ہمیشہ مضطرب رہا ہوں۔ مذہب، رومان اور مارکسیت میرے شعور کا سرچشمہ بھی رہے ہیں اور سامانِ عذاب بھی۔ نتیجہ میرا اسرار وجود کی بے معنویت اور اس کی حقیقت کو ایک ساتھ غذا دیتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں قدیم ہندی فلسفے اور گیتا سے میری عقیدت بہت گہری تھی۔ احترام آج بھی باقی ہے لیکن اب یہ شک بھی ہو چلا ہے کہ یہ سارے افکار عالمِ شکم سیری کے ذہنی عیش سے زیادہ مختلف نہیں۔ تصوف میں مجھے آج بھی تزکیہ نفس کے موثر ترین وسائل ملتے ہیں اور اس کی اصطلاحیں ذات کی پیچیدگیوں اور اس کی گرہ کشائی کے احساس و اظہار کا ذریعہ نظر آتی ہیں، اگرچہ مجاہدے اور ریاضت کی مجھ میں تاب ہے اور نہ تڑپ۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ تنہائی نہیں بلکہ تنہائی کی تلاش ہے۔

اب تک دو کتابیں ہندی میں اور دو اردو کتابیں بچوں کے لئے شائع ہو چکی ہیں۔ پیشہ معلمی ہے جو مجھے جہل کی ترویج سے زیادہ مختلف نہیں معلوم ہوتا۔

محمود سعیدی

نام: سلطان محمد خاں
پیدائش: دسمبر ۱۹۳۴ء
مقام پیدائش: ٹونک
تعلیم: اردو اور فارسی کی کامل دستگاہ، انگریزی اور ہندی کی معمولی استعداد

پیشہ: صحافت

تصانیف و تراجم: "گفتنی" (پہلا مجموعۂ کلام، طبع اول ۱۹۶۰ء، طبع دوم ۱۹۶۱ء)۔ "۱۸۵۷ء کی کہانی غالب کی زبانی" (غالب کی مشہور فارسی تصنیف "دستنبو" کا اردو ترجمہ، ۱۹۶۲ء)۔ "تجدید جنوں" (سوویٹ روس اور مشرقی یورپ کے جدید شاعروں کی منتخب نظموں کے منظوم تراجم ۱۹۶۲ء)۔ "سیہ بر سپید" (دوسرا شعری مجموعہ، زیر طبع)۔ "آئینہ در آئینہ" (قطعات کا مجموعہ، زیر ترتیب)

حسن نعیم

پیدائش: ۲۲ر نومبر ۱۹۲۸ء — تعلیم: بی۔ ایس سی (علیگ) — وطن: عظیم آباد

ذریعۂ معاش: تاحال وزارت خارجہ ہند سے منسلک تھا اور نیویارک میں چار برسوں سے قیام تھا۔ ان دنوں رخصت انتظامی (TERMINAL LEAVE) پر ہوں اور واپس نیویارک جا کر تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگنا چاہتا ہوں۔

متفرق معلومات: شعر و شاعری کے علاوہ کھیل کود اور سیاحت کا دلدادہ ہوں۔ حشمت آرا یوسف سے مارچ ۱۹۵۵ء میں شادی ہوئی۔ چار بچے حیات ہیں۔ دو لڑکیاں، دو لڑکے۔ چار بھائیوں میں صرف ایک بھائی علی نعیم بقید حیات ہیں جو کراچی میں مقیم ہیں۔ ماں باپ کا صغر سنی ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔ صوفیوں کے مشہور سلسلۂ شطاریہ سے آبا و اجداد چار سو برسوں سے منسلک رہے ہیں۔

محمود شام

پیدائش راجپورہ ریاست پٹیالے کی ہے۔ اسکول میں داخل کرتے وقت ماسٹر صاحب نے تاریخ پیدائش اندازاً ۵ر فروری ۱۹۴۰ء لکھ لی تھی۔ بڑے گھرانے میں سالگرہ منانے کا رواج ہوتا ہے، اس لئے تاریخ پیدائش بھی درج کر لی جاتی ہے۔ ہمارے چھوٹے گھر میں اس قسم کی چیز نہیں تھی۔ اس لئے صحیح تاریخ کا علم نہیں ہے۔ قیام پاکستان کے بعد گردش زمانہ جھنگ لے گئی، جسے ہیر کا دیس کہتے ہیں۔ ماں باپ نے نام محمد طارق محمود رکھا تھا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ سے میں نے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ جھنگ کی رومان پرور فضا ذہن کو شاعری کی طرف لے گئی اور نام محمود شام پڑ گیا — گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۶۴ء میں فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ "قندیل" اور "نوائے وقت" میں ملازمت کے بعد "اخبار جہاں" سے وابستہ ہوں۔ تصنیف کی نوبت ناشروں نے نہیں آنے دی۔ گرہ سے پیسے خرچ کر کے کتاب چھپوانی ہی ہے تو ناشر کی حیثیت سے بھی اپنا ہی نام کیوں نہ دیا جائے۔ جس روز اتنے پیسے ہو گئے پہلی تصنیف منظر عام پر آ جائے گی۔

بشیر بدر

میرے دادا سید اصغر علی ضلع فیض آباد کے ایک قصبے کے قاضی تھے۔ والد مرحوم سید محمد نظیر یو۔ پی کی پراونشل سروس میں تھے۔ میں کانپور میں ۱۵ر فروری ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوا۔ ۱۴ سال کی عمر میں ہائی اسکول فرسٹ ڈویژن اور تین مضامین میں امتیاز کے ساتھ کیا۔ والد صاحب ایک حادثہ میں ذہنی توازن کھو بیٹھے اور چند سال کی مسلسل بیماری کے بعد انتقال کر گئے۔ میں کالج سے دفتر آ گیا۔ دس سال ملازمت کی جس میں دو سال پولیس سب انسپکٹر بھی رہا۔ ملازمت چھوڑ کر گزشتہ سال ایم اے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ہر امتحان میں میری امتیازی حیثیت رہتی ہے۔ ایم۔ اے پریویس میں بھی ساری یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر آئے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کی علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر ہوں اور غالب نمبر کی تیاری میں مصروف ہوں۔

کالج سے نام کٹا تو ادب میں داخلہ ہو گیا۔ سب کچھ پڑھا ہے مگر صرف غزلیں کہی ہیں۔ میری غزلوں کا مجموعہ "اکائی" زیر اشاعت ہے

بظاہر زندگی مجھ پر سخت اور نامہربان رہی ہے لیکن خفیہ طور پر اتنی مہربان بھی ہوئی ہے کہ میں نے اُس کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔

شادی ہو چکی ہے۔ میری بیوی شہناز نے ہمیشہ میرے ارادوں کی تکمیل کے لئے خود دُکھ سہے اور میری موجودہ حیثیت جو میرے لئے حیات نَو ہے اُسی کی دین ہے۔ علی گڑھ کی طالب علمی میرا خواب تھی۔ یہ تعبیر اپنے خواب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی کلاس میں مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ دروازے کھل رہے ہیں اور روشنیاں آ رہی ہیں۔ جناب خلیل الرحمٰن اعظمی میرے اُستاد ہی نہیں ادبی رہنما بھی ہیں۔

سحر انصاری

نام: انور مقبول انصاری — تاریخ و سن پیدائش: ۲۷ر دسمبر ۱۹۳۹ء

مقام پیدائش: اورنگ آباد — آبائی وطن: مراد آباد (یو۔پی)

تعلیم: ایم۔ اے (انگریزی)، کراچی یونیورسٹی — ملازمت: برٹش ہائی کمیشن (انفارمیشن سروس)، کراچی

احمد ہمدانی

نام محمد احمد ہمدانی — پیدائش: ۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۴ء۔ بمقام میرٹھ

سکونت: کراچی — پیشہ: ملازمت (ریڈیو پاکستان)

سن ۱۹۴۵ء سے شعر کہنے کا سلسلہ جاری ہے لیکن سن ۱۹۴۵ء کے بعد ایک طویل وقفہ ضرور آیا ہے۔ صرف غزلیں کہتا ہوں۔

بشر نواز

۱۸ر اگست سن ۱۹۳۵ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔

تقریباً بارہ سال تک میونسپل کونسلر رہا۔ اب اس سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ ایک فلم میں کچھ گیت لکھے اور اب اسی کام کو مستقل ذریعۂ آمدنی بنانے کے چکر میں ہوں۔

شاعری سن ۵۵-۱۹۵۴ء سے شروع کی۔ نظمیں بھی کہیں، غزلیں بھی۔ مسدس بھی لکھے اور آزاد نظمیں بھی۔ کچھ تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ میں فن کو اظہارِ ذات کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے کسی ایک فارم یا صنف کی پابندی بڑی مصنوعی سی لگتی ہے۔ میری کوشش یہ رہتی ہے کہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ بھرپور انداز میں کہہ سکوں اور اس کے لئے جو فارم بھی مناسب ہو، استعمال کر لوں۔

نذیر قیصر

میرا آبائی وطن جالندھر ہے۔ میری پیدائش سن ۱۹۴۳ء میں ہوشیار پور کی تحصیل گڑھ شنکر میں ہوئی۔ جس رات میں پیدا ہوا اس رات کی صبح میری ماں فوت ہو گئی۔ خاندان والوں نے اباجی کو اور شادی کرنے پر بہت زور دیا لیکن وہ نہ مانے اور مجھے لئے ہوئے اپنے ایک عزیز دوست لالہ اوتار نرائن کے گھر چلے آئے جو اُن دنوں جہلم میں ایڈووکیٹ تھے۔ لالہ اوتار نرائن کا نوجوان بیٹا ادم پرکاش دریائے جہلم میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ لالہ کے گھر والوں نے مجھے لے لیا اور مجھے اپنا اوم بنا کر پالنے لگے۔ آزادی کے بعد لالہ اوتار نرائن کا گھرانا ہندوستان چلا گیا اور اباجی نے وہیں ملازمت کر لی — اس کے بعد زندگی میں کوئی تسلسل نہ رہا۔ جہلم سے لائلپور، لائلپور سے ملتان، ملتان سے لاہور — اس طرح زندگی گذرنے لگی۔

اس بے ترتیبی اور بکھراؤ کے سبب تعلیم کا سلسلہ بھی جاری نہ رہ سکا۔ یوں بھی اباجی کے سوا کوئی مجھے سنبھالنے والا اور کسی بُرے بھلے کام

سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ بہرحال میں نے چند دوستوں کے مجبور کرنے پر ۱۹۶۳ء میں ادیب عالم کر لیا۔ اس کے بعد سے پھر وہی بے ترتیب دن رات کا سامنا ہے۔

میرے مشاغل میں پڑھنے لکھنے کے علاوہ آوارہ گردی کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ دوپہروں اور راتوں کو گھومنا پھرنا بہت اچھا لگتا ہے گھروں کی اونچی چھتوں پر چڑھنا بھی بہت پسند ہے۔

میری تصانیف میں "آنکھیں، چہرہ، ہاتھ" میری غزلوں کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ نظموں کا مجموعہ "حکاشفہ" زیرِ ترتیب ہے۔

مصحف اقبال توصیفی

نام: عبد المغنی

۱۰ اگست ۱۹۳۹ء کو بدایوں (یو۔پی) میں پیدا ہوا۔ والد محترم بسلسلۂ ملازمت حیدر آباد دکن میں سکونت پذیر رہے اس لئے یہی وطن ٹھہرا۔ جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۶۱ء ایم۔ایس سی (ارضیات) کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۳ء سے جیالوجیکل سروے آف انڈیا کے محکمے سے منسلک ہوں اور اسی ضمن میں آج کل ترپونڈرم (کرالا) میں مقیم ہوں۔

پہلی نظم سہ ماہی "قند" مردان میں ۱۹۵۹ء میں چھپی۔

۴ فروری ۱۹۶۶ء کو عطیہ رحمان سے شادی ہوئی۔

مراتب اختر

شیخو شریف ضلع ساہیوال میں ۹ مئی ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوا۔ بچپن یہیں گزرا۔ پھر ساہیوال چلا آیا۔ یہاں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اس طرح تین چار سال لاہور میں گذار کر بغیر کوئی امتحان پاس کئے واپس آگیا۔ آج تک یہیں ساہیوال میں ہوں۔

پہلی کتاب "جنگل سے پرے سورج" ۱۹۶۳ء میں زمانۂ طالب علمی کے دوران چھپی۔ دوسرا مجموعہ "صحارِ حال" ۱۹۶۵ء میں چھپا لیکن بازار میں آنے سے پہلے ہی تلف ہو گیا۔ نظموں اور غزلوں کے تین نئے مجموعے زیرِ طبع ہیں۔

ہمزاد، گڈریا اور شہلا میری غزلوں کی مستقل علامتیں ہیں جن کی شناخت مجموعی مطالعے سے ہی ممکن ہے۔

اختر امام رضوی

اپریل ۱۹۳۷ء میں تحصیل گوجرخاں (ضلع راولپنڈی) کے ایک گاؤں بجرانہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گوجرخاں میں حاصل کی ۱۹۶۳ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے ایم۔اے (اردو) کیا۔ ۱۹۵۹ء میں بطور معلمِ ادبیاتِ اردو ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۱ء میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور روزنامہ "تعمیر" راولپنڈی، ماہنامہ "ادبیات" چکوال اور روزنامہ "جنگ" راولپنڈی میں کام کرتا رہا۔

۱۹۶۶ء میں ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر کی حیثیت سے شریک ہوا۔

گذشتہ دس سال سے اردو اور پوٹھوہاری میں شعر کہہ رہا ہوں۔ اردو میں زیادہ تر صنفِ غزل میں طبع آزمائی کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ بے شمار ریڈیائی فیچر ڈرامے اور منظوم تمثیلیں لکھ چکا ہوں۔ آج کل کشمیری لوک کہانیوں پر مبنی منظوم تمثیلوں کا مجموعہ "جہلم جاگ اٹھی" زیرِ ترتیب ہے۔

سرمد صہبائی

تاریخ پیدائش: ۱۹ ارنومبر ۱۹۴۵ء (ڈسکہ)

سنٹرل ماڈل سکول سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے (انگریزی) پاس کیا۔ کالج کے زمانے میں "راوی" کا ایڈیٹر اور ایڈوائزر رہا۔ صد سالہ جشن۔ کے اُردو کھیل میں نمایاں کردار ادا کیا اور مباحثوں اور مشاعروں میں کئی انعامات حاصل کیے
۱۹۶۷ء کی سالانہ کونووکیشن میں ادبی سرگرمیوں کے صلے میں رول آف آنر حاصل کیا۔
اکتوبر ۱۹۶۷ء سے اگست ۱۹۶۹ء تک چائے کی ایک کمپنی میں بحیثیت اسسٹنٹ منیجر کام کیا۔ آج کل ٹیلی ویژن کے سکرپٹ سکشن میں بحیثیت اسسٹنٹ سکرپٹ رائٹر کام کر رہا ہوں۔

خاقان خاور

سال پیدائش: ۱۹۳۶ء (گجرات) — پیشہ: برانچ منیجر یونائیٹڈ انشورنس کمپنی جہلم
تصنیف: غزلیات کا مجموعہ "صد برگ" زیر ترتیب ہے۔

امجد اسلام امجد

تاریخ پیدائش: ۴ راگست ۱۹۴۴ء (لاہور) — تعلیم: ایم۔اے (اردو)
مشاغل: (۱) ادب (کہ غریب کی جورو سب کی بھابی ہے) (۲) کرکٹ۔ (۳) مقابلے کے امتحان کی تیاری
تصانیف: فی الحال کوئی نہیں۔ (البتہ سکول، کالج اور یونیورسٹی کے رسالے ایڈٹ کئے ہیں)

عدیم ہاشمی

نام: فصیح الدین۔ ہاشمی خاندان سے تعلق ہونے کی وجہ سے اپنے تخلص عدیم کے ساتھ ہاشمی لکھنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔
تاریخ پیدائش: ۱ راگست ۱۹۴۲ء — جائے پیدائش: فیروزپور۔ ویسے آبائی وطن پٹھانکوٹ (بھارت) ہے
تعلیم: گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج لائلپور میں دو دو سال گذار کر صرف بی۔اے کی ڈگری پر اکتفا۔
مشاغل: کئی بیکاروں کا "کولیگ" ہوں۔ ویسے (پارٹ ٹائم) لوکل اخباروں میں کالم لکھتا ہوں۔
تصنیفات: غزلوں کا ایک مجموعہ مکمل کرنے کی فکر میں ہوں، چند خیال پاروں کا مجموعہ زیر تکمیل ہے۔ چند ایک ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

خالد شیرازی

اصل نام: خالد سعید — سن پیدائش: ۱۵ رجون ۱۹۴۵ء
مقام پیدائش: ملتان — مشاغل: "قانون" کی تعلیم
تصانیف: "ظہیر کاشمیری — شخصیت اور فن" (تنقید) زیر طبع۔ "محراب غزل" (اردو کے جدید غزل گو شعرا کی منتخب غزلیں)

خالد احمد

خالد احمد — اصلی اور قلمی نام ایک ہے۔ ۵ رجون ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا اور وہیں سے ۱۹۵۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسی سال دیال سنگھ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۶۲ء میں دیال سنگھ کالج سے بی۔ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ اور اسی سال کوہ نور ٹیکسٹائل ملز لائلپور میں ایڈمنسٹریشن سپروائزر ہو گیا۔ نو ماہ کی ٹریننگ مکمل کر کے واپس لاہور آگیا اور اگلے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ایس سی (فزکس) میں داخلہ لے لیا۔ تین سال تک فزکس پڑھ کر "ایورز میڈیکل لمیٹڈ۔ لیورپول۔ سپیک" کا "میڈیکل ریپریزنٹیٹو" ہو گیا اور ۱۳ رجنوری ۱۹۶۶ء سے تادم تحریر اسی فرم سے وابستہ ہوں۔

افتخار نسیم

تاریخ پیدائش: ۱۵ ستمبر ۱۹۴۶ء   مقام پیدائش: لائل پور

تعلیم: اسی سال پنجاب یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔بی کا امتحان دیا ہے۔

مشاغل: کتابیں پڑھنا۔ شعر کہنا اور سننا۔

نصیر ترابی

تاریخ پیدائش: ۱۵ جون ۱۹۴۵ء   مقام پیدائش: حیدر آباد دکن

تعلیم: ایم۔اے (صحافت) جامعہ کراچی ۱۹۶۸ء

مشاغل: مقامی اخبارات اور ریڈیو سے منسلک ہوں   تصانیف: فی الحال کوئی نہیں

حامد جیلانی

۱۰ جولائی ۱۹۴۵ء کو ضلع ساہیوال (منٹگمری) میں پیدا ہوا۔ والد صاحب پہلے ساہیوال میں وکالت کرتے تھے۔ پھر انہیں حکومت کی طرف سے لیگل اڈوائزر پنجاب روڈ ٹرانسپورٹ بورڈ کا عہدہ دیا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں وہ حرکتِ قلب بند ہونے سے وفات پا گئے۔ دادا جان جناب شیخ صادق جیلانی (بیرسٹر) ابھی تک زندہ ہیں۔ ابتدائی زندگی لاہور میں گذری۔ سنٹرل ماڈل سکول میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا کہ ساہیوال واپس آنا پڑا۔ اس وقت بی۔اے کا طالب ہوں۔ کلام کی اشاعت کا سلسلہ فسٹ ایئر سے جاری ہے۔ میرا ایک بھائی احمد جیلانی (کسٹم آفیسر سی کسٹم) اور تین بہنیں ہیں۔ والد صاحب کے چھوڑے ہوئے سارے کاروبار کی حفاظت ماں جی بہنیں رضیہ ناصرہ جیلانی کرتی ہیں۔ اس خوشحال گھرانے میں بھی میری روح ہر وقت بے چین رہتی ہے، نہ جانے کیوں! امتحانات کے آخری بیس پچیس دنوں میں کورس کی کتابیں لیتا ہوں اور اچھے نمبروں میں پاس بھی ہو جاتا ہوں۔ کبھی فیل نہیں ہوا۔ باقی سارا سال دوستوں سے ملاقاتیں کرنا، اکثر تنہا گھر میں بیٹھے رہنا سڑکوں پر آدھی آدھی رات تک بے چینی سے پھرنا یا پھر بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھے جانا زندگی کا معمول ہے۔ اس کے علاوہ وقت گذر رہا ہے اور بس......

محمد جلیل عالی

امرتسر سے کوئی بیس ایک میل دور واقع (ڈیروکے) نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ تقسیم پر گھر کے سب لوگ پاکستان چلے آئے اور جب سے ہم لوگ قصبہ کوٹ رادھا کشن میں رہائش پذیر ہیں۔ یہیں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں آرٹس کے مضامین کے ساتھ داخلہ لے لیا۔ بی۔اے میں اردو اور فلسفہ اختیاری مضامین تھے۔ ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) کی ڈگری پائی اور آج کل شعبۂ معاشریات میں تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔

اعجاز آصف

تاریخ پیدائش: یکم اکتوبر ۱۹۴۵ء   مقام پیدائش: امرتسر

تعلیم: ایم۔اے   تصنیف: سمرسٹ ماہم کے افسانے (ترجمہ) زیر طبع

میراجی کا

غیر مطبوعہ کلام ــــ دو مجموعوں کی صورت میں

تین رنگ

پابند نظمیں

میراجی کا یہ وہ کلام ہے جو گذشتہ بیس برس سے کتابی صورت میں اشاعت کا منتظر تھا "کتاب نما" نے اسے نہایت اہتمام کے ساتھ دو مجموعوں کی صورت میں شائع کر دیا ہے ــــ دونوں مجموعوں کو میراجی نے ترتیب دیا تھا دونوں کی ابتدا میں میراجی نے اِن مجموعوں یا خود اپنے بارے میں نثر میں بھی لکھا ہے۔ دونوں کے دیباچے اردو کے نامور شاعر اور میراجی کے قریبی دوست ــــ

مختار صدیقی

نے لکھے ہیں

محترمہ "سلمیٰ" کے موقلم نے دونوں مجموعوں کے گرد پوشوں کو پرمعنی انداز میں آراستہ کیا ہے۔ طباعت وشد ایک پر ہوئی ہے ــــ جلد کپڑے کی ہے اور کاغذ اعلیٰ درجے کا۔

پابند نظمیں	تین رنگ
قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے	قیمت : ۶ روپے ۵۰ پیسے

ناشر : کتاب نما ۵۲ - بی - سیٹلائٹ ٹاؤن ، راولپنڈی ،

شاخ : کتاب نما ۴۷ ، انارکلی ، لاہور ،

کتاب نما کی مطبوعات

ناول اور افسانہ

آنگن	(ناول)	خدیجہ مستور	قیمت ۸ روپے
سیتا ہرن	(دو ناولٹ)	قرۃ العین حیدر	قیمت ۱۰ روپے
جگنو اور ستارے	(تین ناولٹ)	جیلانی بانو	قیمت ۲ روپے
ستمبر کا چاند	(سفرنامے)	قرۃ العین حیدر	قیمت ۵ روپے
مینا بازار	(افسانے)	کرشن چندر	قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے
کرنا فلی	(ناول)	علاؤالدین الآزاد	قیمت ۳ روپے
برگ حنا	(افسانے)	احمد ندیم قاسمی	قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے
گھر سے گھر تک	(افسانے)	احمد ندیم قاسمی	قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

نظم و غزل

دشت وفا	احمد ندیم قاسمی	قیمت دس روپے
درد آشوب	احمد فراز	قیمت ۵ روپے
ریزہ ریزہ	ظہور نظر	قیمت ۵ روپے
پتھر کی زبان	فہمیدہ ریاض	قیمت ۳ روپے
پیاس کا صحرا	ساقی فاروقی	قیمت ۵ روپے
تین رنگ	میرا جی	قیمت ۶ روپے ۵۰ پیسے
پابند نظمیں	میرا جی	قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

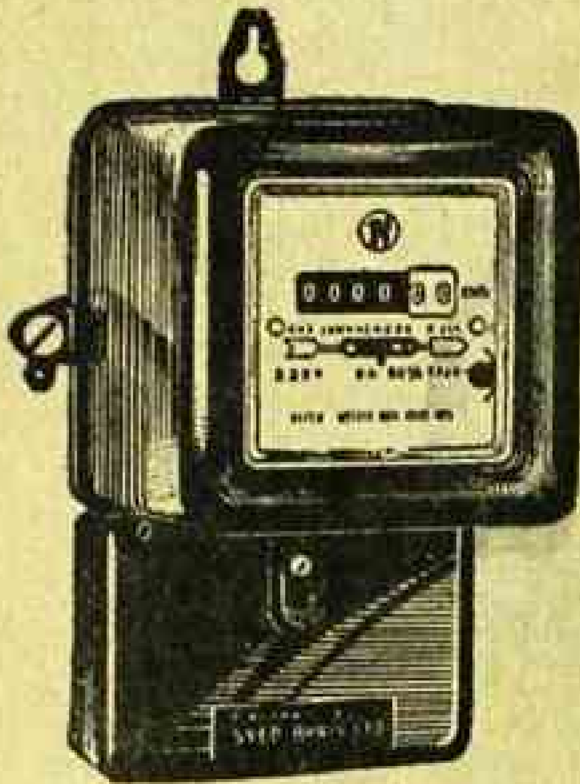
فلسفہ، تنقید، تحقیق

روح عصر	سید علی عباس جلالپوری	قیمت ۴ روپے
نئی شاعری جدید شاعری	فتح محمد ملک	(زیر طبع)
پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی	قیمت ۸ روپے
منٹو کے خطوط	ندیم کے نام	قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے
راگ رنگ	عنایت الٰہی ملک	قیمت ۲ روپے
غالب	ڈاکٹر خورشید الاسلام	قیمت ۵ روپے
مثبت قدریں	ڈاکٹر حنیف فوق	قیمت

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر پبلشر نے محمد طفیل کے اہتمام سے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر "فنون" ۴۷ - انارکلی لاہور سے شائع کیا۔

شہرۂ آفاق
کریزک میٹرز

پاکستان میں اسمبل کیے جا رہے ہیں اور اب محدود تعداد میں دستیاب ہو سکتے ہیں ـــــ!



صنعتی مقاصد کیلئے بجلی کے میٹر

3 فیز - 3 وائر اور 3 فیز - 4 وائر
400 وولٹس 50 سائیکلز
5 تا 400 امپز کیپیسٹی

مقامی فیکٹری سے حاصل کیے جا سکتے ہیں



گھریلو استعمال کیلئے بجلی کے میٹر

سنگل فیز ـــــ 2 وائر
250/230 وولٹس - 50 سائیکلز
10 امپز تا 40 امپز

مقامی فیکٹری سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

عمدہ کام کی گارنٹی۔ مفت سروس اور نقص کی صورت میں تبدیلی کا وعدہ۔

سیّد بھائیز لمیٹڈ ـــ لاہور